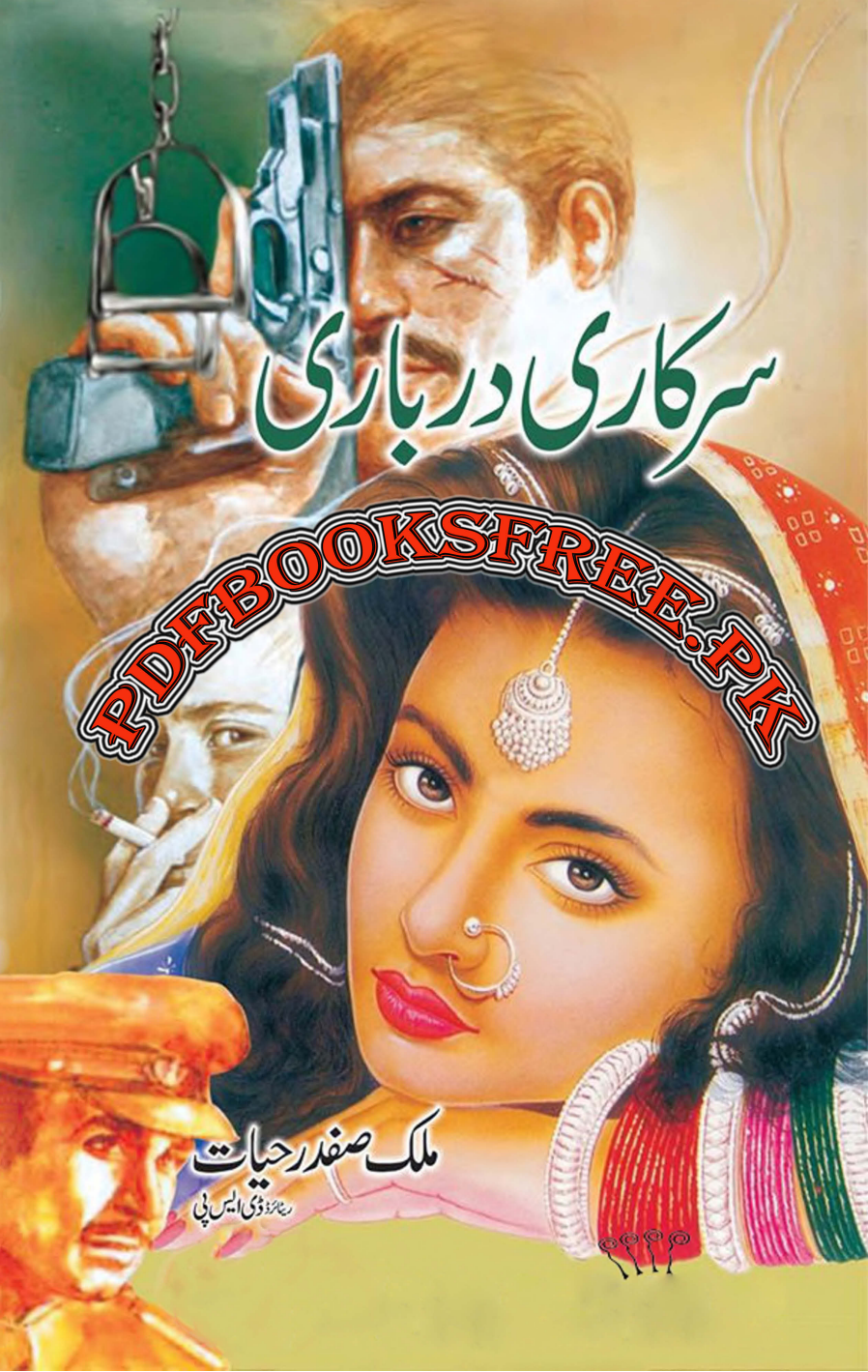
سرکاری درباری
PDFBOOKSFREE.PK
ملک صفدر حیات
ریٹائرڈ ڈی ایس پی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آفت زادی

ملک صفدر حیات

سراہنے اور چاہے جانے کی خواہش تو ان کی بھی ہوتی ہے جنہیں قدرت نے کم روبنایا ہوتا ہے جب کہ وہ تو مجسم حسن تھی سراپا نازوانداز تو بھلا اسے پرستش کی تمنا کیوں نہ ہوتی..... وہ تو خود کو پوجنے کے لائق سمجھتی تھی مگر اس کی بدقسمتی نے اسے ''رلنے'' کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ یوں اس کی ناآسودہ آرزوؤں نے اس فساد کو جنم لیا جس کا نشانہ بالآخر اسی کی ذات بن گئی۔ ملک صفدر حیات ڈائری سے ایک خونچکاں انتخاب

شر زور کا نقاب پہنے اک کمزور کے انجام کی عبرت ناک چشم کشا کتھا

پچھلے دو ماہ بڑے خوشگوار اور پرسکون گزر رہے تھے۔ امنگ اور ترنگ سے بھرپور موسم نے فضا کو مہکا رکھا تھا۔ ماحول میں مستی اور شوخی رچی بسی تھی، چہار سو رنگینی اور آفرینی پھیلی نظر آتی تھی۔ ہر شے نکھری نکھری اور زندگی سے معمور، دماغ مخمور اور دل محبت سے چور..... مگر یہ کمی کا آغاز ہوتے ہی جیسے سب کچھ بجھ کر رہ گیا تھا!

اب نہ تو سانس معطر رہی تھی اور نہ ہی مزاج میں سنسناہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اجلے اور مسکراتے چہرے یک دم کملا کر رہ گئے تھے۔ موسم کی کروٹ نے اچانک ماحول میں ایسی حدت بھر دی کہ ہر طرف ''گرمی گرمی'' کی پکار تھی۔ یوں لگتا تھا، ہوا روٹھ کر کسی اور ہی دنیا کی جانب نکل گئی ہو۔

ایسے ہی ایک حبس زدہ اور تپش رسیدہ دن جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ بڑی نہر میں سے کسی جوان لڑکی کی لاش ملی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میں نے اطلاع کنندہ کو فوراً اپنے کمرے میں بلالیا۔

وہ اسی علاقے کا رہنے والا ایک غریب مچھیرا تھا۔ اس کا نام رحمو معلوم ہوا۔ رحمو کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ رنگ گندمی، جسم متناسب اور قد میانہ۔ مجموعی طور پر وہ ''ساٹھا پاٹھا'' کی منہ بولتی تصدیق تھا۔ نامعلوم دوشیزہ اسی رحمو مچھیرے کے جال میں آ کر پھنسی تھی۔

رحمو سے پانچ منٹ کی اہم اور مختصر گفتگو کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مچھلیاں پکڑنے کے لیے، رات کو نہر کے ایک مخصوص حصے میں جال ڈال آتا تھا اور صبح جا کر شکار کا جائزہ لیتا۔ گزشتہ رات بھی وہ حسب معمول جال کو سیٹ کر کے گھر آ گیا تھا لیکن آج صبح جب وہ نہر کے اس مخصوص حصے کا معائنہ کرنے کے لیے وہاں پہنچا تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ جال میں مچھلیوں کے بجائے ایک جوان اور خوب رو دوشیزہ پھنسی ہوئی نظر آئی۔ اس نظارے نے اسے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا اور وہ اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے چلا آیا تھا۔

میں نے رحمو کی بات توجہ سے سنی اور وقوعہ کا جائزہ لینے کے لیے حوالدار حق نواز کے ہمراہ بڑی نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ان دنوں میں موضع نوشاہی کے تھانے میں تعینات تھا۔ نوشاہی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور وہاں کی ضروریات کے مطابق، کم و بیش ہر اہم شے ادھر مل جاتی تھی۔ بڑی نہر قصبے کی شمالی جانب پہلو سے گزرتی تھی۔ ہم پیدل ہی چلتے ہوئے تھوڑی دیر میں جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

اب وہاں نصف درجن کے قریب افراد بھی جمع ہو چکے تھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اس واقعے کی اطلاع مل رہی تھی، وہ جائے وقوعہ کا رخ کر رہے تھے۔ ہم رحمو کی راہ نمائی میں نہر کے پل پر پہنچ کر نیچے کو اترنے لگے۔ اس نے مچھلی شکار کرنے والا جال پل کے نزدیک، نہر کے ایک کنارے ڈال رکھا تھا۔ مذکورہ بڑی نہر مشرق سے مغرب کی سمت رواں دواں تھی پانی کے حوالے سے اسے بھری ہوئی کہا جا سکتا تھا..... اور یہ نہر کا وہ کنارا تھا جدھر سے پانی آ رہا تھا، یعنی رحمو نے مچھلیوں کو پل کے نیچے سے گزرنے سے پہلے ہی پکڑنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ مجھے مچھیروں اور ماہی گیری کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لہٰذا رحمو بڑی تفصیل سے مجھے اس بارے میں بتا رہا تھا۔ میں نے اس کی سننے کے دوران میں لاش کا معائنہ شروع کر دیا۔

وہ بدنصیب دوشیزہ جال میں بری طرح الجھی ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ یہ حال اس کا شاید جال کھینچنے کے سبب ہوا تھا۔ رحمو نے درجنوں مچھلیوں کی امید میں بڑے ماہرانہ انداز میں جال کو کھینچا ہوگا اور جب اس کی نگاہ ایک بڑی سی ''انسانی مچھلی'' پر پڑی ہوگی تو ظاہر ہے، اسے ذہنی دھچکا لگا ہوگا۔

تدبیر اور تقدیر میں ہر لمحے آنکھ مچولی ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کو چت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں لیکن دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ تقدیر جو مات دیتی ہے وہ بہت ہی اذیت ناک اور رلا دینے والی ہوتی ہے۔ رحمو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا تھا۔ جال کو کھینچتے وقت اسے معمول سے زیادہ زور لگانا پڑا ہوگا اور خوش ہو کر اس نے توقع باندھ لی ہوگی کہ آج تو من بھر مچھلی ... کہیں نہیں گئی۔ اس نے خیالوں میں اس مچھلی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو بھی گننا شروع کر دیا ہوگا مگر جب جال باہر آیا ہوگا تو اس کی خوش خیالی کے غبارے میں سے ایک دم ساری ہوا نکل گئی ہو گی۔ جال کے اندر من بھر وزن کی مچھلیوں کے بجائے انسانی لاش کو دیکھ کر اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہوگا!

میں نے رحمو کی مدد سے اس جوان دوشیزہ کی لاش کو جال میں سے باہر نکال کر نہر کے کنارے زمین پر ڈال دیا۔ ایک خاص زاویہ ہونے کے باعث نہر کے اس حصے تک ابھی دھوپ کی رسائی نہیں ہو پائی تھی۔ اس بچاؤ میں اغلب ہاتھ ان بلند و بالا درختوں کے سائے کا بھی تھا جو نہر کے کنارے پر استادہ تھے ویسے جس تیزی سے دھوپ پھیل رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں نہر کا وہ حصہ بھی محفوظ نہیں رہے گا لہٰذا اس سے پہلے ہی مجھے اپنا کام مکمل کرنا تھا۔ میں دوشیزہ کی لاش کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

میں بار بار اس نامعلوم لڑکی کے لیے ''لاش'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس پر نگاہ پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے زندوں میں شمار کرنا حماقت ہوگی۔ ازاں بعد میرا یہ اندازہ صوفی صد درست ثابت ہوا تھا۔ واقعی، جال کی گرفت میں آنے سے قبل ہی وہ لڑکی زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔

اس نامعلوم دوشیزہ کی عمر بیس اور بائیس کے درمیان رہی ہوگی۔ قد متناسب اور جسم بھرا بھرا۔ وہ ایک گوری چٹی بوب لڑکی نظر آتی تھی۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک پُرکشش اور حسین و جمیل دوشیزہ تھی مگر اس وقت اس کی ساری خوب صورتی اور رعنائی کو موت کی بھوکی پیاسی، گز بھر باہر کو نکلی ہوئی سفاک زبان چاٹ چکی تھی۔

مذکورہ دوشیزہ نے پھول دار پرنٹیڈ لان کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ دوپٹے اور جوتے وغیرہ سے بے نیاز تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس کا دوپٹا اور جوتا پانی کی ہم راہی اختیار کرتے ہی اس سے جدا ہو گیا تھا۔ بادی النظر میں وہ خودکشی کا معاملہ دکھائی دیتا تھا لیکن جب میں نے اکڑوں بیٹھ کر بغور اس کی گردن کا معائنہ کیا تو فوری طور پر مجھے اپنے خیال کو تبدیل کرنا پڑا۔

یہ سوچتے ہی مجھے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی کہ وہ خودکشی نہیں بلکہ قتل کا ایک کیس تھا۔ مذکورہ دوشیزہ کی گردن پر مجھے کچھ ایسے نشانات نظر آئے کہ میں چونک اٹھا۔ تفتیشی جائزے نے مجھے واضح طور پر بتا دیا کہ وہ انسانی انگلیوں کے دباؤ سے بننے والے مخصوص نشان تھے۔ گویا، اس بدنصیب کو گردن گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اس وقت تک جائے وقوعہ پر جمع ہونے والے افراد کی تعداد درجن سے آگے بڑھ چکی تھی۔ اس تعداد میں، میں نے بچوں وغیرہ کو شمار نہیں کیا تھا۔ تعداد میں وہ بھی بڑے افراد سے کسی طور کم نہیں تھے۔ ان سب کا تعلق موضع نوشاہی سے تھا۔ حوالدار حق نواز نے میری ہدایات کے مطابق ''تماشائیوں'' کو لاش سے ایک مناسب فاصلے پر روک رکھا تھا۔ میں نے ان میں سے تین چار معتبر افراد کو آگے آنے کے لیے کہا۔

جب وہ میرے قریب آ گئے تو میں نے خوب رو دوشیزہ کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم میں سے کوئی شخص اس حرماں نصیب کو جانتا ہے؟''

یہ بات تو طے تھی کہ اس لڑکی کو قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا تھا لیکن جب تک اس کی شناخت کا مرحلہ مکمل نہ ہو جاتا، تفتیش آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ موضع نوشاہی کے ان معتبر باسیوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور اس لڑکی کو پہچان لے گا لیکن ضروری نہیں کہ انسان کی ہر توقع پوری بھی ہو جائے!

ان افراد نے بغور مردہ لڑکی کے چہرے کا جائزہ لیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے یکے بعد دیگرے یہ جواب دیا۔ ''ہم اس لڑکی کو نہیں جانتے!''

میں نے اپنی تسلی کی خاطر ان افراد کو فارغ کر کے مزید تین چار کو بھی اسی آزمایش سے گزارہ لیکن اس آزمایش کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نتیجہ بھی میری توقع کے بالعکس ہی برآمد ہوا۔ پندرہ بیس منٹ کی تحقیق و تفتیش کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مچھیرے رحمو کے جال میں آکر لگنے والی اس بے چاری دوشیزہ کا موضع نوشاہی سے کوئی تعلق نہیں تھا!

اب مجھے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی اور کہاں سے یہاں پہنچی تھی؟ جب تک اس کی شناخت نہ ہوتی، قتل والے معاملے کی تفتیش ممکن نہیں تھی لیکن اس سے بھی پیش تر مجھے ایک ضروری کام نمٹانا تھا بلند و بالا درختوں کا سایہ اب پل کے اس مخصوص حصے سے رخصت ہو کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ چلچلاتی اور جلبل کرتی تیز دھوپ نے وہاں رکنا محال کر دیا تھا۔ موسم اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ ہم لڑکی کی لاش کو ایسے ہی چھوڑ کر، میں اس کے شناختی معاملات میں الجھا رہتا۔ لہٰذا لمحاتی سوچ بچار کے بعد میں نے اس لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔

وقوعہ کا نقشہ میں تیار کر چکا تھا۔ لاش کو اسپتال بھجوانے کے بعد میں موقع پر موجود افراد کے بیانات لینے لگا۔ اس کام کے لیے میں نے درختوں کے نیچے ڈیرا ڈال دیا تھا لیکن آدھے گھنٹے کی اس پوچھ تاچھ کے بعد بھی جب کوئی مثبت اور حوصلہ افزا نتیجہ سامنے نہ آیا تو میں حوالدار کے ساتھ واپس تھانے آگیا۔

☆☆☆

ان دنوں میں جس تھانے میں تعینات تھا وہاں بدقسمتی سے نفری بہت کم تھی۔ میرے علاوہ ایک حوالدار حق نواز اور چار کانسٹیبلو۔ اسی مختصر سے اسٹاف کے ساتھ مجھے تھانے داری کرنا تھی۔ اوپر سے مجھے یقین دلایا جا رہا تھا کہ انشاءاللہ! بہت جلد مجھے اے ایس آئی اور مزید تین چار کانسٹیبلو دے دیے جائیں گے مگر ایک سال گزر جانے کے باوجود بھی اس سلسلے میں کوئی پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ انشاءاللہ، محض ''انشاءاللہ'' ہی تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کانسٹیبل عارف کو اپنے ساتھ لیا اور نامعلوم دوشیزہ کے مبینہ اور متوقع قتل کی تفتیش کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مذکورہ لڑکی کی لاش کو میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا تھا۔ اب مجھے اس کے والی وارثوں کی تلاش تھی تاکہ ان سے ''ملاقات'' کے بعد اس قتل کا معما حل کیا جا سکے۔ ہم اس وقت دو سائیکلوں پر سوار ہو کر مشرق کی سمت بڑھ رہے تھے۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ لائحہ عمل اختیار کیا تھا۔ بڑی نہر کے ساتھ ساتھ ایک کچی سڑک بھی مشرق اور مغرب کے درمیان دراز تھی اور ہم اس وقت اسی سڑک پر محوِ سفر تھے۔ رحمو نے اپنے جال کو پل کے اس طرف لگایا تھا جدھر سے پانی آ رہا تھا۔ مذکورہ نہر مشرق سے مغرب کی سمت بہتی تھی۔ اس کا صاف اور واضح مطلب یہی تھا کہ لڑکی کی لاش مشرق کی جانب سے پانی میں بہتے ہوئے نہر کے پل تک پہنچی تھی اور رحمو مچھیرے کے جال میں آکر پھنس گئی تھی اگر رحمو نے وہاں جال نہ لگایا ہوتا تو یہ بات طے تھی کہ مذکورہ لاش نہر کے اندر ہی اندر سفر کرتے ہوئے موضع نوشاہی سے کہیں آگے نکل جاتی۔

ہمارے قصبے نوشاہی سے مشرق کی سمت دو گاؤں آباد تھے۔ پانچ میل کے فاصلے پر، نہر کی اسی جنوبی سمت میں اقبال نگر نامی ایک گاؤں آباد تھا۔ اقبال نگر سے مزید تین میل آگے ٹانڈا نامی ایک چھوٹا سا گاؤں واقع تھا۔ ٹانڈا، نوشاہی سے آٹھ میل دور نہر کے شمالی کنارے پر آباد تھا، یعنی نوشاہی اور اقبال نگر کی مخالف سمت میں۔ مجھے انہی دونوں گاؤں کو چیک کرنا تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ پل کے قریب سے برآمد ہونے والی مردہ لڑکی کا تعلق انہی دونوں گاؤں میں سے کسی ایک سے تھا! یہ دونوں گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہم موضع اقبال نگر پہنچ گئے۔ اقبال نگر ایک درمیانہ سا گاؤں تھا، بمشکل آٹھ دس گلیوں پر مشتمل اگر حساب کیا جاتا تو وہاں لگ بھگ ڈیڑھ سو گھر آباد تھے۔ یہ گاؤں موضع نوشاہی کے مقابلے میں کافی چھوٹا تھا۔ اقبال نگر کے ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے میں نے

> ٹیچر نے کلاس روم میں دیکھا کہ پچھلی بینچ پر بیٹھا ہوا ایک لڑکا کبھی منہ چلا رہا تھا اور کبھی عجیب عجیب شکلیں بنا رہا تھا۔
>
> ''اے .....نعمان .....!'' ٹیچر نے اسے پکارا
>
> ''یہاں، سامنے آؤ.....اور جو کچھ تمہارے منہ میں ہے، مجھے دے دو۔''
>
> ''کاش میں ایسا کر سکتا سر!'' نعمان نے کراہتے ہوئے کہا ''میرے منہ میں تو چھالے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چودھری سرور کی حویلی کا رخ کیا۔

چودھری اس وقت حویلی میں موجود تھا۔ جب ملازموں نے اسے بتایا کہ میں کسی ضروری کام کے لیے اس سے ملنے آیا ہوں تو وہ میرے استقبال کے لیے بہ نفس نفیس حویلی کے گیٹ تک چلا آیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم چودھری کی سجی سجائی کشادہ بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ میں اور کانسٹیبل اس وقت یونیفارم میں تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری نے خوش دلی سے کہا۔ ''ملک صاحب! باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، پہلے آپ کی خاطر تواضع ہو جائے۔ یہ کھانے کا وقت ہے۔ کھانا بالکل تیار ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔''

''اس تکلف کی ضرورت نہیں چودھری صاحب!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''کھانا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے کھالیا ہے۔ آپ ہمیں ٹھنڈا پانی پلوا دیں۔ آج تو قیامت کی گرمی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے ملک صاحب!'' وہ اصراری انداز میں بولا۔ ''آپ میرے غریب خانے پر آئیں اور کچھ کھائے پیے بنا ہی چلے جائیں؟''

''ہم پیے بنا نہیں جائیں گے چودھری صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ سے صرف ٹھنڈے پانی کی فرمائش ہے۔ اس کے بعد میں وہ کام کرنا چاہوں گا جس مقصد کی خاطر یہاں آیا ہوں۔''

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ چوکنا نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''خیریت تو ہے نا، ملک صاحب؟''

''خیریت نہیں ہے چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ورنہ میں اتنی شدید گرمی میں سفر کر کے آپ کے پاس نہ آتا!''

''معاملہ کیا ہے، کچھ پتا تو چلے؟'' وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''میں ایک قتل کے سلسلے میں تفتیش کرنے ادھر آیا ہوں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''قتل..... کون قتل ہو گیا ہے؟'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے جواب دیا۔ ''ایک جوان دوشیزہ کو قتل کرنے کے بعد کسی نے بڑی نہر میں پھینک دیا تھا۔ اس کی لاش آج صبح موضع نوشاہی والے، نہر کے پل کے پاس سے ملی ہے۔ مذکورہ لاش ایک مچھیرے کے جال میں جا پھنسی تھی۔''

''کک..... کون ہے وہ بدنصیب دوشیزہ؟'' چودھری سرور نے پوچھا۔

''اگر یہ معلوم ہو جاتا تو میں تفتیش کے لیے اِدھر کا رخ نہ کرتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ہاں، البتہ یہ قصد یقیناً میں نے کر لی ہے کہ اس کا تعلق موضع نوشاہی سے ہرگز ہرگز نہیں ہے۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب یہ ہی سوچا جا سکتا ہے کہ اس دوشیزہ کی لاش نہر کے پانی کے ساتھ بہتے ہوئے نہر کے پل تک پہنچی ہے۔ نہر کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت ہے اور اس طرف پہلے آپ کا گاؤں آتا ہے اور اس کے بعد موضع ٹانڈا ہے۔ اس وقت میں آپ کے گاؤں کے اندر یعنی آپ کی حویلی میں بیٹھا ہوں اگر یہاں کی تفتیشی کوشش ناکامیاب ہو گئی تو پھر میں ٹانڈا کا رخ کروں گا۔ اب تو آپ میری تفتیش کے زاویے کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے؟''

وہ چند لمحات تک گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''یعنی آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس نامعلوم مقتولہ لڑکی کا تعلق یا تو اقبال نگر سے ہے اور یا پھر موضع ٹانڈا سے؟''

''جی ہاں، بالکل میرا یہی مطلب ہے!'' میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''ہوں.....!'' اس نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا اور کہنے لگا۔ ''اگر تو وہ لڑکی میرے گاؤں سے تعلق رکھتی ہے تو اس کے گھر کا سراغ لگانے کے لیے آپ کو ایک ایک گھر کے دروازے تک جانے کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ میں کچھ ایسا بندوبست کرتا ہوں کہ یہیں بیٹھے بٹھائے آپ کا کام آسان ہو جائے۔''

''آپ نے میرے خیالات کی بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے چودھری صاحب!'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہی سوچ کر آپ کے پاس آیا تھا۔''

''بس تو سمجھ لیں، آپ کا کام ہو گیا۔'' وہ اپنی مونچھوں کو شفقت بھرے انداز میں سہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بدلے آپ کو بھی میرا ایک کام کرنا ہو گا!''

میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سا کام چودھری صاحب؟''

''میں کھانا کھانے کے لیے تو آپ سے اصرار نہیں کروں گا۔'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن موسم کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مناسبت اور ضرورت کے مطابق جو بھی شربت پانی بھجواؤں، اس سے آپ پورا پورا انصاف کریں گے!''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بڑی رسان سے کہا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! جیسے آپ کی مرضی.....''

چودھری بیٹھک میں سے نکل کر حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا تو کا ٹیبل عارف نے مجھ سے کہا ''ملک صاحب! چودھری سرور، دوسرے چودھریوں سے بڑا مختلف ہے!''

''کیا مختلف ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

وہ بولا ''میں نے اکثر چودھریوں کو دیکھا ہے۔ بڑی تن فن اور رعب داب والے ہوتے ہیں۔ ان کی ہر ہر ادا سے غرور اور تکبر ٹپکتا ہے لیکن چودھری سرور جس محبت اور خلوص سے پیش آ رہا ہے اسے دیکھ کر یقین ہی نہیں آ رہا کہ کوئی چودھری اتنا متعاون اور معتدل بھی ہو سکتا ہے۔''

''زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو عارف.....!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''اس میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی، پُرخلوص بھی اور بداخلاق بھی، سیاہ کار بھی اور نیکوکار بھی..... اسی لیے کہا جاتا ہے، کسی ایک برے شخص کو بنیاد بنا کر انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو برا نہیں سمجھ لینا چاہیے یا کسی ایک اچھے شخص کے صالح برتاؤ کو دیکھ کر یہ فتویٰ جاری نہیں کر دینا چاہیے کہ اس کے گروہ میں سب انسان نما فرشتے ہی ہوں گے!''

میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا۔ عارف بڑی توجہ سے میری تقریر نما باتیں سن رہا تھا۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''تمہارا یہ مشاہدہ اور اندازہ بالکل درست ہے کہ چودھری سرور، بہت سے چودھریوں سے خاصا مختلف ہے۔ یہ فرق میں نے بھی اس میں محسوس کیا ہے اسی لیے میں نے اس کیس کی تفتیش میں اسے شامل رکھنا ضروری سمجھا ہے اگر میرے تجربے کے مطابق، سرور کوئی اکھڑ، مغرور اور بددماغ قسم کا چودھری ہوتا تو میں اسے پنچ کرنا بھی پسند نہ کرتا۔''

ہم چودھری سرور کی ذات کے حوالے سے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ بیٹھک کے کھلے ہوئے منقش چوبی دروازے میں سے ایک ملازم صورت شخص لدا پھندا اندر داخل ہوا۔ ہم اس وقت آمنے سامنے دو صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے بیچ ایک لمبی سی میز بھی موجود تھی۔ ملازم نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی کنگ سائز ٹرے کو مذکورہ میز پر رکھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ میں بڑی دلچسپی سے اس ٹرے کا ''معائنہ'' کرنے لگا۔

ٹرے میں دو بڑے سائز کے جگ رکھے نظر آ رہے تھے اور ساتھ ہی..... نفیس قسم کے چار بلوری گلاس بھی موجود تھے۔ دونوں جگوں میں مختلف قسم کے دو مشروب بھرے تھے جن میں سے ایک کا رنگ دودھیا سفید اور دوسرے کا کندنی تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، صندل کے شربت میں سنگترے یا انار کا جوس شامل کر دیا گیا ہو۔ مالٹے اور سنگترے وغیرہ کا تو موسم نہیں تھا۔ وہ کوئی اور ہی ''تجربہ'' دکھائی دیتا تھا۔ بہرحال، مذکورہ شربت شیریں اور خوش ذائقہ تھا۔ پینے کے بعد یوں محسوس ہوا، کس کس میں سرایت کر گیا ہو۔ دونوں جگ پوری طرح بھرے ہوئے تھے۔ دو افراد کی تواضع کے لیے چار گلاس کی حقیقت کوئی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں تھی۔ گویا ہم دونوں کو وہ دونوں مشروب دو دو مختلف گلاسوں میں پینا تھے۔

میں نے ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کا ٹیبل عارف سے کہا ''شروع ہو جاؤ جوان! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ آج بڑی قیامت کی گرمی ہے اور چودھری سرور نے گرمی کا بہترین توڑ پیش کر دیا ہے۔''

خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں

بذریعہ ڈاک

انگلش لینگویج کورس	ایئر ہوسٹسیں	ہوم اکنامکس	بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ	الیکٹریکنگ	ٹیلرنگ	آلو سوسنگ
ریڈیو ٹی وی سی آپریشن	الیکٹریشن	ڈرافٹس مین	ڈریسنگ ٹیچنگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ	صحافت	فوٹوگرافی	انٹیریئر ڈیکوریشن
ایسوسی ایٹ شمسی ایجادات	مہر سازی	سلنگ بیوٹی	حکمت اردو
موٹر مکینکل مرمت	لائبریرین	کمپیوٹر	لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر سپروائزر (ہوم ورک)	میکینکل ایڈ	کوکنگ کیکنگ	ڈینٹل ٹیکنیشن
پولٹری ڈیری فارمنگ	ٹیلی ریڈر	آئل پینٹنگ	پبلک ریلیشن آفیسر
فلاور میکنگ			

یہ تمام کورسز اردو میڈیم بینکوں تصاویر اور ولی ایم کے ساتھ پریکٹیکل کتب کی صورت میں بذریعہ ڈاک ورکشاپ کورسز کو گھر پر کراتے ہیں کورس کے دورانیہ اور سند لینے کے بعد بھی مکمل راہنمائی ایک مدت تک کی جاتی ہے۔ جو اپنی نفاست کے ساتھ خط لکھیں۔

اسلام آباد اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او۔ اسلام آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عارف نے کندنی مشروب کو اپنے لیے گلاس میں بھرا جبکہ میں نے دودھیا شربت سے پیاس بجھانے کی ابتدا کی۔ ایک گھونٹ لیتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ عمدہ قسم کی سرمائی (ٹھنڈائی) تھی۔ ہم دونوں چودھری کی تواضع کا لطف اٹھاتے ہوئے نامعلوم متقولہ دوشیزہ کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی چودھری سرور بھی زیرِ بحث رہا۔ عارف کو یہ تشویش تھی کہ وہ اس کیس میں کس طرح ہماری مدد کرے گا۔ اس سوال کا واضح جواب مجھے بھی معلوم نہیں تھا لہٰذا میں نے کاشمیل سے کہہ دیا۔ ''دیکھتے ہیں، وہ کیا کر کے آتا ہے۔ گیا تو بڑے جوش میں ہے!''

کچھ دیر بعد چودھری واپس آگیا اور بیٹھک میں قدم رکھتے ہی اس نے اعلانیہ انداز میں کہا ''میں نے اچھی طرح معلوم کرلیا ہے ملک صاحب! آپ کو جس لڑکی کی لاش ملی ہے، اس کا ہمارے گاؤں اقبال نگر سے کوئی تعلق نہیں۔''

''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

جواب دینے سے پہلے اس نے چوبی میز کی طرف دیکھا پھر اس کی نگاہ دو بیس جم کر رہ گئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے شکایتی لہجے میں کہا ''ملک صاحب! آپ نے میرا کام ٹھیک طور پر نہیں کیا!''

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا شکوہ بھرا اشارہ دونوں جگوں میں بچے ہوئے مشروب کی جانب تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اس کی شکایت دور کرنے کی کوشش کی۔

''چودھری صاحب! ہم نے اپنی گنجایش اور ضرورت سے زیادہ پیا ہے۔''

''اگر پیا ہوتا تو یہ دونوں جگ خالی نظر آتے؟''

''چلیں کوئی بات نہیں۔'' میں نے موضوع کو پلٹنے اور اس کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا۔ ''تھوڑی دیر بعد ایک دور اور چلا لیں گے۔''

وہ معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دینے لگا۔

میں نے اسے واپس اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

وہ ایک سمجھ دار اور حاضر دماغ چودھری تھا۔ مجھے اپنے سوال کو دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسے بہ خوبی یاد تھا، میں نے اس سے کیا پوچھا ہے۔ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''میں آپ کے پاس سے اٹھ کر اندر گیا تھا اور اپنے خاص آدمیوں کو اس مشن پر روانہ کر دیا تھا کہ وہ پورے گاؤں کا سروے کر کے مجھے بتائیں کہ کسی گھر کی کوئی جوان دوشیزہ یا کوئی عورت غیر حاضر یا غائب تو نہیں ہے؟'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''اپنے آدمیوں کو بھیجنے کے بعد میں دوپہر کے کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ہمارا گاؤں کوئی زیادہ بڑا تو ہے نہیں۔ آٹھ دس گلیوں کا سروے کرنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جتنی دیر میں، میں کھانے سے فارغ ہوتا، وہ کام کر کے واپس آگئے۔ انہوں نے مجھے رپورٹ دی ہے، اقبال نگر کی کوئی لڑکی یا عورت اپنے گھر سے غیر حاضر نہیں ہے۔ میں نے اسی بنا پر کہا ہے کہ آپ کو جس دوشیزہ کی لاش ملی ہے اس کا ہمارے گاؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے!''

میں نے چودھری سرور کو اس واقعے کی تفصیل سناتے ہوئے نامعلوم متقولہ دوشیزہ کے حلیے، قد کاٹھ اور جسامت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''چودھری صاحب! آپ نے اپنے جن بندوں کو سروے کے لیے بھیجا تھا، کیا انہیں متقولہ کے حلیے اور قد و قامت کے بارے میں بتا دیا تھا؟''

''جی ملک صاحب! یہ کام تو میں نے سب سے پہلے کیا تھا۔'' اس نے ترت جواب دیا۔

میں قدرے مایوس نظر آنے لگا۔ قدرے تھکے ہوئے اور پُرسوچ انداز میں، میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے، اس کیس کی تفتیش کے لیے اب مجھے موضع ٹانڈا کی طرف جانا ہو گا کیونکہ آپ کے بعد قریب ترین گاؤں وہی ہے۔ ٹانڈا کے بعد تو پندرہ بیس میل آگے کوئی گاؤں دیہات آباد نہیں۔''

چودھری نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''ملک صاحب! میں نے ابھی تک آپ کو اپنے آدمیوں کی کارکردگی کی آدھی رپورٹ دی ہے!''

''آدھی رپورٹ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں کہا ''میں سمجھا نہیں چودھری صاحب!''

وہ سمجھانے والے انداز میں تفصیل بتانے لگا۔ ''میرے آدمیوں نے یہ تو معلوم کرلیا ہے کہ اقبال نگر میں بسنے والی کوئی عورت یا لڑکی اپنے گھر سے غیر حاضر نہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک انتہائی کام کی عورت کو بھی حویلی لے کر آئے ہیں۔ مذکورہ عورت اس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آپ کی بہت مدد کر سکتی ہے!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اضطراری انداز میں استفسار کیا۔ ''کون ہے وہ مفید عورت؟''

''اس کا نام ماسی رحمتے ہے۔'' چودھری نے بتایا۔ ''وہ اس گاؤں کی اکلوتی اور دیرینہ دائی ہے۔ رحمت بی بی عرف ماسی رحمتے کی عمر لگ بھگ پینسٹھ سال ہو گی لیکن اس کی بینائی لاجواب اور باکمال ہے۔ وہ اس عمر میں بغیر عینک کے بڑی آسانی اور روانی سے قرآن پاک پڑھ لیتی ہے۔ اسی لیے ابھی تک اس نے اپنے فن کو خیرباد نہیں کہا۔ اس کے ہاتھوں میں جیسے کوئی جادو ہے۔ وہ زچہ کو اتنی بھی تکلیف محسوس نہیں ہونے دیتی جتنی بال کھینچنے سے مچھن کو ہوتی ہو گی۔ اس گاؤں کی کم از کم دو نسلیں اسی کے ہاتھوں کی پیداوار ہیں۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے چودھری صاحب!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر بڑی رسان سے کہا ''لیکن یہ تو بتائیں، اپنے فن میں ید طولیٰ رکھنے والی کسی تجربہ کار دائی کا اس کیس کی تفتیش سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟'' میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اس کیس میں زچگی کی کوئی گنجایش نہیں!''

''ماسی رحمتے اس گاؤں کے بچے بچے اور بڑے بڑے کی صورت سے واقف ہے۔'' وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ اسے لاش کا ''چہرہ'' دکھا دیں تو وہ فوراً پہچان لے گی۔''

''لاش کی ''منہ دکھائی'' تو فی الحال ممکن نہیں چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''شاید آپ کو یاد نہیں رہا، میں نے بتایا تھا کہ نامعلوم مقتولہ دوشیزہ کی لاش کو میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا ہے پھر..... جب یہاں کی کوئی لڑکی یا عورت غیر حاضر نہیں تو چہرہ دیکھ کر وہ کس کو پہچانے گی؟''

''اوہ..... یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔'' وہ اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا پھر چونکنے والے انداز میں پوچھنے لگا۔ ''کیا آپ کو مقتولہ کی کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جسے نشانی کے طور پر ماسی رحمتے کو دکھایا جا سکے؟'' ذہن سے نکل جانے والی بات سے اس کی مراد پوسٹ مارٹم والا معاملہ تھا۔

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ چودھری سرور کے سوال نے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ شاید میں اس بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ مجھے مقتولہ کی دائیں کلائی میں سے رولڈ گولڈ کا ایک کنگن ملا تھا۔ اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجتے وقت میں نے مذکورہ کنگن اس کی کلائی میں سے اتار کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور اس وقت بھی مصنوعی سونے کا وہ کنگن میری جیب میں موجود تھا۔ میں نے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے جب اس بدنصیب لڑکی کی لاش کا معائنہ کیا تو اس کے پاؤں میں سلیپر یا جوتی نامی کوئی شے تھی اور نہ ہی کانوں میں کوئی بندے یا بالیاں۔ کلائیوں میں چوڑیاں بھی مجھے نظر نہیں آئیں البتہ اس کی دائیں کلائی میں نقلی سونے کا یہ کنگن ضرور موجود تھا.....!''

میں نے اپنی جیب میں سے مذکورہ کنگن آف رولڈ گولڈ نکال کر چودھری سرور کی جانب بڑھایا اور کہا ''ممکن ہے، یہ ماسی رحمتے اس کنگن کی مدد سے کوئی سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے!''

چودھری نے اس کنگن کو ہاتھ میں لے کر گھما پھرا کر دیکھا اور کہا ''میں ابھی ماسی رحمتے کو یہاں بلاتا ہوں۔ مجھے امید ہے، یہ کنگن آپ کا مسئلہ حل کر دے گا۔''

تھوڑی دیر بعد ماسی رحمتے چودھری سرور کے حکم پر اس بیٹھک میں موجود تھی۔ رحمتے کی عمر کے بارے میں چودھری نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی کمر قدرے جھک گئی تھی تاہم صحت تسلی بخش تھی۔ جب وہ گویا ہوئی تو اس کی کراری آواز سن کر اس کے انتہائی صحت مند ہونے کا مجھے یقین آ گیا۔ اس

ملبوسات کی دکان میں ایک سیلز گرل ایک خاتون کو ہر طرح کے ملبوسات دکھا دکھا کر تھک گئی۔ خاتون کے سامنے کپڑوں کا انبار لگ گیا مگر انہیں کوئی لباس پسند نہ آیا۔

آخر سیلز گرل تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ کو کوئی ڈریس پسند نہیں آیا..... میرے خیال میں اب یہاں کوئی ایسا ڈریس باقی نہیں رہا جو آپ کو دکھایا جا سکے.....''

''کوئی بات نہیں.....'' خاتون نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں..... میں تو ویسے بھی دراصل فریج خریدنے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی.....''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی مجھے اور چودھری کو باری باری سلام کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

چودھری نے، میرے دیے ہوئے کنگن کو رحمتے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''ماسی! قتل ہونے والی لڑکی کے ہاتھ سے، تھانے دار صاحب کو یہ کنگن ملا ہے۔ کیا تم اسے دیکھ کر کوئی اندازہ لگا سکتی ہو؟''

رحمتے نے کنگن کو ہاتھ میں لے کر گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا اور فتویٰ صادر کرنے والے انداز میں بولی۔ ''یہ کنگن تو میں نے نازو کے ہاتھ میں دیکھا تھا!''

میں نے چونک کر چودھری سرور کی طرف دیکھا۔ اس نے رحمتے سے پوچھا۔ ''تم کس نازو کی بات کر رہی ہو۔ ایک نازو تو میری حویلی میں بھی کام کرتی ہے اور..... میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے زندہ دیکھا ہے۔ میرے لیے دوپہر کا کھانا اسی نازو نے لگایا تھا؟''

''آپ کی حویلی میں کام کرنے والی نازو عبدالغفار کی بیٹی ہے۔'' ماسی رحمتے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اور اس کے باپ کو مرے پانچ چھ سال ہو گئے ہیں۔ میں تو کرم دین جٹ کی بیٹی، نازو کی بات کر رہی ہوں چودھری صاحب!''

''اوہ.....!'' چودھری سرور ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''چودھری صاحب! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو سرے سے کرایا ہے، کیا اس کی رپورٹ کے مطابق، کرم دین جٹ کی بیٹی نازو اس وقت اپنے گھر میں ہے؟''

وہ متاملانہ انداز میں بولا ''آں..... ہونا تو چاہیے۔ جب اس گاؤں کی تمام عورتیں اور لڑکیاں اس وقت اقبال نگر میں موجود ہیں تو نازو کو بھی ادھر ہی ہونا چاہیے۔''

ماسی رحمتے نے کہا ''تھانے دار صاحب! کیا آپ مجھے لاش کی ایک جھلک دکھا سکتے ہیں؟''

''کل شام سے پہلے یہ ممکن نہیں۔'' میں نے سپاٹ انداز میں کہا ''شاید چودھری صاحب نے تمہیں بتایا نہیں کہ نامعلوم لڑکی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوایا جا چکا ہے۔''

''اوہ..... پوسٹ مارٹم..... چیر پھاڑ.....!'' اس نے بڑی ناگواری سے یہ الفاظ دہرائے پھر خفگی آمیز انداز میں بڑبڑائی۔ ''ایک تو پولیس کو پوسٹ مارٹم کی بہت جلدی ہوتی ہے.....!''

میں نے اس کی نامعقول بڑبڑاہٹ کا جواب دیتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا ''پولیس کو ہر اس کام کی جلدی ہونا بھی چاہیے جو ناگزیر اور اشد ضروری ہو۔'' میں نے لمحے بھر کو رک کر ماسی رحمتے کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس نامعلوم دوشیزہ کی لاش موضع نوشاہی کی حدود میں سے مجھے ملی تھی۔ میں نے وہاں کے معتبر لوگوں سے لاش کی شناخت کروانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن کسی نے بھی اس کے، وہاں کے رہائشی ہونے کی تصدیق نہیں کی اگر میں اسے پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال نہ بھجواتا تو موسم کی شدت کے باعث لاش کا برا حشر ہو جاتا۔ وہ نہر کے پانی میں تو محفوظ رہی لیکن باہر نکالنے کے بعد اگر اسے مناسب طریقے سے محفوظ نہ کیا جاتا تو دو تین گھنٹوں ہی میں اس میں سے بدبو کے بھبکے اٹھنے لگتے۔ مجھے نہیں معلوم، ''لاش'' کے وارثوں کو تلاش کرنے میں مجھے کتنا وقت لگے گا۔ یہ دو چار گھنٹے بھی ہو سکتے ہیں، دو چار ماہ بھی اور..... اس سے زیادہ بھی لہٰذا لڑکی کی لاش کو سرکاری اسپتال بھجوانا بے حد ضروری تھا اور جہاں تک چیر پھاڑ کا تعلق ہے.....!''

میں نے ایک بار پھر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر ماسی رحمتے کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''شاید میں اس لڑکی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بجائے برف وغیرہ میں لگوا کر کچھ دیر اس کے وارثوں کے سامنے آنے کا انتظار کر لیتا اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا کہ اسے باقاعدہ قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا ہے۔ قتل کی کسی بھی واردات میں پوسٹ مارٹم قانون کی معمول کی کارروائی میں شمار ہوتا ہے!''

میرے خاموش ہونے پر چودھری سرور نے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ کیا پسند کریں گے..... میں کرم دین جٹ کی بیٹی نازو کو ادھر حویلی ہی میں بلا لوں یا آپ اس کے گھر پر جا کر تفتیش کریں گے؟''

میں نے چودھری کے سوال کا جواب دینے سے پہلے ماسی رحمتے سے پوچھ لیا۔ ''ماسی! ایک مرتبہ پھر اچھی طرح کنگن کو دیکھ لو..... اور بتاؤ، کیا واقعی تم نے یہ کنگن کرم دین جٹ کی بیٹی نازو کی کلائی میں دیکھا تھا؟''

''میری آنکھوں کو کسی قسم کا مغالطہ نہیں ہو سکتا جناب!'' وہ تیقن سے بولی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا ''میں کرم دین جٹ کے گھر جا رہا ہوں..... اور ماسی رحمتے بھی میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ جائے گی!''

''ٹھیک ہے!'' چودھری نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور بولا ''اس کیس میں، میں بھی بہت دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔ ادھر سے جو بھی نتیجہ سامنے آئے، تھانے جاتے ہوئے مجھے اس سے ضرور آگاہ کر دیں۔''

میں نے چودھری سرور کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا اور اس کی حویلی سے نکل آیا۔

☆☆☆

اس وقت سہ پہر کے آخری مراحل چل رہے تھے۔ دوپہر کو ڈھلے کافی دیر گزر چکی تھی لیکن ابھی تک گرمی کی تیزی اور تندی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس سیال سورج زمین والوں سے خصوصی طور پر خفا ہے۔ وہ اپنی خفگی مٹانے کے لیے ان پر دوزخ ایسی گرمی برسا رہا ہے اور کروڑوں میل دور کھڑا انسانوں کی بے بسی پر مسکرا رہا ہے۔ اس کی خفگی میں بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی اور اس مسکراہٹ کے پیچھے بڑی قہرناک خفگی چھپی تھی۔

ہم جب کرم دین جٹ کے دروازے پر پہنچے تو میرا پورا بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے چودھری کی حویلی میں، ٹھنڈائی اور دوسرے خوش ذائقہ مشروب سے ہم نے جو لطف اور راحت اٹھائی تھی اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ کانسٹیبل عارف کی دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا اور اپنے سامنے دو پولیس والوں کو باوردی کھڑے دیکھ کر گھبرا گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے فوری مداخلت نہ کی تو وہ دروازہ بند کر دے گی۔ میں اپنی ٹانگ کو دروازے میں پھنسانے ہی والا تھا کہ ماسی رحمتے نے گویا مسئلہ ہی حل کر دیا۔

''نی صادقہ! فکر والی کوئی بات نہیں۔'' اس نے مذکورہ ادھیڑ عمر عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تھانے دار صاحب ایک چھوٹی سی بات کی تفتیش کے لیے آئے ہیں۔ کیا تیری کڑی نازو گھر میں ہی ہے؟''

اس سے پہلے کہ صادقہ نامی وہ عورت ماسی رحمتے کے سوال کا جواب دیتی، گھر کے اندرونی حصے میں سے ایک استفسار یہ نسوانی آواز بلند ہوئی۔ ''اماں! باہر کون آیا ہے؟''

صادقہ کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے مجھے فوراً سے پیش تر بتا دیا کہ نظر نہ آنے والی وہ لڑکی یقیناً نازو ہو گی۔ صادقہ نے بیٹی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الجھن زدہ نظر سے باری باری ہم تینوں کو دیکھا پھر اس کی نگاہ ماسی رحمتے پر ٹک گئی۔

''خیر تو ہے نا ماسی؟'' اس نے تشویش بھرے انداز میں رحمتے سے پوچھا۔

''سمجھو، خیر ہی ہے!'' ماسی رحمتے نے ہاتھ کو ایک مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا ''میں نے اندر سے نازو کی آواز سن لی ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ زندہ ہے!''

''ہائے رہا، میں مرجاؤں.....!'' صادقہ نے بڑے اضطراری انداز میں اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''میری نازو کو کیا ہونا تھا۔ ماسی! یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے؟''

میں نے مداخلت ضروری سمجھتے ہوئے براہ راست صادقہ کو مخاطب کیا اور پوچھا۔ ''بی بی! کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟''

ماسی رحمتے نے میری بات کو مضبوط کرتے ہوئے کہا ''تو دروازہ تے کھول۔ اندر بیٹھ کر میں تیری بات کا جواب دیتی ہوں۔ ادھر گلی میں کھڑے کھڑے بات نہیں ہو سکتی!''

تھوڑے سے تذبذب اور تامل کے بعد صادقہ ہمیں اپنے گھر کے اندر لے گئی اور لے جا کر بیٹھک میں بٹھا دیا۔ وہ خود بھی ہمارے ساتھ ہی ایک موڑھے پر بیٹھ گئی۔ میں اور کانسٹیبل ''چادر بچھی چارپائی'' پر بیٹھ گئے۔ ماسی رحمتے، صادقہ کے سامنے ایک دوسرے موڑھے پر براجمان ہو گئی۔ نازو کا باپ کرم دین جٹ اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ صادقہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنے کھیتوں پر گیا ہوا ہے۔ اس گھر میں وہ تینوں ہی رہتے تھے..... یعنی کرم دین جٹ، اس کی بیوی صادقہ اور ان کی بیٹی نازو۔

صادقہ باری باری ہم سب کو الجھن زدہ اور وحشت بھری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے روئے سخن ماسی رحمتے کی جانب پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ماسی! میں بات شروع کروں یا پہلے تم بولو گی؟''

''بات تو آپ ہی شروع کریں گے تھانے دار صاحب!'' رحمتے نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں صادقہ سے اتنا ضرور کہوں گی کہ کوئی لسی پانی کا بندوبست کرے۔ گرمی اتنی زیادہ ہے کہ یہاں تک آتے آتے چیں بول گئی ہے!''

صادقہ کی الجھن اپنی جگہ برقرار تھی۔ اس نے متذبذب انداز میں پوچھا۔ ''ماسی! تم نے میری نازو کے زندہ ہونے کی بات کی تھی۔ یہ کیا چکر ہے۔ اس بات سے کیا مطلب تھا تمہارا؟''

میں نے صادقہ کو زیادہ الجھانا مناسب نہ سمجھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''بی بی! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آج صبح اپنے علاقے میں، نہر کے پل کے قریب ایک جوان لڑکی کی لاش ملی ہے۔ مجھے یقین ہے، اس بدنصیب کو قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں تفتیش کرتے ہوئے موضع نوشاہی سے یہاں پہنچا ہوں۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے جس مقتولہ دوشیزہ کی لاش کا ذکر کیا ہے، اس کی ایک کلائی میں نقلی سونے کا ایک کنگن موجود تھا۔ ماسی رحمتے کا دعویٰ ہے کہ وہ کنگن اس نے تمہاری بیٹی نازو کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ تم اپنی بیٹی کو یہاں بلاؤ تاکہ میں اس سے پوچھ گچھ کرسکوں۔''

میں بظاہر صادقہ سے بات کررہا تھا لیکن میرے تمام تر ظاہرہ اور خفیہ حواس اس وقت پوری طرح بیدار تھے۔ انہی میں سے ایک حس نے مجھے بتادیا کہ کوئی چھپ کر ہماری باتیں سن رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتے ہی بے ساختہ میری نگاہ بیٹھک کے اندرونی دروازے کی سمت اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا..... اس دروازے کے پیچھے یقیناً نازو کان لگائے کھڑی ہماری باتیں سن رہی ہے!

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔ ''عارف! ذرا دیکھنا، ادھر دروازے کے پیچھے کون چھپا کھڑا ہے!''

اسی لمحے اس قسم کی پُراسرار آوازیں پیدا ہوئیں جیسے جلدی میں کسی نے وہاں سے ہٹنے کی کوشش کی ہو۔ کانسٹیبل کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی صادقہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اندرونی دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بڑبڑائی۔

''میں دیکھتی ہوں!''

''اور لسی پانی کو بھول نہیں جانا۔'' ماسی رحمتے نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا ''پیاس اور گرمی نے حال برا کررکھا ہے۔''

میں نے تاکیدی انداز میں کہا ''صادقہ بی بی! لسی پانی کا بندوبست بعد میں کرتی رہنا۔ پہلے تم اپنی بیٹی نازو کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں تفتیشی کام کا آغاز کرسکوں۔''

صادقہ کوئی جواب دیے بغیر بیٹھک کے دروازے سے نکلی اور گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہوگئی۔ دس منٹ بعد وہ نازو اور لسی کے ساتھ واپس آگئی۔ میں لسی پر سے نگاہ ہٹا کر تنقیدی انداز سے نازو کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی عمر لگ بھگ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ رنگت سانولی۔ وہ پستہ قامت والی ایک دھان پان لڑکی تھی۔ اپنی ماں کے اشارے پر وہ ایک موڑھا سنبھال کر بیٹھ گئی۔ صادقہ ہم سب کے لیے پیتل کے گلاسوں میں لسی انڈیلنے لگی تو میں نازو کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس دوران میں، میں نے مقتولہ دوشیزہ کی لاش کی کلائی سے حاصل ہونے والا مصنوعی سونے کا کنگن جیب سے نکال لیا تھا۔

میں نے مذکورہ کنگن نازو کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کنگن کو پہچانتی ہو؟''

''یہ..... یہ آپ کو..... کہاں سے ملا؟'' وہ ہیجانی انداز میں بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''سارا قصہ تم نے دروازے کے پیچھے چھپ کر سن تو لیا ہے، اس کے باوجود بھی پوچھ رہی ہو!''

''جی.....!'' اس نے کھسیانے انداز میں کہا ''مم..... میں نے کیا سن لیا ہے؟''

''زیادہ بھولی بننے کی ضرورت نہیں ہے!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''جب میں تمہاری ماں کو اس کنگن کے بارے میں بتا رہا تھا تو تم اس دروازے سے کان لگائے اندر کی سن گن لے رہی تھیں۔ میں نے دھوپ میں نہیں، تھانے داری کرتے ہوئے یہ بال سفید کیے ہیں اگر مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو بری طرح پچھتاؤ گی!''

میری دھمکی آمیز باتوں نے اس پر گہرا اثر کیا۔ وہ جلد ہی میرے رعب میں آگئی اور حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے بتایا۔ ''وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ.....'' ذرا رک کر اس نے اپنی ماں اور ماسی رحمتے کی طرف دیکھا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس بات کا تو پتا چل گیا تھا کہ ہمارے گھر میں پولیس آئی ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ کیوں؟ اس کیوں نے میرے اندر تجسس کو جگایا اور میں بیٹھک کے دروازے سے کان لگا کر یہ سننے کی کوشش کرنے لگی کہ اندر کس قسم کی باتیں ہورہی ہیں لیکن آپ یقین کریں..... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے آپ کی بات نہیں سنی.....''

''قسم کھانے کی ضرورت نہیں!'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''تمہاری خوشی کی خاطر میں یقین کرلیتا ہوں کہ تم نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔'' پھر میں نے نازو کے سامنے نامعلوم دوشیزہ کی لاش والا قصہ دہرایا اور آخر میں دوبارہ پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ماسی رحمتے نے بڑے وثوق سے مجھے بتایا ہے کہ یہ کنگن اس نے تمہاری کلائی میں دیکھا تھا۔ اب تم سیدھی طرح شرافت سے بتا دو کہ یہ کنگن تم نے کسے دیا تھا۔ ہوسکتا ہے، وہ نامعلوم مقتولہ دوشیزہ وہی لڑکی ہو جسے تم نے کنگن دیا ہو!''

وہ تحیر آمیز نظر سے باری باری مجھے اور اس کنگن کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لل..... لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے.....!'' پھر وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکنے لگی۔

''کیا نہیں ہوسکتا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

اس نے بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے کنگن کو پہچان لیا ہے لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ میں نے تو یہ کنگن کسی کو نہیں دیا..... پھر..... پھر یہ کسی لڑکی کی کلائی میں کیسے پہنچ گیا.....؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے اچٹھک نظر سے اسے دیکھا۔ ''اگر تم نے اپنا کنگن کسی کو نہیں دیا تو پھر تمہاری کلائی سونی کیوں دکھائی دے رہی ہے؟'' بات ختم کرتے ہی میں نے باقاعدہ اس کی کلائیوں کی جانب اشارہ بھی کردیا۔

وہ اپنی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرے ہاتھ اس لیے آپ کو خالی نظر آرہے ہیں کہ میں نے آج صبح ہی کنگن اتار کر صندوق میں رکھا ہے۔'' پھر ایک مرتبہ وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

''مگر..... یہ کنگن میرے صندوق سے نکل کر کسی لڑکی کے پاس کیسے پہنچ گیا.....؟'' بات مکمل کرتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' میں نے تیز آواز میں اس سے پوچھا۔

''میں صندوق میں کنگن دیکھنے جارہی ہوں!'' وہ پُرعزم انداز میں بولی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل جاتا کہ آخر اس کنگن کا ماجرا کیا تھا۔ نازو کے رویے اور تاثرات سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ میں بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کرتے ہوئے نمکین ٹھنڈی ٹھار لسی کو اپنے معدے میں اتارنے لگا۔

وہ ادھر گئی، ادھر واپس آگئی۔ پہلے میرے ہاتھ میں کنگن کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی، اب ویسا ہی ایک دوسرا کنگن اس کے ہاتھ میں دیکھ کر میں حیرت زدہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ والے کنگن کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ دیکھیں..... میرا کنگن تو صندوق ہی میں رکھا ہوا تھا!''

میں نے نازو والا کنگن اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر گھما پھرا کر بڑے غور سے ان دونوں۔ ''ہم شکل۔'' کنگنوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ہو بہو ایک دوسرے کی کاپی تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ ایک ہی سانچے میں ڈھل کر تیار ہوئے ہوں۔ مجھے ان کنگنوں میں رتی برابر فرق دکھائی نہ دیا۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے نازو سے سوال کیا۔

''نازو! تمہارے پاس یہ کنگن کہاں سے آیا ہے..... میرا مطلب ہے، تم نے اسے کس دکان سے خریدا ہے؟''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے نازو سے کنگن کے بارے میں اس لیے پوچھا تھا کہ اگر مجھے اس دکان کا پتا چل جاتا جہاں سے نازو نے وہ کنگن خریدا تھا تو میں اس دکان دار سے تفتیش کر کے یہ معلوم کرسکتا تھا کہ اس نے ایسے کنگن اور کس کس کو فروخت کیے تھے لیکن نازو نے میری توقع کے بالعکس جواب دیا۔

''میں نے تو یہ کنگن کسی بھی دکان سے نہیں خریدا!''

''خریدا نہیں..... تو پھر کسی نے تمہیں تحفہ دیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ نازو میرے سوال کا جواب دیتی، اس کی ماں صادقہ بول اٹھی۔ ''نازو..... کہیں یہ وہی کنگن تو نہیں جو مسرتی نے تمہیں دیا تھا؟''

''ہاں اماں..... یہ وہی کنگن ہے!'' نازو جلدی سے بولی۔

''مسرتی۔'' ایک نیا کردار سامنے آیا تھا لہٰذا اس کے بارے میں استفسار ضروری ہوگیا۔ میں نے باری باری نازو اور اس کی ماں کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ مسرتی کون ہے بھئی؟''

صادقہ نے جواب دیا۔ ''مسرتی کا اصل نام تو مسرت جبیں ہے لیکن بگڑ کر ''مسرتی'' ہوگیا ہے۔ نازو سے اس کی بڑی پکی دوستی ہے۔''

''کہیں تو جمیلہ کی بیٹی مسرتی کی بات تو نہیں کررہی؟'' ماسی رحمتے نے صادقہ سے پوچھا۔

''ہاں ہاں..... وہی مسرتی۔''

''پر اس مسرتی کی تو دو مہینے پہلے شادی ہوگئی ہے؟''

''ہاں ماسی!'' صادقہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''پچھلے دنوں وہ ادھر اقبال نگر آئی ہوئی تھی۔ اسی وقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے یہ کنگن میری نازو کو تحفہ دیا تھا۔''

میں ان دو عورتوں کی باہمی گفتگو سے چونک اٹھا اور قدرے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ ''تم لوگ جس مسرت جبیں عرف مسرتی کا ذکر کر رہے ہو، کیا اس کا تعلق اسی اقبال نگر سے ہے؟''

ماسی رحمتے اچانک کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی چنانچہ صادقہ نے میرے سوال کا جواب دیا۔ ''مسرتی کے ماں باپ تو اِدھر ہی رہتے ہیں جی۔ اقبال نگر اس کا میکا ہے۔ وہ دو مہینے پہلے بیاہ کر یہاں سے اُدھر ٹانڈا گئی ہے۔''

''ٹانڈا!'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''اس کا مطلب ہے، آج کل وہ اپنی سسرال موضع ٹانڈا میں ہے؟''

''جی ہاں..... چند دن پہلے ہی تو گئی ہے۔'' صادقہ نے جواب دیا۔

ماسی رحمتے گہری سوچ سے باہر نکل آئی اور تمتماتی ہوئی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ مسرتی بھی میرے ہی ہاتھوں سے پیدا ہوئی تھی اور میری نگاہ کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔'' اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے اس لڑکی کا حلیہ کیا بتایا ہے۔ جس کی لاش آپ کو نہر میں سے ملی ہے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں نامعلوم مقتولہ دوشیزہ کا حلیہ دہرا دیا۔

ماسی رحمتے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ حلیہ تو بڑی حد تک مسرتی پر فٹ بیٹھ رہا ہے۔''

''اے ماسی! تیری مت تے نہیں ماری گئی!'' صادقہ نے تیز آواز میں کہا ''مسرتی تو چند دن پہلے ٹھیک ٹھاک یہاں سے گئی ہے۔ ایسی باتیں کیوں منہ سے نکالتی ہے؟''

ماسی رحمتے کے گمبھیر انکشاف نے مجھے ریڈ الرٹ کر دیا۔ وہ ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار عورت تھی۔ پینسٹھ سال کی عمر میں بھی بغیر عینک کے قرآن پاک پڑھ لیتی تھی۔ اس کی نگاہ کو دھوکا ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، ماسی رحمتے نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''صادقہ! میں کوئی مسرتی کی دشمن تھوڑی ہوں۔ وہ تو میری پوتی کی طرح ہے۔ میں نے تو حق سچ بات کی ہے۔ اللہ مسرتی کو حیاتی دے۔ پر تو بھی اپنے ایمان سے بتا، جو حلیہ تھانے دار صاحب نے بیان کیا ہے وہ مسرتی سے میل نہیں کھاتا؟''

''بات تو، تو ٹھیک ہی کر رہی ہے ماسی!'' صادقہ نے پُرمعنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے، سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا۔ ''رب خیر کرے..... بڑی سوہنی کڑی ہے!''

میں ان دونوں عورتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے نازو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ مسرت کی گہری دوست تھی لہٰذا اس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر بتا سکتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''نازو! تم تو مسرتی کی گہری سہیلی ہو۔ میں نے ابھی ابھی جو حلیہ بتایا ہے، کیا تمہیں لگتا ہے، مسرتی ایسی ہی ہے؟''

''لگتا تو ہے جی!'' وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ''آپ مجھے اس لڑکی کی لاش دکھائیں۔ میں دیکھ کر فوراً پہچان لوں گی کہ وہ مسرتی ہے یا نہیں!''

میں نے کہا۔ ''جب اس نامعلوم دوشیزہ کی لاش اسپتال سے واپس آئے گی تو میں تمہیں دکھا دوں گا۔ فی الحال، تم مجھے اس کنگن کے بارے میں بتاؤ؟''

''ان میں سے کون سے کنگن کے بارے میں بتاؤں جی؟'' نازو نے میرے ہاتھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں فوراً اس کے سوال کی بنیاد تک پہنچ گیا۔ اس وقت وہ دونوں کنگن میرے ہاتھ میں تھے۔ میں نے انہیں نازو کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''ان میں سے تم اپنے کنگن کو پہچان سکتی ہو؟''

''بہت مشکل ہے جی۔'' وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''یہ دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔''

''ہاں، ایک جیسے تو ہیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''مسرتی نے یہ کنگن تمہیں تحفے میں دیتے ہوئے کچھ کہا بھی تھا؟''

''جی، اس نے کہا تھا کہ میں نے ایک جیسے دو کنگن اس لیے خریدے ہیں کہ ایک میرے پاس رہے اور دوسرا میری سہیلی نازو کے پاس..... میری دوستی کی نشانی کے طور پر.....!''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ایک ایسا ہی کنگن تمہاری سہیلی مسرتی کے پاس بھی ہے؟''

''جی ہاں..... جی ہاں.....'' وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی پھر میرے ہاتھ میں موجود دو ایک جیسے کنگن دیکھ کر اُلجھن میں پڑ گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ کوئی گمبھیر بات سوچ رہی ہو!

''اس کا مطلب ہے.....'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''مجھے نہر میں سے جس نامعلوم مقتولہ دوشیزہ کی لاش ملی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے وہ مسرت جبیں عرف ''مسرتی'' بھی ہوسکتی ہے!'' میرا انداز خود کلامی والا تھا۔

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کانسٹیبل نے فوراً میری تقلید کی۔ ماسی رحمتے نے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! میری اور ضرورت ہے یا آپ کی تفتیش مکمل ہوگئی۔ شام ہونے والی ہے اگر آپ کا کام ہوگیا ہو تو میں اپنے گھر جاتی ہوں۔''

''مجھے اب تمہاری مزید ضرورت نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میرا کام ختم ہوگیا ہے۔ اصل کام تو اب شروع ہوا ہے۔ تم اتنا کرو کہ ہمیں مسرت کے ماں باپ کے گھر پہنچا دو۔ اس کے بعد تم اپنے گھر چلی جانا۔''

اس نے لمحے بھر کو سوچا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''آئیں جی میرے ساتھ.....!''

ہم کرم دین جٹ کے گھر سے نکلے اور ماسی رحمتے کی راہ نمائی میں مسرتی کے میکے کی جانب بڑھ گئے۔ جب ہم نے خوشی محمد کے دروازے پر دستک دی تو اس وقت مغرب کی اذان ہورہی تھی۔

میں نے ماسی رحمتے کو جانے کی اجازت دے دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ رحمتے ہی کی زبانی مجھے مسرت کے والد خوشی محمد کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ گاؤں کے مین بازار میں اس کی دودھ دہی کی دکان ہے۔ مین بازار وہاں سے دو گلیوں کے فاصلے پر تھا۔ رحمتے نے مجھے بتایا تھا کہ مسرت کی شادی ہوجانے کے بعد اس گھر میں تین افراد رہ گئے تھے یعنی مسرت کا باپ خوشی محمد، اس کی ماں جمیلہ اور چھوٹا بھائی فواد!

میں اس کیس کے تانے بانے میں اپنے ذہن کو الجھا رہا تھا کہ گھر کا دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے ایک معصوم سی صورت دکھائی دی۔ وہ آٹھ نو سال کا ایک بھولا بھالا بچہ تھا۔ اس بچے سے یہ پوچھنا تو سراسر حماقت ہوتی کہ کیا یہ خوشی محمد کا گھر ہے۔ رحمتے ایسی جہاں دیدہ عورت راہ نمائی کے سلسلے میں کوئی غلطی نہیں کرسکتی تھی۔

''بیٹا! تمہارا ابا کہاں ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''ابا تو اس وقت دکان پر ہوگا!'' وہ سرتاپا گہری نظر سے ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کوئی سوال کرتا، گھر کے اندر سے ایک استفساریہ نسوانی آواز ابھری۔ ''فواد پتر! کون ہے دروازے پر؟''

''اماں..... پولیس آئی اے!'' فواد نامی اس بچے نے اپنی ماں کو جواب دیا۔

''ہائے میں مرجاواں.....'' اسی عورت کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''پولیس.....؟''

میں نے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ نہیں لیا کہ فواد نامی اس بچے نے جس عورت کو اماں کہہ کر مخاطب کیا تھا وہ جمیلہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحے اس عورت کی جھلک دکھائی دی۔ وہ سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے متذبذب لہجے میں مستفسر ہوئی۔

''کیا بات ہے جی..... خیر تو ہے؟''

جمیلہ ایک خوش شکل عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس اور بیالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ پہلے میرے جی میں آئی کہ اسے صورت حال سے آگاہ کردوں لیکن ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔ جمیلہ ایک ماں تھی۔ اس کے سامنے ایسے ناگہانی بم کو پھوڑنا ٹھیک نہیں تھا پھر ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا تھا کہ مجھے جس لڑکی کی لاش ملی تھی، وہ مسرت عرف مسرتی ہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا، مسرتی والا کنگن اس کے پاس ہو اور وہ راضی خوشی موضع ٹانڈا میں زندگی بسر کررہی ہو۔ مجھے لاش کی دائیں کلائی میں سے جو کنگن ہاتھ لگا تھا، وہ انہی دو کے جیسا کوئی تیسرا کنگن ہو! ظاہر ہے، کسی شخص نے وہ دو کنگن بنانے کے لیے تو سانچہ تیار نہیں کیا ہوگا۔ اس سانچے سے اور بھی کنگن بنائے گئے ہوں جن کی خرید و فروخت پر بھی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ اس وقت وہ دونوں کنگن میری جیب میں تھے۔

میں نے جمیلہ کو تشویش بھری نظر سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''سب خیر ہے جمیلہ بی بی! میں تمہارے خاوند سے دو چار باتیں پوچھنے آیا تھا۔ اس بچے نے بتایا ہے کہ خوشی محمد اس وقت دکان پر ہے۔ ٹھیک ہے، میں ادھر جارہی اس سے مل لیتا ہوں۔''

''پولیس دو چار باتیں کرنے کے لیے خواہ مخواہ ہی کسی کے دروازے پر نہیں آتی۔'' وہ بے یقینی کے سے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں!''

''ایسی کوئی بات نہیں بی بی!'' میں نے جمیلہ کی جانب دیکھے بغیر کہا پھر فواد سے مخاطب ہوتے ہوئے اضافہ کیا ''چل کاکا! ہمیں اپنے ابے کی دکان دکھادے۔''

فواد نے ایک لمحے کے لیے سوالیہ نظر سے اپنی ماں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔ میں اس کی نگاہ کے مفہوم کو واضح طور پر سمجھ نہیں سکا، آیا اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ماں سے اجازت مانگی تھی یا اپنے جانے کے بارے میں اطلاع فراہم کی تھی۔ بہرحال، ہم فواد کی معیت میں جلد ہی خوشی محمد کی دکان پر پہنچ گئے۔

اس وقت تک اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ خوشی محمد نے گیس لیمپ روشن کر کے ایک بڑے تھال میں رکھی ہوئی تھی جو گھی والے ایک خالی کنستر پر دھرا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی نے اس کی دکان اور اردگرد کے ماحول کو اجال دیا تھا۔ میں نے بہ آواز بلند ''السلام علیکم'' کہا تو خوشی محمد چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

اس چونکنے کے دو بڑے اسباب تھے۔ نمبر ایک، میں اور کانسٹیبل عارف اس وقت پولیس کی وردی میں تھے۔ اس وردی کی ایک اپنی ہی دہشت ہوتی ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ چونکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ نمبر دو، ہم دونوں پولیس والوں کے ساتھ اسے اپنا چھوٹا بیٹا فواد بھی نظر آ رہا تھا لہٰذا اس کا تشویش میں مبتلا ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔

خوشی محمد نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا ''وعلیکم السلام.....'' پھر وہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''خیریت تو ہے سرکار! آپ نے فواد کو کیوں پکڑا ہوا ہے؟''

میں نے اس کی دہشت کو کم کرنے کی غرض سے مذاق کے رنگ میں دونوں ہاتھ اسے دکھاتے ہوئے کہا ''کہاں پکڑا ہوا ہے؟''

وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔

میں نے فواد کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''کاکا! تیرا کام ہو گیا۔ اب تو نس جا یہاں سے..... جلدی.....'' میں نے چٹکی بجائی۔ ''ٹاٹ.....''

فواد ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نو دو گیارہ ہو گیا۔ خوشی محمد کو جب یقین ہو گیا کہ اس کے بیٹے پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہونے والی تو اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نہایت ہی مناسب الفاظ میں اسے صبح والے واقعے اور اپنی اب تک کی تفتیش کے بارے میں بتایا پھر وہ دونوں کنگن اپنی جیب میں سے برآمد کر کے اسے دکھائے۔ وہ ان کنگنوں کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔

''یہ کنگن تو میری گھر والی نے مسرتی کو خرید کر دیے تھے جن میں سے ایک اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا اور دوسرا کرم دین جٹ کی بیٹی نازو کو تحفے میں دے دیا تھا۔ ان دونوں کڑیوں میں بڑی گہری دوستی ہے لیکن مجھے یقین ہے.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ کو جس لڑکی کی لاش ملی ہے وہ میری مسرتی نہیں ہو گی!''

''تمہیں یہ یقین کیوں ہے خوشی محمد؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ متذبذب انداز میں گویا ہوا ''.....اس لیے..... اس لیے کہ وہ ابھی چار دن پہلے تو یہاں سے بھلی چنگی گئی ہے۔ مجھے پوری امید، میری مسرتی ادھر ٹانڈا میں خیریت سے ہو گی۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو!'' میں نے بے اختیار کہا پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ تمہاری بیٹی کی شادی دو ماہ پہلے ہوئی تھی؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس کی شادی کو دو، سوا دو مہینے ہی ہوئے ہیں۔''

''وہ پچھلے دنوں یہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی تھی؟''

اس نے میرے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیا اور بتایا۔ ''جناب! کوئی ایک ہفتہ پہلے وہ اپنے خاوند انور کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ انور اسے اقبال نگر میں چھوڑ کر اسی دن واپس ٹانڈا چلا گیا تھا۔ مسرتی تین دن ہمارے پاس رہی پھر چار دن پہلے انور اسے اپنے ساتھ ٹانڈا لے کر چلا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے، وہ اپنے خاوند کے گھر میں صحیح سلامت ہو گی۔''

آخری جملہ اس نے بڑے اعتماد سے ادا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے محسوس کر لیا کہ وہ اپنے اندر کسی گہری کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ ایک باپ تھا اور ایک معقول باپ کی طرح اسے ایسی تشویش اور کش مکش میں مبتلا ہونا بھی چاہیے تھا۔ میں نے اس کی حالت کو ذہن میں رکھتے ہوئے محتاط لہجے میں استفسار کیا۔

''خوشی محمد! تم نے بتایا ہے، چار دن پہلے تمہاری بیٹی اقبال نگر سے موضع ٹانڈا روانہ ہو گئی تھی۔ کیا اس کے بعد ٹانڈا کی طرف سے ان میاں بیوی کی خیریت کی کوئی اطلاع موصول ہوئی؟''

''نہیں'' اس نے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور کہنے لگا۔ ''اقبال نگر سے ٹانڈا اور ٹانڈا سے اقبال نگر اکثر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اس طرح یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں خوشی غمی کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں لیکن یہ ایک اتفاق ہے کہ پچھلے چار دنوں میں ایسی کوئی اطلاع اِدھر سے اُدھر نہیں آئی اگر میری بیٹی کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہوتی تو یقیناً یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات ابھی تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی!''

وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا'' آپ جس معاملے کی تفتیش کررہے ہیں اس نے مجھے بڑی پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، کل صبح تڑکے میں ٹانڈا روانہ ہوجاؤں اور مسرتی کی خیر خیریت معلوم کرکے آجاؤں۔ میں نے.....!''

''صبح نہیں، اسی وقت خوشی محمد!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اصراری لہجے میں کہا'' تم فی الفور ٹانڈا جاؤ اور وہاں کے حالات کی خبر لے کر آؤ۔ میں کل صبح تمہیں اپنے سامنے تھانے میں دیکھنا چاہتا ہوں..... مکمل رپورٹ کے ساتھ۔ کیا سمجھے؟''

وہ سر کو کچھ اس انداز میں حرکت دینے لگا جیسے بتانا چاہ رہا ہو، جی میں بڑی اچھی طرح آپ کی بات سمجھ گیا ہوں تھانے دار صاحب۔

میں واپس جانے کے لیے مڑا تو خوشی محمد نے منت ریز لہجے میں کہا'' تھانے دار صاحب! میں آپ کے حکم کے مطابق ابھی ٹانڈا روانہ ہوجاتا ہوں لیکن آپ سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے!''

اس کے شکستہ لہجے کو دیکھتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔

''ہاں بولو..... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا'' اگر آپ مجھے اس لڑکی کی لاش دکھا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

''فوری طور پر تو تمہاری اس خواہش کو پورا کرنا ممکن نہیں خوشی محمد!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' تم ٹانڈا کی رپورٹ کے ساتھ صبح تھانے آجاؤ۔ میں تمہیں خود اپنے ساتھ لے کر اسپتال جاؤں گا اور لاش کی شناخت کرادوں گا۔''

''اسپتال میں!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔'' کیا اس لڑکی کی لاش اسپتال کے مردہ خانے میں رکھی ہے؟''

میں نے اس کی ذہنی الجھن دور کرنے کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے کہا'' نامعلوم مقتولہ دوشیزہ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوایا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کل دوپہر کے بعد ملنے کی امید ہے لیکن اگر تم کل صبح میرے پاس آجاتے ہو تو میں تمہیں سرکاری اسپتال لے جا کر لاش کا چہرہ کروادوں گا۔''

بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ابھی دکان بند کرکے گھر جائے گا، اپنی گھر والی کو صورت حال سے آگاہ کرے گا اور پہلی فرصت میں، میرے حکم کی تعمیل کے لیے ٹانڈا روانہ ہوجائے گا۔

میں نے اسے'' اللہ حافظ'' کہا اور کانسٹیبل عارف کے ساتھ واپسی کی راہ پکڑلی۔ ہماری سائیکلیں چودھری سرور کی حویلی میں کھڑی تھیں۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے حویلی کی جانب بڑھے اگر سائیکلیں ہمارے پاس بھی ہوتیں تو بھی مجھے تھانے جانے سے پہلے چودھری سرور کی حویلی تو جانا ہی تھا۔ چودھری نے بڑی محبت سے مجھے تاکید کی تھی کہ ناز و اور کنگن کے حوالے سے جو بھی حقائق سامنے آئیں، میں اسے ان سے آگاہ کرتے ہوئے تھانے کا رخ کروں۔ چودھری اس کیس میں خصوصی دلچسپی محسوس کررہا تھا۔

کسی کے خلوص اور محبت کا جواب بھی محبت اور خلوص ہی سے دینا چاہیے لہٰذا میں تھانے پہنچنے سے پہلے چودھری سرور سے ایک مختصر سی ملاقات کا خواہاں تھا۔

☆☆☆

سات مئی کی صبح بڑی سنسنی خیز تھی!

میں توقع کررہا تھا، جب میں تیار ہوکر تھانے پہنچوں گا تو خوشی محمد سے ضرور ملاقات ہوگی۔ میری یہ توقع پوری تو ہوگئی مگر بڑے ہی ہنگامہ خیز انداز میں۔ خوشی محمد تھانے کے برآمدے میں بیٹھا میرا انتظار کررہا تھا مگر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کی بیوی جمیلہ اور داماد انور بھی اس کے ساتھ تھے اور ان تینوں کے چہرے بری طرح اترے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ انہیں میرے پاس بھیج دے۔

میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ چکا تو وہ تینوں میرے سامنے موجود تھے۔ میں نے اپنی میز کے آگے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان سے کہا'' آپ لوگ آرام سے بیٹھ جائیں!''

خوشی محمد نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا'' تھانے دار صاحب! بیٹھنے کو چھوڑیں..... آپ ہمیں فوراً اسپتال لے چلیں.....''

ان کے چہروں کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ تو ہو چکا تھا، ادھر ٹانڈا میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے اور یہ بھی توقع تھی، اس گڑبڑ کا تعلق یقیناً مسرت جبیں عرف مسرتی سے ہوگا اور اب خوشی محمد کے لہجے نے میرے اس اندازے کی تصدیق کردی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''خوشی محمد! میں تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں پہلے ٹانڈا کے بارے میں رپورٹ تو دو؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشی محمد کے بجائے انور نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''میری بیوی مسرتی گھر سے غائب ہے جی۔ آپ ہمیں اس لڑکی کی لاش دکھائیں تاکہ.....!''

بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہوگیا۔ اس کی آواز کی شکستگی سے اندازہ ہوتا تھا، اس سے آگے بولنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ مجھے یہ بھانپنے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تینوں توقع کر رہے تھے کل صبح مجھے نہر میں سے جو لاش ملی تھی وہ مسرتی کے سوا کسی اور کی نہیں تھی۔

جمیلہ نے روہانسے لہجے میں کہا ''تھانے دار صاحب! آپ رات کو گھر آئے تھے لیکن آپ نے مجھے اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب تو دیر نہ کریں۔ ہمیں فوراً اسپتال لے چلیں..... ہائے میری بچی.....!''

وہ آنسو بہاتے ہوئے باقاعدہ بین کرنے لگی۔ خوشی محمد کی حالت بھی دگرگوں تھی البتہ، انور نے خود کو بڑی حد تک سنبھال رکھا تھا۔ وہ دکھی اور ملول تو نظر آتا تھا لیکن اس نے اپنے جذبات کو کنٹرول سے باہر نہیں ہونے دیا تھا۔ فوری طور پر صورت حال کے پیش نظر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ انہیں اسپتال لے جاؤں۔ باقی باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی تاہم جمیلہ کی جذباتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے میں نے ان پر واضح کر دیا۔

''میرے ساتھ صرف انور اور خوشی محمد اسپتال جائیں گے!''

جمیلہ کو میرا یہ سخت فیصلہ اگرچہ ہرگز پسند نہیں آیا تھا تاہم میری بات ماننے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا لہٰذا وہ آنسو بہاتے ہوئے خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ میں نے ایک تانگے کا بندوبست کروایا اور انور و خوشی محمد کو اپنے ساتھ لے کر سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہوگیا۔

نامعلوم مقتولہ دوشیزہ کی لاش کو دیکھنے کے بعد اسپتال میں جو کہرام بپا ہوا اس کی تفصیل بیان کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ ایک جملے میں صرف یہ جان لیں کہ اب وہ نامعلوم نہیں رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً ان سسر داماد کو اس لڑکی کا محض چہرہ دکھایا تھا اور چہرے کی ایک مختصر سی جھلک دیکھتے ہی باپ نے بیٹی کو اور شوہر نے اپنی بیوی کو فوراً پہچان لیا تھا۔ وہ ستم نصیب، بدبخت لڑکی کوئی اور نہیں، مسرت جبیں عرف مسرتی ہی تھی۔ اس شناخت کے بعد گویا وہ کیس لگ بھگ آدھا حل ہوگیا تھا۔ اب مجھے اس کے قاتل کو تلاش کرنا تھا۔ میں نے پوسٹ مارٹم شدہ لاش کو واپس رکھوایا اور ان دونوں کو لے کر اسپتال کی انتظار گاہ کی طرف آگیا۔

خوشی محمد کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ جوان اور نوبیاہتا بیٹی کی المناک موت کا غم بڑا دل چیر ہوتا ہے۔ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھرتھر رہا تھا۔ انور کی کیفیت تو اپنے سسر سے بھی زیادہ سخدوش تھی۔ وہ مسرتی کو پکار پکار کر باقاعدہ آہ وزاری کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، وہ اپنی بیوی سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ ابھی ان کی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ دو ماہ کوئی وقت ہوتا ہے بھلا۔ وہ تو ابھی خوشیوں اور مسرتوں کے مفہوم کو بھی ابھی پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہوں گے کہ ان کے درمیان ابدی جدائی کی دیوار اٹھ گئی تھی۔ انور پر ایک جنون سا سوار تھا۔ اس نے ہیجانی انداز میں اسپتال کی پتھریلی دیواروں سے سر ٹکرانے کی کوشش بھی کی تھی تاہم اسپتال کے عملے نے اسے فوراً قابو کر کے اس خود اذیتی سے روک دیا تھا۔ میری ہدایت پر، ایک ڈیوٹی ڈاکٹر کو بلا کر انور کو مسکن انجیکشن دے دیا گیا۔ اسے فوری طور پر کنٹرول کرنے کا کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آتا تھا۔

میں اسپتال کے نگران اعلیٰ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اس سے لڑکی کے پوسٹ مارٹم اور اس کی رپورٹ کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے بتایا، پوسٹ مارٹم کا عمل مکمل ہو چکا ہے، صرف رپورٹ تحریر کرنا باقی ہے۔ جس مخصوص ڈاکٹر نے مسرتی کا پوسٹ مارٹم کیا تھا، وہ ڈیوٹی پر آجاتا تو پھر رپورٹ تیار ہونے میں بمشکل آدھا گھنٹا صرف ہوتا۔ ایڈمنسٹریٹر نے مجھے یقین دلایا کہ آج دوپہر کے بعد لاش ہمارے حوالے کر دی جائے گی۔

میں جب انور اور خوشی محمد کے ساتھ اسپتال کی طرف آرہا تھا تو میں نے ایک کانسٹیبل کو بھی اپنے ہمراہ کر لیا تھا۔ اس کانسٹیبل کو میں نے اسپتال ہی میں تعینات کر دیا تاکہ وہ انور وغیرہ کی دیکھ بھال کرتا رہے اور جب لاش کو ''فارغ'' کیا جائے تو وہ اسے لے کر سیدھا موضع نوشاہی چلا آئے۔ ڈاکٹر سے میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ انور کو جو سکون آور انجیکشن دیا گیا تھا اس کا اثر تین چار گھنٹے میں زائل ہو جائے گا۔ وہ ایک بہت ہی مائیلڈ انجیکشن تھا۔ اس کا مطلب تھا، تین چار گھنٹے کے بعد انور کو ہوش آجانا تھا۔ میں کانسٹیبل سمیت انور اور خوشی محمد کو سرکاری اسپتال میں چھوڑ کر خود تھانے آگیا۔

مسرتی کی ماں جمیلہ ابھی تک تھانے ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جاتی بھی کہاں؟ وہ خوشی محمد کے ساتھ اقبال نگر سے موضع نوشاہی پہنچی تھی۔ میں نے تھانے میں قدم رکھا تو اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ ماں کا دل بڑا حساس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور خبر آشنا ہوتا ہے۔ اسے بہت سی باتوں کا پہلے ہی سے پتا چل جاتا ہے۔ میں جب اسپتال کی طرف جارہا تھا تو اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا تھا، وہ اپنی بیٹی کی موت سے آگاہ ہوچکی ہے!

میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ، نہایت ہی مختصر الفاظ میں جمیلہ کو اس کی بیٹی کے ساتھ پیش آنے والے اندوہ ناک واقعے سے آگاہ کردیا۔ یہ کام اگرچہ بہت ہی مشکل تھا۔ کسی ماں کو اس کی جوان اولاد کی موت کی خبر دینا بڑا دل گردے اور حوصلے کا کام ہوتا ہے تاہم میں اس کٹھن مرحلے سے جیسے تیسے گزر رہی گیا۔

جمیلہ کا اصرار تھا کہ اسے بھی اسپتال پہنچایا جائے۔ ایسے موقع پر وہ اپنے شوہر کے پاس رہنا چاہے گی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دوپہر کے بعد وہ لوگ بھی ادھر ہی آجائیں گے لیکن میری کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بالآخر اس کی ضد سے مجبور ہوکر میں نے اسے بھی اسپتال بھجوا دیا۔

مجھے تھوڑی سی تنہائی میسر آئی تو میں مسرت جبیں عرف مسرتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ مسرتی طبعی موت نہیں مری تھی۔ میں نے اس کی گردن پر ایسے نشانات دیکھتے تھے جن سے پتا چلتا تھا، گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی کہ اس کی موت کس طور واقع ہوئی تھی۔ میرے نزدیک یہ سیدھی سادی قتل کی ایک واردات تھی۔ انور اسپتال سے واپس آجاتا تو میں اس سے مسرتی کی موت کے بارے میں کچھ پوچھتا۔ جمیلہ اور خوشی محمد سے اس سلسلے میں کوئی سوال کرنا فضول ہی ہوتا۔ وہ اگر اس بارے میں کچھ جانتے ہوتے تو خوشی محمد رات ہی کو مجھے بتا دیتا۔ انور کا کہا ہوا ایک جملہ میرے ذہن میں گردش کررہا تھا..... میری بیوی مسرتی گھر سے غائب ہے جی۔ آپ ہمیں اس لڑکی کی لاش دکھائیں تاکہ.....!

''مسرتی گھر سے غائب ہے!'' کے الفاظ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہے تھے۔ مسرتی کی لاش چھ مئی کی صبح کو موضع نوشاہی میں دریافت کی گئی تھی اور اس دریافت کا سہرا رحمو مچھیرے کے سر جاتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی موت کب، کہاں اور کیسے واقع ہوئی؟ ''کب؟'' اور ''کیسے؟'' کا جواب تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے مل جاتا۔ ''کہاں؟'' کا سراغ مجھے لگانا تھا۔ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے ہی میرا ذہن مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اگر مسرتی کا قتل موضع ٹانڈا میں ہوا تھا تو پھر اس کا یہ مطلب تھا کہ اس کی موت رات کے پہلے حصے میں واقع ہوئی ہوگی۔ موضع ٹانڈا اور نوشاہی کے درمیان لگ بھگ آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ لاش نہر میں ''تیرتے'' ہوئے رحمو کے جال تک پہنچی ہوگی..... اور اگر اس بدنصیب کو اقبال نگر کے قرب و جوار میں زندگی کی قید سے آزاد کیا گیا تھا تو پھر اس حساب سے اس کی موت کا وقت نصف شب کا ہونا چاہیے تھا۔ وقت کے حوالے سے میرا ذہن جو حساب جوڑ رہا تھا اس کی بنیاد محض اس بات پر تھی کہ مسرتی کو قتل کرنے کے بعد اگر فوراً حوالہ نہر کردیا گیا ہوگا لیکن اگر صورت حال اس کے بالعکس یا اس سے بالکل مختلف رہی ہو تو نتائج میں بھی فرق آسکتا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں غرق تھا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ حالات جو بھی رہیں، پیٹ کھانا مانگتا ہے۔ جلد یا بہ دیر اسے خوراک کی ضرورت پیش آتی ہے لہٰذا میں بھی پیٹ پوجا میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک کانسٹیبل نے آکر مجھے بتایا کہ خوشی محمد اور اس کی بیوی جمیلہ واپس آگئے ہیں۔

میں نے اطلاع لانے والے کانسٹیبل سے کہا ''ٹھیک ہے، انہیں ادھر برآمدے ہی میں بٹھاؤ اور روٹی پانی کا پوچھو۔ میں تھوڑی دیر بعد انہیں اپنے پاس بلاتا ہوں۔''

کانسٹیبل۔ ''یس سر!'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

میں کھانے کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ دونوں میاں بیوی اپنے داماد کے بغیر ہی واپس کیوں آگئے۔ جمیلہ بڑی ضد کرکے یہاں سے اسپتال کی طرف گئی تھی اور جب میں صبح اسپتال سے واپس آرہا تھا تو میں نے خوشی محمد کو بھی چلنے کے لیے کہا تھا لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کردیا تھا کہ وہ مسرتی کی لاش کے ساتھ ہی واپس آئے گا اور..... وہ دونوں یہاں تھانے میں موجود تھے۔

میں نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ان کے بارے میں پچھوایا تو پتا چلا، وہ بڑی بے تابی سے میرا انتظار کررہے تھے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا، انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔ یہ ان کا ایک عین فطری ردعمل تھا۔ ان پر جتنی بڑی قیامت گزر گئی تھی اس میں نیند اور پیاس بھوک کا اڑ جانا لازمی بات تھی!

میں نے انہیں فوراً اپنے گھر میں بلا لیا اور پوچھا۔ ''آپ لوگوں نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟''

''بس جی، ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔'' خوشی محمد نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

جمیلہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کھانا کیسے ہمارے حلق سے اتر سکتا ہے تھانے دار صاحب! ہماری اکلوتی بیٹی تھی۔ کتنے چاؤ اور ارمانوں سے اسے بیاہا تھا۔ پتا نہیں..... پتا نہیں، کس نامراد کی نظر اسے کھا گئی.....؟'' اس کا گلا رندھ گیا۔

میں رات خوشی محمد پر یہ واضح کر چکا تھا کہ مجھے نہر کے پل کے نزدیک سے جس نامعلوم دوشیزہ کی لاش ملی ہے، اسے باقاعدہ قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے تسلی آمیز لہجے میں ان سے کہا۔

''مجھے آپ کی جوان بیٹی کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ آپ فکر نہ کریں، انشاءاللہ! بہت جلد میں اس کے قاتل کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھجوادوں گا۔''

''اس سے کیا میری مسرتی واپس آجائے گی؟'' جمیلہ نے کچھ اس انداز سے سوال کیا جیسے اس کی بیٹی کے زیاں میں میرا کوئی ہاتھ ہو!

خوشی محمد نے نم ناک لہجے میں کہا ''تھانے دار! اب ہمیں کس بات کی فکر کرنا ہے۔ جب ہماری مسرتی ہی نہیں رہی تو اس کے قاتل کو گرفتار کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا..... کوئی فائدہ نہیں.....!''

دونوں میاں بیوی نے کم و بیش ایک جیسی ہی بات کی تھی لیکن میں ان کے زخمی استفسارات کے جواب میں یہ تفصیل بیان نہیں کر سکتا تھا کہ کسی قاتل کو گرفتار کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ جس جذباتی صدمے سے گزر رہے تھے اس میں انہیں بہلانے کی ضرورت تھی، اس وقت انہیں ہم دردی اور دلاسے کی ضرورت تھی۔ ان کے منتشر ذہن اور بکھرے ہوئے دل دنیا کی سفاک حقیقتوں کو قبول کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہ ہوتے لہٰذا میں نے زمینی حقائق کو ان سے دور رکھا اور پوچھا۔

''تم دونوں کے داماد کا کیا حال ہے؟''

''وہ ٹھیک ہے جناب۔'' خوشی محمد نے جواب دیا۔

''لیکن ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا۔''

جمیلہ نے کہا ''اس بے چارے کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ اب اسے کیا ہوش آئے گا.....!''

میں نے محسوس کیا کہ جمیلہ کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جب بھی بولتی تو ساتھ ہی اس کے آنسو بھی نکل آتے۔ آنسوؤں پر کسے اختیار ہوتا ہے؟ یہ دل پر لگنے والی کسی گہری چوٹ کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور جب تک اس چوٹ کا نشان مندمل نہیں ہو جاتا، انہیں پیدا ہونے سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا۔ میں نے نہایت ہی اپنایت سے کہا۔

''آپ لوگ انور کے ہوش میں آنے کے سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔ وہ نیند آور انجیکشن کے زیر اثر ہے۔ انشاءاللہ! بہت جلد وہ نارمل ہو جائے گا۔ بیوی کی لاش کا چہرہ'' دیکھ کر وہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا اگر اسے شانت کرنے کے لیے انجیکشن نہ دیا جاتا تو وہ خود کو بہت بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس نے بیوی کی موت کا بڑا گہرا اثر لیا ہے۔''

''انور مسرتی سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔'' جمیلہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا ''اب تو صرف تسلیاں اور دلاسے ہی رہ گئے ہیں۔''

میں نے جمیلہ کی بہتری کی خاطر، ایک کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا ''تم انہیں برآمدے کی کسی بینچ پر بٹھا دو..... اور اگر لٹا دو تو زیادہ اچھا ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

''آرام تو اب قبر میں اتر کر ہی ملے گا تھانے دار صاحب!'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

خوشی محمد نے کہا ''دراصل، ہم آپ سے اجازت لینے آئے تھے۔ ادھر اقبال نگر میں ہم، اپنے بیٹے کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر آئے ہیں۔ ٹھیک ہے، اڑوس پڑوس والے اس کا خیال رکھیں گے لیکن وہ اتنا بھی بچہ نہیں کہ اسے حالات کی سنگینی کا اندازہ نہ ہو سکے۔ پورے اقبال نگر میں اس واقعے کی خبر پھیل چکی ہے۔ وہ پریشان ہو رہا ہوگا اس لیے آپ ہمیں گھر جانے دیں تو اچھا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''اسپتال میں انور موجود ہے۔ آپ مسرتی کی لاش کو اسی کے ہاتھ اقبال نگر بھیج دینا جناب..... مجھے گھر جا کر اس کی.....'' جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ آنکھوں کے تیزی سے نم ہوتے گوشوں کو صاف کرنے لگا۔

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ مسرتی کی تدفین کے سلسلے میں ضروری بندوبست کا ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ ایسے مواقع پر زبان گنگ اور الفاظ جامد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کہا جائے کیونکہ خیالات بھی مفلوج ہو چکے ہوتے ہیں۔

میں نے سرسری انداز میں کہا ''ٹھیک ہے، آپ لوگ اقبال نگر جا سکتے ہیں لیکن..... دس منٹ کے بعد!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے بیک وقت چونک کر میری طرف دیکھا، خوشی محمد نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''دس منٹ کے بعد کیوں جناب؟''

''وہ اس لیے کہ.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اگر دس منٹ تک تمہاری بیوی باہر کسی چوبی بینچ پر لیٹ کر آرام کر لے گی تو اقبال نگر تک کا سفر کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اس کی حالت مجھے ٹھیک نظر نہیں آ رہی اور..... انہی دس منٹ میں، میں تم سے چند ضروری باتیں بھی کر لوں گا!''

ضروری باتوں کے ذکر پر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا لیکن کچھ پوچھنے کے بجائے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر کانسٹیبل کی راہ نمائی میں وہ جمیلہ کو سہارا دے کر میرے کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ منتظر نگاہ کے ساتھ ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا تھا۔

اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ خوشی محمد کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سوالات کو میں بخوبی سمجھ رہا تھا۔ میں چند لمحات تک اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر نہایت ہی سنجیدہ انداز میں کہا۔

''خوشی محمد! یہ بات میں نے تمہیں کل شام بھی بتائی تھی کہ لڑکی کو قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا ہے اور اتنی سمجھ تو تم میں ہے کہ کوئی کسی کو بلاوجہ قتل نہیں کرتا۔ مجھے جلد از جلد مسرت جبیں کے قاتل تک پہنچنا ہے اور اس سلسلے میں تم میری راہ نمائی کرو گے؟''

''مم..... میں آپ کی کیا راہ نمائی کر سکتا ہوں تھانے دار صاحب!''

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''خوشی محمد! انور کی شادی دو، سوا دو ماہ پہلے ہوئی ہے اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا۔ یہ کارروائی ان دونوں میں سے کسی کے دشمن کی ہی ہو سکتی ہے!'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ گے، ادھر ٹانڈا میں انور کی کس سے دشمنی ہے؟''

''انور تو بہت ہی اچھا انسان ہے جناب!'' خوشی محمد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اس کی تو سب سے دوستی ہے، دشمنی کسی سے نہیں۔''

''میں یہ نہیں مان سکتا خوشی محمد!'' میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں وہاں کوئی ایک آدھ دشمن بھی موجود ہوتا ہے؟''

وہ بے بسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!''

''اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جی..... میں سمجھا نہیں!''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنے دشمنوں کا تو بخوبی علم ہو گا نا۔ ممکن ہے، اس دشمنی کا اثر تمہاری بیٹی پر پڑا ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ پورے تیقن سے بولا۔

میں نے ایک اور امکانی سوال کیا ''مسرتی کی شادی پر کوئی تم سے ناراض تو نہیں تھا؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو جلدی سے وضاحت کر دی۔ ''خوشی محمد! دراصل میں یہ جاننا چاہتا ہوں، اقبال نگر میں کوئی اس بات پر ناخوش تو نہیں تھا کہ مسرتی کی شادی انور سے کیوں ہو رہی ہے؟''

''نہیں جی، بالکل نہیں!'' وہ قطعیت سے بولا ''پورے گاؤں نے مسرتی کی شادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ہر کوئی بہت خوش تھا۔ سب مجھے مبارک بادیں دے رہے تھے.....''

میں نے اس کی بات مکمل ہونے پر پوچھا۔ ''اور ادھر ٹانڈا کی کیا صورت حال تھی؟ کیا وہاں بھی سب لوگ انور کی مسرتی سے شادی پر خوش تھے؟''

''میں وہاں کے ایک ایک بندے کے دل کا حال تو نہیں جانتا تھانے دار صاحب!'' خوشی محمد نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن ایسی کوئی ناپسندیدگی دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔''

میں نے زاویہ سوالات کو تبدیل کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم جب کل رات ٹانڈا پہنچے تو وہاں کی کیا صورت حال تھی؟''

''جب میں وہاں پہنچا تو انور گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔'' خوشی محمد نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے پوچھا، تم رات کو کہاں جا رہے ہو؟ اس نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا کہ وہ اقبال نگر ہی آ رہا تھا۔ میں آپ کی زبان سے ایک بری خبر سننے کے بعد گھر سے نکلا تھا، جب انور کے انداز میں بھی گڑبڑ محسوس کی تو میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا، خیریت تو ہے انور! تم اس افراتفری میں کیوں ہو؟ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ وہ صبح مسرتی کو صبح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلامت گھر میں چھوڑ کر چک چونتی (چونتیس) گیا تھا۔ جب شام میں وہ واپس ٹانڈا پہنچا تو مسرتی گھر میں موجود نہیں تھی۔ اس نے اڑوس پڑوس حتیٰ کہ گاؤں کے ایک ایک بندے سے اپنی بیوی کے بارے میں پوچھ لیا لیکن کسی کو مسرتی کے بارے میں کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ٹانڈا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، بمشکل بیس پچیس گھر ہوں گے۔ اس تلاش و جستجو میں انور کی مسرتی تو کہیں نہ ملی مگر پورے گاؤں کو اس بات کی خبر ہوگئی کہ انور کی گھر والی اچانک غائب ہوگئی ہے۔ اس صورت حال نے انور کو اور بھی پریشان کر دیا۔ ہر کوئی اس کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے پوچھ رہا تھا..... انور! تمہاری نئی نویلی بیوی کہاں چلی گئی؟ جب نکیلے اور چبھتے ہوئے سوالات کا یہ سلسلہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تو اس نے اقبال نگر آنے کا فیصلہ کرلیا.....''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''وہ گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ میں وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسے اقبال نگر اور موضع نوشاہی کی۔ ''صورت حال'' سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے ٹانڈا کے تازہ ترین اور پریشان کن ''حالات'' کی خبر دی..... پھر ہم پہلی فرصت میں اقبال نگر آگئے۔ رات اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ آپ کے پاس نوشاہی اس وقت نہ آسکے۔ رات کے باقی حصے میں ہم نے ہر، دل دکھانے والے زاویے پر بات چیت کی اور صبح کی اذان کے بعد ہم گھر سے نکل آئے۔ ابھی سورج طلوع ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ہم نوشاہی پہنچ گئے۔

خوشی محمد نے طویل وضاحتی بیان ختم کیا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے حالات کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ باتیں اسے انور کی زبانی پتا چلی تھیں۔ ٹانڈا میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جاننے کے لیے انور کا ایک بھرپور ''انٹرویو'' بہت ضروری تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ ہوش میں آجاتا!

میں نے خوشی محمد سے دو چار ضمنی سوالات کیے اور ان میاں بیوی کو اقبال نگر جانے کی اجازت دے دی۔ انہیں تھانے سے نکلے بمشکل آدھا گھنٹا ہوا ہوگا کہ انور وہاں پہنچ گیا۔ اسے نور امیرے پاس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

میں نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''انور! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں جی۔'' وہ کم زور سے لہجے میں بولا ''اب برداشت تو کرنا ہی ہوگا نا!''

وہ صبح کی بہ نسبت بڑی حد تک سنبھلا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اس نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت جلد حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ بعض لوگ واقعی ایسے مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں جنہیں ہنگامی حالات سے باہر نکلنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں کسی صدمے سے سنبھلنے کے لیے ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے۔

''تم تو ادھر اسپتال میں تھے!'' میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھایا۔ ''وہاں کی کیا خبریں ہیں؟''

''اسپتال کا عملہ اچھا نہیں ہے!'' وہ قدرے برہمی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیوں..... تم ایسی بات کیوں کر رہے ہو؟''

''میں نے ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لیے ان سے کہا۔'' وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن انہوں نے میری بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ وہاں آپ کا سپاہی بھی موجود تھا۔ میں نے منت کر کے اس سے سفارش کرانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک نہیں سنی۔ صرف اتنا کہتے ہوئے بات ہی ختم کر دی..... یہ ناممکن ہے!''

وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو کوئی اصول نہ ہوا جی۔ میں مسرتی کا خاوند ہوں، اس کا محرم ہوں اور وہ مجھے ہی اس سے ملنے نہیں دے رہے تھے تنگ آکر میں نے پوچھ لیا، وہ پوسٹ مارٹم شدہ لاش کب دیں گے؟ انہوں نے بڑی رکھائی سے جواب دیا، یہ ہم تمہیں نہیں بتا سکتے۔ تم تھانے سے لاش وصول کرلینا۔'' وہ لمحے بھر کو دوبارہ متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے آخر کار یہی فیصلہ کیا کہ جب وہ میری کوئی بھی بات ماننے کو تیار نہیں ہیں تو پھر اسپتال میں پہرا لگا کر بیٹھنے کا کیا فائدہ۔ تھانے چل کر خوشی محمد اور جمیلہ چاچی کا دکھ ہی بٹاتا ہوں..... لیکن وہ دونوں مجھے یہاں کہیں نظر نہیں آرہے؟'' وہ بات ختم کرتے ہی سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے اور سمجھانے والے انداز میں، اس کے تمام سوالات کے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو انور! اسپتال والوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے اور نہ ہی انہوں نے تمہیں کسی برے سلوک سے گزارہ ہے۔ انہوں نے وہی کیا ہے جو ان کا فرض بنتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر غور سے تم اپنے حالات کا جائزہ لے لو تو تمہیں اچھی طرح یہ محسوس ہو جائے گا کہ تم مسرتی کے خاوند تھے، اب نہیں ہو اور یہ کہ اس کی موت طبعی نہیں ہوئی بلکہ اسے باقاعدہ قتل کرنے کے بعد نہر میں پھینکا گیا ہے لہٰذا اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوایا گیا۔ آج صبح میں تمہارے ساتھ تھا اس لیے میری درخواست پر انہوں نے تمہیں لاش کے چہرے کے ایک حصے کی جھلک دکھا دی تھی ورنہ یہ بھی ممکن نہیں تھا۔'' میں لمحے بھر کو خاموش ہوا، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور جہاں تک خوشی محمد اور جمیلہ کا تعلق ہے تو وہ دونوں مجھ سے اجازت لے کر اقبال نگر گئے ہیں۔ جب مسرتی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تھانے آ جائے گی تو میں لاش کی وصولی کے لیے انہیں یہاں بلوا لوں گا۔''

وہ یک لخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے استفسار کیا ''کیا ہوا انور؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بددلی سے بولا ''میں بھی اقبال نگر ہی جا رہا ہوں۔ جب چاچا خوشی محمد اور چاچی جمیلہ نہیں ہیں تو میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا؟''

اس کا یہ فوری ردعمل ٹھنڈا کر دینے والا تھا اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں ضرور اس پر جرح کرتا لیکن اسے پیش آنے والے سانحے سے بخوبی آگاہ تھا اور اسپتال میں اس پر طاری ہونے والی جنونی کیفیت کو میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ بیوی کی ابدی جدائی نے اس کے ذہن کی رو کو بری طرح متاثر کیا تھا لہٰذا میں نے اسے الاؤنس دیتے ہوئے ہاتھ ہولا رکھا اور کہا۔

''انور! تمہیں اقبال نگر جانے سے کوئی نہیں روک رہا لیکن اس سے پہلے میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ تم دس پندرہ منٹ کے لیے بیٹھ جاؤ تو اچھا ہوگا!''

میرے لہجے میں شامل سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے لمحے بھر کو کچھ سوچا پھر جس میکانکی انداز میں وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا، ویسے ہی ایک جھٹکے سے بیٹھ بھی گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''انور! میری تجربہ کار اور جہاں دیدہ آنکھیں کہتی ہیں کہ تمہاری بیوی کو کسی نے قتل کر کے نہر میں پھینک دیا تھا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، تمہارا ایسا سنگ دل اور سفاک دشمن کون ہو سکتا ہے؟''

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے مستفسر ہوا ''آپ کس بنا پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ مسرتی کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ بات آپ نے پہلے بھی کی ہے؟''

میں نے کہا ''میں نے مسرتی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوانے سے پہلے اپنی تجربہ کار آنکھوں کے سامنے سے گزارہ تھا۔ میں نے اس معائنے میں مسرتی کی گردن پر، بڑے واضح انداز میں چند ایسے نشانات بنے دیکھے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے، اس کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ تم دیکھ لینا، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اس تجرباتی تجزیے کی تصدیق کر دے گی!''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے یقین دہانی کروانے والے انداز میں کہا ''اب تم میرے سوال کا جواب دو، یہ کارنامہ تمہارے کس دشمن کا ہو سکتا ہے؟''

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا ''جناب! میرا ایسا تو کوئی دشمن نہیں ہے!''

بات ختم کرتے ہی وہ اس انداز میں اِدھر اُدھر نگاہ گھمانے لگا جیسے اسے جانے کی جلدی ہو۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''انور! یہی سوال میں نے تمہارے سسر خوشی محمد سے بھی پوچھا تھا۔ اس کا جواب بھی تم سے ملتا جلتا ہے لیکن یہ تو تم بھی مانو گے کہ کوئی خواہ مخواہ کسی کو قتل نہیں کرتا۔ تمہاری بیوی کو جس نے بھی موت سے ہم کنار کیا ہے وہ یا تو تمہارا دشمن ہے اور یا پھر خوشی محمد کا..... تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''میں نے بتایا ہے نا جی.....'' وہ پریشان کن انداز میں بولا ''میں اپنے ایسے کسی دشمن سے واقف نہیں ہوں جو اس حد تک جا سکتا ہو..... اور جہاں تک چاچا خوشی محمد کا تعلق ہے'' وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا، ایک اچٹتی سی نگاہ کمرے کے دروازے پر ڈالی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''چاچا خوشی محمد بھی ایک سیدھا سادہ اور شریف آدمی ہے۔ میں نے آج تک اسے کسی شخص سے لڑائی جھگڑا کرتے نہیں دیکھا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ کوئی اس کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے بہ آہستگی کہا ''انور! اسی نوعیت کے خیالات اور جذبات کا اظہار خوشی محمد نے تمہارے لیے کیا ہے۔ لگتا ہے، تم داماد سسر میں بڑی محبت اور ہم آہنگی ہے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''واقعی چاچا خوشی محمد میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ وہ میرا سگا چاچا تو نہیں لیکن سگوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میں اسے اپنا بزرگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مانتا ہوں اور اپنے باپ کی طرح اس کا احترام کرتا ہوں۔''

پھر اس نے مناسب الفاظ میں مجھے بتایا کہ وہ والدین ایسی نعمت سے محروم تھا۔ خوشی محمد نے اس کے لیے کبھی اپنی شفقت کم نہیں ہونے دی۔ بہت سے لوگوں نے اسے منع کیا تھا کہ مسرتی کی شادی مجھ سے نہ کرے لیکن اس نے کسی کی نہیں مانی اور یہ شادی ہوگئی۔ اتنا اچھا سلوک تو اپنے سگے بھی نہیں کرتے!

اسکی ایک بات نے مجھے چونکا دیا اور میں ذہن میں ابھرنے والے سوال کو اس کے سامنے لائے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تم نے کیا بتایا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس شادی کی مخالفت کی تھی؟''

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجایش تلاش کرنا ممکن نہیں تھا کہ مسرتی کو قتل کیا گیا تھا۔ اب یہ بھی طے تھا کہ ایسا کام یا تو انور کا کوئی دشمن کرسکتا تھا یا مسرتی کا اور یا پھر ان دونوں کی شادی کا کوئی دشمن۔ ابھی ابھی انور نے کچھ اس انداز کی بات کی تھی کہ میرا چونک جانا لازم ہوگیا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''وہ تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں کنوارا نہیں تھا۔ چند سال قبل میری شادی ہوئی تھی جو کسی بھی وجہ سے ناکامیاب ہوگئی اسی بات کو بنیاد بنا کر لوگ خوشی محمد کو مشورے دے رہے تھے کہ مسرتی کو ایک سے ایک رشتہ مل جائے گا۔ وہ مجھ سے کیوں اس کی شادی کررہا ہے۔ میں نے اسی مخالفت کی بات کی ہے، آپ اسے دشمنی وغیرہ نہ سمجھیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا، ایک گہری سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں کو بھرا اور دھیرے دھیرے سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! ویسے اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مسرتی کو ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ مل سکتا تھا۔ یہ تو چاچا خوشی محمد کی محبت اور مہربانی ہے کہ اس نے میرے حق میں فیصلہ کیا لیکن.....'' اس کی آواز بوجھل ہونے لگی، شکستہ لہجے میں بات مکمل کرتے ہوئے بولا ''.....لیکن میں ہی بدقسمت ثابت ہوں کہ مسرتی کا پائے دار ثابت نہیں ہوا..... وہ..... وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔''

وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو بڑے اضطراری انداز میں کھول بند کرنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے دوبارہ اس پر وہی جنونی کیفیت طاری ہونے والی ہے۔ ذہن میں ایک خیال تو یہ آیا کہ میں سوالات کے سلسلے کو موقوف کر کے اسے جانے دوں لیکن پھر ایک دوسرے پیشہ ورانہ خیال نے پہلے خیال کا سر کچل دیا۔ ابھی انور سے بہت کچھ پوچھنا باقی تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں قاتل تک راہ نمائی کرنے والے راستے پر قدم رکھنے ہی والا ہوں۔ یہاں سے واپس پلٹنا درست نہیں تھا۔

میں چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے انور کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب مجھے ایسا لگا کہ وہ جنونی کیفیت کی جانب بڑھنے کے بجائے نارمل ہورہا ہے تو میں نے ملائم لہجے میں اس سے پوچھا۔

''انور! تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ شادی سے پہلے بھی تمہارا خوشی محمد کے گھر آنا جانا تھا۔ تم لوگوں کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ وہ تمہارے بارے میں اور تم ان کے بارے میں چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی واقف تھے۔ تمہاری ہی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ مسرتی کے لیے ایک سے ایک رشتہ موجود تھا!''

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، وہ اب بالکل نارمل ہوچکا تھا لہٰذا بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے پوچھا ''انور! ذرا سوچ کر بتاؤ، مسرتی کے لیے کسی اور کا رشتہ بھی آیا تھا جو خوشی محمد نے منظور نہ کیا ہو؟''

''اس سلسلے میں مجھے زیادہ تو پتا نہیں۔'' وہ سوچنے والے انداز میں بولا ''لیکن سنا ہے، مشتاق مسرتی سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے باقاعدہ رشتہ بھی بھیجا یا نہیں، اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔''

میرے تجسس کو قدرے اور ہوا ملی۔ میں نے پوچھا ''یہ مشتاق کون ہے؟''

دراصل، مجھے کسی بھی ایسے شخص کی تلاش تھی جس کی مسرتی یا انور سے کوئی عداوت ثابت ہوتی ہو۔ اس نکتے تک پہنچے بغیر میں مسرتی کے قاتل کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا اور..... جب تک قاتل مجھے نہ چڑھ جاتا، یہ کیس حل نہیں ہوسکتا تھا۔ انور نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مشتاق ادھر اقبال نگر ہی کا رہنے والا ہے۔ سنا ہے، اس کا باپ طفیل احمد زمیں دارا کرتا ہے۔ یہ لوگ خاصے آسودہ حال اور کھاتے پیتے ہیں۔''

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں خوشی محمد اور اس کے گھر کی حالت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس نے اگر ایک خوشحال زمیں دار کے بیٹے کا رشتہ منظور نہیں کیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی۔ میں نے انور سے پوچھ لیا۔

''کیا طفیل احمد کے بیٹے میں کوئی بڑا عیب تھا جو خوشی محمد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے رشتے سے صاف انکار کر دیا۔ میرا مطلب ہے، کیا مشتاق لولا لنگڑا تھا یا گونگا بہرا؟''

''اس میں کوئی جسمانی عیب تو نہیں تھا جناب!'' انور نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بتایا ''لیکن سننے میں آیا ہے کہ اس کا کردار تسلی بخش نہیں تھا۔ وہ ایک بگڑا ہوا اور آوارہ آدمی ہے۔ اس کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے ہی خوشی محمد نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔''

''ہوں.....!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''اگر مشتاق کے ایسے کرتوت ہیں تو خوشی محمد نے اسے اپنا داماد نہ بنانے کا فیصلہ کر کے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔''

انور نے میری بات سنی اور ایک مرتبہ پھر اس انداز میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا جیسے اسے جانے کی بہت جلدی ہو۔ میں نے اپنے ذہن میں ''مشتاق'' کے نام پر ایک سرخ دائرہ لگایا اور انور سے سوال کیا۔

''مجھے تمہارے چاچا سسر نے بتایا ہے کہ کل صبح تم اپنی بیوی کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر چک چونتیس چلے گئے تھے اور شام کو جب واپس آئے تو مسرتی گھر میں موجود نہیں تھی۔ اس کے بعد ہی تم اسے اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ کیا تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں رہتا؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ''والدین کے انتقال کے بارے میں، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ پہلے تو میں بالکل ہی اکیلا تھا۔ شادی کے بعد مسرتی میری زندگی میں آ گئی۔ ہم دونوں کے سوا اس گھر میں اور کوئی نہیں رہتا تھا اور اب..... پھر مجھے تنہا ہی رہنا ہوگا.....!''

آخری جملہ اس نے گلوگیر آواز میں ادا کیا تھا۔

میں نے پوچھا ''انور! آج سات تاریخ ہے۔ پچھلے دن چھ مئی تھی۔ تم کل کتنے بجے گھر سے نکلے تھے؟''

''میں کل ناشتا وغیرہ کر کے ہی گھر سے روانہ ہوا تھا۔'' اس نے بتایا ''اور مسرتی سے کہا تھا، شام سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔ اس نے کہا، مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں نے کہا، یہ مناسب نہیں۔ میں وہاں اپنے ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں اگر اکیلے گھر میں تمہیں ڈر محسوس ہو رہا ہے تو تمہیں اقبال نگر چھوڑتا ہوا جاتا ہوں۔ وہ بولی، ڈر والی کوئی بات نہیں۔ میں ابھی چار دن پہلے ہی تو اقبال نگر سے واپس آئی ہوں۔ اتنی جلدی جلدی میکے جانا اچھا نہیں لگتا۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ، میں رہ لوں گی اور میں بے فکر ہو کر چلا گیا تھا.....'' جملہ نامکمل چھوڑ کر وہ گمبھیر انداز میں خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے افسردگی ٹپکتی تھی۔

میں نے استفسار کیا ''تم کون سے چک چونتیس گئے تھے؟''

میری معلومات کے مطابق، اس ضلع میں دو ''چک چونتیس'' تھے۔ انور نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں چک چونتی شمالی گیا تھا۔''

''وہاں تم اپنے کس دوست سے ملنے گئے تھے؟''

''میرے دوست کا نام چودھری صغیر گھمن ہے۔''

''کیا یہ صغیر گھمن اس بات کی گواہی دے گا کہ تم چھ مئی کو اس سے ملنے چک چونتیس شمالی گئے تھے جو موضع ٹانڈا سے دس میل کے فاصلے پر شمال میں واقع ہے؟''

''کیوں نہیں گواہی دے گا جناب!'' وہ متاثرانہ انداز میں بولا ''صغیر گھمن میرا دوست ہے اور میں واقعی اس سے ملنے گیا تھا۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''آپ مجھ سے اس قسم کے بے اعتباری والے سوال کیوں پوچھ رہے ہیں جناب؟''

''بات اعتبار اور بے اعتباری کی نہیں ہے انور'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''شاید تمہیں معلوم نہیں، پولیس کی تفتیشی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ میں تو سیدھا سیدھا تمہاری بیوی کے قاتل تک پہنچنا چاہتا ہوں اس لیے ہر شخص کو ہر ہر زاویے سے گھس کر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ مجھے کوئی ایسا اشارہ مل جائے جس کا ہاتھ تھام کر میں قاتل کی گردن تک پہنچ سکوں۔ میرے ان تفتیشی سوالات سے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو تمہارا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔'' میں نے سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم دیکھ لینا، میں مشتاق اور صغیر گھمن سے بھی اسی قسم کے سوالات کروں گا اور ہر اس شخص سے بھی جو میری تفتیش کے راستے میں آئے گا۔''

وہ یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ''تم نے چک چونتیس تک جانے کے لیے سواری کون سی استعمال کی تھی؟''

''میں اپنے مشکی گھوڑے پر بیٹھ کر وہاں گیا تھا۔''

مزید چند سوالات کے بعد میں نے انور کی جان چھوڑ دی۔ اس نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے اجازت طلب لہجے میں مجھ سے پوچھا ''اب تو میں جا سکتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں نا؟''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے، تم چلے جاؤ مگر اقبال نگر میں موجود رہنا۔ جیسے ہی تھانے سے کوئی پیغام پہنچے، اپنے ساس سسر کے ساتھ تم بھی یہاں آجانا۔''

''پیغام.....!'' اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''پیغام سے میری مراد ہے، کوئی اہم اطلاع۔ مسرتی کی لاش جیسے ہی اسپتال سے یہاں آئے گی، میں تم لوگوں کو مطلع کر دوں گا۔ تم لاش وصول کرنے کے لیے میرے پاس آجانا۔''

بات سمجھ میں بیٹھ جانے کے بعد وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی شدت سے میرا شکریہ ادا کرنے لگا پھر مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ وہ میرے کمرے سے کچھ اس تیزی سے نکلا تھا جیسے برسوں کے قیدی کو یکا یک رہا کر دیا گیا ہو!

میں نے اپنی سوچ کو دوبارہ مقتولہ مسرتی پر مرکوز کر دیا۔

مقتولہ کے شوہر انور نے کسی آوارہ مشتاق کا ذکر کر کے میری سوچ کو جلا بخش دی تھی۔ وہ مسرتی کے ایک امیدوار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا تھا اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ خوشی محمد نے اس امیدوار کی درخواست کو یک سر مسترد کر دیا تھا۔ منتخب ہونے کا کوئی بھی خواہش مند یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اسے یوں ٹھکرایا جائے اور خاص طور پر اگر وہ امیدوار مقابلتاً طاقت ور بھی ہو تو پھر اپنی ناکامیابی کو آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔ مشتاق تو نہ صرف یہ کہ ایک طاقت ور اور صاحب حیثیت شخص کا بیٹا تھا بلکہ وہ خاصا بگڑا ہوا بھی تھا۔ ''یہ کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا'' والی صورت حال تھی!

میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس مشتاق کو تھانے بلا کر اس سے کڑی پوچھ گچھ کروں گا۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک اور نام بھی چمک رہا تھا اور..... وہ نام تھا، کرم دین جٹ کی بیٹی نازو کا۔ نازو، مقتولہ مسرتی کی سب سے زیادہ گہری سہیلی تھی۔ مشتاق کے بارے میں اس سے بھی بڑی مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ میں نے محسوس کیا، ایک مرتبہ پھر مجھے ''اقبال نگر'' کے دورے پر جانا ہو گا..... مگر یہ ''دورہ'' پوسٹ مارٹم کے نتائج سامنے آنے سے پہلے ممکن نہیں تھا!

بہت سی باتیں اچانک مل کر ایک ساتھ چلنے لگی تھیں جن میں سے بعض تو روز روشن کی طرح عیاں تھیں اور بعض وضاحت طلب۔ اس روز بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر مسرتی کی لاش اسپتال سے نہ آسکی لہٰذا یہ معاملہ آئندہ روز پر ٹل گیا۔ میں اس کیس کو ذہن میں رکھتے ہوئے معمول کی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم رپورٹ گویا ایٹم بم کا دھماکا تھا!

آٹھ مئی کی صبح میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اسپتال سے مسرتی کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش آگئی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو فوراً اقبال نگر روانہ کر دیا تاکہ وہ مقتولہ کے والدین اور شوہر کو لاش کی ''آمد'' کی اطلاع دے دے۔ اس کے بعد میں رپورٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔ میں سطر سطر جیسے آگے بڑھ رہا تھا، میرے ذہن میں گویا پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں تاہم ان پھلجھڑیوں میں بارودی دھماکوں ایسی وحشت ناک گونج شامل تھی۔

اس سنسنی خیز رپورٹ کے مطابق مقتولہ دوشیزہ مسرت جبیں عرف مسرتی کی موت پانچ مئی کو رات کے ابتدائی حصے میں واقع ہوئی تھی۔ موت کے وقت کا تعین رات نو اور دس بجے کے درمیان کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں درج تھا کہ مقتولہ کو حالت نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ موت کے سبب کے سلسلے میں بیان کیا گیا تھا کہ مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کیا گیا تھا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ پوسٹ مارٹم کی یہ رپورٹ میرے اندازوں کی ترجمانی کر رہی تھی لیکن اس کے بعد جو قیامت خیز انکشاف کیا گیا تھا اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتولہ مسرتی تین ماہ کی حاملہ تھی!

میں نے اس سطر کو کوئی دس بار پڑھا لیکن اس کے معنی اور مفہوم میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ ''ہنڈسے'' کو تحریر کرتے ہوئے کوئی سہو ہو گیا ہو۔ جہاں ''تین'' کا ہندسہ درج تھا، وہیں بریکٹ میں باقاعدہ ''تھری'' کی اسپیلنگ بھی موجود تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ رپورٹ تیار کرنے والے سے کہیں کوئی غلطی نہیں ہوئی، مقتولہ واقعی تین ماہ کی حاملہ تھی۔

میرا ذہن اس ہولناک انکشاف پر گھوم کر رہ گیا تھا۔ مصدقہ معلومات اور اطلاعات کے مطابق مقتولہ کی شادی دو، سوا دو ماہ پہلے ہوئی تھی پھر..... یہ کیوں کر ممکن تھا؟

یہ ''کیوں کر'' ایک ایسا خطرناک سوال تھا جو سوچ کر زہر آلود کرتا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ یہ خیالات کی ان تاریک گلیوں میں دوڑاتا تھا جہاں قدم قدم پر شرم سے نگاہ جھک جاتی ہو۔ انسان آگے بڑھنے کے بجائے سچے دل سے یہ دعا مانگنے لگے کہ زمین شق ہو جائے اور وہ زمین اوڑھ کر اپنا چہرہ، لوگوں کی گھورتی، چھیدتی نگاہوں سے چھپا لے۔ یہ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسا مقام ہوتا ہے جب انسان زندہ رہنے پر، موت کو ترجیح دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے!

میرے ذہن نے فوراً ایک فیصلہ کر لیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں کوئی غلطی نہیں تھی بلکہ غلطی تو مسرتی سے ہوئی تھی!

اس فیصلے پر پہنچتے ہی میرے ذہن میں مقتولہ کے شوہر انور کا نام گھومنے لگا۔ اس نے مجھے جو ''انٹرویو'' دیا تھا وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ انور نے مجھے بتایا تھا، چھ مئی کی صبح وہ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اپنے مٹکی گھوڑے پر سوار ہو کر کسی چودھری صغیر گھمن نامی دوست سے ملنے چک چونتیس شمالی چلا گیا تھا۔ اس کے بیان کی رو سے اس وقت تک مسرتی زندہ اور خوش باش تھی اور بڑے خوش گوار انداز میں مقتولہ نے اپنے شوہر کو رخصت کیا تھا مگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی تھی، چھ مئی کا سورج اسے دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوا تھا، اسے پانچ مئی کی رات نو اور دس بجے کے درمیان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ مجھے مقتولہ کی لاش، رحمو مچھیرے کے توسط سے چھ مئی کی صبح کو ملی تھی۔ اس کا مطلب تھا، پانچ مئی کی رات نو دس بجے سے لے کر چھے مئی کی صبح تک مقتولہ کی لاش نہر کے پانی کے ساتھ ساتھ ''تیرتی'' رہی تھی اگر وقت کا حساب جوڑا جاتا تو بڑے وثوق سے یہ کہا جا سکتا تھا، مقتولہ کی لاش کو موضع ٹانڈا کے مقام سے نہر برد کیا گیا تھا۔ اس تناظر میں انور کا بیان بوگس اور باطل ہو جاتا تھا۔

اب سب سے اہم سوال یہ ابھر کر سامنے آتا تھا کہ انور نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟

جب کوئی شخص غلط بیانی کرتا ہے، دروغ گوئی سے کام لیتا ہے تو اس کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ اپنے جھوٹ سے وہ کوئی نہ کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور عام طور پر، یہ فائدہ کسی نقصان سے بچنے کی شکل میں ہوتا ہے۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ انور کو اس دروغ گوئی سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا یا اس نے کس ممکنہ نقصان سے بچنے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا تھا؟

میرے ذہن نے فوراً سے پیش تر اس سوال کا جواب پیش کر دیا اور..... وہ جواب بڑا تہلکہ خیز تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، انور کسی ایسے جرم میں ملوث تھا جس کا مقتولہ مسرتی سے گہرا تعلق تھا!

یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں سرکاری اسپتال کا منظر گھوم گیا جب انور، مسرتی کی دائمی جدائی میں اسپتال کی سنگلاخ دیواروں سے سر ٹکرا رہا تھا۔ میں تازہ ترین صورت حال کی روشنی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ انور نے اسپتال میں اور ازاں بعد تھانے میں میرے سامنے بڑی بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

خوشی محمد اقبال نگر سے اپنی بیٹی کی لاش وصول کرنے آیا تو اس کے ساتھ گاؤں کے دو تین اور افراد بھی شامل تھے لیکن میری متلاشی نگاہ جس چہرے کو ڈھونڈ رہی تھی وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں خوشی محمد سے پوچھ لیا۔

''خوشی محمد! تمہارا داماد نظر نہیں آ رہا؟''

''وہ جی، آج صبح ٹانڈا گیا ہے!'' خوشی محمد نے جواب دیا۔

''وہ ٹانڈا کیوں چلا گیا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ''میں نے اسے تاکید بھی کی تھی، وہ اقبال نگر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے اور..... اپنی بیوی کی لاش وصول کرنے کے لیے تمہارے ساتھ تھانے آئے!''

خوشی محمد نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''وہ بات یہ ہے جناب..... کہ ہم توقع کر رہے تھے کل ہمیں لاش مل جائے گی۔ میں نے تو کل یہاں سے جاتے ہی قبرستان میں مسرتی کے لیے ایک قبر.....'' اسے بولنے میں دشواری محسوس ہونے لگی تو جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا پھر بڑی زخمی نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں اس کی مجبوری اور معذوری کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک باپ تھا، اولاد کے لیے اس کے سینے میں ایک حساس دل دھڑک رہا تھا۔ اپنی بیٹی مسرتی کی موت اور تدفین کے ذکر نے گویا اس کا گلا ''گھونٹ'' دیا تھا۔ الفاظ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں مجھے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا!

میں نے اس سے کوئی سوال نہ کیا، خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا اور اس انتظار میں رہا کہ وہ جذبات کے ریلے سے نکل کر ذرا خود پر قابو پا لے۔ مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''..... جب کل رات تک بھی آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تو انور کہنے لگا کہ وہ صبح ہی صبح ٹانڈا چلا جائے گا تاکہ وہاں کے لوگوں کو بھی اس اندوہ ناک واقعے کی خبر دی جا سکے۔ اس نے وعدہ کیا تھا، وہ آج دوپہر تک واپس آ جائے گا۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور کسی جرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ''خطرناک پہلوؤں'' سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دکھی شخص تھا، ایک ایسا باپ جس کے اعصاب ٹوٹ چکے ہوں اور جذبات بکھر گئے ہو۔ جس باپ کی محدود اور مختصر خوشیوں کا کانچ محل ریزہ ریزہ ہوکر اس کے اپنے دل و جگر ہی میں پیوست ہو جائے، اس سے حساس موضوع پر بات کرنے سے احتراز برتنا چاہئے، تاوقت یہ کہ وہ جذباتی صدمے سے کلی طور پر باہر نہ آجائے!

میں نے ضروری قانونی کاغذی کارروائی مکمل کر کے مقتولہ مسرتی کی لاش خوشی محمد کے حوالے کر دی پھر جب وہ تھانے سے جانے لگا تو میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کے حوالے سے اسے صرف اتنا بتایا۔

''خوشی محمد! میرا یہ شک سچ ثابت ہو گیا ہے کہ تمہاری بیٹی کو باقاعدہ قتل کر کے نہر میں پھینکا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مسرتی کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی ہے!''

وہ جذبات سے لب ریز کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ''کک.....کون ہے وہ مردود.....جس نے میری پیاری بیٹی کو موت کے حوالے کیا ہے؟''

''اس سفاک اور بے رحم شخص کو میں چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ڈھونڈ نکالوں گا۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا ''میں بڑی شدومد سے مسرتی کے قاتل کو تلاش کر رہا ہوں۔ تم امید رکھو، بہت جلد میرا ہاتھ اس کی گردن پر ہوگا!''

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

خوشی محمد کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی نوشاد کو اپنے کمرے میں بلایا پھر اسے موضع ٹانڈا روانہ کرنے کے لیے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ میرے حکم کے مطابق، اسے انور کو ہر حال میں گرفتار کر کے میرے پاس لانا تھا۔ میں نے دو کانسٹیبلز مقصود اور مظفر کو بھی اس کے ساتھ کر دیا اور تین افراد کی اس ٹیم کو خصوصی ہدایت کر دی کہ وہ آج شام سے پہلے انور کو گرفتار کر کے تھانے پہنچا دیں۔

ان کے جانے کے بعد میں بھی حرکت میں آ گیا۔ خوشی محمد کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ انور دوپہر تک اقبال نگر آجائے گا۔ اقبال نگر سے ٹانڈا اور ٹانڈا سے اقبال نگر آنے جانے کے لیے ایک ہی راستہ مستعمل تھا۔ زیادہ امید اس بات کی تھی کہ میری بھیجی ہوئی ٹیم کو وہ راستے ہی میں کہیں نظر آجائے گا۔ نوشاد، مقصود اور مظفر اس کے صورت آشنا تھے لہٰذا ان کے لیے کوئی مشکلات نہیں تھیں مگر میں اسی پر قناعت کر کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے کانسٹیبل عارف کو ایک مرتبہ پھر اپنے ساتھ لیا اور اقبال نگر پہنچ گیا۔

میں نے اقبال نگر میں قدم رکھنے کے بعد خوشی محمد کو بچ کیا اور نہ ہی اس کے گھر کا رخ کیا بلکہ نہایت ہی خفیہ انداز میں چودھری سرور کی حویلی پہنچ گیا۔ چودھری نے حسب معمول میرا پرتپاک استقبال کیا اور اس کیس کے حوالے سے مختلف سوالات کرنے لگا جس پر آج کل میں کام کر رہا تھا یعنی، مسرت مرڈر کیس!

گزشتہ دو روز میں جو حالات سامنے آئے تھے، اسے پل پل ان کی خبر تھی۔ رہی سہی کسر میں نے پوری کر دی۔ وہ پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ میری بات سنتا رہا۔ اس سنسنی خیز اور پراز معلومات گفتگو کے دوران میں زمیں دار طفیل احمد کے بیٹے مشتاق کا بھی ذکر آیا اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی زیر بحث رہی۔ میں خاموش ہوا تو چودھری سرور نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! میرا اندازہ تو یہ کہتا ہے کہ انور اس قتل کی واردات کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''آپ کو تو اندازہ ہے اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں۔ میرے خیال میں یا تو انور نے خود اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور یا پھر کسی اور کی مدد سے یہ کام کیا ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس کے متعدد جھوٹوں کی قلعی کھول دی ہے اسی لیے.....'' میں سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے میں نے اس کی گرفتاری کے لیے ایک مختصر سی پولیس پارٹی کو موضع ٹانڈا روانہ کر دیا ہے اور خود آپ کے پاس آیا ہوں۔ انور کی گرفتاری کے لیے مجھے آپ کا خفیہ تعاون بھی درکار ہے!''

''جی ملک صاحب! آپ حکم کریں.....'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے کہا ''آپ اپنے بندوں کو الرٹ کر دیں کہ جیسے ہی انور اقبال نگر میں داخل ہو، وہ کسی طرح اسے گھیر گھار کر آپ کی حویلی تک لے آئیں۔ میں کانسٹیبل عارف کو ادھر ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ویسے تو میں نے انور کی گرفتاری کے لیے ایک ٹیم ٹانڈا بھیجی ہے لیکن میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں اگر انور کسی طرح میری بھیجی ہوئی پارٹی سے نظر بچا کر یہاں آجاتا ہے تو آپ کے متعین ہوشیار بندے اسے قابو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرلیں گے۔ میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے انور کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ فکر نہ کریں..... یہ سب ہو جائے گا۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ''ٹھیک ہے، تو پھر میں چلتا ہوں!''

''کہاں؟'' وہ بھی میرے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے حیرت سے مستفسر ہوا۔

''میں تھانے واپس جا رہا ہوں۔ وہاں بہت سارے کام بکھرے پڑے ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں آج آپ کو ایسے ہی نہیں جانے دوں گا!'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔

میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''اس روز بھی آپ کھانا کھائے بغیر چلے گئے تھے۔ اتفاق سے دوبارہ آ ہی گئے ہیں تو آج دوپہر کا کھانا.....''

''چوہدری صاحب!'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''آپ کھانے کے سلسلے میں اپنے پاس میرا ادھار کھاتا کھول لیں اور اس میں میرا ادھار لکھتے جائیں۔ انشاءاللہ! میں جیسے ہی اس کیس سے نمٹوں گا، آپ کے دولت خانے پر ایک عظیم الشان دعوت اڑانے ضرور آؤں گا..... مگر ابھی نہیں رک سکتا۔ میرا انور اتھانے پہنچنا بہت ضروری ہے!''

میں چند لمحات کے لیے متوقف ہوا پھر چوہدری سرور کی تسلی کے لیے کہہ دیا ''میں اپنے عملے کا ایک فرد یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آپ خاطر تواضع کے سلسلے میں فی الحال اسی سے استفادہ کرلیں۔''

چوہدری نے اندازہ لگا لیا کہ میں کسی بھی صورت رکنے والوں میں سے نہیں ہوں تو اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

میں اس کی حویلی سے نکلا اور تھانے کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ شام ہونے والی تھی یعنی اس دن کا سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ میں تھانے میں، اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میرے علاوہ اس کمرے میں دو افراد موجود تھے۔ ایک حوالدار حق نواز اور دوسرا مقتولہ مسرتی کا شوہر انور۔ وہ دونوں میرے سامنے کھڑے تھے، اس طرح کہ حوالدار بڑی بھوکی اور ترسی ہوئی نظر سے انور کو دیکھتے ہوئے میرے کسی مخصوص اشارے کا منتظر تھا۔

میں نے جس متلاشی ٹیم کو موضع ٹانڈا بھیجا تھا ان کی واپسی بڑی کامیاب رہی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہوں نے انور کو تھانے پہنچایا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انور انہیں راستے ہی میں مل گیا تھا۔ وہ اقبال نگر سے ٹانڈا کی سمت بڑھ رہے تھے کہ وہ انہیں سامنے سے آتا نظر آ گیا لہٰذا وہ اسے بڑی مہارت سے قابو کر کے تھانے لے آئے اور اب وہ میرے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اے ایس آئی نے مجھے رپورٹ دی تھی کہ گرفتاری کے وقت انور نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے لہٰذا میں نے اس کی ''خاطر تواضع'' کے لیے ایک جلاد صفت حوالدار کو اس کے پہلو میں کھڑا کر دیا تھا تاکہ تھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکل سکے تو میری ٹیڑھی نگاہ کو دیکھتے ہی حق نواز اپنے مزاج کو بھی ٹیڑھا کر لے!

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور تیز نظر سے گھورتے ہوئے انور سے پوچھا ''تم شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہو یا میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں؟''

''جناب! میں نے کچھ نہیں کیا'' وہ فریادی لہجے میں بولا ''آپ کے آدمی خواہ مخواہ مجھے گرفتار کر کے لے آئے ہیں۔ ایک تو میری بیوی جان سے گئی، اوپر سے میرے ہی ساتھ زیادتی بھی ہو رہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم سیدھی طرح نہیں مانو گے۔'' میں نے سنگین لہجے میں کہا اور حوالدار کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی کمرا انور کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ حوالدار نے بڑے وحشیانہ انداز میں اس کی خاطر داری شروع کر دی تھی۔ اس کی کراہوں میں قدرے کمی آئی تو میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''انور! تم نے بتایا تھا، چھ مئی کی صبح تم چک چونتیس شمالی چلے گئے تھے اور جب شام کو واپس آئے تو مسرتی غائب تھی جبکہ صبح جب تم گھر سے نکلے تو تمہارے بیان کے مطابق، مسرتی خوش باش اور زندہ تھی لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تمہارے اس بوگس بیان کے منہ پر جوتے مار رہی ہے۔ جانتے ہو، اس میں کیا لکھا ہے؟''

میں نے لمحے بھر کو توقف کر کے سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ خاصا سراسیمہ دکھائی دیا۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔

''مسرتی کی موت پانچ مئی کی رات نو اور دس بجے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ وہ رات ہے جو تم نے، بقول تمہارے اپنی بیوی کے ساتھ گھر میں گزاری تھی۔ تم نے اپنے کس جرم کو چھپانے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بولا تھا؟''

''تھانے دار صاحب! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' وہ کن انکھیوں سے حوالدار حق نواز کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں اگرچہ لجاجت تھی لیکن مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس کا یہ لہجہ ایک دم کھوکھلا تھا۔ وہ اپنی فریاد کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''آپ لوگوں کو کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوگئی ہے.....''

حوالدار نے اس کی پنڈلی کے سامنے والے حصے پر اپنے بوٹ سے ایک پردرد ٹھوکر لگائی۔ انور تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ حوالدار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! آپ اس بدبخت کو تھوڑی دیر کے لیے میرے حوالے کر دیں پھر دیکھیں اس کی زبان کتنی تعاون کرنے والی ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے ''بی بابندہ'' نہ بنا دیا تو حق نواز میرا نام نہیں!''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو مجبوراً ایسا کرنا ہی پڑے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور دوبارہ انور کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' میں نے کرخت انداز میں سوال کیا۔

''دو.....دو ماہ اور چند دن.....!'' وہ ہکلایا۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں شامل ایک شرم ناک انکشاف کو اس پر واضح کرنے کے بعد کہا ''ٹھیک ہے، تمہاری شادی کو تو دو ماہ ہی ہوئے ہیں لیکن رپورٹ بتاتی ہے، مسرتی کی شادی تم سے بھی دو ماہ پہلے ہوگئی تھی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

''مسرتی کی شادی.....!'' وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا ''مجھ سے پہلے کسی اور سے اس کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟''

''اس سوال کا جواب بھی تم ہی دو گے؟''

''مم..... میں..... میں کچھ نہیں جانتا جناب!'' وہ اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے حوالدار کے مشورے پر عمل کرنا پڑے گا۔ اس سے وقت بھی بچتا اور حوالدار کے ہاتھ پاؤں کو بھی خاصا ''سکون'' مل جاتا۔ میں نے انور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تو یہی چاہا تھا، تمہارے ہاتھ پاؤں سلامت رہیں لیکن جب تمہیں خود اپنا خیال نہیں ہے تو میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں!''

بات ختم کرتے ہی میں نے حوالدار کی خواہش پوری کرنے کے لیے اسے مخصوص اشارہ کر دیا۔

حق نواز کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے تجربے کا استعمال کرتے ہوئے انور کے کالر میں ہاتھ ڈالا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسے کسی لاوارث جانور کی مانند گھسیٹتے دھکیلتے ہوئے میرے کمرے سے باہر لے گیا۔ مجھے یقین تھا، اس کی منزل ٹرائل روم کے سوا اور کوئی نہیں ہوگی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اس سمت سے کراہنے اور بلبلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں سمجھ گیا، حق نواز نے ٹرائل روم کا حق ادا کرتے ہوئے ''ٹرائی'' شروع کر دی تھی۔

میں کرسی سے اٹھا اور مغرب کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بڑے اطمینان سے رات کا کھانا کھایا اور ٹہلتے ہوئے دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے امید تھی، اس دوران میں حق نواز نے انور کو خاطر داری کے ناقابل فراموش آداب سے نواز دیا ہوگا۔ میری یہ امید پوری ہوگئی۔ میں جیسے ہی اپنی کرسی پر بیٹھا، حوالدار کسی چراغی جن کے مانند میرے سامنے حاضر ہوگیا۔

''ملک صاحب! یہ انور تو بڑا ہی بزدل اور کم زور بندہ ثابت ہوا ہے!''

میں حوالدار کی بات سن کر فوراً سمجھ گیا کہ اس نے محدود ''تفتیش'' کے استعمال سے انور کو سچ بولنے کے لیے ''آمادہ'' کر لیا تھا، روداد میں، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیوں، کیا ہوگیا؟''

''ہونا کیا تھا جناب!'' وہ سادگی سے بولا ''میں تو سمجھ رہا تھا، وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا مگر یوں لگا جیسے وہ ٹرائل روم میں پہنچتے ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے دو تین سادہ اور آسان ''فارمولے'' آزمائے تو اس نے مجھے آزمایش میں ڈالے بغیر، شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے اقبال جرم کرنے کا اعلان کر دیا۔ انور نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا ہے ملک صاحب!''

میں نے ایک طویل، گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ہاں حق نواز! ایسا بھی ہوتا ہے۔ تم نے اسے بزدل اور کم زور کا خطاب دیا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر میں انور کے حوالے سے یہی کہوں گا، وہ کیا مجرم ہے اس لیے اس نے تمہیں زیادہ ''زحمت'' نہیں دی۔ بہرحال.....!''

میں لمحے بھر کو رکا پھر حوالدار سے کہا ''حق نواز! اگر تم اسے ''بی بابندہ'' بنا ہی چکے ہو تو پھر فوراً یہاں لے آؤ تاکہ اس کا اقبالی بیان قلم بند کرنے کے بعد سکھ کی سانس لی جائے۔''

حوالدار کشاں کشاں میرے کمرے سے نکلا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ انور کو اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے آیندہ ایک گھنٹے میں اس کا ''انٹرویو'' لے لیا پھر اسے حوالات میں بند کرنے کے احکام صادر کرتے ہوئے، سونے کے لیے اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

انور نے مجھے جو بیان دیا وہ فل اسکیپ کے پانچ صفحات پر مشتمل تھا لیکن میں یہاں پر صرف خلاصہ پیش کروں گا تاکہ اس کیس کے تشنہ پہلوؤں کو سیراب کرنے کا کام مکمل ہو جائے۔

انور کی ایک شادی فلاپ ہو چکی تھی اور اس ناکامیابی کے سبب سے یا تو خود وہ واقف تھا یا پھر اس عورت کو آگاہی حاصل تھی جو اسے چھوڑ کر عرصہ ہوا چلی گئی تھی۔ اتنے بڑے فالٹ کے ساتھ اسے چاہیے تھا کہ زندگی بھر دوبارہ شادی نہ کرتا۔ اس کے نقص سے ٹانڈا اور اقبال نگر کے لوگ واقف نہیں تھے لہٰذا خوشی محمد نے اپنے تن تنہا بھتیجے کو داماد بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ خوشی محمد بے چارہ تو اس کی نااہلیت سے بے خبر تھا مگر انور نے بھی حماقت کا ثبوت دیا۔ اسے چاہیے تو یہی تھا کہ اب زندگی بھر کبھی شادی کا نام نہ لیتا لیکن مسرتی جیسی بھرے بھرے بدن کی مالک، گوری چٹی یوپ لڑکی کو دیکھ کر اس کی نیت پھسل گئی اور اس نے اپنی عاقبت خراب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دو ماہ خیر و عافیت سے گزر گئے لیکن چند روز پہلے جب مسرتی اپنے میکے میں رہنے کے بعد دوبارہ موضع ٹانڈا پہنچی تو ایک قیامت برپا ہو گئی۔ ایک رات مسرتی نے انور کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ یہ الفاظ زہر بن کر انور کی سماعت میں سرایت کر گئے۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قابل ہے اور کس لائق نہیں۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اقبال نگر والے مشتاق کو مسرتی میں دلچسپی رہی تھی۔ اس کے ذہن نے احمقانہ انداز میں سوچتے ہوئے آناً فاناً میں اس کہانی کے ڈانڈے یہاں سے وہاں تک ملا ڈالے۔ اب اس کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ کھلم کھلا مسرتی کی اس لغزش پر شور نہیں مچا سکتا تھا۔ بیوی کو موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے اسے اپنی نااہلی کا پردہ چاک کرنا پڑتا اور یہ اسے کسی بھی طور منظور نہیں تھا، وہ نام نہاد مردانگی پر لگنے والی ٹھیس کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

سچ کا زہر بڑا ہی کڑوا اور اذیت دینے والا ہوتا ہے۔ وہ ایک دو روز تک یہ اذیت سہتا رہا، بالآخر اس نے مسرتی کی زندگی کا چراغ گل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اچانک بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ ذہن میں گھومنے والے زہریلے خیالات اور سوالات نے اسے بے انداز مشتعل کر دیا تھا۔ وہ اتنا جوشیلا ہو گیا کہ اپنے ہوش کھو بیٹھا اور وقوعہ کی رات اس نے سوتے میں، مسرتی کا گلا گھونٹ کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کو حل نہ کیا جا سکتا ہو مگر انور اپنی ''خامی'' کے ہاتھوں ایسا ہو گیا تھا کہ حل کرنے کے بجائے اس نے مسئلے ہی کو ختم کر ڈالا۔ خود کو اس واقعے سے لاتعلق اور لاعلم ظاہر کرنے کے لیے اس نے چک چونتیس شمالی کا دورہ بھی کر ڈالا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں قانون کے شکنجے میں جکڑا جائے گا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا تھا۔

دوسروں کے عیب پر پردہ ڈالنے اور ان کی خطائیں معاف کرنے کی تاکید اسی لیے کی گئی ہے تاکہ ایک صحت مند معاشرے کو تشکیل دیا جا سکے اگر انور غصے اور اشتعال میں آ کر کوئی سنگین قدم اٹھانے کے بجائے مسرتی کو معاف کر کے خاموشی اختیار کر لیتا تو اللہ تعالیٰ اس کا پردہ بھی رکھ لیتا۔ اس کی جذباتی حماقت نے سب کچھ تباہ کر ڈالا تھا۔

انور نے مسرتی اور مشتاق کو تصوراً سمجھتے ہوئے ایک قیامت خیز فیصلہ کر ڈالا تھا لیکن میری بعد کی تحقیق سے پتا چلا کہ اس معاملے میں مشتاق کا کوئی دوش نہیں تھا۔ مسرتی نے کس کے تعاون سے وہ خطا کی تھی، اس شخص تک رسائی حاصل کرنے کے باوجود بھی میں اس کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔

وہ آفت زادی تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی اور اس کی موت کے ساتھ ہی بہت سارے راز بھی زیرِ زمین چلے گئے تھے۔ میں کون ہوتا تھا..... کسی کے راز سے پردہ اٹھانے والا؟

جبکہ اب اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یک نہ شد

ملک صفدر حیات

رشتے اگر سگے ہوں تو ان کے لگائے گئے زخموں کا لطف ان سے علیحدہ ہوتا ہے جو سوتیلے رشتہ داروں کے توسط سے لگتے ہیں۔ رشتے چاہے سگے ہوں یا سوتیلے، ہوتے بہرحال رشتے ہی ہیں، اسی رشتے داریوں کی کوکھ سے نفرتیں، محبتیں، رقابتیں اور رفاقتیں بنتی اور بگڑتی ہیں اور کبھی کبھی اتنا بگڑ جاتی ہیں کہ پھر انجام کار کسی جان پر ہی بن آتی ہے۔

رشتوں کو زر کی میزان میں تولنے والے ناعاقبت اندیشوں کا قصہ ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب

وہ آتش زدگی کا ایک لرزہ خیز واقعہ تھا!

میں اطلاع ملتے ہی جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔ اے ایس آئی نزاکت شاہ بھی میرے ساتھ تھا۔ ان دنوں میں ایک ضلع کے مضافات میں تعینات تھا۔ دراصل یہ شہر سے متصل ایک توسیعی رہائشی منصوبہ تھا۔ مضافات میں واقع ہونے کے باعث یہ ایک پُرسکون اور شور شرابے سے دور پوش رہائشی علاقہ تھا۔ آتش زدگی والا افسوس ناک واقعہ اسی علاقے یعنی ''فرید ٹاؤن'' میں پیش آیا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا حادثہ تھا۔

فرید ٹاؤن کو آباد کرتے وقت جدید ڈرائنگ اور نقشے کا بہت خیال رکھا گیا تھا۔ اس کے کل چار بلاکس تھے، ڈبلیو، ایکس، وائے اور زیڈ۔ چاروں بلاکس کے وسط میں چار خوب صورت پارکس بنائے گئے تھے۔ ہر پارک مربع شکل میں تھا اور فٹ بال کے کسی میدان سے زیادہ کشادہ تھا۔ ان چار پارکس کے عین بیچ، گول فوارہ بنا ہوا تھا جو ان پارکس کے لیے دل یعنی مرکز کی حیثیت کا حامل تھا، بالکل ایسے ہی جیسے وہ چار پارکس فرید ٹاؤن کے چار بلاکس کے لیے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ آتش زدگی کا اندوہ ناک واقعہ بلاک وائے کی کوٹھی نمبر ایک سو چالیس میں رونما ہوا تھا۔

یہ ایک دو منزلہ کوٹھی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کوٹھی کے اندر اور باہر درجن بھر افراد کو موجود پایا۔ میں نے پہلی فرصت میں غیر متعلقہ افراد کو کوٹھی سے باہر نکال دیا اور وہاں رہنے والے لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ مجھے بتایا گیا، آگ لگنے والا واقعہ کوٹھی کی بالائی منزل پر پیش آیا تھا۔ میں اے ایس آئی کی معیت میں جائے وقوعہ کی سمت لپک گیا۔

اس کوٹھی میں کل چھ افراد رہائش پذیر تھے جن میں چار مالک اور دو ملازم کی حیثیت رکھتے تھے۔ کوٹھی کا مالک اور اس گھر کا سربراہ قادر علی خاں اپنی بیوی شکیلہ اور دو سالہ بیٹے جبران کے ساتھ بالائی منزل پر رہتا تھا جبکہ کوٹھی کی زیریں منزل قادر خاں کے بڑے بیٹے نادر علی خاں کے استعمال میں تھی۔ غلام حسین اور ولایت بی بی نامی دو ملازم میاں بیوی زیریں منزل کے ایک کوارٹر میں رہتے تھے۔ یہ ایک بے اولاد جوڑا تھا جو طویل عرصے سے قادر خاں کی خدمات پر مامور تھا۔ جلد ہی ہم، زینہ طے کر کے متاثرہ کمرے میں پہنچ گئے۔

وہ کمرا خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور ہولناک آگ اسی کمرے میں بھڑکی تھی۔ اس کمرے کی پیمایش میرے اندازے کے مطابق، بارہ ضرب پندرہ فٹ رہی ہو گی۔ خواب گاہ کی اندرونی حالت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ کمرا اور اس میں موجود آگ پکڑنے والی ہر شے جل کر تقریباً راکھ ہو چکی تھی۔ سب سے زیادہ دل دوز منظر کمرے کے وسط کا تھا جہاں قادر خاں اور اس کے ننھے سے بچے جبران کی سوختہ لاشیں بڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ بھوکی پیاسی آگ نے ان کی زندگی کو بڑی بے رحمی سے چاٹ کر کوئلا بنا ڈالا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے وحشت ناک اور دل ہلا دینے والے مناظر دیکھ رکھے ہیں مگر اس سوختہ ساماں منظر نے مجھے بری طرح متاثر کیا تھا۔ سوختہ لاشوں کی وقوع پذیری سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنی موت سے قبل، جل کر کوئلا بننے سے پہلے وہ کسی عالی شان پلنگ پر پُرسکون نیند سو رہے ہوں گے مگر کمرے کی دوسری، جلنے کے قابل اشیا کے ساتھ اب وہ پلنگ بھی رزق آتش بن چکا تھا۔ دونوں سوختہ لاشیں کمرے کے عین وسط میں، فرش پر بڑی درس عبرت دیتی نظر آتی تھیں!

اس واقعے نے کوٹھی کے مکینوں کو قیامت سے پہلے ایک قیامت سے دوچار کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ بری حالت قادر خاں کی بیوی شکیلہ کی تھی۔ اسے غش پر غش آ رہے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نادر خاں اور دونوں ملازموں نے شکیلہ کو زیریں منزل کے ایک کمرے تک محدود کر دیا تھا۔ وہ اسے بالائی منزل کی طرف جانے کی ''اجازت'' نہیں دے رہے تھے۔ یہ جان کر کہ اس کا شوہر اور شیر خوار بچہ عفریتی آتش کی نذر ہو گئے ہیں، وہ قیامتی غم واندوہ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ ایک ماں..... ایک بیوی کی حیثیت سے یہ حادثہ شکیلہ کے لیے صدمہ جاں کاہ تھا۔

ہم نادر خاں کی راہ نمائی میں متاثرہ کمرے تک پہنچے تھے اور اس وقت بھی وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے کمرے کی حالت زار پر نگاہ ڈالتے ہوئے افسوس ناک انداز میں کہا'' کچھ بھی نہیں بچا۔ سب جل کر راکھ ہو گیا!''

نادر خاں نے میرے اس غم ناک تبصرے پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یک ٹک خاموش مگر گھائل نظر سے ان دونوں سوختہ لاشوں کو تکے جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے ادا کردہ الفاظ نے اس کی سماعت تک رسائی ہی حاصل نہ کی ہو۔ وہ گہرے صدمے میں نظر آتا تھا۔ باپ اور بھائی کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس کی کیفیت کے پیش نظر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا'' نادر خاں! تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ تم نیچے والی منزل پر جا کر آرام سے بیٹھو۔ میں موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد تم سے بات کرتا ہوں۔''

''میں ٹھیک ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آواز کسی اندھے کنویں سے آ رہی ہو۔ میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھتے ہوئے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا۔

''تم ٹھیک نہیں ہو نادر خاں! اگر ٹھیک ہوتے تو ٹھیک دکھائی بھی دیتے!''

وہ بڑی عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ان گنت الجھنیں اور بے شمار سوالات نظر آئے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو، کیا کہے اور کس سے کہے.....؟ اور اگر کہے بھی تو کہاں سے شروع کرے؟''

''تھانے دار صاحب.....!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

اسے متذبذب دیکھتے ہوئے میں نے کہا'' میں نے کہا ہے نا، تم سے ڈھیر ساری باتیں ہوں گی۔'' میرا انداز شفقت بھرا اور سمجھانے والا تھا'' تم میری بات مانو اور زیریں منزل پر چلے جاؤ۔ میں اپنا کام نمٹانے کے بعد تمہارے پاس آ رہا ہوں۔''

وہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی تحکمانہ لہجے میں کہہ دیا۔'' میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں وہ قانون کا تقاضا ہے۔ اگر وقوعہ کی کارروائی کے دوران میں مجھے کسی مرحلے پر تمہاری مدد کی ضرورت پیش آئی تو میں تمہیں خود اوپر بلا لوں گا..... شاباش!''

بات ختم کرتے ہی میں نے اے ایس آئی کو مخصوص اشارہ کر دیا جس کا مطلب تھا، وہ نادر خاں کو چائے وقوعہ سے ہٹا دے۔ اے ایس آئی نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور نادر خاں کو بازو سے تھام کر نیچے لے گیا۔

چائے وقوعہ کی ضروری کارروائی اگر نادر خاں یا کسی اور شخص کی موجودگی میں عمل میں لائی جاتی تو اس میں کوئی خرابی تھی اور نہ ہی کوئی قباحت۔ میں نے تو صرف یہ سوچ کر اسے وقوعہ سے ہٹا دیا تھا کہ وہ اپنے باپ اور بھائی کی سوختہ، بے سروساماں لاشوں کو دیکھ دیکھ کر ہولتا رہے گا۔ میں اس کے صدمات کو بڑھانا نہیں بلکہ کم کرنا چاہتا تھا لہٰذا جذباتی اشتعال اور اعصابی شکستگی سے بچانے کے لیے میں نے اسے نیچے بھیج دیا تھا۔ چائے وقوعہ سے دور رہنا ہی اس کے لیے بہتر تھا۔

اے ایس آئی نزاکت شاہ، نادر خاں کو نیچے چھوڑ کر واپس آیا تو اس نے بوجھل انداز میں کہا'' ملک صاحب! اس گھر پر تو جیسے قیامت ٹوٹ گئی ہے۔ جب دو جنازے ایک ساتھ یہاں سے اٹھیں گے تو ایک کہرام بپا ہو جائے گا۔ زندہ رہ جانے والوں پر پتا نہیں کیا بیتے گی؟''

اے ایس آئی ان لمحات میں خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ یہ اس ماحول کا اثر تھا۔ میری اندرونی کیفیت بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی مگر میں نے اپنے احساسات، جذبات اور اعصاب کو مکمل طور پر کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے جواب میں، میں نے کہا۔

''واقعی، یہ ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ مرنے والا تو مر جاتا ہے، اصل قیامت تو ان لوگوں پر ٹوٹتی ہے جو اس کی موت کا سوگ منانے کے لیے زندہ رہ جاتے ہیں۔ فرداً فرداً روزانہ ان کے اندر ایک موت واقعہ ہوتی ہے..... بہرحال، نادر خاں اور شکیلہ کو یہ صدمہ تو سہنا ہی ہوگا۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولا ''ملک صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی.....!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کون سی بات شاہ جی؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بہ دستور الجھن بھرے انداز میں بولا ''ہماری معلومات کے مطابق، قادر خاں، شکیلہ اور ان کا معصوم بچہ جبران خاں بالائی منزل پر رہتے تھے۔ اس کمرے میں بھڑکنے والی آگ نے قادر اور جبران کو تو نگل لیا مگر شکیلہ بالکل محفوظ رہی۔ کیا اس اندوہ ناک حادثے کے وقت وہ کمرے میں موجود نہیں تھی؟''

''مجھے یقین ہے نزاکت علی! تم آگے چل کر بہت ترقی کرو گے۔'' میں نے ستایشی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ایک سمجھ دار اور فرض شناس پولیس والے کو ایسے ہی سوالیہ اور شکی انداز میں سوچنا چاہیے۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ذہن میں بھی ایسے ہی بہت سارے سوالات ڈوب ابھر رہے ہیں اور ہمیں ان سب کے جوابات تلاش کرنا ہیں۔ جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی ہو جائے تو نیچے جا کر نادر خاں، شکیلہ اور دونوں ملازمین سے پوچھ گچھ کریں گے۔ انشاء اللہ! سب کچھ سامنے آ جائے گا!''

''اور جو چھپا ہوا ہے؟'' اے ایس آئی نے غیر مطمئن نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے تیقن سے کہا ''اسے ہماری تفتیش کان سے پکڑ کر باہر کھینچ لائے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس کے بعد ہم دونوں موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔

اس خواب گاہ کا وسطی حصہ بری طرح تباہ ہو چکا تھا اور یہی حصہ سب سے قیمتی تھا جہاں ایک عالی شان پلنگ پر قادر خاں اور اس کا شیر خوار بچہ گہری نیند سو رہے تھے۔ اب وہ نیند کے اس ''مقام'' پر پہنچ گئے تھے جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ کمرے کے درمیانی حصے میں ان کی سوختہ لاشیں نظر آ رہی تھیں یا پھر پلنگ اور بیچ کے جھولے کی باقی راکھ اور یہ راکھ بھی اب باقاعدہ کیچڑ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ یہ کیچڑ اس پانی کے سبب پیدا ہوئی تھی جو آگ بجھانے کی غرض سے اس باپ بیٹے کی جلتی ہوئی لاشوں پر پھینکا گیا تھا۔

جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے کے دوران میں، میں متلاشی نگاہ سے جل جانے والی اور باقی بچ رہنے والی ایک ایک چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں مجھے ایک خستہ حال کوئلوں والی انگیٹھی بھی نظر آئی۔ ایسی انگیٹھیوں کو موسم سرما میں کمرا گرم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ انگیٹھی کے اندر کوئلے دہکا کر اسے بستر کے قریب محفوظ فاصلے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ مذکورہ انگیٹھی کسی ہیٹر کی طرح کام کرتی ہے۔

پانی کا اصول ہے کہ ہر بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی آگ کا بھی اپنا ایک اصول ہے کہ بڑا آتش دان، چھوٹے آتش دان کو نگل جاتا ہے۔ وہ انگیٹھی اپنی ذات میں ایک چھوٹا سا آتش دان تھی۔ جب کمرے میں قیامت خیز آگ بھڑکی تو وہ ایک دہکتے ہوئے بڑے آتش دان کی صورت اختیار کر گیا لہٰذا انگیٹھی کی آگ کو کمرے کی آگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ انگیٹھی کے رنگ روپ کو تو بڑی آگ نے نگل لیا تھا، بس باقی رہ جانے والے آثار ہی بتاتے تھے کہ ہاں..... وہ بھی کبھی ''ہوا'' کرتی تھی۔

اس سوختہ خواب گاہ کی تلاشی کے دوران میں، قادر خاں اور اس کے بیٹے جبران خاں کی لاشوں کے علاوہ مجھے کام کی صرف دو چیزیں ہی حاصل ہو سکیں۔ ان میں ایک بے مول اور دوسری ان مول تھی مگر اہمیت کے لحاظ سے دونوں، میرے ذہن میں ایک جیسے پُرتجسس اور قابلِ تفتیش سوالات کو ابھار رہی تھیں۔ ان میں ایک تو گھی والا ایک سیر کا خالی ڈبا تھا۔ اس زمانے میں کھجور مارکا، ڈالڈا، تلو، شالیمار اور کشمیر نامی بناسپتی گھی کے ایک سیر والے، ٹین کے ڈبے بھی آیا کرتے تھے۔ جلنے کے باعث مذکورہ ڈبے کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے دیکھ کر بتانا مشکل تھا کہ وہ کون سی بناسپتی گھی تیار کرنے والی کمپنی سے تعلق رکھتا تھا؟

بہرحال، گھی کے اس خالی صورت ناآشنا ڈبے کو قادر خاں کی خواب گاہ میں دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی تھی کیونکہ ایسی کسی شے کی وہاں کوئی گنجایش نہیں نکلتی تھی!

ہاتھ لگنے والی دوسری شے ان مول تھی یعنی اسے قیمتی کہا جا سکتا تھا اور وہ تھا ایک طلائی لاکٹ! سونے کی زنجیر میں پروئے گئے اس لاکٹ کا تعویذ کسی صراف کی کاری گری کا عمدہ نمونہ تھا۔ بیضوی شکل کے اس تعویذ کے کناروں پر بڑی مہارت سے ایک ڈیزائن ابھارا گیا تھا اور اس کے عین وسط میں انگریزی کا حرف این (N) ابھرا ہوا تھا جو بہت نمایاں دکھائی دیتا تھا۔

میں نے جائے وقوعہ کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد دونوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوانا چاہا تو نادر خاں میری راہ میں حائل ہو گیا، دکھی لہجے میں اس نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! ظالم آگ نے پہلے ہی ابا جی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس معصوم کا حشر خراب کر دیا ہے۔ اب آپ ان کی چیر پھاڑ کروا کے مزید بے حرمتی تو نہ کریں نا!''

میں اس کے درد کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن اپنے فرض کے تقاضے نبھانا بھی ضروری تھے لہٰذا میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''نادر خاں! یہ بہت ضروری ہے۔ تمہارا باپ اور چھوٹا بھائی طبعی موت نہیں مرے اس لیے ان کا پوسٹ مارٹم ہونا چاہیے۔ میں اپنی ڈیوٹی کو زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہوں۔''

باپ اور چھوٹے بھائی کی المناک جدائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا لہٰذا وہ میری راہ میں زیادہ مزاحمت پیش نہ کر سکا۔ لاش کو ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوانے کے بعد میں نے نادر کو اپنے ساتھ لیا اور اس کوٹھی کی زیریں منزل کے ایک کمرے میں جا بیٹھا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں شکیلہ کو رکھا گیا تھا۔ شکیلہ کی دل گرفتگی بڑے اونچے درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا، جب تک وہ ذرا سنبھلتی، میں نادر خاں کا بیان قلم بند کر لوں گا۔

اس وقت ہم دونوں کے سوا اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اے ایس آئی نزاکت شاہ کو میں نے، افسوس ناک حادثے کا شکار ہونے والے افراد کی سوختہ لاشوں کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا اور یہ تاکید بھی کی تھی کہ لاشوں کو اسپتال پہنچوانے کے بعد وہ سیدھا میرے پاس آئے پھر ہم دونوں ایک ساتھ ہی تھانے واپس جائیں گے۔ اس دوران میں، میں اہل خانہ کے بیانات لے لیتا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نادر خاں کو ہمدردی بھرے لہجے میں مخاطب کیا اور کہا ''نادر خاں! مجھے اس واقعے کا دلی رنج ہے، اس غم میں، میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں لیکن دوسری طرف میں اپنے فرض سے بھی مجبور ہوں لہٰذا تمہیں سوچ سمجھ کر میرے سوالات کے جوابات دینا ہوں گے!''

اس نے زخمی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے غم اور تذبذب کی پرچھائیں میں نے واضح طور پر محسوس کی۔ غم کا سبب تو سامنے کی بات تھی، اسے سمجھنے کے لیے کسی خاص قسم کی عقل یا ذہانت کی ضرورت نہیں تھی مگر تذبذب کی وجہ میرے ذہن کو الجھا رہی تھی۔ میں نے پہلے بھی اس کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر دیکھا تھا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کسی شے نے اسے کش مکش کی سی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔

میرے نرمی بھرے انداز کے جواب میں اس نے متاملانہ لہجے میں صرف اتنا کہا ''جی پوچھیں جناب.....!''

میں کوئی سوال کرنے سے پہلے چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ بھی لیتا رہا۔

نادر خاں کی عمر میرے اندازے کے مطابق، پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ''گبرو'' کی اصطلاح پر ایک سو ایک فیصد پورا اترتا تھا لہٰذا اس کے حلیے اور وضع قطع پر مزید لب کشائی مناسب نہیں ہوگی لیکن ان دل گرفتہ لمحات میں اس کی جوانی اور رعنائی گہن کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔

''نادر خاں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا ''جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تم کہاں تھے؟''

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا ''میں اپنے اسی کمرے میں سو رہا تھا۔''

''اسی کمرے'' سے اس کی مراد وہ کمرا تھا جہاں اس وقت ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا ''تمہیں اس حادثے کے بارے میں کیسے پتا چلا..... میرا مطلب ہے، تم تو سو رہے تھے۔ یقیناً کسی اور ہی نے تم تک یہ خطرناک اطلاع پہنچائی ہوگی؟''

''مجھے غلام حسین نے اس بارے میں بتایا تھا۔'' نادر نے جواب دیا۔

''یہ خبر سننے کے بعد تم نے کیا کیا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''غلام حسین نے مجھے بتایا کہ بی بی جی نے کہا ہے، ان کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ آپ فوراً پہنچیں۔'' اس نے جواب دیا ''پھر میں اوپر والی منزل کی طرف چلا گیا تھا۔''

بی بی جی سے اس کا مطلب شکیلہ تھا۔ نادر خاں کی بات سن کر مجھے جھٹکا سا لگا اگر آتش زدگی کی اطلاع شکیلہ نے زیریں منزل تک پہنچائی تھی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، جب بالائی منزل کی خواب گاہ میں آگ بھڑکی، اس وقت شکیلہ اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ وہاں سو نہیں رہی تھی ورنہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی جل کر کوئلا ہو جاتی۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ خواب گاہ میں تو موجود ہو لیکن جاگ رہی ہو اور اس نے آگ بھڑکتے ہوئے دیکھ لی ہو!

میں نے نادر خاں سے پوچھا ''جب تم بالائی منزل والی خواب گاہ میں پہنچے تو وہاں تم نے کیا دیکھا؟''

''میں نے ابا جی اور چھوٹے بچے کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''غلام حسین بھی میرے ساتھ ہی اوپر پہنچا تھا۔ اور اس کی بیوی بھی۔ غلام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حسین بہت پریشان تھا۔ میری طرح وہ بھی اس منظر کو دیکھ کر وحشت زدہ رہ گیا تھا پھر اسی کے مشورے پر ہم بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر اوپر لانے لگے مگر ہماری ہر کوشش ضائع ہوگئی۔ ہم اباجی اور اس معصوم بچے کو بچا نہیں سکے۔ وہ جل کر کوئلا ہو گئے تھے.....'' اس کی آواز رندھ گئی۔

ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا اور مجھے بتا رہا تھا کہ اس المناک واقعے کی تہ میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ موجود ہے۔ سب کچھ ویسا ہی سیدھا سادہ نہیں تھا جیسا کہ بیان کیا جا رہا تھا یا نظر آ رہا تھا۔ بہت سی باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ مثلاً سب سے بڑی بات تو یہی مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ شکیلہ کو کسی بھی طرح یہ پتا چلا کہ اس کی خواب گاہ میں آگ لگ گئی ہے۔ اس نے مدد کے لیے زیریں منزل پر موجود ملازمین کو پکارا۔ ولایت بی بی اور اس کے شوہر غلام حسین نے اس کی پکار پر لبیک کہا اور نادر خان کو جگا کر اس واقعے سے آگاہ کیا اور پھر جب وہ دونوں آگ بجھانے کے لیے بالائی منزل پر پہنچے تو اس دوران میں قاتل آگ قادر خاں اور اس کے بیٹے کی زندگی کو پوری طرح چاٹ چکی تھی لہٰذا غلام حسین اور نادر خاں کی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں..... یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ اتنی تیز رفتاری اور ہلاکت خیزی سے تو جنگل کی آگ بھی کام نہیں دکھاتی!''

''نادر خاں! کیا تمہاری ماں اس وقت خواب گاہ میں موجود نہیں تھی جب آگ بھڑکی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ شکستہ لہجے میں بولا ''چھوٹی امی اس وقت نیچے والے باتھ روم میں تھی۔''

''چھوٹی امی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

وہ میرے الجھنے کا سبب جان گیا، وضاحت کرتے ہوئے بولا ''شکیلہ کو میں چھوٹی امی کہتا ہوں۔ یہ میری سگی نہیں، سوتیلی ماں ہے۔ میری سگی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ چار سال پہلے اباجی نے شکیلہ سے شادی کر لی تھی۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا ''اور جبران؟''

''وہ بھی میرا سوتیلا بھائی ہے۔'' نادر خاں نے جواب دیا ''ہم صرف دو بہن بھائی ہیں۔ آپا فردوس مجھ سے بڑی ہیں۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ ادھر محلہ اسلام پورہ میں اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ رہتی ہیں۔''

پھر اس نے بتایا کہ فردوس کا شوہر سبزی منڈی کا ایک بہت بڑا آڑھتی تھا۔ ان لوگوں کو اس واقعے کی اطلاع بھیج دی گئی تھی اور امید تھی، ایک آدھ گھنٹے میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ جب سے یہ انکشاف ہوا تھا کہ شکیلہ قادر خاں کی دوسری بیوی اور نادر خاں کی سوتیلی ماں ہے، میرے ذہن میں سوچ و فکر کا ایک اور دروا ہو گیا تھا..... اور یہ در، پہلے سے کھلے ہوئے دروں سے کہیں زیادہ کشادہ تھا۔

میں نے نادر خاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''تمہاری چھوٹی امی زیریں منزل والے باتھ روم میں کیوں آئی تھیں۔ کیا بالائی منزل پر یہ سہولت موجود نہیں؟''

''یہ کوٹھی ابھی نئی نئی بنی ہے جناب!'' نادر خاں نے جواب دیا ''اوپر والی منزل میں باتھ روم وغیرہ تو ہیں لیکن ان میں ابھی تک پانی کا نظام بحال نہیں ہو سکا اسی لیے وہ لوگ بہ وقت ضرورت نچلی منزل والے باتھ روم کو استعمال کرتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چنانچہ ہمیں آگ کو بجھانے کے لیے بھی پانی کو بالٹیوں میں بھر بھر کر اوپر پہنچانا پڑا لیکن افسوس کہ ہم انہیں بچا نہ سکے.....'' وہ ایک مرتبہ پھر جملہ ادھورا چھوڑ کر افسردہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک اہم سوال کیا ''یہ قیامت خیز واقعہ رات کے کس پہر پیش آیا تھا؟''

''جب مجھ تک اس واقعے کی خبر پہنچی اس وقت رات کے تین سوا تین بجے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''رات کے تین.....!'' میں نے سوچنے والے انداز میں کہا ''یعنی آج صبح کے تین؟''

''جی ہاں..... جی ہاں وہی۔'' وہ جلدی سے تصدیقی لہجے میں بولا۔

''کیا تم نے اس آتش زدگی کے سلسلے میں اپنی سوتیلی ماں سے کچھ پوچھا تھا؟''

''اس کی حالت اس قابل کہاں ہے کہ وہ کسی سوال کا جواب دے سکے!'' وہ سپاٹ آواز میں بولا ''شوہر کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ لگتا ہے، جبران کی دردناک موت نے چھوٹی امی کا دماغ الٹ دیا ہے۔ غلام حسین کی بیوی ولایت بی بی نے بڑی مشکل سے اسے سنبھال رکھا ہے۔''

میں نے پہلے بھی اور خاص طور پر اب بھی نادر خاں کے لہجے میں شکیلہ کے لیے وہ مخصوص احترام محسوس نہیں کیا تھا جو سوتیلی ماں کا حق ہوتا ہے۔ اس کا یہی مطلب تھا، وہ شکیلہ سے کچھ زیادہ خوش نہیں۔ میں نے اس سے استفسار کیا۔

''نادر خاں! ٹھیک ہے، شکیلہ کی حالت ایسی نہیں کہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے تم کچھ پوچھ سکتے لیکن تمہیں غلام حسین یا ولایت بی بی کی زبانی تو کچھ باتیں ضرور پتا چلی ہوں گی۔ تم جو کچھ جانتے ہو، مجھے تفصیل سے بتاؤ تاکہ میں جلد از جلد تمہاری جان چھوڑ دوں!''

آخری جملہ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا تھا۔ وہ مذاق کا موقع تھا اور نہ ہی تفریح کا وقت لیکن پتا نہیں کیوں، بے ساختہ میری زبان سے وہ جملہ پھسل گیا تھا۔ بہرحال، میں نے فوراً ہی خود کو کنٹرول کر کے سنجیدہ سی صورت بنالی۔

وہ چند لمحات تک یوں خاموش بیٹھا رہا جیسے بولنے سے پہلے اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف النوع خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے بتانا شروع کیا۔

''رات کو لگ بھگ دس بجے میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا اور جلد ہی مجھے نیند بھی آ گئی تھی۔ اس کے بعد اس گھر میں کیا ہوتا رہا، مجھے کچھ خبر نہیں پھر جب غلام حسین نے دروازہ دھڑ دھڑایا تو میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت رات کے..... میرا مطلب ہے، صبح کے کوئی سوا تین بجے تھے۔ غلام حسین نے نہایت ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا کہ اوپر صاحب جی کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ ''صاحب جی'' وہ ابا جی کو کہتا ہے۔ میں تو ویسے ہی ہڑبڑا کر اٹھا تھا، اس اطلاع نے میرے حواس کا سوا ستیاناس مار ڈالا۔ اوپر کی جانب، افراتفری کے عالم میں بڑھتے ہوئے میں نے غلام حسین سے پوچھا کہ اسے کیسے پتا چلا، ابا جی کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے؟ اس نے میرے سوال کا جواب دیا کہ بی بی جی نے چیخ چیخ کر اس کی بیوی یعنی ولایت بی بی کو یہ بتایا ہے۔ ولایت بی بی اس وقت جاگ رہی تھی۔ چند لمحے پہلے چھوٹی امی نے اسے باتھ روم کے اندر سے پکار کر اپنے قریب بلا لیا تھا۔ اس نے اپنے خاوند کو سوتے میں سے جگایا اور یہ اندوہ ناک اطلاع دی۔ غلام حسین نے اوپر جانے سے قبل مجھے اس سانحے سے آگاہ کیا پھر ہم تینوں ایک ساتھ آگے پیچھے اوپر پہنچے اور آگ بجھانے کے لیے اپنی سی کوشش کر ڈالی مگر افسوس..... کہ ہماری کوشش کامیاب نہیں ہو سکی.....'' وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں اس دوران میں بڑی گہری اور ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''جب کسی بھی طرح ہم آگ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے تو اس وقت تک بڑی دیر ہو چکی تھی۔ آگ نے ان دونوں کو جلا کر بالکل کوئلا بنا دیا تھا۔ اس موقع پر شکیلہ یعنی چھوٹی امی دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میں اس آتش زدگی کا سبب جاننا چاہتا تھا اور میں نے اس سلسلے میں کوشش بھی کی لیکن چھوٹی امی میرے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نظر نہیں آتی تھیں۔ مجبوراً میں نے اسے ولایت بی بی کی مدد سے نچلی منزل پر پہنچا دیا۔ اسے پہلے ہی غش پر غش آ رہے تھے اگر وہ لاشوں کے قریب موجود رہتی تو عین ممکن تھا، اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا!'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، سانس درست کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ بات بھی مجھے ولایت بی بی ہی کی زبانی پتا چلی تھی کہ چھوٹی امی رات کے آخری پہر نیچے والے باتھ روم میں آئی تھی۔ چھوٹی امی نے باتھ روم کے اندر سے چلا کر ولایت بی بی کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ جب ولایت، باتھ روم کے پاس پہنچی اور اس نے پوچھا، بی بی جی! کیا ہوا ہے؟ تو چھوٹی امی نے باتھ روم کے اندر سے سخت غصے کے عالم میں دریافت کیا، کس بدبخت نے باہر سے کنڈی لگا دی ہے؟ یہ سوال ولایت کے لیے انتہائی حیران کن اور ناقابل یقین تھا۔ کوئی بھلا چھوٹی امی کے باتھ روم کو باہر سے کنڈی کیسے لگا سکتا تھا۔ اس منزل پر تین باتھ روم الگ الگ بنے ہوئے تھے۔ ایک امی ابو کے استعمال میں رہتا تھا، ایک میرے لیے تھا اور تیسرا باتھ روم بالکل الگ تھلگ ملازم میاں بیوی کے استعمال کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ولایت بی بی، مالکن کی ڈانٹ سن کر ہکا بکا رہ گئی اور بے ساختہ اس نے باتھ روم کی بیرونی کنڈی کی طرف دیکھا.....''

نادر خاں اتنا بتانے کے بعد ذرا دیر کے لیے تھما ایک گہری سی سانس لی پھر دوبارہ گویا ہوا ''ولایت کو چھوٹی امی کا چیختا ہوا سوال سن کر شاید اتنی حیرت نہیں ہوئی ہوگی جتنی حیرانی یہ دیکھ کر ہوئی کہ باتھ روم کی باہر والی کنڈی تو کھلی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹی امی سے کہا، بی بی جی! کنڈی کو تو کسی نے بند نہیں کیا۔ آپ تھوڑا سا زور لگا کر دروازہ کھولیں تو یہ فوراً کھل جائے گا۔ ان دروازوں نے نیا رنگ پیا ہے نا اور اوپر سے موسم بھی بڑا اٹھتا ہے۔ لگتا ہے، دروازہ پھول کر پھنس گیا ہے۔ آپ اسے زور سے اپنی طرف کھینچیں۔ اندر سے چھوٹی امی کی غصیلی آواز آئی، میں اتنی دیر سے زور ہی تو لگا رہی ہوں مگر یہ نامراد کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا..... اور تم ہر وقت فلسفیوں جیسی باتیں نہ کرتی رہا کرو۔ میں تم سے زیادہ جانتی ہوں کہ لکڑی کس موسم میں پھولتی ہے اور کس موسم میں سکڑ جاتی ہے اور..... اور رنگ پینے کے بعد اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے، سمجھی نا! ولایت بی بی کافی عرصے سے یہاں ملازم ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ فلسفی نہ سہی مگر اس میں، میں نے مصلحت اندیشی ضرور دیکھی ہے۔ اس نے موقع محل کی نزاکت کو محسوس کرتے ہی چھوٹی امی کے سامنے ہتھیار پھینک دیے، کسی قسم کی بحث تکرار میں وقت ضایع کرنے کے بجائے اس نے کہا، بی بی جی! آپ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو جائیں۔ میں باہر سے دھکا دیتی ہوں۔ چھوٹی امی نے کہا، ٹھیک ہے۔ تم مارو دھکا۔ ولایت نے گرین سگنل ملتے ہی دھکا مارا اور ایک دھڑاکے سے باتھ روم کا دروازہ کھل گیا۔ چھوٹی امی منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتی ہوئی اوپر چلی گئیں اور ولایت بی بی اپنے کمرے کی طرف آ گئی۔ ابھی وہ بستر پر آ کر لیٹی ہی تھی کہ اوپر سے چھوٹی امی نے ایک مرتبہ پھر اسے پکار لیا۔ اس بار وہ ولایت بی بی کو اپنے کمرے والی آتش زدگی کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے فوراً اوپر آنے کو کہہ رہی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ بھی پیش آیا، وہ میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں تھانے دار صاحب!''

وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو اختتام دیتے ہوئے بولا ''یہ ساری باتیں مجھے ولایت بی بی نے بتائی ہیں۔''

اس کی بیان کردہ تفصیل سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ آتش زدگی کا یہ واقعہ بڑے حیرت انگیز اور ناقابل یقین انداز میں پیش آیا تھا۔ شکیلہ باتھ روم جانے کے لیے رات کے آخری پہر بالائی منزل سے زیریں منزل پر آئی۔ اس کا مطلب ہے، وہ اپنے شوہر اور شیر خوار بچے کو صحیح سلامت خواب گاہ میں چھوڑ کر آئی تھی یعنی اس وقت تک، دور دور تک آتش زدگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس نے باتھ روم میں کتنا وقت لگایا ہوگا؟ یہی کوئی پانچ دس منٹ یا زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ! یخ بستہ راتوں میں عموماً پیشاب کی حاجت انسان کو گرم بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے اور اس حاجت کو رفع کرنے کے لیے دو تین منٹ کافی ہوتے ہیں لیکن معاملہ گڑبڑ دکھائی دے رہا تھا۔ شکیلہ یہی وقت باتھ روم میں گزارنے کے بعد جب اپنی خواب گاہ میں پہنچی تو سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی اور ذہن میں ان گنت مہلک خیالوں کو جنم دیتی تھی مثلاً.....

اچانک خواب گاہ کے اندر آگ بھڑکی کیسے؟ اگر شکیلہ نے باتھ روم کے اندر اپنی حاجت کو پورا کرنے کے لیے فطری وقت لیا تھا تو پھر اس قلیل مدت میں آگ نے کس طرح دو انسانوں کو کوئلوں میں بدل دیا؟ اور اگر شکیلہ غیر معمولی دیر تک باتھ روم میں موجود رہی تھی تو کیوں، کس لیے؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کسی نے شکیلہ کی غیر موجودگی میں، خواب گاہ کے اندر گھس کر وہاں آگ لگا دی ہو؟ اگر ایسا ہی تھا۔ تو پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ وہ فتنہ پرور شخص کون ہے؟ اس کے مقاصد کیا تھے؟؟؟

ان.....اور ان جیسے دوسرے متعدد سوالات کے جواب شکیلہ ہی دے سکتی تھی اور وہ فی الحال کسی جواب کے قابل نہیں تھی لہٰذا میں نے اپنی توجہ اور روئے سخن نادر خاں کی طرف موڑ لیا۔

''تمہارے خیال میں یہ آگ کس نے لگائی ہوگی؟'' میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

''جج..... جی.....؟'' وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے دیکھنے لگا۔

پتا نہیں، کیوں! مجھے یہ احساس مسلسل ستا رہا تھا کہ آتش زدگی کا وہ واقعہ اپنے جلو میں کچھ اور بھی لیے ہوئے تھا جو فی الحال میری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ میں اسی چھپی ہوئی، دل میں اندیشے اور دماغ میں خدشے جگاتی بات کو سامنے لانا چاہتا تھا۔ اسی تناظر میں ایک خاص مقصد کی خاطر میں نے نادر خاں سے وہ چبھتا ہوا سوال کیا تھا جس کا جواب دیتے ہوئے وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔ میرے اس خطرناک سوال نے اسے گڑبڑا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''کیا تم ایسا نہیں سوچتے کہ کسی نے خاص مقصد کے تحت آگ لگا دی ہو؟''

''جناب! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔'' اس کی حیرت اور الجھن بتدریج بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ''کوئی جان بوجھ کر کیوں آگ لگائے گا اور ایسا شخص ہو کون سکتا ہے۔ یہاں تو کوئی کسی کا دشمن نہیں!''

میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر قدرے نرم لہجے میں کہا ''نادر خاں! تفتیش کا عمل بڑا ہی ٹیڑھا اور کٹھن ہوتا ہے۔ اس میں ہر زاویے سے سوال کیا جا سکتا ہے لہٰذا تم میرے کسی سوال پر پریشان نہیں ہونا۔ مجھے ہر پہلو اور ہر امکان کو اپنی نگاہ میں رکھنا ہے۔'' میں تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ آگ کے بھڑکنے کو جس انداز میں بیان کیا جا رہا ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں بیٹھ رہا۔ کسی کمرے میں لگنے والی آگ آناً فاناً میں وہاں سوئے ہوئے افراد کو جلا کر کوئلا نہیں کر سکتی۔ آتش زدگی کے ایسے واقعات میں دھواں بھی وافر مقدار میں پیدا ہوتا ہے جو سوئے ہوئے افراد کی سانس کے ساتھ ان کے پھیپھڑوں تک رسائی حاصل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لیتا ہے جس کے سبب انہیں کھانسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ نیند چاہے کتنی بھی گہری کیوں نہ ہو، وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ اور دم گھٹنے کی اسی کیفیت کے دوران میں وہ خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ضرور مارتے ہیں لیکن.....''

میں نے سانس لینے کی خاطر تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''.....لیکن یہاں تو بالکل ہی مختلف صورتِ حال نظر آ رہی ہے۔ ٹھیک ہے، جبران کی عمر اتنی نہیں کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے کوئی سود مند اور نتیجہ خیز جدوجہد کر سکتا مگر تمہارے ابا جی کو کیا ہو گیا تھا۔ کیا وہ کوئی گہرا نشہ پی کر سویا تھا؟''

وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! آپ کی باتوں میں بڑا وزن ہے۔ پتا نہیں کیوں، اس نکتے کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا..... آپ کے ان خطرناک سوالات کا جواب تو چھوٹی امی ہی دے سکتی ہیں۔''

''میں تمہاری چھوٹی امی سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا ''اس سے تو اور بھی بہت سارے سوالات پوچھنا ہیں۔ میرے ذہن میں بہت کچھ ہے۔ ابھی تو یہ جاننا بھی باقی ہے کہ آگ لگی کیسے؟''

نادر خاں نے چونک کر میری طرف دیکھا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا ''آگ لگنے کا سبب میری سمجھ میں آ رہا ہے مگر پتا نہیں، میں کہاں تک درست ہوں!''

''ہاں ہاں، بولو..... تمہارے ذہن میں کیا ہے؟'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ جو کچھ بولا، میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ اس حوالے سے میں نے اوپر والی خواب گاہ میں کچھ ایسے آثار دیکھے تھے جو آتش زدگی کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ میں پوری توجہ سے نادر خاں کی بات سننے لگا۔

''تھانے دار صاحب!'' اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''آج کل سردیوں کا موسم ہے اور اس سال تو سردی بھی کچھ زیادہ ہی پڑ رہی ہے۔ نیچے والی منزل پر تو لحاف وغیرہ سے گزارہ ہو جاتا ہے لیکن اوپر یہ لوگ لحاف اوڑھنے کے ساتھ ساتھ کوئلوں والی انگیٹھی بھی جلاتے ہیں تاکہ کمرا اچھی طرح گرم ہو جائے۔'' وہ بولتے بولتے رکا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہو سکتا ہے، جب چھوٹی امی نیچے والے باتھ روم کی طرف آنے کے لیے کمرے سے نکلی ہو تو لحاف کا کوئی کونا پلنگ سے نیچے لٹک گیا ہو..... اور بدقسمتی سے وہ کونا کوئلوں والی انگیٹھی میں جا گرا ہو جہاں پر دہکتے ہوئے کوئلوں نے اسے آگ دکھا دی ہو اور.....!''

وہ اچانک رکا اور سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اپنی دانست میں اس نے آگ لگنے کے سبب کی وضاحت پیش کر دی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میرے ذہن میں بھی یہ امکان موجود ہے اور میں نے اوپر والی خواب گاہ میں کوئلوں والی ایک انگیٹھی بھی رکھی ہوئی دیکھی ہے جو اب صرف نام ہی کی انگیٹھی رہ گئی ہے لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ اسی انگیٹھی کی وجہ سے آگ لگی تھی تو پھر بھی میرے اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ اتنی جلدی آگ نے سب کچھ کیسے نگل لیا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمہاری چھوٹی امی کوئی گھنٹا بھر باتھ روم میں بیٹھی رہی ہوں؟''

''ہاں، یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی!'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں نے کہا ''اس معمے کے علاوہ بھی دو ایسی چیزیں ہیں۔ جو ابھی تک مجھے ہضم نہیں ہو سکیں۔ ان کے متعلق تم ہی مجھے بتا سکتے ہو!''

''جی کیا..... کون سی چیزیں'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے چند لمحات تک اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور کہا ''ایک چیز تو بنا سپتی گھی والا ایک سیر کا ڈبا ہے۔ کمرے میں بھڑکنے والی آگ نے اسے نگلنے کی پوری کوشش کی ہے۔ وہ اس کی دھات کو تو نہیں کھا سکی البتہ، اس کے رنگ، روغن اور چھپائی کو اس نے صاف کر دیا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کون سی، بنا سپتی گھی بنانے والی کمپنی سے تعلق رکھتا ہے مگر میرے ذہن میں مسلسل یہ سوال گونج رہا ہے کہ اس ڈبے کو کس مقصد کی خاطر خواب گاہ میں رکھا گیا تھا۔ کیا تمہارے پاس اس سوال کا جواب ہے؟''

''میں نے تو وہاں ایسا کوئی ڈبا پڑا ہوا نہیں دیکھا!'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''شاید پریشانی کے سبب تمہارا اس طرف دھیان نہ گیا ہو۔ آؤ میرے ساتھ، ذرا بالائی منزل والے بیڈ روم میں چلتے ہیں۔''

پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اوپر والے کمرے میں پہنچ گئے۔

میں نے مذکورہ ڈبا نادر خاں کو دکھاتے ہوئے کہا ''میں اس بنا سپتی گھی والے ڈبے کی بات کر رہا ہوں۔ تم خود اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں سے دیکھ لو، آگ نے اس کا کیا حشر کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، یہ سفاک آگ صرف دو مقاصد کے لیے بھڑکی تھی۔ نمبر ایک، قادر خاں اور جبران خاں کو کوکلا بنانے کے لیے اور نمبر دو..... اس ڈبے کی شناخت مٹانے کے لیے..... تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟''

''جی..... میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں!'' وہ وحشت زدہ انداز میں بولا ''یہ تو آپ چھوٹی امی سے پوچھیں، اس نے بنا سپتی گھی والا یہ ڈبا کس مقصد کے لیے یہاں رکھا تھا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں البتہ، میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس ڈبے کا ستیاناس صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ گھی والا ڈبا تھا۔ تیل اور گھی بڑی آسانی سے آگ پکڑ لیتے ہیں۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو!'' میں نے سرکو معنی خیز انداز میں اثباتی جنبش دی اور کہا ''اس ڈبے کے بارے میں، میں تمہاری چھوٹی امی ہی سے پوچھوں گا۔ ہوسکتا ہے، وہ اس سلسلے میں کوئی وضاحت پیش کرسکیں۔''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! آپ نے اس کمرے میں سے دو ایسی چیزیں ملنے کی بات کی تھی جو آپ کے ذہن کو الجھا رہی ہیں۔ ان میں ایک تو گھی والا یہ ڈبا تھا اور دوسری.....؟''

میں نے دوسری شے کا ذکر کرنے سے پہلے اس سے پوچھ لیا ''نادر خاں! کیا تمہیں لاکٹ وغیرہ پہننے کا شوق ہے؟''

مجھے آتش زدہ کمرے سے جو طلائی لاکٹ ملا تھا وہ اس وقت میری جیب میں موجود تھا۔ اس لاکٹ کے تعویذ والے منقش بیضوی حصے میں انگریزی حرف این (N) بڑا واضح ابھرا ہوا تھا۔ نادر خاں کا نام بھی چونکہ ''این'' سے شروع ہوتا تھا لہٰذا لاکٹ سے متعلق سوال اسی سے پوچھنا بنتا تھا۔

وہ میرا سوال سنتے ہی چونک اٹھا، بولا ''آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

''بتاؤں گا..... پہلے تم ہاں یا نہ میں میرے سوال کا جواب دو؟''

''جی، مجھے لاکٹ پہننے کا شوق ہے!'' اس نے بتایا۔

''کیا اس وقت بھی تم نے کوئی لاکٹ پہنا ہوا ہے؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''وہ..... وہ جی چند روز پہلے میرا لاکٹ کہیں گر گیا تھا۔'' اس نے متاسفانہ انداز میں جواب دیا۔ ''ابھی تک میں نیا لاکٹ نہیں بنوا سکا ہوں۔''

''کیا تم نے گم ہوجانے والے لاکٹ کو تلاش کیا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی، بہت تلاش کیا مگر ملا نہیں۔'' نادر خاں نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا ''اس کو ڈھونڈنے کے لیے میں نے اپنے کمرے کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ مجھے اس لاکٹ سے بڑی انسیت تھی!''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''کمرا الٹ کر رکھ دینے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہارے خیال میں وہ لاکٹ گھر کے اندر ہی کہیں کھویا تھا؟''

''جی ہاں، بالکل۔ مجھے یقین ہے.....!''

''کیا تم نے اپنے ملازمین کو لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا؟''

''جی ہاں، بتایا تھا۔ غلام حسین اور ولایت بی بی نے بھی لاکٹ کو ہر جگہ تلاش کرلیا مگر وہ کہیں بھی نہیں مل سکا تھا۔ چھوٹی امی اور اباجی بھی میرے سونے کے لاکٹ کی گمشدگی سے واقف ہیں۔'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چھوٹی امی نے تو فوراً فتویٰ جاری کردیا تھا کہ میں نے اس لاکٹ کو گھر سے باہر کہیں کھویا ہوگا اگر وہ گھر کے اندر کہیں گرتا تو ضرور مل جاتا۔ اباجی، چھوٹی امی کی بہت مانتے ہیں..... میرا مطلب ہے، مانتے تھے انہوں نے بھی امی کی بات کی تائید کردی اور تسلی دینے والے انداز میں مجھ سے کہا تھا، لاکٹ جہاں بھی کھویا، اس بات کو جانے دو۔ خوامخواہ پریشان ہونے کا کیا فائدہ! تم اپنے لیے ویسا ہی دوسرا لاکٹ بنوا لینا..... لیکن میں ابھی تک لاکٹ نہیں بنوا سکا۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بوجھل ہوگئی۔ داغ مفارقت دے جانے والے باپ کے ذکر نے اسے بے حد افسردہ کردیا تھا۔

میں بڑی گہری نظر سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ واقعی بڑا دل گرفتہ اور اندر باہر سے ٹوٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحات تک خاموش نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''نادر خاں! ہم اتنی دیر سے جس طلائی لاکٹ کا ذکر کررہے ہیں، کہیں یہ وہی لاکٹ تو نہیں جس کے خوب صورت بیضوی تعویذ پر این کا حرف بڑے نمایاں انداز میں ابھرا ہوا ہے؟''

''جج..... جی ہاں، وہی.....!'' وہ اضطراری انداز میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلدی سے بولا ''آپ میرے کھوئے ہوئے لاکٹ کے بارے میں کیسے جانتے ہیں تھانے دار صاحب؟''

''میں اس لاکٹ کے بارے میں ایسے جانتا ہوں کہ اب یہ گمشدہ نہیں رہا!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کک..... کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ الجھ کر بولا۔ اس کی الجھن میں وزن محسوس ہوتا تھا۔

''مطلب یہ کہ وہ لاکٹ بازیاب ہو چکا ہے!''

''کہاں ہے میرا وہ لاکٹ؟''

''میری جیب میں ہے!''

''آپ کی جیب میں؟'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا ''آپ کوئی مذاق تو نہیں کر رہے!''

''بالکل نہیں!'' میں نے اس کی مضطربانہ کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''آپ کے پاس میرا لاکٹ کیسے جا سکتا ہے.....؟'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا پھر ہیجانی لہجے میں بولا ''ایسے مجھے یقین نہیں آئے گا اگر میرا وہ لاکٹ آپ کی جیب میں ہے تو دکھائیں۔''

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، خاموشی سے وہ لاکٹ برآمد کیا اور بہ آہستگی اس کی جانب بڑھا دیا پھر سپاٹ لہجے میں کہا ''لو..... دیکھ کر اور چھو کر یقین کر لو!''

میرے ہاتھ میں لاکٹ کو دیکھتے ہی اس کے چہرے اور آنکھوں میں شناسائی کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس نے ایک نظر میں شناخت کے تمام مراحل طے کر لیے تھے۔ اس نے لاکٹ کو اپنے ہاتھوں میں بڑی محبت اور لگاوٹ سے گھمایا پھرایا جیسے کوئی بچھڑے ہوئے دوست کے گلے ملتا ہے۔ اس دوران میں، میں اس کی حرکات و سکنات کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بدن کی جنبشوں اور چہرے کے تاثرات میں مجھے ایک فیصد بھی بناوٹ، تصنع یا اداکاری نظر نہ آئی۔ وہ اس وقت ایک سچی اور فطری جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ چند لمحات کی ''تسلی'' کے بعد اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ..... یہ آپ کو..... کہاں سے ملا.....؟''

''اسی کمرے میں سے'' میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے!''

''میں تو اس لاکٹ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''میں نے تو نہیں پہنچایا'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''آج ہماری پہلی ملاقات ہے۔ اس سوال کا جواب تو تم دو گے کہ یہ لاکٹ تمہاری چھوٹی امی کی خواب گاہ میں کیسے پہنچ گیا؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا اگر مجھے پتا ہوتا کہ میرا لاکٹ چھوٹی امی کے کمرے میں ہے تو میں اسے اِدھر اُدھر کیوں تلاش کرتا پھرتا؟''

''ٹھیک ہے!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ آؤ، نیچے چلتے ہیں۔ جس کی خواب گاہ سے مجھے یہ لاکٹ ملا ہے اسی سے جا کر پوچھتا ہوں۔''

وہ الجھتا ہوا ایک مرتبہ پھر میرے ہمراہ کوٹھی کی زیریں منزل پر آ گیا۔

واقعی، یہ سوال بڑا اہم تھا کہ نادر خاں کا گمشدہ لاکٹ متوفی قادر خاں کی خواب گاہ میں کیسے پہنچ گیا۔ قادر خاں تو کسی جواب دہی کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ دنیاوی سوال و جواب سے اتنی دور چلا گیا تھا جہاں اسے ہماری اور ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ہاں البتہ، قادر خاں کی خواب گاہ شکیلہ کی بھی اتنی ہی خواب گاہ تھی لہٰذا یہ سوال اب اسی سے پوچھا جا سکتا تھا!

یہی نہیں، مجھے شکیلہ سے اور بھی بہت سارے سوالات پوچھنا تھے مثلاً، خواب گاہ میں آگ کیسے لگ گئی؟ وہ کتنی دیر تک باتھ روم میں موجود رہی تھی؟ جب وہ خواب گاہ سے نکل کر باتھ روم کی طرف آ رہی تھی تو قادر خاں اور جبران خاں کس پوزیشن میں اور کیسے سوئے ہوئے تھے؟ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ کنگ سائز پلنگ پر سوتے تھے۔ اس پلنگ کے ساتھ ہی، بچے کے لیے کھٹولا قسم کی ایک چھوٹی چارپائی بھی بچھائی جاتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس پلنگ اور کھٹولا چارپائی کا حشر دیکھا تھا۔ وہ دونوں رزق آتش بننے کے بعد راکھ کے ڈھیر میں بدل گئے تھے۔ شکیلہ سے یہ پوچھنے کی ضرورت تھی کہ جب وہ کمرے سے نکلی تو شیر خوار بچہ اپنے کھٹولے میں سو رہا تھا پھر بڑے پلنگ پر؟ ایک سوال یہ بھی تھا کہ گھی والا خالی ڈبا اس کے بیڈ روم میں کس مقصد سے لایا گیا تھا اور..... یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ باتھ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگنے کی کیا حقیقت تھی؟ اس نے چیخ کر ولایت بی بی کو اپنے پاس بلایا تھا۔ کہ دیکھے کس بدبخت نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں شکیلہ سے وہ تمام سوالات پوچھنا چاہتا تھا جنہوں نے میری سوچ کو تہ و بالا کر رکھا تھا۔ ویسے اب تک کی تفتیش سے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ وہ آتش زدگی کا کوئی عام سا واقعہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے مجھے کسی گہری سازش کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ کون سی اور کس کی سازش؟..... یہ ابھی واضح نہیں ہو سکا تھا۔ فی الحال، میں نے اپنے ذہن میں دو ناموں کو سرخ دائرے کے اندر مقید کر لیا تھا۔

ان میں ایک نام تھا نادر خاں کا اور دوسرا نام تھا شکیلہ کا۔

نادر خاں کا لاکٹ مجھے جائے وقوعہ پر پڑا ملا تھا۔ میرے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ آیا واقعی اس کا لاکٹ کھو گیا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب ''نہیں'' تصور کر لیا جاتا تو نادر خاں کی شخصیت شک کے دائرے کے اندر بند ہو کر رہ جاتی تھی اور اگر اس سوال کا جواب ''ہاں'' سمجھ لیا جاتا تو پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ مذکورہ لاکٹ کسی ایسے شخص نے چرایا تھا جو اس حادثے کا ذمے دار ہے۔ لاکٹ کو جائے واردات پر پھینک کر، نادر خاں کو اس حادثے میں ملوث کرنے کی سازش کی گئی تھی اور ایسا کردار فی الحال شکیلہ کی جانب اشارہ کرتا تھا مگر اس صورت میں ایک انتہائی خطرناک سوال سر اٹھا کر کھڑا ہو جاتا تھا..... کیا کوئی عورت اتنی شقی القلب ہو سکتی ہے کہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ ایسی سازش بن ڈالے جس میں وہ اپنے دو سال کے معصوم اور شیر خوار بچے کو بھی جلا ڈالے؟

دل و دماغ اس سوال کا جواب نفی میں دیتے تھے اور یہی بات میرے ذہن کو سب سے زیادہ الجھا رہی تھی۔ ہم زیریں منزل پر پہنچ چکے تھے اور اس کمرے میں بھی آ بیٹھے تھے جہاں سے اٹھ کر تھوڑی دیر پہلے اوپر گئے تھے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ نادر خاں نے ملازمین سے پوچھنے کے بعد مجھے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! چھوٹی امی اس وقت گہری نیند میں ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ سو رہی ہیں یا بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میرے خیال میں، اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے!''

میں نے نادر خاں اور شکیلہ کے حوالے سے اپنے ذہن میں جو ''سوتیلی فضا'' قائم کی تھی، نادر خاں کا حالیہ رویہ اس کی نفی کرتا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے محسوس کیا، وہ اپنی سوتیلی ماں کے لیے خاصا پریشان تھا اور اس کی صحت کی بحالی کے لیے وہ شکیلہ کو فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ عمل میری سوچی ہوئی مخصوص فضا سے لگا نہیں کھاتا تھا اور..... یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔

''کیا میں شکیلہ کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟'' میں نے نادر خاں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تعاون آمیز انداز میں بولا ''ہاں ہاں، ضرور..... کیوں نہیں.....!''

میں نادر خاں کی معیت میں، اس کمرے میں داخل ہو گیا جہاں ایک بستر پر شکیلہ گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا پورا بدن گرم لحاف میں ڈھکا ہوا تھا، صرف چہرہ کھلا ہوا تھا۔ خوابیدہ چہرے کے خال و خط نے مجھے بتا دیا، وہ ایک خوب صورت اور پُرکشش عورت تھی۔ میں نے لحاف کے بہ غور مشاہدے سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ زندہ تھی تاہم اس کی سانس بہت مدھم چل رہی تھی۔ یہ بتانا ممکن نہیں تھا کہ وہ اس وقت گہری نیند میں ہے یا صدمہ کی زیادتی نے اسے بے ہوش کر دیا ہے۔

ولایت بی بی، شکیلہ کی نگرانی اور دیکھ بھال پر مامور تھیں، اس نے نہایت ہی دکھی لہجے میں کہا ''تھانے دار صاحب! بی بی جی کی حالت ٹھیک نہیں۔ میں نے اب تک بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی سوئی ہیں۔ خاوند اور بچے کے غم نے ان کا دماغ الٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس گھر پر تو اچانک ہی قیامت ٹوٹ گئی ہے!''

وہ اپنی فہم و فراست کے مطابق، حالات کا بالکل درست تجزیہ کر رہی تھی۔ میں نے اس کے تبصرے پر کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور نادر خاں سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے تمہاری کوٹھی کے باہر، دیوار کے ساتھ ایک گرے فورڈ کار کھڑی دیکھی ہے۔ کیا وہ تمہاری ہی گاڑی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ''جی ہاں، وہ ہماری ہی گاڑی ہے۔''

''تم فوراً جاؤ اور اس گاڑی میں ڈاکٹر کو لے کر آ جاؤ۔'' میں نے اس سے کہا ''تمہاری چھوٹی امی کی حالت ایسی نہیں کہ اسے کسی ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچایا جائے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے حیرت ہے، ابھی تک کسی ڈاکٹر کو یہاں کیوں نہیں بلایا گیا؟''

نادر خاں نے کہنا چاہا ''وہ جناب! حادثہ رات کے آخری پہر.....!''

لیکن میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی ''ٹھیک ہے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتش زدگی کا واقعہ رات تین، سوا تین بجے پیش آیا تھا لیکن ہم تو دن چڑھے یہاں پہنچے ہیں۔ اس سے پہلے تمہیں کسی ڈاکٹر سے ضرور رجوع کرنا چاہیے تھا!''

میرا لہجہ ڈانٹ آمیز تھا، نادر خاں ندامت بھرے انداز میں بولا ''بس جی، اس پریشانی نے تو مت ہی مار کر رکھ دی ہے۔ ہوش ٹھکانے پر ہوتا تو دھیان اِدھر بھی جاتا۔'' پھر وہ سر کو فی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔

''میں ابھی جاتا ہوں جناب! اور فائف ڈاکٹر صاحب کو لے کر آتا ہوں۔''

نادر خاں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو غلام حسین بھی اس کے پیچھے لپکا لیکن نادر نے اسے روک دیا ''تم اِدھر گھر ہی میں رکو۔ میں بھی اچھی خاصی ڈرائیونگ کر لیتا ہوں۔''

ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ غلام حسین متوفی قادر خاں کے لیے ڈرائیونگ بھی کرتا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی ایک عرصے سے ان کے ہاں ملازم تھے۔ پہلے قادر خاں ماڈل کالونی میں رہتا تھا۔ جب شہر کے مضافات میں ''فرید ٹاؤن'' آباد ہونے لگا تو اس نے اس جدید رہائشی منصوبے میں پلاٹ خرید کر اپنے لیے ایک دو منزلہ عالیشان کوٹھی تعمیر کروالی تھی۔ یہ کوٹھی ویسے تو بالکل تیار تھی تاہم اندرونی آرائش و زیبائش کا کچھ کام باقی تھا۔ انہیں اس کوٹھی میں شفٹ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

ایک بات یقیناً آپ کے ذہن کو الجھا رہی ہو گی لہٰذا آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہے کہ میں آپ کی الجھن دور کر دوں۔ یہ ایک طرح سے میرا فرض بھی ہے۔ آپ لگ بھگ ربع صدی سے سسپنس ڈائجسٹ کے ان صفحات میں میری پیشہ ورانہ زندگی کے واقعات پڑھ رہے ہیں۔ کوارٹر سینچری کی رفاقت کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ کم از کم دو نسلوں کی ذہنی اور قلبی وابستگی میں اپنے ساتھ محسوس کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کے تاثرات، جذبات اور محسوسات اکثر و بیشتر مختلف ذرائع سے مجھ تک پہنچتے رہتے ہیں۔ ان محبتوں اور چاہتوں کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ محکمہ پولیس کے اندر ایک فٹ کانسٹیبل سے لے کر آئی جی تک مجھے ہر شخص سے پذیرائی ہی ملی ہے اور محکمے کے باہر..... خصوصاً سسپنس ڈائجسٹ کے توسط سے مجھے آپ جیسے قدر شناس اور بیدار مغز قارئین کا خصوصی برتاؤ دیکھنے کو ملا۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہے..... مگر میں یہاں آپ سے کچھ اور کہنے، کچھ اور بتانے والا تھا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں پنجاب کے دور دراز گاؤں دیہات کی خاک چھانتے ہوئے اچانک شہر کے مضافات میں آباد، اس وقت کے لحاظ سے ایک جدید رہائشی منصوبے ''فرید ٹاؤن'' میں کیا کرتا پھر رہا ہوں؟ تو اس سلسلے میں، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں تو ملک کی تقسیم سے پہلے ہی محکمہ پولیس سے وابستہ ہو گیا تھا۔ یہاں ''ملک'' سے مراد متحدہ ہندوستان ہے۔ بعد میں، یہ بڑا سا ملک ''پاکستان'' اور ''انڈیا'' نامی دو ملکوں میں بٹ گیا۔ تقسیم سے قبل میں مشرقی پنجاب کے ایک ضلع امرتسر میں تھا اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے سب انسپکٹر کے عہدے تک پہنچ چکا تھا پھر قیام پاکستان کے بعد میں مغربی پنجاب یعنی پاکستان کے حصے میں آنے والے صوبہ پنجاب کے ایک تھانے میں تعینات ہو گیا۔ اس کے بعد صوبہ پنجاب کے مختلف گاؤں دیہات میں میری پوسٹنگ ہوتی رہی۔ ابتدا میں، چونکہ ملک کے ہر شعبے میں مسائل کی زیادتی اور وسائل کی کمی تھی لہٰذا محکمہ پولیس کا بھی یہی حال تھا۔ میں عہدے کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ لیکن نفری کی کمی کے باعث..... خصوصاً افسران کی تعداد کم ہونے کے سبب مجھے ڈائریکٹ تھانہ انچارج بنا دیا گیا، گویا میں تھانے دار بن گیا۔

میں نے اپنی زندگی میں دیانت داری اور فرض شناسی کے دامن کو ایک لمحے کے لیے بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ہمیشہ مظلوم کی دادرسی کی اور ظالم کا ہاتھ توڑا۔ نیکی کی اس راہ میں، بدی کے خلاف جنگ کرتے ہوئے مجھ پر بہت مشکل وقت بھی آئے اور مجھے کڑے امتحانات سے بھی گزرنا پڑا لیکن میں ہتھیار پھینکنے کے بجائے اس محاذ پر ڈٹا رہا۔ اسی ثابت قدمی، استقلال اور عزم نے مجھے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھنے دیا اور ہر کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد کامیابی نے میرے قدم چومے۔ میں قدم قدم آگے بڑھتا رہا اور منزلیں مارتے ہوئے بالآخر ڈی ایس پی کے عہدے تک جا پہنچا..... اور پھر ایک طویل عرصے کے بعد میں اسی عہدے پر ریٹائر ہو گیا۔ میری پیشہ ورانہ زندگی کے دلچسپ واقعات کہانی کے انداز میں پہلے محترم عبدالقیوم شاد کے قلم اور سسپنس ڈائجسٹ کے توسط سے آپ تک پہنچتے رہے۔ شاد صاحب کے انتقال کے بعد، میرے قابل صد احترام دوست معراج رسول صاحب نے اس کام کی ذمے داری حسام بٹ کو سونپ دی۔ گزشتہ دس بارہ سال سے حسام بٹ صاحب میرے پیشہ ورانہ تجربات کو رقم کر رہے ہیں۔ میری پوسٹنگ چونکہ زیادہ تر گاؤں دیہات اور چھوٹے قصبہ جات میں رہی اس لیے آپ کو ایک مخصوص فضا کی کہانیاں پڑھنے کو ملتی رہی ہیں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انشاءاللہ! آئندہ بھی ملتی رہیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی آپ وہ سنسنی خیز اور تحیر آمیز واقعات بھی انہی صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے جو بحیثیت ''ڈی ایس پی'' میری پیشہ ورانہ زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے، یہ کہانیاں آپ کو بے حد متاثر بلکہ مبہوت کر کے رکھ دیں گی۔

زیرِنظر واقعہ ان دنوں کا ہے جب میرے ڈی ایس پی بننے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا لہٰذا اس زمانے میں مجھے شہروں اور ان کے مضافات کے تھانوں میں بھی تعینات کیا جاتا رہا۔ میرے خیال میں، اس وضاحت کے بعد تو آپ کی ذہنی الجھن دور ہو گئی ہو گی۔ یقیناً آپ کا جواب ہو گا..... ''ہاں!'' تو آئیں واپس وہیں چلتے ہیں جہاں سے آتش زدگی والے موجودہ کیس کا رابطہ ٹوٹا تھا۔

نادر خاں کے جانے کے بعد مجھے اچھا موقع مل گیا تھا کہ ان ملازم میاں بیوی کا بیان بھی لے لوں۔ ولایت بی بی مصر تھی کہ وہ اپنی بی بی جی کو تنہا چھوڑ کر مجھے کسی قسم کا کوئی ''انٹرویو'' نہیں دے گی لہٰذا میں نے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کمرے کا دروازہ کھول لے جہاں شکیلہ بے خبری کی نیند سو رہی تھی اور میں کرسی ڈال کر اس کے قریب ہی، کمرے سے باہر بیٹھ جاتا ہوں۔ غلام حسین کو بھی میری تجویز پسند آئی اور وہ بھی میرے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھ گچھ کے سلسلہ کا آغاز غلام حسین ہی سے کیا۔

غلام حسین کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہو گی۔ رنگ گندمی، قد درمیانہ اور جسم مائل بہ فربہی۔ اس نے خاصی صحت مند مونچھیں پال رکھی تھیں، اس بات کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک بے اولاد جوڑا تھا۔ غلام حسین اور اس کی بیوی، ولایت بی بی کو متوفی قادر خاں کے پاس ملازمت کرتے ہوئے پانچ سال ہو گئے تھے۔ گھر کا سارا کام کاج انہوں نے مل بانٹ کر اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ غلام حسین ڈرائیور رنگ کرتا تھا، گھر میں موجود پودوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور سودا سلف لانا بھی اسی کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی بیوی صفائی ستھرائی اور دھلائی کے علاوہ کھانے پکانے کے دوران میں شکیلہ کا ہاتھ بٹاتی تھی اور دیگر اوپر کے چھوٹے موٹے کام بھی اسی کے ذمے تھے۔

میں نے دس منٹ تک گھما پھرا کر غلام حسین سے مختلف سوالات کیے لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہ آ سکی۔ گزشتہ رات وہ حسبِ معمول نو بجے کے قریب سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا تھا اور جلد ہی اسے نیند بھی آ گئی تھی پھر اس کی آنکھ ولایت بی بی کے جگانے پر ہی کھلی تھی۔ بیوی نے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اسے اطلاع دی تھی کہ اوپر بی بی کے کمرے میں آگ لگ گئی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ دونوں مل کر نادر خاں کو جگانے گئے تھے اور آخر کار وہ تینوں زینے کے راستے گھر کی بالائی منزل پر جا پہنچے تھے۔

غلام حسین کے بیان میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو مجھے پہلے سے معلوم نہ ہو لہٰذا میں نے اسے فارغ کر دیا۔ اب ولایت بی بی کی باری تھی۔ میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

ولایت بی بی کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس سال کے قریب لگایا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کی ایک پستہ قامت عورت تھی۔ اس کے ہاتھ بہت چھوٹے چھوٹے اور پلپلے سے تھے، آنکھوں میں بڑی تیزی اور طراری پائی جاتی تھی۔ اس کے بالوں کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وقت سے پہلے سفید ہو جانے والے سر کو اس نے خضاب کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ غلام حسین کسی کام سے اٹھ کر کہیں چلا گیا تو میں نے ولایت بی بی کا انٹرویو شروع کر دیا۔

''تم لوگوں کو اس گھر میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''اس گھر میں آئے ہوئے تو ابھی تھوڑے دن ہی ہوئے ہیں۔'' ولایت بی بی نے جواب دیا ''پہلے ہم ماڈل کالونی والے گھر میں رہتے تھے۔ قادر خاں کے پاس ملازم ہوئے ہمیں کوئی پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

''مجھے پتا چلا ہے، قادر خاں نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا ''نادر نے مجھے بتایا ہے کہ شکیلہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔ کیا نادر خاں کی سگی ماں بھی زندہ ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''نادر خاں کی سگی ماں کا نام صابرہ بیگم تھا۔ جب ہم ماڈل کالونی والے گھر میں تھے تو اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ کوئی تین ساڑھے تین سال پہلے کی بات ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر افسوس ناک انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

''بے چاری بہت اچھی عورت تھی۔ آخری دنوں میں اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہا تھا۔ ہر وقت پاگلوں کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہتی تھی۔ پھر ایک روز مکان کی چھت سے نیچے گر گئی..... اور وہیں، فرش پر پڑے پڑے اس نے جان دے دی۔ آہ.....! کتنی حسرت ناک موت ہوئی تھی اس کی بھی!''

ولایت بی بی ایک دم افسردہ ہو گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ مرحومہ صابرہ بیگم سے گہری جذباتی وابستگی رکھتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ ولایت بی بی کی زبانی جو حالات میرے علم میں آرہے تھے وہ خاصے دلچسپ اور انکشاف انگیز تھے۔ میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا قادر خاں نے صابرہ بیگم کی زندگی ہی میں دوسری شادی کرلی تھی؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے لمحہ بھر سوچا پھر بولی ''میرا تو خیال ہے، صاحب جی نے بڑی بی بی جی کی موت سے پہلے ہی چھوٹی بی بی جی سے شادی کررکھی تھی لیکن چھوٹی بی بی جی ہمارے گھر میں، بڑی بی بی جی کی موت کے بعد ہی آئی ہیں۔''

''اوہ.....!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر نہایت ہی رازدارانہ انداز میں استفسار کیا ''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو میرے خیال میں، صابرہ بیگم کو اپنے شوہر کی دوسری شادی کا علم ہوگیا تھا اور شاید.....اس کی دماغی صحت بھی اسی سبب خراب ہوئی تھی؟''

''جی.....جی، میرا بھی یہی خیال ہے!'' اس نے چوکنا نظر سے، بستر پر سوئی ہوئی شکیلہ کی جانب دیکھنے کے بعد کہا۔

میں نے پوچھا ''اس کا مطلب ہے، قادر خاں نے اپنی دوسری شادی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی؟''

ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مرد چھپ کر دوسری شادی کرلیتے ہیں اور اس شادی کو ایک راز کی طرح رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب یہ راز افشا ہوتا ہے تو بڑی تباہی مچتی ہے۔ مجھے یہاں بھی کچھ ایسا ہی نظر آرہا تھا!

''حالات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ''نادر خاں نے مجھے بتایا ہے، وہ صرف دو بہن بھائی ہیں۔ فردوس اس سے بڑی ہے جس کی شادی ہوچکی ہے اور وہ اپنے شوہر بچوں کے ساتھ اِدھر محلہ اسلام پورہ میں رہتی ہے جبکہ غیر شادی شدہ نادر خاں اپنے باپ کے ساتھ اس کوٹھی میں رہ رہا ہے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ.....!''

میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''نادر خاں اور فردوس نے قادر خاں کی دوسری شادی پر کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟''

آتش زدگی والے اس پُراسرار واقعے نے میرے ذہن میں کھد بد مچا رکھی تھی اور ایک سوچ رفتہ رفتہ پختگی اختیار کرتی جارہی تھی کہ یہ واقعہ کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ اس نامعلوم سازش اور سازش کار کو بے نقاب کرنے کے لیے اس خاندان کے پس منظر سے آگاہی نہایت ہی ضروری تھی۔ میں ولایت بی بی کو اسی سلسلے میں دھیرے دھیرے کریدرہا تھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے مگر دھیمے لہجے میں بولی ''فردوس کی شادی کو سات سال سے زیادہ ہوگئے ہیں اور اب تو ماشاءاللہ! اس کے تین بچے بھی ہیں۔ اس نے جب سنا کہ صابرہ بیگم کے انتقال کے بعد باپ ان کے لیے سوتیلی ماں لے آیا ہے تو وہ بہت چیخی چلائی تھی۔ اس کے خاوند نے بھی اپنے سسر کے اس عمل پر شدید احتجاج کیا تھا۔ فردوس گھر پر آکر نہ صرف یہ کہ قادر خاں سے خوب لڑی تھی بلکہ اس نے چھوٹی بی بی جی کو بھی کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔ باپ اپنی نئی نویلی بیوی کی بے عزتی برداشت نہ کرسکا اور جواب میں فردوس کو خوب ڈانٹ پلائی جس کے نتیجے میں فردوس ناراض ہوکر اپنے گھر چلی گئی۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھمی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''وقت ہر زخم کا مرہم ہے تھانے دار صاحب! آہستہ آہستہ یہاں کے حالات بھی ٹھیک ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد باپ نے جاکر بیٹی کو منالیا اور فردوس بی بی راضی بھی ہوگئی۔ اس کی سگی ماں تو باقی نہیں رہی تھی۔ سوچا ہوگا، باپ بھی کہیں ہاتھوں سے نہ نکل جائے لہٰذا صلح صفائی کرلی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے ولایت بی بی کے خاموش ہونے پر کہا ''لیکن تم نے نادر خاں کے رویّے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

وہ رفتہ رفتہ مجھے بڑی اہم معلومات فراہم کررہی تھی مگر میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس کا انداز احتیاط لیے ہوئے تھا۔ وہ بات کرنے کے دوران میں کن انکھیوں سے شکیلہ کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی جیسے خدشہ ہو کہ وہ اس کی باتیں نہ سن لے اور کبھی وہ باہر کی جانب بھی دیکھ لیتی جدھر اس کا شوہر غلام حسین گیا تھا۔ میں ولایت بی بی کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ شکیلہ کو اپنی مالکن تو سمجھتی تھی لیکن اس سے خوف زدہ بھی دکھائی دیتی تھی۔

میں اس کی طرف منتظر نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی ''نادر خاں نے بھی شروع میں بہت واویلا مچایا تھا لیکن پھر ٹھنڈا ہوگیا۔ یہی محسوس ہوتا تھا، چھوٹی بی بی جی نے اس پر کوئی جادو شادو کردیا ہو!''

''جادو؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تھانے دار صاحب!'' اس نے چوکنا نظر سے سوئی ہوئی شکیلہ کی جانب دیکھا پھر آواز دبا کر بولی ''چھوٹی بی بی جی بہت تیز اور ہنر والی ہیں۔ مردوں کو رام کرنا تو ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الٹے ہاتھ کا کھیل ہے.....'' وہ بولتے بولتے رک گئی پھر منت ریز لہجے میں مجھ سے کہا ''دیکھیں جی تھانے دار صاحب! آپ یہ باتیں کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اگر بی بی جی کو پتا چل گیا کہ میں نے ان کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے زندہ ہی زمین میں دبا دیں گی!''

بات ختم کرنے کے بعد وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد کہا ''ولایت بی بی! تم ذرا کمرے سے باہر آؤ۔''

''جی.....؟'' وہ حیرت سے میری جانب دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ''تم باہر تو آؤ.....پھر بتاتا ہوں!''

میرے لہجے میں کچھ ایسا تحکم اور مضبوطی تھی کہ وہ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر کرسی سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں نے بڑی سرعت سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ غلام حسین تھوڑی دیر پہلے اسی کرسی سے اٹھ کر گیا تھا۔

''ادھر بیٹھ جاؤ اور بے فکر ہو کر مجھے ساری بات بتاؤ۔ تم بہت کام کی باتیں کرتی ہو!''

''وہ.....وہ جی.....اگر بی بی جی اٹھ گئیں تو؟''

''تو کچھ نہیں ہوگا!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''اول تو اس کے جاگنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی اور بہ فرض محال اس کی آنکھ کھل بھی گئی تو ظاہر ہے، وہ تمہیں یا کسی اور کو آواز دے گی۔ تم اس کی آواز پر لپک کر کمرے کے اندر پہنچ جانا۔''

میں لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''میں محسوس کر رہا ہوں، تم شکیلہ کے حوالے سے کوئی نہایت ہی اہم بات مجھے بتانے والی ہو اور تمہیں یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ تمہاری باتیں نہ سن لے۔ اب یہاں اطمینان سے بیٹھ کر تم میرے سوالوں کے جواب دو!''

اس نے ہراساں انداز میں باہر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''اگر نادر خاں نے مجھے یہاں بیٹھے دیکھ لیا تو ناراض ہو گا۔ اس نے تو مجھے بی بی جی کی دیکھ بھال پر مقرر کر رکھا ہے!''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تمہیں نادر خاں کی فکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں.....وہ گاڑی میں گیا ہے اور ڈاکٹر کو لے کر ہی واپس آئے گا اور کوٹھی کے اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی ہمیں اس کی آمد کا پتا چل جائے گا۔ جب ایسا موقع آئے گا، تم یہاں سے اٹھ کر اپنی چھوٹی بی بی جی کے پاس کمرے میں چلی جانا!''

میں نے اسے ایک بند گلی میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اسے فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو وہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' کی عملی تفسیر نظر آنے لگی۔ وہ ایک دم کرسی پر ڈھے سی گئی اور تھوک نگلتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ولایت بی بی!'' میں نے اسے دلاسا دیا ''اس سلسلے میں تم پوری طرح مطمئن ہو جاؤ۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ کسی کے سامنے تمہارا ذکر نہیں کروں گا۔ اب تم ایک لمحہ بھی ضایع کیے بغیر مجھے بتاؤ، تم شکیلہ کے حوالے سے مجھے کیا بتانے والی تھیں؟''

''وہ بات تو میرے ذہن ہی سے نکل گئی.....'' وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ''خوامخواہ کا ماتھا نہیں پیٹو ولایت بی بی! میں بتاتا ہوں، تم مجھے کیا بتانے جا رہی تھیں.....'' پھر میں نے لمحاتی توقف کے بعد اس کے الفاظ دہرائے ''چھوٹی بی بی جی بہت تیز اور ہنر والی ہیں۔ مردوں کو رام کرنا تو ان کے الٹے ہاتھ کا کھیل ہے.....'' پھر میں نے اس تناظر میں اس سے استفسار کیا۔

''ولایت بی بی! پہلے تم نے کہا کہ شکیلہ نے نادر خاں پر کوئی جادو شادو کر کے اس کی زبان بند کر دی تھی پھر تم نے اسے بڑی تیز اور ہنر والی بتایا اور آخر میں یہ ذکر بھی کیا کہ یہ مردوں کو بڑی آسانی سے رام کر لیتی ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تمہاری ان باتوں کے پیچھے کوئی بہت ہی پُراسرار کہانی چھپی ہوئی ہے۔ بتاؤ، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ولایت بی بی نے لمحے بھر کو سوچا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی ''تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے جی.....کہ بڑے خاں صاحب کو کوٹھے پر جانے کا شوق تھا۔ چھوٹی بی بی کو انہوں نے وہیں پسند کیا تھا۔ یوں کہیں تو زیادہ اچھا ہوگا کہ چھوٹی بی بی نے خاں صاحب کو پھانس لیا تھا۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار میری زبان سے پھسل گیا ''ولایت بی بی! کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہاری اس چھوٹی بی بی شکیلہ کا تعلق اس بازار سے ہے؟''

''کبھی تھا جناب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی ''لیکن بڑے خاں صاحب سے شادی کے بعد اس نے اپنی پچھلی زندگی کو بالکل ترک کر دیا تھا اور ایک شریف زادی کی طرح گھر میں رہ رہی ہے۔ اب ان کو کوٹھے والی کہنا بالکل غلط ہو گا!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا ''ٹھیک ہے، میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ شکیلہ نے بازاری زندگی کو چھوڑ کر گھریلو رہن سہن اپنا لیا ہے لیکن تمہاری جادو شادو والی بات کی ابھی تک وضاحت نہیں ہوئی؟''

''وہ تو جناب..... میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا!'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''کوئی بات ایسے ہی، خوامخواہ تو نہیں کہی جاتی نا۔ تم ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو ولایت بی بی؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔ وہ گھبرا گئی اور جلدی سے بولی ''آپ مجھ پر شک نہ کریں تھانے دار صاحب! میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بڑے خاں صاحب چھوٹی بی بی جی کی اداؤں پر ریجھ گئے تھے۔ اسے مردوں کے دل کو قابو کرنا آتا ہے۔ جب وہ، صابرہ بیگم کے انتقال کے بعد ایک مالکن کی حیثیت سے اس گھر میں آئی تو چھوٹے خاں صاحب نے بہت احتجاج کیا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ ان کا احتجاج دم توڑ گیا اور وہ چھوٹی بی بی کے ساتھ بڑے سلوک سے رہنے لگے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ چھوٹی بی بی نے اپنی اداؤں اور ہنر سے چھوٹے خاں صاحب کو بھی مٹھی میں لے لیا تھا ورنہ فردوس بی بی تو ایک طویل عرصے تک بڑے خاں صاحب سے روٹھی رہی تھی حتیٰ کہ خاں صاحب کو خود اس کے پاس جا کر اسے منانا پڑا تھا۔'' وہ رک کر اپنی سانس ہموار کرنے لگی پھر کہا ''بس جی، اتنی سی بات ہے!''

وہ ''اتنی سی بات'' کہہ کر خاموش ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یا تو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ مجھ پر کس طرح اپنی بات کو واضح کرے اور یا پھر وہ دانستہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہ رہی تھی۔ بہرحال، اس نے شکیلہ اور نادر خاں کے حوالے سے مجھے جو کچھ بھی بتایا تھا، میں نے اسے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ میرے لیے بس اتنا سا اشارہ ہی کافی تھا، باقی میں نادر خاں کو کرید کر رہی سہی کسر پوری کر لیتا۔

اسی لمحے باہر کسی کے قدموں کی مخصوص آواز ابھری۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ غلام حسین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں کمرے کے اندر کسی قسم کی کوئی آواز نہیں پیدا ہوئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ شکیلہ ہنوز گہری..... بے ہوشی ایسی نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ ولایت بی بی نے بھی سن لی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ اس کے بول، میرے اندازے کی تصدیق میں تھے..... ''لگتا ہے، غلام حسین واپس آ گیا ہے!''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مشورہ دینے والے انداز میں اس سے کہا ''تم شکیلہ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی جاؤ۔''

اس نے پلک جھپکتے میں میرے حکم کی تعمیل کی اور ہم ایک مرتبہ پھر پہلے والی پوزیشن میں آ گئے۔ جب غلام حسین ہمارے قریب پہنچا تو میں ولایت بی بی سے پوچھ رہا تھا۔

''وہ باتھ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگنے والا معاملہ کیا تھا؟''

''تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے نارمل انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ''سونے سے پہلے رات کو میں نے چائے پی لی تھی لہٰذا پیشاب کی غرض سے مجھے نیند میں سے اٹھنا پڑا۔ میں اپنے باتھ روم سے فارغ ہو کر نکلی اور ابھی بستر پر جا کر لیٹی ہی تھی کہ چھوٹی بی بی جی کی تیز چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس وقت غلام حسین بے خبر سو رہا تھا۔ میں کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی۔ وہ رات کا آخری پہر تھا اور بڑی کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، بی بی جی کو کیا ہو گیا ہے۔ میں صحن میں کھڑی اپنے ذہن کو الجھا ہی رہی تھی کہ بی بی جی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ کسی نامراد کو کوس رہی تھیں جس نے ان کے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔'' وہ رکی، ایک گہری سانس لی اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں بھاگ کر اس باتھ روم کے پاس پہنچی جس کے اندر سے بی بی جی کی غصہ بھری آواز آئی تھی۔ میں نے باتھ روم کے دروازے کا جائزہ لیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ باہر کی کنڈی تو کھلی ہوئی تھی پھر بی بی جی کو ایسا کیوں لگا کہ کسی نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ کنڈی تو کھلی ہے۔ انہوں نے برہمی سے کہا، پھر یہ بدبخت کھل کیوں نہیں رہا؟ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دروازے کے پیچھے سے ہٹ جائیں، میں باہر سے دھکا مارتی ہوں۔ وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے اندر سے بولیں، لو۔ مارو دھکا! میں نے دھکا مارا اور دروازہ کھل گیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلیں اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل کی طرف چلی گئیں.....''

یہاں تک بتانے کے بعد وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹی ہی تھی کہ ایک مرتبہ پھر ان کے چلانے کی آواز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئی۔ اس بار وہ ''آگ..... آگ'' پکار رہی تھیں.....!''

اس کے بعد، ولایت بی بی نے مجھے بتایا کہ اس نے کس طرح اپنے خاوند کو جگایا پھر وہ اور اس کا خاوند غلام حسین سیدھے نادر خاں کے پاس پہنچے۔ اسے سوتے میں سے جگایا اور اطلاع دی کہ اوپر والی منزل میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ تینوں، دیکھتے ہی دیکھتے بالائی منزل پر پہنچے اور آگ بجھانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ یہ الگ بات کہ ان کی اس کوشش سے پہلے ہی آگ نے اپنا ''کام'' کر دکھایا تھا!

ولایت بی بی اپنا بیان مکمل کر کے خاموش ہوئی تو غلام حسین نے اس کی بیان کردہ باتوں کی پُرزور تائید کر دی۔ ان میں سے بہت ساری باتیں مجھے پہلے ہی نادر خاں کی زبانی معلوم ہو چکی تھیں گویا سلسلہ تفتیش کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ میں چند لمحات تک غور و فکر کرتا رہا پھر ولایت بی بی سے استفسار کیا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے، شکیلہ باتھ روم جانے کے لیے کب اوپر سے آئی تھی؟''

''نہیں جی..... میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی!''

''پھر تو تمہیں یہ بھی پتا نہیں ہوگا، وہ باتھ روم کے اندر کتنی دیر تک موجود رہی تھی؟''

''واقعی، مجھے اس بارے میں بھی کوئی علم نہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی ''مجھے تو اس وقت پتا چلا کہ وہ باتھ روم میں ہیں جب انہوں نے دروازہ پیٹ کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ سانس درست کرنے کے لیے رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارا باتھ روم اور بی بی جی والا باتھ روم ایسے زاویے پر واقع ہیں کہ ایک باتھ روم کے پاس کھڑے ہو کر دوسرا باتھ روم دکھائی نہیں دیتا ورنہ جس وقت میں اپنے باتھ روم جا رہی تھی تو مجھے بی بی جی کے باتھ روم کا بند دروازہ اور اندر جلتی ہوئی لائٹ کو دیکھ کر پتا چل جاتا کہ اس باتھ روم میں کوئی موجود ہے!''

ولایت بی بی کی اس وضاحت میں مجھے بڑا وزن محسوس ہوا۔ وہ تیکنیکی اعتبار سے ایک کھلی حقیقت کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے گھوم پھر کر اس کوٹھی کی بالائی اور زیریں، دونوں منزلوں کا بڑی اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ واقعی ملازمین والا باتھ روم اور مالکان کے باتھ رومز (نادر خاں + نادر خاں کے دونوں باتھ رومز) ایک دوسرے کی مخالف سمت میں واقع تھے۔

''شک''، تفتیش کی بنیاد ہے۔ اس کے بغیر کارروائی کو آگے بڑھانا ممکن نہیں ہوتا مگر خوامخواہ کا شک ہمیشہ گمراہ کرتا ہے اور تفتیش کی گاڑی کو غلط رخ پر ڈال کر منزل سے دور لے جاتا ہے۔ درست سمت میں تفتیش کو آگے بڑھانے کے لیے کسی ایسے شک کو بنیاد بنانا چاہیے جس میں واقعاتی معقولیت اور شواہدی منطق ضرور موجود ہو۔

آتش زدگی والا یہ واقعہ مجھے ایب نارمل محسوس ہوتا تھا۔ اب تک حالات و واقعات کو جس انداز میں میرے سامنے بیان کیا گیا تھا اس کی روشنی میں مجھے نظر آتا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ یہی مجھے تلاش کرنا تھا۔ اس کوٹھی میں کل چھ افراد رہائش پذیر تھے جن میں سے دو کو آگ نے جلا کر کوئلا بنا دیا تھا۔ ان کی لاشیں، پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دی گئی تھیں۔ وہ دونوں چونکہ جان ہار گئے تھے لہٰذا کہا جا سکتا تھا، آتش زدگی کے اس واقعے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں ہوگا۔ کوئی خود کو فنا کرنے کے لیے خوامخواہ اس قسم کی مہلک سازش نہیں کرتا۔

باقی بچتے تھے چار افراد۔ غلام حسین اور اس کی بیوی ولایت بی بی، نادر خاں اور اس کی چھوٹی امی شکیلہ۔ غلام حسین اور ولایت بی بی کو بھی میں نے گھس گھسا کر دیکھ لیا تھا۔ ان کی ذات شکوک و شبہات سے بالاتر نظر آتی تھی۔ ویسے بھی ان کے پاس ایسا کوئی جواز یا وجہ نہیں تھی کہ وہ کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے قادر خاں اور اس کے معصوم بچے جبران خاں کو ایک گہری سازش کے تحت موت کے منہ میں دھکیل دیتے۔

میرے شک کا دائرہ فی الحال شکیلہ اور نادر خاں کو اپنے حصار میں بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نادر خاں سے میں نے خاصی طویل پوچھ گچھ کی تھی لیکن شکیلہ سے بات کرنے کا ابھی موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ میں اس سے کوئی سوال و جواب کر سکتا، چنانچہ مجھے اس کے ہوش و حواس میں آنے کا انتظار کرنا تھا۔

ایک سوال کافی دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ نادر خاں نے اس سلسلے میں جو وضاحت پیش کی تھی، میں پوری طرح اس سے مطمئن نہیں تھا لہٰذا اپنی تسلی کی خاطر میں نے ولایت بی بی اور اس کے خاوند غلام حسین سے پوچھ لیا۔

''کیا آپ لوگ آتش زدگی کی اطلاع پاتے ہی نادر خاں کو بتانے چلے گئے تھے یا پھر باہمی صلاح مشورے میں کچھ وقت ضایع کیا تھا؟''

''نہیں جناب! ہم نے ایک سیکنڈ بھی ضایع نہیں کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔'' غلام حسین نے جواب دیا ''جیسے ہی ولایت نے مجھے جگا کر بتایا کہ اوپر والی منزل میں آگ لگ گئی ہے، میں اسے ساتھ لے کر نادر صاحب کو بتانے چلا گیا تھا۔''

''اور اُدھر بھی ہم نے ایک لمحہ برباد نہیں کیا۔'' ولایت نے بتایا ''دروازہ کھٹکھٹا کر ہم نے نادر خاں کو اٹھایا اور پھر ہم تینوں اوپر والی منزل کی طرف دوڑ پڑے.....''

ٹائم کی میچنگ کے سلسلے میں، میں جو گڑبڑ محسوس کر رہا تھا اس کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ میرا ذہن کسی بھی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ایک شخص کو باتھ روم کے معاملات سے نمٹنے کے لیے جتنا وقت درکار ہوتا ہے، اسی مدت میں کسی کمرے میں بھڑکنے والی آگ آناً فاناً میں سب کچھ جلا کر..... حتیٰ کہ دو انسانوں کو کوئلا بنا کر رکھ سکتی ہے!

میں نے مشترکہ طور پر ان دونوں سے سوال کیا ''جب آپ لوگ نادر خاں کو اس واقعے کی اطلاع دینے گئے تو وہ فوراً بیدار ہو گیا تھا یا اس نے اٹھنے میں دیر لگائی تھی؟''

میں یہ جاننے کی کوشش میں تھا کہ آیا ان آفتی لمحات میں، نادر خاں اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ ولایت بی بی نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! چھوٹے خاں صاحب کو جگانے کے لیے ہمیں کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانا پڑا تھا پھر کہیں جا کر ان کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ گہری نیند سے اٹھے تھے اور آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تھا۔ ہم نے انہیں اوپر والی منزل پر لگنے والی آگ کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً ہمارے ساتھ ہو لیے۔''

''ہوں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی وقت نادر خاں کسی ڈاکٹر کو لے کر واپس آ گیا۔

ڈاکٹر نے کمرے میں آنے کے بعد بے ہوش پڑی شکیلہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کے انداز اور حرکات و سکنات سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ ایک تجربہ کار کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر قدیر معلوم ہوا۔ وہ ایک جاندار اور پُرتاثر شخصیت کا مالک تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بہ غور ''چیک اپ'' کے بعد اس نے ماہرانہ انداز میں اعلان کر دیا۔

''یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تنفس نارمل ہے تاہم گہری بے ہوشی کی سی کیفیت کے دوران میں سانس مدھم ہو گئی ہے۔ پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں۔ راستے میں نادر خاں نے مجھے اس واقعے کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ میرا خیال ہے، اس صدمے نے ان کے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔ بہرحال.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنے بیگ کی جانب بڑھا پھر میڈیکل ایمرجنسی بیگ کو کھولتے ہوئے بولا۔

''میں ان کو ایک انجیکشن دے رہا ہوں۔ انشاء اللہ! دو تین گھنٹے کے بعد یہ بالکل نارمل ہو جائیں گی۔''

نادر خان نے تشویش بھرے لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! اگر کوئی ایسی ویسی پریشانی والی بات ہو تو ہم انہیں اسپتال لے جاتے ہیں!''

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔''

''یہ ہوش میں تو آ جائیں گی نا؟'' ولایت بی بی نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''بالکل..... کیوں نہیں۔ میں انجیکشن لگا رہا ہوں نا!''

''ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ ان کی ایسی حالت تو نہیں ہو جائے گی؟'' نادر خاں نے استفسار کیا۔

ڈاکٹر قدیر نے شکیلہ کے بازو میں انجیکشن لگانے کے بعد نادر خاں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے اُمید تو یہی ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ سنبھلی رہیں گی لیکن میں اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ اس گھر میں اتنا بڑا سانحہ ہوا ہے کہ اگر انہیں وہ سب کچھ یاد آتا رہا تو دوبارہ بھی ان کی حالت بگڑ سکتی ہے۔ شوہر اور معصوم بچے کی المناک موت سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا ہے.....''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا پھر سوالیہ نظر سے ہر ایک کے چہرے کو دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''انہیں کسی قسم کی کوئی دوائی وغیرہ بھی دی گئی ہے؟''

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ میں اضطراری انداز میں ڈاکٹر قدیر کو تکنے لگا۔

ولایت بی بی نے جلدی سے جواب دیا ''نہیں ڈاکٹر صاحب! دوائی تو ہم نے کوئی نہیں دی۔''

اس جواب سے ڈاکٹر کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ نادر خاں نے تشویشناک لہجے میں پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! آپ کس قسم کی دوائی کی بات کر رہے ہیں؟''

نادر خاں نے میرے منہ کا سوال چھین لیا تھا۔ میں بھی ڈاکٹر سے یہی پوچھنے والا تھا۔ ڈاکٹر نے لمحہ بھر غور کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جیسے کوئی نیند کی گولی..... کوئی سکون کی دوا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نادر خاں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''نہیں جناب..... بالکل نہیں!''

''ڈاکٹر قدیر!'' میں نے براہِ راست ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''کیا آپ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ شکیلہ کی گہری نیند یا بے ہوشی میں کسی دوا وغیرہ کا بھی دخل ہے؟''

''میں واضح طور پر یا پھر دعوے سے تو کوئی بات نہیں کہہ سکتا تھانے دار صاحب!'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مہذب مگر پیشہ ورانہ انداز میں بولا ''لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ مجھے بتا رہا ہے کہ اس بے خبری کے پیچھے کسی مسکن یا خواب آور دوا کا ہاتھ بھی ہوسکتا ہے بہرحال، اپنے پیاروں کی المناک موت کا صدمہ تو اپنی جگہ ہے ہی!''

آخری جملہ ڈاکٹر قدیر نے بڑے سرسری انداز میں ادا کیا تھا۔ جیسے خانہ پری کے لیے کوئی بات کہہ دی جائے۔ اصل واقعے کے حوالے سے اس کی کوئی اہمیت یا افادیت نہ ہو۔ ڈاکٹر کے ماہرانہ انکشاف نے مجھے ایک نئے زاویے سے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ ولایت بی بی اور نادر خاں اس بات سے صاف انکاری تھے کہ شکیلہ کو کسی بھی قسم کی کوئی دوا دی گئی تھی اگر واقعی ایسی کوئی بات ہوتی تو انہیں انکار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب آجا کر دھیان شکیلہ کی طرف ہی جاتا تھا۔ اگر ڈاکٹر قدیر کا تجربہ اور مشاہدہ کوئی غلطی نہیں کررہا تھا تو پھر پورے وثوق سے یہ کہا جاسکتا تھا، شکیلہ نے ازخود نیند کی کوئی گولی نگل لی ہوگی..... مگر کیوں؟''

یہ سوال میرے ذہن میں چکرانے لگا لیکن فی الحال وہاں موجود افراد میں سے کوئی بھی مجھے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا لہٰذا میں نے اسے اپنی یادداشت کے ایک خانے میں محفوظ کیا اور ڈاکٹر قدیر سے پوچھا۔

''شکیلہ کب تک اس قابل ہوجائے گی کہ میں اس کا بیان قلم بند کرسکوں؟''

''جیسا کہ میں نے بتایا ہے، انجیکشن لگنے کے دو تین گھنٹے بعد یہ بالکل نارمل ہوجائیں گی۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا ''نارمل ہوجانے کا مطلب ہے، یہ گفتگو کرنے کے قابل ہوجائیں گی۔ آپ احتیاطاً چار گھنٹے کے بعد ان کا بیان لے سکتے ہیں۔''

میں پُرمعنی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دینے لگا۔

ڈاکٹر اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ظاہر ہے، اب وہ واپس جانا چاہتا تھا لہٰذا نادر خاں نے اس کی تقلید کی اور ڈاکٹر کا ایمرجنسی بیگ اٹھاتے ہوئے بولا ''میں ڈاکٹر صاحب کو چھوڑ کر آتا ہوں۔''

نادر خاں نے چونکہ یہ جملہ میری جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا لہٰذا میں نے ہی اسے جواب بھی دیا۔ ''میں اے ایس آئی نزاکت شاہ کی آمد تک یہاں رکوں گا پھر تھانے چلا جاؤں گا۔ انشاءاللہ! شام کو دوبارہ تمہاری چھوٹی امی کا بیان لینے آؤں گا۔ اس وقت تک وہ ہوش میں آکر نارمل ہوچکی ہوں گی۔'' میں لمحے بھر کو رکا پھر تنبیہی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ اسے دوبارہ بے ہوش نہیں ہونے دینا۔ سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کی بات توجہ سے سنی ہے نا؟''

اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا ''جی ہاں..... جی ہاں، میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔''

ڈاکٹر نے بیرونی دروازے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا ''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں ان کے لیے اپنے کلینک سے دوائی بھی دوں گا۔ جب انہیں ہوش آجائے تو وہ دوا کھلا دینا۔ اس سے ان کے اعصاب اور دل و دماغ کو خاصی تقویت ملے گی۔''

اس کے بعد نادر خاں ڈاکٹر قدیر کے ساتھ کوٹھی سے روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی سے پہلے ہی اے ایس آئی اسپتال سے لوٹ آیا چنانچہ میں ولایت بی بی اور غلام حسین کو اپنی روانگی کے بارے میں بتا کر نزاکت شاہ کے ساتھ تھانے آگیا۔

دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں کھانے اور ظہر کی نماز سے فارغ ہوا تو اے ایس آئی نزاکت شاہ میرے کمرے میں آگیا پھر ہمارے درمیان آتش زدگی والے واقعے پر گفتگو ہونے لگی۔ اس دوران میں نزاکت شاہ نے بھی متوفی قادر خاں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلی تھیں جن میں سے بہت ساری باتیں مجھے ولایت بی بی کی زبانی پتا چل چکی تھیں مثلاً یہی کہ.....

قادر خاں خاصا رنگین مزاج اور شوقین واقع ہوا تھا۔ وہ بڑی باقاعدگی سے ''اس بازار'' جاتا تھا۔ اسے گانا سننے اور رقاصاؤں پر نوٹ نچھاور کرنے کا بہت شوق تھا۔ اللہ نے اسے سب کچھ دے رکھا تھا۔ دولت، عزت اور شہرت..... سبھی کچھ تھا اس کے پاس۔ خاص طور پر جب انسان کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت آجائے تو اسے نئی نئی سوجھنے لگتی ہے۔ یہاں اس دولت کا ذکر ہو رہا ہے جو انسان کی جائز اور معقول ضروریات سے زیادہ ہو۔ ایسی دولت کچھ کرنے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکساتی ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ اس قسم کی صورتِ حال میں عورت کا رجحان آرام، سکون اور تعیش کی طرف جاتا ہے۔ وہ کوئی عالی شان گھر خریدنا چاہتی ہے اور اس گھر کو دنیا کی مہنگی ترین اشیا سے سجانا چاہتی ہے۔ سب سے زیادہ توجہ اس کی اپنی ذات کی طرف ہوتی ہے۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت اور نمایاں بنانے کے لیے میک اپ، قیمتی ملبوسات اور بیش قدر جیولری کا سہارا لیتی ہے جبکہ مرد اس کے بالعکس، نمود و نمایش سے زیادہ عیاشی اور عیش کی طرف جاتا ہے اور زیادہ تر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کے حصول کی تگ و دو میں لگ جاتا ہے۔ اب یہ اس کے ضمیر، ضمیر اور فطرت پر منحصر ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے تصرف میں لانے کے لیے باقاعدہ ان سے شادی کرتا ہے یا اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے!

متوفی نے اس حوالے سے خاصا معتدل رویہ اپنایا تھا۔ وہ بنیادی طور پر صنعت کار تھا۔ شہر کے سائٹ ایریا میں ''خان ٹیکسٹائلز'' کے نام سے اس کا ایک کارخانہ تھا جہاں پر بیڈ شیٹس، رومال اور تولیے تیار ہوتے تھے۔ پیسے کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی لہٰذا وہ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے بازارِ حسن کا چکر لگا لیتا تھا۔ وہیں نگینہ بائی کے کوٹھے پر اس کا دل اٹک کر رہ گیا۔ شکیلہ کی ادائیں اس قدر بھائیں کہ وہ خود کو اس کی محبت میں، سر سے پاؤں تک جکڑا ہوا محسوس کرنے لگا۔

''کوٹھے'' بہت سوچ سمجھ کر آباد کیے جاتے ہیں۔ وہاں بسنے والی حسینائیں اپنے ناز و انداز کو فروخت کرتی ہیں۔ خریدار جیبیں بھر کر زینے چڑھتے ہیں اور واپسی میں یہی زینے اترتے ہوئے ان کی جیبیں خالی ہوتی ہیں، اس کے باوجود بھی وہ دکھی یا افسردہ نہیں ہوتے، انہیں کوئی ملال ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی احساس زیاں کہ وہ وہاں سے بڑے ''مال و مال'' ہو کر رخصت ہو رہے ہوتے ہیں۔ ان کے دل سرشار اور ذہن مخمور ہوتے ہیں اور روپے سے یوں جھلکتا ہے جیسے وہ وہاں سے دنیا کی سب سے بڑی نعمت لوٹ کر جا رہے ہوں۔

درحقیقت، وہ لوٹ کر نہیں بلکہ لٹ کر جا رہے ہوتے ہیں۔ لوٹنے والے تو ان کے جاتے ہیں لوٹ کے مال کو گننے میں لگ جاتے ہیں۔ بہرحال، یہ فلسفہ خاصا پیچیدہ اور ٹیڑھا ہے۔ ہر شخص اپنے زاویے سے دیکھتا ہے اور اپنی مرضی کا مطلب اخذ کر لیتا ہے۔

قادر خاں کے عمل کو اس لیے معتدل اور معقول کہا گیا ہے کہ وہ باقاعدہ شکیلہ سے شادی کرنے کے بعد اسے گھر میں بسانا چاہتا تھا۔ وہ بھی اس کی خواہش پوری کرنے کو تیار تھی لیکن نگینہ بائی کیسے اس بات پر تیار ہوتی کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو..... قادر خاں کے حوالے کر دیا جائے۔ جب قادر خاں کا اصرار بہت بڑھ گیا تو وہ مطلب کی بات پر آ گئی۔

''خاں صاحب! آپ جانتے ہیں، یہ ہمارا رزق روزگار..... روزی روٹی کا وسیلہ ہے اگر آپ شکیلہ کو لے جاؤ گے تو میرا کیا بنے گا، ذرا یہ بھی تو سوچیں؟''

''میں تمہارے بارے میں پہلے سوچوں گا۔'' قادر خاں نے مضبوط لہجے میں کہا ''شکیلہ کو یہاں سے لے جاتے ہوئے میں تمہارا ہاتھ بھر دوں گا۔ بولو، تمہیں کتنا پیسا چاہیے؟''

''صرف پانچ ہزار روپے!'' نگینہ بائی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شکیلہ کی قیمت لگا دی۔

وہ سستا زمانہ تھا۔ اس رقم کو آج کل کے پانچ لاکھ تصور کر لیں۔ قادر خاں اس کا مطالبہ سن کر چونک اٹھا اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نگینہ بائی؟''

نگینہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائی اور جواباً پوچھ لیا۔ ''کیوں خاں صاحب..... کیا میں نے کچھ کم رقم بتا دی ہے؟''

''کم نہیں..... بہت زیادہ ہے یہ!'' قادر خاں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''آپ جیسے قدر دانوں کے دم قدم ہی سے تو میرے کوٹھے کا چولہ اجلتا ہے خاں صاحب!'' وہ بڑی لگاوٹ سے بولی ''بھلا آپ جیسی شخصیت کے لیے پانچ ہزار کیا معنی رکھتے ہیں!''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے نگینہ کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''جانتی ہو، پانچ ہزار روپے میں کم از کم پانچ شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہو جاتی ہیں۔''

''لیکن..... ان پانچ میں ایک بھی میری شکیلہ جیسی نہیں ہو گی۔'' نگینہ بائی نے خاص انداز سے کہا ''ویسے خاں صاحب! کوئی زبردستی تھوڑی ہے۔ اس بازار میں اور بھی بہت سے کوٹھے آباد ہیں۔ ہو سکتا ہے، کسی کوٹھے سے آپ کو کوئی سستا سودا مل جائے۔''

نگینہ بائی، قادر خاں کی ''ضرورت'' کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی لہٰذا اس کی نفسیات سے کھیلنے میں اسے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ قادر خاں کے لیے پانچ ہزار کی ادائی کوئی بڑا مسئلہ ہو۔ وہ بنیادی طور پر چونکہ ایک کاروباری آدمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا اس لیے اپنی عادت کے مطابق، بارگیننگ کر رہا تھا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نگینہ بائی! تم بڑی ظالم عورت ہو۔ بیس تیس روپے میں خریدی ہوئی چیز کو پانچ ہزار میں فروخت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ منافع کی کوئی شرح بھی ہونا چاہیے۔ ہم بھی کاروبار کرتے ہیں، آئے دن خرید و فروخت سے وابستہ ہیں لیکن تم تو کند چھری سے مجھے مونڈنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اتنی بے دردی سے تو کوئی قصاب بھی جانور کی کھال نہیں اتارتا؟''

نگینہ نے قادر خاں کی بات پوری توجہ سے سنی اور مسکرانے لگی پھر معتدل لہجے میں بولی ''خاں صاحب! آپ جیسے بڑے لوگوں کو ایسی ہلکی باتیں زیب نہیں دیتیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے، میں بیس، تیس اور چالیس، پچاس میں بچی حاصل کرتی ہوں لیکن اس وقت یہ بچی کسی پتھر کے مانند ہوتی ہے لہٰذا اس کی قیمت بھی پتھر والی ہی ہوتی ہے۔ ذرا اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں خاں صاحب کہ میں کسی پتھر کو ہیرا بنانے کے لیے کس قدر محنت کرتی ہوں اور ان دس بارہ سال میں اس کی پرورش، دیکھ ریکھ اور کھلائی پلائی پر کتنا اٹھ جاتا ہے اگر کم از کم دس سال کا حساب جوڑنے بھی بیٹھ گئے تو بات پانچ ہزار سے نکل کر لاکھوں تک جا پہنچے گی خاں صاحب!''

قادر خاں نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا ''زیادہ بحث، مباحثے کا کوئی فائدہ نہیں نگینہ بائی۔ بس، دو ہزار روپے ٹھیک ہیں!''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خاں صاحب!'' وہ قطعیت سے بولی۔

''سوچ لو ایک مرتبہ پھر؟'' قادر خاں نے کہا۔

نگینہ بائی چونکہ قادر خاں کی کمزوری کو بھانپ چکی تھی لہٰذا اس نے اپنے مطالبے میں ذرا سی لچک بھی نہ آنے دی اور اٹل لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولی۔

''خاں صاحب! میں نے تو جو کہنا تھا، کہہ دیا ہے۔ سوچنا اور سمجھنا اب آپ کا کام ہے!''

قادر خاں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس سوچ میں تشویش اور پریشانی باہم پیوست تھیں۔ وہ شکیلہ کے معاملے میں، اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور ''ہر قیمت'' پر اسے حاصل کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا، نگینہ کا پانچ ہزار کا مطالبہ اس ''ہر قیمت'' کا عشر عشیر بھی نہیں تھا۔

عورت، مرد کی کمزوری سے آگاہ ہو جائے تو اسے کھل کھیلنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ان نازک لمحات میں نگینہ بائی اپنی مرضی کا کھیل، کھیل رہی تھی!

قادر خاں نے نگینہ بائی کا مطالبہ پورا کر دیا اور شکیلہ اس کی ہو گئی۔ لگ بھگ چھ ماہ تک قادر خاں نے اپنی دوسری شادی کو دنیا والوں کی نگاہ سے چھپائے رکھا لیکن اس کی پہلی بیوی صابرہ بیگم، کو کسی طرح اس معاملے کی بھنک پڑ گئی۔ یہ بات پورے وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ صابرہ بیگم کی پاگلوں جیسی ذہنی حالت اسی صدمے کے باعث ہوئی تھی۔ البتہ، یہ ضرور ہے کہ جب وہ چھت سے گر کر موت کو گلے لگا بیٹھی تو قادر خاں نے شکیلہ کو اپنی نئی بیوی کی حیثیت سے گھر میں داخل کر لیا تھا۔ اس کے اس عمل پر فردوس اور نادر خاں نے کیا ردعمل ظاہر کیا، یہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے!

شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے کانسٹیبل منظور الٰہی کو اپنے ساتھ لیا اور ایک مرتبہ پھر قادر خاں کی کوٹھی واقع ''فرید ٹاؤن'' کی جانب روانہ ہو گیا۔ اے ایس آئی نزاکت شاہ کسی ضروری کام میں الجھا ہوا تھا لہٰذا میں نے اسے تھانے ہی میں رہنے دیا مجھے امید تھی، اب تک شکیلہ کو ہوش آ چکا ہو گا اور وہ باقاعدہ اپنے حواس میں ہو گی۔

کوٹھی میں قدم رکھتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ میری امید بر آئی ہے۔ شکیلہ اس وقت بیان دینے کے قابل تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ نادر خاں کی بہن اسلام پورہ سے وہاں پہنچ گئی ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ میں شکیلہ کی طرف بڑھنے سے پہلے دو باتیں اس سے ضرور کر لوں۔ میں ایک عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

اس وقت ہم کوٹھی کی زیریں منزل پر تھے اور نادر خاں میرے قریب کھڑا تھا۔ اسی نے مجھے اپنی بہن فردوس کی خواہش سے آگاہ کیا تھا۔ ان لمحات میں، نادر خاں مجھے خاصا پریشان دکھائی دیا۔ پریشان تو وہ صبح بھی بہت تھا لیکن اس وقت اس کی پریشانی میں حد درجہ الجھن اور تذبذب بھی موجود تھا۔ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے نادر خاں! تمہاری بہن فردوس مجھ سے ایسی کون سی خاص بات کہنے والی ہے؟''

''جناب! آپا فردوس نے مجھے بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا، اسے کیسے چپ کراؤں۔ پہلے ہی کچھ کم پریشانیاں ہیں جو اس نے نیا رٹا (پھڈا) ڈال دیا ہے!''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی آنکھوں میں دیکھا ''کیا کہہ رہی ہے تمہاری آپا فردوس.....تم اسے کیوں چپ کرانا چاہتے ہو؟''

''وہ کہہ رہی ہے، آتش زدگی والا یہ واقعہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں.....!'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا ''پھر؟''

''اس کا خیال ہے، اباجی کو باقاعدہ ایک سازش کے تحت ہلاک کیا گیا ہے!''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا ''بھئی! تمہاری آپا تو بالکل پولیس والوں کے انداز میں سوچتی ہے۔ اس کے خیال میں، کس نے ایک گہری سازش کر کے قادر خاں اور ننھے جبران کو موت کے منہ میں دھکیلا ہے؟''

اس کیس میں اچانک ایک نیا اور دلچسپ زاویہ سامنے آگیا تھا۔ یہ شک مجھے بھی تھا کہ حالات ویسے پیش نہیں آئے ہوں گے جیسا کہ بیان کیے جارہے تھے۔ چلو، کوئی تو میرا ہم خیال بھی سامنے آیا تھا لیکن یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ فردوس کو آتش زدگی والا وہ واقعہ قتل کا منصوبہ کیوں نظر آرہا تھا۔ اسی منظر کو اجاگر کرنے کے لیے میں نے نادر خاں سے وہ سوال کیا تھا۔

وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا ''جناب! لگتا ہے، امی جی کی طرح آپا فردوس کا دماغ بھی خراب ہوگیا ہے۔ پتا ہے، وہ کیا کہہ رہی ہے.....؟'' اس نے توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں خاموش رہا تو اس نے خود ہی اس سوال کا جواب بھی دے دیا۔

''وہ کہہ رہی ہے، چھوٹی امی شکیلہ نے اباجی کو جلا کر راکھ کردیا ہے!''

میں ایک مرتبہ پھر گہری اور طویل سانس خارج کرنے پر مجبور ہوگیا پھر پوچھا ''کیا تمہاری آپا کے پاس اپنے اس دعوے کا کوئی ثبوت بھی ہے؟''

''یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہے جناب!'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا ''ثبوت وبوت کوئی نہیں ہے، اس کے پاس۔ بس، اس نے ایک ہی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے، اس کی آواز ابھی تک چھوٹی امی کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ بڑی مشکل سے تو وہ سنبھلی ہے اگر اس نے سن لیا کہ فردوس اسے قادر خاں اور جبراں خاں کی قاتل ٹھہرا رہی ہے تو دوبارہ اس کی ذہنی حالت پہلے جیسی ہوجائے گی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپا کو کیسے سمجھاؤں۔ پہلے ہی میں بہت پریشان تھا، آپا نے تو ایک نئی مصیبت کھڑی کردی ہے!''

الجھن اور ابتری کے ان لمحات میں، میں نے محسوس کیا کہ نادر خاں کی ہمدردیاں پوری طرح اپنی سوتیلی ماں شکیلہ کے ساتھ تھیں۔ وہ اس کی ذہنی صحت کے حوالے سے بھی بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں ولایت بی بی کے کہے ہوئے یہ الفاظ گھوم گئے.....''چھوٹی بی بی جی تو بڑی تیز اور ہنر والی ہے۔ بڑے خاں صاحب اس کی اداؤں پر ریجھ گئے تھے۔ مردوں کو رام کرنا تو اس کے الٹے ہاتھ کا کھیل ہے۔ ہوسکتا ہے، چھوٹے خاں صاحب کو بھی اپنی مٹھی میں لے لیا ہو!''

ولایت بی بی کے اس تبصرے کے تناظر میں ذہن لامحالہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ کہیں نادر خاں اور شکیلہ کے درمیان کوئی ایسا تعلق تو موجود نہیں جسے معاشرہ اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو؟

میں کسی ثبوت اور حقائق کے بغیر اس سوچ اور سوال پر صاد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے صبح سے اب تک نادر خاں کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک آفت گزیدہ، مصیبت زدہ شخص نظر آتا تھا۔ اس اچانک پڑنے والی افتاد نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج اور منقود کر کے رکھ دیا تھا۔ کبھی وہ شکیلہ کی حمایت میں دکھائی دیتا اور کبھی اس کی مخالفت میں..... لہٰذا کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ حالانکہ شکیلہ اور نادر دونوں ہی میری ہٹ لسٹ پر تھے۔

میں نے نادر خاں کی الجھن کو کم کرنے کی غرض سے کہا ''ٹھیک ہے نادر خاں! میں پہلے تمہاری آپا فردوس ہی سے دو باتیں کرلیتا ہوں۔ شکیلہ سے بعد میں ملاقات کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں آپا کو آپ کے پاس یہیں لے آتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''آپ بھی اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔ گھر میں پہلے ہی صف ماتم بچھی ہے۔ اوپر سے کوئی اور نیا تماشا نہ ہوجائے!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو نادر خاں!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا۔

وہ اٹھا اور بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں تازہ ترین صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اس وقت میرا ذہن نہایت ہی تیز رفتاری سے کام کررہا تھا۔ ''آپا فردوس'' بہت دور کی کوڑی لائی تھی لیکن میرا ذہن اور دل کسی بھی طور یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ شکیلہ اتنی بھی وحشی اور سنگ دل ہوسکتی ہے کہ کسی بھی مقصد کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حصول کی خاطر وہ اپنے دو سال کے بیٹے کو اپنے ہی ہاتھوں جلا کر کوئلا بنا دے!

دو منٹ بعد ہی نادر خاں واپس آ گیا۔ وہ اپنی آپا کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ فردوس نے مجھے سلام کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر دانستہ ایک چال چلی۔ میں نے باری باری نادر خاں اور کانسٹیبل منظور الٰہی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''میں فردوس سے تنہائی میں بات کرنا چاہوں گا!''

کانسٹیبل منظور الٰہی ایک لفظ ادا کیے بغیر اٹھا اور بیٹھک کے دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔ وہ نہ صرف یہ کہ میرے اشارے کو سمجھ گیا تھا بلکہ اس نے اس اشارہ نما حکم کی تعمیل بھی کر دی تھی البتہ، نادر خاں مجھے گہرے تذبذب میں نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''کوئی مسئلہ ہے نادر خاں؟''

''وہ جی..... اگر میں بھی اِدھر ہی رک جاؤں تو.....؟''

وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں مستفسر ہوا۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا ''کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں؟''

وہ جلدی سے بولا ''ایسی بات نہیں ہے جناب!''

''پھر کیسی بات ہے نادر خاں؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

''میں تو گھر کا آدمی ہونا جی.....!'' وہ اپنی بات کی وضاحت میں بولا۔

میں نے دوٹوک انداز میں اس پر واضح کر دیا ''نادر خاں! میں مانتا ہوں، تم اس گھر کے سب سے زیادہ مضبوط ستون، سب سے زیادہ اہم آدمی ہو لیکن میرا، تفتیش کا اپنا ایک انداز ہے۔ میں نے تم سے بھی علیحدگی میں پوچھ گچھ کی تھی نا! اس وقت ہمارے سوا کمرے میں اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس لیے یہ بات ذہن میں بٹھا لو کہ میں تمہاری آپا سے تنہائی میں بات کروں گا اور..... اس کے بعد تمہاری چھوٹی امی سے بھی بالکل علیحدگی میں ملاقات ہو گی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے برا سا منہ بنایا جیسے اسے میری یہ بات پسند نہ آئی ہو، تاہم اس نے کسی جرح بحث کی راہ تلاش نہیں کی اور بادل ناخواستہ بیٹھک سے باہر چلا گیا۔ اس کے رویّے سے ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ وہاں موجود رہ کر یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس کی آپا فردوس، اس کی چھوٹی امی شکیلہ کے خلاف کون سا زہر اگلنے والی ہے۔ بہرحال، میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنا روئے سخن فردوس کی جانب پھیر لیا۔

وہ جلدی سے بولی ''تھانے دار صاحب! آپ نے بہت اچھا کیا جو نادر کو باہر بھیج دیا۔ بڑا ہی جھلا ہے۔ شکیلہ نے پوری طرح اسے بے وقوف بنا رکھا ہے!''

وہ اتنی بے تکلفی سے بات کر رہی تھی جیسے ہمارے بیچ پرانی شناسائی ہو۔ اس کے انداز میں جھجک نام کو نہیں تھی۔ بہرحال، ہر شخص کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ ممکن ہے، فردوس کا رویہ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی بے باک اور جھجک سے پاک ہو۔ میں نے کوئی جواب دینے سے پہلے بغور اس کا جائزہ لیا۔

اس کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہو گی۔ یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ سات سال پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور اب وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ اس کا شوہر خاور محمود سبزی منڈی کا ایک معروف آڑھتی تھا۔ فردوس درمیانے قد اور مائل بہ فربہی جسم کی مالک تھی۔ رنگ گندمی اور تین نقش جاذب نظر! وہ اپنی آنکھوں سے زیادہ تیز طرار اور چالاک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پیشانی سے ظاہر ہوتا تھا، وہ بہت زیادہ باتونی ہے اور غصے کے عالم میں اسے اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں رہتا، دل میں جو کچھ بھی ہو اسے زبان پر لے آتی ہے۔ اسے کسی کا خوف نہیں۔ جس سے جو بھی کہنا چاہے، بے دھڑک کہہ ڈالتی ہے۔ ایسے لوگ خود کو سچے اور کھرے سمجھتے ہیں لیکن آس پاس کے لوگوں میں ان کا تاثر ایک جھگڑالو انسان کی طرح کا ہوتا ہے!

میں نے اس کی نفسیات سے، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے فوراً ہاں میں ہاں ملائی اور رازدارانہ انداز میں کہا ''یہ تو تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے فردوس! تمہارا یہ بھائی مجھے بھی ایک دم الو کا چرخہ لگا ہے!''

وہ خوش ہو گئی اور اطمینان بھرے لہجے میں بولی ''آپ خاصے تجربہ کار تھانے دار ہیں مجھے امید ہے، آپ میری بات کو صحیح معنوں میں سمجھ جائیں گے۔''

''میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔'' میں نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا ''بس، تم شروع ہو جاؤ..... وقت بہت کم ہے!''

.....اور وہ نان اسٹاپ شروع ہو گئی۔

صرف دس منٹ کے اندر اس نے مجھے چار سال پر محیط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک سنسنی خیز داستان سنا ڈالی جس میں اس نے شکیلہ کے کردار کو کسی خوب صورت، کلیجا نکال کر کھا جانے والی ڈائن سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے خیال میں قادر خاں جب سے شکیلہ کے چکر میں پڑا تھا، ان کے گھر کو آفتوں اور مصیبتوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سب سے پہلے ان کی والدہ صابرہ بیگم نے اس درجہ صدمات اٹھائے کہ اس کا دماغ ہی الٹ گیا۔ بقول فردوس، صابرہ بیگم اپنے شوہر اور گھر سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ اس کا شوہر اس کی وفاؤں کا خون کر کے اور زندگی بھر کی اس کی خدمت اور ریاضت کو ٹھوکر مار کر کسی کو بٹھے والی کا ہو گیا ہے تو اس کا دل ایک چھناکے سے ٹوٹ کر اس کے اندر ہی بکھر گیا۔ اس کا کچ محل کی کرچیوں نے صابرہ بیگم کے احساس کو لہولہان کر دیا۔ وہ اسم بامسمّیٰ تھی۔ اس نے منہ سے آواز تک نہ نکالی اور اندر ہی اندر کسی موی شمع کے مانند گھلتی رہی۔ جب یہ دکھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تو سب سے پہلے اس کے دماغ نے ساتھ چھوڑا پھر حواس بھی جواب دے گئے۔ وہ دیوانوں کی طرح پورے گھر میں چکراتی رہتی اور ایک روز اسی پاگل پن میں وہ مکان کی چھت سے گر کر زندگی کی بازی ہار گئی۔ فردوس کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے باپ کو ہی ماں کی موت کا ذمے دار سمجھتی تھی اسی لیے صابرہ بیگم کے انتقال کے بعد جب قادر خاں شکیلہ کو گھر میں لے آیا تو سب سے زیادہ ہنگامہ بھی فردوس ہی نے مچایا تھا۔ اس نے قادر خاں کے ساتھ ساتھ اپنی سوتیلی ماں کو بھی بے نقط سنا ڈالی تھیں بہرحال، شکیلہ کی مخالفت میں بولتے ہوئے اس نے مجھے مزید بتایا کہ اس کا چھوٹا بھائی نادر بالکل بدھو ہے اور یہ کہ شکیلہ نے اسے اپنی اداؤں سے رجھا کر گاٹھ کا الو بنا رکھا ہے۔ وہ پوری طرح اس کی مٹھی میں جکڑا ہوا ہے اور اس کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ فردوس کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ نادر اس کی نہیں سنتا۔ اگر وہ اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا تو وہ دونوں مل کر قادر خاں کو مجبور کر سکتے تھے کہ وہ شکیلہ کو چلتا کر دے۔ اس نے نادر کو بے حس اور بے غیرت بھی کہا جو اپنی ماں کی موت کو بھی بھول بیٹھا تھا اور ایک ایسی بازاری عورت کے ساتھ مل گیا تھا جو اس گھر کی تباہی کی ذمے دار تھی۔ وغیرہ..... وغیرہ!

آخر میں فردوس نے بڑے یقینی لہجے میں کہا ''تھانے دار صاحب! مجھے پورا یقین ہے، یہ آگ اسی عورت نے بھڑکائی ہو گی جس میں میرا باپ جل کر زندگی ہار بیٹھا۔ آپ اس بدقماش عورت کو فوراً پھانسی پر لٹکا دیں۔''

فردوس ان لمحات میں بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ جس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہی تھی ان میں باپ کی محبت کم اور سوتیلی ماں سے نفرت زیادہ جھلکتی تھی۔ وہ ہر قیمت پر شکیلہ کو عبرتناک انجام سے دوچار کرانا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''فردوس! تم ایک بات کو فراموش کیے بیٹھی ہو!''

''کون سی بات تھانے دار صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تم نے شکیلہ کے حوالے سے ماضی کی جو طویل داستان سنائی ہے، ممکن ہے وہ سب ٹھیک ہو، تم نے حقیقت بیان کی ہو۔ تمہاری والدہ کی موت کا سبب بلاواسطہ شکیلہ ہی رہی ہو لیکن میں فی الحال اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ سردست میں صرف اتنا کہوں گا کہ آتش زدگی کے اس افسوسناک واقعے میں صرف تمہارا باپ ہی جل کر ہلاک نہیں ہوا۔ اس کا ننھا بیٹا جبران بھی اسی موذی آگ کی خوراک بن گیا ہے۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم فرض کر لیں کہ شکیلہ ہی نے خواب گاہ میں آگ بھڑکا کر تمہارے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے تو پھر اس سوال کا تم کیا جواب دو گی کہ..... شکیلہ نے اپنے معصوم بیٹے کو زندہ کیوں جلا دیا؟''

''اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت ہی کیا ہے!'' وہ عجیب سے انداز میں ہاتھ نچا کر بولی ''شکیلہ جیسی بازاری عورتوں سے کچھ بھی بعید نہیں۔ یہ اپنے مطلب کی خاطر عزیز ترین ہستی کو بھی ختم کر سکتی ہیں اور پھر.....'' وہ متوقف ہوئی پھر طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اس بات کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ.....!''

معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ یک دم خاموش ہو گئی۔ اس کی نامکمل بات کو سمجھنے کے لیے مجھے قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا۔ اس نے انتہائی نامعقول اور بے ہودہ بات کی تھی۔ اپنی سوتیلی ماں کی دشمنی میں اس نے باپ اور بھائی کے منہ پر کالک تھوپنے سے بھی کوئی تکلف نہیں برتا تھا۔ اس کی یہ حرکت مجھے سخت ناگوار گزری اور میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''فردوس بیگم! کیا تم نے یہی اہم باتیں مجھ سے کرنا تھیں!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تو.....!'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا ''تو آپ کی نظر میں یہ باتیں فضول ہیں؟''

''اس بات کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا کہ کیا فضول ہے اور کیا مفید۔'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا ''فی الحال تو تم مجھے اتنا بتاؤ کہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے تمہارے پاس کوئی ٹھوس دلیل ہے؟''

''دعویٰ..... میں نے کون سا دعویٰ کیا ہے؟'' وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''لگتا ہے، تمہاری یادداشت خاصی کمزور ہے فردوس بیگم! میں اس دعوے کی بات کر رہا ہوں جو تم نے اپنی سوتیلی ماں کے بارے میں کیا ہے کہ..... اس نے خواب گاہ میں آگ لگا کر تمہارے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''

''ثبوت تو کوئی نہیں ہے میرے پاس!'' وہ بے پروائی سے بولی ''لیکن مجھے یقین ہے، یہ کارستانی اسی شیطان عورت کی ہے۔''

اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھ کر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں برداشت کر گیا اور معتدل انداز میں کہا ''بغیر ثبوت کے کسی پر الزام لگانا بہت بڑا گناہ ہے فردوس بیگم۔ یہ فرض محال، میں اگر تمہاری زبانی کلامی بات کا یقین کر بھی لوں تو اس امر کو عدالت میں بھی پیش کرنا ہوگا اور عدالت انسانی جذبات و احساسات کو کچھ نہیں سمجھتی اور نہ ہی لوگوں کے اندازوں کو کوئی اہمیت دیتی ہے۔ وہاں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس ثبوت فراہم کرنا پڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے، اب تو تم میری بات سمجھ گئی ہوگی؟''

وہ ہار ماننے کے موڈ میں نظر نہیں آتی تھی، ضدی لہجے میں بولی ''تھانے دار صاحب! آپ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں کہتی ہوں، یہی عورت اباجی کی قاتل ہے۔ پہلے اس نے ہماری ماں کو ختم کیا اور اب باپ کی جان بھی لے لی۔ یہ کسی منحوس چڑیل سے کم نہیں ہے.....''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے فردوس بیگم! میں اس موضوع پر تم سے بعد میں بات کرتا ہوں پہلے ذرا تمہاری سوتیلی ماں کا بیان قلم بند کرلوں اور ہاں..... اس دوران میں تم یہ بھی سوچ لینا کہ آخر شکیلہ نے کون سا فائدہ حاصل کرنے کے لیے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہوگا کیونکہ کوئی بھی شخص کسی غرض، کسی مقصد کے بغیر اتنا سنگین قدم نہیں اٹھاتا!''

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے میں نے اسے بہت مایوس کیا ہو!

یہ ٹھیک ہے کہ میں نے نادر خاں اور شکیلہ کو سرخ دائروں میں بند کر رکھا تھا۔ ان کی ذات شک و شبہے کے حلقے میں دکھائی دیتی تھی لیکن بغیر کسی ثبوت یا سراغ کے ان پر چڑھ دوڑنا سراسر زیادتی ہوتی۔ میں نادر خاں کا ''انٹرویو'' کر چکا تھا اور اب شکیلہ کی باری تھی۔ بہت سی باتیں ابھی تک جواب طلب تھیں۔ شکیلہ کا بیان لینے کے بعد ہی میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا، فردوس کا دعویٰ بالکل ٹھیک ہو لیکن میں تجربے اور منطق کی کسوٹی پر رگڑے بغیر کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں نادر خاں کی معیت میں شکیلہ کے پاس پہنچ گیا۔

کمرے میں شکیلہ کے علاوہ ولایت بی بی بھی موجود تھی جو مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی لمحے نادر خاں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ولایت کو اشارہ کیا اور وہ کھڑے کھڑے، الٹے قدموں کمرے سے نکل گئی۔ نادر اپنی سوتیلی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ اس علاقے کے تھانے دار ہیں..... ملک صفدر حیات صاحب۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا، یہ شام کو آپ کا بیان لینے آئیں گے!''

شکیلہ نے نحیف آواز میں مجھے سلام کیا اور قدرے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے شائستہ انداز میں اس کے سلام کا جواب دیا اور ایک کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شکیلہ نے بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو گھٹنوں تک گرم لحاف میں چھپا رکھا تھا تاہم دونوں بازو اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے گھٹنوں پر دونوں ٹانگوں کو فولڈ کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نقاہت اور پژمردگی جھلکتی تھی اور..... ایسا کیوں نہ ہوتا، وہ جتنے بڑے صدمے سے گزری تھی، بلکہ گزر رہی تھی وہ کسی بھی ہٹے کٹے انسان کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا!

میں نے دن میں بھی شکیلہ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اس وقت وہ گہری بے ہوشی میں تھی اور اب میں اسے بڑے واضح انداز میں دیکھ رہا تھا۔ شکیلہ انتہائی خوب صورت اور جاذب نظر عورت تھی۔ قادر خاں نے اس کے حصول کے لیے پانچ ہزار روپے خرچ کر کے کوئی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ کوئی بھی دل والا، قدر داں اور صاحب حیثیت شخص اسے پانے کے لیے اپنی تمام دولت اس کے قدموں پر نچھاور کر سکتا تھا۔ تاہم ان لمحات میں شکیلہ کا حسن اور شادابی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ انتہائی افسردہ اور ملول دکھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، بھری بہار میں خزاں نے اسے چاٹ ڈالا ہو۔ وہ بیوگی کی دبیز چادر اوڑھے مرقع حزن وملال بنی بیٹھی تھی۔

نادر خاں ابھی تک کمرے میں موجود تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری آنکھ سے جھلکتے اشارے کو فوراً سے پیشتر سمجھ گیا اور جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ چھوٹی امی کا بیان لے لیں۔ میں ادھر کمرے سے باہر موجود ہوں اگر کسی مرحلے پر میری ضرورت پیش آجائے تو آپ مجھے آواز دے کر بلا سکتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ کمرے میں رک کر ہماری گفتگو سننے کا خواہش مند تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اس کی غیر موجودی میں شکیلہ مجھ سے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔ میں نے نادر خاں کے اس رویے کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا اور شکیلہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

سب سے پہلے تو میں نے اس سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ اس کے بعد صبح والے اندوہ ناک واقعے پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''شکیلہ بی بی! آتش زدگی والے اس واقعے نے مجھے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا ہے۔ بہت ساری ایسی چیزیں سامنے آئی ہیں جن کی ابھی تک کوئی توضیح نہیں ہوسکی۔ مجھے امید ہے، تم میری الجھن کو ضرور دور کردو گی۔''

وہ کمزور سی آواز میں بولی ''مجھے یوں لگتا ہے، اگر میں بولوں گی تو میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔ آپ تصور نہیں کرسکتے کہ میں نے غم کے اس طوفان کو کس طرح اپنے اوپر جھیل رکھا ہے لیکن.....'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گی، حالانکہ اب اس سے کوئی فرق تو پڑتا نہیں۔ پوچھنے اور بتانے کے لیے باقی کیا رہ گیا ہے۔ جب قادر خاں اور جبرو ہی نہیں بچے تو.....؟''

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ان لمحات میں شکیلہ مجھے ایک ایسی دل شکستہ اور اعصاب زدہ عورت نظر آئی جس کی دنیا لٹ گئی ہو۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا تھا۔ وہ اپنے شوہر اور دو سالہ بیٹے جبرو (جبران) کو یاد کرکے بے حد دکھی ہوگئی تھی۔

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا ''شکیلہ! میں تمہارے دل اور دماغ پر طاری بوجھ کی شدت کو سمجھ سکتا ہوں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر تم بات کرو گی تو اس سے بڑی حد تک تمہارا غبار دھل جائے گا لہٰذا پہلے تو تم نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتاؤ کہ گزشتہ رات اس کوٹھی کی بالائی منزل پر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کے بعد اگر میں ضروری سمجھوں گا تو تم سے کوئی سوال بھی کرلوں گا۔''

وہ چند لمحات تک خاموشی سے یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے آر پار تکنے کی کوشش کررہی ہو۔ میں سمجھ گیا، وہ اپنے بکھرے ہوئے ذہن اور منتشر خیالات کو یک جا کرنے کی سعی میں مصروف تھی۔ میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کھوئے کھوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔ اس کی آواز سے گہری افسردگی جھلکتی تھی۔

''مجھے رات کے آخری پہر باتھ روم جانے کی حاجت محسوس ہوئی لہٰذا مجھے نیچے آنا پڑا۔ اوپر والے باتھ روم میں ابھی پانی کا سسٹم بحال نہیں ہوا اس لیے ہم بھی نیچے والا باتھ روم ہی استعمال کرتے ہیں۔ جب میں واپس اوپر آئی تو.....!''

اس نے لمحے بھر کو توقف کرکے ایک خوف زدہ جھرجھری لی اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سراسیمہ انداز میں بولی ''میں جس کمرے کو امن وسکون میں چھوڑ کر گئی تھی وہ کسی تنور کی مانند دہکا ہوا تھا۔ مجھے ہر طرف آگ ہی آگ نظر آئی اور اس آگ کے اندر قادر خاں اور جبرو.....'' اس کی آواز رندھ گئی۔

''پھر..... پھر کیا ہوا تھا؟'' میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ روہانسی آواز میں بولی ''یہ قیامت خیز منظر دیکھ کر تو میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں بچانے کے لیے کیا کروں۔ آگ بڑی بے دردی سے انہیں نگلتی جارہی تھی۔ خود کو بے بس اور لاچار پاکر میں کمرے سے باہر دوڑ گئی اور وہیں کھڑے کھڑے میں نے ''آگ آگ'' چلانا شروع کردیا۔ میری پکار پر ولایت سامنے آئی اور میں نے اسے بتایا کہ ہمارے کمرے میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوتا رہا۔ نادر، غلام حسین اور ولایت بی بی کب اوپر پہنچے اور انہوں نے آگ بجھانے کے سلسلے میں کیا کوششیں کیں! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھے کس طرح نیچے والی منزل پر پہنچایا۔ میں اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی.....''

وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوئی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے واقعی مختصر الفاظ میں بیان دیا تھا اور شکیلہ کے اس بیان میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو میری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی۔ یہ باتیں ولایت بی بی اور نادر خاں کی زبانی مجھ تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کا یہی مطلب تھا، کام کی کوئی بات سامنے لانے کے لیے مجھے سوالات کا سہارا لینا تھا لہٰذا میں شکیلہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شکیلہ بی بی!'' میں نے بڑی رسان سے اسے مخاطب کیا ''آتش زدہ خواب گاہ میں مجھے گھی والا ایک سیر کا خالی ڈبا نظر آیا تھا، آگ نے جس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو، بنا سپتی گھی والا وہ خالی ڈبا کس مقصد سے وہاں رکھا گیا تھا؟''

اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر تعجب خیز انداز میں بولی ''گھی والے کسی خالی ڈبے کا ہمارے کمرے میں کیا کام۔ نہیں جناب! آپ جس ڈبے کا ذکر کر رہے ہیں، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے گھر میں تو پانچ سیر گھی والا ڈبا آتا ہے!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ایک سیر گھی والا ڈبا بھی اس گھر میں آیا ہی نہیں؟''

''نہیں جی۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی ''نہ خالی اور نہ ہی گھی سے بھرا ہوا!''

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''جب اس گھر میں بنا سپتی گھی والا ایک سیر کا ڈبا کبھی آیا ہی نہیں تو پھر وہ تمہاری خواب گاہ میں کیسے پہنچ گیا؟ کس نے اسے وہاں پہنچایا؟''

''یہی بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھانے دار صاحب!'' وہ الجھن بھری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی پھر استفسار کیا ''کیا آپ نے اس ڈبے کے بارے میں نادر خاں سے پوچھا تھا؟''

''ہاں، پوچھا تھا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''تمہاری طرح اس نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ بہرحال، تم چاہو تو میں تمہیں خواب گاہ میں موجود وہ آفت زدہ ڈبا دکھا سکتا ہوں!''

شکیلہ نے مذکورہ ڈبے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ ہی سرے سے انکار کیا، بس مضمحل انداز میں مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد متاثرہ خواب گاہ کو بند کر کے دروازے پر سرکاری تالا لگا دیا تھا۔ نادر کو وہ ڈبا دکھانے بھی میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ اس تالے کی چابی اس وقت بھی میری جیب میں تھی۔

میں نے شکیلہ سے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا ''تم تو جانتی ہی ہو گی کہ پچھلے دنوں نادر خاں کا طلائی لاکٹ گم ہو گیا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی ''یہ بات میرے علم میں تو نہیں ہے۔ کب کھویا تھا اس کا لاکٹ؟''

شکیلہ کے اس حتمی جواب نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ وہ ایک نئی اور خلاف توقع بات کر رہی تھی۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں جانتی ہو گی اور میں اسے بتاؤں گا کہ وہ گمشدہ طلائی لاکٹ بھی اسی خواب گاہ سے ملا ہے جہاں سفاک آگ نے دو جیتے جاگتے انسانوں کو جلا کر کوئلا کر بنا ڈالا تھا مگر اس نے تو کہانی ہی الٹ کر رکھ دی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ لاکٹ کی گمشدگی کا اسے علم نہ ہو۔ میں نے اس کے ذہن کی بات کو سامنے لانے کی غرض سے سوال کیا۔

''شکیلہ! تم بڑی عجیب بات کر رہی ہو۔ نادر نے خود مجھے اپنے لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا ہے اور جب اسے پتا چلا کہ اس کا کھویا ہوا لاکٹ مجھے تمہاری خواب گاہ سے ملا ہے تو وہ بہت حیران ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ وہ لاکٹ وہاں کیسے پہنچ گیا؟ میں بھلا اس کے سوال کا کیا جواب دیتا! میں نے اس سے کہہ دیا کہ تم سے پوچھنے کے بعد بتاؤں گا..... اور تم تو سرے سے اس لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں ہو۔ حیرت ہے، ایک چیز کی سب کو خبر ہے اور صرف تم ہی لاعلم ہو! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں واقعی نادر خاں کے لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''کیا نادر نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مجھے اپنے لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا؟ اگر ایسی بات ہے تو آپ اسے میرے سامنے لے کر آئیں۔''

شکیلہ کے لہجے میں قطعیت کو دیکھتے ہوئے میں سوچ میں پڑ گیا۔ نادر نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے چھوٹی امی اور ابا جی کو اپنے لاکٹ کی گمشدگی سے آگاہ کیا تھا۔ شکیلہ نے فوراً فتویٰ جاری کر دیا تھا کہ وہ لاکٹ گھر سے باہر کہیں کھویا ہو گا اور اب..... یہی شکیلہ لاکٹ کی گمشدگی سے لاعلمی ظاہر کر رہی تھی۔ بلکہ نادر سے سامنا کرانے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے ایک چال چلتے ہوئے بات کو تھوڑا گھما دیا۔ میں نے اس سے کہا ''نادر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ایسا کوئی دعویٰ تو نہیں کیا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس واقعے کا سارے گھر کو پتا ہے تمہارے دونوں ملازمین ولایت بی بی اور غلام حسین اس لاکٹ کو تلاش کرتے رہے ہیں اس سے تم بے خبر کیوں ہو؟ نادر نے تو مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ متوفی قادر خاں نے اس سے کہا تھا..... جانے والی شے کا غم نہ کرو۔ میں تمہیں ایسا ہی دوسرا نیا لاکٹ دلا دوں گا!''

''ہوسکتا ہے، باپ بیٹے میں ایسی کوئی بات ہوئی ہو لیکن میں اس سے قطعی لاعلم ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی ''دراصل، میں نادر کے معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی ہوں۔''

آخری جملہ شکیلہ نے کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا جیسے وہ نادر خاں سے خوش نہ ہو۔ سوتیلے ''ماں بیٹے'' کے تعلقات کا یہ ایک نیا زاویہ میرے سامنے آرہا تھا ورنہ نادر کو تو میں نے شکیلہ کے لیے خاصا فکرمند اور پُرتشویش دیکھا تھا آپا فردوس کو بھی یہی غم مارے جارہا تھا کہ اس کے سگے بھائی نادر خاں کی سوتیلی ماں کے ساتھ خوب بنتی ہے مگر نادر خاں کے حوالے سے شکیلہ کا رویہ اس کے بالکل بالعکس نظر آرہا تھا اور یہ میرے لیے چونکنے کی بات تھی۔ میں نے شکیلہ کے کہے ہوئے آخری جملے کی روشنی میں اس سے پوچھ لیا۔

''کیوں..... اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''نادر خاصا اکھڑ اور غصے والا ہے۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی ''سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے!''

''میں نے تو اس کے رویّے اور انداز میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا ''وہ تو تمہارے لیے خاصا پریشان دکھائی دیتا ہے۔''

''یہ محض اس کی اداکاری ہے۔'' وہ ناپسندیدہ لہجے میں بولی ''وہ کسی میٹھی چھری سے کم نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ''مینا'' کا لفظ زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اونہہ.....!'' وہ نفرت آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں، اس عیار کے دل میں میرے لیے کتنی محبت اور ہمدردی ہے۔ فردوس کی طرح یہ بھی مجھے اپنی ماں کی قاتل سمجھتا ہے۔ بس دونوں میں اتنا سا فرق ہے کہ فردوس پھٹا ہوا ڈھول ہے اور نادر میٹھی چھری۔ فردوس کی دوستی اور دشمنی بالکل کھلی نظر آتی ہے اور یہ شیطان اوپر سے میٹھا بن کر اندر سے جڑیں کاٹتا ہے۔ میں نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ سب جانتی ہوں میں..... ایک ایک کو پہچانتی ہوں۔''

میں حیرت بھری نظر سے شکیلہ کو دیکھتا چلا گیا۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ ان لمحات میں وہ کوئی مذاق نہیں کررہی تھی۔ میں نے اسے بے انتہا سنجیدہ اور گمبھیر پایا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ میں نادر خاں کو اس کے سامنے لاؤں! اب اس کا اعتماد سمجھ میں آرہا تھا۔ اس نے ابھی نادر خاں کے لیے اپنے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا اس کی روشنی میں بڑا واضح نظر آرہا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ نادر خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا سامنا کرسکتی تھی بلکہ اسے منہ توڑ جواب بھی دے سکتی تھی۔

''تو پھر..... تو پھر نادر خاں کن ہواؤں میں تھا؟''

اس سوال نے میرے ذہن کو الجھا دیا اگر شکیلہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا، نادر خاں نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ وہ پہلے ہی میرے شک کے دائرے میں بند تھا۔ شکیلہ کے خیالات سے آگاہی حاصل ہونے کے بعد یہ دائرہ اس کی ذات کے گرد تنگ ہونے لگا۔

میں نے شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا ''اس کا مطلب ہے، نادر نے لاکٹ کے حوالے سے مجھ سے جھوٹ بولا ہے!''

''کیسا جھوٹ؟'' وہ تجسس بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کردی اور کہا ''لیکن میں محسوس کرتا ہوں، فی الحال کسی قسم کا سامنا کرنے کی ضرورت نہیں۔ آگے چل کر دیکھیں گے!''

''میں تو تیار ہوں۔'' وہ خاصی بہادری سے بولی ''آگے آپ کی مرضی، تھانے دار صاحب!''

میں نے سوالات کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا ''شکیلہ بی بی! ذرا اچھی طرح سوچ کر تم مجھے بتاؤ کہ گزشتہ رات تم لوگ کتنے بجے سونے کی غرض سے خواب گاہ میں داخل ہوئے تھے؟''

''رات کا کھانا ہم نے نیچے ہی کھایا تھا۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولی ''پھر اوپر آگئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ہم رات نو بجے اپنی خواب گاہ میں داخل ہوئے تھے۔''

''یعنی ہم سے آپ کی مراد ہے..... تم، قادر خاں اور ننھا جبران؟''

''جی ہاں ہم تینوں۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیا تم لوگ اوپر پہنچتے ہی سو گئے تھے؟''

''جبران تو نیچے ہی سو گیا تھا۔ میں اسے اپنی گود میں اٹھا کر اوپر لائی تھی۔'' میرے سوال کے جواب میں شکیلہ نے بتایا ''میں اور خاں صاحب لگ بھگ دس بجے سوئے ہوں گے۔''

''مجھے پتا چلا ہے، ننھا جبران آپ دونوں سے الگ ایک چھوٹی سی کھٹولا نما چارپائی پر سوتا ہے!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''کیا کل رات بھی تم لوگ اسی انداز میں اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے؟''

''جی ہاں، میں اور خاں صاحب بڑے پلنگ پر سوئے تھے۔'' اس نے بتایا ''اور جبزو اپنے کھٹولے پر۔ وہ کھٹولا میں اپنی سائیڈ پر رکھتی ہوں اور رات میں، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہاتھ بڑھا کر میں اسے چیک کرتی رہتی ہوں۔ میں نے سن رکھا ہے اگر بچوں کو علیحدہ سونے کی عادت ڈالی جائے تو ان میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔''

یہ ایک طویل بحث ہے اور مغرب اس فلسفے کا حامی ہے لیکن مشرق، خصوصاً برصغیر میں اس کی مخالفت دیکھنے میں آئی ہے۔ اس خطے کے باسیوں کا کہنا ہے کہ جو مائیں اوائل عمری ہی سے اپنے بچوں کو خود سے الگ کر دیتی ہیں، بڑے ہونے کے بعد وہ اولاد اپنے والدین سے دور ہو جاتی ہے۔ صحیح اور غلط کی جانچ کے لیے آپ تجربہ کر کے دیکھ سکتے ہیں!

میں نے شکیلہ سے پوچھا ''تم گزشتہ رات باتھ روم جانے کے لیے بالائی منزل سے زیریں منزل پر پہنچی تھیں۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے، تم کتنے بجے اپنی خواب گاہ سے نکلی تھیں؟''

''اس وقت رات کے تین بجے تھے۔'' شکیلہ نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''جب تم اپنی خواب گاہ سے نکل رہی تھیں تو کیا تم نے قادر خاں اور جبران کو چیک کیا تھا..... میرا مطلب ہے، تم انہیں کس پوزیشن میں چھوڑ کر گئی تھیں؟''

''میں قادر خاں کے پاس سے اٹھی تھی۔ وہ اس وقت گہری نیند میں تھا۔'' شکیلہ نے جواب دیا ''ننھا جبرو بھی بڑے مزے سے سو رہا تھا۔ میں نے اس خیال کے تحت جبرو کو کھٹولے پر سے اٹھا کر اپنی جگہ پر ڈال دیا کہ میری غیر موجودی میں اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو وہ خود کو تنہا محسوس نہ کرے، قادر خاں کا لمس پاتے ہی وہ سمجھ جائے کہ کوئی اس کے آس پاس موجود ہے۔ بس، پھر میں کمرے سے نکل کر نیچے والی منزل کی طرف آ گئی تھی اور جب میں واپس پہنچی تو.....!'' اس نے خوف زدہ انداز میں ایک جھرجھری لی اور خاموش ہو گئی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کے تصور میں جلتے ہوئے کمرے کا ہلاکت خیز منظر گھوم گیا ہوگا۔ میں نے اس کے خاموش ہونے پر استفسار کیا ''شکیلہ بی بی! یہ بڑی عجیب بات نہیں کہ جب تم اپنی خواب گاہ سے نکلیں تو وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن جب واپس آئیں تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا کیا تم نے باتھ روم میں کوئی گھنٹا بھر گزارا تھا؟''

''یہ بات نہیں ہے تھانے دار صاحب!'' وہ وضاحت کرنے والے انداز میں بولی ''میں تو کم سے کم وقت کے لیے نیچے اتری تھی اور ارادہ یہی تھا کہ جبرو کو زیادہ دیر تک تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے سوچا تھا، بس جانا آنا ہی کروں گی۔ اسی جلد بازی اور افراتفری میں، میں اپنی سلیپر کے بجائے خاں صاحب کی سوفٹی پاؤں میں پھنسا کر کمرے سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ میری سلیپر پلنگ کے نیچے کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی تھی اور میں اسے ڈھونڈنے میں وقت ضایع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ دیکھیں، خاں صاحب کی سوفٹی!''

اس نے اپنی بات کو روک کر کمرے کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے اس کے اشارے کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے مردانہ چپل رکھی نظر آ گئی۔ مخصوص قسم کی وہ مردانہ چپل ان دنوں نئی نئی متعارف ہوئی تھی۔ اپنی نرمی اور آرام دہی کے باعث وہ ''سوفٹی'' کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ میں نے مذکورہ چپل کو دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی تو شکیلہ نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت سے یہی سوفٹی میرے پاؤں میں ہے۔ میں جب باتھ روم سے فارغ ہونے کے بعد واپس اپنے کمرے میں پہنچی تو وہاں کی ہر شے کے ساتھ ہی میری سلیپر بھی رزق آتش بن چکی تھی۔ خیر..... تو میں آپ کو بتا رہی تھی.....'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں تو چند منٹ کا سوچ کر باتھ روم گئی تھی مگر وہاں پہنچ کر ایک عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ میں نے قادر خاں والی سوفٹی کو باتھ روم کے دروازے کے باہر چھوڑ کر باتھ روم کے استعمال کے لیے مخصوص چپل پاؤں میں پھنسالی تھی۔ میں نے فارغ ہونے کے بعد جب باتھ روم سے باہر نکلنا چاہا تو دروازہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے باہر سے کسی نے اسے کنڈی لگا دی ہو.....!''

اس کے بعد شکیلہ نے وہ پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا جو نادر خاں اور ولایت بی بی کی زبانی فرداً فرداً مجھ تک رسائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاصل کر چکا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں نے باتھ روم میں گھنٹا بھر تو نہیں گزارا لیکن میرا خیال ہے، اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بیس پچیس منٹ تو لگے ہی ہوں گے۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ آدھا گھنٹا سمجھ سکتے ہیں۔''

''آدھا گھنٹا!'' میں نے زیرِلب دہرایا پھر پُرسوچ انداز میں کہا ''ہاں یہ اتنا وقت ہے کہ تیزی سے بھڑکنے والی آگ اس مدت میں انسانی جانوں کو جلا کر کوئلا بنا سکتی ہے مگر.....'' میں لمحے بھر کو رکا پھر الجھن بھرے انداز میں اضافہ کیا۔

''.....مگر اس صورت میں بھی چند اہم سوالات سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں ابھی تک ان سوالات کے جواب حاصل نہیں کر سکا ہوں۔ شکیلہ بی بی! مجھے امید ہے، اس سلسلے میں تم ضرور میری مدد کرو گی؟''

''کون سے اہم سوالات تھانے دار صاحب؟'' وہ الجھن آمیز انداز میں مجھے تکنے لگی۔

میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''نمبر ایک، اچانک خواب گاہ میں ایسی خطرناک آگ کیوں کر بھڑک اٹھی؟ نمبر دو، اگر کسی بھی طرح آگ لگ ہی گئی تھی تو وہ دونوں خاموش پڑے اس میں جلتے کیوں رہے۔ جبرو تو ابھی اپنے ہاتھ پاؤں کا نہیں ہوا تھا لیکن قادر خاں تو اپنی جان بچانے کے لیے کوشش کر سکتا تھا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا نا کہ اسے پتا ہی نہ چلا ہو کہ کمرے میں جہنمی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ یہ اسی صورت ممکن تھا جب وہ ایسی حالت میں ہو کہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی سکت بھی نہ رکھتا ہو؟ نمبر تین، نادر خاں کا طلائی لاکٹ جائے حادثہ سے کیوں ملا؟ اور نمبر چار، بنا پتی گھی والا ایک سیر کا ڈبا تمہاری خواب گاہ میں کیا کر رہا تھا؟'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر ان تمام سوالوں کے درست جواب مجھے حاصل ہو جائیں تو میں پلک جھپکتے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ سکتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا شکیلہ بی بی؟''

اس نے متاملانہ نظر سے مجھے دیکھا، ایک گہری سانس خارج کی پھر نقاہت بھری بوجھل سی آواز میں بولی ''تھانے دار صاحب! لاکٹ کا مالک نادر خاں ہے لہٰذا یہ سوال تو آپ اسی سے پوچھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں لاکٹ کی گمشدگی کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کر چکی ہوں۔ گھی والے خالی ڈبے کے بارے میں بھی میں کچھ نہیں جانتی۔ قادر خاں نے اپنی جان بچانے کے لیے کوئی عملی کوشش کیوں نہیں کی اس بات پر مجھے بھی شدید حیرت ہو رہی ہے۔ اس وقت تو میرا دماغ ہی الٹا ہوا تھا لہٰذا میں اس حوالے سے سوچ نہ سکی۔ اب آپ نے اس جانب توجہ دلائی ہے تو میرا ذہن واقعی الجھنے لگا ہے کہ قادر خاں نے چپ چپاتے موت کو کیسے گلے لگا لیا!''

اس نے ایک مرتبہ پھر خوف زدہ انداز میں جھرجھری لی۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر میرے سوالات کے جواب دے رہی تھی۔ بظاہر وہ خاصی سنبھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی لیکن میں اس کی اندرونی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ننھے جبران کی المناک موت نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا ''اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آگ لگی کیسے؟ تو اس سلسلے میں، میں وثوق سے تو کوئی بات نہیں کر سکتی ہوں البتہ، میرا دھیان کوئلوں والی انگیٹھی کی طرف جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے، میری غیر موجودگی میں قادر خاں نے کروٹ بدلی ہو اور لحاف کا کوئی کونا دہکتی ہوئی انگیٹھی میں جا گرا ہو..... بہرحال، یہ میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے!''

وہ خاموش ہوئی تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ شکیلہ نے آتش زدگی کے حوالے سے جو اندازہ لگایا تھا وہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا اور اس کے ساتھ ہی باتھ روم کے دروازے کو باہر سے لگنے والی کنڈی کا معاملہ بھی مجھے الجھا رہا تھا۔ شکیلہ کا دعویٰ تھا، اس نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی تھی مگر دروازہ نہیں کھل سکا تھا جس سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ کسی بدبخت نے باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی ہے۔ کنڈی کھلوانے کے لیے اس نے اپنی ملازمہ ولایت بی بی کو پکارا تھا لیکن ولایت بی بی کا بیان یہ تھا کہ باتھ روم کے دروازے کی بیرونی کنڈی سرے سے بند ہی نہیں تھی۔ اس سچویشن میں میرا دھیان اس بات کی طرف جا رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے واقعی دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی ہو اور ازاں بعد شکیلہ کے شور مچانے پر، ولایت بی بی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ کنڈی کھول دی ہو!

ایسا صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو شکیلہ کو زیادہ سے زیادہ دیر تک، باتھ روم کے اندر بند رکھنے کا خواہش مند ہو، تاکہ اس کی واپسی سے پہلے خواب گاہ کا قصہ پاک ہو جائے۔ یہ وہی شخص ہو سکتا تھا جس نے خواب گاہ میں آگ بھڑکائی ہو۔ اس گھر میں، زیریں منزل پر صرف تین افراد رہتے تھے۔ یعنی غلام حسین، ولایت بی بی اور نادر خاں۔ غلام حسین اور ولایت بی بی کسی بھی پہلو سے اس معاملے میں ملوث دکھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں دیتے تھے۔ اب آجا کر نادر خاں ہی باقی بچتا تھا!

شکیلہ نے نادر خاں کے حوالے سے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی روشنی میں وہ شکیلہ کا دشمن ٹھہرتا تھا۔ وہ بھی اسے سخت ناپسند کرتی تھی پھر لاکٹ کی گمشدگی اور بازیابی کا معاملہ بھی خاصا الجھ کر رہ گیا تھا۔ دونوں ''ماں بیٹے'' کے بیانات میں گہرا تضاد پایا جاتا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن یہ سوچنے پر مجبور تھا..... تو کیا یہ آگ نادر خاں کی لگائی ہوئی تھی؟

یہ ایک خاصا خطرناک سوال تھا۔ نادر خاں کی ذات شک و شبہے سے چونکہ پاک نہیں تھی لہٰذا میں اس زاویے پر آگے ہی آگے سوچتا چلا گیا اور اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ میں نے شکیلہ سے پوچھ لیا۔

''میں نے زیریں منزل کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اس کے اندرونی حصے میں داخل ہونے کے لیے ایک تو سامنے کا راستہ ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی راستہ موجود ہے؟''

وہ اپنی پیشانی کو ہاتھ کی مدد سے دباتے ہوئے بولی ''کوٹھی کے عقبی حصے میں گھاس والا لان ہے اور عقبی دیوار کے ساتھ ساتھ پھول دار پودے بھی لگے ہوئے ہیں۔ اس سمت سے بھی ایک راستہ اندر کو جاتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکی، لحاف کے اندر اس نے بڑی مشکل سے پہلو بدلا تو چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے پھر کمزور سی آواز میں اس نے مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں نے قانونی تقاضے اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے آپ سے اتنی لمبی گفتگو کر لی ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ میں اندر باہر سے کس قدر ٹوٹ چکی ہوں۔ میں مزید کسی بیان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا ہے اور دل کا جو حال ہے اسے بیان کرنے کی ہمت ہے اور نہ ہی سکت۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے سینے میں ایک قبرستان آباد ہو گیا ہے لہٰذا میں آپ سے معذرت.....''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر باقاعدہ ہانپنے لگی۔

میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر جلدی سے کہا ''بس، میں تم سے آخری سوال پوچھ رہا ہوں۔ اس کے بعد تم آرام کرنا، میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔''

وہ دریدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا ''کیا تم نے اس سانحے کے بعد کوئی دوا وغیرہ کھائی تھی؟''

''کیسی دوا؟'' اس نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا ''نیند کی کوئی گولی وغیرہ.....؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی ''مجھے اتنا ہوش کہاں تھا کہ میں اپنے بارے میں کچھ سوچ سکتی۔ مجھ پر جو قیامت گزر گئی تھی اس نے تو جیسے مجھے موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔''

میں نے شکیلہ کو فارغ کر دیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

سب سے پہلے نادر خاں سے سامنا ہوا۔ وہ کافی دیر سے میرا منتظر بیٹھا تھا۔ چھوٹتے ہی اس نے پوچھ لیا ''تھانے دار صاحب! کچھ پتا چلا؟''

اس کے اس سوال نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا ''کیا پتا چلنا تھا؟''

''وہ جی یہی کہ.....'' وہ گڑبڑا گیا ''کہ آگ کس نے لگائی تھی.....!''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا ''ہاں، مجھے پتا چل گیا ہے کہ اوپر والی خواب گاہ میں آگ کیسے بھڑکی تھی لیکن تمہیں اس بات کی تفصیل جاننے کے لیے کل تک انتظار کرنا ہوگا۔''

''یہ..... یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔

''تم کل صبح تھانے آجاؤ، پھر میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔'' میں نے اس کی تسلی کی خاطر خاصے رازدارانہ انداز میں کہا ''یہاں پر بات کرنا مناسب نہیں۔ تم نے سنا تو ہوگا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں..... اور انہی دیواروں کے پیچھے تمہاری سوتیلی ماں شکیلہ بھی موجود ہے!''

میں نے اسے فی الحال ٹالنے کے لیے یہ بات کہہ دی تھی۔ وہ بڑے صحت مند انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا جناب!''

اس مرتبہ نادر کا رویہ پہلے سے کافی مختلف تھا۔ وہ اب تک مجھے شکیلہ کی حمایت کرتا دکھائی دیا تھا لیکن اب اس کی گردن کی حرکت کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔ اندر کمرے میں شکیلہ نے نادر خاں کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان سوتیلے ماں بیٹے کے بیچ کوئی بڑی گڑبڑ ہو۔

میں کانسٹیبل منظور الٰہی کے ساتھ اس کوٹھی سے رخصت ہونے لگا تو آپا فردوس کہیں سے نکل کر اچانک میرے سامنے آ گئی۔ مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو اس نے جسس آمیز انداز میں پوچھا۔

''اب تو آپ کو میری بات کا یقین آ گیا ہوگا تھانے دار صاحب!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب؟''

''کون سی بات؟'' میں نے دانستہ انجان بنتے ہوئے کہا۔

''وہی جناب..... کہ ہماری سوتیلی ماں نے ابا جی کو جلا کر ہلاک کیا ہے!''

میں نے اس جذباتی عورت کی تسلی کی خاطر کہہ دیا ''اس نے اقرار تو نہیں کیا حالانکہ میں نے اس سے پوچھا بھی تھا!''

''وہ اتنی سیدھی نہیں ہے کہ اپنی زبان سے اقرار کرلے۔'' فردوس نے نفرت آمیز انداز میں کہا ''آپ اسے تھانے میں بند کر کے تھوڑی سختی کریں تو وہ سب کچھ بک دے گی۔''

اس کا یہ جارحانہ انداز مجھے قطعاً پسند نہ آیا۔ وہ اتنے وثوق سے بات کر رہی تھی جیسے اس نے خود اپنی آنکھوں سے شکیلہ کو وہ جرم کرتے دیکھا ہو۔ میں نے معتدل لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''فردوس بیگم! تھانے دار تم ہو یا میں؟''

''ظاہر ہے، تھانے دار تو آپ ہی ہیں جناب!'' وہ گڑبڑا کر بولی۔

''تو پھر تھانے داری بھی تم مجھے ہی کرنے دو۔'' میں نے قدرے برہم لہجے میں کہا ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کس وقت مجھے کیا کرنا ہے۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی نگاہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا اس لیے الجھ کر رہ گیا لیکن جب وہ بولی تو اس کی آنکھوں میں موجود حیرت اور بے یقینی کے تاثرات کو گویا زبان مل گئی۔ اس نے عجیب سے انداز میں ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار جی! لگتا ہے، اس جادوگرنی نے آپ پر بھی کوئی تیر چلا دیا ہے!''

جادوگرنی سے اس کی مراد یقیناً شکیلہ ہی تھی۔ میں نے فردوس کے تبصرے کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا اور کانسٹیبل کے ہمراہ تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

اگلے روز دوپہر سے تھوڑا پہلے نادر خاں میرے پاس تھانے آیا اور مجھ سے کل والی بات کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ میں نے گزشتہ رات اس سے وعدہ کیا تھا، تھانے آؤ گے تو تمہیں کوئی اہم بات بتاؤں گا۔ وہ اس وقت نہایت ہی مضطرب اور متجسس دکھائی دیتا تھا جیسے اسے یہ جاننے کی بہت جلدی ہو کہ میں نے پچھلی رات اس کی سوتیلی ماں شکیلہ سے کیا باتیں کی تھیں۔ اس کی بے تابی قابل دید تھی۔

میں چند لمحات تک گہری نظر سے اس کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے، اس کے بارے میں، اس کی سوتیلی ماں کے خیالات سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ ایک دم برہم ہوگیا پھر غصیلے لہجے میں بولا۔

''یہ کوٹھے والیاں کسی کی نہیں ہوتیں۔ میں نے اپنی ماں سے زیادہ اس کا خیال رکھا اور وہ میرے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہے۔ ابا جی زندہ ہوتے تو میں ان کی گواہی پیش کرتا کہ میں نے ان کے سامنے اپنے گمشدہ لاکٹ کا تذکرہ کیا تھا یا نہیں..... اور اس موقع پر شکیلہ نے جو تبصرہ کیا تھا وہ بھی آپ کو پتا چل جاتا لیکن افسوس کہ.....'' وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا ''اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ.....'' اچانک اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں ''یہ عورت اس کیس میں مجھے پھنسانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہے۔ میں اس کو چھوڑوں گا نہیں'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مجھ سے پوچھنے لگا ''کیا شکیلہ نے میرے بارے میں آپ سے ایسی کوئی بات کی ہے..... میرا مطلب ہے، مجھے آتش زدگی والے معاملے میں ملوث کرنے کی بات؟''

''اس نے ایسا کچھ نہیں کہا نادر خاں!'' میں نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا ''اور تم جا کہاں رہے ہو؟ آرام سے اِدھر بیٹھ کر بات کرو!''

وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے رویے میں نمودار ہونے والی اس اچانک تبدیلی نے مجھے کھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ یا تو اس کا وہ اشتعال مصنوعی تھا اور یا پھر وہ اب مطمئن نظر آنے کی اداکاری کر رہا تھا۔ میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نظر سے اسے تکتا رہا اور اس سے پہلے کہ میں اسے کسی نئے زاویے سے گھسنے کا آغاز کرتا، مجھے بتایا گیا کہ سرکاری اسپتال سے قادر خاں اور جبران خاں کی ''لاشیں'' آگئی ہیں۔ میں تھوڑی دیر کے لیے نادر خاں کو بھول کر ضروری کاغذی کارروائی میں مصروف ہوگیا۔

پوسٹ مارٹم شدہ لاشوں کے ساتھ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی موصول ہوئی تھی۔ جب میں نے اس رپورٹ کا مطالعہ کیا تو یہ الجھا ہوا کیس ایک لمحے میں سلجھ کر رہ گیا۔ اس رپورٹ نے مجھے حیرتوں کے سمندر میں غوطہ خوری پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت میں اپنے کمرے میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا، نادر خاں لاشوں کے پاس کھڑا انہیں کوٹھی تک پہنچوانے کے بندوبست میں مصروف تھا۔ میں جلدی جلدی اس سنسنی خیز رپورٹ کو پڑھتا چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، قادر خاں کی موت بارہ فروری کی رات، دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ کیمیاوی تجزیے کی رو سے، قادر خاں کو کوئی سریع الاثر زہر کھلا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس زہر میں اتنی طاقت تھی کہ اسے مرنے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ اغلب امکان یہ تھا کہ زہر کسی لیکوئیڈ خصوصاً دودھ میں ملا کر اس کے معدے تک پہنچایا گیا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں کے تجزیے سے پتا چلا کہ دھویں نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی تھی یعنی جب خواب گاہ میں آگ بھڑکی تو وہ اس سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا!

ننھے جبران کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اس سے قطعی مختلف تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق، اس کی موت کا وقت تیرہ فروری کی صبح، تین اور چار بجے کے درمیان بتایا گیا تھا اور موت کا سبب دم گھٹنا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں دھویں کے مخصوص آثار مل گئے تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آگ لگنے کے سبب خواب گاہ میں جو کثیف دھواں پھیلا تھا، جبران اسی کی وجہ سے دم گھٹ کر مر گیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی واشگاف رپورٹ نے نادر خاں اور شکیلہ کے جھوٹ کی قلعی کھول دی تھی۔ بس، یہ جاننا باقی تھا کہ کس نے کس مقصد کے حصول کے لیے کس قدر جھوٹ بولا تھا۔ ایک بات تو طے تھی کہ ان دونوں میں ایکا نہیں تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی طے تھا کہ آتش زدگی والے واقعے میں وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ضرور ملوث تھا۔ میں اگر ان پر سختی کرتا تو ان کی زبان کھل سکتی تھی۔ اب ان کے خلاف میرے پاس اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ وہ مجھے چکر دینے یا مزید اداکاری جاری رکھنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے مگر..... میرا ذہن اس نقطے پر آ کر اٹک گیا کہ انہیں فوری طور پر حراست میں لے لوں یا پھر قادر اور جبران کی تدفین کے بعد ان پر ہاتھ ڈالوں۔

تھوڑی سوچ بچار کے بعد میں ایک سنگین حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔ میری نظر میں وہ کسی رو رعایت کے مستحق نہیں تھے۔ میں نے اے ایس آئی نزاکت شاہ کو اپنے پاس بلایا اور نہایت ہی رازدارانہ انداز میں کہا۔

''تم فوراً فرید ٹاؤن روانہ ہو جاؤ اور وہاں سے شکیلہ، فردوس اور خاور محمود کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آ جاؤ۔''

تھوڑی دیر پہلے نادر خاں نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا بہنوئی خاور آدھمکی گھر آیا ہوا ہے اور اب وہ شام ہی کو واپس جائے گا۔ نزاکت شاہ نے پُرتجسس انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! لگتا ہے، کوئی خاص سرا آپ کے ہاتھ آ گیا ہے؟''

''بہت ہی خاص الخاص شاہ جی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔

وہ پُرجوش انداز میں اٹھا اور میرے بتائے ہوئے مشن پر روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد نادر خاں میرے پاس آیا اور بولا ''جناب! اب یہ لاشیں میرے حوالے کر دیں تاکہ ان کی تکفین تدفین کے بارے میں سوچا جا سکے۔ باقی جھگڑے تو بعد میں نمٹائے جا سکتے ہیں، پہلے ان کو قبر میں اتارنا ضروری ہے۔''

''میرے پیش نظر بھی یہی بات ہے نادر خاں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میں اسی کوشش میں ہوں کہ جلد از جلد تمہیں فارغ کر دوں۔ تم باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔''

وہ کمرے سے نکلا تو میں نے ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلا کر ایک دو ضروری کاموں کی تاکید کی اور اسے روانہ کر دیا۔ اس کانسٹیبل کو ایک تو آٹھ دس گلاس ٹھنڈی لسی کا انتظام کرنا تھا اور دوسرے ایک ایسا پنجرہ لے کر آنا تھا جس کے اندر دو خطرناک، صحت مند چوہے بند ہوں۔ کانسٹیبل نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا بندوبست کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوا تھا۔

''سر جی! سمجھیں میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔''

اور واقعی..... نزاکت شاہ کی واپسی سے پہلے ہی کانسٹیبل نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔

اے ایس آئی میرے مطلوبہ افراد کو لے کر تھانے پہنچا تو میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔ نادر خاں بھی ان کے ساتھ ہی اندر چلا آیا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے پہلے ہی میں نے حوالدار صفدر حسین کو اپنے ''خصوصی پروگرام'' سے آگاہ کر دیا تھا لہٰذا وہ پورے بندوبست کے ساتھ میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔

میں نے فردوس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم اپنے خاوند کے ساتھ قادر خاں اور جبران کی لاشوں کو لے کر فرید ٹاؤن چلی جاؤ۔ ان دونوں بدنصیبوں کی تدفین تم لوگوں کے ہاتھوں ہو گی۔''

''کک..... کیا مطلب ہے جی؟'' وہ ہکلائی۔

خاور نے پوچھا ''کیا نادر اور شکیلہ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''کیوں..... کیوں جی؟'' فردوس ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگی۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''فردوس بیگم! میں مان گیا کہ تم انداز ے لگانے کی ماہر ہو لیکن اپنی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے تم جانبداری سے کام لیتی ہو۔ سگے کو بچا کر صرف سوتیلی کی گردن پھنسواتی ہو لیکن دیکھ لو، میں نے دونوں کو قابو کر لیا ہے؟ ان کی خاطر داری اب مجھ پر لازم ہو گئی ہے!''

نادر خاں طیش کے عالم میں یک لخت اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بپھرے ہوئے لہجے میں بولا ''کوئی مائی کا لال مجھے روک نہیں سکتا!''

''یہ کیا تماشا ہو رہا ہے تھانے دار صاحب؟'' شکیلہ نے جارحانہ انداز میں دریافت کیا۔

''یہ کوئی نیا تماشا نہیں ہے!'' میں نے زہریلے انداز میں کہا ''بلکہ جس تماشے کا تم لوگوں نے آغاز کیا تھا، میں نے اس کا انجام تلاش کر لیا ہے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے حوالدار صفدر حسین کو اشارہ کر دیا۔ وہ بجلی کے کوندے کے مانند لپکا اور پلک جھپکتے میں اس نے اپنی مہارت کا استعمال کرتے ہوئے نادر خاں اور شکیلہ کے ایک ایک ہاتھ میں ہتھنی زیور پہنا دیا۔ میری ہدایت کے عین مطابق، اس نے دونوں کا دایاں ہاتھ آزاد رہنے دیا تھا۔ ہتھکڑی والی زنجیر کو وہ یوں تھامے کھڑا تھا جیسے ان کی طنابیں کھینچ رکھی ہوں!

اس منظر نے فردوس اور خاور کو مبہوت کر دیا لہٰذا ان کی ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لیے میں انہیں ایک دوسرے کمرے میں لے گیا پھر انہیں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے آگاہ کر دیا اور کہا ''قادر خاں اور جبران کی تدفین میں تاخیر ہونا مناسب نہیں لہٰذا تم ان کی لاشوں کو لے کر فوراً فرید ٹاؤن روانہ ہو جاؤ۔''

خاور محمود سمجھ داری سے اثبات میں گردن ہلانے لگا۔

فردوس نے شکایتی انداز میں کہا ''شکیلہ کو تو آپ نے بالکل ٹھیک پکڑا ہے تھانے دار صاحب لیکن میرا خیال ہے، نادر کے سلسلے میں آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے!''

''غلط فہمی اور درست فہمی کا فیصلہ تفتیش کے دوران میں بخوبی ہو جائے گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''تم بے فکر ہو جاؤ فردوس! کسی کے ساتھ ناحق یا زیادتی نہیں ہوگی۔''

انہیں رخصت کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ شکیلہ اور نادر خاں گویا گرم توے پر بیٹھے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ برس پڑے اور مجھے اپنی اپنی دھن میں الٹی سیدھی سنانے لگے۔ میں نے ان کی واہی تباہی کا ذرا بھی برا نہیں منایا اور کانسٹیبل کو آسٹھم نمبر ایک حاضر کرنے کا حکم دے دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ ایک ٹرے میں، نمکین لسی سے بھرے ہوئے دو کنگ سائز جگ اور دو پیتل کے بڑے گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اسے اشارہ کیا تو اس نے نادر خاں اور شکیلہ کے سامنے ایک ایک جگ اور ایک ایک گلاس رکھ دیا پھر کمرے سے رخصت ہو گیا۔

شکیلہ نے بھڑکیلے لہجے میں پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

''گرمی دور کرنے کا مجرب نسخہ ہے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا ''میں محسوس کر رہا ہوں، آپ دونوں بڑے اشتعال اور جلال میں ہو۔ ذرا تمہارا مزاج ٹھنڈا ہو جائے پھر کام کی بات کرتے ہیں۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''تم دونوں میں سے جو بھی پہلے لسی کا جگ ختم کرے گا، میں اس کو جانے دوں گا۔ دوسرے کو الٹا لٹکا دوں گا!''

''آپ ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے!'' نادر خاں نے چراغ پا ہوتے ہوئے کہا۔

''برخوردار!'' میں نے تیکھے لہجے میں اسے مخاطب کیا ''بے وقوف تو کل سے تم مجھے بناتے آئے ہو۔ میں تو قانونی کارروائی کر رہا ہوں۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے کانسٹیبل کو اشارہ کر دیا کہ وہ ان کے گلاس بھر دے۔

میں نے کچھ اس قسم کا سیٹ اپ بنا دیا تھا کہ میرا حکم ماننے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ سردی کا موسم تھا اور ٹھنڈی لسی پینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نمکین لسی تو ویسے بھی بڑی پیشاب آور ہوتی ہے پھر کڑاکے کی سردی میں اس نے کچھ زیادہ ہی سرعت سے کام دکھایا۔ شکیلہ نے بمشکل دوسرا اور نادر خاں نے بہ سہولت تیسرا کنگ سائز گلاس ختم کیا ہی تھا کہ معدے کا بوجھ مثانے پر منتقل ہو گیا۔ وہ شدید پیشاب کی حاجت محسوس کرنے لگے۔ میں نے انہیں لسی ''پلانے'' کا کام کوئی پچیس تیس منٹ میں کیا تھا لہٰذا انہیں یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ فوری طور پر باتھ روم نہ گئے تو ان کے مثانے پھٹ جائیں گے۔

اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے میں انہیں اپنے ساتھ لے کر ''ٹرائل روم'' میں آ گیا۔ وہاں موجود ''آلات تفتیش'' کو دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہہ کر آسٹھم نمبر دو بھی وہیں منگوا لیا پھر باری باری ان دونوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکی سے کہا۔

''اب میں تم دونوں کو چھت سے الٹا لٹکواؤں گا۔ تم اس پنجرے میں دو خوف ناک چوہے دیکھ رہے ہو نا؟'' میں نے مذکورہ پنجرے کی سمت اشارہ کیا اور مزید کہا ''ان میں سے ایک ایک چوہا تمہارے پائنچوں میں ڈال کر ڈوری کی مدد سے پائنچوں کو باندھ دیا جائے گا۔ یہ چوہے تمہاری ٹانگوں کے ساتھ جو اٹکھیلیاں کریں گے، تم ان کا تصور کر سکتے ہو لیکن اگر تم لوگ سچ بولنے کا وعدہ کرو تو میں.....''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی شکیلہ ہیجانی انداز میں چیخ اٹھی ''نہیں نہیں.....!'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو چھپاتے ہوئے بولی ''میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتی..... خدا کے لیے مجھے ہاتھ روم جانے دیں۔ میں..... اقرار کرتی ہوں کہ میں نے قادر خاں کو..... زہر دے کر مارا ہے.....''

بات ادھوری چھوڑ کر وہ باقاعدہ رونے لگی پھر روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ فوراً اسے باتھ روم کا راستہ دکھا دے پھر میں نادر خاں کی طرف متوجہ ہو گیا اور خوں خوار لہجے میں دریافت کیا۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے رستم خاں کے لگتے لگاتے۔ چوہے والے تجربے سے گزرنا ہے یا پھر.....؟''

میری سفاکی اور بے رحمی کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں کسی بھی صورت اس کی جان نہیں چھوڑوں گا لہٰذا اسے بھی اقبالِ جرم کرتے ہی بنی۔ خوف زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''خواب گاہ میں آگ میں نے لگائی تھی۔ باتھ روم کے باہر ابا جی کی سلیپر کو دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ وہ اس وقت کمرے میں نہیں ہیں۔ میں کافی دنوں سے شکیلہ اور اس کے بیٹے کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ یہ ایک اچھا موقع تھا۔ میں نے ان ماں بیٹے کو، مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ.....!''

شکیلہ نے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ قادر خاں اس کے کردار پر شک کرنے لگا تھا اور اس کا خیال تھا کہ نادر خاں سے اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ اس نے شوہر کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن قادر کے دل میں شک کا جو پودا سر اٹھا چکا تھا وہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں ناکامیاب ہو گئی پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ قادر، جبران کو بھی اپنی اولاد نہیں سمجھتا تو اس کے دل میں ایک خنجر سا پیوست ہو گیا۔ شکیلہ سے زیادہ یہ بات اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ جبران صرف اور صرف قادر ہی کا خون تھا اور قادر کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اس نے ایک لمحے کے لیے

بیرونِ ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ

ماہنامہ سرگزشت اور ماہنامہ دلکش

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائر میل

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ڈاک خرچ میں 100% اضافے کی وجہ سے غیر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح مندرجہ ذیل ہو گی

ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے فی ڈائجسٹ

سالانہ ڈاک خرچ تقریباً -/3080 روپے

12 شماروں کی قیمت -/420 روپے

زرِ سالانہ -/3500 روپے

امریکا، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لئے فی ڈائجسٹ

سالانہ ڈاک خرچ تقریباً -/4080 روپے

12 شماروں کی قیمت -/420 روپے

زرِ سالانہ -/4500 روپے

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، ذیل میں درج پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابلِ ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرونِ شہر / ملک ادائیگی کے لئے بینک کمیشن کے دس ڈالر کے مساوی رقم کا اضافہ کر لیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
KARACHI 75500
PHONES: (92) (21) 5802552,
5804200 FAX: 5802551,
E-MAIL: jdpgroup@hotmail.com

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی بے وفائی کا تصور نہیں کیا تھا۔ بہرحال، وہ نادر کی اوچھی حرکتوں سے بیزار ضرور تھی۔ اس نے جس شخص کی خاطر کوٹھے کی زندگی ترک کر کے عزت کی راہ پر چلنا شروع کیا تھا جب وہ ہی اسے، اس کی نظر میں گرا رہا تھا تو شکیلہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ قادر کہیں اسے اپنی زندگی ہی سے نہ نکال دے۔ اس کے بعد اس کا اور اس کے بیٹے کا کیا مستقبل ہوتا؟ یا تو وہ دوبارہ کوٹھے کی زینت بن جاتی اور یا پھر فٹ پاتھ پر بیٹھی بھیک مانگ رہی ہوتی۔ اسے یہ دونوں راہیں منظور نہیں تھیں لہٰذا اس نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق یہ فیصلہ کیا کہ قادر خاں ہی کا قصہ پاک کر دیا جائے۔ لیکن تقدیر نے اس کی تدبیر کا بڑے بھیانک انداز میں مذاق اڑایا تھا۔ اس نے سوچا تھا، قادر خاں کی موت کے بعد اس کی وارث ہونے کے ناتے سب کچھ اسے مل جائے گا اور اسے در در کی ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں گی لیکن اب بدقسمتی سے اس کی باقی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرنے والی تھی۔

نادر خاں کا اقراری بیان بھی حرص و ہوس کا آئینہ دار تھا۔ اس نے پہلے پہل اپنی سوتیلی ماں پر ''ٹرائی'' مارنے کی کوشش کی تھی لیکن جب اسے ثابت قدم پایا تو وہ محتاط ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد، باپ کی شکیلہ میں تیزی سے بڑھتی ہوئی دلچسپی سے اسے خطرہ محسوس ہوا کہ قادر خاں کہیں سب کچھ شکیلہ کے نام کر کے اسے گھر سے بے دخل نہ کر دے۔ اسی روز سے اس نے شکیلہ اور جبران کو راہ سے ہٹانے کے منصوبے بنانا شروع کر دیے تھے۔ وقوعہ کی رات اسے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کا موقع مل گیا۔ وہ یہی سمجھا کہ قادر خاں باتھ روم میں ہے۔ اس نے باتھ روم کو باہر سے کنڈی لگائی، مٹی کے تیل سے بھرے ہوئے گھی والے ایک سیر کے ڈبے کو اٹھایا اور سیدھا بالائی منزل والی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ وہ باتھ روم کے باہر قادر خاں کی سوٹی دیکھ آیا تھا اور یہاں پلنگ کے نیچے اسے شکیلہ کی سلیپر رکھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے یہی سمجھا کہ لحاف کے نیچے شکیلہ اور اس کا بیٹا جبران سو رہے ہیں۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ اس نے آناً فاناً میں لحاف کے اوپر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی پھر وہ تیزی سے زیریں منزل پر آ گیا۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کو محض اس لیے کنڈی لگائی تھی کہ قادر خاں اسے یہ کارروائی کرتے ہوئے دیکھ نہ سکے۔ نیچے آنے کے بعد، وہ عقبی طرف سے اپنے کمرے میں پہنچا پھر یہی ظاہر کرنے لگا جیسے وہ پانچ چھ گھنٹے سے گہری نیند سو رہا ہے۔ اسے کیا پتا تھا، وہ جس عورت کو اپنی دانست میں زندہ جلا آیا ہے، چند لمحات کے بعد وہ بالائی منزل سے ''آگ..... آگ'' پکارنے لگے گی۔

شکیلہ کا یہ کہنا بالکل درست تھا کہ کسی بدبخت نے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی تھی لیکن ولایت بی بی کو کنڈی کھلی ہوئی ملی تھی۔ ممکن ہے، جس دوران میں شکیلہ دھکیل کر دروازے کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی، جھٹکے سے کنڈی خود ہی کھل گئی ہو اور..... یہ بھی ہو سکتا تھا، ولایت نے اپنی مالکن کی ڈانٹ پھٹکار سے بچنے کے لیے خود ہی کنڈی کھول دی ہو اور اس پر ظاہر یہی کیا ہو کہ کنڈی تو پہلے سے کھلی ہوئی ہے۔ بعض افلاطون قسم کے گھریلو ملازم اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں.....! میں نے ولایت سے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ میرے خیال میں اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

لاکٹ والا معما ابھی تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ شکیلہ اور نادر خاں اقبال جرم کے بعد بھی اپنے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے لہٰذا میں نے کنڈی والے معاملے کی طرح اس پر بھی مٹی ڈال دی۔

میں کافی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ شکیلہ اور نادر خاں میں سے زیادہ سفاک اور سنگ دل کون تھا؟ پھر میرے ذہن اور دل نے نادر خاں کے ''حق'' میں فیصلہ سنا دیا۔ شکیلہ نے تو ''تنگ آمد، بہ جنگ آمد'' کے مصداق اپنے اور اپنے لختِ جگر کے مستقبل کو تاریک ہوتے دیکھ کر ایک سنگین قدم اٹھا ڈالا تھا۔ جب کسی عورت کے سامنے شوہر اور اولاد کی محبت شانہ بشانہ آ کر کھڑی ہو جائے اور تقاضا کرے کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو تو ''بیوی'' کو ''ماں'' کے سامنے اور..... ''باپ'' کو ''اولاد'' کے سامنے ہتھیار پھینکنا پڑتے ہیں۔ ماں کی محبت کا پلا ہمیشہ اولاد ہی کی جانب جھکتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے شوہر سے ٹکرا جاتی ہے..... اور پھر اگر شوہر قادر خاں جیسا کم ظرف اور شکی مزاج ہو تو اس نوعیت کا سنگین فیصلہ کرتے ہوئے عورت کو ایک لمحہ نہیں لگتا!

میں شکیلہ کے فعل کی حمایت نہیں کر رہا، بلکہ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ''حقیقت'' چونکہ سچ پر مبنی ہوتی ہے اس لیے کانوں کو تلخ محسوس ہوتی ہے، سماعت میں زہر گھولتی ہے۔

سچ کہتے ہیں، شک ایک لاعلاج مرض ہے۔ اس کا توڑ یا تریاق حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ قادر خاں کے ذہن میں، جڑ پکڑنے والے شک کے پودے نے ایک ہنستے بستے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نامعقول

ملک صفدر حیات

انسان ہے اور جرم بھی ہے ..... چھوٹا جرم یا بڑا جرم اس کا انحصار مجرم کے حالات اور سوچ پر ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹے جرم کو بھی بڑا سمجھتا ہے اور کوئی قتل جیسے بھیانک اور سفاک جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے لمحہ بھر کو بھی نہیں کپکپاتا۔ ایسے ہی جرم صفت انسانوں میں سے چند کی کہانی ملک صاحب کی زبانی۔

زر، زن اور زمین کے لیے بپا مناقشوں میں سے ایک مناقشہ کی سچی کہانی

زندگی دُکھ اور سکھ سے عبارت ہے!

درخت کڑی دھوپ میں جلتا ہے تو اس کے وجود سے سایہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر سکون کی سانس لینے والوں کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہیں یہ آرام پہنچانے کے لیے وہ درخت خود کو کتنے بڑے عذاب سے گزار رہا ہوگا۔ یہ طے ہے کہ تکلیف اٹھائے بغیر راحت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الگ بات کہ بعض معاملات میں کسی کو آرام و سکون فراہم کرنے کی خاطر کوئی دوسرا مشکلات سے دوچار ہو جائے۔

کہانی کی فضا سے آپ کو متعارف کرانے کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ موسمِ سرما کی ایک اُداس اور خنک صبح تھی۔ فروری کا مہینا شروع ہو چکا تھا لیکن سردی گویا کسی ضدی کمبل کے مانند ماحول سے لپٹ کر رہ گئی تھی۔ دُھند کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ صبح و شام کی کیفیت کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا یہ سال اسی ٹھنڈے ٹھار موسم کی نذر ہو جائے گا۔ اس روز جب میں تھانے پہنچا تو بیرونی ماحول نے تھانے کی اندرونی فضا کو بھی منجمد کر رکھا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ حوالدار خوش بخت میرے کمرے میں آ گیا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' اس نے بڑی کراری آواز میں مجھے سلام کیا اور پوچھنے لگا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو انگیٹھی لا کر یہاں رکھ دوں؟''

میں نے سر سے پاؤں تک بغور اس کا جائزہ لیا اور اس کے سلام کا جواب دے کر استفسار کیا۔ ''خوش بخت! تمہاری عمر کتنی ہوگی؟''

یہ اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ دراصل میں نے اس کی عمر کے بارے میں اس لیے پوچھا تھا کہ اس یخ بستہ موسم میں اسے گرم کپڑوں کے کسی خاص اہتمام کے بغیر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی کراری اور ہشاش بشاش آواز نے بھی مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شدید سردی کے باعث تو منہ سے خارج ہونے والے الفاظ بھی جمے جا رہے تھے اور وہ تھا کہ جیسے اس پر کسی شے کا اثر ہی نہ ہو۔

اس نے اُلجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھا اور بتایا۔ ''ملک صاحب! آپ کی دُعاؤں سے آنے والے کاتک میں پورے پینتالیس سال کا ہو جاؤں گا۔'' پھر وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میری عمر کے بارے میں کیوں پوچھا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''خوش بخت! تم عمر میں مجھ سے کوئی چھ سات سال بڑے ہی ہو گے لیکن مجھے تو تم دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی پیش کر رہے ہو اور خود کسی کہرو کی طرح اس سخت سرد موسم کے لیے ایک چیلنج بنے دکھائی دیتے ہو۔ کیا تمہیں سردی نہیں لگتی؟''

''سردی کا موسم ہے تو وہ لگے گی بھی ضرور۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''بس جناب! اپنی اپنی برداشت کی بات ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم سردی کو برداشت کر رہے ہو؟''

وہ اپنے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو رستم خان کی مہربانی ہے جناب..... جس کی وجہ سے میرے اندر شدید سردی کو برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اگر میں بہت زیادہ گرم کپڑے پہن لوں تو سارے بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حدت سے میرا جسم پھٹ جائے گا۔ مجھے اپنے وجود میں سے ایک آگ سی پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''خوش بخت! تم نے اپنی جو کیفیت بیان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ہے وہ تو میڈیکل پرابلم ہے۔ بعض لوگوں کو موسم سرما میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے اور اس کا سبب کیلشیم اور بی کمپلیکس کی کمی بتایا جاتا ہے۔ بہرحال.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اس سے پوچھ لیا۔

''تم نے کسی رستم خان کی مہربانی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کیا سلسلہ ہے؟''

وہ یکلخت اُداس ہوگیا پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''رستم خان میرا جگری دوست تھا لیکن افسوس کہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔'' وہ لمحے بھر کو گمبھیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''رستم برٹش آرمی میں تھا اور حالات و واقعات کی مناسبت سے جگہ جگہ اس کی پوسٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ میں اپنی فرصت میں اکثر و بیشتر اس سے ملنے چلا جاتا تھا۔ وہ بہت جی دار، یار باش اور متواضع شخص تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ خود کو بھی پکا کر دوستوں کے سامنے سجا دے۔ جس بندے کو کھانے پینے کا شوق ہو، وہ بہت اچھا باورچی بھی ہوتا ہے۔ یہی حال رستم خان کا بھی تھا۔ وہ نہایت ہی لذیذ اور مزیدار کھانے بناتا تھا۔ ایک مرتبہ میں موسم سرما میں اس کے پاس گیا ہوا تھا کہ اس نے مجھے بھنا ہوا گوشت کھلایا۔ اس کے ہاتھ کا بھنا ہوا گوشت تو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ کھایا تھا لیکن اس بار ذائقہ بہت ہی مختلف پایا تو میں نے اس سے پوچھا، یار! آج تم نے کس جانور کو بھون ڈالا ہے؟ بچھیا کا تازہ گوشت ہے یار، اس نے جواب دیا۔ میں نے سوال کیا، بچھیا کا گوشت تو تم نے پہلے بھی کئی دفعہ بھون کر مجھے کھلایا ہے مگر آج ذائقہ بالکل مختلف ہے۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا اور استفسار کیا۔ ''کیا آج بہت بدذائقہ گوشت بنا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''نہیں پہلے سے زیادہ خوش ذائقہ ہے۔'' وہ بولا۔ ''صرف ''زیادہ'' خوش ذائقہ ہی نہیں بلکہ زیادہ طاقت والا بھی ہے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا، زیادہ طاقت والا کیا مطلب؟ اس نے بتایا کہ یہ گوشت خاص طور پر مچھ کی چربی سے تیار شدہ گھی میں پکایا گیا ہے۔ میں نے استعجابیہ انداز میں چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا، میرے ایک دوست نے پتا نہیں کہاں سے ایک سیر گھی کا یہ ڈبا مہیا کر کے مجھے دیا ہے۔ میں آدھا ختم کر چکا ہوں اور اپنے بدن میں اس کے بڑے اُمنگ افزا اثرات محسوس کر رہا ہوں۔ انشا اللہ! دیکھنا، تم بھی اس کی تعریف کرو گے.....''

حوالدار خوش بخت سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! وہ اٹھتی ہوئی جوانی کا زمانہ تھا۔ یہ ایک ایسی لاابالی اور بے پرواعمر ہوتی ہے کہ انسان ہر شے کو تسخیر کرنے کی دُھن میں رہتا ہے۔ وہ ہر چیلنج کو بچوں کا کھیل سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ وہ کائنات میں پائی جانے والی تمام تر طاقتوں اور توانائیوں کو اپنے وجود میں سمیٹ لینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ میں بھی اس بار شوق شوق میں کچھ زیادہ ہی دن رستم خان کے پاس ٹھہر گیا تھا۔''

آخری جملہ اس نے خاصے جھینپے ہوئے انداز میں ادا کیا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھ لیا۔ ''اور..... اُن کچھ زیادہ' دنوں میں رستم خان تمہیں مگر مچھ کے گھی میں بھنا ہوا گوشت کھلاتا رہا تھا..... ہیں نا؟''

''جی.....!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں مگر مچھ اور افریقی گورلے کی چربی کے اثرات کو زیر بحث لا کر کسی طولانی گفتگو کا دروا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا سرسری انداز میں حوالدار سے کہا۔

''خوش بخت! میں تمہاری طرح کے خطرناک اور حیرت انگیز تجربات کا شوقین رہا ہوں اور نہ ہی ایسی الف لیلوی باتوں پر یقین رکھتا ہوں۔ تم اپنے جسم میں چبھنے والی سوئیوں کا کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ یا نہ کراؤ، تمہاری مرضی ہے لیکن جلدی سے جا کر میرے لیے دہکتے ہوئے کوئلوں والی انگیٹھی اٹھا لاؤ تاکہ میں اپنے ماحول کے درجۂ حرارت کو بڑھا سکوں۔''

''او کے سر!'' اس نے فرماں برداری سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ اس نے دہکتے ہوئے کوئلوں والی گرما گرم انگیٹھی میری کرسی سے تھوڑے فاصلے پر رکھی اور اطلاع فراہم کرنے والے انداز میں بتایا۔

''ملک صاحب! ماسٹر جمیل آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''ماسٹر جمیل کون؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

حوالدار نے بتایا۔ ''ماسٹر جمیل اِدھر ہی سوہدرہ کلاں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتا ہے۔''

ان دنوں میں موضع سوہدرہ کلاں کے تھانے میں تعینات تھا۔ اس علاقے میں صرف ایک ہی پرائمری اسکول تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے تاہم لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکوں کی غالب تعداد وہاں پڑھنے آتی تھی۔ آج سے پہلے ماسٹر جمیل سے براہِ راست میرا واسطہ نہیں پڑا تھا لہٰذا میں اسے اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔

میں نے حوالدار سے پوچھ لیا۔ ''ماسٹر جمیل کو مجھ سے کیا کام ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کام میں نے پوچھا تھا۔'' خوش بخت نے بتایا۔
''لیکن وہ کہتا ہے کہ آپ ہی سے بات کرے گا۔''
''ٹھیک ہے، تم اسے میرے پاس بھیج دو۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔
حوالدار خوش بخت کمرے سے باہر چلا گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد ایک دُبلا پتلا دراز قامت شخص میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شلوار قمیص پر گرم جرسی پہن رکھی تھی اور..... ایک ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ وضع قطع اور انداز واطوار سے وہ معقول اور سمجھ دار شخص نظر آتا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے مجھے سلام کیا اور سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔
''میرا نام جمیل احمد ہے..... ماسٹر جمیل.....''
میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مہربان لہجے میں کہا۔ ''بیٹھ جائیں ماسٹر صاحب!''
وہ با آہستگی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے کے تھیلے کو اس نے کمرے کے فرش پر رکھ دیا۔
میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''جی ماسٹر صاحب! اتنی ٹھنڈی ٹھار صبح کو آپ مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔ سب خیریت تو ہے نا؟''
''میرا خیال ہے، خیریت نہیں ہے.....!'' اس نے مبہم سے انداز میں کہا اور نیچے رکھے ہوئے تھیلے کو اٹھا کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ خود دیکھ لیں جناب!''
میں نے اُلجھن زدہ انداز میں اس کے ہاتھ سے مذکورہ تھیلا لے لیا۔ میں نہیں جانتا تھا وہ اس تھیلے میں کیا ڈال کر مجھے دکھانے لایا تھا۔ میں چونکہ نہیں جانتا تھا لہٰذا تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے وہ تھیلا کھول لیا۔
اس تھیلے میں سے جو کچھ برآمد ہوا اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک عام سی استعمال شدہ درانتی تھی لیکن خاص بات یہ تھی کہ مجھے اس کے دندانے دار پھل پر جما ہوا خون نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی سیاہی مائل رنگت کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ خون تھا جو خشک ہو جانے کے بعد اپنا اصل رنگ و روپ کھو چکا تھا۔ میرے فوری اور محتاط اندازے کے مطابق اس خون کو جم کر خشک ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔
میں نے خون آلود درانتی کو اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر بہ غور اس کا جائزہ لیا پھر سوالیہ نظر سے ماسٹر جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! اس درانتی کی کیا کہانی ہے؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں جناب!'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''میں اسے آپ کے پاس اسی لیے لایا ہوں تاکہ آپ اس سے منسوب کہانی کا پتا چلا سکیں۔''
''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''یہ درانتی آپ کو کہاں سے ملی ہے؟''
وہ سادگی سے بولا۔ ''یہ میری نہیں بلکہ میری گھر والی کی دریافت ہے جناب!''
میں سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا تاکہ وہ اس خون آلود درانتی کے بارے میں مزید کچھ بتائے۔ جب وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھا۔
''آپ کی گھر والی نے اسے کہاں سے دریافت کیا ہے ماسٹر صاحب؟''
ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''پڑھولے میں سے!''
''پڑھولے میں سے؟'' میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کوٹر..... میری گھر

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے انکے لیے اپنے تجربے و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے نوجوان ایک ایک ہفتہ آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جو ہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی ہاتھ پیروں میں چستی توانائی ظاہر کرکے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جنکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والی پڑھولے میں سے گندم نکال رہی تھی کہ اس کا ہاتھ کسی ٹھوس اور تیز دھار شے سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی چیخ خارج ہوئی۔ اس وقت میری بڑی بیٹی اس کے قریب کھڑی تھی۔ کوثر نے چیخنے کے بعد پڑھولے کے موکھلے سے ہاتھ باہر نکالا تو اس کی تین اُنگلیوں میں سے خون رس رہا تھا۔ میری بیٹی خالدہ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور آ کر مجھے بتایا کہ امی کا ہاتھ زخمی ہوگیا ہے۔ میں یہ خبر سن کر فوراً اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا اور دیکھا کہ واقعی اس کی تین اُنگلیاں گھائل ہوچکی تھیں۔ میں نے کوثر سے پوچھا، یہ سب کیسے ہوا؟ اس نے پڑھولے کے موکھلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے اس حادثے کے بارے میں بتایا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ پڑھولے کے اندر گندم میں ایسی تیز دھار کون سی چیز ہوسکتی ہے جس سے ہاتھ زخمی ہوجائے۔''

ماسٹر جمیل نے سانس درست کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''میں نے سوچا، پڑھولے کو تو میں بعد میں چیک کروں گا، پہلے بیوی کے زخمی ہاتھ کا علاج کرلوں چنانچہ میں نے کوثر کے زخمی ہاتھ کو اچھی طرح صاف کرکے اس پر صاف کپڑے کی پٹی باندھ دی، اس کے بعد پڑھولے کی جانب متوجہ ہوگیا۔''

گاؤں دیہات میں اناج کا ذخیرہ کرنے کے لیے مٹی کے بڑے بڑے ''پڑھولے'' بنائے جاتے ہیں۔ پڑھولے کو آپ مٹی کا ایک بڑا سا ڈرم سمجھ لیں۔ پڑھولے عموماً گولائی میں تعمیر کیے جاتے ہیں جن کا قطر لگ بھگ ڈھائی تین فٹ رکھا جاتا ہے اور اُونچائی پانچ فٹ سے لے کر دس فٹ تک بھی ہوسکتی ہے۔ اس کے اندر اناج بھرنے کے لیے پڑھولے کی چھت میں ایک بڑا سا سوراخ موجود ہوتا ہے۔ جب پڑھولے کو اناج سے بھر دیا جاتا ہے تو اس سوراخ کو کسی شے سے ڈھک کر بند کردیتے ہیں۔ پڑھولے میں سے حسبِ ضرورت اناج نکالنے کے لیے اس کے زیریں حصے میں ایک موکھلا موجود ہوتا ہے جس کا قطر عموماً پانچ سے چھ انچ رکھا جاتا ہے۔ اس موکھلے میں سے اناج نکالنے کے بعد کپڑا ٹھونس کر اس کا منہ بند کردیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس موکھلے کے لیے باقاعدہ ڈھکن بھی بنا لیتے ہیں جیسا کہ آپ نے دودھ والے ڈرم کا ڈھکن دیکھا ہوگا..... اور بعض لوگ وہاں ایک پٹ کا چھوٹا سا دروازہ لگا لیتے ہیں۔

''میں پڑھولے کی جانب بڑھا تو میری گھر والی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔'' ماسٹر جمیل نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اس نے مجھے تاکید کی کہ میں بہت محتاط رہوں۔ بہرحال، میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس موکھلے کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور پھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میرا متلاشی ہاتھ اس درانتی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا جس کے خطرناک پھل نے میری بیوی کی تین اُنگلیاں زخمی کردی تھیں۔'' اس نے میرے ہاتھ میں موجود خون آلود درانتی کی طرف دیکھا، ایک خفیف سی جھرجھری لی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس درانتی کو آڑا ٹیڑھا کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے پڑھولے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے پڑھولے کے موکھلے کو ایک طرف سے تھوڑا توڑنا بھی پڑا تھا۔ درانتی باہر آئی تو اس کے پھل پر جمے ہوئے خون نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا اور یہی مجبوری مجھے صبح ہی صبح آپ کے پاس لے آئی ہے۔ اس خون آلود درانتی کی کیا کہانی ہے، یہ آپ پتا چلائیں گے تھانے دار صاحب۔''

ماسٹر جمیل اپنا بیان مکمل کرکے خاموش ہوا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میرا ذہن بار بار مجھے اشارہ دے رہا تھا کہ درانتی کے دندانے دار پھل پر جما ہوا وہ خون کسی انسان کا ہے اور..... یہ انتہائی تشویش ناک سوچ تھی۔ اس سوچ کا واضح مطلب یہی نکلتا تھا کہ اس درانتی کی مدد سے کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قتل کی کسی واردات کی اطلاع تھانے تک پہنچتی ہے۔ اس کے بعد پولیس قاتل کی تلاش میں نکلتی ہے۔ آلۂ قتل بھی قاتل سے پہلے ہاتھ لگ جاتا ہے اور کبھی قاتل کی گرفتاری کے بعد، اس کی نشاندہی پر آلۂ قتل برآمد کرلیا جاتا ہے۔ موجودہ معاملے میں..... اگر میرا ذہن بالکل درست اشارہ دے رہا تھا تو پھر صورتِ حال کچھ ایسی ہوجاتی تھی کہ آلۂ قتل سب سے پہلے مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس کی مدد سے مجھے قاتل اور مقتول تک رسائی حاصل کرنا تھی۔

چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد میں نے کریدنے والے انداز میں ماسٹر جمیل سے پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ کے گھر میں کل کتنے افراد رہائش پذیر ہیں؟''

''صرف میرے اپنے گھر کے لوگ ہیں جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''کل پانچ افراد..... میں، میری بیوی کوثر پروین اور ہمارے تین بچے۔'' پھر وہ اپنے بچوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ''چھ سالہ خالدہ، پانچ سالہ شبیر اور دو سالہ شفاعت۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ تینوں بچے اس قابل نہیں تھے کہ کسی خون آلود درانتی کو پڑھولے کے اندر پہنچا سکیں لہٰذا میں نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی نگاہ کو ماسٹر اور اس کی بیوی پر مرکوز کر دیا۔ چند لمحات تک اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''ماسٹر صاحب! کیا آپ یا آپ کی گھر والی اس خطرناک خون آلود درانتی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

اس نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''نہیں جناب! ہم نے آج پہلی مرتبہ اس منحوس کی شکل دیکھی ہے جس نے میری بیوی کی تین اُنگلیاں زخمی کر دی ہیں۔''

''ہوں!'' میں نے درانتی کو میز پر پڑے تھیلے کے اوپر رکھ دیا اور کہا۔ ''ماسٹر صاحب! اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجایش نہیں کہ یہ درانتی آج صبح آپ کے گھر میں موجود گندم والے پڑھولے میں سے برآمد ہوئی ہے۔ وہ پڑھولا چونکہ آپ کے گھر میں ہے لہٰذا درانتی کے بارے میں، میں آپ سے استفسار کر رہا ہوں۔ آپ اس درانتی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خون آلود درانتی گندم والے پڑھولے کے اندر کیسے پہنچ گئی؟''

''یہی بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھانے دار صاحب!'' وہ قدرے اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کو یقیناً معلوم ہوگا، میں موضع سوہدرہ کلاں کے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں جماعت چہارم کو پڑھاتا ہوں۔ یہی ماسٹری میرا رزق روزگار ہے۔ زراعت اور کھیتی باڑی سے کبھی میرا تعلق نہیں رہا اس لیے درانتی یا ایسے ہی کسی اور زرعی آلے کا میرے گھر میں پایا جانا ناممکنات میں سے ہے۔ پتا نہیں، یہ کم بخت کیسے گندم والے پڑھولے میں پہنچ گئی۔''

اس کی وضاحت میں بڑی معقولیت پائی جاتی تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی باتوں پر غور کرنے پر پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کسی اور شخص نے خون آلود درانتی کو گندم والے پڑھولے میں چھپا دیا ہو اور وہ رفتہ رفتہ گندم کے ساتھ سرکتے ہوئے نیچے موکھلے تک پہنچ گئی ہو؟''

''ایسا نہیں ہوسکتا جناب!'' وہ بڑی شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

میں نے اس قطعیت پر حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں، بس ہم پانچوں ہی یہاں رہ رہے ہیں۔ ایسا کوئی بھی اس دوران میں ہمارے گھر میں نہیں آیا جس پر اس قسم کا شک کیا جا سکتا ہو۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ درانتی پہلے ہی سے گندم والے پڑھولے میں موجود تھی۔''

''پہلے!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پہلے کب سے؟''

''میرا مطلب ہے..... ہمارے اس گھر میں آنے سے پہلے۔''

ماسٹر جمیل کا بیان کسی سنسنی خیز انکشاف سے کم نہیں تھا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا اور تیز لہجے میں پوچھا۔

''ماسٹر صاحب! آپ کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس گھر میں آنے سے قبل آپ کہیں اور رہتے تھے؟''

''جی، تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے ہم لوگ چک نمبر بیالیس۔ ج ب میں رہتے تھے۔ ''چک بیالیس۔ ج ب'' موضع سوہدرہ کلاں سے لگ بھگ پانچ میل دور ہے۔ میں روزانہ سائیکل پر اسکول آتا جاتا تھا۔ اس آمدورفت میں اچھا خاصا وقت ضایع ہو جاتا تھا۔ پھر مجھے پتا چلا کہ سوہدرہ کلاں میں ایک گھر فروخت ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی گھر والی سے مشورہ کیا۔ وہ میری ہمنوا ثابت ہوئی لہٰذا اپنی آسانی اور سہولت کے لیے میں نے سوہدرہ کلاں میں گھر لے لیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''آپ کو اس گھر میں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ''کم و بیش دو ماہ ہوئے ہیں جناب!''

اس کے جواب نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونکا دیا۔ درانتی کے دندانے دار پھل پر جمے سیاہی مائل خون کو دیکھ کر میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ اس درانتی کو خون آلود ہوئے دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور اب ماسٹر جمیل بتا رہا تھا کہ دو ماہ پہلے اس گھر میں کوئی اور رہایش پذیر تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے اس سے سوال کیا۔

''ماسٹر صاحب! آپ نے یہ گھر کس سے خریدا ہے؟''

''عنایت حسین سے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے آپ سے پہلے اس گھر میں عنایت حسین رہتا تھا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! کیا ان دو ماہ میں آپ نے گندم والے پڑھولے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں خود کوئی گندم ڈالی تھی؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''اس گھر میں دو پڑھولے ہیں۔ ایک میں چاول اور دوسرے میں گندم کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ عنایت حسین نے یہ گھر میرے ہاتھ فروخت کرتے ہوئے بتایا تھا کہ دونوں پڑھولے اناج سے بھرے ہوئے ہیں لہٰذا ہمیں کئی ماہ تک ان کو دوبارہ بھرنا نہیں پڑے گا۔ اس نے مہربانی کرتے ہوئے پڑھولوں میں موجود اناج کی مجھ سے قیمت بھی نہیں لی تھی۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو وہ کہنے لگا۔ دانہ پانی تو نصیب سے ہوتا ہے ماسٹر جی! یہاں کے دانے پانی نے آپ کو اس گھر تک پہنچایا ہے۔ میں آپ سے اس اناج کی قیمت وصول نہیں کروں گا۔''

بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ''لگتا ہے، عنایت حسین کی ساری مہربانی گندم والے پڑھولے میں بند تھی جو موکھلے میں سے درانتی کی شکل میں آپ نے باہر کھینچ نکالی ہے؟''

ماسٹر جمیل تشویش بھری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! کیا آپ بھی اسی انداز میں سوچ رہے ہیں جیسے خیالات میرے ذہن میں آ رہے ہیں؟''

''آپ کیا سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب؟''

''میرا خیال ہے یہ خون آلود درانتی کسی واردات میں استعمال ہوئی ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے اندازے کے مطابق وہ واردات بڑی سنگین ہوگی..... کوئی قتل ایسی واردات!''

ماسٹر جمیل متفکر لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، عنایت حسین اس خون آلود درانتی کے بارے میں ضرور جانتا ہوگا۔''

''ہوں!'' میں نے گمبھیر انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور ماسٹر جمیل سے پوچھا۔ ''کیا عنایت حسین کی رہائش بھی اِدھر سوہدرہ کلاں ہی میں ہے؟''

''نہیں جناب! وہ تو یہ گھر مجھے فروخت کر کے کہیں چلا گیا ہے۔'' جمیل احمد نے جواب دیا۔

اس جواب سے سنسنی خیزی جھلکتی تھی۔ میں نے فوراً پوچھا۔ ''وہ کہاں گیا ہے؟''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں جناب!''

''کمال ہے۔'' میں نے اُلجھن بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ نے اس سے اتنا بھی نہیں پوچھا کہ وہ سوہدرہ کلاں کو چھوڑ کر کہاں جا رہا ہے؟''

''مجھے کیا پتا تھا جناب کہ بعد میں کوئی ایسی صورتِ حال پیش آ جائے گی۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ ''میں اصل میں اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔ وہ گھر بیچنا چاہ رہا تھا اور مجھے گھر کی ضرورت تھی۔ ہمارے درمیان رقم کا معاملہ طے ہوا۔ میں نے ادائی کر دی اور اس نے اپنا گھر میرے حوالے کر دیا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!''

''ٹھیک ہے، میں بہت جلد پتا چلا لوں گا کہ عنایت حسین موضع سوہدرہ کلاں کو خیر باد کہہ کر کدھر گیا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو میں آپ کے گھر کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''بڑے شوق سے جناب!'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''یہ میری خوش قسمتی ہوگی کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر جمیل احمد آف جماعت چہارم کے ہمراہ جائے وقوعہ کے معائنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ کانسٹیبل اللہ بخش بھی ہمارے ساتھ تھا۔

☆☆☆

ماسٹر جمیل کا گھر گاؤں کے جنوب مشرقی کنارے پر واقع تھا۔ گاؤں کے اس حصے کی لوکیشن بڑی فطری، جاذبِ نظر اور پُرکشش تھی۔ گاؤں کے اختتام پر سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ انہی کھیتوں کے درمیان سے ایک نہر گزرتی تھی جس کا بہاؤ شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت تھا۔ اس نہر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر شرقاً غرباً ریلوے لائن تھی جس پر اکا دُکا پسنجر ٹرینیں گزرتی تھیں یا پھر مال گاڑیوں کی آمد و رفت دیکھنے کو ملتی تھی۔ ریلوے لائن سے آگے بھی تاحدِ نگاہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا فرحت بخش سلسلہ نظر آتا تھا۔ ہم مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے مذکورہ مکان تک پہنچ گئے۔

وہ درمیانے سائز کا ایک کچا مکان تھا۔ جمیل احمد نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور ''ابھی آتا ہوں'' کا کہہ کر گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا۔ بیٹھک کے طور پر استعمال ہونے والا وہ کمرا پیمایش میں بارہ ضرب پندرہ فٹ رہا ہوگا۔ میں سرسری نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کانسٹیبل نے کہا۔ ''سر جی! لگتا ہے، ماسٹر صاحب ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کرنے اندر گئے ہیں۔''

کانسٹیبل کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا لیکن میں نے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔''

''اِدھر میری بات ختم ہوئی اُدھر ماسٹر جمیل بیٹھک میں داخل ہوا اور اس نے کانسٹیبل کے ارمانوں پر برف سی چھڑک دی۔ خاطر تواضع کا ذکر کرتے ہوئے جیسے اللہ بخش کی باچھیں سی کھل گئی تھیں۔ وہ کھانے پینے کا شوقین ہونے سے کچھ بڑھ کر تھا۔ ایسے شخص کے لیے ''کھانے پینے کا لوبھی'' ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

ماسٹر جمیل احمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں نے پردہ کرادیا ہے۔ آپ اندر آکر اس کمرے کا معائنہ کرسکتے ہیں جہاں اناج والے پڑھولے رکھے ہوئے ہیں۔''

اللہ بخش نے بے ساختہ ایک تھکی ہوئی گہری سانس خارج کی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اللہ بخش! تم اِدھر ہی بیٹھو۔ میں اندر سے ہوکر آتا ہوں۔''

اس کے بعد میں ماسٹر جمیل کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ وہ مجھے ایک کشادہ صحن سے گزارنے کے بعد اس کمرے میں لے گیا جہاں اناج والے پڑھولے رکھے تھے۔ ماسٹر کے گھر میں آگے پیچھے چار کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے اور ان کے پہلو میں کشادہ صحن تھا۔ اس قطار کا پہلا کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ اس کے بعد دو رہائشی کمرے تھے اور سب سے آخر میں پڑھولوں والا کمرا۔ ایک طرح سے اس کمرے کو اسٹور روم کہا جاسکتا تھا۔ وہاں پر متروک اور مستعمل دونوں قسم کی اشیا موجود تھیں۔ میں پڑھولوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس کمرے میں موجود پڑھولوں کی تعداد دو تھی جو پہلو بہ پہلو کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ استادہ تھے۔ ان دونوں کی جسامت اور قدبت ایک جیسا تھا۔ اُونچائی آٹھ فٹ کے قریب رہی ہوگی اور گولائی کا اندازہ میں نے ڈھائی فٹ کے آس پاس قائم کیا۔ ماسٹر جمیل نے ایک پڑھولے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔

''تھانے دار صاحب! گندم والا پڑھولا یہی ہے۔ درانتی اسی پڑھولے میں سے نکلی ہے۔''

میں نے مذکورہ پڑھولے کی طرف بڑھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ کمرا اگرچہ گھر کے آخری سرے پر واقع تھا لیکن بیرونی سمت کھلنے والے ایک روشن دان سے اتنی روشنی اندر پہنچ رہی تھی کہ وہاں پر موجود ہر شے کو باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔

میں نے گندم والے پڑھولے کے موکھلے کا جائزہ لیا۔ موکھلے کا ایک حصہ مجروح تھا۔ اس کے بارے میں مجھے ماسٹر جمیل نے تھانے ہی میں بتادیا تھا۔ خون آلود درانتی کو کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے اسے موکھلے کے ایک کنارے کو تھوڑا توڑنا پڑا تھا۔ میں موکھلے کے تفتیشی جائزے کے بعد اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ماسٹر جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ماسٹر صاحب! میں اس پڑھولے کے اوپر والے حصے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اوپر والے حصے سے میری مراد پڑھولے کی چھت تھی جہاں سے پڑھولے کے اندر اناج بھرا جاتا ہے۔ ماسٹر جمیل نے کہا۔ ''ٹھہریں جناب! میں چوکی لے کر آتا ہوں۔''

پڑھولے کی اونچائی آٹھ فٹ کے قریب تھی لہٰذا کسی چیز پر چڑھے بغیر اس کی چھت کا معائنہ ممکن نہیں تھا۔ دو منٹ کے بعد ماسٹر جمیل ایک چوبی چوکی لے کر واپس آگیا۔ مذکورہ چوکی کی اُونچائی لگ بھگ دو فٹ تھی۔ میں نے چوکی کو پڑھولے کے ساتھ لگادیا پھر اس پر کھڑے ہوکر پڑھولے کی چھت کا جائزہ لینے لگا۔

میرا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ دو فٹ چوکی کی اُونچائی اس میں شامل ہوئی تو میرا دائرۂ کار آٹھ فٹ تک پہنچ گیا۔ میں نے پڑھولے کے اوپری حصے کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہاں مجھے کوئی بھی قابلِ گرفت شے نظر نہ آئی۔ اس سے اگلا مرحلہ پڑھولے کے اندر جھانکنے کا تھا مگر اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تھوڑا اور بلند ہونا ضروری تھا۔

میں نے چوکی پر کھڑے کھڑے ماسٹر جمیل سے پوچھا۔

''کوئی اور چوکی مل جائے گی؟''

''ایک چھوٹی چوکی ہے گھر میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ ایک فٹ سے زیادہ اُونچی نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، تم وہ چوکی لے آؤ۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اس سے کام چل جائے گا۔''

اگر میں زمین سے مزید ایک فٹ بھی بلند ہوجاتا تو ڈھکنا اٹھا کر پڑھولے کے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماسٹر جمیل مذکورہ چوکی لے کر میرے پاس آگیا۔

ایک فٹی یہ چوکی پہلے والی چوکی سے رقبے اور پھیلاؤ میں کم و بیش آدھی تھی۔ میں نے بہ سہولت اسے دو فٹی چوکی پر جمایا اور احتیاط سے اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں گندم والے پڑھولے کے اندر جھانک کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

اپنی تفتیشی کوشش سے مطمئن ہونے کے بعد میں نیچے اتر آیا اور ماسٹر جمیل سے کہا۔ ''کیا تم لوگ آج کل فاقہ کشی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہے ہو؟''

''نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اللہ کے فضل سے ہم لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی رات ہم میں سے کوئی بھوکا سویا ہو۔''

''اچھا.....!'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''مگر ایسا نظر تو نہیں آ رہا۔''

وہ مزید اُلجھ گیا اور پوچھنے لگا۔ ''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں جناب؟''

''تم نے بتایا ہے کہ دو ماہ قبل جب تم لوگ آ کر اس گھر میں آباد ہوئے تو اناج والے یہ دونوں پڑھولے مکمل طور پر بھرے ہوئے تھے۔'' میں نے اس کی اُلجھن دور کرنے کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے گندم والے پڑھولے کے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ آدھے سے بھی زیادہ پڑھولا گندم سے بھرا ہوا ہے بلکہ یہ کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اس پڑھولے سے ابھی چند سیر گندم ہی نکالی گئی ہے۔''

اس وضاحت سے وہ میرے مقصد کی تہ میں اتر گیا اور جلدی سے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میری گھر والی اور تینوں بچے چاول بہت شوق سے کھاتے ہیں لہٰذا ہمارے گھر میں گندم کی بہ نسبت چاول کا استعمال زیادہ ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

میں ماسٹر جمیل کی ''اتنی سی بات'' سے مطمئن ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔ ''ماسٹر صاحب! میں نے گندم والے پڑھولے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے لیکن میں اپنی تسلی کی خاطر ایک کام کروانا چاہتا ہوں اور وہ کام.....''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور ماسٹر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کام آپ کریں گے..... اپنی گھر والی کی مدد سے۔''

''جی بتائیں..... کیا کام ہے؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ ''آج اسکول سے تو آپ کی چھٹی ہو ہی چکی ہے۔ یہ دن آپ اپنے گھر میں گزاریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی گھر والی کی مدد سے دونوں پڑھولوں کے اناج کو باہر نکال لیں اور باریک بینی سے اناج کا جائزہ لیں۔ ممکن ہے، اس اناج میں سے کوئی ایسی شے برآمد ہو جائے جو خون آلود رانتی کی تفتیش کے سلسلے میں معاون ثابت ہو۔'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن قانون کی مدد کرنا آپ پر بھی لازم ہے۔ اس تفتیشی کارروائی کے بعد آپ اناج کو اس کے مخصوص پڑھولے میں ڈال سکتے ہیں۔''

وہ فراخ دلی سے بولا۔ ''زحمت والی کوئی بات نہیں جناب! آپ بے فکر ہو جائیں، میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے یہ کام کر ڈالوں گا۔''

''شاباش! مجھے آپ سے یہی اُمید تھی ماسٹر صاحب!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اور اگر اس اناج میں سے کوئی قابلِ ذکر شے برآمد ہو جائے تو آپ اسے لے کر فوراً میرے پاس تھانے آ جائیں گے۔''

''ضرور جناب!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

''اور اس تعمیل کے دوران میں آپ ایک احتیاط کو پیشِ نظر رکھیں گے۔''

میرے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ باری باری دونوں اناج کا جائزہ لیں گے۔ ایک اناج کو پڑھولے میں سے نکالنے کے بعد اس کا معائنہ کریں گے اور مطمئن ہونے کے بعد اسے واپس پڑھولے میں بھر دیں گے۔ تب جا کر آپ دوسرے پڑھولے کے ساتھ کارروائی شروع کریں گے۔ اگر آپ نے میری ہدایات پر من و عن عمل نہ کیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

وہ استعجابیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیسی گڑبڑ جناب؟''

''اگر دونوں اناج ایک ہی وقت میں پڑھولوں سے باہر نکالے گئے تو اس بات کے امکانات بہت قوی ہیں کہ وہ آپس میں مل جائیں گے۔'' میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اس ''ملاپ'' سے گڑبڑ یہ ہوگی کہ تمہارے بچے اور گھر والی تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ گندم ملے چاول انہیں پسند نہیں آئیں گے اور ان کی خفگی آپ کے گھر کے امن و امان کے لیے ایک سنگین خطرہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''اوہ.....!'' اس نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''جناب! آپ بڑا شائستہ مذاق کرتے ہیں۔''

میں اس کی معیت میں پڑھولوں والے کمرے سے نکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر صحن میں آ گیا۔

ماسٹر جمیل کے گھر میں ہمارا داخلہ بیٹھک کے بیرونی دروازے سے ہوا تھا۔ اب مجھے گھر کے اندرونی حصے کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ گھر کا مرکزی داخلی دروازہ ایک چھت دار برآمدے میں کھلتا تھا۔ اس برآمدے میں بیٹھک کا ایک دروازہ بھی کھلتا تھا جو گھر کے اندرونی حصے سے بیٹھک میں آمد و شد کا وسیلہ تھا۔ مذکورہ برآمدے سے آگے کشادہ صحن تھا۔ اسی صحن میں بیٹھک سے متصل کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ بعد کے دو کمروں میں جانے کے لیے کمرا در کمرا آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ صحن کے اختتام پر باورچی خانہ اور غسل خانہ پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک تنگ سا راستہ مکان کی عقبی سمت کو نکلتا تھا۔ اس راستے نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور میں اسی طرف بڑھ گیا۔

ماسٹر جمیل کے ہمراہ میں مذکورہ راستے سے گزر کر مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں میں نے ایک تنور لگا دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دیوار کے قریب جانوروں کے چارے والی بڑی سی چوبی کنڈلی رکھی نظر آئی۔ کنڈلی کے نزدیک زمین میں تین چار بڑے کھونٹے بھی گڑے دکھائی دے رہے تھے مگر وہاں جانور نام کی کوئی شے وجود نہیں رکھتی تھی۔ ایک کونے میں خشک لکڑیاں اور اُپلے بھی رکھے تھے جو یقیناً چولہے اور تنور میں ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے ہوں گے۔ میرے چہرے پر اُبھرنے والی اُلجھن کو ماسٹر جمیل نے فوراً بھانپ لیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! یہ ساری جگہ بھی اس مکان ہی کا حصہ ہے۔'' پھر اس نے ایک دیوار کو تھپتھپاتے ہوئے بتایا۔ ''اس کے پیچھے پڑھولوں والا کمرا ہے جہاں تھوڑی دیر پہلے آپ موجود تھے۔ دراصل اس جگہ کو عنایت حسین مویشیوں کی دیکھ ریکھ کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ مجھے مویشی پالنے کا شوق ہے اور نہ انہیں سنبھالنے کا طریقہ آتا ہے لہٰذا یہ جگہ آپ کو خالی دکھائی دے رہی ہے۔ البتہ.....''

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک طویل سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ اس تنور کی ہمیں ضرورت تھی اس لیے یہ ہمارے استعمال میں ہے۔''

میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور ایک مرتبہ پھر مکان کے اس عقبی حصے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ وہاں پر مجھے کوئی بھی اہم یا قابلِ گرفت چیز نظر نہ آئی لیکن پتا نہیں کیوں اس جگہ کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن میں اپنے محسوسات کو کوئی نام نہ دے سکا چنانچہ سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔

میں ماسٹر جمیل کے ہمراہ واپس بیٹھک میں آ گیا۔ ہم بیٹھ چکے تو ماسٹر نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے کیا اندازہ قائم کیا ہے؟''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس بات میں تو کسی شک و شبہے کی گنجایش نہیں کہ خون آلود درانتی کسی واردات میں استعمال ہوئی ہے۔ اس کے دندانے دار پھل پر جما ہوا خون کسی واردات ہی کی نشانی ہے۔ پھر جس پُراسرار انداز میں مذکورہ درانتی کو گندم والے پڑھولے میں چھپایا گیا ہے اس سے بھی جرم کی بو آتی ہے۔ بس.....'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

''بس یہ معلوم کرنا باقی ہے کہ واردات کب اور کہاں پیش آئی؟ ان سوالات کے درست جوابات تو عنایت حسین ہی دے سکتا ہے لیکن عنایت حسین کہاں ملے گا.....؟'' میں نے ماسٹر جمیل کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''یہ آپ نہیں جانتے۔''

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ عنایت حسین یہاں سے کہاں منتقل ہوا ہے تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔''

''کوئی بات نہیں ماسٹر صاحب! آپ ذہن پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔'' میں نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ کو نہیں پتا تو میں پتا چلا لوں گا۔ اس کے آس پڑوس والوں کو ضرور کچھ خبر ہوگی۔ ویسے.....!''

میں نے سوچنے والے انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا اور ماسٹر جمیل کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے تکنے لگا۔ وہ میرے دیکھنے کے اس انداز سے اُلجھن آمیز بے چینی محسوس کرنے لگا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے میرا خیال ہے ماسٹر صاحب! کہ آپ کی گھر والی کو اس بارے میں کچھ سن گن ضرور ہوگی۔ عورتیں بہت جلد اپنا ڈاک خانہ ملا لیتی ہیں۔ ہوسکتا ہے اڑوس پڑوس والی عوتوں سے کچھ خبریں آپ کی بیوی تک بھی پہنچی ہوں۔ اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

وہ متانت سے بولا۔ ''میں آپ کے اندازے کی تردید نہیں کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے کوثر سے کبھی اس حوالے سے سوال نہیں کیا اور نہ ہی اس اللہ کی بندی نے ازخود مجھے کچھ بتایا ہے اور اس کی ایک وجہ بھی ہے.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، سانس درست کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پہلے کبھی ایسی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ درانتی کی برآمد کے بعد ہی عنایت حسین کے بارے میں مختلف سوالات اٹھے ہیں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، پہلے کبھی ایسے استفسارات کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن اب تو ایسا موقع اور ضرورت پیدا ہو چکی ہے۔ آپ ذرا اپنی گھر والی کو ٹٹول کر تو دیکھیں۔ ہوسکتا ہے کوئی مفید بات معلوم ہوجائے۔ ویسے یہاں سے اٹھنے کے بعد میں آپ کے پڑوسیوں سے بھی پوچھ گچھ تو کروں گا ہی۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی اپنی گھر والی سے پوچھ کر آتا ہوں۔''

اِدھر ماسٹر جمیل کا جملہ مکمل ہوا، اُدھر بیٹھک کے اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

ماسٹر جمیل نے چونک کر ہماری جانب دیکھا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مذکورہ دروازہ گھر کی اندرونی سمت یعنی چھتے ہوئے (چھت دار) برآمدے میں کھلتا تھا۔ اس وقت گھر میں ماسٹر جمیل کی بیوی اور تینوں بچے موجود تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ انہی چار افراد..... بلکہ تین افراد میں سے کوئی ایک ہوگا۔ ماسٹر جمیل کے سب سے چھوٹے بچے شفاعت کو میں نے اس لیے خارج از امکان رکھا تھا کہ مجھے اس کی عمر لگ بھگ دو سال بتائی گئی تھی اور..... دو سالہ بچہ اس انداز میں دستک دینے کے قابل نہیں ہوتا۔

ماسٹر نے بآہستگی دروازہ کھولا اور نیم وا دروازے کے سامنے آ گیا۔ میں دیکھ نہ سکا کہ ادھ کھلے دروازے کی دوسری طرف کون تھا۔ بہرحال، اگلے ہی لمحے وہ پلٹ آیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں مجھے ایک ٹرے نظر آئی جس میں چند برتن سجے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی کہ مذکورہ ٹرے میں ہماری خاطر داری کا سامان آیا تھا۔

ماسٹر جمیل نے مذکورہ ٹرے کو ایک چھوٹی میز پر سجا کر ہمارے سامنے رکھ دیا پھر شائستہ لہجے میں بولا۔ ''آپ لوگ شروع کریں۔ میں کوثر سے بات کرکے آتا ہوں۔''

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی ماسٹر صاحب!'' کانسٹیبل اللہ بخش نے سرسری انداز میں کہا۔

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ کانسٹیبل نے یہ بات محض رسمِ دنیا نبھانے کے لیے کھوکھلے انداز میں کہی تھی ورنہ اس کے ذہن میں تو کچھ اس قسم کے خیالات تھے..... ماسٹر صاحب! ایسے نیک کاموں میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔ آپ نے تو حد کردی۔

ماسٹر جمیل جیسے ہی بیٹھک سے باہر نکلا، اللہ بخش بے صبری سے ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ''ملک صاحب! بسم اللہ کریں۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اللہ بخش! کیا تمہارے ذہن میں یہ خدشہ ہے کہ اگر ہم نے اس ٹرے میں سجے ہوئے لوازماتِ خورد و نوش پر ہاتھ صاف کرنے میں دیر کردی تو ماسٹر جمیل یہ ٹرے اٹھا لے جائے گا؟''

وہ مجلل سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ بات نہیں ہے ملک صاحب!''

اس نے اس کے ساتھ ہی تیزی سے ٹرے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو روک کر گھٹنوں پر رکھ لیا تو میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ بات نہیں تو پھر کون سی بات ہے؟''

''وہ جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، میں نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ جب رزق سامنے کھانے کے لیے تیار رکھا ہو تو اس کو انتظار نہیں کروانا چاہیے.....!''

کانسٹیبل کی یہ بات انتہائی معقول اور برمحل تھی لہٰذا میں نے اس کے ندیدے پن کو نظر انداز کردیا۔ اس کے بعد ہم مذکورہ ٹرے کی جانب ''متوجہ'' ہوگئے۔

ماسٹر جمیل کی گھر والی خاصی سگھڑ اور سلیقہ شعار عورت معلوم ہوئی تھی۔ تھوڑی سی دیر میں اس نے ڈھیر ساری چیزیں تیار کرڈالی تھیں جن میں..... ایک پلیٹ میں اُبلے ہوئے گرما گرم انڈے کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ ایک ڈونگے میں گاجر کا حلوا تھا۔ ایک پلیٹ میں تلی ہوئی مچھلی کے دو بڑے قتلے موجود تھے۔ ساتھ ہی چائے سے بھری ہوئی چائے دانی اور نیم گرم دودھ والے دو گلاس۔ موسم کی مناسبت سے یہ بھرپور خاطر تواضع تھی۔ ہم انعامِ خداوندی سے پوری طرح انصاف کرنے لگے۔

ماسٹر جمیل کوئی دس منٹ کے بعد دوبارہ بیٹھک میں نمودار ہوا۔ میں نے فوراً محسوس کرلیا کہ اس نے دانستہ ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا تاکہ ہم اس کی غیر موجودگی میں کسی قسم کا تکلف نہ برتیں۔ اس کا یہ عمل عقل مندی پر دلالت کرتا تھا۔ کانسٹیبل اللہ بخش کے بارے میں تو میں وثوق سے کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا البتہ ماسٹر جمیل کے سامنے ممکن ہے،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک کپ چائے سے آگے نہ بڑھتا۔

ماسٹر جمیل بڑے اطمینان سے آ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ کے ''کام'' کو نمٹایا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا البتہ کاشمیل اللہ بخش بڑی بے پروائی سے اپنے کام میں ''جتا'' رہا۔

''کچھ پتا چلا ماسٹر صاحب؟'' میں نے ماسٹر جمیل سے استفسار کیا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔ ''میری گھر والی عنایت حسین کے بارے میں جو کچھ جانتی ہے، ممکن ہے وہ معلومات آپ کے کسی کام کی نہ ہوں۔''

''یہ فیصلہ میں باآسانی کرلوں گا کہ کون سی بات مفید ثابت ہوسکتی ہے اور کون سی بے کار۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس، آپ شروع ہو جائیں۔''

اور..... وہ شروع ہو گیا۔

ماسٹر جمیل کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس کی بیوی بھی زیادہ میل ملاقات رکھنے والی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کی عورتوں سے اسے عنایت حسین کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، اس کے مطابق..... اس گھر میں ماسٹر جمیل کی آمد سے قبل عنایت حسین اپنے بوڑھے باپ کرامت حسین کے ساتھ رہتا تھا۔ عنایت حسین شادی شدہ تھا لیکن بیوی کے ساتھ اس کی بنتی نہیں تھی۔ ان کے درمیان اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا اور اس کا سبب عنایت حسین کی بیوی ہی بتایا جاتا تھا۔ آس پڑوس کے مطابق شگفتہ ایک تیز طرّار اور لڑاکا عورت تھی۔ اس نے اپنے شوہر عنایت حسین کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ان میاں بیوی کے درمیان جب بھی جھگڑا ہوتا، شگفتہ روٹھ کر اپنے میکے چلی جاتی۔ چند روز اسی تناؤ میں گزر جاتے پھر عنایت حسین اپنی سسرال جاتا، شگفتہ کی منت خوشامد کرتا اور اسے منا کر واپس سوہدرہ کلاں لے آتا لیکن چند روز بعد ہی ان میں ایک مرتبہ پھر لڑائی ہو جاتی۔ یہ ایسی صورتِ حال تھی کہ شگفتہ مہینے میں اگر چار دن عنایت حسین کے پاس رہتی تھی تو چھبیس دن اس کے اپنے میکے میں گزرتے تھے۔ پڑوسیوں کا خیال تھا کہ شاید عنایت حسین سوہدرہ کلاں والا مکان اور زمین بیچ کر اپنی سسرال ہی میں جا بسا ہے۔ ماسٹر جمیل کی زبانی ایک بات یہ بھی پتا چلی کہ جن دنوں عنایت حسین کے ساتھ اس کا مکان کے حوالے سے سودا ہو رہا تھا جب بھی شگفتہ گھر میں کہیں نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس نے عنایت حسین کے باپ کو دیکھا تھا۔ اس کی جو بھی ایک دو ملاقاتیں ہوئیں وہ عنایت حسین ہی سے ہوئی تھیں۔

ماسٹر جمیل یہ کہانی سنانے کے بعد خاموش ہوا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ بات تو میرے علم میں آ گئی تھی کہ دونوں میاں بیوی میں اکثر و بیشتر دنگا فساد ہوتا رہتا تھا لیکن اس لڑائی جھگڑے کی وجوہ کیا تھیں، یہ جاننا بہت ضروری تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ خوامخواہ جھگڑنے بیٹھ جاتے ہوں اور وہ بھی بلا مقصد ڈراما کر کے اپنے میکے چلی جاتی ہو۔ میرا دل کہہ رہا تھا، اگر میں عنایت حسین اور شگفتہ کے درمیان واقع تنازع کا سراغ لگالوں تو اس کیس کو چٹکی بجاتے میں حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سارے معاملات آپس میں جڑے ہوئے نظر آتے تھے۔

''ماسٹر صاحب!'' میں نے اسی خدشاتی سوال کے جواب کی خاطر پوچھا۔ ''کیا آپ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ عنایت حسین اور شگفتہ کے درمیان جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! اس سلسلے میں کوئی حتمی اور ٹھوس بات سامنے نہیں آ سکی..... یا یہ کہ کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جو باتیں ابھی تک نامعلوم ہیں انہیں میں بہت جلد معلوم کرلوں گا۔ بہرحال، آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔''

وہ کسی معقول اور شریف النفس انسان کی طرح بولا۔ ''یہ تو میرا فرض تھا تھانے دار صاحب!''

میں ماسٹر جمیل احمد کے گھر سے باہر نکل آیا۔

کاشمیل نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اب کیا ارادہ ہے؟''

''میرا ارادہ ہمیشہ نیک ہی رہتا ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں جواب دیا۔

''ہم تھانے جا رہے ہیں نا؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تھانے جانے میں ابھی تھوڑی دیر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک دو ضروری کام ابھی باقی ہیں۔ تم آؤ میرے ساتھ۔''

وہ خاموشی سے میرے ہمراہ ہولیا۔

عنایت حسین کا نام اس وقت میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص کے بارے میں جب میری تحقیقات مکمل ہوں گی تو سنسنی خیز انکشافات کا انبار سا لگ جائے گا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ماسٹر جمیل جتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرتبہ بھی عنایت حسین سے ملا، اسے اس گھر میں اور کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ شگفتہ کا روٹھ کر میکے میں جا بیٹھنا ایک معمول کی بات بن کر رہ گئی تھی لیکن اس روٹھنے کی وجہ ابھی تک سامنے نہیں آ سکی تھی اور..... یہ وجہ معلوم کرنا انتہائی ضروری تھا۔

ماسٹر جمیل کے گھر کے دائیں جانب نیاز علی کا مکان تھا اور بائیں طرف غلام لوہار رہائش پذیر تھا۔ ماسٹر جمیل کی بیوی کوثر پروین نے تو تشفی آمیز معلومات فراہم نہیں کی تھیں مگر مجھے یقین تھا، اگر میں عنایت حسین کے ان دو ہمسایہ پڑوسیوں کو ٹٹولوں تو ضرور کسی اہم اور مفید بات تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ان پڑوسیوں کو عنایت حسین کے خانگی حالات کا اچھی طرح علم ہوگا۔

میں نے پہلے نیاز علی کے گھر کا انتخاب کیا اور کانسٹیبل اللہ بخش سے کہا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ جب ہم ماسٹر کے گھر سے نکلے تھے تو ماسٹر جمیل بھی ہمارے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا۔ میں چونکہ اس کے پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کا فیصلہ کر چکا تھا لہٰذا میں نے مصلحتاً اس سے کہہ دیا کہ وہ اپنے گھر کے اندر ہی رہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ماسٹر جمیل کو یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ درانتی والے معاملے میں فی الحال اپنی زبان بند رکھے۔ اگر کوئی اس سے پوچھے کہ اس کے گھر میں پولیس کیوں آئی تھی تو وہ کام چلانے کے لیے کوئی بھی خوبصورت بہانہ بنا سکتا ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت پر من و عن عمل کرے گا۔

دستک کے جواب میں گھر کے اندر قدموں کی مخصوص چاپ اُبھری اور کوئی دروازے تک آ کر رُک گیا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اگلے ہی لمحے دروازہ کھل جائے گا لیکن جب میری توقع پوری نہیں ہوئی تو میں نے کانسٹیبل کو دوبارہ دستک کے لیے اشارہ کیا۔

کانسٹیبل کو دوسری دستک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس نے جیسے ہی دروازے کی جانب ہاتھ بڑھایا، دروازے کے عقب سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ اس آواز میں تشویش ناک استفسار پنہاں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ نیاز علی کی بیوی ہو سکتی تھی۔

''کون ہے؟'' اندر موجود عورت نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''میں نیاز علی سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ گھر میں ہے؟''

''نہیں جی..... نیاز تو اس وقت گھر میں نہیں۔''

''وہ کب تک واپس آ جائے گا؟''

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ اگر نیاز علی کو تھوڑی دیر بعد واپس آنا ہو تو میں پہلے غلام لوہار کا انٹرویو کر لوں۔ بعد میں نیاز علی سے بھی بات ہو جائے گی۔ اندر موجود عورت نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''آپ کون ہیں..... اور نیاز سے آپ کو کیا کام ہے؟''

میں نے دانستہ غلط بیانی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام غلام فرید ہے اور..... کام میں نیاز علی کو ہی بتاؤں گا۔ بتاؤ، وہ کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آ جائے گا؟''

''نیاز کام پر گیا ہوا ہے اور شام ہی کو واپس آئے گا۔'' اس عورت نے جواب دیا۔ ''اُدھر بڑے بوڑھ (بڑھ کا درخت) کے پاس اس کا کولھو ہے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے کولھو پر کام کرتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں اُدھر کولھو پر ہی اس سے مل لوں گا۔''

یہ کہتے ہی میں کانسٹیبل کے ساتھ غلام لوہار کے گھر کی سمت قدم بڑھانے لگا۔ غلام لوہار کی دُکان گھر کے اندر ہی سامنے والے حصے میں موجود تھی لہٰذا اس سے فوری ملاقات ہو گئی۔ ہم اس کی دُکان میں داخل ہوئے تو وہ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اپنے اڈے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت ہم دونوں پولیس کی مخصوص یونیفارم میں تھے اور اس کے اٹین شن ہونے کا سبب بھی یہی تھا۔

''آؤ جی..... بسم اللہ، بسم اللہ.....!'' وہ دونوں ہاتھ باندھ کر تعظیمی انداز میں بولا۔

غلام لوہار کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی مگر اس عمر میں بھی اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ لوہے کے ساتھ دن رات کھیلتے ہوئے وہ جیسے خود بھی لوہے ہی کا ہو گیا تھا۔ وہ سیاہ رنگت کا حامل ایک چاق چوبند شخص تھا۔ میں سرسری انداز میں اس کے لوہار خانے (دُکان) کا جائزہ لینے لگا۔

اگر آپ کا کسی لوہار کی دُکان (ورکشاپ) میں جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا، وہاں کیا کچھ پایا جاتا ہے۔ لوہار دراصل لوہے کا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ وہ لوہے کا علاج کرتا ہے۔ لوہے ہی کے بنے ہوئے اوزاروں کی مدد سے وہ لوہے کے چھوٹے بڑے بے شکل ٹکڑوں کو اپنے فن اور ہنر کی مدد سے مخصوص شکل دے کر انہیں مفید اور قابلِ استعمال بناتا ہے۔ اس کام میں بھٹی اور روزنی ہتھوڑا اس کے سب سے بڑے معاون ہوتے ہیں۔ وہ لوہے کو آگ میں تپا کر اس کی سختی کو ختم کرتا ہے پھر ہتھوڑے کی ضربوں سے کوٹ پیٹ کر اسے اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ یہ کام اتنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آسان نہیں جتنا کہ بیان میں نظر آتا ہے۔ ایک لوہار کو اپنے فن اور ہنر کے ساتھ ساتھ ہتھوڑے کے توسط سے بے پناہ جسمانی قوت کو بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ جب ہم غلام لوہار کی دُکان میں داخل ہوئے تو وہ اپنے معمول کے کام میں مصروف تھا۔ دہکتی ہوئی بھٹی کے سبب کمرے میں بڑی خوشگوار سی حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا، لو بھائی! غلام لوہار تو بڑے مزے میں ہے۔ باہر ٹھنڈے ٹھار موسم نے جیسے ہر شے کو برف کا بنا دیا ہے اور یہ اپنی دُکان کے اندر بڑے سکون سے بیٹھا کام کر رہا ہے۔

اسے پُرسکون اور مطمئن دیکھ کر حسد یا رشک کرنے والوں کو ایک لمحے کے لیے یہ تصور بھی ضرور کرنا چاہیے کہ مئی، جون میں اس بے چارے پر کیا گزرتی ہوگی۔ جنوری، فروری کی بہ نسبت مئی، جون کا موسم بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہی ماحول جس میں ان دنوں برف جمی ہوئی تھی، مئی، جون میں آگ برساتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن سال کا کوئی بھی مہینا ہو، لوہار کی دُکان کا موسم تو ایک جیسا ہی رہتا ہے۔

میں نے دُکان کے ''معائنے'' کے بعد غلام لوہار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ چاچا! میں اِدھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا، دیکھ لوں کہ تمہارا کام کاج کیسا چل رہا ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں؟''

ایک آسودۂ حال اور پریشان حال شخص میں سب سے نمایاں فرق دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ دونوں اپنی کیفیت کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے میرا مشاہدہ اور تجربہ ہر جگہ مطلق نہ ہو لیکن میں نے جو محسوس کیا وہی بتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں کسی خوش باش شخص کی بہ نسبت مصیبت زدہ شخص زیادہ متقی اور شکر گزار ہوتا ہے۔ اس سے جب بھی اس کا احوال دریافت کیا جائے تو وہ یہی جواب دیتا ہے..... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

غلام لوہار نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''مولا کا احسان ہے جی، مجھے کوئی فکر پریشانی نہیں۔ وہ جس حال میں بھی رکھے میں خوش ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ ٹھہریں جناب..... میں آپ کے لیے اندر سے کرسیاں لے کر آتا ہوں۔''

''کرسیوں کی کوئی ضرورت نہیں چاچا! ہم اِدھر چوکیوں پر ہی بیٹھ جائیں گے۔'' میں نے اس کی دُکان میں رکھی چوکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چوکی'' کو آپ پڑایا نیچا اسٹول سمجھ لیں۔ جو دُکانیں فرشی نشست پر مبنی ہوتی ہیں وہاں گاہکوں کے بیٹھنے کے لیے ایسی چوکیاں موجود ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں گاؤں دیہات کی دُکانداری عموماً فرشی نشست کی مرہون منت تھی۔ آج کل کافی تبدیلی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے بدل جاتی ہے۔ بس گاؤں اور شہر کی زندگی میں رفتار کا فرق ہے۔ شہر میں ایک سال کے اندر جو تبدیلی رونما ہو جاتی ہے، گاؤں میں بعض اوقات اس تبدیلی کو آتے ہوئے پچاس سال بھی لگ جاتے ہیں۔

غلام لوہار نے دیوار پر ٹنگا ہوا ایک کپڑا اتارا اور جلدی سے ہمارے لیے دو چوکیوں کو صاف کر دیا پھر عاجزانہ انداز میں بولا۔ ''مائی باپ! آپ تشریف رکھیں۔ میں آپ کے لیے چائے پانی.....!''

''ہم سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس تکلف کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے چند سوالات پوچھ کر چلا جاؤں گا۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور اُلجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! خیریت تو ہے نا؟''

شاید میں آپ سے یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ غلام لوہار کی دُکان میں قدم رکھتے ہی میں نے ملک صفدر حیات بطور تھانے دار اپنا تعارف کرا دیا تھا جبھی وہ مجھے ''تھانے دار صاحب'' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں بڑی رسان سے کہا۔

''اس بات کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے کہ خیریت ہے یا نہیں ہے۔ بہرحال، چاچا غلام! بتاؤ، تمہارا یہ نیا پڑوسی کیسا بندہ ہے؟''

میں نے دانستہ بات کو گھما کر گفتگو کا آغاز کیا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ ماسٹر صاحب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں نا؟''

''کیا کوئی اور بھی تمہارا نیا پڑوسی آباد ہوا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''دو ڈھائی ماہ پہلے ماسٹر صاحب ہی اس گھر میں آباد ہوئے ہیں۔'' وہ ماسٹر جمیل والے مکان کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی تم سے اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟''

''ماسٹر صاحب تو بڑے بھلے مانس ہیں۔'' اس نے بتایا اور ایک مرتبہ پھر معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر غلام لوہار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ماسٹر جمیل سے پہلے اس گھر میں کون رہتا تھا؟''

''عنایت حسین اور اس کا بوڑھا باپ کرامت حسین۔'' غلام لوہار نے جواب دیا۔ ''عنایت یہ مکان ماسٹر صاحب کو بیچ کر خود اس گاؤں سے چلا گیا ہے۔''

''کہاں چلا گیا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میرا خیال ہے جہاں اس کی بیوی نے چاہا ہوگا وہ وہیں گیا ہوگا۔'' بات کرتے کرتے غلام لوہار کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے۔ ''بڑی ہی کپتی (کمینی) عورت تھی جناب عنایت حسین کی گھر والی۔''

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ عنایت حسین کی جھگڑالو بیوی شگفتہ کے ''اوصاف'' بیان کر رہا تھا۔ وہ شگفتہ کی جانب سے خاصا برگشتہ اور خفا نظر آتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں اسے ڈھنگ سے کریدتا تو اس کی زبان سے بڑی کارآمد معلومات اُگلوائی جاسکتی تھیں لیکن کوئی اور سوال کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ عنایت حسین موضع سوہدرہ کلاں کو چھوڑ کر کہاں چلا گیا تھا۔

''چاچا!'' میں نے غلام لوہار کو مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''تمہیں یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ عنایت حسین کی گھر والی اسے کہاں لے جانے کی خواہش مند تھی؟''

''اپنے میکے کے قریب..... اور کہاں!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا میں شگفتہ کے ماں پیو رہتے ہیں۔''

''ہوں.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''تو اس کا مطلب ہے عنایت حسین یہ مکان فروخت کر کے ٹوبہ ٹہلی والا گیا ہے؟''

غلام لوہار جلدی سے تصحیح کرنے والے انداز میں بولا۔ ''جناب! میں نے اپنے اندازے کی بات کی ہے ورنہ مجھے نہیں پتا وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ وہ تو جاتے وقت مل کر ہی نہیں گئے حالانکہ کرامت تو اکثر اِدھر میری دُکان پر بیٹھا گپ شپ کرتا رہتا تھا۔ یہ بڑا ہی مظلوم بڈھا ہے تھانے دار صاحب!''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''چاچا! تمہارا مطلب کیا ہے؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! عنایت حسین کی بیوہ شگفتہ اپنے سسر کو پسند نہیں کرتی تھی۔ کرامت حسین میرے پاس بیٹھا اپنے دُکھڑے روتا رہتا تھا۔ بزرگوں کا گھر میں ایک احترام ہوتا ہے۔ عنایت حسین کے سامنے تو وہ وقت پر کرامت کو کھانا دے دیتی تھی لیکن اس کی غیر موجودی میں شگفتہ کا اپنے سسر کے ساتھ رویہ بڑا ہی نامناسب تھا۔ بے چارے کرامت کی عمر ستر کے قریب ہے اور اس کی نگاہ بھی کافی کمزور ہو چکی ہے۔ کرامت نے بڑے ہی رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا ہے کہ شگفتہ اس کے کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ وہ پہنے ہوئے کپڑے دھونے کے لیے اتارتا تو اگلے روز وہی میلے وہ اسے تھما دیتی اور بڑی ڈھٹائی سے کہتی کہ میں نے کپڑے اچھی طرح دھو دیے ہیں۔ کرامت حسین نے ایک واقعہ تو ایسا سنایا کہ سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔''

غلام لوہار نے تھوڑا توقف کر کے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کرامت نے مجھے بتایا کہ اکثر و بیشتر اس کی بہو اس کے سالن میں تھوڑا پانی ملا دیتی تھی جس کی وجہ سے اس سالن کا ذائقہ تو خراب ہوتا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی ظاہر ہے سالن میں نمک بھی کم ہو جاتا ہے۔ کرامت سالن میں نمک کی کمی کا اظہار کرتا تو نمک والا ڈبا اس کے سامنے رکھ دیا جاتا کہ جتنی ضرورت ہو، وہ اوپر سے نمک ڈال لے۔ ''اصلی سالن'' میں چونکہ نمک مرچ بالکل مناسب ہوتا تھا اس لیے عنایت چڑ کر اپنے باپ سے کہتا، ابا! آپ بڑھاپے میں بہت تیز نمک کھانے لگے ہو، مجھے تو سالن میں نمک بالکل ٹھیک لگ رہا ہے۔ اسی قسم کی کارروائی شگفتہ، کرامت کی چائے کے ساتھ بھی کرتی تھی۔ بڑے مزے کی بات ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''کرامت حسین کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی بہو کی ان چھل فریبیوں سے اچھی طرح واقف ہے مگر مصلحت کے تحت اس نے اپنی زبان بند کر رکھی ہے۔ وہ جانتا ہے عنایت اور شگفتہ میں پہلے ہی نہیں بنتی۔ اس نے اگر بہو پر تنقید شروع کر دی یا ''خانہ خراب'' سالن اور چائے کو ''ٹیسٹ'' کے لیے بیٹے کی طرف بڑھا دیا تو گھر میں ایک قیامت برپا ہو جائے گی۔ کرامت ایک امن پسند اور صلح جو شخص ہے اس لیے اس نے مصلحتاً اپنی زبان پر تالا ڈال رکھا ہے۔ آہ.....!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر جیسے خیالوں میں گم ہو گیا۔ چند لمحے وہ جذب کی سی کیفیت میں خلا میں گھورتا رہا پھر ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''کرامت یہاں تھا تو اس کے ساتھ میرا دل لگ گیا تھا۔ میری بڑی تمنا تھی کہ جاتے وقت میں اس سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا لیکن عنایت نے دو دن پہلے ہی اسے روانہ کر دیا۔''

''کہاں روانہ کر دیا؟'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے بیزاری سے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''یہی سوال میں نے عنایت سے اس وقت کیا تھا جب وہ اس گھر کو خیرباد کہہ کر جا رہا تھا۔ عنایت نے مجھے بتایا کہ ابا کافی دنوں سے کوٹ فرمان جانے کی ضد کر رہا تھا۔ میں نے اسے اُدھر ہی بھیج دیا ہے۔ اچھا ہے، وہ کچھ عرصہ کوٹ فرمان میں رہ لے، اس کا دل بہل جائے گا۔''

میں نے سرسری لہجے میں پوچھ لیا۔ ''کوٹ فرمان میں ان کا کون رہتا ہے؟''

''صغریٰ۔'' غلام لوہار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کرامت حسین کی دو ہی اولادیں ہیں صغریٰ اور عنایت۔ صغریٰ شادی شدہ ہے اور اُدھر کوٹ فرمان میں اپنے شوہر شکور کے ساتھ رہتی ہے۔ شکور وہاں کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔ ان کے ماشاءاللہ پانچ بچے ہیں جبکہ.....''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''.....جبکہ عنایت اولاد ایسی نعمت سے محروم ہے۔ صغریٰ، عنایت سے پانچ سال چھوٹی ہے اور باپ کو بڑا یاد کرتی رہتی ہے۔ صغریٰ کا گھر والا بھی کرامت کی بڑی آؤ بھگت کرتا ہے۔ کرامت اپنی گفتگو کے درمیان اکثر صغریٰ کے بچوں کا تذکرہ کرتا رہتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے وہ اپنے نواسا نواسیوں کو بہت چاہتا ہے۔ اچھا ہے، وہ کوٹ فرمان چلا گیا۔ وہاں اس کی خوب گزرے گی۔''

غلام لوہار کی زبانی شگفتہ، عنایت، کرامت، صغریٰ، شکور اور کوٹ فرمان کے بارے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان میں سرِدست میرے کام کی کوئی بات نہیں تھی۔ جس گھر میں بھی بوڑھے ساس سسر ہوں وہاں عموماً اسی قسم کی صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ عام طور پر یہی سننے میں آتا ہے کہ بہو کی ساس کی بہ نسبت اپنے سسر سے بن جاتی ہے لیکن یہ کوئی فارمولا نہیں، ایک عمومی مشاہدہ ہے۔ اس چپقلش، ناچاقی اور اختلاف میں دونوں پارٹیوں کا تھوڑا بہت قصور ضرور ہوتا ہے، کسی کا کم اور کسی کا زیادہ۔ جب انسان ساٹھ کا ہندسہ عبور کر کے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیتا ہے تو اس کی عادت میں نمایاں تبدیلی آ جاتی ہے۔ وہ خاصا چڑچڑا اور تنقیدی ہو جاتا ہے۔ بات بات پر روک ٹوک اس کا وتیرہ بن جاتا ہے۔ اپنی دانست میں وہ عقل مندی کی باتیں کر رہا ہوتا ہے لیکن نوجوانوں اور جوانوں خوبیہ دانش مندانہ باتیں پسند نہیں آتیں لہٰذا وہ بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ بیٹے بیٹیاں، نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں پھر بھی کچھ خیال کر لیتے ہیں لیکن بہو اور داماد سے اس قسم کی کوئی توقع رکھنے حماقت کے زمرے میں آتا ہے لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ یہ کوئی فارمولا نہیں، ایک عمومی مشاہدہ ہے۔ بعض جگہ صورتِ حالات اس کے بالعکس بھی نظر آتی ہے۔ بہرحال، غلام لوہار سے جو مفید بات پتا چلی وہ یہ تھی کہ عنایت حسین موضع سوہدرہ کلاں سے نکل کر ٹوبہ ٹہلی والا گیا ہوگا..... یا گیا تھا۔

ٹوبہ ٹہلی والا، موضع سوہدرہ کلاں سے آٹھ میل دور جنوب میں واقع تھا جبکہ کوٹ فرمان جانے کے لیے سوہدرہ کلاں سے چھ میل شمال میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس کا مطلب تھا عنایت نے سرِدست اپنے باپ کو خود سے چودہ میل دور کر دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا وہ کرامت حسین سے بہت بیزار ہے۔ یہ بات الگ کہ اس کی اس بیزاری کے پیچھے شگفتہ کا دباؤ ہو۔

غلام لوہار کافی دیر سے میرے ساتھ مصروفِ گفتگو تھا۔ ہماری آمد سے قبل وہ اپنے کام میں جتا ہوا تھا لیکن ہمارے دُکان میں داخل ہوتے ہی اس نے کام سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ جب دہکتی ہوئی بھٹی پر سے اس کی توجہ ہٹی تو اس نے دہکنا موقوف کر دیا۔ اسے دھونکنی کے ذریعے وہ ''حوصلہ اور تشفی'' نہیں مل رہی تھی جو اس کے دہکنے کے لیے ضروری تھی لہٰذا اس کی کارکردگی ''متاثر'' ہونے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے غلام لوہار کی دُکان میں جو خوشگوار اور فرحت بخش حرارت بھری ہوئی تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی تھی۔ آمد اور جامد میں تناسب برقرار نہ رہے تو ایک روز قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

میں نے غلام لوہار کی دُکان سے اٹھنے کا فیصلہ کر لیا اور جاتے جاتے اس سے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے اس مکان کے علاوہ عنایت حسین کی کچھ زمین اور مال مویشی بھی تھے۔ مکان تو اس نے ماسٹر جمیل کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ زمین اور مویشیوں کا کیا ہوا؟''

''عنایت کے پاس صرف پانچ ایکڑ اراضی تھی۔ وہ اسی زمین پر کھیتی باڑی کرتا تھا۔'' غلام لوہار نے مجھے بتایا۔ ''عنایت نے تو اس سلسلے میں مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا البتہ، بعد میں مجھے پتا چلا ہے، زمین اس نے یہاں کے ایک زمیندار ملک صمد کو بیچ دی ہے اور ڈھور ڈنگر وہ اپنے ساتھ لے گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔''

پھر اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ عنایت حسین کے پاس ایک بھوری بھینس، ایک صحت مند گدھا اور دو بکریاں تھیں۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری دیکھا دیکھی کانسٹیبل نے بھی چوکی چھوڑ دی۔ غلام لوہار بھی تنظیماً کھڑا ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے چاچا! اب ہم چلتے ہیں۔''

وہ چند لمحات تک متذبذب نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ہچکچاہٹ بھرے انداز میں پوچھ بیٹھا۔ ''تھانے دار صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ عنایت کے بارے میں کس سلسلے میں پچھ پرتیت کر رہے ہیں؟''

غلام لوہار نے نہایت ہی سیدھا اور برمحل سوال کیا تھا۔ میں چاہتا تو اس کا جواب دے سکتا تھا لیکن فی الحال میں خون آلود درانتی والے معاملے کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا لہٰذا ایک خوبصورت بہانہ بناتے ہوئے اس سے کہا۔

''چاچا! میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔ اوپر سے بڑے افسروں نے سختی سے آرڈر کیے ہیں کہ میں اپنے تھانے کی حدود میں آنے والے گاؤں دیہات کا خاص خیال رکھوں۔ میرے علاقے میں بسنے والوں کو کوئی تکلیف پریشانی نہیں ہونا چاہیے۔''

وہ تعریفی انداز میں یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی افسرانِ بالا نے یہ احکام بھی صادر کیے ہیں کہ اگر میرے تھانے کی حدود میں کوئی شخص نقل مکانی کرتا ہے تو میں اس کی تفصیلی رپورٹ تیار کر کے اوپر والوں کو بھیج دوں۔ موضع سوہدرہ کلاں اور ٹوبہ ٹہلی والا میرے تھانے کی حدود میں آتے ہیں۔ میں نے یہاں تو عنایت حسین کے بارے میں پوچھ گچھ کر لی ہے۔ اب اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا جا کر تحقیقات کرنا باقی ہیں۔'' اتنا کہہ کر میں رُکا پھر اچانک اس سے پوچھ لیا۔

''چاچا! تمہارا کوئی مسئلہ، کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

اس کے چہرے پر تشکرانہ تاثرات اُبھر آئے پھر جذبات سے لبریز آواز میں اس نے کہا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے تھانے دار صاحب! ہم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ اس علاقے میں کوئی آپ جیسا مخلص، ہمدرد، نیک سیرت اور خدا ترس تھانے دار تعینات ہوا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے یہاں کوئی دُکھ، تکلیف یا پریشانی نہیں۔ اگر ایسا وقت آیا تو میں پہلی فرصت میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''ضرور..... ضرور.....!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

ہم غلام لوہار کی دُکان سے باہر نکل آئے۔

کانسٹیبل اللہ بخش نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! یہ لوہار چاچا تو بڑا ہی بے وقوف اور سیدھا سادہ ہے۔''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سیدھا سادہ تو وہ مجھے بھی لگا ہے لیکن تم اسے بے وقوف کس حوالے سے کہہ رہے ہو؟''

''اسے ذرا دنیا داری نہیں آتی۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری نظر میں دنیا داری کیا ہے اللہ بخش؟''

''دیکھیں نا ملک صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اسے کتنی بڑی پیشکش کی تھی کہ..... اسے کوئی تکلیف یا پریشانی تو نہیں؟ اس نے بڑی بے وقوفی سے جواب دیا اسے کوئی دُکھ تکلیف نہیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور سمجھ دار شخص ہوتا تو آپ کی اس فراخ دلانہ پیشکش سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ وہ آپ کے ذریعے اپنا کوئی نہ کوئی کام نکلوا لیتا۔''

میں نے پورے تحمل سے اس کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اللہ بخش! اگر غلام لوہار تمہارے معیار کی سوجھ بوجھ اور دنیا داری کا مظاہرہ کرتا تو میری نظر میں بے وقوف قرار پاتا۔''

''یہ کیا بات ہوئی ملک صاحب؟'' اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''اللہ بخش! یہ سارا سمجھ کا ہیر پھیر ہے۔ غلام لوہار نے اس لیے مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی کہ اس کی زندگی میں واقعی کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں ہے اور یہ سب کچھ اس کی سادگی اور فطرت سے قریب زندگی گزارنے کا ثمر ہے۔ مجھے یقین ہے اس کی زندگی میں کبھی کوئی دُکھ تکلیف نہیں آئے گی۔ اس کے بالعکس.....''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس درست کی پھر سلسلۂ کلام کو تکمیل تک پہنچاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بالعکس اگر وہ ریاکاری اور غلط بیانی سے کام لیتا تو یہ حقیقت ہے، وہ وقتی طور پر مجھ سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن دروغ گوئی کو بنیاد بنا کر حاصل کیا گیا یہی فائدہ آگے چل کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتا۔ یاد رکھو..... جو لوگ حقیقت کو چھپا کر منافقت کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زبان سے خود کو مجبور، بے کس اور مصیبت زدہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں وہ ناعاقبت اندیش لوگ کفرانِ نعمت کے علاوہ اپنی جانوں پر سخت ظلم کرتے ہیں۔ قدرت ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتی اور ان کی زندگی واقعی نمونہ جہنم بن جاتی ہے۔''

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ اللہ بخش چند لمحات تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر تحیر آمیز آواز میں مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب! آپ تھانے دار ہیں یا کوئی دینی مبلغ؟''

میں نے گمبھیرانہ انداز میں کہا۔ ''اللہ بخش! میں سب سے پہلے ایک انسان ہوں، بعد میں تھانے دار۔ ایک انسان ہونے کے ناتے ہر شخص کو زندگی کی یہ حقیقی اُونچ نیچ معلوم ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انسان کا عالم دین یا مذہبی مبلغ ہونا ضروری نہیں۔''

اسی وقت آٹھ نو سال کا ایک بچہ ہمارے قریب آ گیا۔ اللہ بخش میری وضاحت کے جواب میں پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا۔ بچے کی آمد پر اس کے منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ میں مذکورہ بچے کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''پولیس صاحب! آپ کو ماسی فردوس نے بلایا ہے۔''

''کون ماسی فردوس؟'' میں نے اُلجھن زدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

وہ اپنے عقب میں ایک گھر کے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ماسی فردوس اس گھر میں رہتی ہے۔''

میں نے اس مکان کی طرف دیکھا جدھر اس بچے نے اشارہ کیا تھا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مذکورہ گھر نیاز علی کا تھا پھر بھی تصدیق کی خاطر میں نے اس بچے سے پوچھ لیا۔

''تم نیاز علی کے گھر کی بات کر رہے ہو نا؟''

''جی جی، وہی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''ماسی فردوس، نیاز چاچا کی گھر والی ہے۔''

میں نے اُلجھن بھری نظر سے اللہ بخش کی طرف دیکھا پھر نیاز علی کے مکان کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اسی لمحے وہ بچہ ایک بغلی گلی میں غائب ہو گیا۔

نیاز علی کے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ فردوس نے مجھے کیوں بلایا تھا۔ آخر اس عورت کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ غلام لوہار کی دُکان میں قدم رکھنے سے پہلے ہم نے نیاز علی کے مکان کے دروازے پر دستک دی تھی۔ اور اس کی بیوی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ نیاز اس وقت اپنے کولھو پر ملے گا۔ میرا ذہن بار بار مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ فردوس کے پاس میرے لیے کوئی سنسنی خیز خبر ہو گی ورنہ وہ یوں بچہ بھیج کر مجھے اپنے پاس نہ بلاتی۔ نیاز علی کا مکان، ماسٹر جمیل کے گھر کی دائیں جانب واقع تھا۔

ہم نیاز علی کے گھر کے سامنے پہنچے تو داخلی دروازے کے عقب سے نسوانی آواز اُبھری۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا ہے۔ آپ اندر آ کر بیٹھ سکتے ہیں۔''

میں نے اس آواز کو پہچاننے میں ایک لمحے کی دیر نہ کی۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس آواز سے یہیں کھڑے ہو کر مختصر مکالمت کر چکا تھا۔ وہ یقیناً نیاز علی کی بیوی فردوس تھی۔

گھر کے داخلی دروازے کی بغل میں بیٹھک کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ دروازہ نیم وا تھا۔ میں کانسٹیبل اللہ بخش کے ساتھ اس دروازے کے توسط سے بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اندر فردوس پہلے سے موجود تھی۔ وہ ہمیں بیٹھک کے دروازے کے بارے میں بتا کر اس طرف آ گئی تھی۔

فردوس کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہو گی۔ وہ قابلِ رشک صحت کی مالک ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر اس کی شخصیت کے حوالے سے ذہن میں کسی ہوئی چارپائی کا تصور اُبھرتا تھا۔ وہ ایک مڈر اور ٹھسے دار عورت تھی۔

ہمیں بیٹھک میں بٹھانے کے بعد اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میں گھر میں اکیلی ہی ہوں۔ نیاز اپنے کولھو پر گیا ہے اور بچے پڑھنے کے لیے اسکول گئے ہیں۔ آپ لوگ بیٹھیں۔ میں آپ کے.....''

''تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں فردوس بی بی!'' میں نے اس کی بات کی تہ میں اترتے ہوئے فوراً قطع کلامی کی۔ ''ہم کسی شے کی طلب محسوس نہیں کر رہے۔ تم اِدھر ہی بیٹھ جاؤ اور بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟''

ایک لمحے کے تامل کے بعد وہ بھی بیٹھک میں بیٹھ گئی۔ میں مسلسل سوالیہ نظر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تھوڑا توقف کیا پھر قدرے انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے گھنٹا بھر پہلے غلام فرید کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا اور بتایا تھا کہ آپ میرے گھر والے سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا نیاز اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت اپنے کولھو پر ہوگا تو آپ نے کہا آپ اُدھر کولھو پر جا کر ہی اس سے مل لیں گے پھر آپ غلام لوہار کی دُکان میں داخل ہوگئے۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی تو میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ یقیناً اس تیز طرار عورت نے چھپ کر دروازے کے عقب سے ہمیں دیکھا تھا۔ وہ میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں نے دروازے کی اوٹ میں رہتے ہوئے پیچھے سے آپ کو دیکھا تھا۔ پولیس کی وردی میں آپ دونوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ تھوڑی دیر پہلے میں دُھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے اپنے گھر کی چھت پر گئی تھی تو میں نے آپ دونوں کو ماسٹر جمیل کے ساتھ اس کے گھر کے عقبی حصے میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ میں اس بات پر حیران ہوئی کہ آپ نے مجھے اپنا نام غلام فرید کیوں بتایا۔ میں نے اتنی دیر میں اپنے طور پر یہ جان لیا ہے کہ آپ کا نام ملک صفدر حیات ہے اور آپ ہمارے علاقے کے تھانے دار ہیں۔''

وہ ہوشیار ہی نہیں، خاصی خطرناک عورت بھی تھی۔ پتا نہیں اس نے کون سے ذرائع استعمال کر کے میرے بارے میں معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی استفساری نظر کے جواب میں کچھ کہتا، وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔

''تھانے دار جی! اتنا تو میں بھی جانتی ہوں، پولیس بلامقصد کہیں آتی جاتی نہیں۔ اللہ خیر کرے، آپ کس کیس کی تفتیش کرنے نکلے ہیں؟''

فردوس جیسی ہوشیار عورت کو چکر دینا آسان کام نہیں تھا لیکن ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا لہٰذا بروقت مجھے ایک عمدہ قسم کا بہانہ سوجھ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو گھورتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔

''فردوس بی بی! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ کہیں پر بھی پولیس کی آمد بے سبب نہیں ہوتی۔ میں بھی ایک معاملے کی تفتیش کے سلسلے میں ان گلیوں کی خاک چھان رہا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''دراصل..... میں عنایت کی بیوی شگفتہ کے بارے میں کچھ معلومات اکٹھا کر رہا ہوں۔''

وہ پھڑک اٹھی۔ ''کیسی معلومات تھانے دار صاحب؟''

میں نے اپنے جھوٹ کے منہ میں تکنیکی زبان فٹ کرتے ہوئے بات کو نبھا دیا۔ ''اُدھر ٹوبہ نہلی والا سے شگفتہ کی انکوائری آئی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق شگفتہ، عنایت حسین کی بیوی ہے۔ عنایت حسین، ماسٹر جمیل کے ہاتھ اپنا مکان بیچ کر کہیں چلا گیا ہے۔ اب پتا چلا ہے شگفتہ اُدھر ٹوبہ نہلی والا میں کسی مشتاق نامی آدمی سے شادی کر رہی ہے۔ میں اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے نکلا ہوں کہ آیا شگفتہ نے عنایت حسین سے طلاق حاصل کر لی ہے یا.....؟''

میں نے بڑے پُراسرار انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو فردوس کے چہرے پر سنسنی سی پھیل گئی۔ جب وہ بولی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اندھیرے میں میرا چلایا ہوا تیر جا کر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی۔

''آپ کہیں مہر مشتاق کی بات تو نہیں کر رہے؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں، اس شخص کا نام مہر مشتاق ہی ہے۔''

''توبہ توبہ.....!'' وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ ''غضب خدا کا۔ اس عورت کو تو ذرا بھی حیا نہیں۔ میں تو سمجھ رہی تھی بڑھاپا کرامت کسی غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہے کیونکہ بڑھاپے بارے مت ماری جاتی ہے انسان کی لیکن یہ معاملہ تو واقعی سچا نکلا۔''

وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی پھر بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں آپ کو بالکل صحیح بتا رہی ہوں۔ عنایت حسین نے کبھی شگفتہ کو طلاق نہیں دی۔ وہ عنایت کی قانونی بیوی ہے۔ آپ قانون کی طاقت کا استعمال کریں اور پہلی فرصت میں اس شادی کو رُکوانے کی کوشش کریں۔ خصم پر خصم کرنا تو بہت بڑا گناہ ہے۔ پتا نہیں وہ بلّی (نامراد) کون سا گل کھلانے جا رہی ہے۔''

یہ سچ ہے کہ انسان اگر خلوصِ نیت سے منزل کی تلاش میں نکلے اور اس کی کوشش میں بھی کوئی کلام نہ ہو تو اسے ضرور کامیابی ملتی ہے۔ میری اب تک کی کوشش اتفاق سے اچانک ہی رنگ لے آئی تھی۔ فردوس نے جوشِ جذبات میں مجھے اس کیس پر آگے بڑھنے کے لیے ایک راستہ فراہم کر دیا تھا لہٰذا میں نے اس کے اطمینان اور تسلی کی خاطر مضبوط لہجے میں کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں وہ شادی ہونے دوں۔ تم نے حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا کر قانون کی مدد کی ہے۔ میں تم سے تھوڑے سے اور تعاون کی اُمید رکھتا ہوں۔''

''جی جی..... بتائیں۔'' وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ''فردوس بی بی! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ عنایت کا باپ کرامت، شگفتہ کے حوالے سے کسی غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا، یہ کیا قصہ ہے؟''

وہ بڑی رسان سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''قصہ یہ ہے جناب کہ شگفتہ نے یہ وتیرہ اپنا لیا تھا کہ آئے دن وہ اپنے خصم سے روٹھ کر اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا اپنے میکے چلی جاتی تھی۔ بڈھا کرامت اپنی بہو کی اس روش سے گہری تشویش میں مبتلا تھا۔ اسے شک ہوگیا کہ وہاں شگفتہ کا ''کسی'' سے کوئی چکر ہے۔ کچھ عرصے کے بعد کرامت حسین نے ''کسی'' کی جگہ مشتاق مہر کا نام فٹ کردیا۔ جب شگفتہ کا روٹھنا اور میکے میں جا بیٹھنا حد سے گزر گیا تو کرامت نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنے بیٹے سے اس سلسلے میں بات کی۔ عنایت نے مبہم انداز میں اپنی بیوی سے باز پرس کی تو اس نے ایک طوفان کھڑا کردیا پھر تو وہ ایک لمبے عرصے کے لیے میکے جا بیٹھی۔''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''پتا نہیں، یہ عنایت حسین کس بودی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو زندہ گاڑ دیتا..... یا ٹکڑے کرکے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ بیوی کی ایسی حرکتیں تو کوئی بے غیرت مرد ہی برداشت کرسکتا ہے..... یا پھر کوئی ایسا شخص جو مرد کہلانے کے قابل نہ ہو۔''

آخری جملے اس نے بڑے زہریلے انداز میں ادا کیے تھے۔ اس کے الفاظ سے ترشی ٹپکتی تھی۔ وہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ کافی حقیقت پسند بھی تھی۔ دلچسپ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے بڑے مخصوص منفی انداز میں سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور تلخی سے بولی۔

''شگفتہ کو روٹھ کر اپنے میکے بیٹھے چند روز ہی گزرتے تھے کہ عنایت منت خوشامد کے لیے ٹوبہ ٹہلی والا پہنچ جاتا۔ کچھ دن اس کی خوشامد درآمد میں گزارتا اور اسے منا کر یہاں لانے میں کامیاب ہوجاتا۔ وہ ہفتہ دس دن یہاں رُکتی پھر کسی بے بنیاد بات پر جھگڑے کی عمارت کھڑی کرکے اپنے میکے چلی جاتی۔ ان دنوں بھی وہ تو ٹوبہ ٹہلی والا گئی ہوئی تھی جب عنایت اپنا مکان بیچ کر گیا ہے۔''

فردوس کی زبانی عنایت اینڈ کمپنی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ میں نے اس تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا اور اٹھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

''سننے میں آرہا ہے، عنایت حسین یہاں کی زمین اور مکان بیچ کر اپنی سسرال ٹوبہ ٹہلی والا گیا ہے۔ تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے، وہ اُدھر نہیں گیا ہوگا۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اگر عنایت ٹوبہ ٹہلی والا میں موجود ہوگا تو پھر شگفتہ، مہر مشتاق سے شادی نہیں کرسکے گی۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے۔'' میں نے سرا ہنے والے انداز میں کہا۔ ''میں بہت جلد ٹوبہ ٹہلی والا جانے کا ارادہ رکھتا ہوں پھر ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ ویسے یہ مشتاق ہے کون؟'' بات کے اختتام پر میں نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

''کوئی غیر تھوڑی ہے۔'' وہ بڑی ادا سے ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''مہر مشتاق، شگفتہ کے چاچے کا بیٹا ہے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' میں معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

وہ ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے بولی۔ ''جی ہاں، تھانے دار صاحب!''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے رضا کارانہ تعاون کا شکریہ ادا کیا اور کانسٹیبل اللہ بخش کے ساتھ نیاز علی کے گھر سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے اے ایس آئی بشارت مرزا کو اپنے ساتھ لیا اور موضع ٹوبہ ٹہلی والا روانہ ہوگیا۔ جب تک عنایت حسین یا اس کی بیوی شگفتہ سے میری ملاقات نہ ہوجاتی، اس کیس کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ رات بھر میرا ذہن اسی مسئلے کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف رہا تھا اور میں دو تین گھنٹے سے زیادہ کی نیند نہیں لے سکا تھا۔ اس کم خوابی کے اثرات مجھے اپنے اعصاب پر محسوس ہو رہے تھے لیکن بہرحال، یہ تو فرائضِ منصبی کا حصہ اور تقاضا ہے۔

رات کو سونے کے دوران میں خون آلود دندانے دار درانتی پر میرا فوکس رہا تھا۔ وہ درانتی بہ زبانِ خاموشی یہ اعلان کرتی سنائی دیتی تھی کہ اس کی مدد سے کوئی خونی واردات عمل میں لائی گئی ہے..... کوئی وارداتِ قتل!

اس رُخ پر سوچتے ہوئے فردوس کے کہے ہوئے الفاظ اچانک میرے ذہن میں جلنے بجھنے لگے۔ اس نے بڑی تلخی سے کہا تھا..... اگر عنایت کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو زندہ گاڑ دیتا..... یا ٹکڑے کرکے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ کسی کوز مین میں گاڑا جائے یا ٹکڑے کرکے بھوکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کتوں کے سامنے پھینک دیا جائے، بات ایک ہی ہے یعنی.....قتل!

تو کیا.....عنایت حسین کی غیرت اچانک جاگ اٹھی تھی اور اس نے واقعی اپنی بے راہ روی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا؟

یہ ایسا سنسنی خیز اور خطرناک سوال تھا کہ مجھے اپنے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی خون آلود درانتی کا معما حل بھی حل ہوتا نظر آنے لگا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ عنایت نے اس درانتی کی مدد سے اپنی بیوی کا گلا کاٹ ڈالا ہو اور ازاں بعد آلۂ قتل کو گندم والے پڑھولے میں چھپا دیا ہو۔ ان امکانی باتوں کی تصدیق یا تردید ٹوبہ ٹہلی والا پہنچ کر ہی ہوسکتی تھی۔ اگر عنایت حسین نے واقعی اپنی بیوی کو قتل کیا تھا تو پھر شگفتہ کو ٹوبہ ٹہلی والا میں موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مگر وہ.....وہاں موجود تھی۔

ہم دوپہر کے وقت ٹوبہ ٹہلی والا پہنچے اور پوچھتے پاچھتے سیدھے شگفتہ کے میکے پہنچ گئے۔ یہ گھر گاؤں کے وسط میں واقع تھا۔ شگفتہ کے باپ یعقوب علی کا عرصہ پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ وہ گھر میں اپنی ماں کے ساتھ تھی اور اتفاق یہ تھا کہ اس وقت ان دونوں کے سوا گھر میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ شگفتہ کی ماں کا نام شرافت بی بی معلوم ہوا۔

ہماری دستک کے جواب میں دروازہ شرافت بی بی ہی نے کھولا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں موضع سوہدرہ کلاں سے آیا ہوں اور اس کے جوائی (داماد) عنایت حسین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں تو وہ ہمیں اپنے گھر کے اندر لے گئی۔ پولیس کی وردی کا اپنا ایک رعب داب ہوتا ہے۔ اس کے سامنے بہت سے بند دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔

شرافت بی بی نے ہمیں بیٹھک میں بٹھانے کے بعد کہا۔ ''آپ لوگ اتنی دور سفر کرکے یہاں آئے ہیں۔ میں شگفتہ سے کہتی ہوں آپ کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرے۔''

وہ اتنے نارمل انداز میں بات کررہی تھی جیسے کہیں کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ پتا نہیں یہ اس کے حقیقی تاثرات تھے یا وہ کمال کی اداکارہ تھی۔ بہرحال، خط و خال سے وہ خاصی سرد و گرم چشیدہ دکھائی دیتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا اس کے دل کا حال جاننے کے لیے مجھے سخت محنت کرنا پڑے گی۔

اس کی پُرکشش پیشکش کے جواب میں، میں نے کہا۔

''کسی قسم کے تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں، ہم تھانے سے ناشتا کرکے نکلے تھے۔''

''تھانے دار صاحب! سوہدرہ کلاں یہاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''آپ لوگ گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوکر یہاں پہنچے ہیں۔ سردی کے موسم میں ویسے بھی جسم کو زیادہ گرمی (توانائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبح کا کھایا پیا تو سب برابر ہوگیا ہوگا۔''

اس نے بڑی معقول بات کی تھی لہٰذا اس کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ واقعی اس وقت مجھے ہلکی ہلکی بھوک محسوس ہورہی تھیں۔ ازیں علاوہ پوچھ تاچھ کے سلسلے میں ہمیں وہاں تھوڑا وقت گزارنا تھا چنانچہ خاطر تواضع کرانے میں کوئی مضایقہ نہیں تھا۔

مجھے نیم رضامند دیکھتے ہوئے شرافت بی بی گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہوگئی۔ میں اس بیٹھک اور بیٹھک میں موجود ساز و سامان کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا اس گھر کے مالی حالات خاصے اچھے تھے یعنی وہاں کسی قسم کی کوئی معاشی پریشانی نہیں تھی۔ ان لوگوں کی زندگی بڑے اچھے اور خوشگوار انداز میں گزر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد شرافت بی بی واپس بیٹھک میں آگئی۔ وہ خالی ہاتھ آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا اس نے ہماری خاطر داری کے لیے اپنی بیٹی شگفتہ کو ''آرڈر'' دے دیا تھا۔ شرافت بی بی میرے سامنے ایک موڑھے پر براجمان ہوگئی پھر بڑے تیکھے لہجے میں بولی۔

''لگتا ہے اس مرتبہ عنایت نے شگفتہ کو بلانے کے لیے باقاعدہ پولیس کی مدد لی ہے۔''

اس کے اس طنزیہ جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس بات سے صاف ظاہر ہوتا تھا، عنایت کے تازہ ترین حالات کی ان کو کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ بڑی اچنبھے کی صورتِ حال تھی۔ میں نے اسے گھسنے کے لیے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے شرافت بی بی! تم نے ''تنگ آمد، بہ جنگ آمد'' کے بارے میں تو سنا ہوگا؟''

''اچھا تو آپ یہاں.....عنایت کے لیے جنگ کرنے آئے ہیں۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''لیکن شروع میں تو آپ نے بتایا تھا آپ عنایت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں؟''

''سچی بات تو یہی ہے۔'' میں نے گفتگو کو ٹو دی پوائنٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عنایت حسین کہاں ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسے کہاں ہونا ہے..... اُدھر سوہدرہ کلاں میں اپنے گھر ہی میں ہوگا۔''

شرافت بی بی کے اس جملے نے مجھے بڑے واضح طور پر بتادیا کہ وہ عنایت کے مکان کی فروخت کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں چند لمحات تک ٹٹو لنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شرافت بی بی! دو ڈھائی ماہ پہلے تک تو وہ سوہدرہ کلاں ہی میں تھا لیکن پھر اس نے اپنا مکان اور زمین فروخت کردی۔ مال مویشیوں کو ساتھ لیا اور کہیں چلا گیا۔ اس کے باپ کرامت حسین کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس کوٹ فرمان چلا گیا ہے اور عنایت حسین کے حوالے سے یہی سننے میں آرہا ہے کہ وہ یہاں ٹوبہ ٹہلی والا آ گیا ہے..... اسی لیے اس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا ہوں۔''

اس نے حیرت، دلچسپی اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری بات سنی پھر اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! یہ تو آپ بڑی عجیب کہانی سنا رہے ہیں۔ ہمیں ان واقعات کا بالکل کوئی علم نہیں۔ عنایت یہاں تو نہیں آیا۔''

''وہ آخری مرتبہ اس گھر میں کب آیا تھا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

اس سے پہلے کہ شرافت بی بی میرے سوال کا جواب دیتی، بیٹھک کے اندرونی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ شرافت بی بی نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور دروازے کی طرف منہ کر کے بہ آواز بلند کہا۔

''آ جاؤ بیٹی..... خیر ہی ہے۔''

اگلے ہی لمحے ''بیٹی'' ایک ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوئی۔ وہ یقیناً شگفتہ ہی تھی۔ شرافت بی بی نے اس کا تعارف کرا کر میرے اندازے کی تصدیق بھی کردی۔ میں نے جائزہ نظر سے شگفتہ کو دیکھا۔ وہ ایک گوری چٹی اور حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کے خط و خال میں ایک خاص قسم کا تناسب پایا جاتا تھا جس نے اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ وہ جاذب نظر دلکشی کی مالک تھی۔ اس کے سراپا میں وہ سب کچھ شامل تھا جو کسی بھی مرد کو مسخر اور مسحور کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ وہ اسم بامسمّیٰ کی ایک زندہ مثال تھی۔ یہ بات بخوبی میری سمجھ میں بیٹھ گئی کہ عنایت حسین اپنی بیوی کا گرویدہ کیوں تھا..... اور وہ کیوں روٹھی ہوئی بیوی کو بار بار منانے کے لیے ٹوبہ ٹہلی والا پہنچ جاتا تھا؟

اس دوران میں شرافت بی بی نے ایک چھوٹی میز ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ شگفتہ نے اپنے ہاتھوں میں سجائی ہوئی ٹرے کو باآہستگی اس میز پر رکھ دیا اور جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ شرافت بی بی نے کہا۔

''شگفتہ! تم بھی اِدھر ہی بیٹھو۔ میں چاہتی ہوں تمہاری موجودگی میں تھانے دار صاحب سے بات ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لوگ عنایت کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے آئے ہیں۔''

شگفتہ اپنی ماں کے نزدیک دوسرے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

شرافت نے ٹرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے مہمان نواز لہجے میں کہا۔ ''بسم اللہ کریں جناب!''

میں نے ٹرے میں موجود لوازماتِ خورونوش کا جائزہ لیا۔ شیشے کے ایک جگ میں گرم دودھ نظر آ رہا تھا اور اس کے ساتھ تانبے کے دو کنگ سائز گلاس رکھے تھے۔ ازیں علاوہ ٹرے میں دو پلیٹیں بھی موجود تھیں۔ ایک میں گرما گرم میوے والا سوجی کا حلوا تھا اور دوسری میں اُبلے ہوئے انڈے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پیتل کی دو کٹوریوں میں پسا ہوا نمک اور کالی مرچ موجود تھی۔ ناشتے کی یہ ٹرے موسمِ سرما کا بڑا شافی ''علاج'' تھی۔

میں نے ''بسم اللہ'' کرتے ہوئے شرافت بی بی سے کہا۔ ''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا..... آخری مرتبہ عنایت اس گھر میں کب آیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے وہ تین ماہ پہلے یہاں آیا تھا۔'' پھر اس نے شگفتہ کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں نا بیٹی؟''

''نہیں اماں!'' شگفتہ نے فوراً تصدیق کردی۔ ''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔''

اس کے بعد شرافت بی بی نے شگفتہ کو عنایت کے مکان اور زمین فروخت کرنے کے بارے میں مختصراً بتایا اور یہ بھی کہ کرامت حسین کوٹ فرمان چلا گیا ہے۔ شگفتہ نے بھی تعجب سے یہ روداد سنی اور اس دوران میں وہ حیرت سے پلکیں جھپکتی رہی۔ آخر میں شرافت نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب! ہم اس باپ بیٹے سے سخت تنگ ہیں۔ کیا آپ کے قانون میں انہیں سدھارنے کے لیے کوئی دفعہ موجود نہیں..... وہ اگر نہیں سدھر سکتے، نہ سدھریں لیکن ہماری جان تو چھوڑ دیں۔ آپ یقین کریں، میں شگفتہ کی وجہ سے سخت پریشان ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب تک اس کیس کے کرداروں کی جو کہانی میرے علم میں آئی تھی، شرافت بی بی اس کے بالکس صورتِ حال پیش کررہی تھی۔ میں نے سوچا، اس سے کھل کر بات کرلوں تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوسکے۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ان دونوں کو اپنی معلومات سے آگاہ کیا تو شرافت بی بی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''توبہ.....توبہ.....تھانے دار صاحب! لوگوں کو جھوٹ بولتے ہوئے یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے۔ وہاں کوئی کسی کا نہیں ہوگا۔ صرف اپنے اعمال ہی کام آئیں گے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی خاطر رُکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میری بیٹی نے جتنا برداشت کیا ہے شاید ہی کوئی دوسری لڑکی اتنی ہمت کرسکے۔ عنایت کے ساتھ ساتھ اس نے اس اندھے کرامت کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن اس کی قدر نہیں کی گئی۔ اس خرابی کی اصل جڑ وہ خبیث بڈھا ہے۔ کرامت کسی شیطان سے کم نہیں تھانے دار صاحب۔ اگر شگفتہ کی بساس نہیں تو کیا ہوا، ایک کرامت سو ساسوں پر بھاری ہے۔ اس نے اپنی حرکتوں اور کمینگیوں سے شگفتہ کو کون کون سی اذیت نہیں دی۔ اس کے کردار پر حملے کیے گئے۔ اس مردود کرامت نے الزام لگایا کہ شگفتہ بدچلن ہے۔ اُدھر میکے میں اس کا کوئی یار بستا ہے اسی لیے خصم کے گھر میں اس کا دل نہیں لگتا۔ وہ بہانہ بے بہانہ ناراض ہوکر توبہ ٹہلی والا آجاتی ہے.....''

وہ جذبات کی رو میں طوفانی رفتار سے بولتی چلی گئی۔ ''عنایت دل کا زیادہ برا نہیں ہے لیکن وہ کرامت کی مٹھی میں بند ہے۔ جب بھی کوئی فتنہ اٹھا، کوئی جھگڑا ہوا، اس نے اپنے باپ کا ساتھ دیا۔ عورت ذات کہاں تک مقابلہ کرے گی جناب! جب پانی سر سے گزرنے لگتا تو شگفتہ میرے پاس آجاتی۔ برے وقت میں اولاد کے لیے ماں ہی سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔ اگر شگفتہ کا باپ زندہ ہوتا تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ چند لمحات تک وہ گردن جھکا کر خاموش بیٹھی رہی پھر دوبارہ گویا ہوئی۔

''شگفتہ جب بھی روٹھ کر میکے بیٹھی، چند دن کے بعد ہی عنایت اسے منانے آجاتا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ عنایت، شگفتہ کو چاہتا ہے لیکن ایسی چاہت کو کیا کسی کھوہ (کنویں) میں ڈالنا ہے جس کے بدلے لات جوتے ملیں..... اور بدنامی رسوائی جھولے میں آئے۔ عنایت تو ایک طرح سے اپنی جگہ ٹھیک تھا لیکن جب تک کرامت اس کے ساتھ نتھی تھا، شگفتہ کے لیے حالات ٹھیک نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے جب بھی سمجھا بجھا کر شگفتہ کو عنایت کے ساتھ روانہ کیا تو بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ آخری موقع ہے۔ وہ اپنے گھر کے ماحول کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے ورنہ اب کی بار اگر شگفتہ توبہ ٹہلی والا آگئی تو پھر کبھی سوہدرہ کلاں نہیں جائے گی۔ وہ ہر مرتبہ وعدہ کرتا کہ اب کوئی بدمزگی نہیں ہوگی لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد شگفتہ روتی دھوتی پھر میرے پاس پہنچ جاتی۔''

شرافت بی بی اپنے دُکھوں کو الفاظ کے روپ میں ڈھالنے کے دوران میں ذرا دیر کے لیے رُکی، ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، عنایت تین ماہ پہلے شگفتہ کو لینے ہمارے گھر آیا تھا۔ اس بار میں نے اس کی منت خوشامد کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے ہر وعدے کو رد کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا، جب تک اس گھر میں کرامت حسین موجود ہے، میری بیٹی وہاں نہیں جائے گی۔ اس نے مجھ سے پوچھا، میں اپنے ابا کو کہاں بھیج دوں؟ میں نے حتمی انداز میں جواب دیا، یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ تم اگر شگفتہ کو الگ گھر میں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ بھول جاؤ اسے۔ وہ میری خوشامد کرتے ہوئے کہنے لگا، میں شگفتہ کو نہیں بھول سکتا۔ میں نے کہا، اگر تمہیں شگفتہ کی اتنی ہی ضرورت ہے تو پھر اس کے لیے رہائش کا الگ انتظام کرو۔ یہ بات لکھ لو کہ شگفتہ کسی ایسے گھر میں قدم بھی نہیں رکھے گی جہاں کرامت حسین موجود ہو۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس سوچ میں فکر اور پریشانی بھی شامل تھی۔ میں نے اسے کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا اور میں اس معاملے میں خود کو حق بجانب بھی سمجھتی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد عنایت نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، ٹھیک ہے۔ میں جارہا ہوں۔ میں اس وقت تک شگفتہ کو لینے نہیں آؤں گا جب تک ابا کا کوئی مناسب بندوبست نہ کرلوں۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں منتظر نگاہ سے اسے دیکھنے لگا۔

''تھانے دار صاحب!'' ایک لمحے کے وقفے سے وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''وہ دن اور آج کا دن، میں اور شگفتہ اس کی راہ دیکھ رہی ہیں کہ وہ کب اس منحوس کرامت کا بندوبست کرکے واپس آتا ہے۔ وہ تو نہیں آیا لیکن آپ اس کے حوالے سے ایک عجیب وغریب کہانی لے کر آگئے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے شرافت بی بی کی بات پوری توجہ سے سنی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس گفتگو کے دوران میں شگفتہ بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے تائیدی اور تصدیقی لقمے دیتی رہی تھی۔ اس وقت کیس کی جو صورتِ حال اُبھر کر سامنے آئی تھی اس میں بہت کچھ اُلجھا ہوا تھا۔ مؤقف اور بیان میں دونوں پارٹیوں کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ جب تک دونوں فریق روبرو نہیں بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے اعتراضات کی وضاحت یا توجیہہ پیش نہیں کریں گے، ان کے مسئلے کا کوئی حل نکالا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مابین کسی قسم کے تصفیے کے امکان ہیں۔ ایک فریق یعنی شگفتہ اینڈ کمپنی تو میرے پاس تھا۔ اب مجھے دوسرے فریق عنایت اینڈ کمپنی کو تلاش کرنا تھا۔ عنایت حسین کی بازیابی اس لیے بھی ضروری تھی کہ اس کے حوالے سے ایک خون آلود درانتی بھی اس معاملے میں پیش پیش تھی۔

لگے ہاتھوں میں نے شرافت بی بی سے پوچھ لیا۔ ''یہ مہر مشتاق کا کیا معاملہ ہے؟''

''اس کے حوالے سے شگفتہ کے بارے میں جو افواہیں اُڑائی جا رہی ہیں ان میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں۔'' وہ میرے سوال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''مشتاق میرے دیور کا بیٹا ہے۔ بہت ہی لائق اور بی با بچہ ہے۔ اگر آج عنایت، شگفتہ کو فارغ کر دے تو میں مشتاق کو شگفتہ سے شادی پر تیار کر سکتی ہوں۔''

اس نے لفظ ''فارغ'' پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا جس کا واضح مطلب ''طلاق'' تھا۔ اپنے بارے میں اس نوعیت کی گفتگو سنتے ہی شگفتہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ہم دونوں ''ٹرے'' کو فارغ کر چکے تھے۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹے اور بیٹھک سے نکل گئی۔

میں نے شرافت بی بی سے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے مشتاق، شگفتہ کو پسند کرتا ہے؟''

''میری شگفتہ ہے ہی ایسی کہ کوئی اس رشتے سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔'' وہ فخریہ انداز میں بولی۔

اس کے فخر میں کسی قسم کی ملاوٹ یا مبالغہ نہیں تھا۔ اپنی بیٹی کے بارے میں اس کا فتویٰ سو فیصد درست اور مبنی برسچ تھا۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھ لیا۔

''کیا شگفتہ اس نئے رشتے کے لیے تیار ہو جائے گی؟''

''میرا خیال ہے، وہ انکار نہیں کرے گی۔'' وہ پُروثوق لہجے میں بولی۔ ''میں نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے چیک کیا ہے۔ پھر اپنے مشتاق میں کوئی عیب فعل بھی نہیں۔ بس عنایت حسین کا کانٹا نکل جائے تو میں اس نیک کام میں ذرا بھی دیر نہ کروں۔''

وہ لمحے بھر کو رُکی پھر خاصے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''اب اگر عنایت یہاں آیا نا..... تو میں اس سے یہی مطالبہ کروں گی کہ وہ شگفتہ کو آزاد کرے۔ روز روز کا یہ لڑائی جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ اپنے گھر میں خوش، ہم اپنے گھر میں خوش۔''

بالکل ٹھیک کہتے ہیں، رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے اور..... تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ عنایت اور اس کا باپ اپنی جگہ جو کچھ کر رہے تھے اس سلسلے میں مجھ تک متضاد آرا پہنچی تھیں اور اِدھر شرافت بی بی جس انداز میں سوچ رہی تھی وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی، چاہے اس کا یہ عمل شگفتہ کے سسرال والوں کے رویوں کے ردِعمل میں تھا۔ بہرحال، شرافت بی بی اس موڈ میں دکھائی دیتی تھی کہ اِدھر عنایت، شگفتہ کو رشتہ ازدواج سے آزاد کرے، اُدھر وہ اپنی بیٹی کو مہر مشتاق سے بیاہ دے۔

میرے لیے اب ٹوبہ ٹہلی والا میں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ میں جس مقصد کی خاطر وہاں پہنچا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا تھا۔ اگر عنایت حسین میرے ہتھے چڑھ جاتا تو خون آلود درانتی پر روشنی ڈال سکتا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شرافت بی بی سے کہا۔

''میں عنایت کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ اس نے ٹوبہ ٹہلی والا میں قدم نہیں رکھا۔ تمہارے خیال میں وہ مجھے کہاں مل سکتا ہے؟''

اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے شروع میں مجھے بتایا تھا کہ عنایت نے اپنے باپ کو اُدھر کوٹ فرمان روانہ کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اِدھر آنے کے بجائے وہ خود بھی اپنی بہن کے گھر چلا گیا ہو؟''

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے سر کو اثبات میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ عنایت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں لیکن اس بات کی وضاحت ابھی تک نہیں ہو سکی کہ آپ کو کس قسم کی معلومات چاہئیں؟''

''اگر عنایت حسین مل جاتا تو اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ یہاں آیا ہی نہیں۔ اب اس کی تلاش میں مجھے کوٹ فرمان تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سفر کرنا پڑے گا۔''

وہ بدستور بے اعتباری سے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں ایسا محسوس کر رہی ہوں کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ نہیں بتانا چاہتے، نہ بتائیں۔ آپ کی مرضی ہے لیکن اگر عنایت آپ کو کہیں مل جائے تو اسے اس بات کے لیے تیار کرنے کی کوشش کریں کہ وہ میری بیٹی کی جان چھوڑ دے۔''

''تو اس کا مطلب ہے تم نے شگفتہ کو مہر مشتاق سے بیاہنے کا پکا فیصلہ کرلیا ہے؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''شادی، شادمانی کا نام ہے تھانے دار صاحب! اگر انسان کی زندگی میں خوشی نہ ہو تو ایسے جینے کا کیا فائدہ؟''

''ہوں!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اگر میں اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا تو پکڑ کر سیدھا تو بہ تھلی والا لاؤں گا۔ پھر ساری باتیں اِدھر تمہارے گھر میں بیٹھ کر ہی ہوں گی۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔

میں اے ایس آئی بشارت مرزا کے ہمراہ شرافت بی بی کے گھر سے رُخصت ہونے لگا تو اسی وقت ایک گبرو جوان وہاں نمودار ہوا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے درمیان رہی ہوگی۔ مناسب قد و قامت کے ساتھ وہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی نظر مجھ سے ملی تو میں نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کہ وہ مجھے وہاں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔ اس چونکنے میں اچنبھے سے زیادہ تشویش شامل تھی۔ مجھے اس کا یہ ردعمل کچھ عجیب سا لگا۔

شرافت بی بی ہمیں رُخصت کرنے کے لیے دروازے تک چلی آئی تھی۔ وہ جلدی سے اس نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! یہ اپنا مشتاق ہے..... مہر مشتاق!''

پھر وہ مشتاق کی جانب مڑتے ہوئے بولی۔ ''مشتاقے پتر! یہ ملک صفدر حیات ہیں، اپنے علاقے کے تھانے دار۔ یہ اس لومڑ عنایت کے سلسلے میں تحقیقات کرنے ہمارے گھر آئے ہیں۔''

شرافت بی بی کا یہ اندازِ تعارف مجھے بالکل اچھا نہ لگا..... بلکہ بہت ناگوار گزرا۔ ٹھیک ہے، عنایت سے ان لوگوں کے کچھ اختلافات چل رہے تھے لیکن وہ بہرحال اس کا داماد تھا۔ اسے لومڑ کہہ کر بات کرنے کی کوئی تک بنتی تھی اور نہ ہی جواز نظر آتا تھا اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے سامنے جو اس کی بیٹی کے لیے اُمید لگائے بیٹھا تھا۔ ویسے تو مشتاق کی آمد کا انداز بھی مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا، وہاں اندر ہی اندر بڑی خطرناک کھچڑی پک رہی تھی۔

مشتاق نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ اس فضول آدمی کے بارے میں کس قسم کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ کیا اس نے کوئی قتل وغیرہ کردیا ہے؟''

میں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''جوان! اس نے کسی کو قتل کیا ہے یا وہ کسی کے ہاتھوں قتل ہوگیا ہے، اس حقیقت سے بہت جلد پردہ اٹھنے والا ہے۔''

میں نے مہر مشتاق کی آنکھوں میں ٹھہری تشویش کے سائے لہراتے دیکھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے اندر سے ہل کر رہ گیا تھا مگر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کریں جی..... تحقیق کریں۔ یہ بڑا نیک کام ہے.....!''

ہم شرافت بی بی کے گھر سے باہر نکل آئے۔ دروازے کے قریب ہی ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اے ایس آئی نے میرا اور اپنا گھوڑا کھولا پھر ہم ان گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوکر واپسی کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

ہم ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوئے تو اے ایس آئی نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! یہ بندہ مشتاق مجھے ٹھیک نہیں لگا۔''

میرا ذہن بھی اس وقت مسلسل مہر مشتاق کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ سرسری لہجے میں، میں نے اے ایس آئی سے کہا۔ ''کیا خرابی ہے اس میں؟ مجھے تو وہ اچھا خاصا لگا ہے۔ میں نے ابھی تک عنایت حسین کو نہیں دیکھا لیکن شگفتہ کو تو ہم دونوں ہی نے دیکھ لیا ہے۔ میرے خیال میں، شگفتہ اور مہر مشتاق کی جوڑی بڑی موزوں رہے گی۔''

''میں ان کی جوڑی یا شادی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''پھر..... پھر تمہارا کیا مطلب ہے؟'' میں نے پوچھ لیا۔

ایسی بات نہیں کہ میں بشارت مرزا کا مقصد نہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کس زاویے سے بول رہا ہے لیکن میں دانستہ اسے اِدھر اُدھر کر رہا تھا۔ دراصل، اس وقت میرا ذہن کئی محاذوں پر ایک ساتھ نبرد آزما تھا۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس کیا تھا کہ کوئی ہمارے تعاقب میں ہے۔ میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا، کون ہمارا پیچھا کر رہا ہے اور کیوں؟

اے ایس آئی نے میرے استفسار کے جواب میں کہا۔

''ملک صاحب! میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ ہمیں شرافت بی بی کے گھر میں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا جیسے اسے ہمارا وہاں آنا اچھا نہ لگا ہو۔ ہماری اس سے دوستی ہے اور نہ ہی دشمنی پھر اسے ایسے مشکوک رویے کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔ اس حوالے سے بھی مشتاق کا چونکنا اور بدکنا بڑا معنی خیز ہے۔ ایسا ردعمل تو وہی شخص پیش کر سکتا ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو..... یا جرم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

اے ایس آئی بشارت مرزا نے حالات و واقعات کا بڑا درست اور برمحل تجزیہ کیا تھا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی شخص نہایت ہی خفیہ انداز میں ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ کیا تم نے بھی ایسا ہی محسوس کیا؟''

میرے اس انکشافی سوال نے اے ایس آئی کو بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ بڑبڑانے والے انداز میں اس کے منہ سے نکلا۔ ''میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔''

''دھیان نہیں دیا..... تو دو!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

اگلے ہی لمحے وہ تصدیقی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ مجھے یقین تھا اس نے بھی متعاقب کی جھلک دیکھ لی تھی۔ سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں ملک صاحب لیکن..... وہ بندہ مہر مشتاق نہیں۔''

''وہ مہر مشتاق نہیں لیکن اسی کا متعین کردہ کوئی بندہ تو ہو سکتا ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ ہم کافی دیر سے شرافت بی بی کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر مشتاق واقعی کسی قسم کے جرم میں ملوث ہے یا ایسا کوئی ارادہ رکھتا ہے تو وہ ہماری نگرانی پر اپنے کسی بندے کو مامور بھی کر سکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''پھر کیا کرنا چاہیے۔ کیا اس بندے پر ہاتھ ڈال دیں؟''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میرا خیال ہے، اس متعاقب کو اپنے پیچھے لگا کر ٹوبہ ٹہلی والا سے باہر لاتے ہیں پھر اس کا مزاج بھی دریافت کر لیں گے۔''

اے ایس آئی نے میری تجویز سے اتفاق کیا لیکن ہم جیسے ہی گاؤں کی حدود سے باہر نکلے، متعاقب غائب ہو گیا۔ ہم نے کسی بہانے سے اپنے گھوڑوں کو روکا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے ہم اپنا گھوڑا بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن ہم اس توسط سے نامعلوم متعاقب کا ''جائزہ'' لینا چاہتے تھے۔ مگر ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ دور دور تک مذکورہ متعاقب کے آثار دکھائی نہ دیے۔

اے ایس آئی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''کیا خیال ہے ملک صاحب! واپس چل کر اس پُراسرار پیچھا کرنے والا کا کھوج لگائیں؟''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مجھے نہیں اُمید کہ وہ اب ہمارے ہاتھ آئے۔''

اے ایس آئی نے کہا۔ ''مجھے پورا شک ہے، وہ بندہ مشتاق ہی کا بھیجا ہوا ہے۔''

''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس بندے مہر مشتاق کی خفیہ نگرانی کرانا چاہتا ہوں تاکہ پتا تو چلے وہ کس قماش کا شخص ہے اور اس کے ارادے کیا ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ کسی فوری خیال کے تحت بولا۔ ''یہاں ٹوبہ ٹہلی والا میں میرے ایک دو جاننے والے ہیں۔ میں ان سے کام لے کر مہر مشتاق کے بارے میں مفید معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ آپ کہیں تو ابھی چلتے ہیں۔''

''ابھی واپسی کا رُخ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میں یہ کام تمہارے ذمے لگاتا ہوں۔ تم کل سے اس مشن پر لگ جاؤ۔ تم اور دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبلو یہاں آؤ لیکن خیال رہے کہ تمہیں یہ کام سادہ لباس میں رہتے ہوئے کرنا ہے تاکہ یہاں کسی کو پولیس کی سرگرمی کا احساس نہ ہو۔ تم اپنے قابل بھروسا جاننے والے سے ملو اور اپنے مطلب کی باتیں جاننے کی کوشش کرو۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبلو کو خصوصی ہدایت دے کر مہر مشتاق کی خفیہ اور محتاط نگرانی پر مامور کر دو۔ مجھے بہت جلد حوصلہ افزا نتائج چاہئیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں کل ہی اس مشن پر جت جاتا ہوں۔ بہت جلد آپ مجھے اس محاذ پر سرخرو ہوتا دیکھیں گے۔''

''انشاءاللہ۔'' میں نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ٹوبہ ٹہلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والا سے موضع سوہدرہ کلاں کی جانب سفر شروع کردیا۔ مغرب کی اذان سے قبل ہم تھانے پہنچ گئے۔

☆☆☆

آئندہ روز اے ایس آئی کوٹ بہلی والا بھیجنے کے بعد میں خود کوٹ فرمان کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے ساتھ حوالدار خوش بخت بھی تھا۔ دراصل خوش بخت بھی کوٹ فرمان ہی کا رہنے والا تھا اور وہاں کے ایک بندے سے بخوبی آشنا تھا اسی لیے میں نے خاص طور پر اسے اپنے ہمراہ کرلیا تھا تاکہ کسی معاملے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

کوٹ فرمان اور سوہدرہ کلاں میں کم و بیش چار میل کا فاصلہ حائل تھا اور یہ گاؤں ہمارے تھانے سے شمال میں واقع تھا۔ ہم دس بجے کے اریب قریب کوٹ فرمان پہنچ گئے۔ خوش بخت مجھے سیدھا شکور کے دروازے تک لے گیا اور میرا اشارہ پاتے ہی اس نے دروازے پر دستک بھی دے دی۔

شکور، کوٹ فرمان کا ایک چھوٹا زمیندار تھا اور رشتے میں وہ ہمارے مطلوبہ بندے یعنی عنایت حسین کا بہنوئی تھا۔ اس کی پانچ اولادیں تھیں اور وہ طویل عرصے سے یہاں رہ رہا تھا۔ حوالدار خوش بخت کی رپورٹ کے مطابق شکور ایک امن پسند اور صلح جو شخص تھا۔ لڑائی بھڑائی اور فتنہ پروری کے کاموں سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

غلام لوہار کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ عنایت نے سوہدرہ کلاں چھوڑنے سے دو تین روز قبل اپنے باپ کرامت حسین کو کوٹ فرمان بھیج دیا تھا کہ چند روز اپنی بیٹی صغریٰ کے پاس رہ آئے۔ عنایت کے بارے میں عمومی رائے یہ تھی کہ وہ مکان اور زمین کی فروخت کے بعد اپنی سسرال کو پیارا ہوگیا ہوگا اسی لیے میں نے سب سے پہلے ٹوبہ ٹہلی والا کو چیک کیا تھا لیکن عنایت کی وہاں موجودگی کے آثار نہیں ملے تھے۔

دستک کے جواب میں ایک بارہ تیرہ سالہ بچے نے دروازہ کھولا۔ وہ خوش بخت کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اتفاق سے اس وقت شکور گھر پر موجود تھا۔ جلد ہی ہم اس گھر کی بیٹھک میں بیٹھے شکور اور اس کی بیوی کو اپنی آمد کی غرض و غایت بتا رہے تھے۔

انہوں نے پوری توجہ سے میری بیان کردہ کہانی سنی اور ہکا بکا رہ گئے۔ شکور نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''چاچا کرامت تو ایک طویل عرصے سے ہمارے گھر نہیں آیا حالانکہ میری تو ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اِدھر ہی ٹھہر جائے۔ بڑھاپے میں بہو کے ہاتھوں اپنی مٹی خراب نہ کرائے لیکن وہ سنتا ہی نہیں۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ بیٹی کے در پر پڑے رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ آپ نے عنایت کی بھی بڑی خوب کہانی سنائی ہے۔ ہمیں اس بارے میں کچھ خبر نہیں کہ عنایت نے اپنا گھر بار فروخت کردیا ہے۔ آپ کی بات پر یقین کررہا ہوں لیکن میرے خیال میں عنایت نے زمین بیچ کر زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ زمیندار تو زمین کو پھیلانے بڑھانے کے چکر میں رہتا ہے اور وہ.....'' اس نے جملہ افسوس ناک انداز میں ادھورا چھوڑا اور نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں اپنی کہانی میں انہیں یہ بھی بتا چکا تھا کہ عنایت کی تلاش میں، میں ٹوبہ ٹہلی والا کی خاک چھان چکا ہوں۔ اسی تناظر میں صغریٰ بی بی نے کہا۔

''اباجی یہاں نہیں پہنچے اور عنایتا اُدھر ٹوبہ ٹہلی والا نہیں گیا تو پھر یہ دونوں کہاں غائب ہیں؟''

''یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔'' میں نے اُلجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔'' صغریٰ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا اور پوچھ لیا۔ ''کیسا چکر؟''

''یہ شرافت بی بی بڑی بدمعاش عورت ہے۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جو عورت اپنی بیٹی کا گھر بسنے نہ دے وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ مجھے شک ہے، اسی نے عنایتا اور اباجی کو کہیں غائب کیا ہے۔''

صغریٰ دور کی کوڑی لائی تھی۔ میں گزشتہ روز شرافت بی بی سے ایک بھرپور ملاقات کرکے آیا تھا۔ مجھے بھی وہ خاصی تیز طرار اور موقع پرست لگی تھی لیکن وہ اپنے سمدھی اور داماد کو کہیں غائب بھی کرواسکتی ہے اس بارے میں، میں نے نہیں سوچا تھا البتہ میں نے یہ واضح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ وہ شگفتہ کو عنایت سے طلاق دلوا کر بہر مشتاق سے بیاہنے کی خواہاں تھی۔ صغریٰ چونکہ شگفتہ کی نند تھی اس لیے اس کی سوچ کا زاویہ قدرے مختلف تھا۔ میں نے اس کا مؤقف جاننے کے لیے پوچھ لیا۔

''کیا وہ اتنا بڑا اقدم اٹھا سکتی ہے؟'' میرا اشارہ شرافت بی بی کی طرف تھا۔

وہ زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ اس عورت کی مکاریوں اور چال بازیوں سے واقف نہیں ہیں۔ وہ صرف نام کی شرافت بی بی ہے ورنہ.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

توبہ توبہ!'' اس نے ذرا توقف کر کے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولی۔

''اگر وہ واقعی بھلی مانس اور شریف عورت ہوتی تو بیٹی کے گھر کا سکون برباد کرنے کی کوشش کبھی نہ کرتی۔ عنایت کے گھر میں شگفتہ کو آخر تکلیف ہی کیا ہے لیکن ماں اس کے کان بھرتی ہے کہ اپنے خاوند کو تنگ کرو تاکہ وہ بوڑھے اباجی کو گھر سے نکال دے۔ آپ خود بتائیں تھانے دار صاحب! اباجی اس عمر میں کہاں جائیں۔ آپ جانتے ہیں، بڑھاپے میں انسان بڑا چڑچڑا اور تنقیدی ہو جاتا ہے۔ اباجی کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ کوئی غلط بات دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ شگفتہ کی جو حرکتیں اور چھن ہیں وہ اباجی کو اچھے نہیں لگتے۔ وہ اسے گاہے بہ گاہے روکتے ٹوکتے رہتے تھے اور یہی بات اسے منظور نہ تھی اسی لیے آئے دن گھر میں فساد ڈال کر وہ میکے چلی جاتی ہے۔ میں نے اباجی کی منت کی ہے کہ وہ ہمارے پاس آ جائیں لیکن وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ کو پتا نہیں، یہ شرافت بی بی کتنی کمینی عورت ہے۔ وہ ہر بار عنایتا سے یہی مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اباجی کو گھر سے باہر کرے پھر شگفتہ اس گھر میں قدم رکھے گی۔ عنایتا ان سے جھوٹا سچا وعدہ کر کے بیوی کو گھر لے آتا ہے لیکن بتائیں، وہ باپ کو کیسے گھر سے نکال دے۔ وہ باپ جس کے سائے میں ہم پل بڑھ کر بڑے ہوئے ہیں۔ اس نے خود کو بھوکا رکھ کر ہمارا پیٹ بھرا ہے۔ وہ خود کڑی دھوپ میں جلا ہوگا لیکن گرم ہوا کا ایک جھونکا ہم تک نہیں پہنچنے دیا۔ ہماری ماں چھوٹی سی عمر میں ہمیں چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ اباجی نے ہمیں ماں بن کر پالا ہے اور ایک باپ بن کر پروان چڑھایا ہے۔ ایسے سایہ دار درخت کو کوئی کیسے کاٹ کر پھینک سکتا تھا۔''

وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی اور میں نے اس کے بیان میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تاکہ اس کے دل کا غبار ڈھل جائے۔ پتا نہیں، کب سے اس نے یہ طوفان اپنے سینے میں باندھ رکھا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ اس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار صاحب! میں نے عنایتا کو بہت سمجھایا ہے۔ شکور نے بھی کہا ہے کہ شگفتہ جب اس کے گھر میں نہیں بسنا چاہتی تو لعنت بھیجے اس پر۔ ہم کسی اچھی اور بھلی مانس لڑکی سے خود اس کی شادی کرائیں گے۔ اولاد ہو جائے تو اس رشتے کو توڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ بھی نہیں مگر عنایتا مانتا ہی نہیں۔ وہ کسی بھی صورت شگفتہ کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔ لگتا ہے ان ماں بیٹی نے اس پر کالا جادو کر دیا ہے یا اسے اُلو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ ویسے یہ شگفتہ کمبخت ہے بھی تو اتنی خوبصورت نا.....!''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر اچانک خاموش ہوگئی۔ میں چونکہ گزشتہ روز خود اپنی آنکھوں سے شگفتہ کو دیکھ چکا تھا لہٰذا یہ سمجھنے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ صغریٰ بی بی کہنا چاہتی تھی..... کمبخت شگفتہ اتنی خوبصورت بلا ہے کہ کوئی بھی مرد آسانی سے اسے چھوڑنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔

ہم نے آدھا پونا گھنٹا شکور زمیندار کے گھر میں گزارا پھر وہاں سے اٹھ گئے۔ طے یہی پایا تھا کہ اگر مجھے عنایت اور کرامت کی کوئی خبر ملے تو میں انہیں اطلاع کر دوں گا اور اگر وہ لوگ ان کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں تو فوراً تھانے آ کر مجھے خبر کریں گے۔

ہم شکور کے گھر سے نکلے تو حوالدار خوش بخت ضد کر کے مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اسی کے گھر میں کھایا پھر ظہر کی نماز کوٹ فرمان کی مسجد میں ادا کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے۔

☆☆☆

آنے والے تین روز کسی قابلِ ذکر کارروائی کے بغیر ہی گزر گئے۔ ٹوبہ ٹہلی والا سے گاہے بہ گاہے مجھے رپورٹ مل رہی تھی لیکن اس رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر فوراً حرکت میں آ جاتا۔ مہر مشتاق کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ بہت ہی جوشیلا اور جی دار جوان ہے لیکن وہ کسی ایسی کارروائی میں ملوث نہیں پایا گیا تھا کہ اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاتی البتہ یہ خبر مجھ تک پہنچی تھی کہ وہ نہایت پابندی کے ساتھ آزادانہ طور پر شرافت بی بی کے گھر آتا جاتا ہے۔ جس گھر کے لوگ خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں وہاں کوئی کیوں نہیں جائے گا۔

مزید ایک ہفتے تک میں نے عنایت اور کرامت کی تلاش کا کام جاری رکھا۔ میں نے اپنے بندے اردگرد کے گاؤں دیہات میں دور تک پھیلا دیے تھے اور انہیں سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان باپ بیٹے میں سے جو بھی اور جس حالت میں بھی نظر آئے اسے فی الفور میرے سامنے حاضر کیا جائے۔ ایسی متلاشی ہر ٹیم کے ساتھ میں نے ایک ایک ایسے مقامی بندے کو بھی نتھی کر دیا تھا جو عنایت اور کرامت کا صورت آشنا تھا تاکہ پولیس پارٹی کو ان کی تلاش اور شناخت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سلسلے میں وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جب تک عنایت میرے ہتھے نہ چڑھتا، خون آلود درانتی کا معما حل نہیں ہوسکتا تھا جب تک یہ معما حل نہ ہوتا، میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اسی بھاگ دوڑ اور ادھیڑ بن میں پندرہ روز گزر گئے لیکن کامیابی کا کوئی کونا، کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ میں جھنجلاہٹ میں مبتلا ہونے لگا۔ ممکن تھا کہ میں ہمت ہار کر اس کیس کی فائل کو داخلِ دفتر کردیتا کہ ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آ گیا۔

ایک صبح میں تھانے میں آ کر اپنی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے اطلاع ملی کوئی شخص بیری والے کھوہ میں گر گیا ہے۔ بیری والا کھوہ (کنواں) موضع سوہدرہ کلاں کی حدود میں ہی واقع تھا۔ یہ ایک متروک کنواں تھا لیکن پچھلے دنوں ہونے والی لگاتار بارشوں نے دیگر گڑھوں کے ساتھ اس میں بھی اچھا خاصا پانی بھر دیا تھا۔ کسی شخص کے متروک کنویں میں گرنے کی خبر خاصی سنسنی خیز تھی چنانچہ میں حوالدار خوش بخت اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر فوراً جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔

موقع پر لگ بھگ درجن بھر افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے ساتھ ہی جائے حادثہ پر بھگدڑ مچ گئی۔ میں کنویں کی منڈیر پر پہنچا اور اُکڑوں بیٹھ کر اندر جھانکا۔ کنویں کے اندر خطرناک حد تک برساتی پانی موجود تھا اور اس پانی میں کوئی شے ڈوب اُبھر رہی تھی۔ میں نے ''شے'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ مجھے اس کے خدوخال واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اس شے (شخص) کو کنویں سے باہر نکالنے کا تھا اور اس سلسلے کے حل کے لیے کنویں کے اندر اترنا ضروری تھا۔ میں نے وہاں پر موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی مضبوط رسے کا فوراً انتظام کرو۔''

ایک شخص نے آگے بڑھ کر مجھے مطلع کیا۔ ''تھانے دار صاحب! عبدالرحمٰن رسا لینے ہی گیا ہے۔'' پھر اس نے گاؤں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا اور قدرے مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''شاید..... وہ واپس آ رہا ہے..... اس کے ہاتھ میں رسا بھی دکھائی دے رہا ہے۔''

وہاں پر موجود افراد کی نظریں دور سے آتے ہوئے عبدالرحمٰن نامی اس شخص پر جم گئیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اسی عبدالرحمٰن نے ایک بندے کو کنویں میں گرے ہوئے دیکھا تھا۔ عبدالرحمٰن اس وقت اپنے کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ اس نے آواز دے کر چند لوگوں کو کنویں کے پاس جمع کرلیا تھا پھر وہ خود رسا لینے اپنے گھر کی سمت روانہ ہوگیا تھا۔

عبدالرحمٰن رسا لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ اس مسئلے کا ایک مرحلہ طے ہوگیا تھا۔ دوسرا مرحلہ کنویں کے اندر اترنے اور ڈوبتے ہوئے شخص کو باہر نکالنے کا تھا اور یہ خاصا مشکل اور آزمائشی مرحلہ تھا۔ کنویں کے اندر کھڑا پانی پگھلی ہوئی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا اور اوپر سے موسم کے تیور بھی بڑے خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ رگوں میں خون منجمد کردینے والی یخ بستہ ہوائیں فضا میں ہر طرف چکراتی پھر رہی تھیں۔ میں نے وہاں موجود افراد کے چہروں کا جائزہ لیا اور ہر چہرے پر ایک ہی سوال کو مجسم پایا..... کنویں میں کون اترے گا؟

یہ ایک ایسا ہی سوال تھا جیسے ہر چوہا دوسرے چوہوں سے پوچھ رہا ہو..... بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟

اس دوران میں عبدالرحمٰن نے گھر سے لائے ہوئے رسے کا ایک سرا نزدیکی درخت کے تنے کے ساتھ نہایت ہی مضبوطی سے گرہیں دے کر باندھ دیا۔ رسے کے دوسرے آزاد سرے سے باآسانی کنویں میں اترا جاسکتا تھا۔ عبدالرحمٰن کی پُرعزم حرکات وسکنات نے فوراً سے پیشتر مجھے بتادیا کہ وہ درجن بھر چوہوں میں خود کو شیر ببر ثابت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

عبدالرحمٰن کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی مگر مسلسل محنت اور کسرت نے اس کے وجود کو تندرستی اور توانائی بخش رکھی تھی۔ مضبوط کاٹھی کا مالک عبدالرحمٰن اب بھی کئی جوانوں سے زیادہ جوان تھا۔ وہ رسے کا آزاد سرا تھامے کنویں کی منڈیر کی جانب بڑھنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔

وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے رسا لے لیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عبدالرحمٰن! تم نے جتنا کردیا وہی کافی ہے۔ اب قانون کی باری ہے۔''

وہ کوئی سوال، کوئی اعتراض کیے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔

اسی لمحے حوالدار خوش بخت تیزی سے آگے بڑھا اور میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے ولولہ انگیز لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میرے ہوتے ہوئے آپ یہ نہیں کرسکتے۔''

حوالدار کا انداز اتنا حتمی اور دوٹوک تھا کہ میں سوچ میں پڑ گیا لیکن فیصلہ کرنے میں، میں نے ایک سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لیا اور رسا حوالدار کی طرف بڑھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''خوش بخت! تم نے مگرمچھ کی چربی سے تیار ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والے گھی میں گوشت بھون بھون کر کھایا ہوا ہے۔ یہ سردی تمہارا کیا بگاڑے گی۔ تم خوشی سے اپنا شوق پورا کر سکتے ہو۔''

وہ پھول کر جی داری کی ہمت کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ جب وہ بڑی مہارت سے کنویں کی دیوار کے ساتھ پاؤں ٹکا کر رسے کی مدد سے اندر اتر رہا تھا تو اس کی فخریہ جوش بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ملک صاحب! آج آپ کو میری بات کا یقین آجائے گا اور آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ میرے جسم میں چبھنے والی سوئیوں کا سبب اور بی کمپلیکس کی کمی نہیں بلکہ یہ تو مگر مچھ مار کا اصلی گھی کا کرشمہ ہے۔''

پندرہ بیس منٹ کی کھینچا تانی کے بعد ہم خوش بخت کے تعاون سے اس مصیبت زدہ شخص کو کنویں سے باہر لانے میں کامیاب ہو گئے اور اسی لمحے مجھے ماننا پڑا کہ حوالدار کی چربی میں ضرور کسی مگر مچھ کی چربی شامل ہو گئی ہے۔ موسم کی شدت اس پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نگاہ جما کر تعریفی انداز میں اسے دیکھا اور متاثرہ شخص کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس شخص کے سر اور شیو کے بال بے طرح بڑھے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کئی ماہ سے اس نے اس طرف توجہ نہ دی ہو۔ جسم پر موجود کپڑے بھی بے حد میلے تھے پھر ٹھنڈے ٹھار پانی میں گرنے کے سبب اس کی حالت اور بھی مخدوش اور غیر ہو رہی تھی۔

موقع پر موجود ہر شخص تنقیدی نظر سے اسے دیکھ رہا تھا پھر کسی شخص کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میری سماعت تک ان الفاظ نے رسائی حاصل کی۔

''یہ تو عنایت حسین ہے..... دیکھو ذرا، اس نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔''

اس شخص کا یہ انکشافی جملہ ٹھہرے ہوئے تالاب میں پہلا پتھر ثابت ہوا۔ ان تمام افراد کا تعلق سوہدرہ کلاں سے تھا لہٰذا طرح طرح کے تصدیقی اور تحیر آمیز جملے میری سماعت تک پہنچنے لگے اور ان تبصروں کا لب لباب یہ تھا کہ حوالدار خوش بخت نے بے مثال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس شخص کو متروک کنویں سے باہر نکالا تھا وہ عنایت حسین ولد کرامت حسین سابقہ سکنہ موضع سوہدرہ کلاں تھا..... وہی عنایت حسین جس کی تلاش میں، میں پچھلے بیس پچیس دن سے بے قرار تھا۔ وہ مجھے ملا بھی تو اس حالت میں کہ میں اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

میں نے فوری اور ہنگامی انتظامات کے تحت عنایت حسین کو اسپتال بھجوا دیا اور اس کے ساتھ ہی کوٹ فرمان اور ٹوبہ ٹہلی والا بندے دوڑا دیے تاکہ عنایت کے ورثا کو اس کی بازیابی کی خبر ہو جائے۔

ٹوبہ ٹہلی والا سے تو کوئی نہ آیا لیکن شام سے پہلے صغریٰ اپنے خاوند شکور کے ہمراہ میرے پاس پہنچ گئی۔ میں ان دونوں کو اپنے ساتھ اسپتال لے گیا۔ ڈاکٹر سے ملاقات کی تو اس نے مجھے بتایا۔

''ملک صاحب! ہم نے بندے کو ضروری ٹریٹمنٹ دے دیا ہے اور اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اسپتال سے لے جا سکتے ہیں۔'' لمحے بھر کا توقف کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''بائی دا وے ملک صاحب! یہ پاگل آپ کو ملا کہاں سے؟''

''پاگل؟'' میں نے بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''اس شخص کا ذہنی توازن اپنے ٹھکانے پر نہیں۔ میں نے مختلف ترکیبوں سے اچھی طرح اسے ٹیسٹ کیا ہے۔ یہ شخص سو فیصد پاگل ہے۔ لگتا ہے کسی شدید ترین صدمے نے اس کا دماغ اُلٹ دیا ہے۔ آپ اسے پاگل خانے میں جمع کرا دیں تو اچھا ہے۔ یہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ خود کو نوچتا ہے، دانتوں سے کاٹتا ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مخصوص جملے دُہرانے لگتا ہے پھر دیوار سے سر ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے بڑی مشکل سے اسے کنٹرول کر رکھا ہے۔''

ڈاکٹر کی رپورٹ نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں اس کی ماہرانہ اور پیشہ ورانہ رائے کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا تجسس سے لبریز لہجے میں پوچھ لیا۔ ''وہ کس قسم کے مخصوص جملے دُہراتا ہے؟''

''مثلاً..... میں بہت ظالم انسان ہوں۔ میں نے اپنے باپ پر بہت ظلم کیا اور وہ بھی ایک عورت کی خاطر..... بیوی کی خوشنودی کے لیے انسان کو اپنی جڑ کا دشمن تو نہیں ہو جانا چاہیے نا؟ اس نے کہا، اپنے باپ کا بندوبست کر لو..... اور میں نے بندوبست کر دیا۔ مجھے جتنی بھی عبرت ناک سزا دی جائے وہ کم ہے لیکن..... کوئی میری بات کا یقین نہیں کرتا۔ لوگ مجھے سزا دینے کے بجائے مجھ پر ترس کھاتے ہیں اور مجھے پاگل دیوانہ سمجھتے ہیں جبکہ میں پاگل نہیں ہوں۔ وہ پاگل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں جو میری بات نہیں سمجھتے۔ میں نے کتنی مرتبہ مرنے کی کوشش کی مگر مجھے بچالیا جاتا ہے۔ میں اندھے کنویں میں کودا۔ خیال تھا کہ کسی نے مجھے خودکشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا لیکن میری قسمت بری کہ ایک مرتبہ پھر مجھے بچالیا گیا۔ واقعی..... میرا جرم اتنا بڑا ہے کہ مجھے بار بار مارا اور بچایا جائے گا۔ میں پاگل نہیں ہوں..... اس قسم کے جملے بول کر وہ دیواروں سے سر ٹکرانے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔''

ڈاکٹر مجھے عنایت حسین کی دماغی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں اپنے تصور میں سجی دندانے دار خون آلود درانتی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منحوس درانتی جس کے بے رحم پھل سے عنایت حسین نے اس مہربان اور سایہ دار درخت کی جڑ کاٹ ڈالی تھی جو بچپن سے اب تک اس پر سایہ فگن رہا تھا۔ زندگی کی راہ میں بچھے کانٹوں کو اس نے اپنے وجود میں اتار کر عنایت کے لیے نرم و گداز آغوش وا کی تھی۔ وہ زندگی بھر کڑی دھوپ میں جلا تھا مگر اس دھوپ کی ایک موہوم سی کرن بھی اس نے عنایت کے چہرے تک نہیں پہنچنے دی تھی کہ کہیں وہ معصوم ذرا سی تپش سے کملا نہ جائے۔

والدین کس طرح خونِ جگر پلا پلا کر اپنی اولاد کو پروان چڑھاتے ہیں لیکن بڑا ہونے کے بعد بعض نامعقول اور سفاک اولادیں اس چراغ کو گل کرنے سے بھی نہیں چوکتیں جس کی مستعار روشنی سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہو۔ اس وقت میرے دل سے بے ساختہ یہ دُعا نکلی۔

''اے میرے پروردگار! تُو ہر بے رحم اور سفاک شخص کو صاحبِ اولاد کر دے۔''

پتا نہیں یہ دُعا تھی یا بددُعا! لیکن یہ حقیقت ہے کہ والدین کے دُکھ درد کو اس وقت تک حقیقی معنوں میں محسوس نہیں کیا جاسکتا جب تک انسان خود والدین کے درجے تک نہ پہنچ جائے۔

میں نے خود وارڈ میں جا کر بھی عنایت کی حالت کا جائزہ لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ حرف بہ حرف دُرست تھا۔ واقعی عنایت حسین کا دماغ پھر گیا تھا اور وہ اس حالت میں جو کچھ بھی بک رہا تھا وہ درحقیقت اس کا اقرارِ جرم تھا۔

میں نے عنایت حسین کو صغریٰ اور شکور کے حوالے کر دیا اور کرامت علی کی لاش کی بازیابی کے لیے ایک مرتبہ پھر سرگرمِ عمل ہوگیا۔ آلۂ قتل وہ خون آلود درانتی میرے قبضے میں تھی۔ میں نے اس تلاش کا آغاز ماسٹر جمیل کے گھر سے کیا۔

پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماسٹر جمیل کو ملنے والی درانتی کتنی افسوس ناک اور گمبھیر کہانی کو جنم دے گی۔ ماسٹر کے گھر (جو کچھ عرصہ پہلے عنایت حسین کا گھر ہوا کرتا تھا) کا جائزہ لیتے ہوئے میں مکان کے عقبی حصے میں بھی گیا تھا جدھر تنور اور مویشیوں کی کنڈلی بنی ہوئی تھی۔ اس حصے کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس وقت میں اپنے اس احساس کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا لیکن اب میرا ذہن چیخ چیخ کر مجھے مطلع کر رہا تھا کہ مجھے مکان کے اسی حصے میں کرامت حسین کی لاش کو تلاش کرنا چاہیے۔

میں بڑی پیشہ ورانہ باریکی سے ایک ایک شے کو کھوجتا ہوا بالآخر اس کونے تک جا پہنچا جہاں خشک لکڑیوں اور اُپلوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ میں نے ان اُپلوں اور لکڑیوں کو ہٹوا کر زمین کا معائنہ کیا تو یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہاں ایسے آثار موجود تھے جیسے وہاں کی زمین کو کھود کر دوبارہ بھرا گیا ہو۔

میرے لیے اتنا اشارہ ہی کافی تھا۔ میں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بندوں کو حکم دیا کہ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں کھدائی شروع کریں۔ میرا یہ فیصلہ بہت سود مند ثابت ہوا۔ ابھی ان لوگوں نے زمین کو ڈیڑھ دو فٹ گہرائی تک ہی کھودا تھا کہ کرامت حسین کی لاش جلوہ افروز ہوگئی۔ ہم نے جب اس لاش کو باآسانی باہر نکالا تو میرا اندازہ صد فیصد دُرست ثابت ہوا۔ کرامت حسین کو درانتی کی مدد سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ عنایت کی اس سفاکی اور بربریت پر میری گردن ندامت سے جھک گئی۔

عنایت ایسا نابکار اور نامعقول شخص اس دنیا کی سخت ترین سزا کا مستوجب تھا لیکن افسوس کہ میں اسے کوئی سزا دلوانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ بعض معاملات میں دستِ قدرت اتنی سرعت سے حرکت میں آتا ہے کہ دنیاوی قانون و قاعدے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس ذاتِ پاک نے عنایت کو ایسے عبرت ناک عذاب میں مبتلا کر دیا تھا کہ دیکھنے والوں کے لیے ایک زندہ سبق تھا۔

ڈاکٹر نے مجھے بڑے ٹھوس الفاظ میں باور کرا دیا تھا کہ عنایت کا پاگل پن عارضی اور قابلِ علاج نہیں تھا۔ وہ جب تک بھی زندہ رہتا، اسے اسی طرح خود کو نوچنا اور کھسوٹنا تھا..... اور کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ وہ کتنے عرصے تک زندہ رہے گا، سوائے اس قدرت کے۔

قدرت جب براہِ راست کسی شخص سے انتقام لینے پر آتی ہے تو ایسے ہی دیدۂ عبرت تماشے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

(تحریر: حُسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گناہ کبیرہ

ملک صفدر حیات

جعلی عاملوں ، پیروں ، فقیروں اور بہروپیوں کے افسوس ناک کرتوت آئے روز سامنے آتے رہتے ہیں .ملک صاحب کی یادداشتوں سے منتخب یہ واقعہ بھی ایک ایسے ہی بہروپیے کا ہے. معصوم اور سیدھے سادے لوگوں کی دولت اور عزت سے کھیلنا جس کا مشغلہ تھا اس کے چیلے بھی اس گناہ میں اس سے پیچھے نہ تھے پھر یہ معاملہ ملک صاحب تک پہنچا ...لیکن افسوس ناک واقعہ پیش آ چکا تھا !

گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے بچے کے باپ کے ساتھ اس کا چاچا بھی آیا تھا۔ دونوں بھائیوں میں گہری مماثلت پائی جاتی تھی۔ میں نے انہیں اپنے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی بتائیں، آپ کا معاملہ کیا ہے؟''

''میرا بیٹا گم ہوگیا ہے تھانے دار صاحب!'' بڑے بھائی نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ''ہم اسی کے بارے میں رپورٹ لکھوانے آئے ہیں۔''

میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی... میرا نام اللہ بخش ہے۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا چھوٹا بھائی نبی بخش ہے اور... میرا جو بچہ گم ہوا ہے، اس کا نام قادر بخش ہے۔''

بہت سارے ''بخش'' ایک ہی جگہ پر جمع ہو گئے تھے۔ میں نے بہ غور دونوں بھائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا آپ لوگ اسی قصبے کے رہنے والے ہو؟''

''جی، تھانے دار صاحب!'' اللہ بخش اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم تین پیڑھیوں سے ادھر ہی رتن گڑھ میں رہ رہے ہیں۔''

مجھے قصبہ رتن گڑھ میں تعینات ہوئے لگ بھگ دو ماہ ہوئے تھے۔ رتن گڑھ خاصا گنجان اور بڑا قصبہ تھا۔ ڈھائی سے تین سو تک گھر وہاں آباد تھے۔ ظاہر ہے، وہاں کم از کم ایک ہزار افراد تو بستے ہی ہوں گے۔ میں ایک ایک کے چہرے سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ پچھلے دو ماہ میں، میں نے تھانے کے معاملات اور مسائل کو تو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اب وہاں کے لوگوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا وقت تھا۔ میں نے گم شدہ بچے کے باپ اللہ بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہارے بچے کی عمر کتنی ہے؟''

''دس سال!'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''یہ میرا بڑا لڑکا ہے۔ قادرا سے چھوٹی بچی خالدہ ہے جس کی عمر لگ بھگ سال ہوگی۔''

میں نے خالدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے گمشدہ قادر بخش عرف قادرا پر توجہ مرکوز کر دی اور پوچھا۔ ''قادرا کب سے گم ہے؟''

''کل رات سے جناب۔'' اس مرتبہ بچے کے چاچا نبی بخش نے جواب دیا۔

میں نے قادرا کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اللہ بخش! تم نے اپنے بیٹے کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ابھی تک کیا کوششیں کی ہیں؟''

''بس جی..... ابھی تک تو گاؤں ہی میں ڈھونڈا ہے۔'' وہ مایوس بھرے لہجے میں بولا۔

''اس کے یار دوستوں سے پوچھا ہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ اس قصبے میں تو کہیں نظر نہیں آیا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہر طرف سے ناکامیاب اور نامراد ہو کر تو آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''وہ قصبے میں کہیں نظر نہیں آیا۔'' میں نے اللہ بخش کے ایک جملے کو پُرسوچ انداز میں دہرایا اور کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ موضع رتن گڑھ میں موجود ہی نہیں... اگر قادرا رتن گڑھ میں نہیں اور کہیں باہر چلا گیا ہے تو پھر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنی مرضی سے کہیں گیا ہے یا اسے زبردستی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے جایا گیا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں ذرا توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''رتن گڑھ سے باہر تمہارے قریبی رشتے دار کہاں کہاں رہتے ہیں؟''

نبی بخش نے جواب دیا۔ ''جناب! ہم کل تین بھائی بہن ہیں۔ دو بھائی تو ہم اس وقت آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہماری اکلوتی بہن جو ہم دونوں سے بڑی بھی ہے، اس کا نام سلمٰی ہے اور وہ شادی شدہ ہے جو کہ جمال پور میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس کے علاوہ قادرا کانا نکا (ننھیال) ہے۔ اس کا ماما کریم بخش، تاج نگر میں رہتا ہے اور نانی وغیرہ کا گھر کرم آباد میں ہے۔ بس کل یہی ہماری برادری ہے..... میری سسرال تو ادھر رتن گڑھ ہی میں ہے جناب!''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد نامی یہ گاؤں موضع رتن گڑھ کے گرد و نواح میں واقع تھے۔ جمال پور آٹھ میل مغرب میں، تاج نگر تین میل مشرق میں اور کرم آباد پانچ میل شمال میں۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر قادرا کے باپ نے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! کہیں آپ ایسا تو نہیں سوچ رہے کہ قادرا اپنے کسی رشتے دار کے گھر چلا گیا ہوگا؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس رخ پر سوچنا مناسب نہیں ہے۔ کیا تمہارا بیٹا اپنے کسی رشتے دار کے گھر اس سے ملنے نہیں جا سکتا؟''

''جانے میں کوئی حرج یا قباحت تو نہیں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن پہلے ایسا کبھی ہوا نہیں۔ قادرا اکیلا کبھی گاؤں سے باہر نہیں گیا اور وہ بھی ہمیں بتائے بغیر۔''

''جو بات کبھی نہیں ہوئی ہوتی وہ جب ہوتی ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ ایسا تو پہلی بار ہوا ہے۔'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا پھر اللہ بخش کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''آج پندرہ اگست ہے اور کل چودہ اگست کی تاریخ تھی یعنی یوم آزادی..... ذرا سوچ کر بتائیں، کل گھر میں کسی نے اسے ڈانٹا ڈپٹا تو نہیں..... یا کسی بات پر اس کی پٹائی ہوئی ہو۔ بچے عموماً اس قسم کی صورتِ حال میں بھی گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔''

''ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جناب۔'' نبی بخش نے پُروثوق لہجے میں کہا۔ ''وہ تو گھر میں سب کا بڑا لاڈلا تھا، سب اس سے محبت کرتے تھے۔ مارنا پیٹنا تو دور کی بات ہے، اسے تو کبھی کسی نے غصے میں ڈانٹا بھی نہیں۔''

''تم کیا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہو؟'' میں نے نبی بخش کو گھور کر دیکھا۔ ''جو تمہیں اندر کی اتنی باتیں معلوم ہیں؟''

''ہم دونوں بھائی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔'' نبی بخش نے جواب دیا۔ ''بس درمیان میں ہم نے ایک دیوار کھینچ رکھی ہے تاکہ دو خاندانوں کی زندگی ایک جگہ بھی رہے اور الگ الگ بھی۔ ویسے اس دیوار کے باوجود بھی ہمارا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا ہے لہٰذا اِدھر اُدھر کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل ہوتی رہتی ہے۔''

''وہ کسی بات پر گھر سے ناراض ہو کر نہیں گیا۔ کسی نے اسے گھر سے نہیں نکالا۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ اس کی گمشدگی میں کسی اور کا ہاتھ ہے..... کسی نے اسے غائب کیا ہے!''

''ایسا کون کر سکتا ہے جناب.....؟'' اللہ بخش نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تو میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن تفتیش کے بعد سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا اور اس کام کے لیے آپ لوگوں کو مجھ سے پورا تعاون کرنا ہوگا۔''

''ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔'' اللہ بخش نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں تو چاہتا ہوں، جلد از جلد میرا بچہ مجھے مل جائے۔ بتائیں..... میں آپ سے کیا تعاون کروں؟''

''سب سے پہلے تو تم یہ کرو کہ قادرا کی ایک تصویر لا کر مجھے دو۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ اسے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔''

''تصویر والی بات تو ممکن نہیں.....'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''ہم لوگوں نے کبھی کوئی فوٹو کھنچوائی ہی نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں خود..... یا کسی اور کے تعاون سے ایک کام کرو۔ کسی طرح جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد جا کر یہ جاننے کی کوشش کرو کہ کہیں قادرا وہاں کسی گھر میں تو موجود نہیں۔ اگر وہ وہاں نہیں پایا جاتا تو پھر یہ بات حتمی شکل اختیار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لے گی کہ اسے بہلا پھسلا کر یا زبردستی کسی نے غائب کیا ہے۔''

''یہ کام میں شام سے پہلے پہلے کر کے آپ کو رپورٹ دیتا ہوں تھانیدار صاحب!'' قادرا کے چاچا نبی بخش نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں بھائی اللہ بخش کو زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی مدد کے لیے دونوں سالوں کو ساتھ لے جاتا ہوں..... وہ دونوں ویسے بھی آج کل فارغ ہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''نبی بخش! تم فوری طور پر اس نیک کام کے لیے روانہ ہو جاؤ اور رات تک واپس آ کر مجھے وہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتاؤ۔ ابھی دن کا آغاز ہی ہوا ہے۔ تمہارے پاس کافی وقت ہے اس مشن کے لیے۔''

تھوڑی دیر کے بعد نبی بخش مجھ سے ضروری ہدایات لے کر رخصت ہو گیا تو میں نے قادرا کے باپ اللہ بخش کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اللہ بخش! تم نے بتایا ہے کہ قادرا کے بارے میں اس کے یاروں دوستوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ وہ لوگ کیا بتاتے ہیں؟''

''اللہ آپ کا بھلا کرے جناب!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''تین لڑکے میدو، کامی اور سرفراز سے میں نے بات کی تھی۔ یہ تینوں قادرا کے گہرے دوست ہیں اور ایک ساتھ مل کر کھیلتے رہتے ہیں۔ ان میں میدو اور سرفراز تو قادرا کے ہم عمر ہی ہیں لیکن کامی بارہ، تیرہ سال کا ہے۔ وہ باقی دونوں کے مقابلے میں کافی سمجھدار ہے۔ ان تینوں کے مطابق، قادرا مغرب تک ان کے ساتھ تھا لیکن جب اندھیرا ہونے لگا تو قادرا انہیں گھر آنے کا کہہ کر چلا آیا۔ اس کے بعد قادرا کو انہوں نے نہیں دیکھا لیکن..... کامی نے ایک عجیب بات کی تھی.....!'' وہ کامی کے ذکر پر متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اللہ بخش نے کچھ ایسے انداز میں بات کو ادھورا چھوڑا تھا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کامی کے حوالے سے کوئی اہم بات بتانے جا رہا تھا۔ میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہاں، ہاں..... بتاؤ اللہ بخش..... کامی نے ایسی کون سی عجیب بات کر دی۔ تمہیں وہ عجیب لگی لیکن ہو سکتا ہے، میں سمجھ جاؤں.....؟''

وہ چند لمحات کے لیے اس طرح خاموش ہو گیا جیسے اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو ایک نقطے پر اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں منتظر نگاہ سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔

''تھانیدار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے کبھی قادرا کے کھیلنے کودنے پر پابندی عائد نہیں کی لیکن اسے یہ نصیحت کر رکھی ہے کہ جیسے ہی مغرب کی اذان ہو، وہ گھر آ جائے۔ میرے والد صاحب مرحوم خدا بخش کہتے تھے کہ شام کے وقت شیطان کے چیلوں کو..... یعنی شیطونگڑوں کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ گلی محلوں میں گھوم پھر کر سب سے زیادہ شرارت معصوم بچوں کے ساتھ کرتے ہیں، اس لیے جو بچے مغرب کے بعد باہر کھیلتے ہیں وہ کسی نہ کسی پریشانی یا تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ شیطونگڑے مختلف حیلوں بہانوں سے انہیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ خیر، یہ تو ایک دوسری بات تھی۔ میں اصل میں آپ کو کامران عرف کامی کے بارے میں بتا رہا تھا.....!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کامی نے مجھے بتایا ہے کہ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی قادرا نے گھر جانے کی بات کی تو باقی دوستوں نے حسبِ معمول اس کا مذاق اڑایا لیکن اسے جانے سے نہیں روکا کیونکہ وہ اس کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ بہرحال.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''کامی کے مطابق، قادرا کے جانے کے کافی دیر بعد جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو اس نے راستے میں قادرا کو دیکھا۔ وہ سکندر شاہ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ کامی کو اسے وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی اور اس نے قادرا سے پوچھا کہ وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں گیا۔ قادرا نے جواب دیا کہ..... بس جا رہا ہوں۔ کامی اس کا جواب سن کر آگے بڑھ گیا.....'' اللہ بخش نے ذرا دیر کو رک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''کامی کی بتائی ہوئی یہ بات مجھے عجیب سی لگی تھی۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مقدس آیات و احادیثِ نبوی آپ کے دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں، ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب پتا نہیں، آپ اس سے کیا مطلب نکالتے ہیں!''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کامی کی بات میں سے بڑا گہرا مطلب برآمد ہوسکتا ہے لیکن اس کام کے لیے تھوڑی محنت کرنا پڑے گی اور..... وہ محنت میں نے شروع کردی ہے۔ تم بتاؤ، یہ سکندر شاہ کون ہے..... کیا وہ تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے سر کو منفی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اس بندے سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں۔ سکندر شاہ، جھاڑو والی سرکار کا خاص آدمی ہے۔ اور ادھر آستانے پر ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

اللہ بخش انکشاف پر انکشاف کرتا جارہا تھا۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ ''اور..... یہ جھاڑو والی سرکار کون ہے؟''

مجھے اتنا تو معلوم تھا، نہر کے کنارے کے ساتھ کسی ملنگ ٹائپ شخص نے اپنا آستانہ بنا رکھا ہے اور لوگ اس کے پاس دعا مدد اور تعویذ دھاگے کے لیے جاتے ہیں اور میرے خیال میں، اللہ بخش کا اشارہ بھی اسی ملنگ کی جانب تھا لیکن میں چونکہ اسی کی زبانی سب کچھ سننا چاہتا تھا اس لیے انجان بن گیا۔ میرے استفسار کے جواب میں اللہ بخش نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا۔

''اس بزرگ کا اصل نام تو قلندر شاہ ہے لیکن وہ جھاڑو والی سرکار اور بادام شاہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ کچھ لوگ انہیں سائیں جی اور سائیں صاحب بھی کہتے ہیں۔ اس قصبے اور آلے دوالے کے پنڈ دیہات کے لوگ انہیں بہت مانتے ہیں۔ وہ بہت پہنچی ہوئی ہستی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سکندر شاہ انہی سائیں جی کا خاص آدمی ہے اور ان کے ساتھ ڈیرے پر رہتا ہے۔''

میں نے موقع محل کی مناسبت سے، ایسے ہی کہہ دیا۔ ''اللہ بخش! اگر سائیں جی اتنی ہی پہنچی ہوئی ہستی ہیں تو میں آج ہی ان کی قدم بوسی کے لیے آستانے پر جاؤں گا اور قادرا کی گمشدگی کے سلسلے میں ان سے بھی مدد کی درخواست کروں گا۔ تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ سائیں جی کو جھاڑو والی سرکار اور بادام شاہ کیوں کہا جاتا ہے؟''

میں نے یہ ساری باتیں، اللہ بخش کے عقیدت مندانہ رویے کو دیکھتے ہوئے، خاص طور پر اسے خوش کرنے کے لیے کی تھیں۔ میرا یہ حربہ کافی حد تک کامیاب رہا۔ میری، سائیں کی ذات میں دلچسپی نے اسے خوش کردیا تھا۔ وہ جوش بھرے لہجے میں بتانے لگا۔

''سائیں جی بعض بیماریوں کا علاج جھاڑو کی مدد سے کرتے ہیں۔ وہ بیمار مرد یا عورت کو جھاڑو سے جھاڑتے ہیں تو وہ بھلا چنگا ہوجاتا ہے اور جہاں تک باداموں کا تعلق ہے.....''

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ''سائیں جی جادو ٹونے کا علاج باداموں کی مدد سے کرتے ہیں۔ کسی پر چاہے کتنا ہی گندا عمل کیوں نہ کیا گیا ہو، وہ اپنی روحانی طاقت سے اس عمل کا توڑ کردیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دبائی گئی بندش اور تعویذ وغیرہ کو وہ اپنے کلام اور پڑھائی کے ذریعے باداموں کے اندر کھینچ لاتے ہیں۔ یہ سائیں جی کا ایک بہت بڑا کمال ہے۔''

''واقعی..... سچ کہہ رہے ہو اللہ بخش!'' میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے قادرا کی گمشدگی کے سلسلے میں سائیں جی کو زحمت دی؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب مجھے پتا چلا کہ قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ کھڑے کامی نے دیکھا تھا تو میں قادرا کی تلاش کے سلسلے میں ادھر آستانے پر بھی گیا تھا۔ پورے علاقے میں قادرا کہیں نہیں ملا تھا۔ میں نے سوچا، جا کر سکندر سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ..... یا جھاڑو والی سرکار کچھ بتادیں.....!''

''پھر تمہیں وہاں سے کیا پتا چلا؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''جناب! میں رات کو کافی دیر سے آستانے پر گیا تھا۔'' اللہ بخش وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نبی بخش بھی میرے ساتھ تھا۔ سائیں جی اس وقت سو رہے تھے اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں نے سکندر شاہ سے قادرا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑا تسلی بخش جواب دیا اور میں وہاں سے واپس آگیا۔''

''اس نے تمہیں کس طرح تسلی دی تھی؟'' میں نے اللہ بخش سے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''جب میں نے سکندر شاہ سے قادرا کی بات کی تو اس نے بتایا کہ ہاں، وہ آج رات کو قادرا سے ملا تھا۔ ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سکندر شاہ نے قادرا کو دیکھا تو نصیحت کی کہ چھوٹے بچے اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتے لہٰذا وہ فوراً گھر چلا جائے۔ سکندر شاہ کے مطابق، قادرا کی سمجھ میں اس کی بات آگئی اور گھر جانے کے لیے وہ اپنے راستے پر ہولیا۔ سکندر شاہ وہیں ٹھہر کر قادرا کو گھر جاتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتا رہا پھر آستانے کی طرف چلا گیا.....!''

''ہوں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر اللہ بخش سے پوچھا۔ ''کیا تم نے سکندر شاہ کو قادرا کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں بتا دیا تھا؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''سکندر کو قادرا کے بارے میں جان کر افسوس ہوا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں صبح آستانے پر آجاؤں۔ پھر سائیں جی سے بات کریں گے۔''

''صبح تو تم میرے پاس آگئے ہو، قادرا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آستانے پر جاؤ گے؟''

''جی ہاں..... ارادہ تو یہی ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو.....؟''

بات ادھوری چھوڑ کر وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''ضرور..... ضرور..... اللہ بخش! تمہیں جھاڑو والی سرکار کے آستانے پر جانے کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ، میں تو خود بھی سائیں جی سے ملاقات کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ اچھا ہے کہ تمہی پہلے چلے جاؤ۔ جب تک میں ادھر کے کام نمٹا لیتا ہوں۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر چونکے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔

''اور ہاں..... آستانے سے واپسی پر تم مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔ ذرا پتا تو چلے کہ قبلہ قلندر شاہ صاحب کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے.....!''

''ٹھیک ہے جناب! میں آپ کو وہاں کی پوری رپورٹ دینے کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔'' اللہ بخش نے پروثوق لہجے میں کہا۔

اسے رخصت کرنے سے پہلے میں نے پوچھ لیا۔ ''اللہ بخش! تم کرتے کیا ہو..... میرا مطلب ہے، تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''تھانیدار صاحب! ہم دونوں بھائیوں کا مشترکہ کاروبار ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور قصبے کے مین بازار میں ہماری کپڑے کی دکان ہے۔ یہ دکان ہمارے والد صاحب مرحوم خدا بخش نے قائم کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہم دونوں نے یہ کام سنبھال لیا۔ والد صاحب کی زندگی میں بھی، میں اور نبی بخش ان کی مدد کے لیے دکان میں کام کرتے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اللہ بخش! مین بازار میں یہ دکان کس نام سے ہے؟''

''اللہ مدد کلاتھ مرچنٹ'' اس نے جواب دیا۔ ''دکان کا یہ نام والد صاحب مرحوم نے رکھا تھا اس لیے ہم نے ان کی وفات کے بعد نام تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری دکان ماشاءاللہ! خوب چلتی ہے لیکن.....'' وہ ذرا دیر کے لیے تھما پھر غمزدہ لہجے میں بولا۔

''لیکن آج ہم نے دکان نہیں کھولی۔ قادرا والے معاملے نے دماغ گھما رکھا ہے۔ میرا بیٹا مجھے مل جائے تو کسی اور بات کے بارے میں سوچوں گا۔''

''تم فکر نہ کرو اللہ بخش!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انشاءاللہ! میں بہت جلد تمہارے بیٹے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم آستانے کا چکر لگا کر فوراً میرے پاس آجاؤ۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر جانے لگا۔ میں نے پوچھ لیا۔ ''تم نے قادرا کے دوست کامی کا ذکر کیا ہے، وہ کیسے ملے گا..... میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''کامران عرف کامی حفیظ اللہ کا بیٹا ہے۔ حفیظ اللہ ایک چھوٹا زمیندار ہے۔ اس کا گھر گاؤں کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ میں اس کے گھر کے قریب سے گزر کر ہی آستانے کی طرف جاؤں گا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں کامی کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔''

''ہاں، ضرور.....!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تم یہ نیک کام کرتے ہوئے آستانے کی جانب نکل جانا۔''

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

سمت اور رخ کے اعتبار سے میرا تھانہ موضع رتن گڑھ سے باہر، شمالی جانب میں نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا اور نہر جنوبی طرف تھی جو مشرق سے مغرب کی سمت بہتی تھی۔ مذکورہ نیم پختہ سڑک اس نہر کے اوپر سے گزرتی تھی اور اسی نہر کے کنارے، رتن گڑھ کی طرف سائیں قلندر شاہ کا آستانہ تھا۔

میں سچے پیروں فقیروں، اللہ کے نیک بندوں اور روحانی بزرگوں کی بہت عزت اور احترام کرتا ہوں اور ایسے ولی اللہ افراد کی شان میں معمولی سی گستاخی کو بھی گناہِ عظیم تصور کرتا ہوں لیکن فراڈ عاملوں کاملوں اور ڈھونگی پیر قسم کے سائیں باباؤں سے مجھے خدا واسطے کا بیر ہے۔ معزز قارئین نے اکثر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہانیوں میں ایسے نقلی افراد کا، میرے ہاتھوں حشر خراب ہوتے دیکھا ہوگا۔ یہ گھٹیا اور کمینے لوگ دراصل ایک ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں جو انسانوں کے معاشرے کے لیے انتہائی مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ دھوکے باز بابا جہاں معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جان، عزت، مال اور جذبات سے کھیلتے ہیں، وہیں پر ان کے سیاہ کرتوتوں اور غلیظ کارناموں سے ''مرشد'' کا تصور بھی متاثر ہوتا ہے۔ لوگ سچے اور کھرے لوگوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ لہٰذا ایسے کرداروں کو بے نقاب کرتے رہنا چاہیے تاکہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہوتی رہے..... اور یہ کام اس معاشرے کے ہر فرد پر، ایک فرض کی طرح عائد ہوتا ہے!

میں نہیں جانتا تھا کہ جھاڑو والی سرکار کوئی اصل بزرگ ہے یا وہ بھی پیشہ ور لٹیرا ہے لہٰذا فوری طور پر میں اس کے بارے میں کوئی اظہارِ رائے نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک اس سے روبرو ملاقات نہ ہو جاتی، کچھ کہنا قبل از وقت اور نامناسب تھا اور یہ مجھے اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا کہ بہت جلد جھاڑو والی سرکار سے سامنا ہونے والا ہے۔ ویسے ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی تھی کہ قصبہ رتن گڑھ اور ادھر ادھر کے دیہاتوں کے رہنے والے اس سائیں بابا کو بہت مانتے تھے۔

☆☆☆

دوپہر سے پہلے میں نے ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''محمد اقبال! تم نے مجھے بتایا تھا کہ اسی قصبے سے تمہارا تعلق ہے..... پھر تو تم یہاں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو گے؟''

''جی ملک صاحب! ہم لوگ جدی پشتی یہیں کے رہنے والے ہیں۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''اور میں تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''سائیں قلندر شاہ عرف جھاڑو والی سرکار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے رازدارانہ انداز میں سوال کیا۔

وہ ایک دم بے انتہا سنجیدہ نظر آنے لگا پھر پوچھا۔ ''ملک صاحب! میں سمجھا نہیں، آپ کس حوالے سے میرا خیال جاننا چاہتے ہیں؟''

میرے سوال کے جواب میں جب اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا تو میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیال میں یہ سائیں جی کیسا آدمی ہے؟''

اس کی سنجیدگی اور گہری ہو گئی، سپاٹ آواز میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں دراصل..... سے تعلق رکھتا ہوں۔'' اس نے ایک فرقے کا نام لیا تھا۔ ''ہم پیروں فقیروں اور مزاروں کو نہیں مانتے۔ یوں سمجھیں جس طرح عام لوگ اس حوالے سے تعلق اور عمل رکھتے ہیں، ہم ویسے عمل اور تعلق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک یہ سراسر شرک ہے، ہم ایسے اعمال کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اقبال!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں فرقوں اور نظریوں کے اختلاف میں الجھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ تم سائیں بابا کو مانتے ہو یا نہیں، اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ جھاڑو والی سرکار کے بارے میں پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ تم یہاں کے رہنے والے ہو لہٰذا اس کی اصلیت کے حوالے سے تمہارا علم مصدقہ ہوگا!''

''وہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ رسانیت سے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میرا کبھی قلندر شاہ سے واسطہ نہیں پڑا اس لیے میں دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس قسم کا شخص ہے، البتہ.....''

وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''البتہ، یہاں کے رہنے والے اور آس پاس کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ اس سے گہری عقیدت رکھتے ہیں حالانکہ اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اس کے باوجود بھی اس نے اپنا خاصا وسیع حلقہ بنا لیا ہے..... پتا نہیں، وہ اپنے پاس آنے والوں کو کیا گھول گھول کر پلاتا رہتا ہے!''

کانسٹیبل محمد اقبال نے آخری جملہ اس انداز میں ادا کیا تھا کہ اگر اسے پتا چل جاتا کہ سائیں بابا اپنی کس شکتی سے لوگوں کو گرویدہ بناتا ہے تو وہ اس سے ایسی شکتی چھیننے اور چھین کر ضائع کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہ کرتا۔ اقبال کی ایک بات نے مجھے چونکا دیا تھا لہٰذا اسی حوالے سے میں نے سوال کر ڈالا۔

''سائیں بابا کو اس علاقے میں آکر آستانہ قائم کیے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''یہی کوئی تین، ساڑھے تین سال۔'' محمد اقبال نے جواب دیا۔

''اچھا..... اس کا مطلب ہے، وہ اس علاقے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ پرانا نہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتے ہو، وہ کہاں سے آیا ہے، میرا مطلب ہے کہ رتن گڑھ سے پہلے وہ کہاں پر آستانہ چلاتا تھا؟''

''ملک صاحب! سچ پوچھیں تو میرا وہی معاملہ ہے.....'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''جس پنڈ نہیں جانا اس کا راستہ پوچھنے کا کیا فائدہ..... آپ میری بات تو سمجھ ہی گئے ہوں گے!''

''بڑی اچھی طرح سمجھ گیا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں سائیں بابا، اس کے آستانے اور دیگر معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں..... ہے نا یہی بات؟''

''جی..... بالکل یہی بات ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں نے گفتگو کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''اس قصبے میں بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا رہتا ہے۔ نام اس کا کامران ہے جو کامی مشہور ہے۔ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

اس کی پیشانی پر مجرسوچ لکیریں ابھریں پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''اس کامی کے ماں باپ کا کیا نام ہے؟''

''ماں کا تو مجھے پتا نہیں البتہ، اس کے باپ کا نام حفیظ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''جو قصبہ رتن گڑھ کا ایک چھوٹا زمیندار ہے.....''

''پہنچ گیا..... میں کامی تک پہنچ گیا۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا پھر پوچھا۔ ''ملک صاحب! اس بچے کامی کا کیا ذکر نکل آیا؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اقبال! تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ اللہ بخش کپڑا فروش کا بچہ قادرا کل رات سے غائب ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے چھوٹے بھائی نبی بخش کے ساتھ قادرا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا.....!''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے۔''

''کامی، قادرا کا گہرا دوست ہے۔'' میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آخری مرتبہ کامی ہی نے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ سکندر شاہ، جھاڑو والی سرکار کا مرید خاص بتایا جاتا ہے۔ میں اسی لیے سائیں بابا اور کامی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں!''

''ہوں.....'' کانسٹیبل محمد اقبال نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بولا۔ ''میں نے آپ کو آستانے کے حوالے سے اپنی لاتعلقی اور عدم دلچسپی کا تو بتا دیا ہے البتہ، اگر آپ کہیں تو میں پوچھ گچھ کے لیے کامی کو پکڑ کر تھانے لے آتا ہوں.....''

''میں یہی چاہتا ہوں اقبال!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور جہاں تک تمہاری عدم دلچسپی اور لاتعلقی کا معاملہ ہے تو یہ میری نظر میں ایک مفید کوالٹی ہے۔ میں سائیں بابا کے آستانے پر جا کر بھی تفتیش کرنا چاہتا ہوں اور اس مشن میں تم میرے ساتھ رہو گے۔ ٹھیک ہے.....؟''

''فرض کی راہ میں، میں آپ کا ہر حکم بجالانے کو تیار ہوں ملک صاحب!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جا کر کامی کو لاتا ہوں۔''

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے تعریفی نظر سے محمد اقبال کو دیکھا اور کہا۔ ''شاباش اقبال! تمہارے مضبوط عزم اور بلند حوصلے کو دیکھتے ہوئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ترقی کی راہ میں بہت آگے تک جاؤ گے۔''

''بہت بہت شکریہ ملک صاحب.....!'' وہ جذباتی ہوگیا۔

میں نے کامی کو لانے کے لیے اسے تھانے سے روانہ کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ کامی اور اس کے باپ حفیظ اللہ کو لے کر واپس آ گیا۔ حفیظ اللہ یہ سن کر فکرمند ہوگیا تھا کہ اس کے بیٹے کو تھانے میں بلایا گیا ہے اسی لیے وہ ساتھ آ گیا تھا۔ کانسٹیبل انہیں میرے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

حفیظ اللہ کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ متناسب جسم کا مالک ایک قدآور شخص تھا اور اس نے درمیانی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ رنگ سانولا اور صحت قابلِ رشک۔ ہاتھ پاؤں اور کندھوں سے جفاکشی جھلکتی تھی۔ اس کا بیٹا کامران عرف کامی دبلا پتلا اور دراز قامت لڑکا تھا۔ اللہ بخش نے کامی کی عمر بارہ سال بتائی تھی لیکن وہ اپنے قد بت اور چہرے کے تاثرات سے پندرہ سولہ کا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہوشیاری کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اپنے انداز و اطوار سے خاصا تیز و طرار نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں اپنے سامنے بٹھایا تو حفیظ اللہ نے متفکر لہجے میں پوچھا۔ ''تھانیدار صاحب! خیریت تو ہے۔ آپ نے میرے بیٹے کو کس سلسلے میں یہاں بلایا ہے۔ اس نے ایسی کون سی خطا کر دی ہے؟''

''اس سے کوئی خطا نہیں ہوئی حفیظ اللہ'' میں نے تسلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس لیے تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں پتا ہوگا کہ اللہ بخش کا بیٹا گزشتہ رات سے گم ہوگیا ہے۔ آخری بار کامی نے اسے دیکھا تھا۔ میں تمہارے بیٹے سے اسی سلسلے میں تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ایک دم مطمئن نظر آنے لگا۔ میں کامی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''بیٹا! مجھے پتا چلا ہے کہ تم نے کل رات قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔ ذرا اس بارے میں مجھے بتاؤ؟''

کامی نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تھانیدار جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔''

''اور اس کے بعد ہی قادرا گم ہے۔'' میں نے کامی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''کیا تم جانتے ہو، وہ دونوں آپس میں کیا باتیں کررہے تھے؟''

''نہیں جناب! مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئے تھے۔'' کامی نے کہا۔ ''میں قادرا کو اس طرف دیکھ کر حیران ہوا تھا کیونکہ اس کا گھر تو دوسری جانب ہے۔''

پھر وہ مجھے گھروں کی تفصیل بتانے لگا۔ حفیظ اللہ زمیندار کا گھر موضع رتن گڑھ کے جنوبی کنارے پر واقع تھا جس کے آگے کھیت شروع ہوجاتے تھے اور کھیتوں کا یہ سلسلہ نہر کے کنارے تک دراز تھا۔ اسی کنارے کے ساتھ سائیں قلندر شاہ عرف جھاڑو والی سرکار کا آستانہ آباد تھا۔ گاؤں کے اختتام سے کھیتوں کے بیچم بیچ ایک پگ ڈنڈی نہر کے کنارے تک جاتی تھی۔ لوگ آستانے تک پہنچنے کے لیے یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ جبکہ قادرا کا گھر گاؤں کے مغربی حصے میں واقع تھا اسی لیے کامی، قادرا کو اپنے گھر کی سمت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ میں نے کامی کو کریدنے کے لیے پوچھا۔

''کامی! قادرا تمہارا گہرا دوست تھا۔ تم لوگ روزانہ مل جل کر کھیلتے تھے۔ ظاہر ہے، اس کی گمشدگی سے تمہیں بھی دکھ ہوا ہوگا؟''

''جی ہاں..... اس کے گم ہونے نے مجھے پریشان کردیا ہے۔'' وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ اپنے سپاہیوں کو بھیج کر قادرا کو تلاش کرائیں۔''

''میں خود بھی جلد از جلد قادرا کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے سپاہی تھانے سے روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں۔ بس تمہاری مدد کی ضرورت ہے..... اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے!''

''میری مدد.....؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''میں بھلا آپ کی کس طرح مدد کرسکتا ہوں جناب.....!''

''کل شام میں تم چاروں ایک ساتھ کھیل رہے تھے۔ تم، قادرا، عبید اور سرفراز..... ذرا سوچو، ذہن پر زور دو اور مجھے بتاؤ کہ قادرا نے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہو، اس کے گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ کسی نے اسے مارا پیٹا ہے..... یا ایسی ہی کوئی اور بات؟''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں تھانیدار جی، ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ اگر اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہوا ہوتا تو اس کا منہ لٹکا ہوا نظر آتا۔ کل پاکستان کی آزادی کا دن تھا۔ ہم سب دوستوں نے خوب کھیلا کودا اور مزے اڑائے۔ ہماری طرح قادرا بھی بڑا پُرجوش اور خوش خوش تھا۔''

یہ بات تو اللہ بخش بھی مجھے بتا چکا تھا کہ گھر میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا لیکن میں فرائض کی ادائیگی اور اپنی تسلی کے لیے کامی کے منہ سے اس امر کی تصدیق ضروری سمجھتا تھا اور کامی کے جواب نے میری تشفی کردی تھی۔ میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ٹھیک ہے کامی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قادرا ابھی کل تم لوگوں کی طرح خوش باش تھا۔ یہ بتاؤ کہ بات چیت کے دوران میں اس نے کوئی ایسا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ کہیں جانے والا ہے؟''

''نہیں جناب..... ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''پھر شام ہوتے ہی وہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا تھا..... ہے نا؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور آپ تینوں بعد میں بھی کھیلتے رہے تھے؟''

''جی..... ہم اور تھوڑی دیر تک کھیلتے رہے تھے۔'' کامی نے جواب دیا۔ ''پھر جب اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ عبید اور سرفراز کا گھر تو اسی میدان کے قریب ہے جہاں ہم چاروں کھیل رہے تھے۔ قادرا کا گھر میدان اور میرے گھر کے درمیان واقع ہے اور میرا گھر گاؤں کے آخری کنارے پر کھیتوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے.....''

میں نے اگلا سوال کیا ''اور جب تم اپنے گھر جارہے تھے تو تم نے راستے میں قادرا اور سکندر شاہ کو کھڑے باتیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے دیکھا۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

''جی ہاں..... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اور مجھے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ اندھیرے میں کھڑے دیکھ کر حیرت اس لیے ہوئی تھی کہ اسے ہمیشہ شام میں گھر جانے کی جلدی لگی رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا ابا رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنے کے حق میں نہیں۔ وہ شام ہوتے ہی گھر آنے پر زور دیتا ہے.....''

''اللہ بخش بالکل ٹھیک کہتا ہے تھانیدار صاحب!''

کامی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی حفیظ اللہ بول اٹھا ''میں بھی کامی کو ہمیشہ یہی نصیحت کرتا ہوں لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی!''

باپ کی بات پر کامی نے برا سا منہ بنایا لیکن کچھ بولنے کے بجائے میری طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''کامی! کل رات جب تم نے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ کھڑے دیکھا تو تم دونوں میں کوئی بات چیت بھی ہوئی تھی یا تم انہیں باتیں کرتے دیکھ کر خاموشی سے آگے بڑھ گئے تھے؟''

اللہ بخش مجھے اس حوالے سے معلومات فراہم کر چکا تھا جس کے مطابق، جب اس نے رات گئے سکندر شاہ کو آستانے پر جا کر قادرا کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا تھا..... میں نے قادرا کو دیکھ کر نصیحت کر دی کہ چھوٹے بچے اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتے لہٰذا تم فوراً گھر چلے جاؤ اور وہ گھر چلا گیا، بعد میں سکندر شاہ جھاڑو والی سرکار کے آستانے پر آ گیا تھا۔ اب میں کامی کے جواب سے بہ آسانی سکندر شاہ کے بیان کو بھی چیک کر سکتا تھا۔ کامی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''جناب! یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ قادرا کو گھر جانے کی جلدی لگی رہتی تھی اسی لیے میں اسے سکندر شاہ کے ساتھ اندھیرے میں کھڑے دیکھ کر الجھ گیا تھا چنانچہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''تم تو کافی دیر پہلے ہمیں چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

''میں شاہ صاحب کی باتیں سن رہا ہوں۔'' قادرا نے جواب دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں قادرا سے کوئی اور سوال کرتا، سکندر شاہ نے کہا۔ ''بیٹا! میں قادرا کو کچھ سمجھا رہا ہوں۔ یہ میری بات سننے کے بعد گھر چلا جائے گا۔ تم اپنے گھر جاؤ۔''

''میں سکندر شاہ سے بحث تو کر نہیں سکتا تھا اس لیے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا لیکن آگے جاتے ہوئے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مڑ کر ان دونوں کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے ان کی شکلیں تو صاف نظر نہیں آ رہی تھیں البتہ، یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دو آدمی کھڑے باتیں کر رہے ہیں..... اور پھر میں اپنے گھر چلا گیا!''

کامی خاموش ہوا تو میرے ذہن میں تھالی بج چکی تھی۔ اس نے اپنے سادہ سے بیان میں بڑا سنسنی خیز انکشاف کر دیا تھا۔ اگر کامی نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو پھر سکندر شاہ کی ذات شکوک و شبہات میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی..... اور کامی کے چہرے کے تاثرات اور میرا پیشہ ورانہ تجربہ یہ کہتا تھا کہ کامی نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

سکندر شاہ نے اللہ بخش کے استفسار پر اسے بتایا تھا کہ اس کی نصیحت سن کر قادرا اپنے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ سکندر شاہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر اسے گھر جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر آستانے کی طرف چلا گیا تھا جب کہ کامی کا بیان سکندر شاہ کے بیان کی نفی کرتا تھا۔ کامی کے مطابق، قادرا سکندر شاہ کے ساتھ باتوں میں مشغول رہا اور وہ اپنے گھر چلا گیا.....!

اس پُراسرار صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے سکندر شاہ کا بھرپور انٹرویو ضروری ہو گیا تھا تاکہ حقیقت کا سراغ لگایا جا سکے۔ میں نے مزید دس منٹ تک کامی سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے لیکن کام کی اور کوئی بات سامنے نہ آ سکی لہٰذا میں نے اس تاکید کے ساتھ ان باپ بیٹے کو تھانے سے رخصت کر دیا۔

''حفیظ اللہ! تم اپنے بیٹے کو لے کر میرے پاس آئے اور تمہارے بیٹے نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا اس کے لیے میں تم دونوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ آئندہ کے لیے بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا اور جیسے ہی قادرا کے حوالے سے کوئی سن گن ملے، فوراً آ کر مجھے بتانا۔''

انہوں نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور اپنے گھر چلے گئے۔ اللہ بخش مجھ سے ملنے کے بعد سائیں قلندر شاہ کے آستانے کی طرف گیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ واپسی پر وہ پہلے مجھے رپورٹ دے پھر اپنے گھر کا رخ کرے۔ میں اس کی پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں آگے حرکت کرنا چاہتا تھا کہ کم سے کم وقت خرچ کر کے جلد از جلد گمشدہ بچے کو بازیاب کیا جا سکے۔

حفیظ اللہ اینڈ سن کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محمد اقبال کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ حاضر ہوا تو میں نے اس سے کہا۔ ''ضروری تیاری کرلو اقبال..... دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دونوں آستانے کی طرف چلیں گے۔ جس مشن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا اس کے آغاز کا وقت آگیا ہے۔''

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن.....!''

''لیکن کیا اقبال؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

وہ بولا ''تھانے میں مجھ سے سینئر کئی افراد موجود ہیں۔ اے ایس آئی فیض احمد، حوالدار مبارک علی اور.....''

''اور کیا.....'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اقبال! کھل کر کہو جو بھی کہنا چاہتے ہو.... تم مجھے اپنا افسر نہیں بلکہ ایک دوست سمجھو.....!''

میرے حوصلہ دلانے پر وہ مطمئن انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کے رویّے سے لگتا ہی نہیں کہ آپ تھانہ انچارج ہیں۔ آج تک مجھے کسی انچارج صاحب کے ساتھ کسی مشن میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا اس لیے شاید ایسا محسوس ہو رہا ہے.....''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں، تم کیا محسوس کر رہے ہو؟''

کانسٹیبل محمد اقبال نے جواب دیا۔ ''مجھ سے سینئر افراد کو یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ ان کو نظر انداز کر کے آپ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں؟''

''اس تھانے کا انچارج کون ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ظاہر ہے..... آپ ہی ہیں ملک صاحب'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر کون جا رہا ہے؟''

''آپ.....!'' وہ اور زیادہ الجھ گیا۔

''جب میں تھانیدار ہوں یہاں کا.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور تم میری مرضی سے کسی مشن میں حصہ لے رہے ہو تو پھر تھانے کے عملے میں سے کسی کو اعتراض کی جرأت کیسے ہوسکتی ہے۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے ذہن کو بالکل صاف اور پُرسکون رکھ کر وہی کرو جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے۔ باقی سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اللہ بخش مجھے وہاں کی رپورٹ دے دے، پھر ہم ادھر آستانے کی طرف روانہ ہوں گے..... ٹھیک ہے!''

''جو حکم آپ کا جناب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''میں جائزروائگی کی تیاری کرتا ہوں۔''

''شاباش.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اللہ بخش کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی۔ اس وقت تک میں کھانا کھا چکا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ ابھی ٹھیک طرح بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے سوال داغ دیا۔

''اللہ بخش! کیا جھاڑ دوالی سرکار سے تمہاری ملاقات ہوگئی؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔ سائیں جی کسی گہرے مراقبے میں تھے اس لیے دیر ہوگئی۔''

''چلو، کوئی بات نہیں۔ ایسے معاملات میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ، تم نے سائیں قلندر شاہ کو اپنی پریشانی سے آگاہ کردیا..... اور انہوں نے تمہاری بپتا سننے کے بعد کیا فرمایا ہے؟''

''انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور کہا کہ بچے کی تلاش اور بازیابی کے لیے وہی طریقہ اپنانا پڑے گا جو اللہ کا وضع کردہ ہے۔ انہوں نے قادرا کی ماں کو بلایا ہے۔''

''قادرا کی ماں کو.....؟'' میں نے چونک کر اللہ بخش کو دیکھا۔

''جی، تھانیدار صاحب!'' وہ سادگی سے بولا۔

میں نے وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا۔ ''قادرا کی ماں کا اس کی تلاش سے کیا تعلق ہے اور..... یہ اللہ کا وضع کردہ طریقہ کون سا ہے؟''

اللہ بخش نے سائیں کے حوالے سے جو بات کی تھی اس نے میرے ذہن کو خاصا الجھا دیا تھا۔ وہ میرے سوالات کے جواب میں بتانے لگا۔

''جناب! میری دکھ بھری کہانی سننے کے بعد سائیں جی مراقبے میں چلے گئے پھر تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں بند رکھتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا، اللہ بخش! کیا تمہیں پتا ہے کہ عامل کامل کسی بندے کا حساب لگانے کے لیے اس کا نام مع والدہ کیوں مانگتے ہیں؟ میں نے اپنی کم علمی اور لاعلمی ظاہر کردی۔ انہوں نے فرمایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ماں کا اپنی اولاد سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اسی لیے عامل کامل نام مع والدہ حساب لگاتے ہیں۔ وہ قدرتی طریقے کو اپناتے ہیں اور میں بھی تمہارے بیٹے کی تلاش کے لیے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔" اللہ بخش سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

"میں جھاڑو والی سرکار کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور پوری توجہ ان کی باتوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اپنی آنکھوں کو بدستور بند رکھتے ہوئے گویا ہوئے..... اللہ بخش! تمہارے بچے کو ڈھونڈنے کے لیے مجھے تمہاری بیوی پر ایک خاص عمل کرنا ہوگا۔ وہ اس عمل کے دوران میں اپنے ہوش وحواس سے بے گانہ ہو جائے گی پھر اسی کیفیت میں اس کی زبان حرکت میں آجائے گی اور اس زبان سے بچے کا سراغ ملے گا۔ تمہاری بیوی نیند کی حالت میں اس جگہ کی نشاندہی کرے گی جہاں قادرا اس وقت موجود ہے۔ جب میں تمہیں اس جگہ کے بارے میں بتاؤں گا تو تم وہاں جا کر اپنے بچے کو لے آنا..... تمہارے بیٹے قادرا کو بازیاب کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔"

اللہ بخش، سائیں قلندر شاہ کے ارشاداتِ خبیثہ اور فرمودات ذلیلہ بیان کر کے خاموش ہوا تو میں جھاڑو والی سرکار کی اصلیت تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے میرے تصور میں ایک چوکور شے ابھرنے ڈوبنے لگی اور سوچ میں ان الفاظ کی گونج پیدا ہوئی..... "ڈبا پیر..... ڈبا پیر.....!"

کسی گمشدہ بچے کی تلاش کے سلسلے میں اس کی ماں پر کسی قسم کے عمل کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ اس کا مطلب تھا، سائیں قلندر شاہ کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ بچے کی تلاش کی آڑ میں بچے کی ماں پر ہاتھ صاف اور دانت تیز کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے اس قماش کے ہوس پرست باباؤں کا وسیع تجربہ تھا اور انہیں راہِ راست پر لانے کے ایک سو ایک گر مجھے آتے تھے۔ تو..... موضع رتن گڑھ میں بھی کوئی ایسی ہی کہانی میری منتظر تھی..... اور مجھے ایک معاشرتی ناسور کو سرجری سے گزارنے کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا تھا جس کے نتیجے میں سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے!

سائیں کے چیلے سکندر شاہ کی ذات شک کے دائرے میں آچکی تھی اور اب یہ جھاڑو والی سرکار بھی گردن گردن تک قعرِ مذلت میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا لہٰذا مجھے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا تاکہ کسی ناکامیابی کا امکان باقی نہ رہے۔

یہ بات میں نے بڑی اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ اللہ بخش اپنے دل میں سائیں بابا کے لیے گہری عقیدت رکھتا تھا اس لیے فی الحال ضروری یہی تھا کہ میں کھل کر اس کے سامنے سائیں کے خلاف کوئی بات نہ کروں۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"اللہ بخش! سائیں جی نے تمہاری بیوی کو کب اپنے پاس بلایا ہے؟"

"آج رات کو جناب!" اس نے جواب دیا "سائیں بابا نے کہا ہے کہ میں زاہدہ کو سورج غروب ہونے کے فوراً بعد ان کے آستانے پر پہنچا دوں۔ وہ اندھیرا پھیلتے ہی اس پر کوئی روحانی عمل کریں گے جس کے بعد وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ آدھے گھنٹے..... یا پھر ایک گھنٹے کے بعد وہ بے ہوشی ہی کی حالت میں قادرا کے بارے میں بتائے گی۔"

میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اللہ بخش کی بیوی زاہدہ بڑی خوبصورت عورت ہوگی۔ سائیں قلندر شاہ جیسی سرکاروں کے طریقۂ واردات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ لوگ اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے نت نئے فارمولے آزماتے ہیں جنہیں یہ مختلف قسم کے روحانی عمل کا نام دیتے ہیں۔ یہ روحانیت نہیں بلکہ روحانیت کو بدنام کرنے کی ایک گھناؤنی سازش ہے۔ ایسے سازشی افراد کے خلاف معاشرے کے ہر فرد کو انفرادی اور اجتماعی طور پر مل جل کر جہاد کرنا چاہیے۔ معاشرتی مسائل کے خلاف جہاد کرنا اس جہاد سے سو درجے افضل ہے جو معاشرے کی حدود سے باہر نکل کر کیا جاتا ہے اور اس کارِ خیر میں ان لوگوں کو بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے جو اصل اور سچی روحانیت کے علم بردار اور روح رواں ہیں کیونکہ سائیں قلندر شاہ جیسے ناگی باباؤں کی یہ مکروہ حرکتیں دراصل انہی ہستیوں کی نیک نامی پر ایک کھلا حملہ ہیں!

میں نے اللہ بخش سے پوچھا "کیا تمہیں بھی رات کو اپنی بیوی کے ساتھ، سائیں جی کے آستانے پر جانے کی اجازت ہوگی یا زاہدہ کو انہوں نے اکیلے ہی میں بلایا ہے؟"

"انہوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو ایک ساتھ بلایا ہے تھانیدار صاحب!" اللہ بخش نے جواب دیا "میں ہال میں بیٹھ کر انتظار کروں گا اور سائیں جی زاہدہ کو اپنے مخصوص حجرے میں لے جا کر اس پر عمل کریں گے۔ پھر جب زاہدہ کی زبان سے قادرا کا اتا پتا معلوم ہو جائے گا تو سائیں جی اسے حجرے سے باہر لے آئیں گے اور مجھے بتائیں گے کہ میں کہاں جا کر اپنے گمشدہ بچے کو تلاش کروں..... اس کے بعد ہم دونوں میاں بیوی واپس گھر آجائیں گے۔ یہ ہے ساری تفصیل تھانیدار صاحب!"

"ہوں.....!" میں نے مُرسوچ انداز میں کہا۔ "تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سائیں جی نے تمہیں رات والے عمل کے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا ہے؟''

''جی..... جی ہاں'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

میرے ذہن میں مسلسل ایک پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ جب سے مجھے جھاڑو والی سرکاری کی اصلیت کا علم ہوا تھا، میں اس سے نمٹنے کے لیے ہی سوچ رہا تھا جس کے نتیجے میں خود بہ خود ہی ایک لائحہ عمل ترتیب پاتا چلا جا رہا تھا لیکن میں اللہ بخش کو اپنی پلاننگ سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ قلندر شاہ کا معتقد تھا۔ اگر میں سائیں کے خلاف کوئی بات کرتا تو وہ اس کے ذہن کے لیے قابل قبول نہ ہوتی۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیوی کو ایک نقلی عامل کے حجرے میں نہ پہنچاؤ ورنہ ڈیش، ڈیش، ڈیش اللہ بخش کے ساتھ اسی کی فری کوئنسی میں بات کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اللہ بخش! انسان کو اپنے مسائل حل کرنے کے لیے دنیاوی اور روحانی دونوں راستے اختیار کرنا چاہئیں، اس میں کوئی برائی یا خرابی والی بات نہیں ہے۔ تم نے قادرا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی ہے۔ میں نے اس کی تلاش کے لیے عملی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔ تم رات کو ضرور زاہدہ کے ساتھ سائیں جی کے آستانے پر جاؤ۔ اگر سائیں جی اپنے کسی عمل سے قادرا کے محل وقوع کا سراغ لگا لیں تو میرے لیے بڑی آسانیاں ہو جائیں گی۔ میں تمہارے بیٹے کو جلدی ڈھونڈ نکالوں گا'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہیں دو ضروری کام کرنا ہوں گے اللہ بخش!''

''جی حکم تھانیدار صاحب!'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں پتا ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی نبی بخش اپنے سالوں کے ساتھ، قادرا کی تلاش میں جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد کی طرف گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی واپس آئے تم اسے فوراً میرے پاس بھیج دینا، ٹھیک ہے.....!''

''بالکل ٹھیک جناب'' وہ فرماں برداری سے بولا پھر پوچھا ''اور دوسرا کام؟''

''دوسرا کام یہ ہے اللہ بخش!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''جب تم اپنی بیوی زاہدہ کے ساتھ، شام کو آستانے کی طرف جانے لگو تو مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔''

اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا ''کوئی خاص بات ہے جناب؟''

''ہاں.....'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''مجھے سائیں جی کے لیے ایک تحفہ بھجوانا ہے۔ خود بھی کسی وقت ملاقات کے لیے آستانے پر جاؤں گا۔ جب تک خود جانے کا موقع نہیں ملتا، کچھ نذر نذرانہ تو بھیج ہی دوں۔''

''بالکل، بالکل جناب'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سائیں جی بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔''

میں نے تائیدی انداز میں اپنے سر کو حرکت دی اور دل ہی دل میں کہا، اللہ بخش! تمہیں کیا معلوم کہ جھاڑو والی سرکار کہاں تک پہنچی ہوئی ہستی ہے اور وہ چال باز آج رات کو تمہاری بیوی کو جس ''بلند مقام'' پر پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کا تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے..... لیکن ظاہر ہے، اس غریب اور سادہ دل انسان کو سائیں کی مکاری کا علم نہیں تھا اسی لیے وہ مطمئن اور مزے اعتماد نظر آتا تھا اور میرے ذہن میں رات کی کارروائی کے لیے جو منصوبہ ترتیب پا چکا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں فی الحال اللہ بخش کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں مجھے خاموش اور سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اللہ بخش نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ بھی ہمارے ساتھ ہی آستانے پر چلیں نا!''

''یہ ممکن نہیں اللہ بخش!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو تھانے میں بہت زیادہ کام ہے اور دوسرے آج ایس پی صاحب کی آمد بھی متوقع ہے۔ اس علاقے کے ایس پی صاحب سے میری گہری دوستی ہے۔ وہ آج کسی وقت بھی مجھ سے ملنے یہاں تھانے آ سکتے ہیں لہٰذا میرا یہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔''

میری اس، فوری تیار کردہ وضاحت کے آگے وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور مجھے سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گیا۔

اللہ بخش کے جانے کے بعد میں قادرا کی گمشدگی اور سائیں جھاڑو والی سرکار کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ زاہدہ کو اپنے آستانے پر بلا کر اور حجرے میں بند کر کے کوئی عمل کرنے کا راگ دینا سراسر سائیں کے مذموم ارادے کی تکمیل کا اعلان تھا۔ وہ قادرا کی آڑ میں اس کی ماں سے فیض اٹھانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتا تھا۔ سائیں قلندر شاہ جیسے نقلی اور فراڈ پیروں کو صرف دو چیزوں کی ہوس ہوتی ہے۔ نمبر ایک دولت، نمبر دو عورت! اس کے علاوہ آستانے کے دیگر معاملات فروعی ہوتے ہیں جو خود بہ خود چلتے رہتے ہیں۔ اب یہاں پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا تھا.....!

سائیں قلندر شاہ اپنی ہوس کی تکمیل کے بعد اللہ بخش کو، قادرا کے بارے میں کیا بتائے گا؟ (ویسے میرے پروگرام میں یہ شامل تھا کہ میں آستانے والی کارروائی میں اللہ بخش کی بیوی زاہدہ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا) اسے کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی تھا۔ یا تو قادرا کا مکمل سراغ یا پھر کوئی ٹامک ٹوئی! زیادہ امکان ٹامک ٹوئی ہی کا تھا۔

اور.....اگر وہ قادرا کی وقوعہ پذیری کا ٹھیک ٹھیک پتا دیتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ قادرا کی گمشدگی میں اسی کا غالب ہاتھ ہے کیونکہ نہ تو وہ روحانی عامل تھا اور نہ ہی ایسی کوئی خبر دے سکتا تھا۔

آستانے ہی کے تعلق سے سکندر شاہ کی ذات بھی شک کی چادر میں لپٹی نظر آتی تھی۔ سکندر شاہ، قلندر شاہ کا خاص آدمی تھا اور گمشدہ قادرا کو اسی سکندر شاہ کے ساتھ آخری مرتبہ مشکوک انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

رات کو اللہ بخش کی روانگی کے بعد تو مجھے ایک خفیہ آپریشن کے لیے آستانے کی طرف جانا ہی تھا لیکن اس سے پہلے بھی وہاں کا ایک چکر ضروری تھا تاکہ میں اس آستانے کو اور اس کے کل وقوع کو اچھی طرح اپنی آنکھوں میں بسا سکوں اور رات والی کارروائی میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور..... اس کے ساتھ ہی سکندر شاہ کا ہلکا انٹرویو بھی ہو جاتا۔

میں نے ابھی تک سکندر شاہ اور قلندر شاہ کو نہیں دیکھا تھا اور دونوں بھی مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے اس لیے اگر میں کانسٹیبل محمد اقبال کے ساتھ کسی کانسٹیبل کی حیثیت سے آستانے پر جا کر سکندر شاہ سے پوچھ گچھ کرتا تو اس میں زیادہ سسپنس ہوتا اور یہ ایک معمول کی کارروائی بھی نظر آتی۔

میں نے اپنے پروگرام کو حتمی شکل دی ہی تھی کہ محمد اقبال میرے کمرے میں آگیا اور آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا پروگرام ہے ملک صاحب؟''

''پروگرام تو وہی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے تمہیں چند اہم باتوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔''

''جی.....حکم کریں۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے محمد اقبال کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کر دیا۔ جب پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی تو میں نے اس سے کہا۔

''تمہاری جسامت مجھ سے ملتی جلتی ہے۔ مجھے تمہاری ایک شرٹ چاہیے ہوگی تاکہ میں مکمل کانسٹیبل نظر آؤں پھر ہم خاموشی سے آستانے کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

ٹھیک چار بجے سہ پہر ''دو کانسٹیبل'' سائیں قلندر شاہ کے آستانے پر پہنچ گئے۔ ان میں ایک کا نام محمد اقبال اور دوسرے کا جاوید خان تھا اور یہ جاوید خان کانسٹیبل کے روپ میں کوئی اور نہیں بلکہ میں خود یعنی ملک صفدر حیات تھا نہ انچارج موضع رتن گڑھ تھا۔

نہر کے کنارے کے ساتھ وہ آستانہ اچھے خاصے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور اس آستانے کی پشت نہر کے کنارے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ آستانے میں آمد و رفت کا راستہ گاؤں کی جانب سے تھا یعنی نہر کی مخالف سمت سے اور ہم اسی طرف سے وہاں پہنچے تھے۔

آستانے کے داخلی دروازے سے اندر آئیں تو ایک وسیع و عریض دالان نما صحن آتا تھا جس میں چھوٹے بڑے مختلف رنگ و نسل کے درخت استادہ تھے۔ اس کشادہ صحن ہی میں باورچی خانہ، اسٹور روم وغیرہ ایک دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ دوسری دیوار کے ساتھ بھی دور رہائشی کمرے نظر آرہے تھے۔ صحن کے بعد، عمارت والے حصے میں ایک قدرے اونچی چھت والا ہال نما کمرا تھا جہاں پیر سائیں اپنے عقیدت مندوں کے سامنے ''جلوہ افروز'' ہوتے تھے۔ اس ہال کے عقب میں جھاڑو والی سرکار کا حجرہ واقع تھا۔ اس حجرے میں آمد و رفت کے لیے دو راستے تھے۔ ایک تو وہی ہال کی جانب سے اور دوسرا عقب میں نہر کی سمت۔ یہ عقبی راستہ عموماً بند ہی رہتا تھا اور پیر سائیں اپنی مرضی سے بہ وقتِ ضرورت اسے استعمال کرتے تھے۔

ہم صحن میں داخل ہوئے تو درمیانے قد کا ایک دیہاتی، رہائشی کمرے سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ وہ اپنے جثے اور ڈیل ڈول سے لڑائی بھڑائی کا ماہر کوئی غصہ ور شخص نظر آتا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہماری طرف آگیا تھا۔

اس نے باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ اقبال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکا جبکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے نظارے نے اسے تھوڑا الجھا دیا۔ اقبال نے فوراً کہا۔

''نئی بھرتی ہے..... کانسٹیبل جاوید خان!''

اس شخص نے سکون بھری سانس خارج کی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اقبال کی صورت سے واقف تھا اور میرے ناشناسا چہرے نے اسے الجھا دیا تھا اور اس شخص کا یہ رویہ میرے لیے مفید ثابت ہوا تھا۔ ازاں بعد مذکورہ شخص کا نام سخی محمد عرف سخیا معلوم ہوا۔ محمد اقبال کی وضاحت سے مطمئن ہونے کے بعد سخیا نے یکے بعد دیگرے سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا۔

محمد اقبال نے کہا ''سخیا! ہم ایک ضروری کام سے آستانے پر آئے ہیں۔ ہمیں تھانیدار صاحب نے اِدھر بھیجا ہے۔''

سخیا نے ہمارے بیٹھنے کے لیے فوراً ایک چارپائی بچھا دی اور قدرے اکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سنتری بادشاہ! حکم کرو..... کیا کام ہے؟''

میں نے سخیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''کام دراصل، سائیں جی سے ہے۔ انچارج صاحب نے انہی کے پاس بھیجا ہے۔''

اس نے ایک لمحہ سنو چا پھر بچھی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ''آپ بیٹھیں جی..... میں سائیں جی کو آپ کے بارے میں بتا کر آتا ہوں''

بات ختم کرتے ہی وہ آستانے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

محمد اقبال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھیں ملک صاحب! دیکھتے ہیں، یہ سخیا کیا خبر لے کر آتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق، سخیا سائیں صاحب کی خدمت شدمت کے لیے ادھر آستانے پر ہی موجود ہوتا ہے۔ آستانے پر کل تین افراد ہوتے ہیں۔ سائیں قلندر شاہ، سکندر شاہ اور سخیا۔''

میں نے کانسٹیبل کی آواز پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سخیا آستانے کے اندرونی حصے میں غائب ہو چکا تھا اور اس وقت سکندر شاہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے اور اقبال کے سوا وہاں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔

''محمد اقبال! سو بنے محمد صلعم تمہارا اقبال بلند کریں..... تم بیٹھو ادھر چارپائی پر۔ میں ذرا گھوم پھر کر آستانے کا جائزہ لیتا ہوں۔''

اسی ''گھومنے پھرنے'' کے دوران میں، میں نے آستانے کا جو ''جائزہ'' لیا، اوپر اس وقوع پذیری کی تفصیل بیان کی ہے۔ میری یہ تحقیق رات والے مشن کے لیے نہایت ہی اہم تھی!

لگ بھگ دس منٹ کے بعد سخیا عمارت میں سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ہٹا کٹا شخص بھی تھا۔ اس وقت تک میں راؤنڈ لگا کر واپس آ چکا تھا۔ میں نے سخیا کے گینڈے ہم راہی کے بارے میں محمد اقبال سے استفسار کیا۔

''اقبال! کیا یہی جھاڑو والی سرکار، سائیں قلندر شاہ ہے؟''

''نہیں، ملک صاحب!'' وہ دھیمے لہجے میں بولا ''یہ سائیں کا خاص بندہ سکندر شاہ ہے۔''

سکندر شاہ سے یہ میرا پہلا ''تعارف'' تھا۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے ایک بنا بنایا ڈیا پیر نظر آتا تھا۔ چہرہ مکروہ، بے ترتیب ڈاڑھی، ماتھے پر نحوست اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی ہوس کی مخصوص سرخی اور دیکھنے کے انداز میں بڑا ندیدہ پن..... مغرور اور خود پسند!

سکندر شاہ، سخیا کی معیت میں ہمارے پاس پہنچا اور کراری آواز میں کہا ''السلام علیکم.....!''

اس کے بعد وہ تنقیدی نظروں سے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ ہم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور محمد اقبال نے اس سے کہا۔

''ہم سائیں جی سے ملنے آئے ہیں۔''

عام طور پر میرے تجربے میں یہ آیا ہے کہ پولیس کا کوئی معمولی سا اہلکار بھی کہیں کسی کام سے جائے تو اسے چائے پانی کے لیے پوچھا جاتا ہے لیکن سکندر شاہ نے ایسے کسی تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سخیا نے اسے جا کر بتایا ہوگا، تھانے سے دو کانسٹیبلز آئے ہیں اور اس مغرور کی نظر میں کانسٹیبلز کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی..... اس قسم کی سوچ صرف اسی شخص کی ہو سکتی ہے جو خود کو کوئی توپ قسم کی شے سمجھتا ہو..... یا پھر کسی توپ کا گولہ!

سکندر شاہ نے سخیا کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور محمد اقبال کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بات کے جواب میں بولا۔ ''آپ کو سائیں جی سے کیا کام ہے؟''

میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا ''کام بہت ضروری ہے جناب..... صرف سائیں جی کو ہی بتایا جا سکتا ہے..... کیا وہ آستانے کے اندر موجود ہیں؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے سر تا پا گھور کر مجھے دیکھا جیسے میرا ایکسرے کر رہا ہو پھر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

''سائیں صاحب! اس وقت اپنے حجرے میں آرام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرمارہے ہیں۔ اگر خاص طور پر انہی سے ملنا ہے تو پھر آپ لوگ شام میں ادھر آئیں۔ میں ان کو بیدار کرنے کی گستاخی نہیں کرسکتا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر نخوت بھرے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ لوگ کام مجھے بتادیں تو ہوسکتا ہے، آپ کو سائیں جی سے ملاقات کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ میں آپ کا کام کردوں..... مرشد اکثر کاموں کے سلسلے میں میری ہی خدمت لیتے ہیں۔''

میں نے سوچنے والے انداز میں محمد اقبال کی طرف دیکھا اور پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اقبال! یہ شاہ صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ہمیں اپنا مسئلہ ان کو بتادینا چاہیے یہ سائیں صاحب کے بہت قریب ہیں، ضرور ہماری مدد کریں گے۔''

ویسے بھی مجھے سائیں قلندر شاہ سے فی الحال ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس سے رات ہی کو ایک بھرپور ملاقات ہوئی۔ میں اس وقت دراصل سکندر شاہ کا انٹرویو کرنے آستانے پر آیا تھا اور وہ میرے سامنے موجود تھا۔

اقبال نے میری تجویز کے جواب میں کہا ''ٹھیک ہے جاوید خان! تم پوچھ لو ان سے، کیا پوچھنا ہے.....!''

وہ جان بوجھ کر مجھے ''تم'' کے صیغے سے مخاطب کررہا تھا تاکہ سکندر شاہ کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ویسے میرے لیے یہ بات بڑی اطمینان بخش تھی کہ سکندر شاہ مجھے تھانہ انچارج کی حیثیت سے پہچان نہیں سکا تھا۔ محمد اقبال کا اشارہ پاتے ہی میں شروع ہوگیا۔

میں نے سکندر شاہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''شاہ جی! ہم دراصل، اللہ بخش کے گمشدہ بچے قادرا کی تلاش کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں اور.....!''

''سائیں جی اور آستانے کا اس بچے کی گمشدگی سے کیا تعلق؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی تڑخ کر بولا۔

اس کے انداز نے مجھے سلگا کر رکھ دیا لیکن میں برداشت کرگیا کیونکہ میں اس وقت تھانیدار کی حیثیت سے وہاں نہیں گیا تھا اور دوسری جانب ایک سپاہی کے مقابلے میں سائیں کے بندۂ خاص کی اہمیت بھی کم نہیں تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو معتدل رکھتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی..... تعلق تو ہے..... اور آپ بھی اس بات کو مانیں گے!''

''کیا تعلق ہے'' وہ بدستور اکھڑے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ذرا وضاحت کرو تم؟''

میں نے کہا ''یہ آستانہ سائیں قلندر شاہ کا ہے اور تم سائیں جی کے خاص آدمی ہو.....'' میں بھی فوراً آپ کے بجائے تم پر آگیا تھا ''جب گمشدہ قادرا کا تعلق تم سے ہوسکتا ہے تو پھر آستانے یا سائیں صاحب سے کیسے نہیں ہوسکتا!''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟'' اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''سکندر شاہ! ہمارے پاس اس بات کے مصدقہ ثبوت موجود ہیں کہ تم ہی وہ آدمی ہو جسے آخری مرتبہ قادرا کے ساتھ دیکھا گیا ہے..... یعنی قادرا اپنی گمشدگی سے پہلے تمہارے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور یہ واقعہ کچھ زیادہ پرانا نہیں بلکہ کل ہی رات کا ہے۔''

''یہ کیا بکواس کررہے ہو.....؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میری بات سن کر اس کا چہرہ متغیر ہوگیا تھا جیسے میں نے اس کے کسی انتہائی نازک پہلو کو چھیڑ دیا ہو۔ اس کی حالتِ غیر سے میں محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا اور سکندر شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے کہا۔

''یہ بکواس نہیں، بلکہ اٹل حقیقت ہے اور اس واقعے کی بڑی ٹھوس گواہی ہے پولیس کے پاس.....!''

''ٹھوس گواہی'' اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا ''ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ وہ گواہی کیا ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''وہ ٹھوس گواہی دو افراد کی شہادت کے حوالے سے ہے اور دونوں افراد کے بیان میں تھوڑا تضاد بھی پایا جاتا ہے اور یہ تضاد تمہاری وجہ سے ہے اس لیے تم ہی اس امر کی وضاحت کردو گے۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میرے غیر متزلزل انداز نے اسے گڑبڑا دیا تھا، آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی اکڑ میں خاصی کمی آگئی تھی۔

''وہ دو گواہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے میرے خلاف کیا شہادت دی ہے؟''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ان دو گواہوں میں سے ایک کا نام کامران عرف کامی ہے۔ یہ بارہ تیرہ سال کا ایک دبلا پتلا اور دراز قامت لڑکا ہے جو کل رات گمشدہ قادرا کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اگر تم کامی کو نہیں جانتے تو اس کے باپ حفیظ اللہ کو ضرور پہچانتے ہوگے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موضع رتن گڑھ کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔'' میں سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کل رات کامی نے تمہیں قادرا کے ساتھ اس جگہ کھڑے باتیں کرتے دیکھا تھا جہاں سے ایک سیدھی پگ ڈنڈی آستانے کی طرف آتی ہے۔ کامی کا گھر اِدھر ہی گاؤں کے کنارے پر واقع ہے۔ کامی نے قادرا کو تمہارے ساتھ کھڑے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا کہ تم ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے کیونکہ قادرا تھوڑی دیر پہلے گھر جانے کا کہہ کر اس کے پاس سے گیا تھا اور قادرا کا گھر بھی گاؤں کی دوسری سمت میں ہے۔ تم نے اس سے کہا.....''

''میں نے کسی کامی شامی سے کچھ نہیں کہا.....'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ''یہ لڑکا سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔''

''تو کیا قادرا کا باپ اللہ بخش بھی سراسر جھوٹ بول رہا ہے؟'' میں نے قدرے بگڑے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

''اللہ بخش.....!'' اس نے متذبذب انداز میں دہرایا ''اللہ بخش کیا کہہ رہا ہے؟''

''میں نے جن دو گواہوں کا ابھی ذکر کیا ہے نا، ان میں ایک تو کامی اور دوسرا اللہ بخش ہے'' میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''گزشتہ رات اللہ بخش قادرا کی تلاش میں اِدھر آستانے پر بھی آیا تھا کیونکہ کامی نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ تمہاری اللہ بخش سے بات ہوئی اور تم نے اس امر کا اقرار کیا کہ قادرا سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ تم نے قادرا کو نصیحت کی تھی کہ چھوٹے بچے اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتے..... اور وہ تمہاری نصیحت سن کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ تم تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر اسے گھر جاتے ہوئے دیکھتے رہے پھر آستانے کی طرف چل پڑے تھے جب کہ کامی نے ذرا مختلف بیان دیا ہے اور وہی یہ تضاد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا.....!''

میں ایک مرتبہ پھر تھوڑا متوقف ہوا، ایک گہری سانس لے کر خود کو تر و تازہ کیا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''کامی کا کہنا یہ ہے کہ نہ تو قادرا تمہاری نصیحت سن کر اپنے گھر کی جانب بڑھا تھا اور نہ ہی تم آستانے کی طرف بلکہ اس کا خیال ہے کہ تم نے اسے ایسی کوئی نصیحت ہی نہیں کی تھی۔ کامی تم دونوں کو اندھیرے میں کھڑے باتیں کرتے چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ سکندر شاہ! کامی اور اللہ بخش میں سے کوئی ایک تو جھوٹا ہو سکتا ہے مگر دونوں کو بہ یک وقت جھٹلانا ممکن نہیں اور..... دونوں کے بیانات میں بنیادی تضاد کے ساتھ ہی ایک قدر مشترک بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ..... گزشتہ رات تم گمشدہ قادرا سے ملے تھے جبکہ تم ابھی اس حقیقت سے انکار کر چکے ہو؟''

سکندر شاہ ان لمحات میں، مجھے خاصا پھنسا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ قادرا کی گمشدگی میں کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ہاتھ ضرور رہا ہوگا ورنہ وہ اس طرح نہ بدکتا، تاہم وہ فوری طور پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کامی اور اللہ بخش نے جھوٹ کیوں بولا جبکہ میں قادرا سے بالکل نہیں ملا۔ میں تو اس کی شکل سے بھی واقف نہیں ہوں.....!''

اس نے ایسے انداز سے جملہ ادھورا چھوڑا جیسے آگے کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ میں اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ گیا اور سپاٹ آواز میں کہا۔

''چلو، کوئی بات نہیں یہی بیان تم تھانہ انچارج کے سامنے دے دینا۔ اللہ اللہ، خیر سلاّ..... ہو سکتا ہے، انچارج صاحب تمہاری بات کو سمجھ جائیں۔''

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا ''میری بات کو سمجھنا تم سنتریوں کے بس کا کھیل نہیں۔ میں تمہارے انچارج صاحب ہی سے ملوں گا۔''

''ملوں گا نہیں..... ابھی چل کر ملیں'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔''

وہ خاصا متفکر نظر آنے لگا۔ میرے اٹل انداز نے اسے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ رسّی تڑا کر بھاگ نکلنے والے کسی خودسر جانور کے مانند دوڑ لگا دے گا۔ آنِ واحد میں، میرے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا اور میں دل و جان سے اس بات کے لیے تیار ہو گیا کہ حلوے مانڈے کھا کر سانڈ کی صورت اختیار کرنے والے سکندر شاہ نے اگر اچانک فرار کی راہ اختیار کی تو میں اسے نکلنے کا ہرگز ہرگز موقع نہیں دوں گا۔

تاہم دو سو گز کی دوڑ میں حصہ لینے کے بجائے اس نے تشویش بھرے انداز میں کہا ''مجھے تمہارے تھانہ انچارج ہی سے بات کرنا پڑے گی لیکن..... ایک منٹ ٹھہرو، میں ذرا سائیں جی کو بتا آؤں پھر تمہارے ساتھ تھانے چلتا ہوں.....!''

سکندر شاہ کی بدنیتی اس کی آنکھوں اور چہرے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مترشح تھی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہوگیا کہ وہ سائیں کے پاس جانے کا بہانہ کرکے رفو چکر ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اس کا یہ فراری ارادہ اس بات کا غماز تھا کہ قادرا کی گمشدگی والے معاملے میں اس کے ہاتھ پاؤں خاصے آلودہ تھے، چاہے یہ آلودگی اس کی مرضی سے ملی تھی یا سائیں جی کے حکم پر اس نے کسی کچرا کنڈی سے گندگی کھانے کی کوشش کی تھی!

میں نے ریڈ الرٹ ہوتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''سکندر شاہ! قبلہ سائیں صاحب تو اس وقت آرام فرما رہے ہیں۔ انہیں ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے زحمت دینا ٹھیک نہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو، انچارج صاحب سے بات کرنا اور دس منٹ میں واپس آستانے پر آجانا!''

وہ گھرے ہوئے کتے کے مانند بوکھلا کر رہ گیا، الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سائیں جی کو اس بارے میں بتانا بہت ضروری ہے.....!''

''لیکن سائیں صاحب تو اس وقت اپنے حجرے میں آرام فرما رہے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جب ہم نے سائیں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی تو تم نے انہیں بیدار کرنے کی گستاخی سے صاف انکار کردیا تھا اور اب.....!''

''تم لوگ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔'' وہ میری بات کو کاٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ روحانی معاملات ہیں..... سائیں جی کو بتانا بہت ضروری ہے۔''

میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''سکندر شاہ! یہ سخیا بھی تو کافی عرصے سے آستانے پر سائیں جی کی خدمت کررہا ہے۔ سائیں نے اس کے اندر بھی اچھی خاصی روحانیت بھر دی ہوگی۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو سخیا، سائیں کو بتادے گا۔ ویسے بھی.....'' میں نے اپنے ہاتھ کو ہوا میں کسی جہاز کے مانند حرکت دی اور کہا۔ ''تم نے یوں جانا ہے اور یوں آنا ہے.....!''

سائیں کے چیلے سکندر شاہ کو اہنی زیور پہنا کر تھانے لانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن بہ حیثیت کانسٹیبل جاوید خان، اس سے یہ اٹکھیلیاں کرنے میں مجھے بڑا مزہ آرہا تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ میری اس تفریح میں وقت ضائع ہورہا ہے تو میں ذرا تحت ہوگیا تھا۔ وہ میری تجویز کے جواب میں جھنجلا کر بولا۔

''تم سمجھتے نہیں ہو، سائیں جی سے میرا کیا معاملہ ہے.....!''

''چلو ٹھیک ہے، میں تمہاری بات رکھ لیتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم اپنے سائیں جی کو مطلع کرنے کے بعد ہمارے ساتھ تھانے چلنا۔ چلیں، اسی بہانے ہمیں بھی سائیں جی کا دیدار کرنے کا موقع نصیب ہوجائے گا اور ہم یہ بھی دیکھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہوجائیں گے کہ اپنے مرشد قبلہ سائیں قلندر شاہ سے تمہارے کس قسم کے روحانی معاملات ہیں!''

''کیا مطلب.....؟'' وہ اس طرح اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار سے ہاتھ چھو گیا ہو۔ ''کیا میں تم دونوں کو اپنے ساتھ حجرے میں لے کر جاؤں گا؟''

میں نے اس کے دکھتے ہوئے زخم پر بڑی میٹھی سی چوٹ لگائی ''اگر..... ہم دونوں کا وہاں جانا مناسب نہیں تو پھر محمد اقبال ادھر ہی رک جاتا ہے اور صرف میں تمہارے ہمراہ سائیں جی کے پاس چلتا ہوں؟''

''ناممکن.....!'' وہ قطعی انداز میں بولا ''میں تم میں سے کسی کو بھی سائیں جی کے حجرے میں نہیں لے کر جاسکتا۔ آخر تخلیہ بھی کوئی شے ہے!''

''اگر ہم حجرے میں نہیں جائیں گے تو تمہیں بھی نہیں جانے دیں گے۔'' میں نے خالص تھانیدارانہ لہجے میں کہا ''قانون کی بالادستی، سائیں کے تخلیے سے زیادہ اہم ہے۔''

سخیا ہماری اس گرما گرمی کو دیکھتے ہوئے قریب آگیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا ''ہم ضروری پوچھ گچھ کے لیے سکندر شاہ کو تھانے لے جارہے ہیں۔ اس دوران میں تم سائیں جی کے آرام کا خاص خیال رکھنا۔ ویسے تو مجھے امید ہے، سکندر شاہ پندرہ بیس منٹ میں واپس آجائے گا اور اگر خدانخواستہ اس کی واپسی سے پہلے سائیں جی کی آنکھ کھل جائے تو انہیں بتا دینا، تھانیدار صاحب نے کوئی ضروری بات کرنے کے لیے سکندر شاہ کو تھانے بلایا ہے۔''

پھر سخیا کا جواب سنے اور ردِعمل دیکھے بغیر ہم سکندر شاہ کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آگئے۔ راستے بھر تو وہ ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ ہم یہ سب کچھ ٹھیک نہیں کررہے۔ وہ تھانہ انچارج سے ہمارے رویّے کی شکایت کرے گا جس کے نتیجے میں ہوسکتا ہے، انچارج صاحب ہماری پٹیاں اتروادیں یا ہمیں لائن حاضر کردیں یا پھر کم از کم ہمیں الٹا لٹکا کر چھترمار یں گے لیکن جب تھانے پہنچ کر اسے پتا چلا کہ میں ہی وہاں کا انچارج ہوں تو اس کے ہاتھوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

میں نے پہلی فرصت میں یہ کام کر دیا تھا کہ کانسٹیبل محمد اقبال اور کانسٹیبل بشیر حسین کو سادہ لباس میں آستانے کی جانب روانہ کر دیا۔ انہیں میں نے تاکید کی تھی کہ وہ گھوم پھر کر آستانے کے داخلی اور خارجی راستے پر نظر رکھیں اور اگر سائیں قلندر شاہ اپنے آستانے سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کرے تو نہایت ہی خفیہ انداز میں اس کا تعاقب کریں۔ اسے خواہ مخواہ چھیڑنے کی ضرورت نہیں لیکن اگر وہ یہ محسوس کریں کہ سائیں چالاکی سے کہیں فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر اس کے فرار کو ناکامیاب بنانے کے لیے وہ کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتے ہیں لیکن ہر صورت میں سائیں قلندر شاہ مجھے زندہ حالت میں ملنا چاہیے۔ اقبال اور بشیر صحت اور طاقت کے اعتبار سے ایسے تھے کہ بہ آسانی سائیں کو قابو کر سکتے تھے۔

سکندر شاہ کے مطابق، سائیں اپنے حجرے میں محوِ استراحت تھا اور ابھی فوری طور پر اس کی بیداری کا کوئی امکان نہیں تھا، بہ شرطیکہ سخیا معقولیت کا مظاہرہ کرتا۔ اگر وہ میرے کہنے کا یقین کر لیتا کہ سکندر شاہ تھوڑی دیر میں آستانے پر واپس آجائے گا تو پھر وہ سائیں کی طرف سے بے فکر ہو سکتا تھا لیکن اگر اس کے ذہن میں مہم جوئی کا خیال آجاتا تو وہ فوراً سائیں کو بیدار کر کے اس واقعے کی اطلاع دے سکتا تھا۔ بہرحال، اس سلسلے میں فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا صورتِ حال پر غور کر رہا تھا کہ اللہ بخش کا چھوٹا بھائی نبی بخش تھانے پہنچ گیا۔ وہ آج صبح اپنے سالوں کی معیت میں اپنے بھتیجے قادرا کی تلاش میں نکلا تھا اور میری ہدایت کے مطابق، اسے جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد جا کر اپنے رشتے داروں کے ہاں قادرا کو ڈھونڈنا تھا۔ میں نے فوراً نبی بخش کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ عصر اور مغرب کے بیچ کا وقت تھا۔ میری طلبی پر نبی بخش کمرے میں آگیا۔ میں نے اس کے عقب میں نگاہ دوڑائی تو وہ فوراً سے پیش تر میری تشویش کو بھانپ گیا، جلدی سے بولا۔

''میں نے اپنے سالوں کو گھر بھیج دیا ہے تاکہ بھائی اللہ بخش کو اطلاع دے دیں کہ ہم اپنے مشن سے واپس آگئے ہیں..... میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں تھانیدار صاحب!''

''مشن سے واپس تو آگئے ہو لیکن تمہارے لٹکے توتے اور دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ اپنی شکایت کے نتیجے میں اس نے جو جوسزائیں ہمارے لیے تجویز کی تھیں وہ اس کی نگاہ کے سامنے گھومنے لگیں۔

میں نے ایک سوال کیے بغیر اسے حوالدار مبارک علی کے حوالے کر دیا۔ مبارک علی نے سکندر شاہ کی جانب کچھ اس انداز میں اشارہ کیا جیسے وہ کوئی بے کار سی شے ہو پھر مجھ سے پوچھا۔ مجھے اس کے انداز سے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان لوگوں سے خوش نہیں تھا۔

''ملک صاحب! اس کا کیا کرنا ہے؟'' حوالدار کے لہجے میں ناپسندیدگی کی جھلک تھی۔ میں نے کہا ''مبارک علی! کیا تم سکندر شاہ چیلا آف قلندر شاہ المعروف بہ جھاڑو والی اینڈ بادام والی سرکار وغیرہ کو نہیں جانتے۔ بھئی، یہ ہمارے خاص مہمان ہیں۔ انہیں مہمان خانے میں ٹھہراؤ، ان کی خاطر داری کے انتظامات کا جائزہ لو اور انہیں وہ سب کچھ دکھا بھی دو۔ نوع بہ نوع آئٹمز کو دیکھ کر ان کی طبیعت سرشار ہو جائے گی لیکن ابھی کھانا چننے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک دو ضروری کام کر لوں پھر پروگرام شروع کریں گے۔ ویسے بھی جب تک ہمارے مہمانِ خصوصی سائیں قلندر شاہ یہاں تشریف فرما نہیں ہو جاتے، دسترخوان کیسے بچھایا جا سکتا ہے..... ہے نا؟''

حوالدار نے اپنے سر کو معنی خیز اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''ہو جائے گا سب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔ جب تک بخش [illegible] اگر وہ حاضر نہیں ہو جاتا ہم کوئی کارروائی کیسے کر سکتے

سکندر شاہ ہماری طنزیہ، نکیلی، کٹیلی اور ہڈیوں تک اتر جانے والی معنی خیز باتوں کو سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پریشانی میں اضافہ کرتے ہوئے مبارک علی سے کہا، میرا انداز سمجھانے والا تھا۔

''بھئی! تم سکندر شاہ کے گرو کو حاضر کرنے کے لیے جو بھی نیلا پیلا، لال ہرا عمل کرو، اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ چیلا جی کی سلامتی کونسل کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے چھوٹے شاہ صاحب سے ابھی بہت سے ضروری کام نکلوانے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' حوالدار، سکندر شاہ کو کسی قصاب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ کی امانت ہے۔ میں شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری دیانتداری کے ساتھ اس میں کوئی خیانت نہیں کروں گا۔''

سکندر شاہ کے چہرے پر زردی نمودار ہونے لگی!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا'' میرا اندازہ غلط تو نہیں نبی بخش؟''

''نہیں جناب..... آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔'' وہ تھکی ہوئی آواز میں بولا'' خاطر خواہ نہیں بلکہ ہمیں سرے سے کامیابی ہوئی ہی نہیں..... ہم نامراد واپس لوٹ آئے ہیں۔''

''ناامیدی اور نامرادی میں تھوڑا فرق ہوتا ہے نبی بخش!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' تم نامراد ضرور لوٹے ہو لیکن تمہیں ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ بتاؤ مجھے، وہاں کی کیا رپورٹ ہے؟''

وہ ٹوٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔'' تھانیدار صاحب! ہم نے ہر جگہ جا کر دیکھ لیا۔ سلمٰی، کریم بخش اور قادرا کے نانکے میں ایک ایک آدمی سے پوچھ لیا ہے لیکن کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں ملی۔ ان سب کا یہی کہنا ہے کہ قادرا وہاں نہیں آیا۔ نہ تو اکیلا اور..... نہ ہی کسی کے ساتھ۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی رپورٹ کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔'' آپ جانتے ہیں کہ جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد تین الگ الگ کونوں میں ہیں۔ ہم نے اپنی کوشش کر کے دل کو تسلی دے لی لیکن اس طرح کہاں دل کو اطمینان ہوتا ہے جناب..... ہم نے جہاں جہاں قادرا کی گمشدگی کے بارے میں بتایا، وہ لوگ بھی پریشان ہوئے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ..... !'' وہ ایک مرتبہ پھر رک گیا۔ بولتے بولتے اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد بوجھل لہجے میں بتانے لگا۔

''آپ کہتے ہیں کہ مجھے ناامید نہیں ہونا چاہیے..... تو اب یہی آخری سہارا ہے۔ سنا ہے، یہ دنیا امید پر قائم ہے.....''

بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ میں اس کی تکلیف کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اسے اپنے بھتیجے قادر بخش عرف قادرا سے بڑی محبت تھی۔ بھائی کی اولاد سے ویسے بھی بہ نسبت زیادہ ہی لگاؤ ہوتا ہے۔ ''چاچا بھتیجا'' کی جوڑی کو مثالی سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ نبی بخش کی قادرا کے لیے چاہت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی تک اس کی اپنی اولاد نہیں تھی۔

میں نے اس کی کیفیت کے پیشِ نظر کہا'' نبی بخش! تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ یہ دنیا واقعی امید کے مرکز پر قائم و دائم ہے۔ امید مرکز اور یقین محور و محیط ہے۔ جس انسان میں امید اور یقین کی قوت زندہ ہوتی ہے وہ بڑی مشکل اور مصیبت کو پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا سکتا ہے..... میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم امید کا دامن تھام کر رکھو گے تو کامیابی ایک دن ضرور تمہارے قدم چومے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب.....'' نبی بخش نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔'' میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ تو بتائیں، آپ یہاں پر قادرا کو تلاش کرنے کے لیے کیا عملی کوششیں کر رہے ہیں؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں نپا تُلا جواب دیا۔ ''اگرچہ ابھی تک میں قادرا کا کوئی واضح سراغ نہیں لگا سکا ہوں لیکن یہاں کی کارروائی سے میں پوری طرح پُرامید اور مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے، کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کامیابی میرے قدم چوم لے گی۔''

''اچھا..... آپ تو یہ بہت بڑی خوش خبری سنا رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا'' ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ نے کوئی اہم پوائنٹ تو پکڑ لیا ہے لیکن ابھی اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا تھانیدار صاحب؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے نبی بخش!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا'' کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے!'' وہ پُراشتیاق نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم ایک عقلمند انسان ہو نبی بخش.....!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا'' جب تمہیں اندازہ ہے کہ میں قبل از وقت معاملے کو کھولنا نہیں چاہتا تو پھر تمہیں ایسی فرمائش کرنا ہی نہیں چاہیے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا'' آپ کہہ رہے ہیں تو میں ضد نہیں کروں گا۔ آپ تھانیدار ہیں۔ قانون اور تفتیش کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ کسی مصلحت کی بنا پر ہی تو ایسا کر رہے ہوں گے۔ اگر آپ فی الحال اس معاملے کو راز رکھنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''شاباش..... تم ایک معقول انسان ہو'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

وہ بولا'' مجھے اجازت دیں جانے کی۔ ادھر بھائی اللہ بخش میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں ابھی ٹھہرا بھی نہیں گیا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اپنے کمرے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ شام کے سائے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے کہا ''نبی بخش! اگر اللہ بخش ہی سے ملنے جا رہے ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں یہیں پر تمہاری اس سے ملاقات کروا دیتا ہوں۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''کیا بھائی اللہ بخش یہاں آنے والا ہے؟''

اس کے استفسار پر میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''صرف بھائی ہی نہیں بلکہ تمہاری بھابی بھی کچھ دیر میں یہاں پہنچے .....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نبی بخش کے عقب میں دیکھا اور بہ آوازِ بلند کہا۔

''لو دیکھو..... وہ دونوں پہنچ بھی گئے.....!''

نبی بخش بے ساختہ گردن گھما کر پیچھے دیکھنے لگا۔

اللہ بخش حسبِ وعدہ، سورج غروب ہونے سے قبل ہی اپنی گھر والی زاہدہ کے ہمراہ میرے پاس آ گیا تھا۔ زاہدہ دلکش حسن کی مالک ایک پُرکشش عورت تھی۔ سائیں قلندر شاہ عرف جھاڑو والی سرکار کی نیت میں بال اور منہ میں رال کوئی ایسے ہی نہیں آئی تھی۔ وہ زاہدہ کے اَدھ ننگے جوبن پر اپنی ہوس کی جھاڑو پھیرنے کا مکمل پروگرام بنائے بیٹھا تھا.....!

ایک سنسنی خیز پروگرام میرے ذہن میں بھی ترتیب پا چکا تھا جو سائیں عرف آوارہ بابا کے پروگرام کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دیتا۔

اپنی بھابی اور بڑے بھائی کو میرے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نبی بخش فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں بھی نبی کو میرے پاس موجود پا کر چونک گئے تھے۔ شاید انہیں اس کی یہاں موجودگی کی توقع نہیں تھی۔ اللہ بخش نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ہاں نبی بخشا..... کیا رہا اس طرف..... کیا میرے قادرا کا کچھ پتا چلا؟''

زاہدہ نے کہا۔ ''نبی بخش کے چہرے سے تو لگتا ہے، یہ ناکام..... لوٹا ہے۔ اللہ خیر کرے..... میرا قادرا پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے؟''

اس سے پہلے کہ نبی بخش اپنے بھائی اور بھاوج کے سوالات کے جواب میں زبان کھولتا، میں نے دونوں میاں بیوی کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ اطمینان سے بیٹھو، پھر نبی بخش تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے۔''

وہ دونوں میری ہدایت کے مطابق، نبی بخش کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ نبی بخش انہیں جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد سے متعلق اپنی اب تک کی کارکردگی سے آگاہ کرنے لگا اور میں خاموش نظروں سے زاہدہ کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے حسن اور جوانی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ اس وقت تیس کے پیٹے میں تھی اور ماشاءاللہ دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ قادر بخش عرف قادرا لگ بھگ دس برس کا تھا۔ قادرا سے چھوٹی ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام خالدہ تھا اور اس کی عمر سات سال تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ زاہدہ کی شادی کو کم از کم گیارہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، اس کی شادی اٹھارہ انیس سال کی عمر میں ہوئی ہو گی۔ زاہدہ کی خوبصورتی اور دلکشی تو اپنی جگہ تھی ہی، اس پر مستزاد یہ کہ وہ خوب بن ٹھن کر بھی آئی تھی، گویا اس کے سراپا میں دو آتشہ کا تڑکا لگا ہوا تھا۔

ایک بات عموماً دیکھنے میں آئی ہے کہ اگر عورتوں کو کسی ڈاکٹر کے کلینک میں جانا ہو یا کسی پیر سائیں کے آستانے پر حاضری دینا ہو، وہ اپنے بناؤ سنگار اور خوش لباسی میں کوئی کمی نہیں آنے دیتیں۔ اس کے بالعکس شوہر کا قرب حاصل کرتے وقت وہ زیادہ تر ایسے لباس میں ملبوس ہوتی ہیں جس سے لہسن پیاز اور مختلف چٹنیوں کی مخصوص باس اٹھ رہی ہوتی ہے۔ میرا بیان کردہ یہ فارمولا ہر خاص و عام بیوی پر لاگو نہیں ہوتا۔ میں ان معدودے چند بیویوں سے انتہائی، معذرت خواہ ہوں جو اپنے شوہروں کی خواہش اور حسِ لطیف کا پورا خیال رکھتی ہیں..... میں نے اوپر جو کچھ بھی کہا، وہ ان سے متعلق نہیں ہے!

پانچ منٹ کے اندر نبی بخش نے اپنے بھائی اور بھاوج کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تو میں نے اس سے کہا۔

''نبی بخش! تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ میں ابھی تمہیں اپنے پاس بلاتا ہوں۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

وہ کوئی سوال کیے بغیر اٹھا اور خاموش قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اللہ بخش اور زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو تم لوگ تیار ہو کر آ گئے ہو.....؟''

''جی تھانیدار جی۔'' اللہ بخش نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ کا حکم تھا، آستانے کی طرف جانے سے پہلے آپ سے ملتے ہوئے جائیں اس لیے ہم تھانے آئے ہیں.....'' وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے سائیں صاحب کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے کوئی تحفہ وغیرہ دینے کی بات کی تھی!''

''ہاں..... وہ تحفہ میں نے منگوالیا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر زاہدہ کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد اللہ بخش سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری گھر والی پہلے بھی سائیں جی کے آستانے پر جاتی رہتی ہے یا آج پہلی مرتبہ.....!''

اللہ بخش کے بجائے زاہدہ نے ترت جواب دیا۔ ''تھانیدار جی! میں اس سے پہلے صرف ایک بار ادھر آستانے پر گئی ہوں، آج دوسری مرتبہ جارہی ہوں۔''

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری نہ ہوئی کہ سائیں قلندر شاہ، زاہدہ کے دلکش سراپا کو دیکھ کر پھڑک گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، اس وقت زاہدہ کی پریشانی اور موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بہانے سے اسے اپنے آستانے پر بلایا ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ بھی طے تھا کہ زاہدہ چند روز پہلے ہی آستانے پر گئی ہوگی۔ ورنہ پیر بادام شاہ عرف جھاڑو والی سرکار اتنے دن صبر کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنے خیال کی تصدیق کے لیے زاہدہ ہی سے پوچھ لیا۔

''زاہدہ..... یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے جب تم سائیں صاحب سے ملنے گئی تھیں؟''

اس نے میرے اندازے کے عین مطابق جواب دیا۔ ''دس دن پہلے جی۔''

''اور حاجت کیا تھی.....!'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، تم کس مقصد سے وہاں گئی تھیں؟''

''وہ جی.....'' وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''میں جی گھر کی اور دکان کی خیر و برکت کے لیے سائیں صاحب سے دعا کرانے گئی تھی۔''

''انہوں نے تمہارے حق میں دعا کردی ہوگی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی..... جی ہاں!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''اور تمہیں یقین ہے، سائیں جی کی دعا میں بڑا اثر ہے؟''

''بالکل جی.....!'' وہ پُروثوق لہجے میں بولی۔ ''اسی لیے تو قادرا کے سلسلے میں، میں دم کرانے سائیں جی کے حجرے میں جارہی ہوں.....'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر بڑے یقین سے بولی۔ ''سائیں جی نے خیر و برکت کے لیے جو دعا کی تھی اس نے بہت اثر دکھایا تھا اور مجھے امید ہے، سائیں جی قادرا کی گمشدگی کے بارے میں بھی ہماری مدد ضرور کریں گے۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو.....!'' میں نے زاہدہ کا دل رکھنے کے لیے نیم دلی سے کہا۔

اللہ بخش نے تہ دل سے کہا۔ ''آمین.....!''

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ دس روز پہلے جھاڑو والی سرکار نے زاہدہ کے ہوش ربا حسن کا نظارہ کیا تھا اور جبھی سے وہ اس کے تصور پر رال ٹپکا رہا ہوگا۔ قادرا کی گمشدگی نے سائیں کو موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ بہانے بہانے اپنی ہوس کی ضیافت کا اہتمام کرڈالے۔ بہرحال، میں تھانے کے ٹرائل روم میں سائیں کی خاطر مدارات کے لیے بڑے زبردست انتظامات کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے تھانیدار جی؟'' اللہ بخش نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ سائیں جی کے آستانے پر جاؤ مجھے بھی امید ہے، سائیں جی قادرا کی تلاش کے سلسلے میں ضرور تمہاری رہنمائی کریں گے۔''

میں نے کچھ دیر پہلے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر ایک سیر مکس مٹھائی منگوالی تھی۔ اللہ بخش اور زاہدہ کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے مٹھائی والا وہ ڈبا ان کے حوالے کردیا۔ اللہ بخش نے پوچھا۔

''یہ تحفہ سائیں جی کے لیے ہے نا؟''

''ہاں.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میری محبت اور خلوص بھرا چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ تم سائیں جی کا میرا سلام کہنا اور یہ عرض کرنا کہ میں بہت جلد ان کی قدم بوسی کے لیے آستانے پر حاضری دوں گا۔''

وہ جانے لگے تو زاہدہ نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ''تھانیدار جی! آپ نے کسی ضروری کام کے لیے نبی بخش کو ادھر ہی روک رکھا ہے۔ خیریت تو ہے نا.....؟''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بالکل خیریت ہے۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''بس، تھوڑی ہدایت تاکید کے بعد میں اسے گھر کی طرف روانہ کردوں گا۔ تم لوگ اطمینان سے آستانے پر جاؤ۔''

اور وہ چلے گئے.....!

میں نے نبی بخش کو دوبارہ اپنے پاس بلالیا۔ پہلے جب وہ میرے سامنے آیا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں اور چہرے پر تھکن اور ناکامیابی کے تاثرات نظر آئے تھے اور اب ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاثرات میں گہری تشویش اور تفکر بھی شامل ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی سوال کردیا۔

''نبی بخش! جاتے وقت اللہ بخش نے تم سے کوئی بات کی تھی؟''

''نہیں جی..... انہوں نے تو میری طرف دیکھا بھی نہیں۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''بس خاموشی سے چلے گئے۔ لگتا ہے، ان کی مجھ پر نظر ہی نہیں پڑی.....'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ لوگ کہاں گئے ہیں جی۔ بھابی تو خاصی تیار شیار تھی.....؟''

''تمہارا کیا اندازہ ہے؟'' میں نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔ ''وہ کہاں گئے ہوں گے؟''

''انہیں گھر ہی جانا چاہیے لیکن.....؟''

وہ بولتے بولتے سوالیہ انداز میں رک گیا تو میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ''نبی بخش! تمہارا بڑا بھائی اور بھابی پیر بادام شاہ کے آستانے پر گئے ہیں.....!''

''اس وقت..... کیوں؟'' وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اس وقت، کیا مطلب.....!'' میں نے تعجب خیز انداز میں پوچھا۔ ''کیا سائیں جی کے آستانے پر حاضری دینے کا کوئی خاص وقت مقرر ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے جناب۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''دراصل، اب تو شام ہونے والی ہے اور قادرا کی بھی کوئی خیر خبر نہیں.....!''

''وہ قادرا کی خیر خبر ہی ڈھونڈنے تو وہاں گئے ہیں۔'' میں نے نبی بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''سائیں جی نے خاص طور پر تمہاری بھابی کو آج رات آستانے پر بلایا ہے۔ وہ زاہدہ پر کوئی دم کریں گے جس سے پتا چل جائے گا کہ قادرا کہاں ہے۔''

''سب بکواس ہے.....'' وہ بہ آوازِ بلند چلایا پھر فوراً ہی سنبھل کر معتدل لہجے میں بولا۔ ''بھائی اللہ بخش کو اکیلے وہاں جانا چاہیے تھا.....!''

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''نبی بخش! تم نے چلّا کر ''بکواس'' والا جو جملہ بولا ہے نا، وہ مجھے پسند آیا ہے۔ ذرا اس پر روشنی ڈالو.....؟''

''کیا.....!'' وہ آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا.....''

میں نے کہا۔ ''نبی بخش! تم نے ایسے کہا تھا، ویسے کہا تھا یا جیسے تیسے کہا تھا لیکن میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ یہ جھاڑو والی سرکار اور اس کا آستانہ سب بکواس ہے۔ تمہاری بھابی کو یوں بن ٹھن کر رات کے وقت وہاں نہیں جانا چاہیے مگر تم فکر نہ کرو، میں اس سلسلے میں بالکل غافل نہیں ہوں۔ انشاء اللہ! میں تمہاری بھابی اور بھائی کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

وہ تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا ''اس کا مطلب ہے، آپ کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ تیار ہے!''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے نبی بخش!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا..... کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کامیابی میرے قدم چومے گی۔ دیکھ لینا ایسا ہی ہوگا.....'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''نبی بخش! ابھی ابھی میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔ تم زیادہ تھکے ہوئے تو نہیں ہو؟''

وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جی..... حکم؟''

''میں سادہ لباس میں سائیں بادام شاہ کے آستانے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس مشن میں میرے ساتھ رہو.....؟''

''میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں جناب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے شکوک وشبہات اور پروگرام سے آگاہ کیا اور سکندر شاہ کے حوالے سے بھی تفصیلاً بتانے کے بعد کہا۔

''سائیں کا چیلا اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہے۔ مجھے شک ہے کہ قادرا کی گمشدگی میں سکندر شاہ کا ہاتھ ہے اور اسی سلسلے میں جھاڑو والی سرکار نے تمہاری بھابی کو اپنے حجرے میں بلایا ہے تو اس سے اشارہ ملتا ہے کہ خود سائیں بھی اس سازش میں برابر کا شریک ہے.....!''

''اگر سائیں نے میری بھابی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کی گردن دبا دوں گا۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں، بھائی اللہ رکھا کو کیا ہوگیا ہے۔ عقیدت میں انسان کو اتنا اندھا بھی نہیں ہوجانا چاہیے کہ.....'' جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا ایک زوردار مکا برسایا پھر ہونٹ بھینچ کر میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''نبی بخش! تمہارا یہ جوش مجھے پسند آیا ہے لیکن اس جوش کے ساتھ ہی ہوش کی بھی ضرورت ہے ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا۔''

اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''نبی بخش! اب توجہ سے سنو، ہمیں کرنا کیا ہے.....!''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

☆☆☆

جھاڑو والی سرکار کے آستانے میں داخل ہونے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا جس سے گزر کر میں اور کانسٹیبل اقبال اندر پہنچے تھے جب کہ آستانے سے خروج کے لیے دو راستے موجود تھے۔ ایک تو یہی داخلی دروازہ اور دوسرا سائیں کے حجرے کا عقبی دروازہ جو پیچھے نہر کی سمت کھلتا تھا۔ یہ دروازہ صرف قبلہ بادام شاہ ہی کے تصرف میں تھا۔ جب میں اور نبی بخش آستانے کے قریب پہنچے تو ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے کانسٹیبل اقبال اور بشیر حسین کو سادہ لباس میں آستانے کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ اقبال نے مجھے دور ہی سے دیکھ لیا اور محتاط قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آگیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی اقبال..... بشیر حسین کدھر ہے؟''

''وہ آستانے کے پچھلے حصے میں پہرا دے رہا ہے۔'' اقبال نے بتایا۔ ''جدھر حجرے کا عقبی دروازہ کھلتا ہے۔''

''کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے اقبال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

جواب دینے سے پہلے وہ تھوڑا سا ہچکچایا اور متاملانہ نظروں سے نبی بخش کی طرف دیکھنے لگا۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی ہچکچاہٹ کے سبب تک پہنچ گیا اور اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

''نبی بخش اس مشن میں ہمارے ساتھ ہے۔ تم اس کے سامنے زبان کھول سکتے ہو.....!''

کانسٹیبل اقبال کا تعلق چونکہ رتن گڑھ ہی سے تھا لہٰذا وہ اللہ بخش، نبی بخش، قادرا اور زاہدہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اللہ رکھا اور زاہدہ کے حوالے سے کچھ بتانے جارہا تھا کہ نبی بخش کی وہاں موجودگی نے اس کی گویائی کو بریک لگا دیے تھے۔ میری طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد اس نے کہا۔

''ملک صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے اللہ بخش اور اس کی بیوی زاہدہ آستانے کے اندر گئے ہیں.....''

''ہوں.....!'' میں نے پُرمعنی انداز میں ہنکارا بھرا اور پوچھا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، ہمارے ایکشن میں آنے کا وقت آگیا ہے..... اس وقت اللہ بخش اور زاہدہ کے علاوہ آستانے کے اندر اور کون کون ہے؟''

''صرف پیر فرتوت سائیں جھاڑو والا.....!'' اقبال نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

''اور سخی عرف سخیاں کہاں ہے؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اللہ بخش اور زاہدہ یہاں پہنچے ہیں اور ان کی آمد کے پانچ منٹ بعد ہی سخیا آستانے سے نکل کر کہیں گیا ہے۔ آپ نے چونکہ سائیں پر توجہ دینے کی خصوصی ہدایت کی ہوئی ہے لہٰذا ہم نے سخیا کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پتا نہیں، آپ کو یہ بات پسند آئے گی یا نہیں.....!''

''پسند اور ناپسند کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہیں ہے اقبال!'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''سائیں بادام شاہ پر دھاوا بولنے کے لیے یہ مناسب وقت ہے۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' اقبال نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے نبی بخش کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ ایک صحت مند اور جوان شخص تھا۔ میں نے باری باری نبی بخش اور اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں ادھر ہی آستانے کے داخلی دروازے کے آس پاس موجود رہو گے۔ اگر سائیں افراتفری کے انداز میں اس طرف آتا دکھائی دے تو تم اسے اچھی طرح قابو کر لینا۔ میرا خیال ہے، تم دونوں اسے بہ آسانی کنٹرول کر لو گے؟''

''اس سائیں کو کنٹرول کرنے کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں تھانیدار صاحب!'' نبی بخش نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے اپنے ساتھ اندر لے چلیں.....''

میں نبی بخش کے جوش اور ولولے کا اندازہ لگا چکا تھا اور سائیں کے لیے اس کی ناپسندیدگی کو بھی اچھی طرح محسوس کر چکا تھا۔ اندر اس کی بھائی، سائیں کے حجرے میں تھی اور یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ زاہدہ کس حالت میں ہوگی۔ میں نبی بخش کو اندر لے جانے کا خطرہ نہیں مول لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکتا تھا۔ وہاں کوئی جذباتی تصادم بھی پیش آ سکتا تھا!

میں نے نبی بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر میں ضرورت محسوس کروں گا تو سب سے پہلے تمہی کو آواز دوں گا۔''

میری نصیحت کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ خاصا شانت نظر آنے لگا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''تم دونوں کا آستانے کے دروازے پر موجود رہنا بہت ضروری ہے۔ سخیا پتا نہیں، کہاں گیا ہے، سائیں نے اسے کس کام سے بھیجا ہے۔ ممکن ہے، واپسی میں اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی ہوں۔ تم دونوں ہو گے تو ان کے ساتھ نمٹنا ذرا آسان ہو جائے گا۔ پھر سکندر شاہ بھی ادھر تھانے کی حوالات میں بند ہے.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا پھر حتمی لہجے میں کہا۔

''بس، تم دونوں یہاں چوکنا رہو، میں اندر جا رہا ہوں۔''

پھر دونوں جوانوں کو وہیں چھوڑ کر میں آستانے کے اندر داخل ہو گیا۔ میں دن میں بھی یہاں کا ایک چکر لگا کر گیا تھا جب میں اور اقبال سکندر شاہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ تھانے لے گئے تھے۔ میں نے اس موقع پر گھوم پھر کر آستانے اندرونی محل وقوع کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا تاکہ کسی دشواری کا سامنا نہ ہو اور واقعی..... اس وقت مجھے ہوئی۔ دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جلد ہی میں اس ہال نما بخش کے نزدیک پہنچ گیا جہاں دن میں پیر سائیں اپنے ارادت مندوں کو اپنا دیدار کرایا کرتے تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے جھانک کر ہال کے اندر دیکھا۔

لالٹین کی مخصوص روشنی میں، ہال کے اندر مجھے اللہ بخش بیٹھا دکھائی دیا اور وہ ہال بالکل اکیلا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ سائیں، زاہدہ کو دم کرنے کے لیے اپنے حجرۂ خاص میں لے جا چکا تھا۔ میرے تن بدن میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا اور میں بلی کے مانند دبے قدموں سائیں کے حجرے کی طرف بڑھ گیا جو اس ہال کے عقب میں واقع تھا۔

اللہ بخش اور نبی بخش کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اللہ بخش سائیں کی عقیدت اور احترام میں گھٹنے گھٹنے بلکہ گردن گردن دھنسا ہوا تھا جبکہ نبی بخش سائیں پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ اسی کی زبانی راستے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ رتن گڑھ آنے سے پہلے جھاڑو والی سرکار موضع کوٹ مکھن میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں اس کے آستانے پر کوئی سین پارٹ ہو گیا تھا، جبھی اسے مکھن کوٹ سے فرار ہونا پڑا تھا۔ نبی بخش کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ اس کا بڑا بھائی خواہ مخواہ سائیں کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔

جلد ہی میں سائیں کے حجرے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں گھوم پھر کر حجرے کے دونوں دروازوں کا جائزہ لے لیا۔ عقبی دروازے کے اوپر ایک روشن دان بھی نظر آ رہا تھا جو کھلا ہوا تھا۔ حجرے کے اندر کا نظارہ کرنے کے لیے یہ مناسب مقام تھا۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ حجرے کی چھت پر پہنچا اور اوپر سے جھک کر، یعنی الٹا لٹک کر حجرے کے اندر جھانکا۔ حجرے میں دیے کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی روشنی میں، میں نے زاہدہ کو حجرے کے عین وسط میں چٹائی پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے پاس ہی ایک مکروہ چہرے والا شخص بھی موجود تھا جو ایک سو ایک فیصد سائیں ہی تھا۔ زاہدہ کی بے ہوشی کا یہی سبب سمجھ میں آیا کہ سائیں نے اسے کوئی ایسی شے کھلائی یا پلائی ہو گی جس نے زاہدہ کو خود سے غافل کر دیا۔ وہ اسی غفلت کے دوران میں زاہدہ کے شباب سے فیض یاب ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور یہ ارادہ اس کی حرکات و سکنات سے بھی عیاں تھا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے زاہدہ کے بدن کو دیکھ رہا تھا۔

میں بروقت وہاں پہنچا تھا۔ اگر مجھے پانچ دس منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو سائیں اپنے پروگرام پر عمل شروع کر چکا ہوتا۔ اس سے پہلے کہ سائیں زاہدہ کے بدن کو چھوتا، میں نے روشن دان کے فریم منہ لے جاتے ہوئے بڑے بھیانک انداز میں ایک قہقہہ لگایا۔

سائیں اس طرح اچھلا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ میکانکی انداز میں اس نے پلٹ کر حجرے کے عقبی دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ بھیانک قہقہہ اس دروازے کے پیچھے سے ابھرا ہے۔ میں نے دیکھا، ایک لمحے کے تذبذب کے بعد وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے مذکورہ دروازے کی جانب بڑھا تھا۔

وہ بہت نازک لمحات تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ بھی لے گا۔ میں بہ آہستگی نیچی چھت والے حجرے سے نیچے اتر آیا اور دروازے کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میری توقع کے عین مطابق، حجرے کا دروازہ کھلا اور وہاں سے سائیں کی چربیلی گردن نمودار ہوئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھوپڑی پر ایک بھرپور ٹھوکر ماری۔

پاؤں کی یہ ضرب اتنی شدید اور بھرپور تھی کہ وہ الٹ کر حجرے کے اندر گرا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی حجرے میں پہنچا اور اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ سائیں پر گویا اچانک ایک افتاد سی ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا لیکن پہلے میرے بھیانک تعاقب نے اور ازاں بعد میرے تابڑ توڑ حملوں نے اس کی مت مار کر رکھ دی تھی۔ سنبھلنے کی کوشش میں وہ مجھ سے پٹتا چلا گیا۔ جب تک اس کی سمجھ میں یہ آتا کہ اس کے ساتھ فی الواقعہ ہوا کیا ہے، میں زیر کر کے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر چکا تھا۔

حجرے کے روشن دان میں، میں نے جو بھیانک اور لرزہ خیز قہقہہ لگایا تھا اس کی دہشت اور خوف ناکی حجرے کی اندرونی فضا تک ہی محدود نہیں رہی تھی بلکہ یہ آواز اقبال، نبی بخش، اللہ بخش اور بشیر حسین نے بھی سنی تھی۔ نہ صرف سنی تھی بلکہ وہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے دوڑتے ہوئے ''جائے وقوعہ'' پر بھی پہنچ گئے تھے۔ سائیں کو زخم خوردہ اور خستہ حال دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ میں نے اقبال اور بشیر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اس پیر فرتوت، سیاہ کرتوت کو فوراً گرفتار کرلو۔'' میرا اشارہ جھاڑو والی سرکار کی جانب تھا۔ ''باقی کی خاطر تواضع تھانے جا کر ہوگی جہاں اس کا چیلا سکندر شاہ بھی میری میزبانی کا لطیف اٹھا رہا ہے.....''

سائیں نے قہر آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''میں جو کوئی نہیں، بلکہ ملک صفدر حیات ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس علاقے کا تھانیدار..... اور یہ مت سمجھنا کہ کوٹ مکھن کی طرح تم یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گے۔ قادرا کا اغوا اور زاہدہ کی آبروریزی کی کوشش..... یہ ایسے ''کارنامے'' ہیں تمہارے کہ باقی کی ساری زندگی تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارو گے۔''

''کک..... کیا مطلب؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''مطلب تھانے پہنچ کر تم پر واضح ہو جائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس دوران میں اللہ بخش اور نبی بخش کوشش کر کے زاہدہ کو ہوش میں لے آئے تھے۔ آستانے پر مزید رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ثریا کی واپسی اور گرفتاری کے لیے بشیر حسین اور اقبال کو وہیں چھوڑا اور سائیں کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ اللہ بخش اینڈ کمپنی کو میں نے ان کے گھر بھیج دیا اور ہدایت کر دی کہ دونوں بھائی صبح تھانے آ کر مجھ سے ملیں۔ زاہدہ کو آرام کی ضرورت تھی اور یہ شے اسے اپنے گھر ہی میں میسر آ سکتی تھی۔

میں نے تھانے میں قدم رکھا تو ایک سنسنی خیز انکشاف میرا منتظر تھا۔ ثریا بھی سکندر شاہ کے ساتھ حوالات میں بند تھا۔ وہ سکندر کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا اور مبارک نے اسے پکڑ کر بند کر دیا تھا۔ حوالدار مبارک علی کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس نے سکندر شاہ سے اقبالِ جرم کروالیا تھا۔ قادرا کو اسی نے اغوا کر کے آستانے پر پہنچایا تھا۔ اس کے بعد قادرا کے ساتھ کیا ہوا، یہ بہت ہی افسوس ناک بلکہ شرم ناک واقعہ ہے.....!

یہ دراصل سائیں اور اس کے چیلے کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ انہوں نے قادرا اور اس کی ماں زاہدہ کو ایک ہی جال میں پھانسنے کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ قادرا بھی اپنی ماں کی طرح گورا چٹا اور خوبصورت لڑکا تھا۔ سکندر شاہ کی قادرا پر اور سائیں کی زاہدہ پر نیت خراب ہوگئی تھی اور اسی خرابی نیت کے نتیجے میں یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔ سائیں کو پتا تھا، قادرا کی گمشدگی کے سلسلے میں اللہ بخش ضرور اس کے پاس آئے گا، پھر وہ آسانی سے اس کی خوب رو بیوی زاہدہ کو شکار کر لے گا۔

سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہوا تھا لیکن میری بروقت مداخلت نے سائیں کو اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا مگر..... مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ میں قادرا کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

قادرا، سکندر شاہ کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے سکندر شاہ نے معصوم قادرا کی لاش کو نہر کے کنارے ایک جگہ دبا دیا۔ سکندر شاہ کی نشان دہی پر میں نے اگلے روز قادرا کی لاش دریافت کر لی۔

اس واقعے پر قادرا کے ماں باپ کا جو حال تھا، سو تھا لیکن میں خود بھی اندر سے ہل کر رہ گیا تھا۔ سکندر شاہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا تھا۔ اسے جتنی بھی عبرت ناک سزا دی جاتی، کم تھی۔ میں نے اسے ٹھیک ٹھاک فٹ کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔

ذہین قارئین اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ میں نے سائیں اور اس کے چیلے کے ساتھ کیا ''سلوک'' کیا ہوگا.....؟

(تحریر: خسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ضمیر فروش

ملک صفدر حیات

بھیڑوں کی کھال اوڑھے بھیڑیوں کا احوال جو معصوم اور سادہ لوح افراد کے سیدھے پن سے نہ صرف فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ انہیں اپنے ظالمانہ شکنجے میں کس کے ، اذیت میں مبتلا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ۔ ایک ایسے ہی بہروپیے کا واقعہ جسے ملک صاحب نے بے پردہ کیا!

کہا جاتا ہے، چہرہ دل کی کتاب ہے!

یقیناً چہرہ دل کی کتاب ہے لیکن اس کو پڑھنے کے لیے بڑی دور بین نگاہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے ورنہ بعض چہرے اتنی خوبصورتی سے دھوکا دیتے ہیں کہ پلٹ کر پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ ایسی ہی صورتوں کے لیے بزرگ حضرات کہہ گئے ہیں.....شکل مومناں، کرتوت کافراں!

زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسے ہی کردار کی ہے جس نے خبث باطن کو معزز صورت کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔ دیہات کے سادہ لوح افراد اس کی وضع قطع اور ظاہری حلیے کو دیکھ کر فوراً متاثر ہو جاتے ہیں لہٰذا اس عیار شخص کو "اپنا کام" کرنے میں ذرا سی بھی دشواری محسوس نہ ہوتی۔ وہ انسان نہیں، انسان نما تھا اور اس کی کھال کے اندر چھپا ہوا حیوان ہر لمحے انسانوں کو کھانے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ اس نے میرے تھانے کی حدود میں واقع ایک گاؤں کو مطلب براری کے لیے چن لیا تھا۔

ان دنوں میں ضلع جھنگ کے ایک قصبے "نور کوٹ" میں تعینات تھا۔ نور کوٹ کے آس پاس پائے جانے والے دیہات نذیر آباد، کسووال، بخت نگر، احمد پور اور چک چونتیس گ ب میرے ہی تھانے کی حدود میں شامل تھے۔ نور کوٹ میں لگ بھگ دو سو گھر آباد تھے اور یہ قصبہ ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔

ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھانے داری کر رہا تھا۔ وہ اپریل کا مہینا تھا۔ اس سال موسم گرما بڑی جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اپریل کی دھوپ میں ایسی تیزی اور حدت محسوس ہوتی تھی جیسے جون اپنے جوبن پر ہو۔ میں ایک خاندان کے جھگڑے کو نمٹا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ حوالدار جمعہ خان میرے پاس آ گیا۔

جمعہ خان کی عمر پینتیس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک مستعد اور ہوشیار قسم کا حوالدار تھا اور اسے اس تھانے میں خدمات انجام دیتے ہوئے لگ بھگ دس سال ہو گئے تھے۔ جب سے میں وہاں موجود تھا، میں نے اسے قابلِ اعتماد اور تجربہ کار اہل کار پایا تھا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کے بعد قدرے افسردہ لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! پتا نہیں، ہمارے قصبے کی مسجد کا تنازع کب ختم ہوگا.....!"

قصبہ نور کوٹ کے وسط میں ایک مسجد واقع تھی اور پچھلے کچھ عرصے سے وہاں ایک حساس نوعیت کا جھگڑا چل رہا تھا اور یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ پولیس کسی کی طرف داری کر کے کسی دوسرے کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ دراصل دو بڑے مسالک کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ ایک مسلک کے ماننے والے اس مسجد کو خود سے منسوب کرنا چاہتے تھے اور دوسرے مسلک کے پیروکاروں کا خیال یہ تھا کہ اس مسجد پر ان کا حق زیادہ ہے۔ ظاہر ہے دونوں مسالک سے تعلق رکھنے والے بنیادی طور پر مسلمان تھے لیکن "حسبِ توفیق" وہ دوسرے کے خلاف اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے کہ مسجد کا مستقبل داؤ پر لگ گیا تھا۔ قصبے میں دونوں مسالک سے تعلق رکھنے والوں کی ملی جلی آبادی تھی لہٰذا مسجد کے ساتھ ساتھ نمازی بھی سخت پریشانی میں تھے حالانکہ اس تنازع سے قبل تمام لوگ بلاتفریق ایک ہی جگہ پر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

میں نے حوالدار کی پریشانی کے جواب میں کہا۔ "جمعہ خان! مسجد دراصل اللہ کا گھر ہے جو کہ اس کی عبادت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے لیکن ہم لوگوں نے فرقوں اور مسلکوں میں بٹ کر اپنی مساجد الگ کر لی ہیں، اپنی نماز اور دیگر عبادات کے طور طریقے ایک دوسرے سے جدا کر لیے ہیں حالانکہ سب خود کو مسلمان کہتے ہیں اور یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ جب خدا ایک ہے اور سبھی اس کی عبادت کرتے ہیں تو پھر یہ مسجد ہماری، وہ مسجد تمہاری، کی کیا توضیح ہے۔ بہرحال.....!"

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ مذہب اور مسلک کا تنازع ہے۔ دونوں مسالک کے مذہبی رہنماؤں کو مل بیٹھ کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہیے۔ پولیس اس سلسلے میں براہِ راست کوئی کارروائی نہیں کرسکتی۔ ہاں البتہ اگر یہ تنازع کسی مرحلے پر قابلِ دخل اندازی پولیس ٹھہرا تو پھر دیکھا جائے گا۔''

''ہوں.....!'' حوالدار نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میری تو خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمارے قصبے میں بھی کسی حاجی برکت علی رحمت علی کو بھیج دے۔ شاید اس طرح یہ مسئلہ حل ہوجائے۔''

میں نے چونک کر جمعہ خان کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے حاجی برکت علی رحمت علی کا نام سن کر میں مضطرب ہوگیا تھا۔ ان ناموں کا ذکر میں نے چند روز پہلے بھی کسی کی زبان پر سنا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ اب جو حوالدار نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں حاجی برکت علی رحمت علی کہا تو میرے اندر جاننے کا تجسس جاگ اٹھا۔ میں نے میز پر کہنیاں ٹکائیں اور تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے استفسار کیا۔

''جمعہ خان! تم حاجی برکت علی رحمت علی وغیرہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟''

اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا۔ ''جناب! یہ کوئی دو لوگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخص کا نام ہے اور سنا ہے حاجی برکت علی رحمت علی لاہور سے آیا ہے۔''

جمعہ خان کی وضاحت نے مجھے الجھا دیا، میں نے کہا۔ ''حوالدار صاحب! برکت علی، رحمت علی دو الگ الگ نام ہیں جو کسی ایک شخص کے ہو نہیں سکتے۔ تم مجھے اس بارے میں تفصیل سے بتاؤ.....''

اس نے کھنکار کا گلا صاف کیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ملک صاحب! یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ حاجی برکت علی رحمت علی پچھلے کچھ عرصے سے ادھر موضع بخت نگر میں آیا ہوا ہے۔ اس نے لوگوں کو یہی بتایا ہے کہ اس کا تعلق لاہور کے کسی علاقے سے ہے۔ میرا سالا شمشاد بخت نگر میں رہتا ہے۔ اسی کی زبانی مجھے حاجی برکت علی رحمت علی کے بارے میں معلومات ملی ہیں اور اس کا کہنا ہے کہ حاجی صاحب دراصل ایک ہی شخص ہے لیکن اس کا نام کچھ ایسا ہے کہ لگتا ہے کہ یہ دو افراد ہیں.....''

میں نے حاجی برکت علی رحمت علی کے بارے میں اڑتی اڑتی جو خبریں سنی تھیں وہ کچھ اس طرح سے تھیں کہ وہ موضع بخت نگر میں اچانک ہی نمودار ہوا تھا اور بہت ہی قلیل مدت میں اس نے گاؤں والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ وہ بڑا مہربان اور خدا ترس تھا۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی، اپنی جیب سے مدد کیا کرتا۔ لوگ اس کی انہی نیکیوں کے باعث اس سے متاثر ہوتے جارہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا چلا جارہا تھا۔ گاؤں دیہات اور وہاں بسنے والے لوگوں کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اور وہ اتنی آسانی سے نہیں بدلا کرتا۔ لوگ نسل در نسل ایک ہی جگہ پر رہتے چلے آرہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لہٰذا وہ کسی نئے شخص کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتے، متاثر ہونا تو بہت دور کی بات ہے۔

اسی لیے حاجی برکت علی رحمت علی سے متعلق مشہور ہونے والی کہانیاں مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھیں اور اب تو حوالدار جمعہ خان بھی ان معاملات کی تصدیق کر رہا تھا۔ موجودہ حالات چونکہ خلافِ معمول اور خلافِ دستور نظر آتے تھے اس لیے میں اس حوالے سے خاصا غیر مطمئن تھا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے اس پُراسرار کردار حاجی برکت علی رحمت علی کی اصلیت کھوجنے کا پروگرام بنا رہا تھا لیکن بہ وجوہ میں اس جانب بھرپور توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب جو جمعہ خان نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا تو میں نے فیصلہ کرلیا کہ پہلی فرصت میں اس اسرار کو بھی حل کر ہی دینا چاہیے۔ میں نے حوالدار کی وضاحت کے جواب میں پوچھا۔

''جمعہ خان! کیا تم نے حاجی برکت علی رحمت علی کو دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''میں تو کافی عرصے سے بخت نگر نہیں گیا۔ پچھلی بار بھی زلیخا بچوں کو اپنے ساتھ لے کر خود ہی بھائی، بہن اور ماں باپ سے ملنے چلی گئی تھی۔ حاجی صاحب کے بارے میں ساری معلومات مجھے شمشاد نے فراہم کی ہیں۔ وہ زلیخا اور بچوں کو چھوڑنے آیا تھا تو اس سے اس موضوع پر میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔''

میں جمعہ خان اور اس کی فیملی کے بارے میں چیدہ چیدہ باتوں سے واقف تھا۔ بخت نگر میں اس کی سسرال تھی۔ اس کے ساس سسر بہ قیدِ حیات تھے۔ زلیخا اس کی بیوی کا نام تھا، زلیخا کی مزید تین بہنیں ناہید، زبیدہ اور سلطانہ تھیں جن کی ابھی تک شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ دو بھائی شمشاد احمد اور ارشاد احمد تھے جن میں سے صرف شمشاد شادی شدہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شمشاد اپنی بیوی بلقیس اور تین بچوں کے ساتھ والدین کے ہمراہ ہی رہتا تھا۔ حوالدار جمعہ خان کے چار بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔ موضع بخت نگر، میرے تھانے سے لگ بھگ تین میل شمال میں واقع تھا۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا گاؤں تھا جہاں سو، سوا سو گھر آباد تھے۔ یہ ساری تفصیل بتانے کا ایک مقصد ہے۔ وہ یہ کہ آپ کا ذہن اس ماحول اور فضا سے آشنا ہوجائے جہاں سے متعلق یہ کہانی بیان کی جارہی ہے تاکہ مطالعے کے دوران آپ کا ذہن کسی مرحلے پر الجھن کا شکار نہ ہو۔

جمعہ خان کی بات مکمل ہونے پر میں نے استفسار کیا۔

''جمعہ خان! تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان نور کوٹ کی مسجد کے تنازع والی صورت حال پر گفتگو ہو رہی تھی اور تم نے بڑی امید اور تمنا سے یہ دعا کی تھی کہ کاش خدا ہمارے قصبے میں بھی کسی حاجی برکت علی رحمت علی کو بھیج دے.....!'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس حاجی برکت علی رحمت علی کا مسجد یا مولویوں کے تنازع سے کیا تعلق؟''

''مسجد یا مولوی وغیرہ سے تو اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔'' جمعہ خان نے جواب دیا۔ ''مگر مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بڑا اللہ والا ہے۔ اللہ کی راہ میں دل اور ہاتھ کھول کر خرچ کرتا ہے۔ ادھر بخت نگر میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد تھی۔ حاجی صاحب نے مولوی جی کو خاصی نگڑی رقم دی ہے تاکہ وہ مسجد کی تعمیر و توسیع کے لیے خرچ کرسکیں۔ میں نے جو یہاں کے تنازع کے حوالے سے بات کی ہے نا.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک سکون بھری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میرا یہ خیال ہے ملک صاحب..... کہ اگر حاجی برکت علی رحمت علی کو یہاں کی مسجد میں جنم لینے والے جھگڑے کا پتا چل جائے تو وہ ضرور اس مسئلے کو حل کردے گا۔''

''لیکن کیسے.....'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ذرا وضاحت کرو؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''حاجی برکت علی رحمت علی اس تنازع کو اس طرح ختم کرسکتا ہے کہ وہ دونوں دھڑوں کے مولویوں سے ایک ملاقات کرے اور ان سے کہے کہ موجودہ مسجد پر کوئی ایک مسلک قبضہ کرلے، دوسرے مسلک والے اپنی پسند سے ایک اور مسجد تعمیر کرلیں اور اس مسجد کی تعمیر وغیرہ پر جو رقم خرچ ہوگی وہ حاجی صاحب دیں گے.....''

''جمعہ خان! میں تمہارے خیال سے بالکل اتفاق نہیں کرسکتا۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے، یہ حاجی موضع بخت نگر میں رہتے ہوئے یہاں کے کسی معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔''

''کیوں جناب.....؟'' حوالدار نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ میرے اندازے کے مطابق یہ شخص کسی خاص مشن پر ہے اور اس نے اپنی کارروائی کے لیے بخت نگر کا انتخاب کر رکھا ہے لہٰذا اس مشن کو کامیاب بنانے کے لیے وہ اپنے کام سے کام رکھے گا اور ادھر اُدھر کے مسائل میں خود کو الجھانے سے اجتناب برتے گا۔''

''لیکن جناب.....'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''بہ ظاہر تو ایسا کچھ نظر نہیں آرہا۔ میں سمجھا نہیں، آپ حاجی صاحب کے کس مشن کی بات کررہے ہیں؟''

''مشن کی نوعیت کے بارے میں تو سردست میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

BEFORE
AFTER
بطور خاص خواتین کیلئے
اب آپ کو بار بار تھریڈنگ یا ویکسنگ کی ضرورت نہیں
SHINE ON STRIPS
جو ایک خاص پٹیاں ہیں۔ اُن فاضل بالوں کو جو آپ کے چہرے کلائیوں پنڈلیوں پر موجود ہوں یہ ٹریٹمنٹ بالوں کو اگنے نہیں دیتا اور چہرے کے کومل مہاسے داغ دھبوں کو دور کرتا ہے
چہرے کیلئے قیمت 450 روپے،
محصول خرچ 50 روپے،
دیگر حصوں کیلئے قیمت 1350 روپے،
گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر وی پی پارسل سے طلب فرمائیں یا E-mail کریں۔
fairy.perfumers@hotmail.com
فیئری پرفیومرس
پوسٹ بکس نمبر 2209
کراچی۔ 74600

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر ہم ایک حکمتِ عملی کے تحت آگے بڑھیں تو ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوسکتی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جمعہ خان! یقین کرو، مجھے اس حاجی برکت علی رحمت علی میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔ کیا گڑبڑ.....؟ میں ابھی اس فیصلے تک نہیں پہنچ سکا ہوں کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ روزمرہ اور روایت سے بہت ہٹ کر ہے۔''

جمعہ خان چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے اب مجھے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔ میں آپ کے انداز اور طریقے سے اچھی طرح واقف ہوگیا ہوں۔ آپ حاجی صاحب پر جتنی سنجیدگی سے شک کر رہے ہیں اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ حاجی صاحب کے معاملے میں کہیں نہ کہیں کوئی چکر ضرور ہے۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ حاجی صاحب کا رویہ معمول سے بہت مختلف ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس کی اصلیت تک رسائی کیسے حاصل کریں.....؟''

''اگر صحیح خطوط پر کوشش کی جائے تو مشکل سے مشکل کام کو بھی آسان بنایا جاسکتا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس مشن میں، میں تم سے کام لوں گا جمعہ خان کیونکہ تم میرے لیے قابلِ بھروسا ہو۔''

''یہ آپ کی محبت اور مہربانی ہے ملک صاحب!'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں اس سلسلے میں کیا کردار ادا کرسکتا ہوں.....؟''

''میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''جمعہ خان! آج کل ہمارے تھانے کی حوالات تو خالی پڑی ہوئی ہے اور ادھر نورکوٹ میں جرائم کا تناسب بھی کافی کم ہے لہٰذا تھانے میں زیادہ مصروفیات نہیں ہیں۔ میں نے ابھی جس مشن کا ذکر کیا ہے اس کا راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

میں نے توقف کرکے سوالیہ نظروں سے حوالدار کو دیکھا تو اس نے گردن کو اثبات میں جنبش دی پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ بے فکر ہوجائیں ملک صاحب! میں اس راز کی اپنی جان سے بھی زیادہ حفاظت کروں گا۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تم کل مجھ سے چند دن کی چھٹی لے کر بیوی بچوں کے ہمراہ بخت نگر روانہ ہوجاؤ۔'' میں نے اپنے منصوبے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''تھانے کے عملے کو یہی بتانا کہ تم کسی ضروری کام سے اپنی سسرال جارہے ہو، وہاں کسی کو بیمار بھی کرسکتے ہو یا کوئی اور بھی بہانہ کیا جاسکتا ہے.....''

''ٹھیک ہے جناب! مجھیں کہ میں آپ سے چھٹی لے کر چند روز کے لیے کسی ضروری کام سے بخت نگر چلا گیا۔ تھانے کے عملے میں کسی کو میری روانگی کی حقیقت کا علم نہیں۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''آپ بتائیں، مجھے وہاں جاکر کیا کرنا ہوگا؟''

''ہوں.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''تمہیں بخت نگر میں رہتے ہوئے حاجی برکت علی رحمت علی کے معاملات کی ٹوہ لگانا ہے اور وہ اس طرح کہ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ وہ اور بخت نگر کے دیگر باسی یہی سمجھیں کہ تم حاجی اور اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ہو۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں آپ کی بات سمجھ گیا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''اپنی سسرال اور بخت نگر کے لوگوں کو تو میں کسی قسم کا شک نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہایت ہی ہوشیاری سے اس معاملے کو سنبھال لوں گا لیکن مسئلہ زلیخا کا ہے.....!''

حوالدار کو متذبذب دیکھا تو میں نے فوراً پوچھا۔ ''زلیخا کا کیا مسئلہ ہے؟''

''بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں، معصوم اور سادہ ذہن۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''وہ مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر نہ چال جانے کے لیے خوشی خوشی تیار ہوجائیں گے لیکن میرا یہ اچانک پروگرام زلیخا کو ہضم نہیں ہوگا۔ وہ چند روز پہلے ہی بخت نگر سے لوٹی ہے۔ وہ سوال کرکر کے میرا دماغ ہلا دے گی۔ اسے اس روانگی کے حوالے سے مطمئن کرنا بہت ضروری ہے۔''

حوالدار ایک معقول بات کر رہا تھا۔ میں اس کی بیوی زلیخا کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ ویسے تو دنیا بھر کی بیویاں اس معاملے میں کم وبیش ایک ہی جیسی ہوتی ہیں لیکن زلیخا تجسس، کھوج، کرید اور ٹوہ کے حوالے سے دوسری بیویوں سے چار ہاتھ آگے نظر آتی تھی۔ حوالدار کی گمبھیرتا کے جواب میں، میں نے کہا۔

''جمعہ خان! تمہاری تشویش اپنی جگہ بجا ہے، میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس اچانک پروگرام کے حوالے سے زلیخا تمہارا ناک میں دم کردے گی لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم مصلحت برائے تعمیر کی بنا پر اسے ایک خوب صورت چکر سے مطمئن کردیں۔''

''خوب صورت چکر.....؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کچھ بتائیں اس بارے میں ملک صاحب!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے بتایا۔ ''اگر تم اپنی بیوی کو اعتماد میں لے کر یہ بتاؤ کہ نہایت ہی خفیہ ذریعے سے پولیس کو ایک مخبر نے اطلاع دی ہے کہ آنے والے تین چار دنوں میں ایک خطرناک مفرور مجرم بخت نگر پہنچنے والا ہے لہٰذا تم اس کی گرفتاری کے لیے پہلے ہی سے وہاں جا رہے ہو، تم سادہ لباس میں رہتے ہوئے اس اہم مشن کو سر کرو گے۔'' میں لمحے بھر کے لیے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس پلاننگ میں زور اور حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے تم زلیخا کو تاکید کر دینا کہ وہ اس مصوبے کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ یہ نہایت ہی رازداری والا معاملہ ہے۔ تم زلیخا کو مزید پکا کرنے کے لیے اس مفرور مجرم کا کوئی فرضی نام بھی بتا سکتے ہو..... مثلاً قادرا، بلا، بخشو، گوکا، پوپی..... وغیرہ وغیرہ!''

''یہ ترکیب اچھی ہے ملک صاحب۔'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''ویسے یہ بات ہے کہ میں جس معاملے کے بارے میں زلیخا کو تاکید کر دوں کہ اسے راز میں رکھنا ہے تو پھر سمجھیں اس کی زبان پر تالا لگ جاتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر جوشیلے لہجے میں بولا۔

''اگر آپ کا حکم ہو تو میں آج ہی بخت نگر روانہ ہو جاتا ہوں۔''

''آج نہیں، کل صبح۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''آج یہاں تھانے میں ایک دو ضروری کام ہیں اور رات کو تم زلیخا سے بات کر کے اسے صورت حال سے بھی آگاہ کر دینا تاکہ یہ کارروائی منطقی انداز میں آگے بڑھتی ہوئی نظر آئے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! جو آپ کا مشورہ؟'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

اگلی صبح میں نے ضروری ہدایات کے ساتھ، چند روز کے لیے حوالدار جمعہ خان کو مع اہل و عیال موضع بخت نگر روانہ کر دیا۔

☆☆☆

تین روز کے بعد جمعہ خان میرے سامنے بیٹھا تھا اور اس وقت ہم دونوں تھانے کے اندر نہیں بلکہ میرے کوارٹر میں تھے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں عشا کی نماز کے بعد سونے کے لیے لیٹ چکا تھا کہ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر ہونی والی پُراسرار دستک نے مجھے چارپائی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سرکاری کوارٹر کے مختصر سے صحن سے گزر کر دروازہ کھولا تو سامنے جمعہ خان کو کھڑے دیکھ کر چونک اٹھا۔

''جمعہ خان! خیریت تو ہے؟'' بے اختیار میرے منہ

جاسوسی ڈائجسٹ
سسپنس ڈائجسٹ
سائل نہیں ملتے
ماہنامہ پاکیزہ
سرگزشت

اندرونِ ملک چھوٹے شہروں اور قصبوں کے معزز قارئین کی یہ شکایت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

ہاکرز اور بک اسٹال والے صرف اتنی کاپیاں خریدتے ہیں جن کے بک جانے کا انہیں سو فیصد یقین ہو کیونکہ بچ رہنے والی ایک کاپی ان کی کئی کاپیوں کا نفع کھا جاتی ہے۔ کوئی بھی خسارے کا ایسا سودا پسند نہیں کرتا

رسائل کے یقینی حصول کے دو طریقے ہیں

☼ اپنے ہاکر یا بک اسٹال والے کو تاکید کر دیں کہ وہ ہر مہینے باقاعدگی سے آپ کو رسالہ فراہم کرے وہ اپنی تعداد بڑھا لے گا۔

یا

☼ آپ ادارے کو صرف 500 روپے (ڈاک خرچ اس میں شامل ہے) بھیج کر ہمارے کسی بھی پرچے کے سالانہ خریدار بن جائیں اور مزید کسی خرچ یا بھاگ دوڑ کے بغیر 12 شمارے جنرل ڈاک سے بروقت اپنی دہلیز پر وصول کرتے رہیں۔

اس شرح سے آپ زائد سالوں اور چاروں پرچوں کے لیے بہ یک وقت زرسالانہ ارسال کر کے بے فکر ہو سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدرالدین سرکولیشن مینیجر 5802552-5386783-5804200
فیکس نمبر 5802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نکلا۔

وہ میرے اضطراری سوال کا جواب دینے کے بجائے کوارٹر کے اندر آیا پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آئیں، اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

میں اس کے ہمراہ کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں آ گیا۔ ان دنوں موسم خاصا گرم ہو رہا تھا اور عموماً رات میں لوگ کھلے صحن وغیرہ میں سونے لگے تھے لیکن میں نے ابھی تک اپنی چارپائی کو کمرے سے باہر نہیں نکالا تھا۔ رات کے آخری حصے میں فضا میں خنکی رچ بس جاتی تھی اور اوس بھی گرتی تھی لہٰذا میں نے شب بسری کے لیے ابھی صحن کا رخ نہیں کیا تھا۔

حوالدار جمعہ خان اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ لگ بھگ نصف شب کو اس کی آمد سے یہ تو ظاہر تھا کہ وہ کوئی سنسنی خیز خبر ہی لے کر آیا ہوگا اور وہ خبر یقیناً حاجی برکت علی رحمت علی سے ہی متعلق ہوگی لیکن وہ کیا خبر ہے..... یہ تو جمعہ خان ہی بتا سکتا تھا۔

جب ہم کمرے میں آرام سے بیٹھ گئے تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں جمعہ خان! اب بتاؤ، کیا بات ہے جو تمہیں یوں پُراسرار انداز میں چوروں کی طرح چھپ کر میرے پاس آنا پڑا اور وہ بھی آدھی رات کو؟''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''ملک صاحب! میں ابھی سائیکل پر سوار ہو کر بخت نگر سے یہاں پہنچا ہوں۔ میری سائیکل آپ کے کوارٹر کے عقب میں کھڑی ہے۔ تھانے کے عملے میں سے کسی کو پتا نہیں کہ میں اس وقت آپ کے ساتھ کوارٹر میں موجود ہوں۔ کسی نے مجھے اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں..... آپ سے بات کرنے کے بعد چپ چاپ اسی طرح واپس بھی چلا جاؤں گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے وہ اہم بات بھی بتاؤ جس کے لیے تمہیں آدھی رات کو سائیکل پر سوار ہو کر تین میل کا کچا راستہ طے کرنا پڑا اور واپسی میں بھی تمہیں یہی تین میل کا فاصلہ طے کرنا ہے؟''

میرا کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا اور اس کوارٹر کے پچھواڑے کوئی باقاعدہ دیوار وغیرہ نہیں تھی۔ تھانے کی حدود کے ساتھ ہی، اس جانب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ جمعہ خان اسی سمت سے میرے پاس پہنچا تھا۔ ''جناب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' حوالدار نے معنی خیز انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''یہ حاجی برکت علی رحمت علی کسی خطرناک مشن پر یہاں آیا ہے۔ میں نے پچھلے تین دن میں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ جو معلومات اکٹھا کی ہیں، ان سے کسی گہری سازش کی بو آتی ہے۔''

وہ لمحے بھر کے لیے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا تو میں نے اسے ٹوکنا یا استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''حاجی برکت علی رحمت علی.....''

''جمعہ خان!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، اس حاجی کا نام کچھ زیادہ ہی طویل و عریض ہے۔ کیوں نہ ہم اسے مختصر کر دیں، مثلاً حاجی برکت علی یا حاجی رحمت علی یا پھر محض ''حاجی''.....؟''

''آئیڈیا اچھا ہے جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں حاجی صاحب یا پھر صرف حاجی ٹھیک رہے گا۔''

''اور یہ حاجی اگر بعد میں، کسی حوالے سے مجرم ثابت ہو گیا تو ہم اس کے لیے آسانی سے لفظ ''پاجی'' بھی استعمال کر سکتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے مجھے نہیں امید کہ اس بندے نے باقاعدہ حج بھی کیا ہو۔ بعض فراڈ لوگ اپنا دھندا چمکانے کے لیے مومنوں ایسی صورت بنا کر اور اپنے نام کے ساتھ بھاری بھرکم معزز الفاظ لگا کر بھی کام نکالتے رہتے ہیں۔ یہ حاجی بھی مجھے کوئی ایسا ہی کردار لگتا ہے۔''

''ملک صاحب! یہ بندہ بڑی ہوشیاری سے گاؤں کے سادہ مزاج لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس کا کاروبار میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' جمعہ خان تشویشناک لہجے میں بولا۔

''میں وہی تو سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے بخت نگر میں حاجی کے ''جو کمالات'' دیکھے ہیں وہ جلدی سے مجھے بتاؤ تاکہ میں اس کے سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔''

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''ملک صاحب! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، حاجی صاحب کو بخت نگر میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے گاؤں والوں کو متاثر کر لیا ہے، خصوصاً مسجد کی تعمیر کے لیے ایک بڑی رقم دے کر وہ نیک دل، خدا ترس اور عبادت گزار بھی ثابت ہو گیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ پانچوں وقت کی نماز ادا کرنے باقاعدہ مسجد میں جاتا ہے اور دیگر نمازیوں کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑی محبت اور اخلاص سے پیش آتا ہے۔ اس کے برتاؤ نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا ہے، خاص طور پر امتیاز جٹ تو اس کی کچھ زیادہ ہی تعریف کرتا ہے.....''

''یہ امتیاز جٹ کون ہے؟'' جمعہ خان سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''امتیاز جٹ، حاجی کا مالک مکان ہے ملک صاحب! امتیاز کے پاس دو مکان ہیں۔ ایک میں تو وہ خود اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے جبکہ دوسرا اس نے حاجی کو کرایے پر دے دیا ہے۔ حاجی نے یہ مکان لیتے ہوئے کوئی مول تول نہیں کیا، امتیاز کے منہ مانگے کرائے پر وہ نہ صرف راضی ہو گیا بلکہ اس نے تین ماہ کا کرایہ پیشگی بھی ادا کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حاجی نے امتیاز کے بیٹے اشرف کو عراق بھی بھجوا دیا ہے۔''

''عراق بھجوا دیا ہے.....'' میں نے چونک کر جمعہ خان کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''ملک صاحب! حاجی، لوگوں کو بیرونِ ملک بھجوانے کا کام کرتا ہے۔'' جمعہ خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ بات پورے بخت پور کو معلوم ہے۔ میرا سالا بھی سعودی عرب جانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہاں مزدوری کی بڑی اچھی اجرت مل جاتی ہے اور پھر حاجی اتنی آسانی سے باہر بھجواتا ہے کہ بخت نگر کے کبھی نوجوان بیرون ملک جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ دو روز پہلے تین لڑکے بخت نگر سے گئے ہیں جن میں امتیاز جٹ کا بیٹا اشرف بھی شامل تھا۔ مجھے پتا چلا ہے، تین دن بعد ہفتے کی رات چار لڑکوں کا ایک اور گروپ بخت نگر سے روانہ ہونے والا ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ جو تم بتا رہے ہو کہ حاجی بڑی آسانی سے لوگوں کو بیرونِ ملک پہنچا دیتا ہے اس کا کیا مطلب ہے، کیا اس کے اپنے جہاز چلتے ہیں؟''

''جہاز تو نہیں چلتے جناب، میں اس کے طریقہ کار کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ جتنی آسانی اور سہولت سے لوگوں کو لے کر جا رہا ہے وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ خود بتائیں جناب، ایک پائی پیسا لیے بغیر کوئی کسی کو ملک سے باہر لے کر جاتا ہے؟''

''کیا... کیا وہ مفت میں لوگوں کو لے کر جا رہا ہے؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے حوالدار کو دیکھا۔

''مفت میں نہیں جناب، ادھار میں.....'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اور حاجی صاحب کی یہی ادا مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔ پتا نہیں، وہ کس چکر میں ہے۔''

''اس کے چکر کا میں پتا چلا لوں گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم مجھے اس ''ادھار'' کی تفصیل بتاؤ جس کی بنا پر حاجی لوگوں کو ملک سے باہر لے کر جاتا ہے؟''

آج کل کی طرح اس زمانے میں، پاکستان سے باہر جا کر کام کرنے کا رجحان بہت کم تھا تاہم اکا دکا افراد قسمت آزمائی کے لیے بیرونِ ملک جایا کرتے تھے کیونکہ وہاں محنت مزدوری کا معاوضہ بہت اچھا مل جاتا تھا لیکن میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی تھی کہ پاکستان سے باہر جا کر ملازمت کرنے والوں میں زیادہ تعداد چھوٹے شہروں میں بسنے والے افراد کی ہوتی تھی اور کوئی ریکروٹنگ ایجنٹ یوں گاؤں دیہات میں ڈیرا جما کر نہیں بیٹھتا تھا بلکہ بیرونِ ملک جا کر کمائی کرنے کے خواہشمند افراد کو خود آگے بڑھ کر ایسے ایجنٹوں سے رابطہ کرنا پڑتا تھا جس کا ٹھکانا عموماً شہروں میں ہوتا تھا، چاہے وہ شہر چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اس تناظر میں حاجی برکت علی رحمت علی کا اسٹائل واقعی کسی خار کی طرح ذہن میں چبھتا تھا۔

حوالدار جمعہ خان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ملک صاحب! حاجی نے بخت نگر میں رہائش اختیار کرنے کے بعد لوگوں کو اپنے کاروبار کے بارے میں واضح طور پر بتا دیا تھا۔ اسے اپنے بزنس کی پبلسٹی کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس کام کے لیے اس نے گاؤں کی مسجد کو چن لیا ہے۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے وہاں جاتا ہے اور نماز ختم ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک مسجد ہی میں بیٹھا رہتا ہے۔ اسی دوران میں وہ باتوں ہی باتوں میں اپنا کاروبار بھی چمکاتا رہتا ہے۔ خیر، میں آپ کو حاجی کے طریقۂ کار کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' تھوڑا توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

''بخت نگر کے لوگوں کو اس نے یہی بتا رکھا ہے کہ وہ بندوں کو سعودی عرب، کویت، عراق، ایران، لیبیا، لبنان، اردن، بحرین اور دیگر عرب ممالک بھیجتا ہے۔ کسی بھی ملک میں جانے کا معاوضہ برابر ہے، پانچ ہزار روپے..... اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی پیشگی رقم نہیں لے رہا بلکہ سب سے یہی کہہ رہا ہے کہ جب بندہ بیرونِ ملک جا کر ملازمت پر لگ جائے اور اسے پہلی تنخواہ مل جائے تو وہ اس کے وارثوں سے رقم وصول کر لے گا حالانکہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایسے ایجنٹ رقم ایڈوانس میں لیتے ہیں اور اس قسم کے کام کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے پانچ ہزار کی رقم بھی بہت زیادہ ہے لیکن چونکہ لوگوں کو پیسے پہلے نہیں دینا پڑ رہے اس لیے انہیں یہ رقم زیادہ نہیں لگ رہی۔ یہی سچ میرے ذہن کو الجھا رہا ہے.....''

''تمہارا ذہن بلاوجہ نہیں الجھ رہا جمعہ خان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ حاجی اس ریکروٹنگ کے دھندے کی آڑ میں کوئی نہایت ہی خطرناک کھیل، کھیل رہا ہے، گاؤں کے سادہ مزاج لوگ اس شاطر کی چال کو نہیں سمجھ سکتے۔ میرا دھیان تو بار بار اسی گروہ کی طرف جا رہا ہے.....''

''کون سا گروہ جناب؟'' حوالدار نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''جمعہ خان! تم نے بتایا ہے کہ حاجی کا تعلق لاہور سے ہے اور وہ بخت نگر میں امتیاز جٹ کا مکان کرائے پر لے کر رہ رہا ہے۔ اس کی فیملی میں کتنے افراد ہیں؟''

''فی الحال تو وہ اکیلا ہی آیا ہے۔'' جمعہ خان نے جواب دیا۔ ''گاؤں والوں کو اس نے بتایا ہے کہ اس کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی صوفیہ نے تعلیم مکمل کر لی ہے لیکن صدف اور عمران کے آج کل امتحانات ہو رہے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کو فوری طور پر گاؤں میں نہیں لایا جا سکتا۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے پہلے وہ بخت نگر میں اپنے لیے ذاتی گھر تعمیر کرائے گا پھر جولائی یا اگست میں وہ اپنی فیملی کو بھی لے آئے گا۔''

''بہت ہی کائیاں اور چالاک آدمی ہے یہ حاجی۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بچوں کے امتحانات تو مارچ کے ابتدائی حصے میں مکمل ہو گئے تھے۔ اکتیس مارچ کو نتیجہ نکلا ہے اور پورے پنجاب کے اسکولوں میں اب نئی جماعتیں شروع ہو چکی ہیں اور پھر.....'' میں نے ذرا توقف کر کے سانس ہموار کی پھر کہا۔

''یہ بات کتنی عجیب سی ہے جمعہ خان کہ ایک شخص جس کا کاروبار لاہور جیسے بڑے شہر میں عمدگی سے چل رہا ہو، اس کے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے ہوں، وہ ضلع جھنگ کے اس دور دراز گاؤں میں آ کر کیوں رہائش اختیار کرے گا؟''

''وہ مستقل طور پر بخت نگر میں آ کر نہیں بسنا چاہتا.....''

''پھر.....؟'' میں نے چونک کر حوالدار کو دیکھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''حاجی نے گاؤں والوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ رہائش تو لاہور ہی میں رکھے گا لیکن موسم سرما اور گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لیے وہ بیوی بچوں کو یہاں لایا کرے گا۔''

''اور بخت نگر کے باسیوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا ہے؟''

''جی ہاں۔'' حوالدار نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''ان بے چاروں کے پاس یقین کرنے کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس پر بھروسا کر رہے ہیں۔''

''اور ایک دن آنکھیں کھول کر انہیں اپنی حماقت پر رونا پڑے گا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''جمعہ خان! دو روز پہلے حاجی نے بخت نگر کے کن کن تین لڑکوں کو یہاں سے بھیجا ہے اور کیسے.....؟''

''ایک تو امتیاز جٹ کا بیٹا اشرف ہے۔ دوسرے دو لڑکوں کے نام رفیق اور جاوید ہیں۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''دو روز پہلے دوپہر کے وقت ایک جیپ بخت نگر پہنچی تھی۔ جس میں ایک ادھیڑ عمر شخص اور ایک خوبصورت نوجوان لڑکی موجود تھی۔ حاجی کے مطابق اس ادھیڑ عمر شخص کا نام سکندر شاہ ہے جو اس کا بزنس پارٹنر ہے اور وہ خوبرو لڑکی صوفیہ تھی، حاجی کی بڑی بیٹی۔''

حوالدار نے تھوڑا توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''صوفیہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حاجی کے کام میں ہاتھ بٹا رہی ہے اور لاہور والے آفس میں بیٹھتی ہے۔ اس کے ذمے انٹرویوز کا کام ہے۔ وہ بیرونِ ملک جانے کے خواہشمند افراد سے مختلف سوالات کر کے یہ جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ کس نوعیت کے کام کے لیے موزوں رہیں گے۔ یہاں بھی وہ اسی مقصد سے آئی تھی۔ اس نے اشرف، جاوید اور رفیق کا انٹرویو کیا اور شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ ان تین نوجوانوں کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلی گئی۔ ان تینوں کے گھر والے بہت خوش ہیں کہ ان کے بیٹے ملک سے باہر جا کر ڈھیروں دولت کمائیں گے اور وہ خوشحال ہو جائیں گے۔ اگلے پھیرے میں عارف، مشتاق، حامد اور فرقان جائیں گے۔ تین دن بعد ہفتے کی رات صوفیہ اور سکندر شاہ دوبارہ بخت نگر آ کر انہیں جیپ میں لے جائیں گے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! بخت نگر کے نوجوانوں میں ایک خاص قسم کا جوش و خروش دیکھنے کو مل رہا ہے۔ جوانوں کے علاوہ ادھیڑ عمر افراد بھی بیرونِ ملک جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں جیسا کہ میں نے اپنے سالے شمشاد احمد کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ سعودی عرب جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جب صوفیہ جیسی خوبصورت لڑکی انٹرویو کرے گی تو جوان کیا، بوڑھے بھی قسمت آزمائی کے لیے بے قرار دکھائی دیں گے۔ میں تو اس بات سے پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر حاجی نے اپنا دھندا اسی طرح جاری رکھا تو بخت نگر کے علاوہ آس پاس کے علاقے بھی جوانوں سے خالی ہو جائیں گے کیونکہ یہ خبر بخت نگر تک ہی محدود رہنے والی نہیں، وبائی امراض کی طرح بہت دور تک پھیلے گی۔ جب سارے کا سارا جوان خون بیرونِ ملک محنت مزدوری کرنے چلا جائے گا تو یہاں کے کھیتوں اور کھلیانوں کا کیا ہوگا؟''

''یہ واقعی بہت فکرمندی کی بات ہے۔'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر حاجی نے صوفیہ کی شادی کا تذکرہ کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ بہت سے جوان تو بڑے رنگین اور سنگین خواب بھی دیکھنے لگے ہیں... میرا مطلب ہے، صوفیہ کے حوالے سے۔''

''کیوں؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر جمعہ خان کو دیکھا اور پوچھا۔ ''حاجی نے ایسی کون سی بات کر دی ہے؟''

''وہ گاہے بہ گاہے یہ کہتے سنا گیا ہے کہ صوفیہ کی وجہ سے اس کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''اس کی پریشانی کے مطابق صوفیہ پوری طرح بالغ ہو چکی ہے، تعلیم یافتہ ہے، سلیقہ شعار اور خوش گفتار ہے لہٰذا وہ جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا ہے، بس کوئی معقول سا لڑکا نظر آ جائے...!''

''اور بخت نگر کا ہر نوجوان خود کو ''معقول لڑکا'' ثابت کرنے کے لیے تیاری میں جت گیا ہوگا۔'' میں نے کمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ تم بخت حاجی، لگتا ہے کہ انسانی نفسیات سے کھیلنا بہ خوبی جانتا ہے۔ اس کا جلد ہی کوئی ''بندوبست'' کرنا ہوگا۔''

میں نے لفظ بندوبست پر زور دیا تو حوالدار جمعہ خان نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا لیکن آپ نے جواب نہیں دیا؟''

میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کون سے سوال کی طرف تھا۔ میں نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''تم اس گروہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہو نا جس کا میں نے ذکر کیا تھا؟''

''جی.... جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''جمعہ خان! کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں میں ضلع قصور کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ ایک روز مجھے ہیڈ کوارٹر جانے کا اتفاق ہوا تو یہ قصہ میرے علم میں آیا تھا۔ اس حوالے سے میں بڑا خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ مجھے اپنے سینئر افسران کے ساتھ بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا بارہا موقع ملتا رہا ہے۔ ایسی ہی ایک نشست میں اس گروہ کا تذکرہ بھی ہوا جس کا ذکر میں نے تمہارے سامنے کیا ہے۔ حاجی کی مشکوک سرگرمیاں دیکھ کر میرا دھیان بار بار اسی گروہ کی طرف جا رہا ہے...'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وہ گروہ بڑے منظم طریقے سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ کل چار افراد تھے جن کا سرغنہ صفدر سلطان نامی ایک شخص تھا۔ یہ چاروں چھوٹے شہروں اور قصبہ جات وغیرہ میں جا کر ایسے نوجوانوں کو تلاش کرتے جن کی عمریں پندرہ اور پچیس سال کے درمیان ہوں۔ وہ صحت مند اور جفاکش ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یا تو وہ بیروزگار ہوں اور یا پھر کوئی ایسا کام دھندا کرتے ہوں جس سے معقول آمدنی نہ ہوتی ہو۔ وہ ایسے افراد کو بڑے شہروں میں اچھی اور زیادہ آمدنی والی نوکریوں کے خواب دکھاتے اور اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر لاہور میں بنا رکھا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک خطرناک کام کر رہے تھے۔ لوگوں کو ملازمتیں وغیرہ دلوانا تو ایک ڈھونگ تھا۔ لوگ ان کی سنہری اور چکنی چپڑی باتوں میں ایسے پھنستے کہ پھر فرار کی کوئی راہ کھلی نہ رہتی۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد سنسنی خیز انداز میں اضافہ کیا۔

''صفدر سلطان اور اس کے تین ساتھی درحقیقت بردہ فروش تھے۔''

''بردہ فروش!'' جمعہ خان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''یعنی وہ دھوکے سے اپنے جال میں پھانسے ہوئے لوگوں کو فروخت کر دیتے تھے؟''

''بالکل..... بردہ فروش یہی کرتے ہیں۔'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''لاہور پہنچانے کے بعد وہ انہیں دو دو، تین تین کر کے کراچی بھجوا دیتے۔ اس کام کے لیے ایک الگ ٹیم موجود تھی۔ مبینہ بردوں سے کہا جاتا کہ انہیں پانی کے جہاز پر نوکری ملی ہے۔ اس طرح وہ ستم نصیب انسانوں کے ایک ایسے آسٹگر کے ہتھے چڑھ جاتے جو انہیں اپنے ساتھ سمندری راستے سے موریطانیہ، تنزانیہ اور موزمبیق وغیرہ لے جاتا جہاں ایک منڈی میں باقاعدہ ان کا نیلام ہوتا، جب ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ زندگی بھر کے لیے غلام بنائے جا چکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ بہرحال...'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''پولیس نے نہایت ہی خفیہ انداز میں اس گروہ کی نگرانی کی اور ایک رات انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔ پولیس کے ہتھے صرف صفدر سلطان اور اس کے تین ساتھی ہی چڑھے تھے۔ آگے کی چین کو گرفت میں نہیں لایا جاسکا تھا۔ صفدر سلطان اینڈ کمپنی کی گرفتاری سے اگلا سیٹ اپ محتاط ہوگیا اور اس سے پہلے کہ پولیس ان پر ہاتھ ڈالتی، وہ گدھے کے سینگوں کے مانند منظر سے غائب ہوگئے۔ پولیس کو اس آپریشن میں جزوی کامیابی ہوسکی تھی۔ صفدر سلطان اور اس کے تینوں ساتھیوں پر باقاعدہ مقدمات چلائے گئے اور وہ لوگ عدالت سے سزا پاکر جیل چلے گئے تھے اور اب بھی یقیناً وہ کسی جیل ہی میں سڑ رہے ہوں گے... کھ عرصہ پہلے تک میرا یہی خیال تھا لیکن حاجی برکت علی رحمت علی کی خفیہ سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ کہیں یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تو نہیں!''

''آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے ملک صاحب!'' حوالدار تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''حاجی نے جن تین نوجوانوں کو ملک سے باہر بھجوانے کے لیے بخت نگر سے روانہ کیا ہے ان کی عمریں جاوید اٹھارہ سال، رفیق تیئس سال اور اشرف چوبیس سال ہیں۔ اسی طرح عارف، حامد، فرقان اور مشتاق کی عمریں بھی بالترتیب سولہ، انیس، بیس اور بائیس سال ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی عمر ہے اور اس قسم کے بردے زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جمعہ خان! تمہاری معلومات کے مطابق سکندر شاہ اور صوفیہ آنے والے ہفتے کو دوبارہ بخت نگر پہنچیں گے اور اسی رات ان چار جوانوں کو اپنے ہمراہ لاہور لے جائیں گے۔''

''جی ملک صاحب! میری معلومات غلط نہیں ہوسکتیں۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''میں نے غیر محسوس انداز میں آپ کی ہدایت کے مطابق بڑی محنت اور احتیاط سے یہ معلومات اکٹھا کی ہیں۔ ہمیں ہفتے کی شام بخت نگر میں ایک زبردست کارروائی ڈالنا چاہیے۔ میں نے سلطان شاہ کی جیپ کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے۔''

''ویری گڈ، شاباش...'' میں نے تعریفی نظروں سے جمعہ خان کو دیکھا اور جیپ کے نمبر کے حوالے سے استفسار کیا۔

اس نے بتایا۔ ''ملک صاحب! وہ ایک لینڈ روور جیپ ہے جس پر لاہور کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے... ایل ای ڈی۔ اٹھ ہتر۔''

''ہوں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جمعہ خان! کارروائی تو ڈالی جائے گی اور بڑی بھرپور ڈالی جائے گی لیکن اس کے لیے تیاری کرنا ہوگی۔ آنے والے ہفتے کے دن میں ابھی کافی وقت ہے۔ مجھے امید ہے، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم ایک کام کرو...''

میں بولتے بولتے رکا تو حوالدار نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''جی ملک صاحب! کون سا کام؟''

میں نے اس کے استفسار کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ''تمہارا ابھی کا کیا پروگرام ہے... میرا مطلب ہے، تم ابھی واپس بخت نگر جاؤ گے یا رات ادھر ہی نور کوٹ میں گزارنے کا پروگرام ہے؟''

''میں زلیخا سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ ایک ضروری کام کے لیے مجھے نور کوٹ جانا ہے۔'' حوالدار نے جواب دیا۔ ''اگر جلدی فارغ ہوگیا تو واپس آجاؤں گا ورنہ ادھر ہی رک جاؤں گا اور اگلی صبح آؤں گا۔ جب سے میں نے اسے بتایا ہے کہ میں کسی خطرناک مجرم کی تلاش اور گرفتاری کے سلسلے میں ایک خاص مشن پر ہوں، وہ زیادہ سوال نہیں کرتی اگر میں رات کو واپس بخت نگر نہیں بھی گیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

میں نے ایک جماہی لی اور رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ اتنی رات گئے واپس جانا مناسب نہیں، خواہ مخواہ تمہاری سسرال والوں کو بھی شک ہوگا کہ یہ تم کس قسم کی مصروفیات میں پھنسے ہوئے ہو۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں صبح سویرے نکل جاؤں گا۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ مجھے کوئی کام بتا رہے تھے...؟''

''ہاں، میں کہہ رہا تھا...'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بخت نگر میں رہتے ہوئے بڑے کام کی معلومات اکٹھا کی ہیں۔ میرے خیال میں، آنے والے دو تین دن بھی تمہیں وہیں گزارنا چاہئیں تاکہ حاجی اور اس کے عزائم مزید کھل کر سامنے آسکیں۔ ہم جمعہ کی شام کو دوبارہ ملیں گے اور تازہ ترین صورت حال کی روشنی میں ہفتے کی شام کے لیے کوئی مؤثر حکمت عملی ترتیب دیں گے اگر حاجی پر کچا ہاتھ ڈالا گیا تو کام خراب ہوجائے گا۔ ہماری تیاری اور کارروائی میں کوئی کمی، کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔ ''میں علی الصباح بخت نگر روانہ ہوجاتا ہوں اور وہاں کا محاذ سنبھال لیتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ اس دوران میں، یعنی جمعے کی شام سے پہلے اگر کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

میں نے اس کی تجویز کی تائید کی اور پوچھا۔ ''جمعہ خان! کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ جیپ کس راستے سے بخت نگر پہنچی تھی اور واپسی میں اس نے کون سا راستہ اختیار کیا تھا؟''

''جناب! میں نے بھی اس بارے میں چھان بین کی ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''وہ لوگ جھنگ کی طرف سے آئے تھے یعنی ہمارے تھانے کے سامنے سے گزرے تھے۔ اسی سڑک پر آگے جا کر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ایک کچا راستہ شمال کی سمت نکلتا ہے جو اسی درجے کے زاویے پر آگے بڑھتے ہوئے سیدھا بخت نگر تک پہنچتا ہے۔ سکندر شاہ نے آمد اور شد کے لیے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔''

''ہوں...'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر سکندر شاہ، بخت نگر کے جوانوں کو لے کر واقعی لاہور گیا ہے تو اسے میرے تھانے کے سامنے سے گزر کر پہلے جھنگ شہر جانا پڑا ہوگا اور وہ جھنگ شہر سے آگے لاہور کی سمت روانہ ہوا ہوگا۔''

میرے کوارٹر میں صرف ایک ہی چارپائی تھی جو کہ میرے استعمال میں رہتی تھی۔ یہ رات حوالدار جمعہ خان کو بھی اسی کوارٹر میں گزارنا تھی لہٰذا میں متلاشی نظر سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے شب بسری کی سیٹنگ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جمعہ خان نے فوراً بھانپ لیا کہ میں کون سے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ذہنی توانائی صرف کر رہا ہوں۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''ملک صاحب! آپ اطمینان سے چارپائی پر سو جائیں۔ میں زمین پر بستر لگا لوں گا۔''

''زمین پر...؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، محمدی بستر۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ آپ کی چٹائی رکھی ہے نا۔'' اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں وہ بچھا کر اطمینان سے سو جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں، چند گھنٹوں ہی کی تو بات ہے...''

میں نے نماز کی ادائیگی کے لیے ایک چٹائی مختص کر رکھی تھی۔ یہ خاصے بڑے سائز کی چٹائی تھی۔ میں کوارٹر کے فرش پر مذکورہ چٹائی کو بچھاتا پھر اس کے اوپر جائے نماز ڈال کر اللہ کے حضور حاضر ہو جاتا۔ حوالدار کی تجویز کے جواب میں، میں نے کہا۔

''بات چند گھنٹوں کی ہو یا رات بھر کی لیکن مساوات اور رواداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں خود تو چارپائی پر آرام سے سوؤں اور تم چٹائی پر رات گزارو۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے ملک صاحب!'' وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''بہت فرق پڑتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سارا ثواب تم سمیٹ لو اور میں مزے سے بے خبر سوتا رہوں۔''

وہ میری سنجیدگی کے لبادے میں چھپے ہوئے نکتے تک نہ پہنچ سکا اور متذبذب لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کس قسم کے ثواب کی بات کر رہے ہیں جناب؟''

''محمدی بستر پر شب بسری کا ثواب۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''اوہ...'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ''جمعہ خان! یہ چٹائی اتنی بڑی ہے کہ ہم دونوں بہ سہولت اس پر سو سکتے ہیں اور برابر کا ثواب کما سکتے ہیں۔''

''لیکن جناب! آپ تو تھانہ انچارج...!''

''میں تھانہ انچارج اور تم حوالدار صرف فرائض کی بجا آوری کے لیے ہیں اور... وہ بھی ڈیوٹی کے اوقات میں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس وقت نہ تم حوالدار ہو اور نہ ہی میں تھانے دار۔ ہم صرف دو انسان ہیں اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دونوں میں برابری اور توازن قائم رہے۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز میں ایس پی آفس جا کر علی نواز گوندل سے ملا۔ ایس پی گوندل صاحب بڑے ہی تجربہ کار پولیس آفیسر تھے۔ ابھی چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ حق مغفرت کرے۔ بڑے ہی بذلہ سنج اور سرد و گرم چشیدہ تھے۔ نوّے کے قریب عمر پائی تھی انہوں نے۔ گوندل صاحب ہمیشہ محبت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں یا یوں سمجھیں کہ ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھا تھا۔ انسان فانی ہے۔ جو شخص دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن واپس بھی جانا ہے۔ پتا نہیں، کب اپنا بھی بلاوا آ جائے...!

جب میں گوندل صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہ فرصت میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں حاجی برکت علی رحمت علی کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ہمارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درمیان بردہ فروشی کے امکانات پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ انہوں نے توجہ سے میری بات سنی اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

''صفدر حیات! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ مجھے بھی یہ حاجی خاصا گڑبڑ لگ رہا ہے۔ بہرحال، بخت نگر تمہارے تھانے کی حدود میں آتا ہے۔ تم حاجی کی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھو۔ اس سلسلے میں میری طرف سے کسی مدد یا تعاون کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟''

''بالکل ضرورت ہے سر!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے حاجی کو بے نقاب کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا ہے، وہ آپ کے تعاون کے بغیر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔''

''ہاں بتاؤ، تمہیں کس قسم کا تعاون چاہیے؟'' وہ ٹھوس لہجے میں مستفسر ہوئے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے ایک گاڑی کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی ایسی گاڑی جس میں بیٹھ کر میں اپنے تھانے سے لاہور تک کا سفر طے کر سکوں۔''

''ہوں...'' انہوں نے گہری نظر سے مجھے گھورا اور کہا۔ ''گاڑی مہیا کر دی جائے گی۔ تمہارا منصوبہ کیا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''سر! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، آنے والے ہفتے کی شام حاجی، بخت نگر کے مزید چار جوانوں کو جیپ کے ذریعے لاہور بھجوانے والا ہے۔ اس سے پہلے جو تین نوجوان گئے تھے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ حاجی کا جتنا سیٹ اپ بخت نگر میں کام کر رہا ہے اس میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا جس سے نتائج تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ ویسے میں نے حوالدار جمعہ خان کو سادہ لباس میں، بخت نگر میں تعینات کر رکھا ہے۔ بخت نگر میں چونکہ اس کی سسرال بھی ہے لہٰذا اسے کام کرنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ جمعہ خان مجھے وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرتا رہتا ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں...'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میری خواہش ہے کہ ہفتے کی شام جب جیپ بخت نگر کے چار نوجوانوں کو لے کر لاہور کی سمت سفر کا آغاز کرے تو میں اس کا تعاقب کروں تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ حاجی ان سادہ لوح دیہاتیوں کو بیرونِ ملک بھجوانے کا چھانسا دے کر کہاں پہنچا رہا ہے۔ اس سلسلے میں، میں جو بھی تحقیق کروں گا، اس کی رپورٹ پہلی فرصت میں، میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔''

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے صفدر حیات!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''لیکن اس کام میں ایک محکمہ جاتی قباحت ہے...''

''وہ کیا سر؟'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر انہی سے پوچھ لیا۔

حالانکہ میں یہ خوبی سمجھ رہا تھا، ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ ہر تھانے کی اپنی ایک مخصوص حدود ہوتی ہے اور تھانے دار کو اسی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے فرائض کو انجام دینا پڑتا ہے۔ میرا لاہور جانا اس حوالے سے اختیارات سے باہر یا حدود سے متجاوز نظر آتا تھا تاہم کسی کیس کے سلسلے میں، ایک علاقے کے ذمے دار کسی دوسرے علاقے کے ذمے داروں سے تعاون اور مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ میں جس علاقے کا تھانے دار تھا، بخت نگر اس میں شامل تھا چنانچہ حاجی کے حوالے سے میں بخت نگر کی حدود میں ہر قسم کی کارروائی کا مجاز تھا۔ یہ مناسب اور ممکن نہیں تھا کہ میں لاہور جا کر کسی قسم کی سرگرمی دکھاؤں۔ ایس پی علی نواز گوندل نے میرے استفسار کے جواب میں وہی سب کچھ کہا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ بات کے اختتام پر انہوں نے کہا۔

''صفدر حیات! تم خود خاصے سمجھدار ہو...!''

''سر! میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل، میں نے ایسا پروگرام ترتیب دیا ہے جس میں کسی قسم کی مداخلت کا اندیشہ نہیں۔ میں یہاں سے سیدھا لاہور جاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ حاجی کا وہاں کیا دھندا ہے۔ وہ گاؤں دیہات سے گھیر کر لے جائے جانے والے نوجوانوں کو واقعی بیرونِ ملک بھیجتا ہے یا پھر ان کے ساتھ کوئی اور ''سلوک'' کرتا ہے۔ بردہ فروشی کے موضوع پر ہم خاصی تفصیلی بات کر چکے ہیں۔ اس امکان کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

میں نے تھوڑا توقف کیا، ایک گہری سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''میں حاجی کے خلاف کچھ ایسے ثبوت اور شواہد اکٹھا کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا پر میں بخت نگر میں اس پر پکا ہاتھ ڈال سکوں۔ میں اس کے خلاف جو بھی کارروائی کروں گا وہ اپنے تھانے کی حدود، اپنے اختیارات میں رہتے ہوئے قانون کے مطابق کروں گا۔ اپنے علاقے سے باہر میں کسی نوعیت کی کوئی سرگرمی نہیں دکھاؤں گا۔ لاہور والے مشن میں میری حیثیت خاموش تماشائی ایسی ہوگی اور یہ تماشائی وہاں جو بھی تماشا دیکھے گا، اس کی رپورٹ پہلے آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو پیش کرے گا پھر آپ کی صلاح حاصل کرنے کے بعد آگے پیش قدمی کرے گا۔''

''ٹھیک ہے...!'' گوندل صاحب نے ایک پُرسکون سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ طریقہ معقول بھی ہے اور قانون کے دائرے کے اندر بھی۔ تم کب لاہور کے لیے روانہ ہونا چاہتے ہو؟''

''سر! ابھی تک کی معلومات کے مطابق حاجی کا پارٹنر سکندر شاہ اور صوفیہ ہفتے کو بخت نگر پہنچیں گے اور اسی شام چار لڑکوں کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر لاہور لے جائیں گے اگر ان کے اس پروگرام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو مجھے ہفتے کی دوپہر کو گاڑی چاہیے ہوگی۔''

''ہوں...'' گوندل صاحب نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا اور گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''ہفتے کی صبح میری گاڑی ڈرائیور سمیت تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ میرا ڈرائیور گل داد بھی ایک تجربہ کار پولیس والا ہے۔ میں اسے کام کی نوعیت کے حوالے سے بریف کردوں گا۔ وہ خواہ مخواہ کے سوالات پوچھ کر تمہارا دماغ خراب نہیں کرے گا۔ تم اطمینان سے اپنی تفتیش مکمل کرلو۔ لاہور سے واپسی پر سیدھا میرے پاس آنا اور اپنی تحقیق کی رپورٹ پیش کرنا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''قبل از وقت اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ تمہیں لاہور میں کتنا وقت لگے گا۔ وہاں دیر بھی ہوسکتی ہے لہٰذا مناسب یہی ہوگا کہ تم لوگ اگلے روز یعنی اتوار کو واپس آجاؤ۔ گل داد کے رشتے دار لاہور میں موجود ہیں۔ تم رات ان کے گھر میں ٹھہر سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں گل داد کو ضروری ہدایات دے دوں گا۔''

''یہ پروگرام بالکل مناسب ہے سر۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

انہوں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''لاہور کی جانب روانہ ہونے سے پہلے تم حوالدار جمعہ خان کو واپس تھانے بلا لینا۔ تمہاری غیر موجودگی میں کسی ذمے دار اور تجربہ کار شخص کا تھانے میں حاضر رہنا بہت ضروری ہے۔''

''او کے سر... میں ایسا ہی کروں گا۔'' میں نے فرمانبرداری سے کہا۔

''ایک بات اور...'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''ظاہر ہے تم اور گل داد عوامی لباس میں لاہور جاؤ گے تاکہ کسی کو... خصوصاً حاجی اینڈ کمپنی کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو۔ میں کار کی نمبر پلیٹ پر سے ''پنجاب پولیس'' کے الفاظ بھی عارضی طور پر غائب کردوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں تعاقب میں بھی بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا، جیپ والوں کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تھانے سے کوئی کار ان کے پیچھے لگی ہے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر!'' میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''تعاقب کا آغاز یا تو چند سو گز پیچھے سے کیا جائے گا اور یا پھر چند سو گز آگے سے یعنی میں جھنگ شہر کی طرف جانے والی سڑک پر پہلے سے موجود ہوں گا۔ لینڈ روور جیپ جیسے ہی بخت نگر سے آنے والی کچی سڑک کو چھوڑ کر نیم پختہ سڑک پر چڑھے گی، غیر محسوس انداز میں اس کا تعاقب شروع ہوجائے گا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہوجائیں۔ میں کسی بھی مرحلے پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا۔''

''ویری گڈ۔'' انہوں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''وش یو گڈ لک!''

میں نے اس گراں قدر تعاون پر ان کا شکریہ ادا کیا اور واپس آگیا۔

جمعے کی شام کو حسب وعدہ حوالدار جمعہ خان میرے پاس موجود تھا۔ ہماری یہ ملاقات تھانے کے اندر ہی ہوئی۔ اس وقت تھانے میں عملے کے دیگر افراد بھی موجود تھے جس کسی نے بھی اس کی واپسی کے بارے میں سوال کیا، اس نے انہیں یہ کہہ کر خوب صورتی سے ٹال دیا کہ وہ ایک دو دن میں واپس آجائے گا۔ ابھی تو وہ صرف تھانہ انچارج صاحب سے ملنے آیا ہے۔ یہی بات جب جمعہ خان نے مجھے بتائی تو میں نے کہا۔

''جمعہ خان! تم نے اپنے ساتھیوں سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم واقعی کل شام کو واپس آجاؤ گے۔''

''جی...؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ادھر بخت نگر سے سکندر شاہ کی جیپ جوانوں کو لے کر روانہ ہوئی، ادھر تم بھی واپسی کا سفر شروع کردو گے۔ جب تم تھانے پہنچو گے تو میں تمہیں یہاں نظر نہیں آؤں گا۔ میری غیر موجودگی میں ایک دو دن تمہیں یہاں کا نظام سنبھالنا ہے کیونکہ میرے بعد یہاں کے عملے میں تم ہی سب سے زیادہ سینئر ہو...''

اس نے حیرت اور الجھن کی ملی جلی کیفیت میں میری پوری بات سنی اور پوچھنے لگا۔ ''جناب ملک صاحب... آپ کہاں جارہے ہیں؟''

اس استفسار کے جواب میں، میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی اور گوندل صاحب کی ملاقات اور آئندہ کی پلاننگ کے بارے میں آگاہ کردیا اور آخر میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ منصوبہ صرف تین افراد کے درمیان ہے... یعنی ایس پی صاحب، میں اور تم۔ اس راز کی حفاظت کی ذمے داری تم پر بھی عائد ہوتی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں کسی بھی مرحلے پر غیر ذمے داری کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ادھر بخت نگر کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں کے چار جوان بڑی بے تابی سے ہفتے کی شام کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ سکندر شاہ کے ساتھ جیپ پر سوار ہو کر بخت نگر سے لاہور کی سمت روانہ ہوں گے۔''

ـــ ـــ شام کا تو مجھے بھی بے چینی سے انتظار ہے، جمعہ خان!'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ بتاؤ، حاجی نے پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں کی؟''

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پروگرام وہی ہے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں نے اپنی معلومات کو تازہ رکھنے کے لیے ان چار نوجوانوں سے بھی گاہے بہ گاہے اور فرداً فرداً بات کی ہے۔ انہوں نے روانگی کی تیاری مکمل کر لی ہے۔ رختِ سفر باندھا جا چکا ہے، بس اس بات کا انتظار ہے کہ صوفیہ ان کا انٹرویو لینے بخت نگر پہنچے اور وہ پاس ہو کر دکھا دیں۔ صوفیہ کے ذکر پر ان کے چہرے گلنار ہو جاتے ہیں اور وہ کچھ اس قسم کا ردِعمل ظاہر کرنے لگتے ہیں جیسے صوفیہ انٹرویو کے بہانے ان میں سے کسی کو اپنے لیے منتخب کرنے آ رہی ہو۔''

''اس کم بخت حاجی نے چکر ہی ایسا چلایا ہے کہ نوجوانوں کیا، ادھیڑ عمر اور بوڑھے مردوں کے دلوں میں بھی کھد بد ہو رہی ہوگی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے، یہ صوفیہ اس کی بیٹی نہیں ہوگی بلکہ وہ اس کے سسٹم کا ایک پرزہ ہے۔ کوئی باپ اپنی خوبصورت، خوب رو بیٹی کو اس قسم کے گڑبڑ کاروبار میں نہیں لگاتا۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے ملک صاحب!'' حوالدار تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عارف، حامد، مشتاق اور فرقان کی زبانی صوفیہ کے حسن اور اداؤں کے جو قصے مجھ تک پہنچے ہیں وہ خاصے رنگین اور سنگین ہیں۔''

میں نے گمبھیر لہجے میں استفسار کیا۔ ''جمعہ خان! ان نوجوانوں سے بات چیت کرتے ہوئے تم نے احتیاط برتی ہے نا... میرا مطلب ہے، انہیں کسی مرحلے پر شک تو نہیں ہوا کہ تم انہیں کرید رہے ہو؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میرا انداز بالکل نارمل رہا ہے۔''

''گاؤں کے دیگر لوگوں نے تو تمہاری وہاں موجودگی کو کسی خاص انداز میں محسوس نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں ملک صاحب!'' اس نے پُریقین انداز میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس دوران میں حاجی برکت علی رحمت علی سے تمہاری ملاقات ہوئی؟''

حوالدار نے بتایا۔ ''میں باقاعدہ اس سے ملنے تو نہیں گیا جناب لیکن یہ بات مجھے معلوم تھی کہ وہ پنجگانہ نماز کے لیے مسجد میں جاتا ہے۔ اس کی اسی ''ادا'' نے گاؤں والوں کو متاثر کر رکھا ہے۔ وہ اسے ایک پرہیزگار اور عبادت گزار شخص تسلیم کر چکے ہیں اسی لیے وہ آنکھیں بند کر کے اس پر اور اس کے دھندے پر بھروسا کر رہے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی دن میں ایک آدھ بار نماز ادا کرنے کے لیے مسجد چلا جاتا ہوں۔ وہیں پر میری اس سے دعا سلام ہوئی ہے۔ میں نے اس سے زیادہ گھلنے ملنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی زیادہ بات چیت کی ہے تاکہ وہ میری جانب سے کسی کھٹکے میں مبتلا نہ ہو جائے۔ میرا انداز اور رویہ بالکل نارمل اور سرسری رہا ہے البتہ میں نے اس سے ڈبل نام کا معما پوچھ لیا ہے...!''

''کیا توجیہ کی ہے اس نے اپنے دہرے نام کی؟'' وہ متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

''حاجی نے بتایا ہے کہ اس کا اصل نام تو برکت علی ہے۔'' حوالدار وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''رحمت علی اس کے چھوٹے بھائی کا نام تھا جو عین عالمِ شباب میں اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ حاجی اپنے چھوٹے بھائی رحمت علی سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس کی موت نے حاجی کو کافی عرصے تک بے کل اور افسردہ رکھا اور اس بھائی کی یاد کو سدا تازہ رکھنے کے لیے حاجی نے اس کا نام اپنے نام کے آگے لگا لیا۔''

''بہت خوب...!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لوگ اپنے نام کے ساتھ عموماً باپ کا نام جوڑتے ہیں اور حاجی نے چھوٹے بھائی کے نام کو اپنے نام کے ساتھ نتھی کر لیا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی... تمہارا ''سو'' پیچھے بیسیوں کا اور ہمارا ''سو'' چار بیسیوں کا کر لو، جو کرنا ہے۔ بہرحال.. تم مجھے حاجی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں کچھ بتاؤ؟''

حوالدار جمعہ خان نے بڑی تفصیل سے میرے استفسار کا جواب دیا اور آخر میں بولا۔ ''ملک صاحب! حاجی کی شخصیت کا تاثر کچھ اچھا نہیں ہے۔ وہ تو گاؤں والوں کی سادگی اور معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے ورنہ اگر اس کی عبادت اور لچھے دار باتوں سے اوپر آ کر دیکھا جائے تو وہ خاصا مکروہ نظر آئے گا۔''

''ہوں'' میں نے اپنی پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''جمعہ خان! تم نے مجھے سکندر شاہ کی جیپ کا میک اور نمبر بتا دیا ہے۔ وہ ایک رف اینڈ ٹف لینڈ روور جیپ ہے جس پر ''ایل ای ڈی۔ اٹھہتر'' کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں ملک صاحب! آپ جیپ کے بارے میں بالکل ٹھیک بتا رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''مذکورہ جیپ کا رنگ کیسا ہے؟''

''وہ مٹیالے سے رنگ کی جیپ ہے۔'' حوالدار نے جواب دیا۔ ''آپ اسے خاکی رنگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، اب ایک آخری بات بھی بتا دو۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا سکندر شاہ خود ہی جیپ ڈرائیو کرتا ہے یا اس کے ساتھ کوئی ڈرائیور وغیرہ بھی ہوتا ہے؟''

''جناب! سکندر شاہ خود ہی ڈرائیو کرتا ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''لاہور سے صرف دو افراد جیپ میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ ایک سکندر شاہ اور دوسری حاجی کی مہینہ بیٹی صوفیہ۔ صوفیہ، سکندر شاہ کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھتی ہے۔ واپسی میں ان کے ہمراہ جانے والوں جوانوں کو جیپ کے کھلے حصے میں بٹھایا جاتا ہے۔''

میں نے اس کے بعد حوالدار جمعہ خان کو چند نصیحتیں کیں اور خاص طور پر اس بات کی تاکید کی کہ جیسے ہی وہ خاکی جیپ بخت نگر سے روانہ ہو، اسے تھانے میں پہنچانا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔

جمعہ خان کے جانے کے بعد میں اگلے روز کا پروگرام ترتیب دینے لگا۔

☆☆☆

بخت نگر، قصبہ نور کوٹ سے شمالی سمت میں واقع تھا اور ان دونوں گاؤں کے درمیان لگ بھگ تین میل کا فاصلہ حائل تھا۔ ایک کچا راستہ، تھانے والی نیم پختہ سڑک سے سیدھا بخت نگر کی طرف جاتا تھا، اس کچے راستے کی ایک جانب ایک نہر رواں دواں تھی جبکہ دوسری طرف کھیتوں کا وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا، گویا وہ راستہ کچا اور بے ڈھنگا ہونے کے باوجود بھی اپنے مسافروں کو فرحت بخش منظر اور خوش نما فضا فراہم کرتا تھا۔ اس راستے پر سائیکل سوار، گھڑ سوار، تانگا سوار اور پیدل... ہر طرح کے مسافروں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

میں نے بالائی سطور میں جس نہر کا ذکر کیا ہے۔ وہ شمالاً جنوباً بہتی تھی اور نیم پختہ سڑک کے نیچے سے گزر کر زیریں علاقے کو سیراب کرتے ہوئے آگے ہی آگے جنوبی سمت میں بہتی چلی جاتی تھی۔ سڑک کے اس مقام پر ایک پل بنا ہوا تھا جہاں سے نہر گزرتی تھی اور میں اس وقت اسی پل کے قریب موجود تھا۔

وہ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا۔ فضا میں اچھی خاصی تپش موجود تھی۔ عموماً اپریل کی شامیں خاصی خوشگوار ہوا کرتی ہیں لیکن اس سال موسم گرما خاصے جلال میں نظر آتا تھا۔ میرے ساتھ اس وقت ایس پی علی نواز گوندل کا ڈرائیور گل داد بھی موجود تھا۔ گل داد دن ہی میں گوندل صاحب کی کار لے کر میرے پاس آ گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی فیاٹ کار تھی جس کا رنگ نیلا تھا، ایس پی صاحب کی ہدایت کے مطابق کار کی نمبر پلیٹ پر سے ''پنجاب پولیس'' کے الفاظ صاف کر دیے گئے تھے تاکہ سکندر شاہ کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ گوندل صاحب نے گل داد ایک سمجھدار، تجربہ کار اور چاق و چوبند پولیس اہلکار تھا۔ ایسے مستعد لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا مزہ آتا ہے۔

میں پسنجر سیٹ پر براجمان تھا اور گل داد کار کے ساتھ کچھ ایسے انداز میں مصروف تھا جیسے اس میں پیدا ہو جانے والا کوئی فالٹ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ سب ایک قسم کی اداکاری تھی تاکہ کسی کو ہمارے بارے میں کوئی شک نہ ہو۔ ہم دونوں اس وقت عوامی لباس میں ملبوس تھا۔ کار کو ایسے زاویے سے کھڑا کیا گیا تھا کہ پسنجر سیٹ سے نیم پختہ سڑک کا وہ مقام بڑا واضح دکھائی دیتا تھا جہاں پر بخت نگر کی طرف سے آنے والا کچا راستہ آ کر ملتا تھا۔ خاکی جیپ جیسے ہی کچے راستے پر نمودار ہوتی، میری نگاہ میں آ جاتی۔ ہم اسی وقت نیلی فیاٹ کو حرکت میں لے آتے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی کہ جب خاکی جیپ جھنگ شہر کی طرف جانے والی نیم پختہ سڑک پر ''قدم'' رکھے تو ہم چند گز کے فاصلے پر اس سے آگے ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکندر شاہ کو یہی محسوس ہو کہ ہم مخالف سمت سے آ رہے تھے اور اب اتفاق سے ان کے آگے ہیں۔ یہ ایک فطری سی سچویشن ہوتی لہٰذا سکندر شاہ کا اس طرف دھیان ہی نہیں جا سکتا تھا کہ ہم ان کا پیچھا پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم تھانے، تانگا اسٹینڈ اور بس اسٹاپ سے آگے بڑھنے اور جھنگ شہر کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔

ہمارے درمیان پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ڈرائیونگ گل داد کرے گا اور میں اس کے پہلو میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھ کر مشاہداتی اونچ نیچ کا باریک بینی سے جائزہ لوں گا۔ گل داد بہت اچھے مزاج کا مالک تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ہمارے درمیان دوستی کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں، ہماری اسٹوری یہ تھی کہ میں گل داد کا چچازاد ہوں جو اس سے ملنے کے لیے لاہور سے جھنگ آیا ہوا تھا اور اب اس کے ہمراہ لاہور جا رہا تھا۔ گل داد مقامی ایس پی صاحب کا ڈرائیور تھا اور اس نے ایک دن کے لیے ایس پی صاحب سے ان کی کار لے لی تھی۔ یہ اسٹوری حقیقت کے قریب اور معمول کے مطابق تھی۔

دھوپ اپنے سنہری، حدت بردار پر سمیٹنے کو تھی کہ ٹیالے رنگ کی جیپ میری نگاہ میں آ گئی۔ وہ کچے راستے پر اچھلتی، دھول اڑاتی، بے ہنگم انداز میں نیم پختہ سڑک کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کی رفتار کچھ زیادہ نہیں تھی تاہم ناہموار کچا راستہ اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا اور اس کی بے ترتیب اچھل کود کا سبب بھی یہی تھا۔

میرے گرین سگنل پر گل داد جلدی سے کار کے اندر آیا اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اگلے ہی لمحے نیلی فیاٹ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ جب ہم کچی اور نیم پختہ سڑکوں کے ملاپ والے مقام سے چالیس گز آگے پہنچے تو خاکی جیپ بھی نیم پختہ سڑک پر آ گئی۔ میں نے عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں نگاہ ڈالی۔ خاکی جیپ مجھے بڑی واضح نظر آئی۔ سب سے پہلے میں نے اس کی نمبر پلیٹ پر دھیان دیا۔ وہاں ایل ای ڈی اٹھتر لکھا ہوا دکھائی دیا۔ مزید تصدیق اس بات سے ہو گئی کہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر سکندر شاہ موجود تھا اور اس کے برابر پسنجرز سیٹ پر صوفیہ براجمان تھی۔ حوالدار جمعہ خان نے مجھے ان دونوں کے حلیوں کے بارے میں بڑی وضاحت سے بتا دیا تھا لہٰذا انہیں پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

تھوڑی ہی دیر میں تھانہ، تانگا اسٹینڈ اور بس اسٹاپ کو ہم نے پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارا رخ جھنگ شہر کی جانب تھا۔ گل داد نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ خاکی جیپ ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی ہے۔''

''عملاً ایسا ہی نظر آتا ہے خان صاحب!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لیکن جو حقیقت ہے یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

گل داد عہدے میں مجھ سے کافی نیچے تھا لیکن وہ چونکہ ایس پی صاحب کے بہت قریب تھا لہٰذا میں اسے خاص عزت دے رہا تھا۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر یہ حقیقت ہے کہ محکمہ جاتی معاملات میں ان چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

''ملک صاحب! میرے پاس ایک میں آئیڈیا ہے۔'' گل داد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیسا آئیڈیا خان صاحب؟''

''کیوں نہ ہم ہی حکمتِ عملی پر آگے بڑھتے رہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم آگے آگے اور وہ لوگ پیچھے پیچھے۔ اس طرح ایک لمحے کے لیے بھی ان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

''آئیڈیا اچھا ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس پر عمل ایک گھنٹے سے پہلے نہیں ہو سکتا۔''

''وہ کیوں جناب؟'' گل داد ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ کام تو ہم اس وقت بھی جاری رکھے ہوئے ہیں پھر ایک گھنٹے کی شرط کیوں؟''

''یہ شرط اس لیے ہے کہ ایک گھنٹے بعد ہم جھنگ شہر کے اندر سے نکل کر لاہور جانے والی سڑک پر رواں دواں ہوں گے۔'' میں نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ بجھارتیں نہ ڈالیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں بیٹھی نہیں؟''

''میں بٹھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ہماری اطلاعات کے مطابق اس جیپ کو سیدھا لاہور جانا ہے لیکن یہ کسی حدیث کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ جھنگ شہر ہی میں کسی سڑک پر مڑ جائیں اگر ایسا ہوا تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس صورت میں لامحالہ ہمیں آناً فاناً میں گاڑی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روک کر اس کے پیچھے دوڑانا ہوگا جس میں یقیناً بے احتیاطی بھی ہوگی کیونکہ ہم اس جیپ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے۔ ہماری کوئی بھی اضطراری حرکت جیپ والوں کو شک و شبے میں ڈال سکتی ہے پھر ہمارے لیے ان کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہیں رہے گا لہٰذا...!''

میں ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا جب تک خا کی جیپ جھنگ شہر کی حدود سے نکل کر لاہور جانے والی سڑک پر رواں دواں نہیں ہو جاتی، ہمیں تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے جانا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے تعاقب کا احساس نہ ہو۔''

''آپ کی بات نہ صرف میرے دماغ میں بیٹھ گئی ہے بلکہ میں اس سلسلے میں آپ سے مکمل اتفاق بھی کرتا ہوں ملک صاحب!'' گل داد نے بڑی رسان سے کہا۔ ''یس جناب، میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی ہے۔''

ہمارے عقب میں آنے والی خا کی لینڈ روور ایک مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیلی فیاٹ کی اسپیڈ کم ہوئی تو وہ تیزی سے قریب آنے لگی پھر ایک لمحہ وہ بھی آیا جب وہ فیاٹ کو اوورٹیک کرتے ہوئے ہمارے پہلو سے گزر رہی تھی۔ اسی لمحے میں نے بڑی محتاط نظر سے جیپ کے اندر جھانکا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں مجھے چار دیہاتی بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ دہری خوشی سے گزر رہے تھے۔ ایک تو ملک سے باہر جا کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا خیال تھا اور دوسرے صوفیہ ایسی طرح دار حسینہ کی قربت کا تصور بھی انہیں نہال کر رہا تھا۔ وہ مہ جبیں، ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔ یہ تصور اور خیال ان کی خوشیوں کو دوبالا، سہ بالا اور... پتا نہیں، کون کون سا بالا کر رہا تھا۔

میں نے اسی ایک لمحے میں صوفیہ پر بھی بھرپور نگاہ ڈالی۔ جمعہ خان کی زبان سے میں نے اس کی جو تعریف سنی تھی وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میری نظر میں وہ حسن و جمال کا جیتا جاگتا شاہکار تھی۔ اگر بخت نگر کے جوان اس کے دیوانے ہو رہے تھے تو اس میں کچھ بھی اچنبھا نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی جو جوان تو جوان، بوڑھوں کو بھی ٹھنڈی آہیں بھرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ میرے خیال میں حاجی کے سیٹ اپ کا یہ آئٹم سب سے زیادہ مؤثر اور خوش نما تھا۔

میرے اور گل داد کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے جھنگ شہر میں سے گزر کر لاہور کی جانب بڑھنے لگیں۔ جب ہم نے جھنگ کی آبادی کو پیچھے چھوڑ دیا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''گل داد! خا کی جیپ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی اسپیڈ کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اب یہ لوگ لاہور پہنچ کر ہی دم لیں گے، آپ چاہو تو محتاط روی سے اپنی خواہش پوری... میرا مطلب ہے، اپنے آئیڈیا پر عمل کر سکتے ہیں۔''

''خواہش یا آئیڈیا... ایک ہی بات ہے ملک صاحب!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اور جہاں تک محتاط روی کا تعلق ہے، اس سلسلے میں آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔''

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا...!

جھنگ سے لاہور تک کا فاصلہ اس طرح طے ہوا کہ کبھی ہم خا کی جیپ کے تعاقب میں نظر آتے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ وہ لوگ ہمارا ''پیچھا'' کر رہے ہیں۔ خیریت کے ساتھ ہم لوگ آدھی رات کو لاہور پہنچ گئے۔ گل داد نے تعاقب میں احتیاط جاری رکھی اور نیلی فیاٹ، خا کی لینڈ روور کے پیچھے شادمان کالونی میں داخل ہو گئی پھر جب سکندر شاہ اینڈ کمپنی کی جیپ، نہر کے کنارے واقع ایک کوٹھی کے سامنے رکی تو ہمیں بھی محفوظ فاصلے پر اپنی کار کو روکنا پڑا۔

گل داد نے اندھیرے کی آڑ لے کر فیاٹ کو ایسے زاویے سے کھڑا کیا تھا کہ ہم تو بہ آسانی جیپ اور اس کوٹھی کو دیکھ سکتے تھے لیکن سکندر شاہ وغیرہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جیپ نے رکتے ہی مخصوص انداز میں تین مرتبہ ہارن بجایا تو میں چونک اٹھا۔ یہ کوٹھی کے اندر موجود افراد کو ایک طرح سے کوئی خاص اشارہ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھی کی باؤنڈری وال کی جانب میری نگاہ اٹھی تو میری حیرت گہری تشویش میں بدل گئی۔

کوٹھی کی گیٹ لائٹس آن تھیں اور وہاں سے پھوٹنے والی روشنی نے مذکورہ دیوار کے منظر کو بھی واضح کر رکھا تھا۔ میری تشویش کا باعث اس دیوار پر آویزاں وہ بورڈ تھا جس پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یہ الفاظ درج تھے۔

''نیو لائف میٹرنٹی ہوم... نئی زندگی، مرکز زچہ و بچہ۔''

میری طرح گل داد نے بھی اس بورڈ کی تحریر کو پڑھ لیا تھا۔ اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ''ملک صاحب! یہ جوان بیرونِ ملک جانے کے لیے یہاں پہنچے ہیں یا نئی زندگیوں کو جنم دینے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ابھی پتا چل جائے گا خان صاحب!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''مجھے تو کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔'' وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''جیپ والوں کا رویہ بھی عجیب سا ہے۔ جیپ میں سے کوئی باہر کیوں نہیں نکل رہا؟''

واقعی، جیپ تین بار مخصوص انداز میں ہارن بجانے کے بعد خاموش کھڑی تھی۔ نہ تو اس میں سے کوئی نیچے اترا تھا اور نہ ہی کوٹھی کے اندر سے کوئی باہر آیا تھا۔ ہارن کا سگنل تو یہی بتاتا تھا کہ کوٹھی میں ہی سے کوئی نمودار ہوگا۔'' میں نے گل دادکی وحشت کے جواب میں کہا۔

''خان صاحب! اگر گڑبڑ سنگین نوعیت کی نہ ہوتی تو ہمیں یوں آدھی رات کو جھنگ سے یہاں نہ آنا پڑتا۔ جہاں تک جیپ اور جیپ والوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مجھے دو سو فیصد یقین ہے کہ جیپ کے استقبال کے لیے کوٹھی کے اندر سے کوئی ضرور باہر آئے گا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر کوٹھی کا گیٹ کھلا۔ اگلے ہی لمحے دو ہٹے کٹے افراد باہر نکلے پھر بڑی فرمانبرداری سے جیپ کی سمت بڑھ گئے۔ وہ سکندر شاہ کی طرف پہنچے۔ اس سے کچھ بات کی۔ میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو تو نہیں سن سکتا تھا البتہ مجھ کو یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ سکندر شاہ سے کسی قسم کی ہدایات لے رہے ہوں گے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی۔

وہ دونوں ملازم صورت ہٹے کٹے شخص سکندر شاہ کے پاس سے ہٹے اور جیپ کے عقبی حصے والا دروازہ کھول لیا۔ اس کے بعد ہماری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین اور حیرت آفرین تھا۔ حاجی یا سکندر شاہ کی جانب سے کسی بھی شر کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن وہاں جو کچھ دیکھنے کو ملا، اس کی امید بہرحال مجھے بالکل نہیں تھی۔

ان دونوں صحت مند ملازموں نے ایک ایک نوجوان کو باری باری جیپ سے باہر نکال کر کوٹھی کے اندر پہنچانا شروع کردیا۔ جس طرح وہ جوانوں کو سنبھال کر اور سہارا دے کر چلا رہے... بلکہ گھسیٹ رہے تھے اس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جوان اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہیں۔ یقیناً جھنگ سے لاہور کی طرف آتے ہوئے کسی وقت انہیں بے ہوش کردیا گیا تھا۔ راستے بھر میری اس خاکی جیپ پر نظر رہی تھی۔ اس بات کا مجھے اندازہ تھا کہ راہ میں کہیں ان کے ساتھ یہ انتہائی قبیلی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ جھنگ سے روانہ ہوتے وقت انہیں کوئی ایسے شے کھلا دی گئی ہو جس کے مکمل اثرات چار پانچ گھنٹے بعد ظاہر ہوتے ہوں۔ سفر کے دوران میں ہماری نیلی فیاٹ نے تین چار مرتبہ خاکی جیپ کو اوورٹیک بھی کیا تھا لیکن میں ان لمحاتی اوقات میں جیپ کے پچھلے حصے میں جھانکنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اس کا سبب ایک تو رات کا وقت تھا اور دوسرے جیپ کے پچھلے حصے پر تاریکی کی حکمرانی نظر آئی تھی۔ اس وقت میں نے اس پُراسرار اندھیرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ یہی اطمینان تھا کہ وہ جیپ راستے میں کہیں رکی نہیں اور یہ کہ ہمارے مطلوبہ تمام افراد اس کے اندر موجود ہیں۔ اب اس تاریکی کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔ بہرحال اس طرح تو ہونا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

ایک ایک کرکے چاروں جوان کوٹھی کے اندر ''غائب'' ہوگئے تو گل داد کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''ملک صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے جناب؟''

''بھئی، کیا ہو رہا ہے...'' میں نے کوٹھی کے گیٹ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''خان صاحب! آپ ماشاءاللہ! سمجھدار آدمی ہیں۔ یہ بات تو آپ کو اچھی طرح پتا ہوگی کہ جب کسی کو سہارا دے کر میٹرنٹی ہوم میں لایا جاتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ یا تو کاکا... یا پھر کاکی!''

''ملک صاحب! ایسی سنگین صورت حال میں آپ کو مذاق کی سوجھ رہی ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ جس ''کسی'' کی بات کر رہے ہیں نا، وہ کوئی عورت ہوتی ہے... حاملہ عورت جس کی زچگی سر پر آجاتی ہے اور... یہ تو چاروں گبرو جوان ہیں۔ آپ ان سے ویسے نتائج کی امید تو نہ رکھیں جناب!''

اس لمحے خاکی جیپ حرکت میں آگئی۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ پیچھے مڑنے کے بجائے آگے کی جانب بڑھی تھی اگر وہ واپسی کی راہ اختیار کرتی تو اس بات کے قوی امکانات تھے کہ ہماری نیلی فیاٹ ان کی نگاہ میں آجاتی اور اگر جھنگ سے لاہور تک راستے میں سکندر شاہ نے کسی حوالے سے ہماری گاڑی کو کوئی اہمیت دی تھی تو اس مرحلے پر ہمارے لیے بڑی مشکل ہوجاتی۔ بہرحال، اللہ جو بھی کرتا ہے اس میں اس کی کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مصلحت انسان کی سمجھ میں بھی آجائے، قطعی ضروری نہیں... جبھی بڑے بزرگ اور جہاں دیدہ و تجربہ کار لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہیے!''

میرے اشارے پر گل داد نے بہ احتیاط نیلی فیاٹ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاکی لینڈ روور کے پیچھے ڈالا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ ''میٹرنٹی ہوم'' والی بات تو میں نے واقعی مذاقاً کہی تھی۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ سکندر شاہ اور صوفیہ کے مشن کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

''دیکھتے ہیں جناب...!'' گل داد نے مبہم سے لہجے میں کہا۔

جب ہماری گاڑی میٹرنٹی ہوم والی کوٹھی کے سامنے سے گزری تو میں نے کوٹھی کے گیٹ کے پہلو میں لگی نیم پلیٹ کو بہ غور دیکھا۔ اس تختی پر لکھا تھا۔ ''صمد ہارون، سی۔ ایون، شادمان کالونی۔'' میں نے اس ایڈریس کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرلیا۔

اس مرتبہ لینڈ روور نے ہمیں زیادہ زحمت نہیں دی اور ایک دو سڑکوں پر گھومنے کے بعد وہ کینال پارک کی طرف آ گئی پھر ہم نے اسے کینال پارک کی ایک کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہم محدود اور محتاط فاصلہ رکھ کر جیپ کا تعاقب کررہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کینال پارک والی متذکرہ کوٹھی کا گیٹ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا جیسے اس کوٹھی کے مکینوں کو پیشگی یہ اطلاع دے دی گئی ہو کہ چند لمحات میں صوفیہ اور سکندر شاہ وہاں پہنچنے والے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ اطلاع نیو لائف میٹرنٹی ہوم والوں نے یہاں پہنچائی ہو، ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعے۔ بہرحال جیسے ہی خاکی جیپ اس کوٹھی میں داخل ہوئی، ایک شخص نے گیٹ بند کردیا۔ وہ شخص اس کوٹھی کا چوکیدار بھی ہوسکتا تھا اور کوئی ادنیٰ سا ملازم بھی۔

ہم لگ بھگ دس منٹ تک وہیں کھڑے یہ انتظار کرتے رہے کہ شاید اس کوٹھی سے کوئی برآمد ہو لیکن ایسا نہیں ہوا جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ صوفیہ اور سکندر شاہ رات کا باقی حصہ اس کوٹھی میں گزاریں گے۔

گل داد نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اب کیا پروگرام ہے؟''

''آپ اس کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے گاڑی کو آگے لے چلیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔ صوفیہ اور سکندر شاہ تو صبح تک کوٹھی سے باہر نہیں نکلیں گے اور ادھر میٹرنٹی ہوم میں ''داخل'' ہونے والے چار جوانوں کو بھی صبح سے پہلے باہر لائے جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔''

گل داد نے میری ہدایت کی تکمیل کردی۔ کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں نصب نیم پلیٹ کے مندرجات کو ذہن نشین کرلیا۔ نیم پلیٹ پر کچھ یوں تحریر تھا۔ ''چیمہ ہاؤس... چوبیس۔ جی کینال پارک۔''

چیمہ ہاؤس، صمد ہارون، نئی زندگی مرکز زچہ و بچہ کا بہ ظاہر حاجی برکت علی رحمت علی، صوفیہ، سکندر شاہ اور ریکروٹنگ بزنس سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ حاجی نے اپنا اور اپنے متعلقین کا درست نام بتایا ہو۔ ہوسکتا ہے، ناموں کے بارے میں حاجی نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ یہ نکتہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

گل داد مختلف سڑکوں پر سے گھومتے ہوئے نیلی فیاٹ کو نہر کے قریب لے آیا اور ایک درخت کے نیچے روک دیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہم جس سڑک پر کھڑے تھے وہاں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ گل داد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! اب بتائیں، کیا کرنا ہے؟''

''ہوں...!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

اس وقت میرا ذہن گہری سوچ بچار میں مصروف تھا اور میری یہ خاموشی گل داد کی بے تابی میں گراں قدر اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! آثار سے تو یہی نظر آرہا ہے کہ دونوں کوٹھیوں میں جانے والے اب صبح سے پہلے باہر قدم نہیں نکالیں گے لہٰذا ہمیں چاچا کے گھر جا کر سو جانا چاہیے جو بھی ہوگا، صبح دیکھا جائے گا۔''

''لیکن میں صبح کا انتظار نہیں کرسکتا گل داد خان!'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

گل داد کے چاچا شکور حسین کا گھر لاہور کے ایک معروف ''اچھرہ'' میں تھا۔ گوندل صاحب نے بھی مجھے یہی صلاح دی تھی کہ بہ وقتِ ضرورت میں شکور حسین کے گھر پر قیام کرسکتا ہوں لیکن تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں کے جو حالات دیکھے تھے ان کی روشنی میں کسی قیام یا طعام کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ یہ بہت ہی غیر یقینی اور انتہائی نازک صورتِ حال تھی۔ عارف، حامد، مشتاق اور فرقان کو جس حالت میں شادمان والی کوٹھی کے اندر لے جایا گیا تھا وہ انتہائی تشویشناک تھا۔ ظاہر ہے، ان سے پہلے یہاں پہنچنے والے رفیق، اشرف اور جاوید کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہوگا۔ وہ لوگ بھی نصف شب ہی کو لاہور پہنچے ہوں گے اگر حاجی اینڈ کمپنی واقعی بردہ فروشی ایسے مذموم کاروبار میں ملوث تھی تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ ان ''بردوں'' کو اسی ''نئی زندگی مرکز زچہ و بچہ'' سے کہیں آگے ''بھیجا'' جاتا ہوگا۔ ایک معزز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیشے کی آڑ میں کیسا گھناؤنا کھیل، کھیلا جارہا تھا...!

گل داد میری بات سن کر چونکا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''گویا...تو آپ رات ہی رات میں کوئی کارروائی ڈالنا چاہتے ہیں؟''

''تمہارے صاحب کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے پہلے ہی مجھ پر واضح کردیا تھا کہ یہاں آکر مجھے کسی قسم کی کوئی کارکردگی دکھانے کی ضرورت نہیں بلکہ جو بھی صورتِ حال ہو، اس کے بارے میں، میں انہیں آگاہ کروں۔ وہ اس سلسلے میں جو مناسب سمجھیں گے، وہی قدم اٹھائیں گے اور...وہ بالکل صحیح سوچ رہے ہیں۔ وہ میرے افسر ہیں۔ میں اپنے تھانے کی حدود سے باہر کسی نوعیت کی کارروائی کا مجاز نہیں ہوں اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔''

''پھر...پھر...!'' وہ متذبذب آواز میں بولا۔ ''آپ کوئی کارروائی بھی نہیں کرنا چاہتے اور صبح کا انتظار کرنے کا بھی ارادہ نہیں...پھر کیا سوچا آپ نے؟''

''فوری واپسی...!'' میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

''یعنی ہم واپس جھنگ جائیں گے۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ابھی اور اسی وقت؟''

''بالکل، میرا یہی مطلب ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اگر آپ گاڑی کو دوڑانا جانتے ہیں تو انشاء اللہ! سورج طلوع ہونے سے پہلے ہم ایس پی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ میں یہاں کی گڑبڑ صورتِ حال فوری طور پر گوندل صاحب کے علم میں لانا چاہتا ہوں تاکہ جب تک چیمہ ہاؤس اور نئی زندگی مرکز زچہ و بچہ کے مکین بیدار ہوں، گوندل صاحب لاہور پولیس سے رابطہ کرکے کوئی تسلی بخش کارروائی ڈالنے کا بندوبست کردیں۔ آپ میری بات تو سمجھ ہی گئے ہوں گے خان صاحب؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی سرعت سے نیلی فیاٹ کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''گاڑی کو تو صرف ''ایڑ'' لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ خود بہ خود دوڑنا شروع کردے گی۔ جلد از جلد صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

اگلے ہی لمحے نیلی فیاٹ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم کینال پارک، شادمان کالونی، جیل روڈ اور فیروز پور روڈ سے گزر کر شہر سے باہر جانے والے راستے کو ناپنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم دریائے راوی کا پل عبور کررہے تھے۔

میں نے گل داد سے استفسار کیا۔ ''خان صاحب! گاڑی میں فیول کی کیا پوزیشن ہے۔ یہاں شاہ درہ ٹاؤن کے قریب ہی ایک پیٹرول پمپ ہے اگر کوئی کمی بیشی ہو تو پوری کرلیں، واپسی کے راستے میں کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہونا چاہیے۔''

اس نے تسلی بخش لہجے میں جواب دیا۔ ''ملک صاحب! گاڑی کی ٹینکی میں اتنا پیٹرول ہے کہ ہم بہ آسانی جھنگ پہنچ سکتے ہیں لیکن آپ کے اطمینان کے لیے میں پھر بھی اس پیٹرول پمپ سے ٹینکی فل کروالیتا ہوں۔''

''عقلمندی کا تقاضا یہی ہے گل داد؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''موت، گاہک اور مصیبت دستک دے کر نہیں آتی۔ یہ انسان کی بے خبری میں شب خون مار کر اس کے اندازوں کی ایسی کم تیسی کردیتی ہیں اس لیے کسی بھی مشن کے دوران ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

ہم نے مذکورہ فلنگ اسٹیشن سے گاڑی میں پیٹرول بھروایا اور نیلی فیاٹ ویران، سنسان سڑک پر تارکول اور سناٹے کو چیرتے ہوئے جھنگ کی سمت فراٹے بھرنے لگی۔

واپسی کی راہ میں، ہمارے درمیان زیادہ تر گمبھیر خاموشی ہی حائل رہی اور اگر کوئی بات ہوئی بھی تو موضوع ''نیو لائف میٹرنٹی ہوم'' اور وہاں پہنچائے جانے والے بخت نگر کے بدبخت چار جوانوں تک ہی محدود رہا۔ نیلی فیاٹ گویا جیٹ طیارہ بن گئی تھی!

جب ہم نے جھنگ کی حدود کو چھوا تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

ایس پی علی نواز گوندل صاحب کو میں نے سوتے سے جگوایا تو انہیں صورتِ حال کی سنگینی کا فوراً احساس ہوگیا۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ وہ مجھے سننے کے لیے بے چین نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنی کارکردگی پوری تفصیل کے ساتھ ان کے گوش گزار کردی۔ ان کے چہرے اور آنکھوں میں تشویش کے سائے لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے میری باتوں کو پوری توجہ اور گہری سنجیدگی سے سنا۔ میں نے انہیں لاہور میں واقع دونوں مشکوک کوٹھیوں کی ساخت، رنگ اور ایڈریس سے آگاہ کیا۔ کینال پارک والے چیمہ ہاؤس اور شادمان والے نیو لائف میٹرنٹی ہوم کا ایڈریس انہوں نے نوٹ کرلیا۔ میں خاموش ہوا تو انہوں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گمبھیر لہجے میں کہا۔

''صفدر حیات! تم نے اپنے فرائض سے بڑھ کر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔ سمجھو کہ میں ابھی سے حرکت میں آ گیا ہوں۔ میں پہلی فرصت میں اپنے آفیسرز سے رابطہ کر کے انہیں تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں اور... وہ بھی پورے پس منظر کے ساتھ۔''

''سر! سی۔ الیون شادمان کالونی کی کوٹھی میں جو چار جوان پہنچائے گئے ہیں ان کی حالت تشویشناک ہے۔ کہیں ان کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے...!''

میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''صفدر حیات! تمہیں ان چار افراد کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کی حفاظت اور سلامتی اب میری ذمے داری ہے۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سر! ان چار نوجوانوں سے پہلے بھی حاجی بخت نگر کے تین لڑکوں کو لاہور روانہ کر چکا ہے جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا...''

''ان کو بھی دیکھ لیں گے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے تسلی آمیز لہجے میں بولے۔ ''تم یہ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر اپنے اطمینان کے لیے پوچھ لیا۔ ''سر! پچھلی ملاقات میں ہمارے درمیان پردہ فروشی کے مذموم کاروبار پر خاصی تفصیلی بات ہوئی تھی، کہیں یہ اسی سلسلے کی کڑی تو نہیں؟''

''زیادہ امکان تو اسی بات کا نظر آ رہا ہے صفدر حیات!'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''صحیح صورتِ حال کا اندازہ، لاہور پولیس کی تفتیش کے بعد ہی ہوگا۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے سر!'' میں نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

''تم فوراً اپنے تھانے میں پہنچو۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ''گل داد تمہیں گاڑی میں تھانے تک پہنچا دے گا۔'' حاجی لمبے چوڑے نام'' پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں حاجی کا پولیس کی دسترس میں رہنا بہت ضروری ہے اور میں تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ حاجی کو کہیں اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہیے۔ انشاء اللہ! آج شام تک لاہور کی صورتِ حال بھی واضح ہو جائے گی۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئے، ایک گہری سانس خارج کی اور میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولے۔

''صفدر حیات! میں جانتا ہوں، تم نے ساری رات بے آرامی میں جاگ کر گزاری ہے، تھکن اور نیند میں اس وقت تمہارا برا حال ہوگا لیکن فرائض کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں تھوڑی تکلیف اور اٹھانا ہوگی۔''

''آپ حکم کریں سر!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں فرض کی راہ میں ہر تکلیف، ہر پریشانی جھیلنے کو تیار ہوں۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولے۔ ''صرف اتنا کرو کہ آج کے دن آرام اور نیند کا بائیکاٹ کر دو، شام تک تمہیں چاق و چوبند رہنا ہے۔''

''او کے سر... میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں۔''

''ٹھیک ہے، اب تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ گل داد تمہیں تھانے پہنچا دے گا۔'' میں نے ایس پی صاحب کو سلیوٹ کیا اور نیلی فیاٹ میں بیٹھ کر اپنے تھانے، واقع نور کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

جمعہ خان کو امید نہیں تھی کہ میں اتنی جلد لاہور سے واپس لوٹ آؤں گا۔ میں نے تھانے میں قدم رکھتے ہی اس سے کہا۔ ''جمعہ خان! جلدی سے ناشتے پانی کا بندوبست کرو۔ ہمیں ابھی ایک اور مشن کے لیے نکلنا ہے۔''

کل شام نور کوٹ سے روانہ ہوتے وقت میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تھا۔ جب سے اب تک کھانے کے نام پر کچھ بھی پیٹ کے اندر نہیں اترا تھا۔ گزشتہ رات اتنی سنسنی خیز اور تشویش ناک تھی کہ کہیں رک کر کچھ کھانے پینے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ حوالدار نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا۔ وہاں لاہور میں کیا حالات ہیں اور... ابھی ہمیں کس مشن کے لیے نکلنا ہے؟''

''جمعہ خان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لاہور کے حالات اور وہاں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں، میں تمہیں راستے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال، تم پیٹ پوجا کا انتظام کرو تاکہ پوری توانائی کے ساتھ بخت نگر کا رخ کیا جا سکے۔''

''بخت نگر...!'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مگر کس سلسلے میں؟''

''حاجی ایرا وغیرہ کی گرفتاری کے سلسلے میں۔''

''اوہ...!'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے اسے مزید کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں دیا اور کھڑے کھڑے ناشتا لینے بھیج دیا۔ اس کام میں اس نے بھی کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ ناشتے کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ تھانے کے قریب ہی بس اسٹاپ واقع تھا جہاں کھانے وغیرہ کے بھی دو تین چھوٹے ہوٹل تھے لہٰذا جمعہ خان کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کچھ دیر کے بعد میں اور حوالدار جمعہ خان ایک تانگے پر سوار ہو کر بخت نگر کی طرف جا رہے تھے۔ بس اسٹاپ کے سامنے ہی نیم پختہ سڑک کی دوسری جانب تانگا اسٹینڈ تھا۔ حوالدار ناشتے کے ساتھ ہی ایک تانگا بھی پکڑ لایا تھا۔

نور کوٹ سے بخت نگر پہنچنے کے دوران میں، میں نے حوالدار کو ان تمام حالات سے آگاہ کر دیا جنہوں نے اس کے رگ و پے کو ایک سنسنی خیز تجسس میں جکڑ رکھا تھا۔ میری طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ حاجی کو فوراً گرفتار کر لینا چاہیے۔ لاہور پولیس اپنی تحقیق اور تفتیش سے جو بھی نتیجہ اخذ کرے گی اس کی روشنی میں حاجی کی گرفتاری عمل میں لانا ضروری ہو جائے گی۔ جمعہ خان کا دھیان بھی میری طرح بردہ فروشی کی طرف جا رہا تھا اور یہ گھناؤنا کاروبار ایک معزز پیشے کی آڑ میں ہو رہا تھا۔ میں نے اس میٹرنٹی ہوم والی کوٹھی کی نیم پلیٹ پر ''صمد ہارون'' کا نام لکھا دیکھا تھا۔ وہ میٹرنٹی ہوم اگر واقعی کسی صمد ہارون کا تھا تو پھر اس کا صاف صاف یہی مطلب تھا کہ وہ بھی حاجی اینڈ کمپنی کے دھندے کا ایک حصہ تھا۔ بہرحال اب وہ وقت دور نہیں تھا جب حاجی برکت علی رحمت علی کی اصلیت کھل کر سامنے آ جاتی اور میں ان انکشاف انگیز لمحات کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

بخت نگر میں جمعہ خان کی سسرال تھی اور وہ یہاں کی ایک ایک گلی سے ایسے ہی واقف تھا جیسے انسان اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے آشنا ہوتا ہے۔ ہمارا تانگا بخت نگر کی حدود میں داخل ہوا تو جمعہ خان نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! اب کیا حکم ہے؟''

وہ تانگے کی اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ میں عقبی سیٹ پر موجود تھا۔ وہ چونکہ کوچوان کو گائیڈ کر رہا تھا لہٰذا اس کے استفسار کا مطلب یہی تھا کہ تانگا کہاں رکوایا جائے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ دن کے گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے تھے لیکن تپش ایسی تھی کہ گویا سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جمعہ خان! امتیاز جٹ نے اپنا جو مکان کرائے پر دے رکھا ہے کیا وہاں تک تانگا لے جانا ممکن ہے؟''

''بالکل، ممکن ہے جناب۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''امتیاز جٹ کے مکان کے دروازے تک تانگا جا سکتا ہے۔''

''اور تمہارے خیال میں امتیاز جٹ کا کرائے دار اس وقت گھر کے اندر موجود ہو گا؟''

''مجھے یقین ہے، وہ ہمیں گھر ہی میں ملے گا۔'' جمعہ خان نے پُروثوق لہجے میں کہا۔ ''ظہر کی نماز کے لیے وہ لگ بھگ ایک بجے مسجد کی طرف جاتا ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم سیدھے اسی کے پاس جا رہے ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہمارا تانگا حاجی برکت علی رحمت علی کی رہائش گاہ کے سامنے جا کر رکا۔ ہم دونوں تانگے سے نیچے اتر آئے۔ حوالدار جمعہ خان اس وقت یونیفارم میں تھا جبکہ میں نے عوامی لباس پہنا ہوا تھا۔ جمعہ خان نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ میں اس سے چند قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا اور کھلے ہوئے دروازے میں حاجی سیاہ کرتوت کا مکروہ چہرہ نمودار ہوا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ جمعہ خان کی زبان سے نکلنے والے جملے نے مجھے بتا دیا کہ وہ حاجی برکت علی رحمت علی ہی ہے۔

''السلام علیکم حاجی صاحب!'' حوالدار نے بڑی عقیدت مندی سے کہا۔

حاجی نے اس کے سلام کا جواب دینے سے پہلے تنقیدی نظر سے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور پھر جمعہ خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام... حوالدار جی، خیریت تو ہے؟''

''حاجی صاحب! میں خادم حسین کا ایک مسئلہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔'' جمعہ خان نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کہا۔ یہ ساری پلاننگ ناشتے کے دوران ہی ہم نے تیار کر لی تھی۔ جمعہ خان جو بھی کر رہا تھا اس میں میری تائید شامل تھی۔

حاجی نے ایک مرتبہ پھر جائزہ نگاہ سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''خادم حسین اسی بندے کا نام ہے نا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی... جی ہاں۔'' حوالدار نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''آپ لوگ اندر آجائیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے مڑ گیا۔

ہم گھر کے اندر داخل ہوگئے۔ حوالدار کی زبانی مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امتیاز جٹ کا وہ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے عقبی حصے میں بنے ہوئے تھے اور ایک آگے جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ حاجی ہمیں اسی بیٹھک نما کمرے میں لے آیا۔ یہ اچھی بات تھی کہ وہ مجھے تھانہ انچارج کی حیثیت سے پہچان نہیں سکا تھا ورنہ وہ فوراً بدک جاتا اور ہمیں اتنی آسانی سے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا۔

حاجی کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے قریب لگایا۔ وہ صحت مندی کے مرجھ پیمانوں سے کہیں بڑھ کر صحت مند اور توانا تھا۔ اس کے لیے ہٹا کٹا کے الفاظ بھی بے وزن محسوس ہوتے تھے۔ اس کی توند کسی مٹکے کے مانند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ رنگت گہری سانولی اور خود کو معزز اور نیک ظاہر کرنے کے لیے اس نے خاصی نگڑی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر متاثر کن نہیں بلکہ بیزار کن تھا۔ وہ اپنی چکنی چپڑی اور منافقانہ باتوں سے بخت نگر کے سادہ مزاج افراد کو بہ آسانی بے وقوف بنا رہا تھا۔

ہم بیٹھ چکے تو حاجی نے خاصی کراری آواز میں کہا۔ اس کا مخاطب جمعہ خان تھا۔ ''حوالدار جی! وہ آپ کا سالا شمشاد احمد کئی مرتبہ میرے پاس آچکا ہے۔ وہ بہ ضد ہے کہ میں اسے کام کاج کے لیے سعودی عرب بھیج دوں لیکن وہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا، مجھے یقین ہے صوفیہ اسے دیکھتے ہی بغیر انٹرویو لیے فیل کردے گی۔ ادھر سعودیہ میں محنت مزدوری آسان کام نہیں۔ صرف جوان خون ہی اس مشقت کا سامنا اور مقابلہ کرسکتا ہے۔ شمشاد کی عمر چالیس سے آگے بڑھ چکی ہے اور وہ فیملی والا بھی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''حوالدار جی! آپ خاصے سمجھدار ہو۔ اپنے سالے کو بھی تھوڑی عقل دے دیں۔''

''ٹھیک ہے حاجی صاحب!'' حوالدار نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں شمشاد کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

میں حاجی کے فلسفے تک آسانی سے پہنچ گیا۔ یقیناً جوان اور صحت مند بردوں کی اچھی قیمت ملتی ہوگی اور ادھیڑ عمر کو اونے پونے داموں خریدا جاتا ہوگا۔

حاجی نے ایک مرتبہ پھر قصاب کی نظر سے میرے بدن کا جائزہ لیا اور جمعہ خان سے کہا۔ ''حوالدار جی! یہ خادم حسین بھی عرب ممالک کی گرمی اور مشقت کے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔ میرا خیال ہے، تمہیں شمشاد کے ساتھ اسے بھی سمجھانا ہوگا۔''

''نہیں حاجی صاحب! یہ دوسرا کیس ہے...'' جمعہ خان نے جلدی سے کہا۔

''دوسرا کیس...'' حاجی چونکا۔ ''کیا مطلب حوالدار جی؟''

''حاجی صاحب! یہ خادم حسین آپ کو اپنے ساتھ نور کوٹ لے جانے آیا ہے۔'' جمعہ خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ادھر اس کے گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ رکھی ہوئی چیزیں خود بہ خود اپنی جگہ سے غائب ہونے لگتی ہیں۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ اللہ والے اور ایک نیک انسان ہیں۔ اس کے گھر پر کوئی دم وغیرہ پھونک دیں گے تو یہ پُراسرار مسئلہ حل ہوجائے گا۔ دراصل خادم حسین میرا گہرا دوست ہے۔ کہنے لگا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور آپ سے سفارش بھی کردوں، سو میں چلا آیا۔''

''اچھا، اچھا یہ بات ہے۔'' حاجی گردن کو اثباتی جنبش دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

کوشش ان معنوں میں کہ گردن اس کا ''کہنا'' ماننے کو پوری طرح تیار نہیں تھی۔ وہ اس قدر چربیلی ہو چکی تھی کہ اگر حاجی کو گردن کی آنکھ سے دیکھا جاتا تو وہ کسی مرکھنے بیل یا سرکاری سانڈ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔

حوالدار نے لوہا گرم دیکھا تو ایک اور چوٹ لگا دی۔ ''حاجی صاحب!'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کی شہرت بخت نگر سے نکل کر خوشبو کی طرح ادھر ہمارے علاقے نور کوٹ بھی پہنچ چکی ہے اور درجنوں جوان بیرونِ ملک جانے کے لیے پرتول رہے ہیں۔ قصبہ نور کوٹ، بخت نگر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ خادم حسین کا گھر دیکھنے کے بہانے اس علاقے کا سروے بھی کرلیں جناب۔ میرا خیال ہے، آپ کی مصروفیت کے لیے وہاں اچھا خاصا کام نکل آئے گا۔''

یہ تجویز نما مشورہ حاجی کے دل کو لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھرتے دیکھی۔ وہ قدرے خوش گوار لہجے میں بولا۔

''حوالدار جی! ہم آپ کی سفارش کو کیسے رد کرسکتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔"

"جناب! تانگا ہم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔" جمعہ خان نے کہا۔ "آپ جتنی جلدی جائیں گے اتنی ہی جلدی واپس بھی آجائیں گے۔ یہی تانگا آپ کو چھوڑنے بھی آئے گا۔"

وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔

میں اگر چاہتا تو بخت نگر پہنچتے ہی آناً فاناً میں حاجی برکت علی رحمت علی کو گرفتار کرلیتا۔ کوئی اس کام سے مجھے روک نہیں سکتا تھا لیکن میں اس عیار اور مکار بلکہ شیطان صفت شخص سے بڑا سنگین مذاق کرنا چاہتا تھا۔ وہ خوشی خوشی نور کوٹ کے گبرو جوانوں کو دیکھنے جارہا تھا تاکہ ان کی بردہ فروشی سے اپنی آمدنی کا تخمینہ لگا سکے اور جب میں اچانک اسے حوالات میں دھکیل کر دروازے پر آہنی تالا ڈلوا دیتا تو اس پر حیرت، غصے، بے عزتی اور توہین کے غیر متوقع پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ ان لمحات میں ان کی ذہنی، قلبی اور جسمانی کیفیت کا نظارہ بڑا عبرت ناک اور محظوظ کن ہوتا۔ اس نے معصوم اور سادہ لوح افراد کو اپنے مکروہ ڈرامے کے بے بس اور لاچار کردار بنا رکھے تھے لہٰذا اس پر لازم تھا کہ مکافاتِ عمل کے تحت وہ میرے لکھے ہوئے ڈرامے میں بھی کام کرتا... عین اس اسکرپٹ کے مطابق جو میرے ذہن نے اس کے لیے تخلیق کیا تھا۔ میں اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جب حاجی پر یہ خبر آسمانی بجلی کی طرح گرتی کہ اسے بڑی خوبصورتی سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ وہ جوانوں کو بردے بنا تا آیا تھا میں اسے حوالاتی بنا کر اگلی پچھلی ساری کسر نکال دیتا...!

ہم بہ خیر و عافیت بخت نگر سے نور کوٹ پہنچ گئے۔ جب تانگا تھانے کے سامنے پہنچا تو جمعہ خان نے بڑی بے تکلفی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خادم حسین! تمہارے گھر کی طرف تو بعد میں جائیں گے۔ میں ذرا تھانے سے ہولوں۔ اہلکاروں کو ضروری ہدایات دینا ہیں۔ آج انچارج صاحب بھی تھانے میں موجود نہیں ہیں۔ وہ کل رات سے ٹوبہ ٹیک سنگھ گئے ہوئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں یہاں کے سارے معاملات مجھے ہی دیکھنا پڑ رہے ہیں۔"

"تو کیا ہم ادھر تانگے ہی میں بیٹھیں؟" میں نے جمعہ خان سے پوچھا۔

"تانگا کہیں بھاگا نہیں جارہا یار... جو تم اسے پکڑ کر بیٹھے رہو گے؟" جمعہ خان نے سرسری لہجے میں کہا۔ "تم لوگ بھی تھانے میں ہی آجاؤ۔ بس دس پندرہ منٹ کا کام ہے پھر چلتے ہیں۔"

میں، حاجی اور جمعہ خان پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے تھانے کے اندر پہنچ گئے۔ حوالدار نے ہتھکڑی اٹھائی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "خادم حسین آؤ تمہیں دکھاؤں کسی شخص کو کیسے گرفتار کیا جاتا ہے۔"

"ہاں یار، میری بڑی خواہش ہے یہ منظر دیکھنے کی۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "لیکن تم کس کو گرفتار کرنا چاہتے ہو؟"

"اس وقت کمرے میں ہم صرف تین افراد ہیں۔" حوالدار گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تھانے کا دیگر عملہ اپنے کاموں میں مصروف ہے۔ میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ آپس میں فیصلہ کرلو کہ کس نے گرفتاری دینا ہے...؟"

حاجی کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ اس تغیر میں غصے کی سرخی نمایاں تھی۔ اس منظر نے مجھے بڑا لطف دیا۔ میں نے خوفزدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"یار... مذاق نہ کرو۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ گرفتاری کیوں دوں؟"

"اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر...؟" اس نے ڈرامائی توقف کر کے حاجی کی طرف دیکھا۔

حاجی بپھر کر بولا۔ "حوالدار... یہ کیا بکواس ہے؟"

"حاجی صاحب! یہ کوئی بکواس نہیں۔" جمعہ خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تو انچارج صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔"

"انچارج صاحب..." حاجی صاحب نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا۔ "مگر تم نے تھوڑی دیر پہلے تو بتایا تھا، تھانہ انچارج ٹوبہ ٹیک سنگھ گئے ہوئے ہیں۔"

"ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔" جمعہ خان نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "مگر میں ان کو واپس آنے سے تو نہیں روک سکتا نا۔ وہ آگئے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں...!"

"تھانے دار ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واپس آگیا ہے؟" حاجی الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "مگر وہ کہاں ہے...؟"

"یہ..." جمعہ خان نے میری سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ کھڑے ہیں، ملک صفدر حیات، تھانہ انچارج نور کوٹ...!"

"مگر یہ تو خادم حسین...؟"

حاجی کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ میں نے ایک زناٹے دار طمانچہ اس کے گال پر رسید کردیا پھر تحکمانہ انداز میں حوالدار سے کہا۔

"جمعہ خان... اس... حاجی کو فوراً حوالات...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب تک حاجی اس تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھ پاتا، حوالدار نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں آہنی زیور پہنا دیا پھر میری ہدایت پر بے دریغ دھکے دیتے ہوئے اسے حوالات کے اندر پہنچا دیا۔

حاجی برکت علی رحمت علی کی حالت دیدنی تھی۔ جب اسے حوالات کے فرش پر پھینک کر دروازے کو لاک اپ کر دیا گیا تو وہ مجھے بڑی بڑی دھمکیاں دینے لگا۔ مجھے خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے اس کی پھوں پھاں کی ذرا پروا نہیں کی اور نہایت ہی کڑوے لہجے میں کہا۔

''حاجی! صرف ایک دن کی بات ہے پھر سکندر شاہ، صوفیہ، صمد ہارون، چیمہ صاحب اور نئی زندگی میٹرنٹی ہوم کا سارا عملہ کسی نہ کسی تھانے کی حوالات میں تمہاری طرح پڑا دکھائی دے گا۔''

''کک... کیا مطلب...؟'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔

میرے خوفناک انکشافات نے اس کے چہرے کی سانولی رنگت میں بڑی فراخ دلی سے سیاہی بھر دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت اور وحشت کے سائے ہم آغوش ہو کر بڑے بھیانک اور سنسنی خیز مناظر تخلیق کرنے لگے تھے۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تھوڑا صبر حاجی... میری کہی ہوئی ہر بات کا مطلب اور مفہوم بہت جلد تمہاری سمجھ دانی میں قیام پذیر ہو جائے گا۔''

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں انسانی روپ میں موت ہوں!

☆☆☆

پچھلی رات ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ لگانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ناشتے کے بعد میں خاصی سستی محسوس کرنے لگا تھا اور دوپہر کے کھانے نے تو مجھے بالکل ہی نڈھال کر دیا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہ کھانا حاجی گڑبڑ کی کامیاب گرفتاری کے بعد کھایا تھا۔ بڑی شدت سے یہ دل چاہ رہا تھا کہ کہیں بھی پڑ کر میں ایسا بے خبر سوؤں کہ پھر اگلے ہی دن کی خبر لاؤں...!

لیکن ایس پی صاحب کا حکم تھا کہ آج کا دن مجھے ہر صورت جاگ کر گزارنا ہے۔ ان کی طرف سے کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے لہٰذا میں خود پر جبر کر کے مسلسل جاگ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک ایسی اطلاع مجھ تک پہنچی کہ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ پلک جھپکتے میں میری نیند کافور ہو گئی۔

کانسٹیبل عبدالغفور نے میرے کمرے میں آ کر بتایا۔

''ملک صاحب! ایس پی صاحب آئے ہیں۔''

''کیا...؟'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں تو گوندل صاحب کی طرف سے بلاوے کا منتظر تھا اور وہ خود ہی میرے پاس چلے آئے تھے۔ میں نے تصدیقی لہجے میں کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''غور سے کیا تم نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا محض نیلی گاڑی دیکھ کر...'' میرا خیال یہی تھا کہ گل داد نیلی فیاٹ میں آیا ہوگا۔

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ اسی لمحے مجھے گوندل صاحب اپنی جانب بڑھتے ہوئے نظر آ گئے تھے۔ میں کھڑا تو تھا ہی... آگے بڑھ کر میں نے انہیں ایک زوردار سلیوٹ کیا اور اپنی کرسی ان کے لیے چھوڑ دی۔

انہوں نے میرے سلیوٹ کا جواب سر کی اثباتی جنبش سے دیا اور کہا۔ ''صفدر حیات! تم اپنی کرسی میرے لیے نہیں چھوڑو۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ تمہاری کرسی کسی سینئر سب انسپکٹر یا انسپکٹر کے حصے میں آئے کیونکہ تمہیں تو اس کرسی سے اٹھنے کے بعد کسی ڈی ایس پی کی کرسی پر بیٹھنا چاہیے۔''

''سر...!'' میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ...''

''بیٹھ جاؤ صفدر حیات!'' انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میری میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

مجبوراً مجھے بھی اپنی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ گوندل صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''صفدر حیات! حاجی برکت علی رحمت علی کو فوری طور پر گرفتار کرنا ہوگا۔''

''سر! سمجھیں، یہ کام ہو گیا۔'' میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

''صرف سمجھنے سے بات نہیں بنے گی صفدر حیات!'' وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''اس کی عملی گرفتاری ضروری ہے۔ کل صبح لاہور سے پولیس کی ایک گاڑی گرفتار شدہ حاجی کو لینے یہاں پہنچے گی۔ تمہیں یہ کام ابھی اور اسی وقت کرنا ہے۔''

میں زیرِ لب مسکرایا اور فخریہ لہجے میں کہا۔ ''سر! میں نے آپ سے غلط نہیں کہا۔ حاجی برکت علی رحمت علی کو آپ پولیس کسٹڈی میں سمجھیں۔''

''کیا مطلب؟'' ان کی حیرت دوچند ہو گئی۔

میں نے آواز دے کر حوالدار کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے وہاں پہنچ کر پہلے ایس پی صاحب کو اور پھر مجھے سلیوٹ کیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جمعہ خان! اس حوالاتی کو ایس پی صاحب کے پاس لے آؤ جسے ہم آج دوپہر کو بخت نگر سے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔''

''او کے سر...!'' حوالدار تیزی سے مڑا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

''ویل ڈن صفدر حیات!'' گوندل صاحب نے توصیفی لہجے میں کہا۔ ''میں اگر تمہاری ترقی کے لیے کوشاں ہوں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ تم اس کا استحقاق رکھتے ہو۔''

''سر! میں گزشتہ رات ادھر لاہور میں جو حالات دیکھ کر آیا ہوں ان کا تقاضا یہی تھا کہ حاجی کو فوراً حراست میں لے لیا جائے اگر یہ اِدھر اُدھر سلپ ہوجاتا تو میں آپ کو کیا منہ دکھاتا۔ آئی ایم ویری سوری سر... کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر...''

''کسی سوری کی ضرورت نہیں ہے صفدر حیات!'' وہ دوستانہ لہجے میں بولے۔ ''تم نے حاجی کو قابو کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اِدھر لاہور میں اس کے گروہ کے تمام افراد کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو، واقعی اگر یہ کم بخت کہیں سلپ ہوجاتا تو ہمارے لیے بڑی مصیبت ہوجاتی۔''

اسی لمحے جمعہ خان زیرِ حراست حاجی کو لے کر آ گیا۔ گوندل صاحب نے تنقیدی انداز میں سرتاپا اس کا جائزہ لیا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''جمعہ خان! اسے وہیں ڈال دو جہاں سے اٹھا لائے ہو۔ کل صبح تک یہ تمہارا مہمان ہے لیکن تم اس کی ''خاطر داری'' میں نہیں لگ جانا۔ بس، اس کی نگرانی اور حفاظت کرنے کی ضرورت ہے۔ لاہور پولیس نے اس کی ''دعوت'' کے لیے ایک شاندار ''ضیافت'' کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے دیگر ساتھی وہاں پہنچ چکے ہیں۔ بس مہمان خصوصی یعنی'' حاجی صاحب'' کا انتظار ہو رہا ہے۔''

میرا اشارہ پا کر جمعہ خان حاجی کو اپنے ساتھ لے گیا تو میں نے ایس پی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''گوندل صاحب! لاہور کی صورتِ حال کے بارے میں تو کچھ بتائیں؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''صفدر حیات، وہاں کی صورتِ حال بڑی گمبھیر اور افسوس ناک ہے...!''

''یعنی ہمارا شک بالکل درست نکلا۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے ایس پی صاحب کو دیکھا۔ ''حاجی اینڈ کمپنی بردہ فروشی ایسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھے؟''

''بردہ فروشی سے بھی کہیں زیادہ گھناؤنے اور قابلِ مذمت کاروبار میں۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔

''کیا مطلب سر؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے ایک افسردہ سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگے۔ ''صفدر حیات، پچھلے تین مہینوں میں، لاہور پولیس کو مختلف ویران علاقوں اور کچرے کے ڈھیروں پر سے دس انسانی لاشیں ملی ہیں۔ ان لاشوں میں دو چیزیں مشترک پائی گئی ہیں۔ نمبر ایک، وہ دس کے دس جوان اور صحت مند افراد تھے۔ نمبر دو بڑے بہیمانہ انداز میں انہیں ایک آپریشن سے گزارا گیا تھا اور اس آپریشن میں ان کے دونوں گردے نکال لیے گئے تھے۔''

''اوہ...!'' میں نے بے ساختہ ایک متاسفانہ سانس خارج کی۔ ''تو... اس کا مطلب ہے وہ پردہ فروش نہیں بلکہ گردہ فروش ہیں؟''

''بالکل... یہی حقیقت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

میں نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور متوحش لہجے میں استفسار کیا۔ ''تو کیا بخت نگر سے جانے والے جوانوں...؟''

''یہ بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں صفدر حیات!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔ ''گزشتہ رات وہاں پہنچائے جانے والے چار جوان اور پہلے سے وہاں موجود تین جوانوں کو زندہ سلامت پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے اگر تمہاری رپورٹنگ میں دو چار گھنٹے کی تاخیر ہوجاتی تو یہ ساتوں کے ساتوں دیہاتی کبرو اپنے گردوں سے محروم ہوکر موت کو گلے لگا چکے ہوتے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

''تمہاری اطلاعات پر میں نے اپنے اعلیٰ افسران سے رابطہ کیا پھر آناً فاناً لاہور پولیس کو اس سنگین مسئلے سے آگاہ کردیا گیا۔ وہ تو پہلے ہی اس گروہ کی تلاش میں مختلف اسپتالوں کو چیک کر رہے تھے، جہاں صحت سے بھرپور جوانوں کو گردوں سے محروم کردیا جاتا تھا۔ میٹرنٹی ہوم وغیرہ کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا تھا لہٰذا انہوں نے آنِ واحد میں ''نیو لائف میٹرنٹی ہوم'' اور ''چیمہ ہاؤس'' پر ہنگامی چھاپا مارا۔ صوفیہ، سکندر شاہ کے علاقہ ڈاکٹر صمد ہارون کو فوراً گرفتار کرلیا گیا۔ ''نیو لائف میٹرنٹی ہوم'' صمد ہارون کی ملکیت تھا۔ اس نے زچہ و بچہ کے معاملات کے لیے لیڈی ڈاکٹر اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نرسیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں اور اسی کوٹھی کے تہ خانے میں اس نے ایک خفیہ آپریشن تھیٹر بنا رکھا تھا جہاں وہ بیرونِ ملک جانے کے ''شوقین'' افراد کے گردوں کو نکال لیا کرتا تھا۔ بخت نگر سے جانے والے سات جوانوں کو آج دوپہر کے بعد آپریشن سے گزارا جانے والا تھا لیکن اس سے پہلے ہی لاہور پولیس نے مستعدی دکھا کر ان کے مذموم منصوبے کو خاک میں ملا دیا جو پولیس کی گاڑی حاجی برکت علی رحمت علی کو لینے آرہی ہے، اسی میں وہ سات جوان بھی یہاں پہنچا دیے جائیں گے۔''

''اگر یہ لوگ گردہ فروشی کے گھناؤنے دھندے میں ملوث تھے تو اس کا مطلب ہے، کچھ اور افراد بھی ہوں گے جو ان سے فریش گردے خرید کر آگے کہیں پہنچاتے ہوں گے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے صفدر حیات۔'' وہ تائیدی انداز میں بولے۔ ''گرفتار شدگان کو کڑی تفتیش سے گزارا جا رہا ہے۔ سننے میں آرہا ہے کہ گردوں کے اس کاروبار کے ڈانڈے ملک سے باہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔''

''گویا حاجی اینڈ کمپنی انسانی گردوں کی ریکروٹنگ کر رہے تھے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہ جوانوں کو نہیں بلکہ ان کے تروتازہ گردوں کو بیرونِ ملک بھجواتے تھے؟''

''صفدر حیات! لاہور پولیس کا اعلیٰ سطح کا اجلاس بیٹھا ہوا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''وہاں تمہاری ذات بھی ڈسکس ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری کاوش ہی سے ممکن ہو سکا ہے۔ مجھے قوی امید ہے، جھنگ پولیس کو تمہارے حوالے سے خصوصی ہدایات جاری کی جانے والی ہیں، سمجھو کہ تمہاری ترقی ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں۔''

میں نے ممنونیت آمیز لہجے میں کہا۔ ''سر! اگر اوپر کہیں میری تعریف ہو رہی ہے تو یہ سب آپ کے توسط سے ہے۔ میں نے تو صرف اپنا فرض پورا کیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے بڑا مستعد اور ذمے دارانہ کردار انجام دیا ہے۔''

''صفدر حیات! دنیا کا کوئی بھی محکمہ ہو، ٹانگ کھینچنے اور کام لگانے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن سچے، ہمدرد اور خیر خواہ خال خال ہی نظر آئیں گے۔'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ تمہاری گزشتہ رات کی دھوپ دوڑ اور کڑی محنت کو مناسب انداز میں آگے پہنچایا ہے۔ میری جگہ اگر کوئی اور سینئر افسر ہوتا تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کریڈٹ تمہارے حصے میں آتا۔ تم کافی عرصے سے میرے نیچے کام کر رہے ہو اور پچھلے کئی سالوں کی کارکردگی میرے سامنے ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آنے والے وقت میں بہت جلد تمہیں ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی مل جائے۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے تہ دل سے گوندل صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

انہوں نے حاجی کے سلسلے میں مجھے چند ضروری ہدایات دیں اور صبح دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اس گردہ فروش گروہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

بردہ فروش، گردہ فروش، عصمت فروش اور منشیات فروش تو مختلف شکلیں ہیں انسان کی... ایک منفی انسان کی۔ میری نظر میں ایسے شخص کو بنیادی طور پر ضمیر فروش کہنا چاہیے۔ جب کسی انسان کا ضمیر مردہ ہو جائے تو پھر وہ غلط صحیح کی شناخت بھول جاتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اور صرف اپنے مفاد پر لگی رہتی ہے اور اس مفاد کے حصول کے لیے وہ ''کچھ بھی فروش'' ہو سکتا ہے۔ ضمیر فروش انسان تو اپنے فائدے کے لیے دین اور مذہب و ملت بھی فروخت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے، یہ دل، جگر اور گردے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

آئندہ روز، دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے بخت نگر کے ساتوں جوانوں اور حاجی برکت علی رحمت کا پُرامن ''تبادلہ'' ہو گیا۔

حاجی اینڈ کمپنی کو مرحلہ وار کیسی کڑی تفتیش سے گزارا گیا، مزید کن کن شرفا کو شاملِ تفتیش کر کے ''خاطر مدارات'' کی گئی اور ان کی زبانوں سے کیا سنسنی خیز انکشافات ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیل کہانی کی شکل میں پھر کبھی بیان کروں گا۔

بخت نگر زندہ سلامت، اپنے گردوں سمیت واپس لوٹنے والے ساتوں نوجوانوں کی حالت دیدنی تھی۔ وہ سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ اشرف اور عارف نے تو باقاعدہ ناک سے لکیریں نکال کر اس بات کا عہد کیا کہ وہ زندگی میں کبھی اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں جانے کے بارے میں نہیں سوچیں گے اور اپنے پسینے کا ایک ایک قطرہ کھیت، کھلیان میں محنت مشقت کرتے ہوئے بہائیں گے۔ اس طرح ان کی زندگی اور صحت بھی سلامت رہے گی اور وطن کی زمین کی زرخیزی میں بھی اضافہ ہوگا۔

میرے خیال، میں اس سے زیادہ دانشمندانہ فیصلہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا جو لوگ اپنی اصلیت سے چپکے رہتے ہیں، کامیابی اور خوشحالی ان کے قدم چومتی ہے۔

(تحریر حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پتھریلا راز

ملک صفدر حیات

کچھ لوگ وقت کو اپنی مٹھی میں قید کر لینے کی خواہش میں خود ہی لمحوں کے اسیر ہو جاتے ہیں اور بالآخر زندگی کی خوش رنگ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے قبر کے دہانے پر پہنچ کر چونک جاتے ہیں ..... وہ بھی اپنی زندگی کے خوشگوار لمحوں کو کسی راز کے مانند اپنے ساتھ ہی قبر میں دفن کر لینا چاہتا تھا لیکن ..... جن رازوں کو افشا ہونا ہو وہ خفیہ کیسے رہ سکتے ہیں .ایک ایسا راز جو منکشف ہو کر بھی پردے میں رہا۔

ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک کرشماتی پتھر کا فسانۂ حیرت

اس روز صبح ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ رات بھر وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ جب میں تھانے میں آ کر اپنی کرسی پر بیٹھا تو اس وقت بھی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ ماہِ اگست کے الوداعی ایام تھے یعنی بھادوں اپنے جوبن پر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حوالدار حیدر علی میرے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا اور میرے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ان دنوں میں جنوبی پنجاب کے ایک نواحی گاؤں موضع بخشی پور کے تھانے میں تعینات تھا۔ اس تھانے کی حدود میں بخشی پور کے علاوہ کمال گنج ٹبا فقیر والا، ندی پور اور رستم آباد نامی گاؤں دیہات بھی آتے تھے لیکن چونکہ بخشی پور تھانے کے بہت قریب صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا لہٰذا عام طور پر اسے بخشی پور کا تھانہ ہی کہا اور سمجھا جاتا تھا۔ آپ کی دلچسپی کے لیے بتاتا چلوں کہ اس تھانے کا عملہ کل پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ یعنی میں، حیدر علی، اور تین کانسٹیبلز جن کے نام رمضان، سکندر اور رؤف تھے گویا اس تھانے کی حدود میں واقع پانچ گاؤں کا نظم و نسق مجھے انہی چار اہلکاروں کی مدد سے چلانا تھا اور میں یہ فرض دو سال سے بخوبی نبھا رہا تھا۔

حیدر علی سے تھوڑی دیر تک حالیہ برساتی موسم پر گفتگو ہوتی رہی اگر کوئی ہمیں یوں بیٹھے دیکھ لیتا تو اس کے ذہن میں پہلا تاثر یہی ابھرتا کہ ہمیں فرصت ہی فرصت ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ میرے علاقے میں جرائم پیشہ افراد نے ہڑتال کر رکھی ہو۔ گاہے بگاہے وارداتیں تو ہوتی رہتی تھیں لیکن اس صبح میں واقعی کوئی کام نہیں تھا..... پھر ایک سنسنی خیز کام نکل آیا۔

کانسٹیبل رمضان نے کمرے میں آ کر اطلاع دینے والے انداز میں بتایا۔ ''ملک صاحب! ایک بوڑھی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔''

میں نے چونک کر حیدر علی کی طرف دیکھا۔ برسات کے اس موسم میں بھلا کوئی عورت مجھ سے ملنے کیوں آئی تھی اور وہ بھی بوڑھی..... میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی حوالدار نے کانسٹیبل سے پوچھ لیا۔

''رمضان! وہ بوڑھی عورت کون ہے؟''

''اس نے اپنا نام مائی سگی بتایا ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''کہتی ہے پورا گاؤں اسے جانتا ہے.....''

''اوہ.....!'' حوالدار نے گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ''اچھا..... تو یہ اللہ رکھا مرحوم کی گھر والی مائی سگی ہے!''

''جی ہاں، جی ہاں.....'' کانسٹیبل نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''رمضان! مائی سگی کو فوراً میرے پاس بھیجو، دیکھوں تو سہی اتنے خراب موسم میں اسے مجھ سے ایسا کون سا کام پڑ گیا ہے!''

کانسٹیبل رمضان میکانکی انداز میں اباؤٹ ٹرن ہوا اور چند سیکنڈ کے بعد مائی سگی میرے سامنے موجود تھی۔

ضعیف بی بی عرف مائی سگی کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال رہی ہوگی۔ اس عمر میں انسان کی صحت جیسی ہو سکتی ہے وہ بھی ویسی ہی تھی۔ قد درمیانہ اور جسم دبلا پتلا۔ بات چیت اور چہرے کے تاثرات سے وہ خاصی تروتازہ نظر آتی تھی۔ میرے اشارے پر وہ دیوار کے ساتھ رکھی ایک چوبی بینچ پر بیٹھ گئی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے ایک بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی جو اب بھیگ چکی تھی۔ بوندا باندی نے چادر کو بھگو کر اس کے لباس کو بچا لیا تھا۔ بھیگی ہوئی چادر کو بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے اپنے قریب ہی بینچ پر رکھ دیا اور متوحش انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں میں ایک خاص نوعیت کی دہشت نظر آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے کوئی ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہے۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں مائی بتاؤ، تم مجھ سے کیا کہنے آئی ہو۔ یقیناً کوئی بہت ہی ضروری کام ہوگا جو برستی بارش میں تمہیں گھر سے نکل کر میرے پاس آنا پڑا؟''

''کام بہت ضروری ہے جناب.....'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا پھر متذبذب انداز میں حوالدار حیدر علی کی طرف دیکھنے لگی۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ حوالدار کی موجودگی میں مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا، اس کا مسئلہ خاصا سنگین نوعیت کا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مائی، بتاؤ، وہ ضروری کام کون سا ہے؟''

''تھانے دار جی۔ میں تنہائی میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر متاملانہ نظر سے حوالدار کی جانب دیکھا۔ وہ جو کچھ بھی چاہ رہی تھی یہ اس کا حق تھا لہٰذا میں نے آنکھ کے اشارے سے حیدر علی کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہہ دیا۔ وہ زبان سے ایک لفظ ادا کیے بغیر خاموشی سے اٹھا اور میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں نے تنہائی میسر آتے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں مائی، اب بتاؤ۔ کیا معاملہ ہے تمہارے ساتھ؟''

وہ متذبذب انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''آپ میری بات کا یقین تو کریں گے نا۔ کہیں آپ میرا مذاق تو نہیں اڑائیں گے.....؟''

''میرا دماغ خراب نہیں ہوا جو میں تمہارا مذاق اڑاؤں گا۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور جہاں تک تمہاری بات پر یقین کرنے کا تعلق ہے تو میں جب تک تمہاری کہانی سن نہ لوں، یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں اس لیے.....'' میں نے تھوڑا سا رک کر ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے تمہیں جو بھی کہنا ہے، جلدی اور صاف صاف کہہ ڈالو۔ میں پوری توجہ سے تمہاری کہانی سن رہا ہوں.....تم یہاں آؤ اور شروع ہو جاؤ۔''

میں نے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس اکلوتی کرسی کی جانب اشارہ کر دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے حوالدار بیٹھا ہوا تھا۔ مائی سگی نے میرے اشارے کی تعمیل کی تو میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

''تھانے دار جی! میں نے ایک مردے کو قبرستان سے فرار ہوتے دیکھا ہے۔''

میں نے ایک جھٹکے سے چونک کر مائی سگی کو دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یہ کب کی بات ہے مائی؟''

''پچھلی رات کی بات ہے جی۔'' اس کی سنجیدگی میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔

میں نے پوچھا ''تم پچھلی رات قبرستان کیا لینے گئی تھیں؟''

''میں تو قبرستان نہیں گئی تھی.....''

''پھر.....؟'' میری حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! بات دراصل یہ ہے کہ میرا گھر گاؤں کے آخری کنارے پر واقع ہے۔ اس کے بعد قبرستان شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر یہ کارروائی دیکھی تھی۔''

لفظ کارروائی پر اس نے اچھا خاصا زور ڈالا تھا۔ اول تو اس کی یہ بات ہی ناقابل ہضم تھی کہ کوئی مردہ قبر میں سے نکل کر فرار ہو گیا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس نے کوئی خواب وغیرہ دیکھ لیا ہوگا لیکن حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اس کی کہانی سننا بہت ضروری تھا لہٰذا میں نے سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

''مائی سگی، تمہاری بات پر یقین کرنے کے لیے مجھے تفصیل میں جانا ہوگا۔ تم ذرا وضاحت سے بیان کرو کہ گزشتہ رات تم اپنے گھر کے صحن میں کھڑی کیا کر رہی تھیں اور وہ رات کا کون سا وقت تھا۔ تم نے جس مردے کا ذکر کیا ہے، وہ کدھر سے آیا تھا اور کس جانب فرار ہوا تھا۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں، تم بولتی جاؤ.....!''

اس نے بڑی امید بھری نظر مجھ پر ڈالی اور بتانے لگی۔ ''تھانے دار جی! آپ کو پتا ہے، پچھلی رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی ہے اس لیے میں صحن میں نہ سوسکی ورنہ میں گرمی کے موسم میں باہر ہی سوتی ہوں۔ رات کو میں نے کمرے کے اندر چارپائی لگالی تھی۔ مچھروں نے بڑا پریشان کیا، صحیح طرح نیند نہ آسکی۔ بس سمجھیں کہ سوتی جاگتی رہی۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''رات کے آخری پہر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک حیرت بھرا منظر دیکھا۔ میں کمرے کے اندر چارپائی پر پڑی تھی اور صحن والا نلکا (ہینڈ پمپ) چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں گھر میں اکیلی ہی ہوتی ہوں، میرا گھر والا اللہ رکھا کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آٹھ سال پہلے فوت ہوگیا تھا اور ہماری کوئی اولاد بھی نہیں۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی اور ڈر بھی لگا کہ نلکا کون چلا رہا ہے۔ میں ڈرتی ڈرتی اٹھی اور کمرے کے دروازے میں کھڑے ہوکر باہر صحن میں دیکھا اور اسی وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا.....''

بولتے بولتے وہ اچانک رکی اور متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''مائی سگی! تم نے ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔ ابھی تھوڑے دیر پہلے تم نے نلکا چلنے کا ذکر کیا ہے۔ کیا تمہارے ڈر کا تعلق اسی نلکے سے ہے؟''

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خوف زدہ انداز میں بتانے لگی۔ ''میں نے ایک لاش کو نلکا چلاتے اور پاؤں دھوتے ہوئے دیکھا..... اس منظر نے مجھے جیسے پتھر کا بنا دیا۔ میں بے جان سی ہوکر اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس لاش نے بڑی تسلی سے اپنے پاؤں دھوئے پھر نلکے کے قریب ہی رکھا ہوا ایک تھیلا اٹھایا اور نہر کی جانب چلی گئی۔''

مجھے مائی سگی کی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔ وہ لاش کے حوالے سے جو کچھ بیان کر رہی تھی، وہ احمقانہ اور ناقابل یقین تھا۔ میں چونکہ اس کی پوری روداد سننا چاہتا تھا اس لیے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔

''تم نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی لاش ہی تھی، یہ بھی تو ہوسکتا ہے، وہ کوئی آدمی ہو..... زندہ آدمی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''وہ کوئی زندہ انسان نہیں ہوسکتا۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک سفید کفن میں لپٹے ہوئے دیکھا تھا، بالکل جیسے کسی مردے کو کفن میں لپیٹا جاتا ہے۔''

''جب وہ لاش سر سے پاؤں تک سفید کفن میں لپٹی ہوئی تھی تو پھر پاؤں کیسے دھو رہی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ نلکا کیسے چلا رہی تھی؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں جی.....'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''میں نے جو کچھ دیکھا وہ آپ کو بتا دیا..... مجھے تو یہ کوئی بہت ہی پراسرار چکر لگتا ہے تھانے دار صاحب!''

''چکر تو واقعی بڑا پراسرار ہے اور میں اس کی تہہ تک بھی پہنچ کر رہوں گا۔'' میں نے شک زدہ نظر سے مائی سگی کو گھورا۔

وہ فوراً میری نگاہ کا مفہوم سمجھ گئی، پوچھنے لگی۔ ''تھانے دار جی! آپ کہیں یہ تو نہیں سوچ رہے کہ میں آپ سے جھوٹ بول رہی ہوں؟''

''نہیں..... بالکل نہیں۔'' میں نے اس کی تسلی کے لیے فوراً کہہ دیا۔ ''میرے خیال میں تم ایک سمجھدار عورت ہو۔ تم مجھ سے غلط بیانی نہیں کرسکتی ہو۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر پوچھا۔ ''مائی! کیا تم رات کو سونے سے پہلے گھر کا بیرونی دروازہ بند نہیں کرتی ہو جو کوئی بھی منہ اٹھا کر تمہارے صحن میں آ جاتا ہے اور نلکے پر پاؤں دھو کر واپس چلا جاتا ہے، چاہے وہ کوئی لاش ہی کیوں نہ ہو؟''

''وہ جی..... شاید آپ نے میرا گھر نہیں دیکھا جب ہی یہ سوال کر رہے ہیں.....!'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

''ہاں واقعی، میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

میں نے اپنے انداز سے سگی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ اس کی فضول باتوں پر مجھے یقین نہیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں گہری سنجیدگی سے اس کا مسئلہ سن رہا ہوں۔ وہ میرے سوال کے جواب میں بولی۔

''تھانے دار جی! دراصل، میرے گھر کا کوئی داخلی دروازہ نہیں ہے۔ دو کمرے ہیں اور چار دیواری کے نام پر ایک چھوٹی سی دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ سامنے والا حصہ بالکل کھلا ہے۔ کوئی دروازہ یا گیٹ لگانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ ہمارے پاس ہے کیا جو کوئی چور ادھر کا رخ کرے گا۔ میری اکیلی جان ہے وہ سب جانتے ہیں کہ میں بڑی مشکل سے گزارہ کرتی ہوں۔ جناب! آپ تو دروازے کی بات کرتے ہیں، میرے گھر کے دونوں کمروں کے آگے تو برآمدہ بھی نہیں ہے۔ اللہ رکھا زندہ ہوتا تو شاید.....!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور اپنے مرحوم شوہر کی یادوں میں کھو گئی۔ میں نے چند لمحات کے لیے اسے یونہی گم

قائداعظم

وقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ یکم جولائی 1948ء کو وہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی تقریب افتتاح کے سلسلے میں تشریف لائے تو انہوں نے دیکھا کہ وزراء اور سرکاری افسران کی کرسیاں ان کی عدم موجودگی کے باعث خالی پڑی تھیں۔

قائداعظم نے حکم دیا کہ ''خالی کرسیاں یہاں سے ہٹا دی جائیں اور دیر سے آنے والے وزراء، افسران اور اہلکار کھڑے ہوکر تقریر سنیں۔'' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تقریب کے بعد دیر سے آنے والے تمام افراد نے قائداعظم سے معذرت کی۔

محمد مبین اجن کھڑا، ضلع خیر پور، سندھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گشتہ رہنے دیا پھر پوچھا۔

''اللہ رکھی! جب تم کئی سالوں سے تن تنہا رہ رہی ہو تو تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے، انسان زندہ ہو تو اسے ہر شے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھانا پینا، کپڑا لتا وغیرہ.....؟''

میں لاش والے موضوع سے ہٹ کر سگی کی ذات میں اس لیے دلچسپی لے رہا تھا تاکہ وہ ذہنی طور پر مجھ سے ہم آہنگ ہو جائے اور میں اس کی زبان سے کام کی کوئی بات اگلوانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ ایک طرح کا نفسیاتی حربہ یا ہتھکنڈا تھا۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں تھانے دار جی!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دے کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔ اگر اللہ رکھا اپنے پیچھے پانچ کلے (ایکڑ) زمین نہ چھوڑ گیا ہوتا تو پتا نہیں، میرا حشر کیسا خراب ہوتا۔'' وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی، ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اللہ رکھا جب تک زندہ رہا، اس زمین پر خود ہی کھیتی باڑی کرتا تھا لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں تھا لہٰذا اللہ رکھا کی موت کے بعد میں نے یہ زمین حصے پر ایک مزارع کو دے دی۔ کچھ عرصے تک تو اس مزارع نے کسی حد تک ایمانداری دکھائی اور مجھے فصل کا حصہ دیتا رہا پھر اس نے مختلف حیلوں بہانوں سے ڈنڈی مارنا شروع کر دی۔ مجھے جیسے ہی اس کی بدنیتی کا احساس ہوا، میں نے اس سے زمین چھڑا کر ایک دوسرے مزارع کو ٹھیکے پر دے دی۔ یہ طریقہ میرے لیے زیادہ محفوظ تھا۔ فصل اچھی ہو یا بری، اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے طے شدہ اجناس مل جائیں کافی ہے، جب سے میں نے مزارع تبدیل کیا ہے، مطمئن اور خوش ہوں۔''

میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا پھر ایک مرتبہ دوبارہ اس لاش والے قصے کی طرف آ گیا اور تصدیق طلب انداز میں مائی سگی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''رات کے آخری پہر، مچھروں اور بے آرامی کے سبب تمہاری آنکھ کھل گئی۔ تم نے اپنے گھر کے صحن میں نلکا چلنے کی آواز سنی۔ جب تم نے اٹھ کر دیکھا تو تمہیں سفید کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش نظر آئی جو نلکا چلا کر اپنے پاؤں دھو رہی تھی۔ تم حیرت اور خوف سے اسے یہ کارروائی کرتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ جب لاش اپنے کام سے فارغ ہو گئی تو اس نے نلکے کے قریب ہی زمین پر پڑا ہوا ایک تھیلا اٹھایا اور نہر کی جانب جانے والے راستے پر ہو لی۔ میں نے رات والا واقعہ بیان کرنے میں کوئی غلطی تو نہیں کی؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''ہو بہو ایسا ہی پیش آیا تھا۔''

''تمہیں یہ واقعہ بڑا عجیب اور پراسرار محسوس ہوا.....''

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے تم صبح ہوتے ہی میرے پاس چلی آئی ہو تاکہ میں اس معاملے کی تحقیق کروں، ہے نا یہی بات؟''

''جی..... جی ہاں، یہی بات ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے اس واقعے کے بارے میں اور کس کس کو بتایا ہے؟''

''کسی کو نہیں جی۔'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''کوئی میری بات کا یقین ہی کہاں کرتا۔ سب مجھے جھلی مائی سمجھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، عمر کے ساتھ ساتھ میری مت ماری گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں کوئی پاگل عورت ہوں پھر میرے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آپ.....''

وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوئی اور گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''آپ ایک تجربہ کار اور سمجھدار انسان ہیں۔ آپ میری بات کا بھروسا کریں گے اور اس سلسلے میں ضروری کارروائی بھی کریں گے لہٰذا میں صبح تک آپ ہی کے بارے میں سوچتی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ یہ نامراد بارش رکے تو میں اس واقعے کی اطلاع آپ تک پہنچاؤں لیکن یہ کم بخت وقفے وقفے سے جاری ہے۔ بہرحال میں بھیگتے بھاگتے آپ تک پہنچ ہی گئی ہوں۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے مائی سگی! اب تک اگر تم نے کسی کو اس واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تو اب آگے بھی زبان بند ہی رکھنا۔ میں اپنے طور پر اس عجیب و غریب معمے کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' پھر میں نے کمرے سے باہر نظر دوڑائی اور اضافہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''اب بارش تھمی ہوئی ہے۔ تم اطمینان سے گھر جاؤ اور اس سلسلے میں ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سنبھال لوں گا سارے معاملے کو۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گئی۔

مائی سگی کے جاتے ہی حوالدار حیدر علی میرے پاس آ گیا۔ اس حوالے سے حیدر علی کے ذہن اور دل میں تجسس تو جاگ اٹھا تھا کہ مائی سگی برستی بارش میں مجھے کون سی کہانی سنانے آئی تھی، اس نے آتے ہی اس بارے میں مجھ سے سوال بھی کر ڈالا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے سگی کے بیان کردہ واقعے سے آگاہ کیا۔ اس معاملے کو فی الحال صیغۂ راز میں رکھنے کی تلقین کی اور آخر میں پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے حیدر علی..... کیا کوئی لاش کسی قبر سے نکل کر اس طرح فرار ہو سکتی ہے کہ جاتے ہوئے وہ کسی نلکے کو چلا کر اپنے کیچڑ زدہ پاؤں بھی دھو ڈالے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میں اس قسم کی فضول باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔''

''تو پھر مائی سگی نے کس کو دیکھا تھا؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''وہ کون تھا جو رات کے آخری پہر اس کے نلکے پر پاؤں دھو رہا تھا؟''

''میرا تو یہ خیال ہے جناب.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس بھلی مائی نے صبح کے وقت کوئی اوٹ پٹانگ خواب دیکھ لیا ہے اور اس خواب کو حقیقت جانتے ہوئے وہ سمجھ رہی ہے کہ کفن میں لپٹی ہوئی کسی لاش نے اس کے صحن میں نلکا چلا کر اپنے پیر دھوئے ہیں۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں حیدر علی۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''یہ بات عین ممکن نظر آتی ہے کہ سگی نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو لیکن ہمیں اس معاملے کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیا اس واقعے کا کوئی اور پہلو بھی ہو سکتا ہے؟'' حوالدار سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''ہاں.....'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں ایک خاص زاویے سے سوچ رہا ہوں۔''

''کون سا زاویہ؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''فرض کرو.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''مائی سگی نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ واقعی کوئی لاش قبر سے نکل کر فرار ہوئی ہے..... میں ان خطوط پر سوچ رہا ہوں کہ یہ ہو سکتا ہے کسی شخص نے خود کو سفید لبادے میں چھپا رکھا ہو، وہ رات کے آخری پہر قبرستان سے نکلا ہو، اس کے ہاتھ میں کوئی تھیلا ہو، اس نے کیچڑ زدہ پاؤں دھونے سے پہلے وہ تھیلا نلکے کے قریب زمین پر رکھ دیا ہو اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ تھیلا اٹھا کر نہر کی جانب بڑھ گیا ہو۔''

میں ان مفروضات کی مدد سے یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ حوالدار کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ اس نے چند لمحات کے لیے میرے اٹھائے ہوئے نکات پر غور کیا اور بڑے مدلل انداز میں جواب دیا۔

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ اِنشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ملک صاحب! اگر سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا آپ بیان کر رہے ہیں تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا جو رات کے آخری پہر قبرستان سے برآمد ہوا اور بڑے پراسرار انداز میں نہر کی جانب بڑھ گیا پھر یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ اس کے تھیلے میں کیا تھا؟''

''بالکل درست!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''ہمیں اس مشکوک بندے کو تلاش کرنا ہے۔ جب وہ ہماری گرفت میں آجائے گا تو پھر یہ پتا چلانا مشکل نہیں ہوگا کہ اس کے تھیلے میں کیا تھا اور..... اس تلاش کے سلسلے میں ہمیں دو مقامات کو بڑی احتیاط سے چیک کرنا ہوگا۔''

''کون سے دو مقامات ملک صاحب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پہلا مقام تو قبرستان ہے جہاں سے وہ نامعلوم شخص برآمد ہوا تھا اگر اس کے تھیلے میں کوئی اہم شے بھری ہوئی تھی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نے کسی قبر کو کھودا ہوگا۔ جادو ٹونا اور دیگر سفلی عملیات کے لیے عاملوں کو بعض اوقات مردوں کی ہڈیوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ بھی اسی قسم کا کوئی کیس ہوسکتا ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور دوسرا مقام نہر کا کنارا ہے..... وہ مائی سگی کے نلکے سے پاؤں دھو کر نہر کی جانب روانہ ہوا تھا۔ نہر کے ساتھ تھوڑا آگے شمال کی طرف خانہ بدوشوں کی جھگیاں ہیں۔ عین ممکن ہے ہمارا مطلوبہ شخص انہی جھگیوں سے تعلق رکھتا ہو۔ ان خانہ بدوشوں میں سادھو، جوگی اور عملیات وغیرہ کے ماہر بھی ہوتے ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ گندا عمل کرنے والے کسی عامل نے قبرستان سے ہڈیاں چرائی ہوں۔''

''ملک صاحب! اس تھیوری کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ کوئی شخص ہی تھا اور کوئی شے چرانے قبرستان میں گھسا تھا۔'' حوالدار نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''ظاہر ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ''میں مائی سگی کی سنائی ہوئی مردے کے فرار والی کہانی پر قطعاً یقین نہیں رکھتا۔''

ہم دونوں میں بڑی حد تک اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ باہمی صلاح ومشورے کے بعد ہم نے یہی طے کیا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نہر کا رخ کریں گے اور واپسی میں قبرستان کو بھی چیک کرلیں گے۔

دراصل میرا تھانہ ایک نیم پختہ سڑک پر واقع تھا اور موضع بخشی پور جانے کے لیے تھانے سے جنوبی سمت میں ایک فرلانگ کا کچا راستہ طے کرنا ضروری تھا۔ بخشی پور کے اندر سے گزرنے کے بعد قبرستان آتا تھا جبکہ بخشی پور کے اختتام پر مغربی جانب ایک چھوٹی نہر شمالاً جنوباً بہتی تھی جو تھانے والی نیم پختہ سڑک کے نیچے سے گزرتی تھی اگر ہم اسی سڑک پر مغربی سمت سفر کرتے تو آدھی فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر نہر کا پل آجاتا جہاں سے ہم نہر کے کنارے جنوبی طرف سفر کرکے بہ آسانی خانہ بدوشوں کی جھگیوں تک پہنچ سکتے تھے اور واپسی میں قبرستان کو چیک کرتے ہوئے، بخشی پور کے اندر سے گزر کر تھانے آجاتے۔

اس مشن کی تیاری کے سلسلے میں، میں نے حوالدار حیدر علی کو چند ضروری ہدایات دیں اور دوسرے کاموں میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

ہم نے جو پروگرام ترتیب دیا تھا، اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ جیسے ہی میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا، ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آکر بتایا کہ چودھری علی نواز مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے فوری طور پر چودھری کو اپنے پاس بلالیا۔

چودھری علی نواز کو بخشی پور میں چھوٹے چودھری صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ''تھا'' کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ چند روز قبل اس کے والد صاحب چودھری رب نواز کا انتقال ہوگیا تھا۔ رب نواز کے لیے گاؤں والوں نے بڑے چودھری صاحب کے الفاظ مخصوص کر رکھے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد علی نواز بخشی پور کا چھوٹا چودھری نہیں رہا تھا۔ لوگوں نے اسے بڑا چودھری اور اس کے نوسالہ بیٹے حق نواز کو چھوٹا چودھری کہنا شروع کردیا تھا۔ میں چودھری رب نواز کی تعزیت کرنے حویلی گیا تھا اور وہاں سب کچھ موقع محل کے تقاضے کے مطابق ٹھیک ٹھاک پایا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آسکا کہ علی نواز کس مقصد کے لیے مجھ سے ملنے آیا ہے۔

وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے دو حواری بھی ہمراہ تھے جن کے نام دلدار حسین اور منصب علی تھے تاہم وہ اپنے ساتھیوں کو برآمدے میں چھوڑ کر اکیلا ہی میرے کمرے میں آیا تھا۔

میں نے اسے بہت ہی الجھا ہوا، پریشان اور غصے میں پایا تاہم یہ الجھن پریشانی اور غیظ وغضب والد کی ابدی جدائی کے حوالے سے نظر نہیں آتا تھا بلکہ اس کے اسباب کوئی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی دکھائی دیتے تھے۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ خاصے جارحانہ انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا ہوں۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

اس کا یہ جارحانہ انداز اگرچہ مجھے پسند نہیں آیا تاہم اس خیال کے پیش نظر کہ چند روز قبل اس نے اپنے باپ کو منوں مٹی کے نیچے دبایا ہے، میں نے جارحیت کا جواب جارحیت سے دینے کے بجائے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''بات کیا ہے چودھری جی..... آپ مجھے اپنے ساتھ کہاں لے کر جانا چاہتے ہیں؟''

''قبرستان میں!'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''قبرستان..... کیوں، خیریت تو ہے نا سب؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کچھ پتا تو چلے، آخر ہوا کیا ہے؟''

''کسی بدبخت نے ابا جی کی قبر کی بے حرمتی کی ہے۔'' وہ نفرت بھرے انداز میں بولا۔

ادھر علی نواز نے قبر کی بے حرمتی کی بات کی، ادھر مائی سگی کی سنائی ہوئی کہانی میرے ذہن میں چمکنے لگی اور اس کے ساتھ ہی وہ گفتگو بھی تازہ ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے میرے اور حوالدار کے درمیان ہوئی جس میں ہم متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے کہ کوئی شخص گزشتہ رات کسی قبر کے ساتھ کوئی کارروائی کرنے کے بعد مائی سگی کے صحن میں پہنچا تھا اور نلکے پر پاؤں دھو کر نہر کی جانب چلا گیا تھا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور چودھری علی نواز سے کہا۔

''چودھری جی! آپ تشریف رکھیں اور اطمینان سے مجھے بتائیں کہ ایسی ناپاک جرأت کس بدبخت نے کی ہے؟''

''اگر مجھے اس نامراد کا پتا ہوتا تو میں اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دیتا۔'' وہ میری بات مانتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کسی کے برے دن آگئے ہیں جو اس نے ایسی حرکت کی ہے۔''

''چودھری صاحب کی قبر کی بے حرمتی کیسے کی گئی ہے۔'' میں نے ایک ممکنہ خدشے کے پیش نظر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے ابا جی کی لاش کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے؟''

''نہیں جی..... لاش کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا۔'' وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بس، اس کمینے نے ابا جی کی قبر کو کھول دیا ہے، پتا نہیں اس کا مقصد کیا تھا۔''

''یہ کب کا واقعہ ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے یہ واقعہ کل رات کسی وقت پیش آیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ایسے کام دن کی روشنی میں نہیں کیے جاتے۔''

''آپ کو کب پتا چلا کہ چودھری صاحب کی قبر کھلی ہوئی ہے؟'' میں نے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ بات دراصل یہ ہے کہ.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ ابا جی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے صرف چار دن ہوئے ہیں۔ ان کے قلوں (سوئم) تک تو میں صبح شام ان کی قبر پر حاضری دیتا رہا ہوں، صبح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں قبرستان پہنچ جاتا اور شام میں عصر اور مغرب کے درمیان بھی ادھر کا ایک چکر لگاتا رہا ہوں مگر قلوں کے بعد صرف ظہر کی نماز کے بعد یہ سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو میں ان کی قبر پر پہنچا تو قبر کو کھلا ہوا پایا۔ قبر کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ رات کے کسی پہر اس کے ساتھ کارروائی کی گئی ہے۔ آپ جانتے ہیں رات میں وقفے وقفے سے اور صبح سے بھی دو تین مرتبہ ہلکی پھلکی بوندا باندی ہو چکی ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ اس وقت چھینٹا چھانٹی کا سلسلہ رکا ہوا ہے۔'' وہ ایک مرتبہ پھر رکا لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''قبر کھلی ہونے کے باعث بارش کا پانی اندر اتر رہا ہے جس کی وجہ سے کفن میں لپٹی ہوئی ابا جی کی لاش کی حالت خاصی خراب ہو چکی ہے جناب۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ ایسی مذموم حرکت کرنے والے کو فوراً گرفتار کریں اور اسے عبرتناک سزا دیں۔ میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہتا ورنہ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اس خبیث کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں.....!''

میں نے چودھری علی نواز سے یہ نہیں کہا کہ جو شخص تمہارے ہاتھ ہی میں نہیں، اس کے ٹکڑے کیسے کرو گے؟ چند روز قبل وہ باپ کے سایے سے محروم ہوا تھا اور آج ایک اور افسوس ناک واقعہ سامنے آ گیا تھا۔ ان حالات میں، میں اس کے دل و دماغ کی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا لہٰذا نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''حوصلہ رکھو علی نواز! میں اس بدمعاش کو بہت جلد گرفتار کر کے تمہارے سامنے لے آؤں گا۔ تمہاری اس بات سے مجھے خوشی ہوئی کہ تم قانون کو ہاتھ میں لینے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ جب قانون کے رکھوالے موجود ہوں تو یہ طاقت انہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہاتھوں میں بجتی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم نے اس سلسلے میں حیات بخش سے بات کی ہے؟''

حیات بخش، بخشی پور کے قبرستان کا گورکن تھا۔

چودھری علی نواز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ہاں، میں نے آپ کے پاس آنے سے پہلے اس سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن وہ اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''وہ اس قبرستان کا گورکن ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس کے دن اور رات ادھر ہی گزرتے ہیں۔ کوئی شخص پچھلی رات قبرستان میں گھسا، تمہارے والد کی قبر کو کھولا اور واپس چلا گیا مگر گورکن کو اس واقعے کی خبر نہیں، یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ بہرحال، ادھر چل کر دیکھتے ہیں.....'' بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے بھی کرسی چھوڑ دی اور بولا۔ ''میں نے بھی گھما پھرا کر حیات بخش سے کئی سوال کیے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور فریاد کرنے لگا کہ وہ بارش کی وجہ سے اپنے کمرے میں سویا تھا اس لیے بھی قبرستان کے معاملات پر گہری نظر نہ رکھ سکا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ پانچ دس منٹ ادھر برآمدے میں رکو، میں قبرستان جانے کا انتظام کرتا ہوں۔''

''اگر انتظام سے آپ کی مراد سواری ہے تو بے فکر ہو جائیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تانگے میں بیٹھ کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ اسی میں چلتے ہیں۔''

ہم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئے اور پھر تھانے کی حد میں واقع وسیع و عریض صحن میں آ گئے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں حوالدار حیدر علی کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ اس معاملے کے پس منظر سے پوری طرح واقف تھا لہٰذا میری بات سمجھنے میں اسے ذرا دقت محسوس نہ ہوئی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

''ملک صاحب! کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟''

میں نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں حیدر علی۔ تم ادھر تھانے ہی میں رہو۔ میں قبرستان کے حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم ایک ساتھ نہر کے کنارے کا رخ کریں گے، ادھر خانہ بدوشوں کے ڈیرے کی جانب.....''

''ٹھیک ہے جناب.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور خاموش ہو گیا۔

میں چودھری علی نواز کے ہمراہ چلتے ہوئے تھانے سے باہر آ گیا۔ تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ ہی ایک سجا سجایا تانگا کھڑا تھا۔ تانگے کی سج دھج سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چودھری کے ذاتی استعمال کے لیے مختص ہوگا۔ تانگے کے آس پاس جب مجھے کوچوان نظر نہ آیا تو میں نے چودھری سے پوچھا۔

''علی نواز..... تانگے کا کوچوان کہاں ہے؟''

''یہ اپنا منصب علی ہے نا.....'' اس نے اپنے حواریوں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہی اس تانگے کا نظام سنبھالتا ہے۔''

''نظام سنبھالتا ہے۔'' کے الفاظ پر اس نے خصوصی زور ڈالا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ منصب علی محض ایک روایتی کوچوان نہیں تھا بلکہ وہ تانگا چلانے کے علاوہ بھی چودھری کی مختلف خدمات انجام دیتا رہتا ہے۔ چودھری علی نواز کے ساتھ تھانے پہنچنے والے منصب علی اور دلدار حسین اپنی وضع قطع اور ڈیل ڈول سے ڈشکرے نظر آتے تھے۔ چودھریوں اور وڈیروں کو اپنی آن بان اور شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے اسی قسم کے ہٹے کٹے باڈی گارڈز کی ضرورت ہوتی ہے۔

منصب علی نے تانگے کی باگ ڈور سنبھالی۔ میں اور چودھری علی نواز اگلی سیٹ پر بیٹھے اور دوسرے ڈشکرے دلدار حسین نے عقبی نشست پکڑ لی۔ تانگا محتاط انداز اور معتدل رفتار سے موضع بخشی پور کی جانب بڑھنے لگا۔

شکر کی بات یہ تھی کہ اس وقت بارش رکی ہوئی تھی تاہم آسمان کی شکل سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی نیت کا کوئی بھروسا نہیں۔ ابھی نہیں تو کچھ دیر کے بعد، وہ کسی بھی وقت رونا دھونا شروع کر سکتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم بخشی پور پہنچ گئے۔ تانگے نے چودھری علی نواز کے حکم پر گاؤں کا درمیانی راستہ اختیار کیا اور ہمیں قبرستان تک لے آیا۔ مذکورہ قبرستان ایک ٹیلے پر ''آباد'' تھا اور ظاہر ہے، تانگا قبرستان کے اندر رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ہم تانگے سے نیچے اترے اور قبرستان میں داخل ہو گئے۔

قبرستان کے ایک کونے میں، بائیں جانب چودھری خاندان کے لیے ایک حصہ مخصوص تھا جہاں صرف انہی کی فیملی کے افراد کو سپرد خاک کیا جاتا تھا اور قبرستان کا یہ حصہ ''چودھریوں کا قبرستان'' کہلاتا تھا۔ قبرستان کے داخلی دروازے کے ساتھ دائیں جانب گورکن حیات بخش کا کمرا تھا، ہم قبرستان کے اندر داخل ہو گئے اور چودھری مجھے اپنے اباجی کی قبر تک لے آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبرستان کے گیٹ پر میں نے نصف درجن کے قریب لوگ جمع دیکھے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا، اس واقعے کی خبر گاؤں والوں کو ہو چکی تھی تبھی انہوں نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ چودھری علی نواز کے اشارے پر دونوں حواری بھی گیٹ کے پاس ہی رک گئے تھے۔

میں نے بغور چودھری رب نواز کی قبر کا جائزہ لیا۔ اس کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے ابھی صرف چار دن ہی ہوئے تھے۔ قبر ظاہر ہے، ابھی کچی تھی جبکہ دیگر افرادِ خانہ کی قبور بڑی شان دار اور پختہ تھیں جن میں سب سے نمایاں قبر علی نواز کے دادا چودھری احمد نواز کی تھی۔

چودھری رب نواز کی قبر کو پہلو کی طرف سے بڑے ماہرانہ انداز میں کھودا گیا تھا۔ لگتا تھا، کھدائی کرنے والے کو کسی خاص شے کی تلاش تھی اور وہ اپنی اس تلاش میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوا تھا۔

میں نے کفن میں لپٹی ہوئی چودھری کی لاش کا بھی الٹ پلٹ کر تنقیدی نظر سے جائزہ لیا۔ کفن کی بندشیں اپنی جگہ موجود تھیں اور کفن کے اندر لاش بھی محفوظ تھی۔ قبر کھودنے والے نے لاش کی قطعاً بے حرمتی نہیں کی تھی جس سے یہ خیال باطل ہو جاتا تھا کہ کوئی شخص کالے پیلے عمل کے لیے لاش کی ہڈیاں حاصل کرنے قبرستان میں گھسا تھا۔ ویسے اس بات کا اندازہ مجھے اسی وقت ہو گیا تھا جب چودھری علی نواز نے تھانے آ کر اپنے والد کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے افسوس ناک واقعے کی اطلاع دی تھی۔ جادو ٹونے اور سفلی عملیات میں استعمال ہونے والی ہڈیاں عموماً ان قبور میں سے حاصل کی جاتی ہیں جن میں دفن ہونے والی لاشوں کو وہاں سکونت اختیار کیے کافی عرصہ گزر چکا ہو۔ اس دوران میں لاشوں کا گوشت کیڑے مکوڑوں کا رزق بن چکا ہو اور شہر خموشاں کی ان سنسان اور سناٹے دار کوٹھڑیوں میں صرف ان کی چند ہڈیاں باقیات کی صورت رہ گئی ہوں۔

قبر کے تفصیلی جائزے کے بعد میں نے چودھری علی نواز سے کہا۔ ''چودھری جی! آپ اپنے والدِ محترم کی کفن بردار لاش کو ٹھیک ٹھاک کر کے قبر کو بند کروا دیں۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔''

اس جائزے نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در کھول دیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں علی نواز سے بالکل علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ میرے تسلی بھرے جملے کے جواب میں اس نے کہا۔

''ملک صاحب! قبر تو ظاہر ہے، میں بند کروا دیتا ہوں لیکن آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ میں اس بدبخت کو عبرتناک انجام سے دوچار ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں جس نے اباجی کی قبر کے ساتھ ایسا گھناؤنا مذاق کیا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو اور حوصلہ رکھو.....'' میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میں ادھر گورکن کے کمرے کے پاس جمع افراد سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ تم اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ادھر ہی آ جانا۔ انشاءاللہ! بہت جلد وہ نامراد قانون کے شکنجے میں ہوگا جس نے اندھیری اور برساتی رات کی آڑ میں چودھری رب نواز کی قبر کے ساتھ یہ مذموم کارروائی کی ہے۔''

گورکن حیات بخش کا کمرا قبرستان کے داخلی حصے میں ایک جانب بنا ہوا تھا۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے چودھریوں کے ذاتی قبرستان کی طرف راستہ جاتا تھا — گورکن اور چودھری کے دونوں حواری قبر کو ''ٹھیک'' کرنے میں مصروف ہو گئے اور میں اس دوران میں وہاں موجود افراد سے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔

جب میں ان لوگوں کی جانب بڑھ رہا تھا تو میں نے خاص طور پر ایک بات نوٹ کی اور وہ یہ کہ ایک دراز قامت شخص بڑی سرعت کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ اس کے انداز میں بڑا اضطرار پایا جاتا تھا۔ وہ ان افراد میں شامل تھا جو اس واقعے کی حقیقت جاننے کے لیے قبرستان کے داخلی حصے میں اکٹھے تھے۔ میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ وہ بندہ مجھے اس طرف بڑھتے دیکھ کر کھسک لیا تھا۔ اس کی یہ پراسرار حرکت میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی۔

میں نے پندرہ بیس منٹ میں ان لوگوں کو فارغ کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ سب نے ملتا جلتا بیان دیا تھا اور ان کے بیانات میں ایسی کوئی بات یا اشارہ نہیں ملتا تھا جس کی مدد سے میں قبر کھودنے والے تک رسائی حاصل کر سکتا۔ انہی میں شامل ایک پکی عمر کے شخص سے میں نے پوچھا۔

''معراج دین! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم لوگوں میں ایک لمبے قد کا آدمی بھی موجود تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ کیا وہ چلا گیا ہے؟''

اس شخص کی پراسرار رخصتی مجھے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ معراج دین نامی اس بوڑھے نے آنکھیں سکیڑیں اور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ اچھو کی بات تو نہیں کر رہے.....؟''

''مجھے اس کا نام معلوم نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں کہا۔ ''جب میں قبرستان میں داخل ہوا تھا تو وہ آپ لوگوں کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ لمبا قد، سانولی رنگت اور بھاری بدن۔ اس کے سر کے بال بھی کافی حد تک اڑ چکے ہیں۔''

''جی، وہ اچھو ہی ہے۔'' معراج دین کے بجائے ایک نوجوان نے تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ ''آپ نے جو حلیہ اور قد کاٹھ بتایا ہے وہ اسلم عرف اچھو ہی کا ہے۔ صرف ایک خاص نشانی آپ نے چھوڑ دی ہے۔''

''کون سی نشانی بھئی؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''اچھو کے چہرے پر ماتا (چیچک) کے نشان ہیں اور یہی اس کی سب سے بڑی شناخت ہے۔''

''اوہ.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''میں نے اسے خاصے فاصلے سے دیکھا تھا، شاید اسی لیے اس کے چہرے کے داغ مجھے نظر نہ آ سکے۔ بہرحال.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھو کہاں چلا گیا ہے؟''

''اس نے کچھ بتایا تو نہیں جناب۔'' اسی نوجوان نے جواب دیا۔ ''لیکن ظاہر ہے، وہ گاؤں کی طرف ہی گیا ہوگا۔''

''کیا اچھو بھی بخشی پور کا رہنے والا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جی ہاں، وہ بھی ادھر ہی رہتا ہے۔''

معراج دین نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تھانے دار پتر! کچھ پتا چلا، کس نامراد نے بڑے چودھری صاحب کی قبر کو کھولا ہے؟''

''ابھی تو تفتیش کا آغاز ہوا ہے بزرگو!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انشاء اللہ! بہت جلد حقائق سامنے آ جائیں گے۔''

''پتا نہیں، اس کمینے کو کس شے کی تلاش تھی۔'' معراج دین نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیسا برا زمانہ آ گیا ہے۔ زندہ تو زندہ، لوگ مرنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔''

یہ آج سے کم و بیش نصف صدی پہلے کا واقعہ ہے۔ معراج دین ایک مخصوص واقعے کی وجہ سے زمانے کو برا کہہ رہا تھا۔ گویا لوگوں کی نظر میں، ہر دور میں زمانہ اچھا برا رہا ہے حالانکہ بڑے بزرگ فرماتے ہیں زمانے کو کبھی برا نہیں کہنا چاہیے۔

جس نوجوان نے اسلم عرف اچھو کے غیاب کا مسئلہ حل کیا تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ اچھو کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟''

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''کوئی خاص بات نہیں جوان۔ جب میں قبرستان پہنچا تھا تو وہ بھی تم لوگوں کے ساتھ ادھر کھڑا تھا۔ اب جو اسے غیر حاضر پایا تو اس کے بارے میں پوچھ لیا۔''

وہاں پر موجود لوگوں میں کسی کو اور کوئی سوال کرنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اسی وقت چودھری علی نواز اپنے حواریوں اور گورکن کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ چودھری رب نواز کی قبر کو ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا تھا۔ چودھری کو آتے دیکھ کر سب لوگ باادب باملاحظہ ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر چودھری سے کہا۔ ''یہاں موجود لوگوں کے بیانات میں نے لے لیے ہیں لیکن کام کی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ اب گورکن کا بیان اور آپ سے بات چیت باقی ہے تب ہی صورت حال واضح ہوگی۔''

''میں نے ابا جی کی قبر تو بند کروا دی ہے۔'' چودھری علی نواز نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اور حیات بخش کے ساتھ یہاں ایک بندھے کی ڈیوٹی بھی لگا دوں گا جو خاص طور پر ہمارے خاندانی قبرستان کی نگرانی کرے گا تاکہ اس بدبخت کو ادھر جھانکنے کی دوبارہ جرأت نہ ہو بلکہ.....'' وہ چونکنے والے انداز میں متوقف ہوا پھر مجھ سے کہنے لگا۔

''بلکہ میں تو کہتا ہوں، آپ ایک سپاہی کو ادھر متعین کر دیں۔ قانون کے رکھوالے کی موجودگی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکے گی۔''

''چودھری جی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے سو فیصد یقین ہے، اب آپ کے ابا جی کی قبر کے ساتھ ایسی کارروائی نہیں دہرائی جائے گی لہٰذا کسی سپاہی کی یہاں ڈیوٹی لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ویسے بھی میرے پاس نفری بہت کم ہے۔ میں صرف تین سپاہیوں اور ایک حوالدار کی مدد سے یہ تھانہ چلا رہا ہوں۔''

اس نے عملے کی کمی اور تھانے کے معاملات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ کو کس بنا پر یہ پختہ یقین ہے کہ ابا جی کی قبر کے ساتھ آئندہ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی؟''

''اس بنا پر کہ.....'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''وہ نامراد جس شے کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور اس نے چودھری رب نواز کی قبر کو کھودا تھا، وہ مقصد اور شے اسے حاصل ہو گئی ہے لہٰذا دوبارہ اس کے ادھر پھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''آپ..... کس مقصد..... کس شے.....کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنے ذہن میں موجود خدشات کو الفاظ کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جامہ پہنا کر چودھری کے سامنے کھڑا کر دیا تھا لیکن اس کی الجھن پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ حالات و واقعات کی روشنی اور مائی سگی کے بیان کے تناظر میں یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ کسی شخص نے قبر میں سے کوئی خاص شے حاصل کرنے کے لیے قبر کو ایک مخصوص انداز میں، پہلو کی جانب سے کھودا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ تدفین کے وقت چودھری رب نواز کی قبر میں اس کی لاش کے ساتھ کوئی اہم شے بھی دفن کی گئی تھی۔ مائی سگی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے نلکے پر پاؤں دھونے والے مردے کے پاس ایک تھیلا بھی تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ شے اس لاش نے اسی تھیلے میں چھپا رکھی تھی لیکن چودھری علی نواز کی لاعلمی اور بے خبری مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی اگر کسی اہم چیز کو چودھری رب نواز کی لاش کے ساتھ قبر میں رکھا گیا تھا تو چودھری علی نواز اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے چودھری علی نواز کے سوالات کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چودھری جی..... یہ اتنا اہم اور سنگین معاملہ ہے کہ یہاں کھڑے کھڑے اس پر بات نہیں ہو سکتی۔ آپ حویلی میں جائیں، میں گورکن کا انٹرویو کر کے ادھر ہی آ جاتا ہوں پھر ہم بیٹھ کر تسلی سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔''

علی نواز نے کوئی اعتراض کرنا ضروری نہ سمجھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب..... آپ گورکن کو جلدی نمٹا کر حویلی آ جائیں، میں بڑی شدت سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

میں نے گورکن حیات بخش کو ہاتھ سے پکڑا اور اس کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

بادل تو آسمان پر صبح ہی سے موجود تھے اور دن کے پہلے حصے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہوئی تھی لیکن بارش کھل کر نہیں برس سکی تھی اور اس بات کے اغلب آثار نظر آ رہے تھے کہ کسی بھی وقت دھواں دھار بارش کا آغاز ہو سکتا تھا۔ اسی برساتی احتیاط کے پیش نظر میں گورکن کے ساتھ کمرے کے اندر آ بیٹھا۔

اس کمرے میں اٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے کے لیے جو سامان موجود تھا، اس میں ایک چارپائی، ایک اسٹول نما چھوٹی میز اور ایک موڑھا شامل تھا۔ حیات بخش نے اپنے کندھے پر پڑی چادر کو اتارا اور جلدی سے مذکورہ موڑھے کو جھاڑ دیا۔ مطلب یہی تھا کہ مجھے اس موڑھے پر بیٹھنا ہے۔ میں نے حیات بخش کی فرمائش پوری کر دی اور چوکنا نظر سے اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

وہ دس بائی پندرہ فٹ کا ایک مستطیل کمرا تھا جس کے ایک حصے میں تدفین سے متعلق ساز و سامان رکھا دکھائی دیتا تھا جس میں کدال، کسی، بیلچہ اور اسی نوعیت کے دیگر آلات شامل تھے جو مُردوں کی قبروں کی کھدائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ کمرے کے اسی حصے کے ایک کونے پر دیوار میں اوپر تلے دو تین دو چھتیاں بنی ہوئی تھیں جن پر چند برتن سجے نظر آ رہے تھے۔ یہ حیات بخش کے روزمرہ کے استعمال کے برتن تھے۔ چھوٹی میز پر ایک گلاس اور پانی والا جگ بھی رکھا دکھائی دیا۔ ان اشیا کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد میں نے اپنی توجہ حیات بخش پر مرکوز کر دی اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ادھر چارپائی پر بیٹھ جاؤ.....!'' اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

حیات بخش کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے بالکل ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ عموماً گورکن ہوا کرتے ہیں۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے اسی قبرستان میں قیام پذیر تھا، وہ چارپائی پر بیٹھنے کے بعد سہمی ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

چودھری علی نواز نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے گورکن سے خاصی کڑی پوچھ تاچھ کی تھی۔ گورکن کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ مجھ سے بھی اسی قسم کی توقع کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی تسلی کی خاطر اس کی توقع پر پانی پھیرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''چاچا! تمہیں اس قبرستان میں ڈیوٹی دیتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور جواب دیا۔

''کوئی پچیس تیس سال ہو گئے ہیں سرکار۔''

''اس طویل عرصے میں تم نے درجنوں بلکہ سیکڑوں مردوں کو مٹی میں اتارا ہو گا؟'' میں نے کھوجتی ہوئی نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''کبھی گنتی نہیں کی مائی باپ۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''بس اندازہ ہے کہ سو سے تو اوپر ہی مُردوں کو دفنا چکا ہوں۔''

''اور اب تک تم نے کتنے مُردوں کو زندہ کیا ہے؟''

میرے اس سوال پر وہ سٹپٹا کر رہ گیا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''جناب! میں کسی مردے کو کس طرح زندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرسکتا ہوں۔''

''تمہارا نام حیات بخش ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یعنی زندگی دینے والا.....''

''سرکار..... آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ صرف نام حیات بخش ہونے سے کیا ہوتا ہے۔'' وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ''یہ صلاحیت تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیامبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دے رکھی تھی۔ میں نے سنا ہے، وہ مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔''

میں نے ہلکی پھلکی گفتگو سے حیات بخش کے خوف اور سراسیمگی کو دور کر دیا تھا اور میرا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ بلاخوف وخطر مجھ سے بات کرسکے تاکہ مجھے تفتیش کو آگے بڑھانے میں خاطر خواہ مدد ملے۔ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، حیات بخش! ہم مُردوں کو زندہ کرنے والا موضوع چھوڑ دیتے ہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس پچیس تیس سالہ ڈیوٹی کے دوران تم نے کبھی کسی مردے کو قبر میں سے نکل کر قبرستان سے باہر جاتے دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب.....'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے.....؟''

''یہ پچھلی رات میں ہو چکا ہے حیات بخش۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ..... آپ کس مُردے کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے اس مُردے کا نام اور قبر کا مقام تو معلوم نہیں لیکن اسی گاؤں کے ایک معتبر فرد نے اسے قبرستان سے نکل کر چھوٹی نہر کی سمت جاتے دیکھا تھا۔ اس مردے نے اپنے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی اٹھا رکھا تھا.....؟''

''آپ..... شاید اس بندے کا ذکر کر رہے ہیں جس نے پچھلی رات بڑے چودھری صاحب کی قبر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''گاؤں کے کس بندے نے اسے دیکھا تھا؟''

''کس نے دیکھا اور کس نے نہیں دیکھا، اس بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری بات کو درست مان لیتا ہوں کہ جس کسی نے اس بندے کو چلتا پھرتا مُردہ سمجھا وہ درحقیقت مردہ نہیں بلکہ وہ شخص تھا جس نے پچھلی رات چودھری رب نواز کی قبر کی بے حرمتی کی ہے، تم.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے بتاؤ کہ اس شخص نے تھیلے میں کیا چھپا رکھا تھا؟''

''یہ..... میں..... میں..... کیسے بتا سکتا ہوں.....!''

''تم سے زیادہ بہتر انداز میں کوئی اور نہیں بتا سکتا حیات بخش!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ آپ..... کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار جی.....؟''

''حیات بخش! تم اس قبرستان کے گورکن ہو۔'' میں نے اٹل انداز میں کہا۔ ''ہو یا نہیں..... جواب دو؟''

''ہوں جی.....'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ایسے عجیب وغریب سوالات اس سے کیوں پوچھ رہا ہوں۔ اس کے ذہن کی الجھن آنکھوں اور چہرے سے ہویدا تھی۔ میں نے اس کی پریشانی کو قدرے کم کرنے کی غرض سے پوچھا۔

جب سالہا سال سے اس قبرستان کے گورکن تمہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا، تمہارے سوا کوئی اور شخص یہاں تدفین کا کام نہیں کرتا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں، آپ بجا فرما رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں الجھن باقی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حیات بخش! پچھلی رات جس انداز میں کسی شخص نے چودھری رب نواز کی قبر کو پہلو سے کھود کر یہ کارروائی کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص کسی خاص شے کی تلاش میں قبرستان پہنچا تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق، وہ خاص شے بڑے چودھری کی قبر میں موجود تھی۔ اس نے چودھری کی قبر کھود کر اپنی مطلوبہ شے حاصل کی اور اسے تھیلے میں رکھ کر نو دو گیارہ ہوگیا..... کیا تمہارا ذہن اس انداز میں نہیں سوچتا؟''

''وہ جی.....'' وہ لکنت زدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''میں نے دن میں چھوٹے چودھری صاحب کو پوری تفصیل سنا دی ہے۔ رات کو بارش کی وجہ سے میں باہر نہ سو سکا اور کمرے میں چارپائی بچھا ہی پھر ایسی پکی آنکھ لگی کہ مجھے کچھ خبر نہ ہوئی، کون قبرستان میں گھسا اور کب یہ کارروائی کر کے.....!''

''میں نے تم سے یہ تفصیل پوچھی ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔'' میں نے اس کا بیان مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''میں نے دیکھنے کی نہیں بلکہ سوچنے کی بات کی ہے۔ پچھلی رات قبرستان میں کون آیا، کیوں آیا اور اس نے چودھری رب نواز کی قبر کے ساتھ کیا کیا، ان معاملات کو ذہن سے نکال دو۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارا ذہن اس انداز میں نہیں سوچتا جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا ہے؟''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی..... آپ کہہ تو بالکل ٹھیک رہے ہیں۔ میں بھی کچھ ایسا ہی سوچنے پر مجبور ہوں۔''

''اگر میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں اور تم میرے ہم خیال بھی ہو تو.....'' میں نے اپنے مقصد کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر یہ بات بھی تمہیں بتاؤ گے کہ اس قبر میں چودھری رب نواز کی لاش کے علاوہ ایسا کیا دفن کیا گیا تھا جس کے حصول کے لیے کسی نامعلوم اجنبی چور نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم اس قبرستان کے گورکن ہو۔ کوئی شے تمہاری نظر سے چھپا کر کسی قبر میں دفن نہیں کی جاسکتی۔ میں سچ سننا چاہتا ہوں..... صرف سچ!''

اس نے اضطراری نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا۔

''تھانے دار جی! وہ بات دراصل یہ ہے کہ بڑے چودھری صاحب کی وصیت کے مطابق چھوٹے چودھری جی نے لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا بھی لاش کے ساتھ ہی قبرستان میں دفن کیا تھا۔ میں نہیں جانتا، اس ڈبے کے اندر کیا تھا لیکن.....!'' وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگیا۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا حیات بخش.....؟''

''تھانے دار جی! وہ ڈبا قبر میں سے غائب ہوچکا ہے۔ چھوٹے چودھری صاحب بہت اچھے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے، وہ ڈبا اسی بندے نے چرایا ہے جس نے پچھلی رات بڑے چودھری صاحب کی قبر کے ساتھ کارروائی کی ہے۔'' وہ مضمحل انداز میں بتا رہا تھا۔

چودھری علی نواز جب اپنے باپ کی قبر کو دوبارہ ٹھیک ٹھاک کروا کے میرے پاس آیا تو اس کی آنکھوں میں مجھے بے پناہ پریشانی اور الجھن نظر آئی تھی جیسے اس کی کوئی بہت ہی قیمتی اور عزیز ترین چیز کھو گئی ہو۔'' حیات بخش گورکن کے انکشاف کے بعد واضح ہوگیا کہ اس کی پریشانی کا سبب کیا تھا۔ ظاہر ہے، اس چوٹی ڈبے کی قبر میں غیر موجودگی نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے لیکن میری سوچ اس نقطے پر آکر تھم گئی کہ آخر اس ڈبے کے اندر ایسی کون سی اہم شے رکھی گئی تھی؟

اسی تناظر میں، میں نے گورکن سے سوال کیا۔

''حیات بخش! میں نے مان لیا کہ تم نہیں جانتے، لکڑی کے اس ڈبے کے اندر کون سی قیمتی شے رکھی گئی تھی مگر چودھری علی نواز کو تو اس کی پوری خبر ہوگی۔''

''ظاہر ہے جی..... خبر تو ہونی چاہیے!'' گورکن نے گول مول جواب دیا۔

میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''چودھری علی نواز نے مجھے اس ڈبے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ خیر میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا اس کی حویلی جاؤں گا پھر اس موضوع پر بھی بات ہوجائے گی۔''

''ہوسکتا ہے، چودھری صاحب سب کے سامنے بات نہ کرنا چاہ رہے ہوں۔'' حیات بخش نے خیال آرائی کی۔ ''جب آپ حویلی جا کر تنہائی میں ان سے بات کریں گے تو وہ آپ کو اس ڈبے کے حوالے سے کچھ ضرور بتائیں گے۔''

''ہاں..... یہ ہوسکتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے مزید چند سوالات کے بعد اسے فارغ کردیا اور اس تاکید کے ساتھ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ ''حیات بخش! آج رات اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنا۔ یہ نہ ہو کہ.....؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر رہیں تھانے دار جی..... آج کی رات تو میں جاگ کر گزاروں گا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد قبرستان کا چکر بھی لگاتا رہوں گا۔''

میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ رات بھر جاگنے یا قبرستان کے چکر لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ قبر کھودنے والے کو جس شے کی تلاش تھی وہ حاصل کر کے جاچکا تھا اور دوبارہ قبرستان میں قدم رکھنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ قبرستان اب اس کے لیے چوہا پکڑنے والا ایک پنجرہ بن چکا تھا اگر وہ ادھر کا رخ کرتا تو اس کی گرفتاری یقینی تھی۔ میں گورکن کے کمرے سے نکلا تو منصب علی میرا منتظر تھا۔ منصب علی، چودھری علی نواز کے ان دو حواریوں میں سے ایک تھا جو اس کے ہمراہ تھانے پہنچے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ بڑے ادب سے میرے قریب آیا اور کہا۔

''تھانے دار جی! اگر آپ فارغ ہوگئے ہوں تو حویلی چلتے ہیں۔''

اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ چودھری علی نواز ہی اسے یہاں متعین کر گیا تھا۔ میں نے اس کی ہمراہی میں قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھئی..... چلو حویلی۔ چودھری علی نواز تو حویلی پہنچ ہی گیا ہوگا۔''

''جی ہاں..... چودھری صاحب تو اسی وقت دلدار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ حویلی کی طرف چلے گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''اور تمہیں یہاں میرے لیے چھوڑ گئے تھے؟'' میں نے ٹکڑا لگایا۔

''جی.....!'' اس نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

چودھری کی حویلی بھی بخشی پور گاؤں کے اندر ہی واقع تھی لہٰذا ہمیں وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں چند منٹ ہی لگے تھے۔ اس مختصر سے سفر کے دوران میں، میں نے منصب علی سے اسلم عرف اچھو کے بارے میں بھی چند سوالات کیے۔ چیچک زدہ چہرے والا وہ شخص میری یادداشت سے چپک کر رہ گیا تھا۔ کسی بھی کیس کی تفتیش کے دوران میں، میں اپنی آنکھوں اور کانوں کو خاص طور پر کھلا رکھتا ہوں اور ماحول میں رونما ہونے والا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی میری نگاہ سے اوجھل نہیں رہتا۔ اچھو مجھے دیکھ کر جس پراسرار اور مشکوک انداز میں جائے وقوعہ سے کھسک لیا تھا اس نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔ میرے اور منصب علی کے درمیان کچھ اس نوعیت کے سوال و جواب ہوئے۔

''منصب علی کیا تم اچھو کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی بالکل جانتا ہوں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی

''آپ اسی اچھو کی بات کر رہے ہیں نا جو چیچک کا مارا ہوا ہے؟''

''ہاں، ہاں، وہی۔'' میں نے تصدیقی لہجے میں کہا۔

''میں نے اچھو کو ادھر قبرستان میں دیکھا تھا۔ یہ شخص مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''واقعی یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے اسی لیے چودھری صاحب نے اسے دھتکار دیا تھا۔''

''دھتکار دیا تھا.....؟'' میں نے چونک کر منصب علی کی جانب دیکھا۔ ''تم کس چودھری کی بات کر رہے ہو..... چھوٹے یا بڑے؟''

''میں چھوٹے چودھری صاحب کی بات کر رہا ہوں جی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چودھری علی نواز اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے اس لیے انہوں نے اسے خود سے دور کر دیا تھا۔''

''لیکن کیوں.....؟'' منصب علی کے انکشافات میری دلچسپی کو بڑھا رہے تھے۔ ''اس ناپسندیدگی یا دھتکارنے کا سبب کیا تھا؟''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بتانے لگا۔

''کسی زمانے میں، میں اور اچھو بڑے چودھری صاحب کی خدمت میں ہوا کرتے تھے بلکہ صحیح معنوں میں وہی بڑے چودھری صاحب کا خدمتگار تھا۔ میں تو اس کے نائب کے عہدے پر فائز تھا۔ البتہ چھوٹے چودھری صاحب مجھے بہت قریب رکھتے تھے پھر جب بڑے چودھری صاحب اپنی عمر کے آخری دنوں میں بیمار رہنے لگے تو چھوٹے چودھری صاحب نے بڑی صفائی سے اچھو کو الگ کر دیا اور دلدار حسین کو اپنے قریب کر لیا۔ اب اچھو کا حویلی یا چودھری خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے حویلی کے اندر قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں البتہ یہ ادھر بخشی پور ہی میں رہتا ہے۔ آج کل میں اور دلدار حسین چودھری علی نواز کے دو بازو ہیں۔ وہ ہم دونوں پر پورا بھروسا کرتے ہیں۔''

''ہوں.....'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کسی حویلی کا اندرونی انتظام و انصرام ہو یا کسی سلطنت کے اندرونی معاملات، سیاسی کرتب بازیوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ بادشاہ سلامت کی سلامتی جب مختلف نوعیت کے محلاتی خطرات میں گھر جاتی ہے تو وفاداریوں کی تبدیلیوں کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جن وفاداریوں میں لچک نہیں ہوتی اور ولی عہد کے لیے کسی بھی پریشانی کا باعث تنبتی نظر آ رہی ہوں، انہیں دودھ کی مکھی کے مانند خاموشی سے نکال کر دور پھینک دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اسلم عرف اچھو کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا.....!

اور.....اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ اچھو میرے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل کسی وقت خاموشی کے ساتھ اچھو کو تھانے بلا کر نہایت ہی خفیہ انداز میں اس کا ''انٹرویو'' کروں گا۔ مجھے امید تھی کہ میری یہ کوشش ہرگز ہرگز رائگاں نہیں جائے گی۔ میری چھٹی حس مجھے اس بات کا یقین دلا رہی تھی۔

☆☆☆

چودھری علی نواز نے ایک کمرے میں بند ہو کر مجھ سے ملاقات کی۔ ہم دونوں کے سوا اس کمرے میں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ وہ اس واقعے پر غصے اور انتقام سے بھرا بیٹھا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میں جلد از جلد اس کے مجرم کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکا دوں۔ میں نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور آخر میں کہا۔

''علی نواز! جب تک تم دل سے تعاون کے لیے تیار نہیں ہو گے، میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔''

''دل سے تعاون.....!'' وہ الجھن بھرے انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ میری تو خواہش یہ ہے کہ ابھی اور اسی وقت اس مردود کو پکڑ کر ٹانگ دوں.....آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''معلومات اور حقائق کو بالکل درست انداز میں مجھ تک پہنچانے کے تعاون۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے کوئی بات بھی نہ چھپاؤ.....!''

''میں نے آپ سے کیا چھپایا ہے ملک صاحب!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں چند لمحات تک ٹھہری ہوئی نظر سے چودھری علی نواز کے چہرے کو تکتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''چودھری جی! جس انداز میں چودھری صاحب کی قبر کو کھودا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے اس شخص کو کسی خاص شے کی تلاش تھی اور وہ اپنی تلاش میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی قبرستان سے رخصت ہوا ہے۔ چودھری علی نواز! آپ اچھی طرح جانتے ہو، میں کون سی خاص شے کا ذکر کر رہا ہوں.....؟''

''تو اس کا مطلب ہے، آپ کو اس بکس کی خبر ہوگئی ہے.....!'' وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔

''چودھری جی! بات چھوٹی ہو یا بڑی، زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہ سکتی۔'' میں نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''کیا ہی اچھا ہوتا، بکس والی یہ بات تمہاری زبان سے مجھ تک پہنچتی۔''

''میں آپ کو بتانے ہی والا تھا.....'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن اس کا موقع ہی نہیں ملا پھر میں نے سوچا کہ آپ حویلی آئیں گے تو اس موضوع پر کھل کر بات ہوگی۔''

میں نے اسے شرمندہ کرنے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چودھری جی! اب تو میں حویلی کے اندر تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ لکڑی کے اس بکس کا کیا راز ہے، اسے چودھری رب نواز کی قبر میں لاش کے ساتھ کیوں دفن کیا گیا تھا اور یہ کہ..... ایسی حرکت کون شخص کر سکتا ہے؟''

''آپ نے تو ملک صاحب..... ایک ہی سانس میں اتنے سوالات کر ڈالے ہیں کہ میرا دماغ ہل کر رہ گیا ہے۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''سوچنا پڑے گا کہ جواب کا سلسلہ کہاں سے شروع کروں.....!''

''زیادہ الجھنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے چودھری جی!'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''مجھے کسی بات کی جلدی نہیں ہے۔ آپ سوچ سمجھ کر اطمینان سے جواب دو، میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

وہ چند لمحے خاموش رہ کر ایسا ظاہر کرتا رہا کہ جیسے ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔

چودھری علی نواز کے مطابق، لکڑی کا وہ منقش بکس چودھری رب نواز نے اپنی موت سے تھوڑی دیر پہلے اس کے حوالے کیا تھا اور اس بات کا وعدہ لیا تھا کہ مذکورہ بکس کو اس کی لاش کے ساتھ ہی قبر میں دفن کیا جائے۔ اس وعدے کو متوفی نے اپنی وصیت کا نام دیا تھا۔ علی نواز نے جب یہ پوچھا کہ ابا جی، اس بکس کے اندر کیا ہے تو متوفی نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ تمہاری ماں مرحومہ صابرہ بی بی کی ایک نشانی ہے اس کے اندر اور میں چاہتا ہوں، وہ نشانی جسے میں نے سالہا سال سے سنبھال رکھا ہے، وہ میرے ساتھ ہی قبر میں جائے۔

چودھری علی نواز نے اپنے باپ کی وصیت کے عین مطابق اس بکس کو چودھری رب نواز کی قبر میں، لاش کے ساتھ ہی رکھوا دیا تھا۔ مذکورہ بکس کی پیمائش لمبائی آٹھ انچ، چوڑائی چار انچ اور اونچائی تین انچ تھی۔ وہ ایک منقش بکس تھا۔ کسی بڑھئی نے بڑی دلجمعی سے اسے تیار کیا تھا۔

علی نواز خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''چودھری جی! تم نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق اس منقش بکس کو قبر میں دفن تو کروا دیا تھا لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ بکس اور اپنی والدہ کی کسی اہم نشانی کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی تجسس نہ جاگا ہو اور تم نے اس بکس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش نہ کی ہو۔ تم ایک انسان ہو اور انسانی نفسیات کا اطلاق تم پر بھی برابر ہوتا ہے۔''

وہ جز بز ہو کر متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہتے ہوئے ہچکچا بھی رہا ہے۔ میں نے اس کی ہچکچاہٹ کو حوصلے میں بدلتے ہوئے کہا۔

''علی نواز! تمہاری پہلی اور آخری خواہش یہ ہے کہ جس شخص نے تمہارے باپ کی قبر کے ساتھ کھلواڑ کیا ہے، وہ جلد از جلد حوالات کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئے۔ یہ اسی صورت ممکن ہے کہ مجھے پتا ہو، اس بکس کے اندر کیا تھا اور اسے چرانے کی ہمت کون کر سکتا ہے.....!''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس بکس کو کھول کر دیکھا تھا اگرچہ یہ ابا جی سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی تھی لیکن میں فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا اور پھر اس بکس پر باقاعدہ کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا ہوا تھا لہٰذا اس سلسلے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔''

''تم نے بکس کو کھول کر دیکھا.....'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا تھا اس کے اندر چودھری جی.....؟''

''بوسکی کا ایک رومال.....!'' وہ انکشاف انگیز انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بولا۔ ''جیسا کہ عام طور پر دستی رومال ہوا کرتے ہیں۔ بوسکی کا یہ رومال چوپرت کر کے بکس کے اندر رکھا ہوا تھا۔''

''تم نے یقیناً اس چوپرتے رومال کو کھول کر بھی دیکھا ہوگا؟''

''جی ہاں..... دیکھا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''بوسکی کا وہ رومال سادہ تھا یا اس پر کوئی کڑھائی وغیرہ بھی ہوئی تھی؟''

''رومال کے عین وسط میں سرخ ریشمی دھاگے کی مدد سے ایک دل کڑھا ہوا تھا۔'' چودھری نے بتایا۔ ''اور رومال کی کناری کو نیلے دھاگے سے تیار کیا گیا تھا۔''

''ہوں.....'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ایک کڑھے ہوئے بوسکی کے رومال کے لیے قبر کو کھود کر لکڑی کے بکس کو چرانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی اور وہ بھی ایک ایسا رومال جو کسی وفا شعار بیوی نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر شوہر کو دیا ہو..... دال میں کچھ نہ کچھ کالا ضرور تھا جو سر دست واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ چودھری علی نواز کی ذات بھی میری نظر میں شک سے پاک نہیں تھی لہٰذا میں نے ٹٹولنے والے انداز میں اس سے استفسار کیا۔

''کیا اس بکس میں رومال کے علاوہ کوئی اور شے بھی موجود تھی؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے گہری نظر سے بکس کا جائزہ لیا تھا۔ اس رومال کے سوا مجھے وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔''

''اور تم نے.....'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اپنے ابا جی کی وصیت کے عین مطابق اس منقش چوبی بکس کو لاش کے ساتھ ہی قبر میں دفن کروا دیا تھا؟''

''جی..... جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے کہا۔ ''اور پھر گزشتہ رات کسی کم بخت نے چودھری رب نواز کی قبر کھود کر وہ بکس نکال لیا اور نو دو گیارہ ہو گیا.....!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ایک معمولی سے رومال کے لیے چوری کا اتنا بڑا اور سنگین اقدام میرے ذہن کے لیے قابل قبول نہیں علی نواز..... یا تو رومال کے علاوہ اس بکس میں اور کچھ بھی تھا..... یا پھر وہ کڑھا ہوا رومال کسی شخص کے لیے بے پناہ اہمیت کا حامل تھا اگر میں تمہاری بات پر یقین کر لوں کہ بکس میں اور کچھ بھی نہیں تھا تو پھر تمہیں بتانا ہوگا کہ تمہارے باپ کے علاوہ اور کس شخص کی نظر میں اس رومال کی اہمیت تھی..... یہ بات تمہارے سوا اور کوئی شخص بہتر طور پر نہیں بتا سکتا۔''

''جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس بات میں کوئی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ بکس میں صرف وہی رومال رکھا ہوا تھا اگر وہاں کوئی اور شے بھی موجود ہوتی تو میری نظر سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے ابا جی کی خواہش کے احترام میں بکس کو بند کر کے ان کی لاش کے ساتھ قبر میں رکھ دیا تھا اور جہاں تک آپ کے دوسرے خیال کا تعلق ہے.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ معاملہ میری بھی سمجھ سے باہر ہے۔ امی جی کے انتقال کو کئی سال گزر چکے ہیں۔ ابا جی طویل عرصے سے امی جی کی نشانی کو منقش بکس میں سنبھالے بیٹھے تھے۔ ایسا کوئی شخص دور دور تک مجھے دکھائی نہیں دیتا جو کسی بھی حوالے سے اس رومال میں کوئی دلچسپی رکھتا ہو.....!''

اس نے الجھن زدہ انداز میں بات مکمل کی تو میں نے ایک امکانی خیال کے تحت یہ سوال پوچھا۔ ''علی نواز! تمہارے نہیال میں ابھی کون کون باقی ہے، میرا مطلب ہے..... ایسے افراد جن کی عمریں مرحومہ صابرہ بی بی کے آس پاس رہی ہوں؟''

وہ میرے موہوم اشارے کی تہہ میں اتر گیا، جلدی سے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! اس عمر کی ساری کھیپ مٹی میں مل چکی ہے۔ ابا جی آخری آدمی تھے۔ ان سے کئی سال پہلے امی جی کا انتقال ہوا اور ان سے پہلے ان کے ہم عمر مرد اور عورتیں دوسری دنیا میں منتقل ہو چکے تھے۔'' وہ تھوڑا متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ایسی ویسی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی جیسا کہ آپ سوچ رہے ہیں.....!''

''ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہو سکتی.....'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''بکس میں بھی ایسی کوئی قیمتی شے موجود نہیں تھی جس کے حصول کے لیے رات کی تاریکی میں چودھری رب نواز کی قبر کو کھودنے کا جواز سمجھ میں آ سکتا۔ اب آ جا کر ایک ہی زاویہ سمجھ میں آتا ہے۔''

''کون سا زاویہ ملک صاحب؟'' میرے خاموش ہوتے ہی اس نے سوال کر دیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اس صورت حال میں منقش بکس کی ''ذات'' بے پناہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ کیا وہ بکس واقعی لکڑی کا بنا ہوا تھا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''کیا مطلب جی.....؟''

''مطلب یہ کہ.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ مذکورہ بکس کسی قیمتی دھات کا بنا ہوا ہو مثلاً سونے.....!''

میں نے دانستہ پراسرار انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں جناب، وہ بکس لکڑی ہی کا تھا اگر وہ کسی دھات سے بنا ہوتا تو مجھے فوراً پتا چل جاتا۔ لکڑی اور دھات کی بنی ہوئی اشیا کے وزن میں واضح فرق ہوتا ہے، یہ بات تو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں ملک صاحب!''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''حاضر اشاک معلومات کی روشنی میں، میں تفتیش کو آگے بڑھاتا ہوں۔ انشاءاللہ! بہت جلد کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔''

میں نے ''حاضر اشاک'' کے الفاظ ایک خاص مقصد کے تحت ادا کیے تھے اور وہ یہ کہ اگر چودھری علی نواز نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہو تو اس سے پردہ اٹھا دے لیکن کوئی انکشاف کرنے کے بجائے اس نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔

''میں بھی آنکھیں اور کان کھلے رکھوں گا اگر کوئی خاص بات مجھے پتا چلی تو میں فوراً آپ کو بتاؤں گا۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے سرسری سے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہ اچھو کا کیا چکر ہے؟''

''اچھو!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''کیا ہوا اچھو کو..... کیا آپ کا شک اس کی طرف جا رہا ہے.....؟''

''فی الحال تو میرا شک ہر طرف جا رہا ہے.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جب تک اس شخص کا سراغ نہیں مل جاتا جس نے چودھری رب نواز کی قبر کی بے حرمتی کی ہے، میں ہر چہرے کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھوں گا۔ اچھو کے بارے میں، میں نے ایک خاص حوالے سے پوچھا تھا.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے پتا چلا ہے، اچھو بڑے چودھری صاحب کے بہت قریب رہا ہے۔ ایک طویل عرصے تک وہ مرحوم کی خدمت کرتا رہا ہے پھر اسے بالکل الگ کر دیا گیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''خاص وجہ تو کوئی نہیں جناب!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''بس جی، ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ابا جی کے اپنے معاملات تھے۔ انہوں نے اچھو کو کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ اس بات کے لیے میں نے بھی ابا جی کی مخالفت نہیں کی تھی پھر ابا جی بیمار رہنے لگے اور لوگوں سے ان کا ملنا جلنا کم ہوتا چلا گیا۔ ان حالات میں اچھو کا وجود مجھے فضول اور بے کار نظر آنے لگا اور میں نے اسے چلتا کر دیا۔''

''اور اس کی جگہ دلدار حسین کو رکھ لیا.....؟''

''ظاہر ہے جناب، مجھے تو اپنا کام چلانا ہے نا!'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اپنی ضرورت اور سہولت کے تحت دلدار حسین کو رکھ لیا۔''

میں نے تائیدی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس واقعہ کے بارے میں سب سے پہلے مجھے مائی سگی نے اطلاع دی تھی، یہ الگ بات کہ اس کی سوچ ایک مخصوص دائرے میں بند تھی۔ اس کے مطابق کوئی مردہ قبرستان سے نکل کر اس کے گھر کے صحن میں پہنچا تھا، مذکورہ مردے نے اس کے نکلے پر کیچڑ والے پاؤں دھوئے اور قبرستان کی مغربی سمت واقع، چھوٹی نہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ اور علم و عقائد کی روشنی ہی میں کوئی نظریہ یا رائے قائم کرتا ہے۔ مائی سگی نے بھی ایسا ہی کیا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ میں اس کی رائے سے اتفاق بھی کر لیتا، البتہ میں نے اس کے جذبات کا احترام اور اس سے کیے ہوئے وعدے کا پاس کرتے ہوئے کسی بھی شخص سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ آج صبح وہ مجھ سے ملنے تھانے آئی تھی۔

میں نے چودھری علی نواز کو چند ضروریات ہدایات دیں اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ یہاں سے سیدھے تھانے جائیں گے نا؟''

''ہاں علی نواز۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تھوڑی دیر میں شام ہونے والی ہے اور موسم کا بھی کوئی بھروسا نہیں..... اس لیے بہتر یہی ہے کہ تھانے جاؤں۔ ویسے بھی بخشی پور میں تفتیش کے امکانات پر پانی پھر گیا ہے۔''

''کیا مطلب جناب؟'' اس نے حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''چودھری علی نواز! آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ پچھلی رات اور آج دن کے پہلے حصے میں بھی وقفے وقفے سے بارش کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ بڑے چودھری جی کی قبر کو گزشتہ رات کسی وقت کھولا گیا تھا لہٰذا بارش کی وجہ سے اس بات کے امکانات صفر کے برابر ہو کر رہ گئے ہیں کہ کسی کھوجی کی مدد سے قبر کھودنے والا کھرا نکالا جا سکے۔ ویسے.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں کل کسی وقت ادھر کا چکر لگاؤں گا۔ تمہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کرنے کے علاوہ چند لوگوں سے مزید پوچھ گچھ بھی کروں گا۔ مجھے پوری امید ہے، جلد ہی اس شخص کا کوئی سراغ مجھے مل جائے گا جس نے تمہارے باپ کی قبر کی بے حرمتی کی ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب.....!'' وہ متذبذب انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''علی نواز! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، یہ راز اور کس کس کو پتا تھا کہ بڑے چودھری صاحب نے تمہیں مخصوص ہدایات کے ساتھ لکڑی کا کوئی بکس دیا تھا؟''

''انہوں نے بڑی رازداری کے ساتھ وہ بکس مجھے دیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میرے خیال میں یہ بات اور کسی بھی شخص کو معلوم نہیں کہ اس بکس کے اندر کیا تھا اور وہ بکس کس نے مجھے دیا تھا۔''

''لیکن تدفین کے موقع پر تو یہ بات راز نہیں رہی ہوگی۔'' میں نے ایک امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بڑے چودھری صاحب کی لاش کے ساتھ جب وہ بکس بھی قبر میں رکھا گیا ہوگا تو لوگوں کی اس پر نظر تو پڑی ہوگی؟''

''لوگوں کی نہیں..... صرف گورکن کی۔'' وہ پروثوق لہجے میں بولا۔ ''ابا جی کو جب قبر میں اتارا جا چکا تو اس وقت قبر کے اندر صرف میں اور گورکن حیات بخش ہی موجود تھے۔ تدفین کی غرض سے وہاں آنے والے باقی افراد کو میں نے ایک فاصلے تک محدود کر دیا تھا۔ صرف گورکن جانتا ہے کہ میں نے ابا جی کی لاش کے پہلو میں اس منقش چوبی بکس کو بھی دفن کیا تھا۔''

''ہوں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور چودھری علی نواز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''گورکن نے اس بکس کے حوالے سے کوئی تو سوال کیا ہوگا؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس نے ایسی جرأت نہیں کی۔''

''جرأت نہیں کی۔'' کے الفاظ اس نے کچھ ایسے انداز میں ادا کیے تھے جیسے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اگر گورکن حیات بخش ایسی کوئی جسارت کرتا تو وہ پلک جھپکتے میں اس کا سر تن سے جدا کر دیتا.....!

میں نے ٹٹولنے والی نظر سے علی نواز کو دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اگر گورکن اس بکس کے حوالے سے کوئی سوال کرتا تو تم اسے کیا جواب دیتے چودھری؟''

''میں نے اس سلسلے میں ایک ذہن بنا رکھا تھا ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس نوعیت کے سوال کے جواب میں اسے یہی کہتا کہ اس بکس کے اندر مخصوص قسم کی اسلامی دعائیں ہیں جو ابا جی کے سفر آخرت میں آسانی پیدا کرنے کے لیے لاش کے ساتھ دفن کی جا رہی ہیں۔''

میں معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

بعض لوگ تدفین کے وقت کفن میں لپٹی ہوئی لاش کے ساتھ بعض قرآنی اوراق بھی رکھ دیتے ہیں۔ اس تناظر میں چودھری علی نواز کے ذہن نے خاصا زرخیز آئیڈیا سوچا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس آئیڈیا کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی۔

میں چھوٹے چودھری کو تسلی تشفی دینے کے بعد حویلی سے باہر نکل آیا۔ تھانے سے قبرستان تک میں چودھری علی نواز کے تانگے میں بیٹھ کر آیا تھا۔ اس کے دونوں حواری منصب علی اور دلدار حسین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ منصب علی نے کوچوان کے فرائض ادا کیے تھے۔ یہی فرض اسے واپسی کے سفر کے لیے بھی ادا کرنا تھا۔ وہ بچے سجائے تانگے سمیت حویلی کے باہر میرا منتظر تھا۔ میں نے نگاہ دوڑا کر دور دور تک دیکھا مگر دلدار حسین مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں تانگے میں آ کر بیٹھا تو وہ حرکت میں آ گیا۔

چودھری علی نواز کی حویلی گاؤں کے ابتدائی حصے میں واقع تھی لہٰذا ہم جلد ہی گاؤں سے نکل کر اس کچے راستے پر آ گئے جو لگ بھگ ایک فرلانگ کی مسافت پر مشتمل تھا اور بخشی پور نامی گاؤں کو مین روڈ سے ملاتا تھا۔ اسی پختہ سڑک پر میرا تھانہ واقع تھا اگرچہ اس کچے راستے کو حالیہ بارشوں نے کیچڑ اور گارے کا میدان بنا رکھا تھا لیکن میں بہ حفاظت اپنی منزل پر پہنچ گیا۔

جب میں تھانے میں داخل ہوا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی!

☆☆☆

حوالدار حیدر علی بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے اس سے رسمی علیک سلیک کی اور سیدھا اپنے کوارٹر کی جانب بڑھ گیا جو تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔ حیدر علی میرا مزاج آشنا تھا۔ وہ فوراً سے پیشتر سمجھ گیا کہ نماز کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت ہوگیا ہے اور میں اپنے رب کے حضور حاضری لگانے کے بعد ہی اس کے پاس آؤں گا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں میرے کمرے میں بیٹھے تازہ ترین صورتِ حال پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے بخشی پور میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! یہ سارا کھٹ راگ اس چوبی منقش بکس کی وجہ سے پھیلا ہے اگر ہمیں یہ پتا چل جائے کہ مذکورہ بکس کے اندر کیا تھا تو مطلوبہ بندے تک رسائی حاصل کرنے میں بڑی آسانی رہے گی۔''

''اس بکس کے اندر..... جیسا کہ میں نے بتایا ہے، بوسکی کے ایک کڑھے ہوئے رومال کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا..... مرحومہ صابرہ بی بی کی نشانی جو اس نے اپنے شوہر چودھری رب نواز کے لیے چھوڑی تھی اس لیے چودھری اس نشانی کو اپنے ساتھ قبر میں لے جانے کا خواہشمند تھا.....'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا اور خاموش ہوگیا۔

''یہ تو چودھری علی نواز کا بیان ہے نا جی۔'' حوالدار سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ ضروری تو نہیں کہ اس نے سچ ہی بولا ہو۔''

مجھے یہ دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی کہ حیدر علی بالکل میرے انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی سوچ کی مزید پرتیں کھولتے ہوئے کہا۔ ''اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی بھلا؟''

''ملک صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''لکڑی کے کسی چھوٹے سے بکس اور اس میں رکھے ہوئے بوسکی کے کشیدہ رومال کو کوئی شخص کیوں چرائے گا اور وہ بھی برساتی رات کے آخری حصے میں کسی کی قبر کھود کر، نہیں، نہیں.....!'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں اس بکس کو معمولی نہیں سمجھ سکتا ملک صاحب! کسی نہ کسی حوالے سے اس کی اہمیت ضرور ہے، خاص طور پر اس چور کے لیے جس نے گزشتہ رات قبرستان میں چودھری رب نواز کی قبر کے ساتھ کارروائی کی ہے۔''

میں نے اس کی ذہانت کی مزید آزمائش کے لیے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''لیکن مذکورہ بکس کی اہمیت کا اندازہ تو اسی وقت لگایا جاسکتا ہے جب وہ چور بکس سمیت ہماری گرفت میں آجائے۔ سب سے زیادہ ضروری اس چور تک پہنچنا ہے۔''

حوالدار نے میری توقع پر پورا اترتے ہوئے کہا۔ ''چور تک رسائی سے بھی زیادہ ضروری یہ جاننا ہوگا کہ اس بکس کو کس مقصد کے لیے چرایا گیا ہے یعنی بکس کی اہمیت کیا ہے؟''

''لیکن اس سوال کا جواب کون دے گا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے بخشی پور کے حالات بیان کرتے ہوئے حوالدار کو چیچک زدہ چہرے والے اسلم عرف اچھو کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ اس کے دماغ نے درست سگنلز پکڑے اور چونکتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

''میرے خیال میں ہمیں اچھو پر ٹرائل کرنا چاہیے۔ وہ چودھری رب نواز کے بہت قریب رہا ہے..... اس کے رازوں کا امین اور اس کا وفادار.....!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کچھ ایسے تاثر کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا جیسے اس زاویے سے میرے ذہن میں پہلے کچھ نہ ہو حالانکہ..... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں حوالدار کو چیک کرنے کے لیے جو سوالات کر رہا تھا وہ دراصل میری اپنی سوچ تھی۔ وہ میرے الفاظ سے خوش ہوگیا تو میں نے مزید کہا۔ ''حیدر علی! تم کل صبح اس مشکوک بندے اچھو کو پکڑ کر تھانے لے آؤ پھر اس سے پوچھ تاچھ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''یہ کام میرے ذمے رہا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہوجائیں۔''

اور میں واقعی بے فکر ہوگیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے حوالدار حیدر علی کو گاؤں کی طرف روانہ کردیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مائی سکی تھانے پہنچ گئی۔ اس روز مطلع بالکل صاف تھا۔ پچھلی رات تھوڑی دیر کے لیے بوندا باندی ہوئی تھی لیکن صبح ہونے تک یہ سلسلہ رک گیا تھا اور اب آسمان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔

مائی سکی سیدھی میرے کمرے میں آگئی۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور بغور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ آج اس کی آنکھوں اور چہرے پر وہ وحشت اور اجنبھن نظر نہیں آتی تھی جو گزشتہ روز دیکھنے میں آئی تھی تاہم میں نے خاصے شگفتہ لہجے میں اس سے پوچھ لیا۔

''مائی! کیا پچھلی رات کوئی اور مُردہ فرار ہوگیا ہے؟''

اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات نمودار ہوئے، قدرے ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ ''وہ جی.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ کوئی مردہ نہیں تھا۔''

''اچھا.....!'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''وہ کوئی مردہ نہیں تھا تو پھر کون تھا.....اور تمہیں اپنی کس غلطی کا احساس ہو گیا ہے؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ اس رات کسی چور نے بڑے چودھری صاحب کی قبر کو کھولا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ''اڑتی اڑتی میرے کانوں تک پہنچی ہے کہ چھوٹے چودھری جی نے بڑے چودھری صاحب کی لاش کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس بھی دفن کر دیا تھا۔ وہ چور اسی بکس کو چرانے آیا تھا۔ چور نے خود کو سفید لباس میں چھپا رکھا تھا اور جب اس نے میرے نکلے پر پاؤں دھوئے تو میں یہی سمجھی کہ وہ کوئی مردہ ہے۔ اس نے جو تھیلا نکلے سے تھوڑے فاصلے پر رکھا تھا یقیناً چوری شدہ بکس اسی تھیلے میں ہوگا۔ پتا نہیں، بکس کے اندر ایسی کون سی خاص چیز تھی جو چور نے اپنی جان پر کھیل کر یہ کارروائی کی.....!''

بات مکمل کر کے اس نے ایسے انداز میں میری طرف دیکھا جیسے براہ راست مجھ سے سوال کر رہی ہو۔ میں نے قدرے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''تو تم آج یہ جاننے آئی ہو کہ اس بکس کے اندر کیا تھا؟''

''یہ..... یہ تو بس..... ایسے ہی میرے ذہن میں آ گیا۔'' وہ گڑبڑا گئی۔ ''میں تو آپ سے کچھ اور ہی کہنے آئی تھی.....!''

''کیا.....؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظر جما دی۔

اس نے بتایا۔ ''کل آپ تفتیش کے لیے گاؤں آئے تھے۔ آپ نے قبرستان جا کر بڑے چودھری صاحب کی قبر کا معائنہ کیا پھر گورکن سے پوچھ تاچھ کی اور آخر میں حویلی میں جا کر چھوٹے چودھری جی سے بھی ملاقات کی.....!''

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''ہاں، یہ سب تو ہوا تھا لیکن تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مجھ سے کیا کہنے آئی ہو؟''

''وہی تو بتا رہی ہوں جناب!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''وہ بات دراصل یہ ہے کہ اس واقعے کے بارے میں سب سے پہلے میں نے ہی آپ کو بتایا تھا۔ کہیں آپ نے چودھری جی کو تو نہیں بتا دیا تھا۔ میں خوامخواہ کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مائی۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''جب میں نے تم سے کہہ دیا ہے کہ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا تو تمہیں اس سلسلے میں بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم آرام اور سکون سے اپنے گھر میں بیٹھو۔ تھانے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح خوامخواہ تم گاؤں والوں کی نظر میں آ جاؤ گی۔ یہ معاملہ جیسے ہی کسی نتیجے تک پہنچتا ہے، میں تمہیں خود حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔''

اس نے تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے حوالدار بخشی پور سے واپس آ گیا۔ بخشی پور گاؤں اور میرے تھانے کے درمیان صرف ایک فرلانگ کا فاصلہ حائل تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، حیدر علی کو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپس آ جانا چاہیے تھا لیکن اس کی واپسی لگ بھگ چار گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ میرے کمرے میں آیا تو میں نے پوچھ لیا۔

''حیدر علی! میں نے تمہیں بخشی پور بھیجا تھا۔ لگتا ہے تم خانیوال کی طرف نکل گئے تھے، اتنی دیر کیسے ہو گئی؟''

''ملک صاحب! آپ نے مجھے جو ڈیوٹی سونپی تھی، وہ تو پوری کرنا تھی نا۔'' وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ''مطلوبہ بندے تک رسائی حاصل کرنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔''

''تھوڑی دیر.....!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''کیا اچھو بخشی پور میں موجود نہیں تھا؟''

''جی ہاں..... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں جب وہاں پہنچا تو وہ موجود نہیں تھا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کی تو پتا چلا وہ بخشی پور سے باہر گیا ہوا ہے۔ میں خالی ہاتھ واپس آ کر آپ کو کیا منہ دکھاتا لہٰذا وہیں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا پھر جیسے ہی اس نے گاؤں میں قدم رکھا، میں اسے پکڑ کر آپ کے پاس لے آیا ہوں۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ستائشی نظر سے حوالدار کو دیکھنے لگا پھر پوچھا۔ ''وہ نامراد کہاں ہے؟''

''باہر برآمدے میں بینچ پر بیٹھا ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو پیش کروں۔''

''ہاں ضرور..... پہلی فرصت میں اسے میرے سامنے لاؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

حوالدار ''یس سر!'' کہتے ہوئے جانے کے لیے مڑا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''حیدر علی! کیا تم نے اچھو سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ بخشی پور سے باہر کہاں گیا تھا؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ سیدھا پکڑ کر آپ کے پاس لے آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اسے اندر بھیجو!''

''او کے سر.....!'' یہ کہتے ہوئے حوالدار کمرے سے نکل گیا۔

اچھو کل سہ پہر ہی سے میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔ میری نظر میں اس کی ذات شکوک کی دبیز چادر میں لپٹی دکھائی دیتی تھی۔ اب حوالدار کی زبانی جو مجھے یہ پتا چلا کہ وہ گاؤں سے غائب تھا تو ان شکوک وشبہات میں سنسنی خیزی بھی شامل ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد حیدر علی اسے میرے پاس لے آیا۔

اچھو کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ بھاری بدن، درمیانہ قد اور توند باہر کو نکلی ہوئی۔ سر کے بیشتر بال اڑ چکے تھے، وہ پہلے ہی کمزور تھا، اس پر چیچک کے بدنما داغوں نے اس کے چہرے کو ڈراؤنا سا بنا دیا تھا۔ اس زمانے میں چیچک ایک خطرناک اور جان لیوا مرض سمجھا جاتا تھا۔

میں نے اچھو کو لکڑی کی بینچ پر بیٹھنے کو کہا اور حوالدار حیدر علی کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ دراصل، فوری طور پر میرے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا تھا کہ میں جبر، تشدد اور کسی قسم کی سختی کے بجائے اچھو پر ایک نفسیاتی طریقہ آزماؤں گا جس کے لیے تنہائی بہت ضروری تھی اسی لیے میں نے حوالدار کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور مجھے پوری امید تھی کہ میرا یہ نفسیاتی حربہ ضرور کامیاب ہوگا۔

وہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا اور خوف زدہ انداز میں سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے خوف کو کم کرنے کے لیے قدرے نرم لہجے میں سوال کیا۔ ''اچھو! یہ صبح ہی صبح تم کہاں چلے گئے تھے؟''

میرے دوستانہ رویے پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ شاید وہ مجھ سے ایسے سلوک کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ بدقسمتی سے زمانہ کوئی بھی رہا ہو، پولیس کے بارے میں عمومی تاثر خوشگوار نہیں رہا ہے۔ جب کسی شخص کو تھانے بلوایا جاتا ہے تو اس کے ذہن میں پہلا خیال یہی آتا ہے کہ بس، اب اس کی خیر نہیں ہوگی۔ اس میں عوام الناس کا زیادہ قصور نہیں بلکہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا رویہ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ عام لوگوں کو اس سے ڈر محسوس ہونے لگتا ہے۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''جناب! میں صبح نہیں بلکہ کل رات کو رستم آباد چلا گیا تھا۔''

''رستم آباد میں تم کس کے پاس گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

رستم آباد نامی وہ گاؤں میرے تھانے کی حدود ہی میں آتا تھا اور بخشی پور سے محض تین میل کی دوری پر واقع تھا۔ اس نے جواب میں بتایا۔

''جی..... میں ادھر اعوان صاحب سے ملنے گیا تھا۔''

''کون اعوان صاحب؟''

''فیاض اعوان..... جو رستم آباد کے چودھری صاحب ہیں۔''

''تمہیں فیاض اعوان سے کیا کام پڑ گیا تھا؟''

''وہ جی..... بس ویسے ہی.....!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اچھو! بخشی پور کے حالات تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایک دن پہلے چودھری رب نواز کی قبر کے ساتھ جو شرمناک واقعہ پیش آیا تم اس سے پوری طرح واقف ہو، کل سہ پہر کو جب میں قبرستان میں کارروائی کر رہا تھا تو میں نے وہاں تمہیں بھی دیکھا تھا، میں تم سے بھی پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا لیکن تم نہایت ہی خفیہ انداز میں غائب ہوگئے۔ اسی پوچھ تاچھ کے لیے میں نے تمہیں تھانے بلایا ہے، سمجھ رہے ہو نا میں کس حوالے سے بات کر رہا ہوں؟''

''آپ یقین کریں سرکار.....!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''مجھے نہیں پتا کہ بڑے چودھری صاحب کی قبر کے ساتھ کس نے چھیڑ خانی کی ہے.....!''

''تمہیں نہیں پتا تو میں اس چھیڑ خانی کا سراغ خود ہی لگا لوں گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو مجھے معلوم ہو ہی گیا ہے کہ وہ چور چودھری رب نواز کی قبر میں سے کیا چرا کر لے گیا ہے.....؟''

وہ جز بز سا ہو کر رہ گیا۔

اس کا یہ ردعمل میرے شک کو تقویت دینے لگا۔ اصولی طور پر میرے خاموش ہوتے ہی اچھو کو یہ پوچھنا چاہیے تھا..... چور قبر میں سے کیا چرا کر لے گیا ہے؟ اس نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ بکس والے ''راز'' سے بخوبی واقف ہے۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اچھو! تم میرے نرم رویے سے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو جانا۔ اگر تم نے مجھ سے تعاون نہیں کیا تو میں تمہاری کھال کھنچوانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگاؤں گا۔''

اس نے سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھا اور بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مم..... میں نے..... کیا کیا ہے جناب.....!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم نے کچھ کیا ہے یا نہیں، اس کا حساب تو بعد میں کریں گے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم فیاض اعوان سے ملنے کیوں گئے تھے۔ یہ جواب نہیں سنوں گا کہ.....بس ویسے ہی.....؟''

اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں تو ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد اس نے تھکے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔

''تھانے دار صاحب! آپ کو تو پتا ہی ہوگا کہ چودھری صاحب کی زندگی میں، میں ان کے بہت قریب ہوا کرتا تھا..... میں بڑے چودھری صاحب کی بات کر رہا ہوں.....!''

''ہاں، ہاں..... میں سب جانتا ہوں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بڑے چودھری کے خاص خدمت گار تھے اور اس کے ہر راز سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ رب نواز کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ تمہاری نظر سے چھپا ہوا نہیں تھا لیکن اس کی..... زندگی کے آخری حصے میں تمہارے مخالفین کو سازش کا موقع مل گیا اور ان کا وار کارگر رہا..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

میں نے غیر محسوس انداز میں اس کا ''نفسیاتی علاج'' شروع کر دیا۔ اس نے چونک کر دلچسپ نظر سے مجھے دیکھا اور جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔''

''اور اسی سازش کے نتیجے میں.....'' میں نے ڈرامائی رنگ میں کہا۔ ''آج..... دلدار حسین تمہاری جگہ پر نظر آ رہا ہے..... ہے نا؟''

''آپ نے سولہ آنے ٹھیک بات کی ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''میں چھوٹے چودھری کے اسی رویے سے دلبرداشتہ ہو کر اعوان صاحب سے ملنے اُدھر رستم آباد گیا تھا۔ میرا کوئی آگے پیچھے تو ہے نہیں۔ بڑے چودھری صاحب کا سہارا تھا تو ان کے در پر پڑا ہوا تھا۔ اب ادھر بخشی پور میں میری اوقات کسی کتے جیسی ہو کر رہ گئی ہے۔ اعوان صاحب کے پاس اسی لیے گیا تھا کہ اگر وہ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیں تو میں بخشی پور کو خیر باد کہہ کر رستم آباد میں آباد ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''پھر.....!'' اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔ ''فیاض اعوان نے تمہاری عرضی کے جواب میں کیا کہا؟''

''انہوں نے مجھے کہا ہے کہ میں ایک ہفتے کے بعد دوبارہ ان سے ملوں۔'' اچھو نے بتایا۔ ''وہ اس معاملے میں کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔''

''میرے خیال میں تو فیاض اعوان نے بڑی خوبصورتی سے تمہیں ٹال دیا ہے۔'' میں نے اچھو کو گھنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں یہ بات جانتا ہوں کہ چودھری رب نواز اور فیاض اعوان میں کبھی اچھے تعلقات نہیں رہے، بلکہ ایک طرح سے دشمنی ہی رہی ہے۔ اس پس منظر کی روشنی میں تم فیاض کے دشمن کے آدمی ہوئے۔ وہ تمہیں اپنی خدمت میں لینے کو تیار نہیں ہوگا۔''

''اگر بڑے چودھری صاحب زندہ ہوتے تو شاید اعوان صاحب ایسا ہی سوچتے جیسا آپ کہہ رہے ہیں۔'' اس نے عقلمندی کی بات کی۔ ''لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ میں نے اعوان صاحب کو چودھری علی نواز کے رویے کے بارے میں پوری تفصیل سے بتایا ہے اور مجھے بڑی اُمید ہے کہ وہ ایک ہفتے کے بعد میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔''

یہ جاننے کے لیے کہ اچھو راست گوئی کا مظاہرہ کر رہا تھا یا مجھے چکر دینے کی کوشش میں تھا، میں نے اپنے نفسیاتی حربے کا فائنل ٹچ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں میز پر کہنیاں ٹکا کر آگے کو جھک آیا اور سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''اچھو! یہ سچ ہے کہ گزرا ہوا وقت واپس نہیں آتا لیکن اگر تم مجھ سے بھرپور تعاون کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں وقت کے پہیے کو تمہارے لیے الٹا گھما سکتا ہوں.....!''

''جی.....!'' اس کے چہرے اور آنکھوں میں الجھن کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ متذبذب انداز میں بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ایک ایسا فارمولا ہے جس پر عمل کر کے میں تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی پوزیشن دوبارہ دلوا سکتا ہے یعنی دلدار حسین کی چھٹی.....اور تمہاری بحالی.....!''

''لل..... لیکن یہ سب..... کیسے ہوگا.....؟'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ایسے.....!'' میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو بس اتنا بتاؤ کہ تعاون کرو گے؟''

''جناب! میں تو آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میری نظر میں یہ ممکن نہیں..... آپ مجھے سمجھائیں تو سہی، اتنا مشکل کام کیسے ہوگا؟''

''تم نے وہ بوڑھے گھوڑے والی مثال سن رکھی ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''کون سی مثال تھانے دار صاحب.....!'' وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''میں اس مثال کے بارے میں تمہیں بتاتا ہوں اور مجھے یقین ہے، اس کے بعد تم اپنی بحالی اور دلدار حسین کی چھٹی کے حوالے سے ساری بات سمجھ جاؤ گے.....'' میں نے لحاتی توقف کر کے ٹٹولنے والی نظر سے اس کے چہرے اور آنکھوں کا جائزہ لیا۔ جب وہ کچھ نہیں بولا تو میں نے سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کسی زمانے میں ایک گھوڑا بادشاہِ وقت کے استعمال میں تھا۔ جب وہ گھوڑا بوڑھا ہوگیا اور آئے دن بیمار رہنے لگا تو ایک دوسرے درباری گھوڑے نے اس کے خلاف سازش کی اور بادشاہِ وقت کا دل جیت کر اس کے تصرف میں آ گیا۔ اس انقلابی تبدیلی پر بوڑھے گھوڑے کا دل ٹوٹ گیا۔ جب وہ بادشاہ کے استعمال میں نہ رہا تو دربار کو خیرباد کہہ کر جنگل میں آ گیا۔ بادشاہ کا ذاتی گھوڑا ہونے کے ناتے اس کی جو عزت و تکریم تھی، جب وہ باقی نہ رہی تو اس نے کنارہ کشی ہی میں بہتری جانی۔ جنگل میں وہ دلبرداشتہ اور بے کل سا گھوم رہا تھا کہ ایک شیر کی اس پر نظر پڑ گئی۔ اس نے گھوڑے کو اداس اور دل شکستہ دیکھا تو ہمدردانہ انداز میں استفسار کیا۔

''کیا ہوگیا بھئی! ایسے مریل مریل سے کیوں ہو رہے ہو؟''

گھوڑے کو شیر کے دوستانہ رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ حملہ آور ہونے کے بجائے وہ اس کی خیر و عافیت دریافت کر رہا تھا۔ بہرحال گھوڑے نے دلگرفتہ انداز میں اسے اپنی بپتا سنا دی۔ شیر نے اس کی دکھ بھری کہانی سنی تو تسلی آمیز انداز میں بولا۔

''یار! پریشان کیوں ہوتے ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہوجائے گا شیر انکل!'' گھوڑے نے چوکنا انداز میں شیر کی طرف دیکھا۔ ''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔''

اس ''علیک سلیک'' اور ''حال احوال پرسی'' کے دوران میں گھوڑے نے شیر پر بڑی محتاط نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ امکان موجود تھا کہ شیر اسے باتوں میں لگا کر کہیں نرخرے پر چھپٹا نہ مار دے۔ اس کی یہ سوچ عین فطری تھی۔ شیر نے اس کے خدشات کے جواب میں کہا۔

''یہ کام کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو لیکن میں اسے تمہارے لیے آسان بنا سکتا ہوں۔''

''وہ کیسے.....؟'' گھوڑے کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''تمہیں میرے کہے پر عمل کرنا ہوگا۔'' شیر نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

گھوڑے نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، شیر انکل! بتاؤ، کرنا کیا ہوگا؟'' شیر پراسرار لہجے میں گھوڑے کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔

کچھ ہی دیر بعد، شیر کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے وہ دونوں بادشاہِ وقت کے دربار میں حاضر ہوئے اور اس طرح حاضر ہوئے کہ بوڑھے اور کمزور گھوڑے کی چھب ہی نرالی تھی۔ وہ کسی نوجوان اور طاقتور گھوڑے کے مانند چل رہا تھا۔ شیر اس کے ساتھ ساتھ گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔ سب سے لطف والی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ گھوڑے نے شیر کا کان اپنے منہ میں دبا رکھا تھا، دیکھنے میں یہ تاثر ابھر رہا تھا کہ گھوڑے صاحب، شیر کو کسی مریل چوہے کے مانند گھسیٹتے ہوئے دربار میں لا رہے ہیں۔ اس موقع پر شیر نے بڑی لاجواب اداکاری کی اور ہر لمحے خود کو مجبور اور لاچار ظاہر کیا۔

اس منظر نے بادشاہ وقت اور اس کے درباریوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ گھوڑے کے رعب، دبدبے اور طاقت نے وہاں موجود تمام لوگوں کو سانس روکنے پر مجبور کر دیا۔ اس پرفارمنس میں ماسٹر پیس بگھار لگانے کے لیے گھوڑے نے شیر کو بادشاہ کے سامنے پہنچا کر اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ شیر نے سکھ کی سانس لی اور رحم طلب نظر سے گھوڑے کی جانب دیکھنے لگا۔

گھوڑے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''چلو بھاگو یہاں سے..... اب اگر تم نے جنگل میں کوئی مستی کی یا کسی کمزور جانور پر ہاتھ اٹھایا تو اتنا ماروں گا کہ آنے والی سات نسلیں گنجی پیدا ہوں گی۔''

شیر نے سراسیمہ نگاہ سے گھوڑے کی طرف دیکھا، اثبات میں گردن ہلائی اور دم دبا کر وہاں سے فرار ہوگیا۔

اس ناقابلِ یقین منظر نے بادشاہ وقت کو بڑا متاثر کیا۔ وہ گھوڑے کی شہ زوری اور رعب و دبدبے کو مان گیا چنانچہ اگلے ہی لمحے مذکورہ گھوڑے کو اس کی سابق پوزیشن پر بحال کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سازشی گھوڑے کی چھٹی کر دی گئی.....''

یہاں تک بیان کرنے کے بعد میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جس طرح گھوڑے نے شیر کی پلاننگ کے مطابق عمل کیا، اسی طرح اگر تم بھی میرا کہا مان لو تو میں کوشش کر کے تمہیں علی نواز کی آنکھ کا تارا بنا سکتا ہوں پھر سازشی دلدار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حسین کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔''

وہ حیرت، مسرت اور تجسس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! بات کچھ کچھ سمجھ میں آ تو رہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نہ تو آپ شیر ہیں اور نہ ہی میں گھوڑا پھر یہ ڈراما کیوں کر رچایا جائے گا۔ اس بات سے میرا ذہن الجھ رہا ہے۔''

''یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بس تم میری ہدایات پر چپ چاپ عمل کرتے جاؤ، باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا.....؟'' اس کی الجھن میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔

میں نے اچھو کے ساتھ جس نفسیاتی کھیل کا آغاز کیا تھا اب اس کے اختتامی مراحل آن پہنچے تھے۔ کسی لوہار کی زبان میں لوہا گرم ہو چکا تھا.....!

میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اچھو! علی نواز کے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ابا جی کی قبر کو کس نے کس مقصد کے لیے کھولا تھا۔ میں اسی مشن پر کام کر رہا ہوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چودھری علی نواز کے پاس جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ میں نے تمہاری مدد اور نشان دہی سے اس چور کا سراغ لگا لیا ہے جس نے چودھری رب نواز کی قبر کی بے حرمتی کی تھی اور.....''

''لیکن میں تو اس چور اور پتھری والے بکس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا.....'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بے ساختہ بول اٹھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایسے خاموش ہوگیا جیسے اس کی قوتِ گویائی اچانک سلب ہوگئی ہو۔

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''اچھو، تم پتھری والے کون سے بکس کا ذکر کر رہے ہو؟''

''جج..... جی..... کچھ نہیں.....'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا پھر سہمی ہوئی الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہوگئی ہو۔

اب تک اچھو سے میری جو بھی گفتگو ہوئی تھی اس میں کسی بھی حوالے سے بکس کا ذکر نہیں آیا تھا۔ میں نے صرف چودھری رب نواز کی قبر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا تذکرہ کیا تھا جس کے جواب میں اچھو نے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ میرے پھیلائے ہوئے نفسیاتی جال میں قدم رکھنے کے بعد اس کی زبان سے خود بہ خود بکس کا لفظ پھسل گیا تھا اور یہ لفظ بھی اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ کوئی پتھری بھی جڑی ہوئی تھی۔

اچھو نے بے ساختگی میں چور اور پتھری والے بکس کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ گویا اس انکشاف نے میرا کام بہت آسان کر دیا تھا۔ اب میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اچھو! یہ.....''

''جی کچھ نہیں'' سے کام نہیں چلے گا۔ تم نے مجھ سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے بتاؤ، یہ پتھری والے صندوق یا بکس کا کیا قصہ ہے؟''

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ غلط بیانی کے لیے کوئی فوری بہانہ تلاشنے کی کوشش میں ہو۔ میرے گھورتی ہوئی نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اچھو! اگر تم نے مجھے کوئی چکر دینے کی کوشش کی تو پھر مجھ سے کسی اور رعایت کی توقع نہ کرنا۔ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔ شرافت سے بتا دو، پتھری والے بکس سے تمہاری کیا مراد تھی؟''

میرے دوٹوک انداز نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' ایسی کیفیت میں دکھائی دیا۔ معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ادھر قبرستان میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ چور نے بڑے چودھری صاحب کی قبر کو کھود کر لکڑی کا کوئی بکس نکالا ہے۔ اسی لیے میری زبان سے بکس والی بات نکل گئی.....''

اچھو کے کھوکھلے الفاظ سے واضح تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ چوبی بکس کی چوری والی بات ابھی تک میرے، چودھری علی نواز اور گورکن حیات بخش کے درمیان تھی۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں اچھو سے پوچھا۔

''بکس والی بات تم نے قبرستان میں کس کی زبانی سنی تھی؟''

''جی..... اب یہ تو مجھے یاد نہیں.....'' وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔

میں نے بدستور اس کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ''اچھو! کوئی بات نہیں اگر تمہیں یاد نہیں تو میں یاد دلانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ یہ حقیقت ہے کہ چودھری رب نواز کی قبر کو کھود کر وہاں سے لکڑی کا ایک چھوٹا بکس نکالا گیا ہے۔ چودھری علی نواز کو اسی بکس اور مذکورہ چور کی تلاش ہے۔ میرے خیال میں، تمہاری مدد کے بغیر یہ تلاش ممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے، تم مجھے اس بکس اور چور تک پہنچا دو گے کیونکہ..... مذکورہ پتھری والے بکس کے بارے میں تم سے زیادہ اور کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں جانتا..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جناب..... آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی.....'' اس نے کہنا شروع کیا۔

''بکواس بند کرو۔'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کڑک کر کہا۔ ''تم بڑے چودھری کے بہت قریب رہے ہو لہٰذا اس بکس کے حوالے سے تمہیں سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔ چودھری علی نواز صرف اتنا جانتا ہے کہ مذکورہ بکس میں کوئی ریشمی رومال رکھا ہوا تھا جو اس کی ماں صابرہ بی بی کی نشانی تھی۔ تم نے ''پتھری والے بکس'' کا ذکر کر کے اس کیس کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا ہے۔ بتاؤ، پتھری کا کیا قصہ ہے؟''

''میری بات کا یقین کریں جناب۔'' وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں کسی پتھری کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ تو بس ویسے ہی میری زبان سے نکل گیا تھا.....''

''ٹھیک ہے اچھو! میں سمجھ گیا ہوں، شرافت کا رویہ تمہاری طبیعت سے لگا نہیں کھاتا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لیے اب میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا، مجھے جو بھی پوچھنا ہوگا وہ تمہاری زبان سے پوچھوں گا..... وہی زبان جو پتھری کے مغالطے میں بس ایسے ہی پھسل گئی تھی۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، اُلجھن آمیز ڈری سہمی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے آواز دے کر حوالدار حیدر علی کو اپنے کمرے میں بلا لیا اور اچھو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''یہ آج کے دن کے لیے ہمارا مہمان ہے۔ اسے ''ڈرائنگ روم'' میں لے جاؤ اور اس کی خوب خاطر مدارات کرو۔ مجھے پتا چلا ہے، اس کی زبان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے لہٰذا ایسی ''ڈشوں'' سے اس کی تواضع کرو کہ زبان خود کار انداز میں چلنے کے قابل ہو جائے..... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی چنگی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' حیدر علی کسی قصاب کی طرح اچھو کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں اس کی زبان کا بڑا شافی علاج کروں گا اگر یہ ''بولنے'' پر آمادہ نہ ہوئی تو میں اسے گدی سے کھینچ کر وہاں نئی زبان فٹ کر دوں گا جو صرف سچ بولے گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولے گی۔''

اچھو کے چہرے کے تاثرات اور بدن کی حرکات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حیدر علی کے ساتھ جانے کو تیار نہیں لیکن حیدر علی نے ایک ذرا رعایت کیے بنا اسے کالر سے دبوچا اور بے دردی سے دھکیلتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا۔

☆☆☆

یہ محاورہ ہر دور میں قابلِ استعمال ہے کہ..... لاتوں کے بھوت، باتوں سے نہیں مانتے۔ اس روز قبرستان میں چیک زدہ اچھو کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھوت سے کم نہیں، اسی لیے میں اس کی تلاش میں تھا پھر آج جب وہ مجھے میسر آ گیا تو میرے نفسیاتی ٹریٹمنٹ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ لاتوں کا متمنی ہے لہٰذا میں نے اسے حیدر علی کے حوالے کر دیا تھا جو کہ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

''سرکاری مہمان داری'' کا ''جسمانی لطف'' اٹھانے کے بعد، شام سے تھوڑی دیر پہلے اچھو نے مذکورہ بکس کی چوری کا اقرار کر لیا تھا۔ اس نے چودھری فیاض اعوان کے ایما پر چودھری رب نواز کی قبر کھول کر وہ بکس نکالا تھا اور اسے رستم آباد پہنچا دیا تھا۔ خود کو چھپانے کے لیے اس نے پورے بدن کو ایک سفید چادر میں لپیٹ رکھا تھا جبھی مائی سگی نے اسے کوئی مردہ سمجھا تھا۔ اس نے مائی سگی کے نلکے پر پاؤں دھوئے اور چھوٹی نہر کی جانب بڑھ گیا جہاں نہر کے کنارے خانہ بدوشوں نے جھگیاں ڈال رکھی تھیں۔ انہی جھگیوں میں اچھو کا ایک ساتھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اچھو مذکورہ بکس کو لے کر ایک مخصوص جھگی میں پہنچا تو اس کا ساتھی مطمئن ہو گیا۔ عنایت نامی وہ بندہ رستم آباد کا رہنے والا تھا اور اچھو کی مدد کے لیے اس کے ساتھ آیا تھا۔ اگلے ہی لمحے عنایت اور اچھو رستم آباد کی سمت روانہ ہو گئے۔

جب حوالدار حیدر علی اچھو کو ''تیار'' کر کے میرے پاس لایا اور اس کے اقبالی بیان کے بارے میں بتایا تو میں نے اچھو سے پوچھا۔

''صابرہ بی بی نے اپنے خاوند چودھری رب نواز کو کڑھے ہوئے رومال کی شکل میں جو نشانی دی تھی اس کا فیاض اعوان سے کیا تعلق ہے۔ فیاض اعوان نے وہ بکس کیوں چوری کرایا ہے؟''

میرے سوال کے جواب میں اچھو نے جو تفصیل بیان کی اس نے ''پتھری'' والا معما حل کر دیا۔

''تھانے دار صاحب!'' اچھو نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ بکس دراصل دو حصوں والا ہے، اوپری حصے میں واقع ایک ریشمی رومال رکھا ہوا تھا جو اعوان صاحب کے کسی کام کا نہیں۔ انہوں نے زعفرانی پتھری کو حاصل کرنے کے لیے وہ بکس چوری کرایا ہے۔ یہ پتھری اس بکس کے نیچے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والے حصے میں موجود تھی۔ اوپر والے حصے میں ایک مخصوص کیل لگی ہوئی ہے جس پر دباؤ ڈالنے سے نیچے والا حصہ کھل جاتا ہے۔ چودھری علی نواز بکس کے خفیہ خانے سے واقف نہیں ورنہ وہ ضرور اس میں جھانک کر دیکھتا۔ میں چودھری صاحب کے بہت قریب رہا ہوں لہٰذا بکس کا راز مجھے معلوم تھا۔''

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے سوال داغ دیا۔

''لیکن اس پتھری میں ایسی کیا خاص بات ہے جسے حاصل کرنے کے لیے فیاض اعوان نے چودھری رب نواز کی قبر کھدواڈالی؟''

''وہ..... ایک کرشماتی پتھری..... ہے جناب۔'' اچھو ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ایک سنیاسی بابا نے یہ پتھری چودھری صاحب کو تحفے میں دی تھی۔''

''کیا وہ پتھری..... پارس پتھر ہے؟''

''وہ پارس پتھر سے بھی آگے کی چیز ہے جناب۔'' اچھو نے پُراسرار انداز میں بتایا۔ ''پارس پتھر کو چھونے والی چیزیں تو سونا بن جاتی ہیں مگر اس زعفرانی پتھری کی خوبی یہ ہے کہ وہ مردے میں بھی جان ڈال دیتی ہے۔ بوڑھے سے بوڑھا مرد بھی اگر تھوڑی دیر کے لیے اس پتھری کو چاٹ لے تو وہ خلوت کے میدان میں جوان رعنا بن جاتا ہے..... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔ آپ اس پتھری کو جادو کی چھڑی سمجھ لیں جناب۔''

''ہوں.....'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی۔ میں چودھری رب نواز کی ''طبیعت'' کی جولانیوں سے واقف تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ وہ خاصا سنگین ورنگین مزاج واقع ہوا تھا۔ اس کی غیر نصابی سرگرمیوں کے قصے بھی میری سماعت تک پہنچتے رہتے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا بھرم کسی زعفرانی پتھری کا رہین منت تھا جو کسی سنیاسی بابا نے اسے عطا کر رکھی تھی۔ میں نے اچھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اچھو.....! اگر میں تمہارے کہے کو سچ مان لوں کہ یہ پتھری واقعی حیرت انگیز خوبیوں کی مالک ہے۔ کیا تم نے اس پتھری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رکھا ہے؟''

''میں نے اسے بڑے چودھری صاحب کے پاس کئی مرتبہ دیکھا تھا جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کے رنگ کے بارے میں، میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔ اب ذرا اس کا ماپ بھی لے لیں.....'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس پتھری کی لمبائی چار انچ، چوڑائی ڈیڑھ انچ اور موٹائی صرف آدھی انچ ہے۔ میں نے پتھری کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ مجھے چودھری صاحب کی زبانی پتا چلی تھیں۔ بہ وقت ضرورت سے دس پندرہ منٹ پہلے اس پتھری کو تھوڑی دیر کے لیے چاٹنا یا چوسنا پڑتا ہے۔ اس پتھری کے حیرت انگیز اثرات دورانِ خون میں ایک طوفان پیدا کر دیتے ہیں اور رگ و پے میں بجلیاں سی کوندنے لگتی ہیں۔ پتھری کو استعمال کرنے والے مرد پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور..... میں اور کیا بتاؤں جناب۔ آپ سمجھدار ہیں، خود ہی اندازہ لگالیں.....!''

اتنا بتانے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ میں پتھری اور اس کے جادوئی اثرات کی تہہ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چودھری رب نواز کے بڑھاپے کی جواں مردی بھی مجھ پر آشکار ہو گئی لیکن ابھی تک بہت سے سوالات جواب طلب تھے۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے اچھو سے پوچھا۔

''کیا اس پتھری کے راز سے چودھری علی نواز واقف ہے؟''

''میرا خیال ہے، اسے یہ راز معلوم نہیں ہے۔'' اچھو نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اگر علی نواز کو پتھری کے کرشماتی اثرات سے آگاہی ہوتی تو وہ اپنے باپ کی موت کے فوراً بعد پتھری کی تلاش اور جستجو میں لگ جاتا اور لکڑی کا بکس اس کی ''کوشش'' کا خاص نشانہ بنتا۔ اسے یقین ہی نہ آتا کہ محض صابرہ بی بی کی ایک نشانی کو اپنے ساتھ دفن کرانے کے لیے چودھری رب نواز نے اس سے خواہش کا اظہار کیا تھا اگر علی نواز کو پتھری کے حوالے سے ذرا بھی سن گن ہوتی تو وہ مذکورہ بکس توڑ پھوڑ کر اس کی ایک ایک سوت جگہ کا معائنہ کرتا۔''

اچھو کی بات میں وزن تھا۔ وہ مرد کی فطرت کے عین مطابق اپنا تجزیہ پیش کر رہا تھا۔ میں اس کے دلائل کو جھٹلا نہیں سکتا تھا لہٰذا میں نے اس سے دریافت کیا۔

''اچھو! یہ بتاؤ، رستم آباد کے چودھری فیاض اعوان کو اس عمر میں رستم بننے کا خیال کیسے آ گیا..... میرا مطلب ہے، اسے جادوئی پتھری کے بارے میں کیسے پتا چلا؟''

میری معلومات کے مطابق مرحوم چودھری رب نواز نے چوہتر سال کی عمر پائی تھی اور فیاض اعوان بھی اس وقت ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ اچھو نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ اس کے انداز میں ایک خاص نوعیت کی ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔

''وہ جی..... بات دراصل یہ ہے کہ..... جب سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا ہے تو یہ راز بھی چھپانے کی ضرورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں.....''

''ہاں، ہاں بتاؤ۔ میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔'' میں نے حوصلہ افزائی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تم جتنا زیادہ سچ بولو گے، اپنی سزا میں اتنی ہی کمی کرو گے۔''

وہ قدرے مطمئن انداز میں بتانے لگا۔ ''بڑے چودھری صاحب کو اس بازار میں جانے کا بھی شوق تھا۔ وہ شمع نامی ایک طوائف کے دیوانے ہو گئے تھے اور اسے دل کی باتیں بھی بتانے لگے تھے۔ اس پتھری کا راز ایک نازک موقع پر چودھری صاحب کی زبان سے پھسل کر شمع کی سماعت تک پہنچ گیا۔ فیاض اعوان بھی اس کوچے میں آتا جاتا رہتا تھا۔ جب شمع سے اس کی قربت بڑھی تو پتھری کا راز اس کی یادداشت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا پھر فیاض اعوان پتھری کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔'' وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا، دو تین گہری سانسیں لیں اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''چودھری صاحب کے آخری دنوں میں، مجھے ان سے الگ کر دیا گیا تھا۔ یہ بات فیاض اعوان کو پتا چلی تو اس نے اپنا ایک خاص بندہ بھیج کر مجھے رستم آباد بلایا۔ میں عنایت کے ساتھ اعوان صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے میری خوب خاطر تواضع کی اور بتایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا خاص آدمی بنا کر رکھنے کو تیار ہیں۔ میں بخشی پور کو چھوڑ کر رستم آباد چلا آؤں لیکن اس کے لیے مجھے اعوان صاحب کا ایک کام کرنا ہوگا..... وہ کام تھا، پتھری کا حصول۔''

''یہ کام دیکھنے میں ایک طرح سے ناممکن تھا کیونکہ اب حویلی میں میری آمدورفت نہیں رہی تھی لیکن وہ کیا کہتے ہیں..... جب قدرت مہربان تو گدھا پہلوان.....!'' اس نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے اعوان صاحب سے کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا تھا لہٰذا پتھری کے حصول کی تگ و دو میں لگ گیا۔ انہی دنوں چودھری صاحب کا انتقال ہو گیا اور میری خوش قسمتی کہ کسی طرح مجھے پتا چلا کہ ان کی میت کے ساتھ ایک چھوٹا سا بکس بھی قبر میں دفن کیا گیا ہے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ بڑے چودھری صاحب کی وصیت کے مطابق جس بکس کو ان کی قبر میں دفن کیا جا رہا ہے وہ وہی بکس ہے جس کے نچلے خفیہ خانے میں وہ طلسماتی پتھری چھپا کر رکھتے تھے..... اس کے بعد پیش آنے والے حالات کے بارے میں آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں۔''

''یہ اندازہ تو میں نے بخوبی لگا لیا ہے اچھو!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہاری خوش قسمتی اور بدقسمتی کا میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ فیاض اعوان کے حوالے سے میں تمہاری باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ اس معاملے کی پوری تفتیش ہوگی۔ اس سلسلے میں، میں ابھی رستم آباد روانہ ہو رہا ہوں۔''

''آپ اپنی تسلی کر لیں جناب۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''میں نے آپ سے ایک لفظ کی غلط بیانی نہیں کی۔''

میں نے اچھو کو حوالدار حیدر علی کے حوالے کرتے ہوئے تاکید کر دی۔ ''اسے حوالات میں بند کر دو۔ میں رستم آباد جا رہا ہوں۔ اس کی قسمت کا فیصلہ وہاں سے واپسی پر کیا جائے گا۔'' حیدر علی نے میرے حکم کی فوراً تعمیل کر دی۔

☆☆☆

اس شام تو نہیں البتہ آئندہ روز میں علی الصباح رستم آباد پہنچ گیا اور فیاض اعوان سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ جب اسے پتا چلا کہ پتھری کی کارکردگی اور چوری کا راز افشا ہو چکا ہے اور اچھو اس وقت میرے تھانے کے حوالات میں بند ہے تو اس کے لیے ''فرار'' کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں۔ میں نے اسے راست گوئی پر مجبور کرنے کے لیے یہ ڈراوا بھی دیا کہ رستم آباد کا رخ کرنے سے پہلے میں نے ایس پی اور آئی جی صاحب کو اس معاملے سے آگاہ کر دیا ہے لہٰذا چودھری فیاض اعوان کے ڈبے میں سے گھی نکالنے کے لیے مجھے انگلی کو ٹیڑھا نہیں کرنا پڑا۔ وہ پولیس کے اعلیٰ افسران کے نام سن کر ایک دم لائن پر آ گیا تھا۔

دوپہر کے بعد میں طلسماتی پتھری والے منقش بکس کو لے کر تھانے آ گیا۔ اچھو کی گرفتاری والی خبر چودھری علی نواز سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ تھانے میں میرا منتظر تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ کے چہرے کی رونق اور اعتماد سے لگ رہا ہے کہ آپ نے اس بکس کو حاصل کر لیا ہے اور..... اچھو کی گرفتاری اسی سلسلے کی کڑی ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہارا اندازہ بڑی حد تک درست ہے لیکن مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ اس بکس کی اصلیت سے تم بے خبر کیوں تھے یا..... یہ کہ تم نے مجھے حقیقت سے آگاہ ہی نہیں کیا۔''

''آپ کون سی حقیقت اور اصلیت کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس کے سوالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے جواب دیتے ہوئے اسے بکس کی چوری کی روداد سنائی اور اس سلسلے میں اچھو و فیاض اعوان کے کردار کو اجاگر کیا۔ میری بات سننے کے بعد وہ ہکا بکا رہ گیا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''مجھے تو اس پتھری کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ ابا جی نے امی جی کی نشانی.....'' وہ بولتے بولتے ٹھہرا پھر نہایت ہی رازدارانہ انداز میں درخواست کی۔

''ملک صاحب! کیا میں اس زعفرانی پتھر کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟''

میں نے بکس کو مخصوص انداز میں کھول کر چودھری علی نواز کی خواہش پوری کردی۔ وہ حیرت بھری نظر سے مذکورہ پتھری کو دیکھتا رہا پھر رال ٹپکانے والے انداز میں پوچھنے لگا۔ اس کی جگہ کوئی بھی مرد ہوتا تو وہ شاید یہی سوال کرتا۔

''آپ اس پتھری کا کیا کریں گے ملک صاحب؟''

''میں اسے بہ حق سرکار ضبط کر کے متعلقہ افسران کے حوالے کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''جیسا کہ آپ نے بتایا ہے.....'' اس کی رگ حرص پھڑک اٹھی۔ ''کسی سنیاسی نے یہ پتھری ابا جی کو تحفے میں دی تھی۔ میں ابا جی کا وارث ہوں، ان کی وفات کے بعد ان کی چھوڑی ہوئی ہر شے پر میرا حق بنتا ہے لہٰذا یہ پتھری مجھے ملنی چاہیے۔''

''وراثت کے اصول کے تحت تو تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو علی نواز لیکن اس پتھری کے ساتھ ایک پیچیدگی ہے لہٰذا تم اس کی آس میں اپنا بلڈ پریشر نہیں بڑھاؤ۔ یہ تمہیں کسی بھی صورت ملنے والی نہیں۔''

''کیا..... کیا پیچیدگی ہے اس کے ساتھ؟'' وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اول تو تمہارے باپ نے اس پتھری کو بکس کے تہہ خانے میں چھپا کر اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اس کا تزکہ نہیں بلکہ ایک فتنہ ہے جسے نہایت ہی رازداری اور خاموشی کے ساتھ چودھری رب نواز نے ٹھکانے لگانے کی کوشش کی تھی۔ ہمیں اس مرنے والے کی آخری خواہش اور آخری کوشش کا احترام کرنا چاہیے۔ تمہارا باپ اس بات سے آگاہ تھا کہ اس پتھری سے فتنہ و فساد جنم لے سکتا ہے۔ ایک مثال تو تمہارے سامنے ہے۔ فیاض اعوان نے کس طرح تمہارے باپ کی قبر کی بے حرمتی کرا کے اس پتھری کو چوری کروایا تھا.....'' میں نے سانس درست کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ یہ پتھری اور اس کے حصول کی چارہ جوئی ہمیشہ انسانی ہلاکتوں کا باعث بنتی رہے گی لہٰذا اسے تلف کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ایک بڑی خونریزی کا راستہ روکا جاسکے۔''

میرے اس مضبوط استدلال کے بعد علی نواز بجھ کر رہ گیا تاہم پتھری کے حصول کی آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے دوستانہ انداز میں مجھے مشورہ دیا۔

''ملک صاحب! اگر آپ چاہیں تو گھر کی بات گھر ہی میں ختم ہوسکتی ہے۔''

''وہ کس طرح علی نواز؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''جناب! بکس کی چوری والے کیس کو آپ یہیں ختم کردیں۔ اسے آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ خاموشی سے یہ پتھری میرے حوالے کردیں۔ اس کے بدلے میں آپ جو بھی کہیں گے، میں آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔''

''علی نواز! کسی خدمت شدمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''کیونکہ اب یہ گھر کی بات نہیں رہی۔ میں رستم آباد جانے سے پہلے ایس پی صاحب اور آئی جی صاحب کو اس پتھری کے حوالے سے رپورٹ پیش کرچکا ہوں۔''

میں نے فیاض اعوان کو سیدھا کرنے کے لیے بھی یہی چال چلی تھی حالانکہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ زعفرانی پتھری والا معاملہ پوری طرح میری دسترس میں تھا اور میرے اعلیٰ افسران کو اس واقعے کی قطعاً کوئی خبر نہیں تھی۔

میرے قطعی بیان نے علی نواز کے بھڑکتے ہوئے ارمانوں پر اوس کی دبیز اور ٹھنڈی ٹھار چادر بچھادی۔ وہ ایک مضمحل سی سانس خارج کرتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا۔

''آپ نے بہت بڑی غلطی کردی ملک صاحب! آپ اوپر بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو ذکر کرتے میں..... میں.....!''

اس کے ادھورے جملے نے مجھے بتا دیا کہ وہ کتنا خواہش مند بہ الفاظ دیگر کتنا ''ضرورت مند'' تھا۔ میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ غلطی تو ہوچکی..... اب کچھ نہیں کیا جاسکتا علی نواز۔''

یہ ایسا موقع تھا کہ میں علی نواز سے بڑے سے بڑا فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن میرے ضمیر نے اس کی اجازت نہیں دی۔ میں اس فتنہ انگیز پتھری کو تلف کرنے کا مصمم ارادہ کرچکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک خونی پتھری ثابت ہوسکتی تھی۔ اس کے حصول کی خاطر ایک مرد، دوسرے مرد کی گردن کاٹنے پر تیار ہوجاتا۔

میں نے ایک مناسب تسلی کشفی کے بعد علی نواز کو رخصت کردیا۔ وہ بادل ناخواستہ چلا تو گیا لیکن میں اس بات کے امکان کو فراموش نہیں کرسکتا تھا کہ وہ پتھری کے حصول کے لیے اوپری افسران کو کوئی بڑی پیشکش کرسکتا تھا۔ اس طرح میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا، میں نے اپنی سیفٹی کے لیے پتھر کے ایک ٹکڑے کو راتوں رات گھس کر زعفرانی پتھری کے سائز کا بنایا پھر اس کو زعفرانی رنگ میں رنگ کر پتھری سے منسوب کہانی کے ساتھ ایس پی علاقہ کی خدمت میں پیش کردیا۔

ایس پی صاحب نے پوری توجہ کے ساتھ میری بات سنی اور میری تیار کردہ پتھری کو ہاتھ میں گھمانے پھرانے کے بعد کہا۔

''صفدر حیات! مجھے تو یہ سب فکشن لگتا ہے۔ میں نے گیدڑ سنگھی اور ایسی طلسماتی پتھریوں کے باری میں سنا تو ہے لیکن میرے خیال میں یہ واقعات قصے کہانیوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ بہرحال.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں ایک ایسے ڈی ایس پی ہیں جن پر اس پتھری کے اثرات کو ٹیسٹ کیا جاسکتا ہے۔ میں تجربے کے لیے آج یہ پتھری انہیں دیتا ہوں۔ تم کل میرے پاس آجاؤ پھر اس سے بات کرتے ہیں۔''

میں خاموشی سے اٹھا اور واپس آ گیا۔ مجھے اس بات کا ذرا بھی ملال نہیں تھا کہ میں نے پتھری کے حوالے سے اپنے ایک سینئر افسر سے غلط بیانی کی تھی۔ اصلی پتھری جس کے بھی ہاتھ لگتی وہ اس پر قابض ہونے میں ایک لمحہ ضائع نہ کرتا۔ اگلے روز میں دوبارہ ان کے پاس گیا۔ مجھے پتا تھا، وہ کیا جواب دیں گے، انہوں نے میری توقع کے عین مطابق کہا۔

''صفدر حیات! میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ یہ زعفرانی پتھری پتھر کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اسے کسی کے سر میں مار کر خون تو نکالا جاسکتا ہے مگر رگوں میں دوڑنے والے خون میں کوئی طغیانی یا ہیجان پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ ڈی ایس پی صاحب نے اسے چاٹ چاٹ کر اپنی زبان بھی زخمی کرلی ہے لیکن نتیجہ صفر کے برابر ہی نکلا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے۔'' میں نے خیال افروز انداز میں کہا۔ ''چودھری رب نواز بہت بڑا گپ باز تھا۔''

''گپ باز نہیں، فکشنسٹ!'' ایس پی صاحب نے کہا۔

''مرحوم میں ایک اچھے فکشن رائٹر کی خصوصیات پائی جاتی تھیں لیکن وہ خود تو مرگیا اور میرے لیے ایک مسئلہ کھڑا کرگیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ سر؟'' میں نے چونک کر ایس پی صاحب کی طرف دیکھا۔

انہوں نے بتایا۔ ''میں نے جن ڈی ایس پی صاحب پر اس پتھری کا تجربہ کیا ہے نا، ان کی مجھ سے خاصی بے تکلفی ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے ان کا مذاق بنایا ہے۔ اس ''حرکت'' پر وہ مجھ سے خفا ہوگئے ہیں۔''

''سر! یہ جو کچھ بھی ہوا، میری وجہ سے ہوا ہے۔'' میں نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

''صفدر حیات! اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''تم اطمینان سے جاؤ اور اپنے تھانے کا نظام سنبھالو۔ میں ڈی ایس پی صاحب کو منالوں گا۔''

میں اٹھا اور خاموشی سے واپس آ گیا۔

میں نے اپنی حفاظت کے لیے مضبوط پیش بندی کردی تھی۔ اب علی نواز، زعفرانی پتھری کے حصول کے لیے کتنا بھی اوپر جاتا، مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ جس بھی افسر کے سامنے مدعا بیان کرتا، اسے شرمندگی اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے اس زعفرانی پتھری کو ہتھوڑے کی مدد سے کوٹ کر ریزہ ریزہ کرنے کے بعد، رواں دواں نہر کے حوالے کردیا تھا ممکن ہے بعض لوگوں کو میرا یہ فعل پسند نہ آیا ہو اور وہ مجھ سے اختلاف رائے رکھتے ہوں۔

اختلاف رائے ایک اچھی اور خوش آئند بات ہے۔ اس سے جمہوریت کا حسن اور معاشرے کی صحت جھلکتی ہے مگر میں نے جو کچھ کیا وہ وسیع تر قومی مفاد کے لیے تھا۔ زعفرانی پتھری، گیدڑ سنگھی اور انہی جیسی دوسری کرشماتی چیزیں بعض لولے لنگڑے افراد کے لیے بیساکھی کا رول تو ادا کرسکتی ہیں لیکن ان کا حصول پرامن معاشرے کا سکون غارت کرکے اسے کشت وخون کی جانب مائل کرنے کا بھی سبب بنتا ہے۔ انتشار اور بدامنی پھیلانے والے عناصر اور اشیا کو نیست و نابود ہوجانا چاہیے خواہ وہ اپنے اندر ایک سے بڑھ کر ایک کرشماتی وصف ہی کیوں نہ رکھتی ہوں۔

آپ میری اس رائے سے بھی اختلاف کا حق رکھتے ہیں کیونکہ آج کل آپ ایک جمہوری معاشرے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں!

(تحریر حُسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غلط کار

ملک صفدر حیات

خوابوں کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ جھوٹے سچے دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں۔ کچھ کی تعبیر کبھی نہیں ملتی اور کچھ نیند سے جاگتے ہی حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں، ملک صاحب کا رابطہ اس بار ایک ایسے گورکن سے پڑ گیا جس کا خواب آنکھ کھلتے ہی حقیقت بن گیا تھا۔

ہر سطر تجسس اور ہر لفظ میں سنسنی ایک پراسرار واردات کی تفتیش کا احوال

وہ موسم برسات کی ایک حبس زدہ رات تھی!

اس سال ساون ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوا تھا۔ ویسے تو یہ ایک ایسا مہینا ہے جو اپنی جلوہ نمائی کے ایک سے بڑھ کر ایک ڈھنگ رکھتا ہے اور اس کا ہر روپ منفرد محسوس ہوتا ہے لیکن اس سال اس کا موڈ اور مزاج بالکل مختلف دکھائی دیتا تھا۔ گزشتہ دس روز سے بارش ہو رہی تھی اور موسم کے تیور بڑے دل جلانے والے تھے۔ صبح آنکھ کھلتی تو بارش دیکھنے کو ملتی۔ دن بھر آسمان اپنی آنکھوں کے ذخیرے خالی کرنے میں مصروف رہتا۔ سہ پہر کے بعد بارش رک جاتی اور سورج نکل آتا، شام تک اچھی خاصی گرمی پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ رات کو ایسی حدت اور حبس ہو جاتا کہ سانس لینا دوبھر محسوس ہوتا..... مجال تھی جو کسی درخت کا ایک پتا بھی غلطی ہی سے بھی حرکت کر جائے۔

وہ بھی ایک ایسی ہی حبس زدہ رات تھی۔ میں حوالدار منصور گوندل کے ساتھ اس وقت قصبے کے قبرستان میں موجود تھا۔ ہم گھنی جھاڑیوں کے پیچھے اس طرح چھپے بیٹھے تھے کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جب کہ ہم باآسانی اس قبرستان میں ہونے والی نقل حرکت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کی نظریں ایک مخصوص قبر پر جمی ہوئی تھی۔ ہمیں کسی کی آمد کا انتظار تھا۔

جھاڑیوں کے عقب میں اس طرح چھپ کر بیٹھے ہوئے ہمیں لگ بھگ ایک گھنٹا ہو گیا تھا۔ ہم رات گیارہ بجے اس ''کمین گاہ'' میں پہنچ گئے تھے۔ رات اپنا نصف سفر طے کر کے آگے بڑھ چکی تھی مگر ابھی تک ہماری مراد پوری نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس مراد کے برآنے کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ماحول کی وحشت اور گھٹن میں اضافہ ہو رہا تھا۔

مذکورہ قبرستان کی تین اطراف تا حدِ نگاہ کھیتوں کا سلسلہ ہائے دور دراز پھیلا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے گندم کی فصل کاٹی جا چکی تھی لہٰذا سارے کھیت، کھیتی سے خالی پڑے تھے لیکن دس روز سے جاری مسلسل بارشوں نے خالی کھیتوں کو لبالب پانی سے بھر دیا تھا۔ اگر زمین پر پانی کھڑا ہو اور کچھ دیر کے لیے سورج کی کرنیں اس پانی کی سطح سے ''انعطاف، انعطاف'' کھیلیں تو گرمی اور حبس کی قیامت خیزی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔

موسم کی شدت اور حدت تو رہی ایک طرف، اچھل پھدک کر فاصلہ طے کرنے والی خدائی مخلوق نے ساعت کا جسمانی ریمانڈ الگ سے لے رکھا تھا۔ پانی سے بھرے کھیتوں میں ان دنوں مینڈکوں کی افراط نظر آ رہی تھی۔ دن کے شور شرابے میں ان کی ''گلوکاری'' ساعت کو زیادہ متاثر نہیں کرتی تھی لیکن اس وقت نصف شب کو ان مینڈکوں کا ''عین غین'' اور ''نے قاف'' پر مشتمل یکّا راگ سن کر طبیعت مکدر ہو رہی تھی۔ گزشتہ ایک گھنٹے سے اسی کیفیت کے قیام نے مجھے اور میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا، مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی 'اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی!'

اس سے پہلے کہ میں وہ چوکی داری ترک کر کے واپسی کی راہ اختیار کرتا، حوالدار منصور گوندل نے بڑے اضطراری انداز میں میرا ہاتھ دبایا پھر اس کی سرگوشی نے بڑے سنسنی خیز تاثر کے ساتھ میری سماعت تک رسائی حاصل کر لی۔

''ملک صاحب! وہ آ رہی ہے۔''

''کہاں..... کدھر ہے؟'' میں نے جواباً سرگوشی میں استفسار کیا۔

''وہ'' حوالدار نے ایک جانب اشارہ کیا۔ ''ادھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھیں جناب!''

اور میں اُدھر دیکھنے لگا۔

☆☆☆

چار اگست کی صبح، میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا، کوئی حاجی مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہے، میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے دریافت کیا۔

''تم کس حاجی کی بات کر رہے ہو؟''

''حاجی کریم جناب!'' کانسٹیبل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''گورکن حاجی کریم۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم اسے میرے پاس بھیج دو۔'' کانسٹیبل ''یس سر!'' کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

ان دنوں میں قصبہ فتح گڑھ کے تھانے میں تعینات تھا، فتح گڑھ خاصا بڑا آنجہانی آباد قصبہ تھا۔ اس قصبے میں کم و بیش دو سو گھر آباد تھے۔ کانسٹیبل نے جس شخص کی آمد کی اطلاع دی تھی وہ اس قصبے سے متصل بڑے قبرستان میں گورکن کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہو گی۔ میں تین چار مرتبہ پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔ مجھے اور قصبے والوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کا اصل نام عبدالکریم تھا لیکن پتا نہیں کیوں، اس نے اپنے نام کے ساتھ ''حاجی'' کا اضافہ کر رکھا تھا۔ سب لوگ اسے محض ''حاجی'' کہہ کر پکارتے تھے یا زیادہ سے زیادہ ''حاجی کریم'' اس بات کی میں نے تصدیق کر لی تھی کہ اس نے زندگی میں کبھی فریضہ حج ادا نہیں کیا تھا، اس کے باوجود بھی نام کے ساتھ ''حاجی'' کی موجودگی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ میں نے سوچا تھا، کبھی فرصت ملی تو میں اس بارے میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔ میرے خیال میں، ایسا موقع آ گیا تھا!

حاجی کریم صبح ہی صبح مجھ سے ملنے آیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا، کوئی خاص بات ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ میرے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات سجے تھے جیسے وہ کمرے میں قدم رکھنے سے قبل مجھ سے اجازت کا خواہاں ہو۔

میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''آ جاؤ عبدالکریم!''

میری اجازت پا کر وہ اندر آ گیا پھر میرے اشارے کی تقلید کرتے ہوئے میرے سامنے ایک چوبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا لباس اچھا خاصا بھیگا ہوا تھا۔ بوندا باندی کا سلسلہ صبح سے جاری تھا تاہم بارش نے ابھی تک زور نہیں پکڑا تھا۔

میں حاجی کریم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

کریم ایک دراز قامت اور صحت مند شخص تھا، رنگت گندمی اور توانی مضبوط۔ اس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ ابدی رخصت پا چکے تھے۔ باقی ماندہ بالوں میں وہ ہر وقت کوئی تیل چپڑے رہتا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ ناراض وقت کو منانے کے لیے کوئی ٹوٹکا آزما رہا ہے!

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''کیا بات ہے کریم، مجھے پتا چلا ہے، تم مجھ سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہو؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ بے حد محتاط انداز میں گویا ہوا پھر چور کتا نظر سے میرے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بات ہی کچھ ایسی ہے جناب کہ صبح صبح مجھے آپ کے پاس آنا پڑا۔''

میں نے پلک جھپکتے میں محسوس کر لیا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کا خواہش مند ہے، کوئی ایسی بات جو سنسنی سے بھرپور ہو گی۔ میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر بہ آواز بلند پکارا۔

''مراد علی!''

''اگلے ہی لمحے کانسٹیبل مراد علی میرے سامنے حاضر تھا۔

میں نے تحکمانہ انداز میں اس سے کہا۔ ''دیکھو مراد! جب تک حاجی کریم میرے پاس بیٹھا ہے، خیال رکھنا کوئی کمرے میں نہ آئے۔ میری بات سمجھ گئے نا؟''

''او کے سر!'' کانسٹیبل نے مجھے سلیوٹ مارا اور واپس مڑ گیا۔

مراد علی کے جانے کے بعد میں کریم کی جانب متوجہ ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب تم پورے اطمینان سے بات کر سکتے ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تم کوئی سنگین خبر لے کر میرے پاس آئے ہو؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب!'' وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک میں سمجھ نہیں پایا ہوں، جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ میری نگاہ کا دھوکا ہے یا واقعی کوئی پُراسرار چکر شروع ہونے والا ہے۔''

اس کی باتیں اُلجھانے والی تھیں۔ میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''کریم! تم اپنے مشاہدے کو من و عن میرے سامنے بیان کر دو۔ میں خود فیصلہ کر لوں گا، حقیقت کیا ہے۔ میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں!''

''پتا نہیں، آپ کو میری بات کا یقین بھی آئے گا یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں!''

''تم ان چکروں میں اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔'' میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم صرف میری ہدایت پر عمل کرو، باقی سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ شاباش..... بتاؤ، تم نے کیا دیکھا؟''

اس نے تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کیا پھر چند لمحے کی خاموشی اختیار کر کے وہ اپنے بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کرتا رہا۔ اس کے بعد سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! پچھلی رات بڑی گرمی اور گھٹن تھی۔ کمرے میں سونا بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ میں نے کھڑکی اور پورا دروازہ کھول رکھا تھا لیکن ایسا لگتا تھا، دم گھٹ کر رہ جائے گا۔ ذرا سی بھی ہوا ہوتی تو وہ کمرے میں پہنچتی نا..... بہرحال، میں نے کمرے سے باہر رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''پچھلی ایک دو راتوں میں پھر بھی تھوڑی بہت ہوا چل رہی تھی لیکن گزشتہ رات تو برا حال تھا۔ میں نے اپنی چارپائی کمرے سے باہر نکال کر کھلے میں بچھالی اور اس پر لیٹ گیا حالانکہ مجھے یہ بھی پتا تھا کہ اس سال بارش نے چوروں والا طریقہ پکڑا ہوا ہے، رات کے آخری پہر چھپ کر چپکے سے شروع ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا، کوئی بات نہیں جو دو چار گھنٹے سونے کو مل جائیں وہی غنیمت ہیں جب بارش شروع ہو گی تو چارپائی کو کمرے میں لے آؤں گا۔''

یہاں تک بتانے کے بعد وہ چند لمحات کے لیے رکا اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس کی بات کا یقین کر رہا ہوں یا نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا جسے میں شک و شبے کی نظر سے دیکھتا۔ مجھے سنجیدگی سے اپنی جانب متوجہ پایا تو وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! رات کے آخری پہر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک حسین و جمیل عورت بال کھولے قبرستان میں داخل ہوتی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کوئی شے اٹھا رکھی ہے۔ وہ قبرستان کی شمالی سمت سے اندر آتی ہے اور دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ اس نے اپنی بانہوں میں کوئی ننھا منا بچہ اٹھا رکھا ہے۔ رات کے آخری لمحات میں، کوئی بچہ اٹھائے کسی عورت کا یوں قبرستان میں داخل ہونا عجیب ہی نہیں بلکہ حیران کن بات تھی۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ڈر گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ کوئی عورت نہیں بلکہ خوبصورت عورت کے روپ میں کوئی چڑیل وغیرہ ہو۔ میں نے یک بہ یک آنکھیں بند کر لیں.....''

وہ تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا، ایک جھرجھری لی پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''چند لمحات کے بعد میں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس خوبصورت عورت کو ایک قبر کے پاس کھڑے دیکھا، اب اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔ میں نے ہمت کی اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ یہ آہستگی مذکورہ قبر کے نزدیک بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھوں سے اس قبر کے ساتھ کسی کارروائی میں مصروف ہو گئی۔ بچے کو اس نے زمین پر رکھ دیا تھا۔ اس بات نے مجھے اور بھی حیرت میں ڈال دیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے بچے کو اس قبر میں دفن کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس سنسنی خیز خیال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں کسی غیبی قوت کے زیر اثر فوراً حرکت میں آیا اور محتاط قدموں سے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق اس سے پہلے کہ وہ عورت معصوم بچے کو قبر میں ڈالتی مجھے اس حرکت سے اسے روکنا تھا۔ میں سانس روکے، بڑی احتیاط سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا کہ سب کچھ گڑبڑا کر رہ گیا۔ شاید اسے میری پیش قدمی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتے قدموں سے اسی جانب بڑھنے لگی جدھر سے آئی تھی۔ واپسی میں مجھے وہ ننھا منا بچہ نظر نہ آ سکا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، اس عورت نے بچے کو قبر میں دفن کر دیا تھا۔ اس خیال کی سنگینی نے مجھے ہر احتیاط سے بے نیاز ہو کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے پہلی فرصت میں اس عورت کو پکڑنا تھا جو تیزی سے، قبرستان سے باہر نکلتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اندھا دھند اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دی پھر ایک ان ہونی ہو گئی.....''

وہ ڈرامائی انداز اختیار کر کے دوبارہ بلکہ سہ بارہ بڑی عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی بیان کردہ کہانی پر کوئی تائیدی یا تنقیدی ردِعمل ظاہر نہ کیا تو وہ اپنی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''.....اچانک مجھے کسی شے سے ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل زمین پر جا گرا پھر اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر دوبارہ اس عورت کے تعاقب میں دوڑ لگاتا، میری آنکھ کھل گئی.....!''

''اوہ.....!'' میں نے خفگی آمیز انداز میں حاجی کریم کی جانب دیکھا اور کڑے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تو تم صبح صبح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اپنا خواب سنانے آئے ہو؟''

''یہ صرف خواب نہیں..... اس سے آگے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ سے میری درخواست ہے، پہلے آپ میری پوری بات سن لیں پھر آپ کا جو دل چاہے کریں۔''

میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔''

''جناب! میری آنکھ بارش کی وجہ سے کھلی تھی۔'' وہ سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، رات کو میں نے سونے کے لیے اپنی چارپائی کھلے میں بچھائی تھی۔ جب بارش شروع ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ میری آنکھ ایسے موقع پر کھلی تھی جب میں خواب کے انتہائی سنسنی خیز موڑ پر کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں وہ منظر تازہ تھا جب میں نے اس پراسرار عورت کو قبرستان سے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے خواب میں جو کچھ دیکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ قدرت نے خواب کے ذریعے مجھے خبردار کیا ہے کہ میں فی الفور، اس قبرستان میں ہونے والی کسی غیر قانونی سرگرمی کا جائزہ لوں۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں نے چارپائی کو وہیں بارش میں پڑا بھیگنے دیا اور خود تیز قدموں سے قبرستان کے شمالی حصے کی سمت بڑھنے لگا۔''

وہ ایک مرتبہ پھر سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جناب! آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرا کمرا قبرستان کے جنوبی حصے میں ہے جبکہ میں نے اس عورت کو جس قبر کے ساتھ مصروفِ عمل دیکھا تھا وہ شمالی حصے میں ہے۔ آپ کو یہ بات بھی معلوم ہے کہ یہ قبرستان دراصل ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہو جس پر چھوٹی بڑی قبریں چن دی گئی ہوں۔ میرے کمرے میں بیٹھ کر قبرستان کی شمالی قبروں کو دیکھنا ممکن نہیں کیونکہ یہ ٹیلا درمیان سے اتنا بلند ہے کہ جنوب میں کھڑے ہوں تو شمال میں نظر نہیں جاتی مگر خواب میں یہ نشیب و فراز بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں رہتے ہوئے اس عورت کو بڑی آسانی سے دیکھ رہا تھا لیکن آنکھ کھلنے کے بعد جب میں باہوش و حواس قبرستان کے شمالی حصے کی طرف بڑھنا شروع کیا تو وہاں موجود قبریں مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہوا۔ میں بڑی دلچسپی سے ہمہ تن گوش رہا تو اس نے آگے کا احوال بیان کرنا شروع کیا۔

''تھوڑی سی کوشش کے بعد میں قبرستان کے شمالی حصے میں پہنچ گیا لیکن وہاں پر مجھے کسی عورت کے آثار نظر نہ آئے۔ میں نے جہاں تک ممکن تھا، نگاہ دوڑا کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر ڈالی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں تھکے قدموں کے ساتھ اس قبر کی جانب بڑھ گیا جہاں میں نے اس عورت کو کوئی کارروائی کرتے دیکھا تھا۔ چند لمحات کے بعد میں مذکورہ قبر پر پہنچ گیا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''پندرہ بیس دن پہلے گاؤں کے ایک شخص خیر دین کا انتقال ہوا تھا۔ یہ قبر خیر دین ہی کی تھی۔ خیر دین کے گھر والوں نے ابھی اس کی قبر پختہ نہیں کروائی نہیں تھی کہ موسمِ برسات شروع ہوگیا۔ برستی بارش میں تعمیر کا کام شروع کرنا سراسر حماقت ہوتی لہٰذا فی الحال انہوں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا، تاہم بارش کے اثرات سے بچانے کے لیے خیر دین کے گھر والوں پر اس کی قبر پر ترپال کا ایک ٹکڑا ڈال دیا تھا۔ میں جب مذکورہ قبر کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ ترپال قبر کے اوپر سے ہٹا ہوا تھا۔ میں نے اندھیرے میں قبر کے چاروں جانب نگاہ دوڑائی لیکن ننھا منا بچہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میرے ذہن میں اس خطرناک سوال نے سر اُبھارا..... کیا وہ عورت بچے کو اس قبر میں دفن کرنے کے بعد قبرستان سے فرار ہوئی ہے؟

اس نے خاموش ہو کر ایک جھرجھری لی پھر سلسلۂ کلام کو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والا سوال تھا۔ میں اُکڑوں بیٹھ کر بغور اس قبر کا جائزہ لینے لگا پھر ساری صورتِ حال مجھ پر عیاں ہوگئی۔ قبر کی حالت نے مجھے بتا دیا کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی گئی ہے۔ اگرچہ وہاں اندھیرا تھا لیکن تھانے دار صاحب! میری پوری زندگی اسی قبرستان میں گزری ہے۔ یہاں کے چپے چپے کو میں آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتا ہوں، اندھیرا کیا حیثیت رکھتا ہے۔ میں اُلٹے قدموں اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو میں حاجی کریم اور اس کے بیان کردہ سنسنی خیز واقعے پر غور کرنے لگا۔ اس انکشاف نے میرے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ سی دوڑا دی تھی کہ کوئی حسین و جمیل عورت کسی ننھے منے بچے کو ایک قبر میں دفن کر کے بڑے پُراسرار انداز میں وہاں سے غائب ہوگئی تھی۔ مذکورہ عورت کے حسن و جمال اور خوبصورتی کے بارے میں گورکن نے مجھے بتایا تھا اور اس نے یہ سب کچھ خواب میں دیکھا تھا ورنہ رات کی تاریکی میں اتنے فاصلے سے کسی پیپل اور کیکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے درمیان میں تمیز کرنا ممکن نہیں..... کجا یہ کہ کسی عورت کے جوبن اور رعنائی کا مشاہدہ کرلیا جاتا پھر قبرستان کا شمال جنوب، مشرق مغرب نشیبی حصے تھے اور اس کا وسط کسی چھوٹی پہاڑی کے مانند سر اٹھائے کھڑا تھا لہٰذا شمال سے جنوب میں یا مشرق سے مغرب میں دیکھنا ناممکنات میں سے تھا۔

مجھے منتظر پا کر عبدالکریم اپنے بیان کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنی بھیگی ہوئی چارپائی اور سرہانے کو کمرے کے اندر پہنچایا اور اسی عجیب وغریب واقعہ کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ایسا منظر میں نے اپنی پوری زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا..... نہ تو خواب میں اور نہ ہی جاگتی آنکھوں کے ساتھ۔ رات میں نے خواب میں جو کچھ دیکھا، آنکھ کھلنے کے بعد اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ رات کا باقی حصہ میں نے یہی سوچتے ہوئے گزار دیا کہ یا الٰہی! یہ کیا ماجرا ہے۔ میں جس قدر سوچتا جارہا تھا، میرا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ اسی سوچ بچار میں صبح ہوگئی اور پھر..... میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔'' اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور خاموش ہوکر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بیان کردہ کہانی سنی تھی۔ جہاں تک اس کے خواب کا تعلق تھا تو میرے خیال میں یہ قدرت کی طرف سے اس کے لیے ایک اشارہ تھا کہ وہ قبرستان میں ہونے والی اس کارروائی سے باخبر ہوجائے، خاص طور پر اس نے یہ خواب رات کے آخری حصے میں دیکھا تھا۔ ان لمحات میں دیکھے گئے اکثر خواب سچے ہوتے ہیں۔ حاجی کریم کا خواب تو اتنا دُرست اور برمحل تھا کہ اسے اس خواب کی تعبیر معلوم کرنے کے لیے کہیں آنے جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی ''تعبیر'' عملی شکل میں اس کے سامنے آ گئی تھی۔ ایک بات ذہن میں رہے کہ میں نے ابھی جو تجزیہ پیش کیا ہے اس کا انحصار گورکن کے بیان کی سچائی پر ہے۔ اگر حاجی کریم نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی تو پھر وہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا جو میں نے بیان کیا ہے، بصورتِ دیگر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اپنے سامنے بیٹھے حاجی کریم کو دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔ ''حاجی! کیا تھانے آنے سے پہلے تم نے اس قبر کا دوبارہ جائزہ لیا تھا جہاں رات خواب میں تم نے اس عورت کو کسی پُراسرار کارروائی میں مصروف دیکھا تھا..... میرا مطلب ہے صبح کی روشنی میں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ''جی تھانے دار صاحب! میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔ میں نے جس ترپال کا ذکر کیا ہے وہ قبر پر سے ہٹا ہوا ہے اور اس قبر کی حالت بھی یہی بتاتی ہے کہ اسے کھولنے کے بعد دوبارہ بند کیا گیا ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آرہا ہو تو چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔''

''وہ تو میں دیکھوں گا ہی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن پہلے تمہاری طرف سے تسلی تو کرلوں؟''

''کیسی تسلی تھانے دار صاحب؟'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''حاجی کریم! میں خوابوں اور ان کی تعبیروں پر یقین رکھتا ہوں۔ تم نے جو خواب دیکھا اس کی تعبیر بھی فوراً تمہارے سامنے آ گئی لیکن ایک بات کو ذہن میں رکھنا کہ اس کے ساتھ ہی میں ایک سخت گیر تھانے دار بھی ہوں۔ تفتیش و تحقیق کے سلسلے میں، میں ذرا بھی رو رعایت کا قائل نہیں ہوں۔''

میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری طرف سے تسلی کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ مجھے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم نے یہ کہانی سناتے ہوئے کسی دروغ گوئی سے کام تو نہیں لیا؟''

''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا جناب!'' اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج بھی شامل تھا۔ ''میں نے جو کچھ دیکھا، جو کچھ محسوس کیا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے، میری بات پر یقین کریں یا نہ کریں۔''

''میں تمہاری بات پر یقین کررہا ہوں اسی لیے تم سے کھل کر یہ کہا ہے۔'' میں نے بدستور گمبھیر انداز میں کہا۔ ''میری نظر میں اب تک تمہارا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ گاؤں والوں کو بھی تم سے کوئی شکایت نہیں اسی بنا پر مجھے تم پر بھروسا ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی ہوگی لیکن اگر میں تم پر اعتماد کرنے میں کوئی غلطی کررہا ہوں تو اس کے خطرناک نتائج کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔''

میں نے تھوڑا توقف کیا پھر خاصے سنگین لہجے میں کہا۔ ''اگر کسی موقع پر کسی مرحلے میں یہ بات سامنے آئی کہ تم نے اپنے بیان میں کوئی گڑبڑ کی ہے تو میں تمہارے ساتھ جو سلوک کروں گا اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

''انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ پورے یقین سے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں!'' میں نے پُرمعنی انداز میں گردن ہلائی۔ ''ایسا نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔''

حاجی کریم نے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ میرے ساتھ قبرستان چل رہے ہیں نا؟''

''ہاں، قبرستان جا کر خیر دین کی قبر کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔'' میں نے سرکو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''تم باہر جا کر بیٹھو۔ ہم تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے کانسٹیبل مراد علی کو مخاطب کرتے ہوئے باآواز بلند کہا۔ ''اے ایس آئی صاحب کو میرے پاس بھیج دو۔''

اگلے ہی لمحے اے ایس آئی افتخار باجوہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔

☆☆☆

وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔

تھوڑی دیر پہلے تک میں خاصا مایوس ہو چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ آدھی رات کو گھنٹا، ڈیڑھ گھنٹا قبرستان میں گزار کر ہم نے محض جھک ماری تھی۔ ہم جس نامعلوم عورت کے انتظار میں وہاں بیٹھے تھے شاید اسے ہماری اس پہرے داری کا پتا چل گیا ہے لہٰذا کم از کم آج کی رات تو وہ اِدھر کا رُخ نہیں کرے گی..... اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ گورکن حاجی کریم نے ہی غلط بیانی سے کام لیا ہو اور اس دروغ گوئی کے پیچھے اس کا اپنا کوئی گہرا مقصد چھپا ہوا ہو۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور یہ ''کچھ بھی'' چونکہ واضح نہیں تھا لہٰذا مجھے اُلجھن میں ڈال رہا تھا۔ میری بوریت جھنجلاہٹ میں بدل چکی تھی اور میں اس جاسوسی کو خیر باد کہنے ہی والا تھا کہ حوالدار کی سنسنی خیز سرگوشی نے میرے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑا دی تھی۔ اس کی اطلاع موسمِ خزاں میں بہار کے کسی تازہ جھونکے کے مانند تھی۔ میں اس کے اشارے کی تقلید میں قبرستان کے شمالی حصے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

واقعی وہ اس جانب سے قبرستان میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ بہ آہستگی قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی سبک خرامی سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زمین پر چل نہ رہی ہو بلکہ ہوا میں تیرتے ہوئے پیش قدمی کر رہی ہو۔ وہ ایک مبہوت کر دینے والا منظر تھا۔

رات کی تاریکی میں اسے دیکھ لیے جانے کا سب سے بڑا سبب اس کا لباس تھا۔ وہ اس وقت مکمل طور پر سفید لباس میں تھی۔ حاجی کریم نے بھی خواب میں اسے اسی سفید لباس میں دیکھا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اس پُراسرار اور معمّا عورت کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں کر سکا تھا کیونکہ بیدار ہونے کے بعد جب تک وہ مذکورہ قبر یا قبرستان کے متعلقہ حصے میں پہنچتا، وہ نگاہ سے اوجھل ہو چکی تھی مگر ہم دونوں اسے کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ فوراً حوالدار کی نظر میں یوں بھی آ گئی تھی کہ ہم اسی کے انتظار میں نظر جمائے وہاں بیٹھے تھے۔

ہم نے جن گنجان جھاڑیوں میں پوزیشن سنبھال رکھی تھی، وہ قبرستان کے مغربی حصے میں واقع تھیں جبکہ اس عورت نے شمالی سمت سے انٹری دی تھی۔ ایک خاص زاویے پر موجود ہونے کے سبب ہمیں وہ مقام واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا جہاں سے اس عورت کو قبرستان میں داخل ہونا تھا اور..... وہ ہماری توقع کے عین مطابق وہیں سے وارد ہوئی تھی۔

ہم سانس روکے، یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ محتاط روی سے بہ آہستگی قدم قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ جس قبر کے بارے میں حاجی کریم نے بتایا تھا وہ ایک حساب سے شمالی داخلی مقام اور ان جھاڑیوں کے درمیان واقع تھی جہاں ہم گھات لگائے بیٹھے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ خیر دین کی قبر پر پہنچ گئی۔

حوالدار منصور گوندل نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لاتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''ملک صاحب! میرا خیال ہے، ہمیں حرکت میں آ جانا چاہیے۔''

''لیکن فی الحال میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔'' میں نے بھی جواباً سرگوشی میں کہا۔

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر ہم نے دیر کر دی تو کہیں وہ غائب.....!''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا گوندل صاحب!'' میں نے اس بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''وہ اس وقت تک واپس نہیں جائے گی جب تک وہ سب کچھ نہ کر لے جس کے بارے میں کریم نے ہمیں بتایا ہے۔''

حوالدار منصور گوندل نے خاموشی اختیار کر لی۔

حاجی کریم نے دوسری رات..... یعنی پانچ اگست کی رات کو بھی اس عورت کی جھلک دیکھی تھی لیکن اس مرتبہ خواب بیچ میں کہیں موجود نہیں تھا۔ اس نے وہ منظر گزشتہ رات کھلی آنکھوں سے انہی جھاڑیوں میں چھپ کر دیکھا تھا۔ وہ میری ہدایت کے مطابق گزشتہ رات قبرستان کے اس حصے کی خفیہ نگرانی کر رہا تھا کہ آدھی رات کے بعد وہ عورت ایک بار پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں وارد ہوئی تھی۔ وہ خیر دین کی قبر کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ حاجی کریم کے بیان کے مطابق اس عورت نے اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک تھیلے میں سے کچھ برآمد کیا تھا۔ بعد میں اسے پتا چلا کہ وہ اگربتیوں والا پیکٹ تھا۔ اس نے ماچس کی مدد سے چند اگربتیوں کو سلگا کر مذکورہ قبر پر لگا دیا تھا پھر ایک ڈبے میں سے کچھ نکال کر وہ قبر پر چھڑکنے لگی تھی۔ اس منظر نے حاجی کریم کو مبہوت کر دیا تھا۔ وہ اس عورت کی حرکات و سکنات میں اس قدر محو ہوا کہ اسے مطلق پتا نہ چلا، وہ کب وہاں سے رُخصت ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا اس پُراسرار عورت نے حاجی پر کوئی طلسم پھونک دیا ہو۔ اگلے روز یعنی آج صبح وہ ایک مرتبہ پھر تھانے میں میرے سامنے بیٹھا گزشتہ رات کی سحر انگیز کتھا سنا رہا تھا۔ اس کی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی سن کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج کی رات میں بہ نفسِ نفیس اس قبرستان میں پہرا دوں گا اور دیکھوں گا وہ سفید لبادے والی کون سا جادو جانتی ہے..... اور میں اسی سلسلے میں اس وقت حوالدار منصور گوندل کے ہمراہ وہاں موجود تھا۔

خیر دین کی قبر پر پہنچنے کے بعد وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے تھیلے میں سے ٹٹول کر کچھ نکالا اور اس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ حاجی کریم کے مطابق اسے اگربتیاں سلگا کر خیر دین کی قبر پر لگانا تھیں۔ اس کے بعد اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک ڈبے میں سے کچھ نکال کر مذکورہ قبر پر چھڑکنا تھا۔ میں پوری توجہ سے اس کی کارکردگی کا جائزہ لینے لگا۔

جب اس عورت نے ماچس جلائی تو ظاہر ہے روشنی پیدا ہوئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں ماچس کی جلتی ہوئی تیلی تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس کے یقیناً اگربتیاں ہوں گی۔ دیا سلائی کی مخصوص اور محدود روشنی اس عورت کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔ میں اس کے دُھندلے دُھندلے نقش و نگار دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نظارے نے میرے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اگر میری نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو میں نے اس عورت کو پہچان لیا تھا۔

''اچھا..... تو تم ہو!'' بے ساختہ میرے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

حوالدار نے اسی لمحے حیرت بھری سرگوشی کی۔ ''تم کون؟''

''شی.....!'' میں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

☆☆☆

انتظار باجوہ کو قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اسے اپنے پاس کیوں بلایا ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

''ملک صاحب! لگتا ہے حاجی کریم کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

''پہلے مجھے بھی یہی لگا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ بے اعتباری سے بولا۔ ''بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے جناب؟''

''نہیں ہو سکتا نا..... ٹھیک ہے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ہم بغیر کسی کارروائی کے حاجی کریم کے بیان کو جھٹلا نہیں سکتے۔ ایک شخص شکایت یا فریاد لے کر ہمارے پاس آیا ہے لہٰذا قانونی کارروائی لازمی ہے کیونکہ ہم باتیں کرنے کے لیے یہ تھانہ سجائے یہاں نہیں بیٹھے۔ ہم لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے یہاں تعینات ہیں۔ اس تھانے کی حدود میں جو بھی گاؤں دیہات اور چک وغیرہ آتے ہیں وہاں کے رہائشیوں کو پیش آنے والی مشکلات کا مداوا ہم نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''حاجی عبدالکریم المعروف بہ حاجی گورکن نے مجھے جو کہانی سنائی ہے، اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں چیک کر کے ہم اس کے بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا کہنا ہے کہ خیر دین کی قبر کو کھولنے کے بعد دوبارہ بند کیا گیا ہے۔ ازیں علاوہ قبر پر ڈالا ہوا ترپال بھی اپنی جگہ سے ہٹا ہوا ہے پھر حاجی کا خیال ہے کہ اس عورت نے کسی معصوم بچے کو اس قبر میں دفن کیا ہے۔ یہ ساری ایسی باتیں ہیں جنہیں ہم باآسانی چیک کر سکتے ہیں، بس قبرستان میں پہنچنا شرط ہے..... اور میں نے تمہیں اس لیے اپنے پاس بلایا ہے کہ ہم دونوں حاجی کریم کے ساتھ قبرستان پہنچیں گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، آپ کیا کرنا چاہتے ہیں اور مجھے اس بات کی بھی بے حد خوشی ہے کہ آپ نے اس مشن کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ آپ کے ساتھ فیلڈ میں کام کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ آپ صحیح معنوں میں محکمۂ پولیس کے ''فیلڈ مارشل'' ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ سچے دل سے میری تعریف کر رہا تھا۔ ظاہر ہے تعریف کسے اچھی نہیں لگتی۔ مجھے بھی بہت اچھی لگ رہی تھی لیکن اس ''تعریف'' کے بارے میں بڑے بوڑھے بڑے واضح الفاظ میں یہ کہہ گئے ہیں اس سے بہت محتاط رہنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جب کوئی آپ کی تعریف کرے تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ آپ واقعی ''ویسے'' ہیں جیسا تعریف کرنے والا آپ کو سمجھ رہا ہے کیونکہ ایسا سمجھنے سے عموماً دماغ خراب ہوجاتا ہے۔ اس کے بدلے یہ کوشش کرنا چاہیے کہ آپ کو ''جیسا'' سمجھا جارہا ہے، ویسا ہی اچھا ثابت بھی ہوتے رہیں۔ اس سعی میں دماغ اس قدر مصروف ہوجاتا ہے کہ اسے خراب ہونے کا ہوش ہی نہیں رہتا اور آپ اپنے ''ٹائٹل'' کا دفاع کرنے میں کامران رہتے ہیں۔

میں نے اے ایس آئی افتخار باجوہ کے تعریفی کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میری پلاننگ سے اتفاق کرتے ہو تو فوراً قبرستان جانے کی تیاری کرو۔ ابھی بارش نے زور نہیں پکڑا۔ میرا خیال ہے چھتریوں کے سائے تلے ہم یہ مشن سرکر آئیں گے۔''

''او کے سر!'' اس نے حکم بجالانے والے انداز میں کہا پھر قدرے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے ملک صاحب!''

''کون سی بات؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''قبر کے اندر کا حال جاننے کے لیے ہمیں خیر دین کی قبر کو کھولنا پڑے گا۔''

''ظاہر ہے، یہ تو کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''میرے خیال میں اس کام کے لیے خیر دین کے لواحقین کی اجازت ضروری ہے۔''

''بالکل ضروری ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی ہے۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ تمہاری اپروچ بالکل دُرست ہے۔ مجھے یقین ہے تم آگے چل کر بہت ترقی کرو گے۔''

وہ ''تعریف'' سے متعلق بزرگوں کے ''اُصول'' پر عمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! تو آپ نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے؟''

اس کے سوال کرنے کا انداز انتہائی سرسری اور بیگانگی لیے ہوئے تھا جیسے اس نے میری بات کے اختتامی کلمات پر بالکل توجہ نہ دی ہو۔ میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا پھر اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''خیر دین مرحوم کا سابق گھر ہمارے تھانے اور قبرستان کے بیچ میں پڑتا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے کے بعد اس گھر کو کچ کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ اُمید ہے اس کا بیٹا کمال دین ضرور گھر پر موجود ہوگا۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ خیر دین کے لواحقین میں وہی سب سے زیادہ اہم ہے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔'' اے ایس آئی تائید کرتے ہوئے بولا پھر اس نے کہا۔ ''میں قبرستان جانے کی تیاری کرتا ہوں۔ آپ بھی تیار ہوجائیں۔''

''میں تو سمجھو..... بالکل تیار بیٹھا ہوں۔''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

خیر دین کے سوگواران میں اس کا اکلوتا بیٹا کمال دین اور اس کے بیوی بچے شامل تھے۔ کمال دین کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ اس کی بیوی کا نام عابدہ تھا۔ کمال دین کی چار اولادیں تھیں، ایک بیٹا اور تین بیٹیاں جن کے نام علی الترتیب کچھ اس طرح تھے فاروق، خالدہ، سلمٰی اور نرگس جبکہ عمریں پندرہ، بارہ، آٹھ اور پانچ سال تھیں۔ خیر دین باسٹھ سال کی عمر میں طبعی موت مرا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ہم اپنے سروں پر چھتریاں تانے تھانے سے نکل آئے۔ اس وقت باقاعدہ زوردار بارش نہیں ہو رہی تھی بلکہ ہلکی پھلکی بوندا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ اگر دُھواں دھار بارش شروع ہوجاتی تو ہمارے لیے دُشواریاں پیدا ہوسکتی تھیں۔ میرے اور اے ایس آئی کے علاوہ گورکن حاجی کریم بھی ہمارے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر بعد پتا چل جانا تھا کہ اس کی سنائی ہوئی کہانی میں کتنی حقیقت تھی اور کس قدر فسانہ۔

ان دنوں میں موضع فتح گڑھ کے تھانے میں تعینات تھا۔ یہ تھانہ گاؤں کے مشرقی کنارے سڑک کے ساتھ واقع تھا۔ یہ نیم پختہ سڑک شمالاً جنوباً رواں دواں تھی۔ موضع فتح گڑھ اور ٹیلے والے قبرستان کے درمیان کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ مذکورہ قبرستان کے تین اطراف کھیت ہی کھیت واقع تھے۔ شمال میں قبرستان کے اختتام پر چند ایک کھیت تھے پھر نہر آجاتی تھی جو مشرق سے مغرب کی سمت بہتی تھی۔ نیم پختہ سڑک جس کے کنارے ہمارا تھانہ واقع تھا وہ مذکورہ نہر کے پل سے گزر کر آگے چلی جاتی تھی۔ موضع فتح گڑھ کے مشرق میں نیم پختہ سڑک کے پار راج کوٹ، شمال میں نہر کے اس طرف جمال پور، جنوب میں چک بہتر، مغرب میں کھونے والی اور شمال مشرق میں موضع چنی وال نامی گاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقع تھے۔ فتح گڑھ کے جغرافیے کی تفصیل بیان کرنے کا ایک خاص مقصد ہے جس کا اندازہ آپ کو کہانی پڑھنے کے دوران بخوبی ہو جائے گا۔

ہم تھوڑی دیر کے بعد مرحوم خیر دین کے گھر پہنچ گئے۔ خیر دین کے بیٹے کمال دین کو ہم نے اپنے ساتھ لیا اور آگے بڑھ گئے۔ کمال دین حیران تھا کہ اس برستی بارش میں ہم اسے اپنے ساتھ کہاں لے جا رہے ہیں مگر جب راستے میں، میں نے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ شانت ہو گیا تاہم کسی معصوم بچے کی اس کے باپ کی قبر میں ''تدفین'' کے حوالے سے وہ گہری تشویش میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔

کمال دین کا گھر گاؤں کے شمال میں کنارے پر واقع تھا۔ گاؤں کے اس حصے سے ایک پتلی سی پگڈنڈی کھیتوں کے بیچوں بیچ لہراتی بل کھاتی سیدھی قبرستان تک چلی گئی تھی۔ ہم مذکورہ پگڈنڈی پر چلتے ہوئے قبرستان پہنچ گئے پھر جیسے ہی ہم نے قبرستان میں قدم رکھا، بارش ایک دم تیز ہو گئی۔

''لگتا ہے یہ ہمارے قبرستان پہنچنے ہی کا انتظار کر رہی تھی۔'' حاجی کریم نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''اب تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''حاجی! قدرت کے کاموں پر اس قدر جھنجلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی ہر ادا میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، جو عام طور پر کم عقل انسانوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جو مشکلات اور دشواریاں پیدا کرتا ہے وہی اپنے ان بندوں کے لیے آسانیاں بھی فراہم کر دیتا ہے جو اس کی نازل کی ہوئی مشکلات اور مصائب کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے ہیں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' حاجی فوراً ہی پٹری پر آ گیا۔

قبرستان کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی گورکن کا کمرا تھا۔ اس سے متصل جنازہ گاہ تھی۔ اس جنازہ گاہ میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی بنی ہوئی تھی۔ یوں کہا جا سکتا تھا کہ وہ مسجد، جنازہ گاہ کا اور جنازہ گاہ، مسجد ہی کا حصہ تھی۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گورکن کے کمرے میں گھس گئے۔ اس دوران بارش اور تیز ہو گئی تھی۔

گورکن کا کمرا پندرہ بائی پندرہ فٹ پیمایش کا حامل ایک مربع سا تھا جس میں برائے نام سامان نظر آ رہا تھا۔ اس کمرے میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا لہٰذا زیادہ ساز و سامان کی اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ میری معلومات کے مطابق کریم اپنی والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ جب اس کے والد حاجی عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا تو کریم اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ قبرستان کے معاملات کو باآسانی سنبھال سکے۔ اس نے اپنے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے سارا ''کام'' سیکھ لیا تھا۔ چند سال بعد اس کی ماں نذیراں بی بی بھی چل بسی۔ حاجی کریم کو ایک طرح سے یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ماں باپ کی قبریں کھودی تھیں اور انہیں اسی قبرستان کی زمین میں اتارا تھا۔ میری معلومات کے مطابق حاجی کریم نے شادی نہیں کی تھی۔ وجہ کوئی بھی ہو، اس سے بحث نہیں بہرحال، وہ اس قبرستان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اب اس کی شادی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا اس نے ڈھیر ساری قبروں اور ان میں مدفون مردوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

اے ایس آئی نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! اتنی تیز بارش میں قبر کو کھولنا مناسب نہیں ہوگا ورنہ دیکھتے ہی دیکھتے قبر پانی سے بھر جائے گی۔''

''مناسب نہیں..... اسی لیے تو فوری طور پر کھدائی کا کام شروع نہیں کیا جا رہا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

کمال دین تشویش بھرے انداز میں بولا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔ ''تھانے دار صاحب! میں قانونی معاملات میں روک نہیں بنوں گا اس لیے آپ اپنے فرائض کے تقاضے ضرور پورے کریں گے لیکن آپ سے میری صرف ایک ہی درخواست ہے کہ..... ابا جی کی لاش کی بے حرمتی نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے کمال دین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے تھپکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں جو کچھ بھی کروں گا، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی کروں گا۔ اگر تم کسی مرحلے پر محسوس کرو کہ تمہارے باپ کی لاش یا قبر کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی ہو رہی ہے تو تم فوراً مجھے روک دینا۔''

میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کمال دین سے کہا۔ ''اگر مجھے من مانی کرنا ہوتی تو تمہیں ساتھ لیے بغیر بھی قبرستان آ سکتا تھا۔ تمہیں کانوں کان خبر نہ ہوتی اور میں چپکے سے اپنا کام کر کے چلا جاتا لیکن نہیں..... میں اس طریقہ کار کا قائل نہیں ہوں۔ میں قبر کے تقدس سے بخوبی واقف ہوں۔ تمہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں تمہاری اجازت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بغیر ایک قدم بھی نہیں اٹھاؤں گا۔''

وہ مطمئن دکھائی دینے لگا، تشکرانہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی ہے تھانے دار صاحب!''

میں نے تسلی بھرے انداز میں ایک مرتبہ پھر اس کا کندھا تھپتھپا دیا۔

پر گزرتے لمحے کے ساتھ بارش تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ میں چارپائی سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس آ گیا۔ حاجی کریم کے کمرے کی یہ اکلوتی کھڑکی شمال میں قبرستان کی طرف کھلتی تھی۔ اس کھڑکی کے توسط سے لگ بھگ آدھا قبرستان دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ قبرستان چونکہ ٹیلا نما تھا لہٰذا دوسری طرف کا حصہ نظر نہیں آتا تھا اور خیر دین کی قبر بھی اسی دکھائی نہ دینے والے حصے میں واقع تھی..... وہی قبر جہاں حاجی کریم کے مطابق گزشتہ رات ایک حسین و جمیل عورت نے کسی معصوم بچے کو دفن کیا تھا۔

میں نے قبرستان کی جانب آتے ہوئے کمال دین کو اپنے مقصد سے آگاہ کر دیا تھا تاہم گورکن کے خواب کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔ اس سے خوامخواہ اس کا ذہن اُلجھتا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ گورکن کو شک ہوا ہے کسی نے خیر دین کی قبر میں کوئی شے چھپائی ہے۔ ہم قبر کو کھول کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے اور..... کمال دین نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد مجھے اس کام کی اجازت دے دی تھی۔

اگر وہ اجازت نہیں بھی دیتا یا میں اسے اعتماد میں نہیں بھی لیتا تو مجھے قبر کی کھدائی سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ میں البتہ اگر چاہتا تو کارِ سرکار میں حارج ہونے والوں کو زبردستی روک سکتا تھا مگر میں ذرا مختلف انداز میں کام کرنے کا عادی ہوں۔ اگر گھی سیدھی اُنگلی کے اشارے پر خود بخود چلتا آرہا ہو تو اُنگلی کو ٹیڑھا کرنا سراسر حماقت ہوتی ہے پھر..... میرے نزدیک انسانی جذبات اور احساسات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اگر کوئی انتہائی سنگین نوعیت کا معاملہ نہ ہو تو میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا ہوں کہ میرے کسی عمل سے کسی کی دل شکنی یا دل آزاری نہ ہو۔ کمال دین چونکہ اس معاملے میں کسی بھی طور ملوث نہیں تھا لہٰذا اس کے جذبات کا خیال رکھنا اور بھی ضروری تھا۔ اس کے سر کے سائے خیر دین کو اس دنیا سے رُخصت ہوئے چند دن ہی گزرے تھے۔

اسی سوچ کی بازی گری کے دوران مجھے گورکن کا خیال آ گیا۔ میں نے بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''عبدالکریم! تم کس سن میں حج پر گئے تھے؟''

''جی.....'' اس کی گڑبڑائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ''میں تو کبھی حج پر نہیں گیا۔''

''پھر تمہارے نام کے ساتھ ''حاجی'' کیوں لگا ہوا ہے؟''

''میں نے تو نہیں لگایا جناب!''

''پھر کس نے لگایا ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے جناب کہ اماں بتاتی تھیں..... میری پیدائش سے پہلے ابا حج کرنے عرب گئے تھے۔ جس دن وہاں مکہ شریف میں حج ہو رہا تھا اسی روز اس قبرستان میں، میں پیدا ہوا۔ جب ابا حج سے واپس آئے تو انہوں نے پیار سے مجھے گود میں اٹھایا اور کہا، میرا بچہ حج والے دن اس دُنیا میں آیا ہے اس لیے یہ بھی حاجی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''بس، وہ دن اور آج کا دن..... ''حاجی'' کا لفظ میرے نام کے ساتھ نتھی ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی مجھے ''حاجی کریم'' کہتا ہے اور کوئی ''حاجی عبدالکریم'' اور..... کوئی صرف ''حاجی'' میں کسی کو روکتا ٹوکتا نہیں ہوں۔ کوئی کچھ بھی کہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس، اتنی سی بات ہے جناب!''

وہ اپنے نام کی وجہ تسمیہ بیان کرنے کے بعد خاموش ہوا تو اے ایس آئی افتخار باجوہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کتنی عجیب بات ہے کہ لوگوں کو مرنے کے بعد قبرستان لایا جاتا ہے اور تم پیدا ہی قبرستان میں ہوئے ہو۔''

کریم بڑی سادگی سے بولا۔ ''جناب! جو حقیقت ہے وہ میں نے بیان کر دی۔ اس میں عجیب یا حیرت والی کوئی بات نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''باجوہ صاحب! قدرت کا نظام بڑا دلچسپ اور پُراز معنی ہے۔ وہ رات کے بطن سے دن پیدا کرتا ہے اور دن کی کوکھ سے رات کو جنم دیتا ہے۔ اسی طرح موت و حیات بھی ہے۔ زندگی کے اندر سے موت اور موت کے بیچ سے زندگی کو نکالنا اس کے لیے نہایت ہی آسان کام ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ کسی کو مرنے کے بعد قبرستان میں لائے یا قبرستان ہی میں پیدا کرے، اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے اور جو اس کی مرضی میں خوش رہتے ہیں وہ ان سے خوش رہتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری بات ختم ہوئی تو گورکن کے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہاں موجود وہ تینوں افراد میری بات کی گہرائی میں اتر گئے تھے۔ کمرے کے اندر سناٹا راج کر رہا تھا لیکن باہر چھم چھم مینہ برس رہا تھا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''باجوہ صاحب! یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے تو پورا دن نکل جائے گا۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہم یہاں ایک خاص مقصد سے آئے ہیں اور ہمیں اپنے مقصد پر نظر رکھنا چاہیے۔''

''لیکن اس دُھواں دھار بارش میں.....!''

''بارش تو ہوتی رہے گی۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور ہم نے اس کے رُکنے کا انتظار بھی کرلیا۔ وہ نہیں رُکی تو ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ میں اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کوئی آئیڈیا استعمال کریں۔''

''آئیڈیا..... کیسا آئیڈیا؟'' وہ متذبذب انداز میں مستفسر ہوا۔

میں اے ایس آئی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے گورکن کی جانب متوجہ ہوا اور اس سے پوچھا۔ ''حاجی کریم! کیا تمہارے پاس کوئی بڑے سائز کا موم جامہ ہے؟''

''موم جامہ تو نہیں جناب.....!'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''البتہ، ایک ترپال رکھا ہے۔'' پھر اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔ ''لیکن آپ موم جامے سے کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور سرسری انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، ترپال موم جامے سے زیادہ اچھا کام کرے گا۔''

میں ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر انہیں اپنے منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ''ہم اس چارپائی پر ترپال ڈال کر خیر دین کی قبر تک جائیں گے۔'' میں نے کمرے میں موجود اکلوتی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کمال دین اور اے ایس آئی ترپال ڈلی چارپائی کو خیر دین کی قبر پر اٹھائے رکھیں گے اور حاجی کریم میری نگرانی میں کھدائی کرے گا۔ چارپائی کے نیچے خیر دین کی کھلی ہوئی قبر بالکل محفوظ رہے گی۔ ہم اگر مکمل طور پر بھیگ بھی جائیں تو پروا نہیں ہے۔''

ان سب نے میرے منصوبے پر صاد کیا پھر ہم اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے مذکورہ قبر کی سمت بڑھ گئے۔ کمال دین اور افتخار باجوہ نے ترپال ڈلی چارپائی اس انداز میں اٹھا رکھی تھی کہ وہ دونوں خود بھی اس کے نیچے آ گئے تھے۔ اس طرح چلنے میں تھوڑی دُشواری تو محسوس ہو رہی تھی لیکن بہرحال ہم چاروں بارش کے اثرات سے پوری طرح محفوظ ہو گئے تھے۔ حاجی کریم نے کھدائی کے لیے کدال بیلچہ وغیرہ بھی اٹھا رکھا تھا۔ جلد ہی ہم خیر دین کی قبر پر پہنچ گئے۔

اسی وقت ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آ گیا۔ ہم جیسے ہی قبرستان کے شمالی حصے میں واقع خیر دین کی قبر پر پہنچے، بارش کا زور اچانک ٹوٹ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دُھواں دھار سے پہلے بوندا باندی میں تبدیل ہوئی اور پھر بالکل ہی رُک گئی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اے ایس آئی نے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ نے بالکل سچ کہا تھا۔ جو اپنے بندوں کے لیے مشکلات اور دُشواریاں پیدا کرتا ہے وہی ان کی ثابت قدمی اور تگ و دو کو دیکھتے ہوئے آسانیاں بھی فراہم کر دیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔''

''ہاں، وہ قادرِ مطلق اپنے کسی بندے کو اس کی برداشت سے زیادہ بڑی آزمائش میں نہیں ڈالتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب ہمیں فوراً اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ رُکی ہوئی بارش دوبارہ بھی آ سکتی ہے۔''

بارش تھم جانے کے باعث خیر دین کی قبر پر ترپال والی چارپائی کا تنبو تاننے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی لہٰذا میری اجازت پاتے ہی حاجی کریم اپنے اوزار و آلات کو مذکورہ قبر پر آزمانے لگا۔ اس نے پہلے قبر پر پڑا ہوا ترپال کا ٹکڑا ہٹایا پھر کھدائی میں مصروف ہو گیا۔

ہم سب کی نظریں کوئی حیرت انگیز منظر دیکھنے کے لیے منتظر تھیں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس قبر کے اندر سے اس معصوم بچے کی لاش برآمد ہو گی جسے اس پُراسرار عورت نے گزشتہ رات تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مذکورہ قبر میں دفن کر دیا تھا۔

جب کسی معصوم بچے کو خفیہ طریقے سے ٹھکانے لگانے کا ذکر ہو رہا ہو تو ذہن میں ایک ہی سوال اُبھرتا ہے اور وہ یہ کہ اس بچے کی ولدیت مشکوک ہے۔ وہ بدنصیب کسی کے گناہ کا پھل ہے اور وہ گناہ گار دُنیا والوں سے اپنے عیب کو چھپانے کے لیے گناہ کے اس پھل کو زمین کے سینے میں چھپا رہا ہے۔

کچھ اسی نوعیت کے خیالات اس پُراسرار عورت کے حوالے سے میرے ذہن میں بھی چل رہے تھے لیکن جب کھدائی کا نتیجہ سامنے آیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھ ساتھ افتخار باجوہ، کمال دین اور حاجی کریم بھی حیران و پریشان کھڑے تھے۔ ہم سب کی نظریں قبر کے اندر نظر آنے والے منظر پر جمی تھیں اور وہاں ہمیں کوئی انہونا منا بچہ یا اس کی لاش دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ..... وہ کسی نومولود بچے کے سائز کا ایک پتلا تھا جو خیر دین کی لاش کے اوپر رکھا نظر آ رہا تھا۔ لاش کے اوپر سے میری مراد قبر کا اوپری حصہ ہے۔ اس عورت نے قبر کے بالائی حصے کو کھول کر وہ پتلا وہاں دبا دیا تھا۔ خیر دین کی لاش تو مضبوط تختوں کے نیچے قبر کی گہرائی میں پڑی تھی۔

میں بغور اس پتلے کا جائزہ لینے لگا۔ مذکورہ پتلا کپڑے سے بنے ہوئے کسی چھوٹے گڈے کے مانند تھا۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے ایسے ہینڈ میڈ گڈے تیار کیے جاتے ہیں جن کو نرم اور بچوں کے لیے محفوظ بنانے کی خاطر ان کے اندر روئی وغیرہ بھر دی جاتی ہے اور اس گڈے کے چہرے پر کڑھائی کی مدد سے باقاعدہ آنکھیں، ناک اور ہونٹ بھی کشیدہ کیے جاتے ہیں..... وہ بھی ایک ایسا ہی گڈا تھا۔

میرے حکم پر حاجی کریم نے مذکورہ گڈا قبر میں سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور اسی لمحے مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ میں نے دیکھا، اس گڈے کے سینے پر، عین دل کے مقام پر چند سوئیاں چبھی ہوئی تھیں۔ ان سوئیوں کو گڈے کے ''بدن'' میں اس طرح پیوست کیا گیا تھا کہ ان کے سرے بڑے واضح انداز میں نظر آ رہے تھے۔

اسی لمحے میری سماعت تک افتخار باجوہ کی سرسراتی ہوئی آواز نے رسائی حاصل کر لی۔ ''ملک صاحب! مجھے تو یہ جادو ٹونے کا کوئی چکر لگ رہا ہے۔''

''ہاں..... میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس عورت تک پہنچنا بہت ضروری ہے جس نے کسی سفلی عمل کے لیے یہ پتلا اس قبر میں دبایا ہے۔''

اے ایس آئی سرگوشی سے مشابہ لہجے میں بولا۔ ''اگر واقعی اس نامعلوم عورت نے اس پتلے کو یہاں دفن کیا ہے تو..... ورنہ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔''

میں نے سرد ست افتخار باجوہ کے شک بھرے انداز کو نظر انداز کر دیا اور گورکن کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''حاجی کریم! اس سے پہلے کہ بارش دوبارہ شروع ہو جائے، تم اس قبر کو اچھی طرح بند کر دو..... اور اس کے اوپر ترپال کا وہ ٹکڑا بھی ڈال دینا تاکہ بارش سے محفوظ رہے۔ اگر قدرت نے بارش روک کر ہمیں اس کارروائی کا موقع فراہم کر ہی دیا ہے تو ہمیں اس موقع سے پہلی فرصت میں بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے اور کمال دین تم.....''

میں نے خیر دین کے بیٹے کمال دین کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اس کام میں تم حاجی کی مدد کرو گے تاکہ جلد از جلد تمہارے باپ کی قبر کو ڈھنگ سے بند کیا جا سکے۔''

پھر میں نے قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں اس سے کہا۔

''کمال دین! میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض سے مجبور ہوں۔ اگر اس مسئلے کا کوئی اور حل موجود ہوتا تو میں تمہارے باپ کی قبر کو کبھی نہ کھولتا۔ بہرحال، مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ تمہیں اپنے باپ کی قبر کو ایک مرتبہ پھر مٹی دینا پڑ رہی ہے۔''

اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر یہ کہتے ہوئے وہ گورکن کی مدد کو لپک گیا۔ ''کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب! اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟''

میں نے اے ایس آئی کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔ جب ہم خیر دین کی قبر سے اتنے فاصلے پر آ گئے کہ حاجی کریم اور کمال دین ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو مطلق نہیں سن سکتے تھے تو میں نے افتخار باجوہ سے پوچھا۔

''ہاں، اب بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہے تھے..... اس پتلے اور اس عورت کے حوالے سے شاید تم کچھ اور سوچ رہے تھے؟''

''شاید نہیں، یقیناً ملک صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہاری اس منفرد سوچ سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔''

''یہ بات تو آپ ہی نے مجھے سکھائی ہے کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے آگے بڑھتی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہیں کس پر شک ہے؟'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس پُراسرار عورت پر یا گورکن حاجی کریم پر؟''

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے جواب دیا۔

''ملک صاحب! میں نے آپ کی زبانی جو کہانی سنی ہے وہ ظاہر ہے گورکن کی ہی سنائی ہوئی ہے۔ اگر واقعی حاجی کریم نے ایسا کوئی خواب دیکھا تھا تو پھر سب ٹھیک ٹھیک نظر آ رہا ہے لیکن اگر اس نے کسی غلط بیانی سے کام لیا ہے تو اس کی ذات کو شک سے پاک نہیں سمجھنا چاہیے۔'' وہ لمحے بھر کو رُکا تو میں پوری توجہ سے اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے خاموش پا کر اس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''یہ بات طے ہے کہ گورکن نے جاگتی آنکھوں سے کسی عورت کو نہیں دیکھا۔ خواب کا سہارا لے کر وہ ہمارے ساتھ کوئی گیم بھی تو کھیل سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے یہ پتلا خود اسی نے کسی خاص مقصد کی خاطر خیر دین کی قبر میں چھپایا ہو؟''

میں نے تسلی سے اے ایس آئی کی بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے تفتیش کے لیے ایک ٹھوس شک کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی موجود ہے۔ میں نے اگر حاجی کریم کو چھوٹ دے رکھی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اسے بری الذمہ سمجھتا ہوں لیکن تمہاری ایک بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔''

''کون سی بات ملک صاحب؟'' اس نے اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہی کہ وہ پتلا خود گورکن نے کسی خاص مقصد کے تحت خیر دین کی قبر کے اندر رکھا تھا۔ اگر یہ اسی کی حرکت ہوتی تو پھر اس کارروائی کے بارے میں بتانے کے لیے اسے میرے پاس تھانے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح گورکن کا وہ خاص مقصد تو فوت ہو جاتا جسے حاصل کرنے کے لیے اس نے خیر دین کی قبر میں وہ پتلا دبایا تھا۔''

وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''آپ کی بات میں وزن ہے ملک صاحب اور میں اس سلسلے میں آپ سے اتفاق بھی کرتا ہوں لیکن ہمیں گورکن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اکیلا اس وسیع و عریض قبرستان کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔''

''میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے نظر انداز نہیں کیا باجوہ صاحب!'' میں نے رسان سے کہا۔ ''اور میں اسی لمحے سے اسے تمہاری نگرانی میں دیتا ہوں۔ تم اس پر اور اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھو گے، میں اس دوران دوسرے معاملات دیکھوں گا۔ تمہیں گورکن کے بارے میں کوئی بھی قابلِ گرفت بات نظر آئے تو تم براہِ راست اس کے خلاف کارروائی عمل میں لا سکتے ہو..... یا اگر ضرورت محسوس کرو تو مجھے بھی مطلع کر سکتے ہو۔ بولو، منظور ہے؟''

''ہاں، منظور ہے۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

میں نے حتمی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تو سمجھو، تمہاری ڈیوٹی شروع۔ آؤ اب ہم ان لوگوں کی طرف چلتے ہیں۔''

ہم ٹہلتے ہوئے خیر دین کی قبر کے پاس آ گئے۔ اس دوران میں کمال دین اور گورکن نے امداد باہمی کے طور پر خیر دین کی قبر کو اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی حاجی کریم نے کہا۔

''دیکھ لیں تھانے دار صاحب! ہم نے قبر کو بڑی مضبوطی سے باندھ دیا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اب ترپال کا وہ ٹکڑا بھی بڑی احتیاط سے قبر کے اوپر پھیلا دو جیسا کہ وہ پہلے پڑا تھا۔ بارش کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ یہ کسی بھی وقت دوبارہ شروع ہو سکتی ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

ہم قبرستان سے رُخصت ہونے لگے تو کمال دین نے مجھ سے پوچھا۔ ''میرے لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب؟''

''تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔'' میں نے اسے گھر جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''اور جیسے ہی تمہیں موقع ملے، خیر دین کی قبر کو پختہ کروا لینا تاکہ آئندہ ایسا کوئی واقعہ رونما نہ ہو۔''

''وہ تو مجھے کرنا ہی ہے جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ بارشیں ذرا رُک جائیں، میں پہلی فرصت میں اباجی کی قبر کو پکا کراؤں گا لیکن.....!''

اس نے اُلجھن زدہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت نہیں ہوئی کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے، کوئی ایسی بات جسے کہتے ہوئے وہ تذبذب کا شکار ہے۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے کمال دین! تم نے ''لیکن'' کے بعد جملہ ادھورا کیوں چھوڑ دیا؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب! یہاں تو جو کچھ ہوا، سو ہوا۔ مجھے بتائیں گھر جا کر میں اس بارے میں کیا کہوں گا؟''

''کیا اس حوالے سے گھر والوں کو کچھ بتانا ضروری ہے؟''

''جی ہاں، کچھ نہ کچھ تو انہیں بتانا ہی ہوگا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں آپ کے ساتھ جب اس طرف آ رہا تھا تو میری گھر والی نے پوچھا تھا، میں کہاں جا رہا ہوں۔ اس وقت میرا بڑا بیٹا فاروق بھی گھر میں موجود تھا۔ میں نے ان سے یہی کہا تھا کہ آپ کے ساتھ ذرا قبرستان کی جانب جا رہا ہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہٰذا وہ مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ تھانے صاحب کو برستی بارش میں قبرستان میں ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا جو وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انہیں کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ہی پڑے گا۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

میں اس کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا۔ وہ ایک انتہائی معقول بات کر رہا تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ جب تک اس پُراسرار عورت کا کوئی سراغ نہ مل جائے، خیر دین کی قبر والا معاملہ عام نہ ہونے پائے۔ اس معما عورت تک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ابھی اس خبر کو خفیہ ہی رکھا جائے کہ پولیس نے خیر دین کی قبر کھود کر سوئیوں والے پتلے کے راز تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ اس معاملے کو چھپانے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ اگر گاؤں والوں کو یہ پتا چل جاتا کہ کسی عورت نے کوئی سفلی عمل کرنے کے لیے قبرستان میں ایک بچے کا پتلا دبایا ہے تو اس سے خوف و ہراس پھیلنے کا اندیشہ تھا لیکن کمال دین کو کوئی تسلی بخش جواب دینا بھی ضروری تھا۔

خدا کا شکر کہ بروقت مجھے ایک آئیڈیا سوجھ گیا۔ میں نے خیر دین مرحوم کے اکلوتے فرزند کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کمال دین! تمہاری بات میں وزن ہے اور اس کے لیے میں نے ایک معقول بہانہ سوچ لیا ہے۔ تم اپنی بیوی اور بیٹے سے کہہ سکتے ہو کہ حالیہ دُھواں دھار بارشوں میں خیر دین کی قبر ایک طرف سے بیٹھ گئی تھی۔ گورکن کی اتفاق سے تھانے دار سے ملاقات ہوئی تو اس نے دھنسنے والی قبر کے بارے میں تھانے دار کو بتایا چنانچہ تھانے دار (یعنی میں) نے تمہیں قبرستان بلا کر خیر دین کی قبر کو دوبارہ ٹھیک ٹھاک کرا دیا ہے۔ اس طرح تمہاری بات بھی رہ جائے گی اور اگر ان میں سے کوئی قبرستان آ کر قبر کو دیکھنا بھی چاہے گا تو اس کی تسلی ہو جائے گی۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جلدی سے بولا۔ ''ہاں، یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔''

''ایک بات کا خیال رکھنا کمال دین!'' میں نے تاکید کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں جب تک پتلے کو قبر میں دبانے والا میری گرفت میں نہ آ جائے، یہ خبر گاؤں کے کسی شخص کے کانوں تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں جناب!'' اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ اس سلسلے میں میری زبان نہیں کھلے گی۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

کمال دین کے رُخصت ہونے کے بعد میں حاجی کریم کی جانب متوجہ ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

''تھانے دار صاحب! اب تو آپ کو میری بات کا یقین آ گیا نا؟''

میں بغور اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں موجود تاثرات کا جائزہ لینے لگا تاکہ اگر وہ مجھے کوئی چکر دینے کا ارادہ رکھتا ہو تو مجھے اندازہ ہو جائے لیکن میری تجربہ کار عقابی نگاہ نے فوراً مجھے بتا دیا کہ حاجی کریم کی نیت اور ذہن میں کوئی فتور نہیں تھا تاہم اے ایس آئی نے جو اہم نکتہ اٹھایا تھا، میں اس سے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اے ایس آئی کی تسلی اور اپنے اطمینان کے لیے میں نے گورکن کو ذرا مختلف انداز میں گھنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہ آہستگی کہا۔ ''حاجی کریم! حیرت انگیز طور پر تمہارے خواب کا ایک حصہ بالکل دُرست ثابت ہوا ہے اور وہ بھی علامتی طور پر لیکن..... اس کیس کی تکمیل اسی وقت ہو گی جب وہ عورت میرے ہاتھ آئے گی جس نے ننھے بچے کا پتلا خیر دین کی قبر میں دبایا تھا۔ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''آپ جو بھی حکم دیں گے، میں ماننے کو تیار ہوں۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔ ''لیکن آدھے خواب کی سچائی والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ نے ''علامتی'' کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ کیا چکر ہے؟''

میں نے اس کی ذہنی اُلجھن دور کرنے کی غرض سے وضاحت کر دی۔ ''بات یہ ہے حاجی کریم کہ تم نے اپنے خواب میں، اس خوبصورت عورت کو ایک معصوم اور ننھا منا بچہ خیر دین کی قبر میں دباتے دیکھا تھا جبکہ کھدائی پر یہ ثابت ہوا کہ وہ بچہ نہیں بلکہ بچے کا ایک پتلا ہے۔ اسے کہتے ہیں..... علامتی!''

میں تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے آدھے خواب کے دُرست ثابت ہونے سے میرا مطلب یہ تھا کہ خیر دین کی قبر کے ساتھ کی جانے والی کارروائی کا سراغ تو ہم نے لگا لیا لیکن وہ پُراسرار عورت ابھی تک میرے ہتھے نہیں چڑھی جس نے یہ سوئیاں چبھا پتلا گزشتہ رات قبر میں دبایا تھا۔ اگر وہ عورت میری گرفت میں آ جائے تو میں چٹکی بجاتے میں اس کی زبان سے اُگلوا لوں گا، اس کی اس حرکت کا مطلب کیا تھا۔ جب یہ نتیجہ سامنے آ جائے گا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے خواب کی تکمیل ہو جائے گی اور..... اس عورت تک مجھے صرف اور صرف تم ہی پہنچا سکتے ہو۔''

بات ختم کر کے میں تیز نظر سے اسے گھورنے لگا۔ وہ اضطراری انداز میں بولا۔ ''مم..... میں..... بھلا اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''تم نے خواب میں اس عورت کو اچھی طرح دیکھا ہے۔'' میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا حلیہ، اس کے خدوخال تمہارے ذہن میں نقش ہوں گے۔ اگر تم میری رہنمائی کرو تو میں اس عورت تک پہنچ سکتا ہوں۔''

''وہ..... وہ بہت ہی حسین و جمیل عورت تھی۔'' حاجی کریم نے ٹرانس کی سی کیفیت میں جواب دیا۔ ''بالکل کسی خوبصورت جادوگرنی کی طرح.....''

''اس کے جادوگرنی ہونے میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔'' میں نے گمبھیر انداز کہا۔ ''پتلے کے سینے میں پیوست شدہ سوئیاں اس کے جادوگرنی ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں لیکن اس بیان سے بات نہیں بنے گی۔ تم مجھے اس کے نقش و نگار کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

اس نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''جب میں نے اس عورت کو خواب میں دیکھا تھا تو اس وقت مجھے اس کا حلیہ پوری تفصیل سے یاد تھا لیکن اب اس کے خدوخال دُھندلا سے گئے ہیں۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اس کی شکل و صورت کیسی تھی.....!''

اس نے بے بسی سے جملہ ادھورا چھوڑا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے ذرا مختلف انداز میں اپنے سوال کو دُہرایا۔ ''تم اپنی دُھندلی یادداشت کو کرید کر اتنا تو بتا ہی سکتے ہو کہ اس عورت کا تعلق موضع فتح گڑھ سے تھا یا نہیں؟''

اس بار اس نے بڑا اثر جواب دیا۔ ''نہیں جناب! وہ فتح گڑھ کی رہنے والی تو نہیں تھی۔ میں نے اس گاؤں میں پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہوں!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''کیا تم نے فتح گڑھ کی ساری عورتوں کو دیکھ رکھا ہے جو تم اتنا بڑا دعویٰ کر رہے ہو؟''

وہ میرے اس کڑے سوال سے قدرے ڈر گیا، جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نہیں تھانے دار صاحب! میں نے ایسا تو کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ میرے کہنے کا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ خواب میں نظر آنے والی اس عورت کو میں نے پہلے کبھی فتح گڑھ میں نہیں دیکھا۔ وہ چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔''

میں نے اسی نوعیت کے دو چار مزید سوالات کیے پھر یہ کہتے ہوئے عبدالکریم عرف حاجی کریم کو فارغ کر دیا۔

''ٹھیک ہے۔ اب میں واپس تھانے جا رہا ہوں۔ تم اِدھر قبرستان ہی میں رہنا اور اپنے کان و آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنا۔ اگر تم کوئی بھی غیر معمولی بات دیکھو یا ایسا کچھ محسوس کرو تو فوراً تھانے آ کر مجھے بتانا۔ تمہیں بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔''

''میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ گیا جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ انشاء اللہ میں آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔''

میں اے ایس آئی افتخار باجوہ کی معیت میں قبرستان سے نکلا اور ہم نے تھانے کی سمت قدم بڑھا دیے۔ خیر دین کی قبر سے برآمد ہونے والے پتلے کو میں اپنے ساتھ لانا نہیں بھولا تھا۔ راستے میں میرے اور اے ایس آئی کے درمیان اسی نامعلوم پُراسرار عورت کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ ہم تھانے سے ابھی چند قدم کی دوری پر ہی تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔

ہم نے اپنی اپنی چھتری کھول کر بارش سے بچاؤ کے لیے سر پر تان لی۔ کپڑے اور روئی کی مدد سے تیار کیا گیا وہ مخصوص گڈا اس وقت میری بغل میں دبا ہوا تھا اور بھیگنے سے محفوظ تھا۔

جب ہم تھانے پہنچے تو بارش نے موسلا دھاری شکل اختیار کر لی تھی۔

☆☆☆

حالات ایسی سنگین اور سنسنی خیز صورت اختیار کر گئے تھے کہ حوالدار منصور گوندل میری تنبیہی ''شی'' کو نظر انداز کر بیٹھا۔ میں نے درحقیقت اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا لیکن وہ چپ نہ رہ سکا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

''ملک صاحب! کیا آپ اس عورت کو جانتے ہیں؟''

خیریت گزری کہ حوالدار کا استفسار سرگوشی نما تھا۔ اس کی ہیجان خیز مگر دبی دبی آواز خیر دین کی قبر تک پہنچ کر اس عورت کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے حوالدار کے اندر موجیں مارتے تجسس کے سمندر کو تھپکی دینے کی غرض سے کہا۔

''ہاں، میں اس عورت کو پہچان گیا ہوں۔ اس کا نام زلیخا ہے اور..... اب تم بالکل خاموش بیٹھے رہنا۔ میں تمہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔''

حوالدار کو تسلی دینے کے بعد میں اس عورت کی طرف متوجہ ہوگیا۔ سفید لبادے والی وہ عورت زلیخا تھی۔ اب دیا سلائی کی روشنی ایسے زاویے سے اس کے چہرے کو روشن کررہی تھی کہ اس کے زلیخا ہونے میں کسی شک و شبے کی گنجایش نہ رہی۔ وہ گورکن کے بیان کے مطابق عمل کرنے لگی۔

گزشتہ روز یعنی پانچ اگست کو میں نے خیر دین کی قبر کھلوا کر وہاں سے وہ گڈا برآمد کرلیا تھا جو گورکن کے بقول اس عورت (زلیخا) نے وہاں دفن کیا تھا اور میں اسے یہ ہدایت کرکے تھانے آ گیا تھا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہوئے ایک دم چوکنا رہے۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

اس کے علاوہ میں نے ایک وعدہ خیر دین کے بیٹے کمال دین سے بھی لیا تھا کہ وہ قبر والے راز کو اس وقت تک اپنے سینے میں دفن رکھے گا جب وہ تک شخصیت قابو نہیں آ جاتی جس نے اس کے باپ کی قبر میں وہ پتلا نما گڈا دبایا تھا لیکن کمال دین پیٹ کا بہت ہی ہلکا ثابت ہوا تھا۔ شام ہونے سے پہلے پہلے آدھے شہر گڑھ کو یہ خبر ہوچکی تھی کہ چاچا خیر دین کی قبر کے ساتھ کیا ''واقعہ'' پیش آ چکا ہے۔

جب یہ اطلاع مجھ تک پہنچی تو مجھے کمال دین کی حماقت پر سخت غصہ آیا۔ میں نے پہلے اے ایس آئی افتخار باجوہ سے اس خبر کی تصدیق کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ اطلاع مصدقہ ہے۔ کمال دین سے سنگین غلطی ہوئی ہے۔ اے ایس آئی چونکہ گورکن کی نگرانی پر مامور تھا اس لیے بھی یہ ''معاملہ'' فوراً اس کی پکڑ میں آ گیا تھا۔ لوگ ایک ایک، دو دو کر کے قبرستان کا رُخ کررہے تھے اور گورکن سے اس اُڑی ہوئی خبر کے بارے میں کریدکرید کر سوال کررہے تھے مگر گورکن نے ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی۔ وہ نہ تو اس واقعے کی تردید کررہا تھا اور نہ ہی تصدیق۔ اس نے بڑی عمدہ قسم کی حکمتِ عملی اپنا رکھی تھی۔

میرے اور اے ایس آئی کے مابین جب اس موضوع پر گفتگو ہورہی تھی اس وقت رات ہوچکی تھی۔ کمال دین کی حماقت نے میری طبیعت کو اس قدر مکدر کردیا تھا کہ سرزنش کے لیے میں نے اسے فوراً تھانے بلالیا تھا۔ جب میں نے کڑے تیوروں سے گھور کر اس سے اس بے وقوفی کے بارے میں استفسار کیا تو وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھانے دار صاحب!''

''پھر قصوروار کون ہے؟'' میں نے اسے ایک دبکا مارا۔

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، یہ بات عابدہ نے آؤٹ کی ہے۔''

عابدہ، کمال دین کی بیوی کا نام تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر خونخوار نظر سے اسے گھورا اور گرج دار آواز میں سوال کیا۔ ''عابدہ تک تک یہ اطلاع تم ہی نے پہنچائی ہوگی نا؟''

وہ احمقانہ انداز میں بڑی سرعت سے گردن کو اثباتی جنبش دینے لگا۔

میں نے کڑک دار آواز میں اسے ڈانٹ پلائی۔ ''اگر تم اسی طرح سر جھٹکتے رہے تو تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔ بند کرو اس خرافات کو۔''

میری دھمکی آمیز ڈانٹ کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کی جھٹکے کھاتی گردن کو اچانک بریک لگ گئے تھے۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد اس نے جو وضاحت پیش کی وہ کچھ اس نوعیت کی تھی۔

''تھانے دار صاحب! جب میں گھر پہنچا تو عابدہ اور فاروق بڑی بے چینی سے میرا انتظار کررہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس برستی بارش میں قبرستان میں کیا لینے گیا تھا تو میں نے انہیں آپ کا بتایا ہوا جواب دے دیا۔ فاروق تو میرے اس جواب سے مطمئن ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کسی کام سے اِدھر اُدھر ہوا تو تنہائی دیکھتے ہی عابدہ نے مجھے گھیر لیا۔ اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ کرید کرید کر مجھ سے مختلف سوالات کرنے لگی۔ اس نے مجھے اس قدر زچ کردیا کہ جان چھڑانے کے لیے مجھے اصل بات اسے بتانا ہی پڑی۔ بس مجھ سے اتنی سی غلطی ہوئی ہے۔''

''اتنی سی غلطی..... کے گھوڑے!'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا پھر پوچھا۔ ''عابدہ تمہاری بیوی ہے یا خاوند؟''

وہ متذبذب نگاہ سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ظاہر ہے جناب! عابدہ میری گھر والی ہے..... میں اس کا خاوند ہوں۔''

''ایسا لگتا تو نہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ خجل سا ہوکر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا۔

میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے تھانے سے رُخصت کردیا تھا۔

کمال دین سے جو غلطی ہوئی تھی اس نے میرے کھیل کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ جب یہ خبر گاؤں میں گرم ہوگئی تو یقیناً کسی نہ کسی طرح اس عورت تک بھی جا پہنچی ہوگی جس نے خیر دین کی قبر میں گڈا دبایا تھا۔ اس کے بعد وہ بے حد محتاط ہوگئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگی۔ اس کی یہی احتیاط میری تفتیش کے راستے کی رکاوٹ بن سکتی تھی۔ ان حالات میں اس پُراسرار عورت کا سراغ لگانا میرے لیے انتہائی دُشوار ہوجاتا اور..... جب تک وہ عورت میرے ہتھے نہ چڑھتی، یہ معمّا حل نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے کمال دین کو تو برا بھلا کہہ کر تھانے سے روانہ کردیا تھا لیکن پوری رات خود اسی کوفت میں مبتلا رہا کہ اس کی حماقت کے توڑ کے لیے کون سی نئی حکمتِ عملی اپناؤں جس سے وہ عورت میرے قابو میں آجائے۔ اسی اُلجھی ہوئی سوچ کے ساتھ رات کے آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح..... یعنی آج صبح بالکل نئی صورتِ حال میری منتظر تھی۔ میں نمازِ فجر سے فارغ ہونے کے بعد ناشتے کی تیاری کررہا تھا کہ کانسٹیبل مراد علی نے میرے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ اطلاع دی۔

''ملک صاحب! وہ حاجی گورکن آپ سے ملنے آیا ہے۔''

''اتنی صبح!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''خیریت تو ہے نا؟''

''وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔

''میں نے اس سے پوچھا بھی کہ مسئلہ کیا ہے لیکن وہ ایک ہی بات پر اصرار کررہا ہے کہ مسئلہ وہ صرف اور صرف آپ ہی کو بتائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔

''تم اسے اِدھر کوارٹر ہی میں بھیج دو۔''

حاجی کریم نے آج صبح میرے کوارٹر میں جو حیرت انگیز کہانی مجھے سنائی تھی اس نے کمال دین کی غلطی کو بے اثر کردیا تھا۔ وہ عورت گزشتہ رات پھر خیر دین کی قبر پر نظر آئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھی کہ قبر کی کھدائی اور گڈے کی برآمدگی کی اطلاع اس تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

حاجی کریم نے مجھے بتایا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے مجھے بہت زیادہ ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ہدایت کی تھی۔ میں اس لیے اور بھی محتاط ہوگیا کہ گاؤں والوں کو خیر دین کی قبر والے قصے کی خبر ہوگئی تھی اور وہ تفصیل پوچھنے کے لیے قبرستان کا رُخ کررہے تھے لیکن میں نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا۔ آپ نے سختی سے منع جو کردیا تھا۔''

وہ سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا تو میں نے شاباشی دینے والے انداز میں کہا۔ ''یہ تم نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔''

وہ سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''رات ہوجانے کے بعد لوگوں کی قبرستان میں آمد و رفت تو ختم ہوگئی لیکن میری بے چینی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ایک حوالے سے تو میں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو خیر دین کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں نہیں بتانا پڑے گا لیکن اس پُراسرار عورت کے حوالے سے دل میں عجیب سے خیالات آرہے تھے۔ جب سے خیر دین کی قبر میں سے سوئیوں والا پتلا برآمد ہوا ہے، میرے دل میں اس عورت کی طرف سے ایک خوف سا بیٹھ گیا ہے۔ سچ پوچھیں تو اس رات زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے قبرستان میں ڈر محسوس ہوا۔ میرے ذہن نے اس عورت کے بارے میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ کوئی جادوگرنی ہے لہٰذا میں کچھ زیادہ ہی فکرمند ہوگیا تھا۔''

وہ ایک مرتبہ پھر چند لمحات کے لیے متوقف رہا لیکن میں خاموش رہا اور منتظر سوالیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اسی ڈر اور خوف کی وجہ سے مجھے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ ہر لمحے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ عورت کہیں دوبارہ خیر دین کی قبر پر نہ پہنچ جائے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ ہم نے اس کا دبایا ہوا سوئیوں والا گڈا قبر میں سے نکال لیا ہے تو پتا نہیں وہ کیسا خطرناک ردِعمل ظاہر کرے۔''

اس نے خاموش ہوکر ایک جھرجھری لی پھر مزید بتانے لگا۔ ''میں رہ رہ کر پچھتا رہا تھا کہ میں نے آج کی رات کسی اور کو قبرستان میں کیوں نہ روک لیا۔ انسان کے دل میں جس شے کے حوالے سے کوئی خدشہ ہو وہ اس کی طرف سے بے حد محتاط رہتا ہے۔ میں بھی اس خطرناک عورت کی جانب سے بہت ہوشیار تھا چنانچہ اس کے ڈر کے باوجود بھی میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد قبرستان کے شمالی حصے میں جھانک آتا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ راستہ بدل کر، چھپ کر میں اسے دیکھنے کی کوشش کروں۔ میں مقصد کے لیے وہ جھاڑیاں بہت کارآمد ثابت ہوئیں جو قبرستان کے مغربی حصے میں کنارے پر واقع ہیں۔ ان گھنی جھاڑیوں میں خود کو پوشیدہ رکھ کر خیر دین کی قبر کو دیکھا جاسکتا ہے..... اور پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں کوئی سوال یا تنقید کیے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''تھانے دار صاحب! اس عورت کے حوالے سے میرے ذہن اور دل میں سو قسم کے اندیشے جاگے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں جیسے پتھر کا ہوگیا۔ میرے اندر موجود خوف نے جیسے میرے اعضا اور اعصاب کو منجمد کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے ان گھنی جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف آنے کا ارادہ کیا تو اس کوشش میں مجھے سراسر ناکامی ہوئی۔ مجبوراً میں پتھر کا بت بنا اس عورت کو دیکھتا رہا۔ وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے خیر دین کی قبر کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی دیکھا۔ وہ مذکورہ قبر کے پاس بیٹھ کر اپنے تھیلے میں سے کچھ برآمد کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں نے اس کے ہاتھوں میں اگربتیوں کا پیکٹ اور ایک ماچس دیکھی۔ اس نے چند اگربتیاں سلگا کر خیر دین کی قبر پر لگا دیں پھر اس نے تھیلے میں سے ایک ڈبا نکالا اور اس میں سے کوئی شے برآمد کر کے وہ قبر پر چھڑکنے لگی۔ جب اس نے ماچس جلائی تھی تو میں اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے ایک رات پہلے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ پچھلی رات میں نے خواب میں اس کی شکل دیکھی تھی اور آج رات میں اپنی کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنی حسین اور دلکش تھی کہ میں اس کے نظارے ہی میں کھو کر رہ گیا۔ ماچس کے جلنے سے تھوڑی دیر کے لیے روشنی پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد پھر اندھیرا ہوگیا تھا لیکن اس کے لمحاتی دیدار نے جیسے قبرستان میں طاری تاریکی کو اُجال دیا تھا۔ پتا نہیں یہ میرے تصور کا کرشمہ تھا یا اس کا رعب حسن کہ وہ نیم تیرگی میں بھی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے طلسمی نظارے میں اس قدر کھویا کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی وہ کب قبرستان سے چلی گئی.....''

وہ خاموش ہو کر ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف اور سراسیمگی موجزن تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ مجھے کوئی چکر دینے کے لیے کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ اس نے گزشتہ رات جو کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھا، وہی بیان کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ تصور کے حوالے سے میں اس کے تجربات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ اس کی محویت، ڈر اور خوف تھا جنہوں نے یکجا ہو کر اسے یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ عورت کب اپنا کام ختم کر کے قبرستان سے رُخصت ہوگئی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں گورکن سے استفسار کیا۔ ''اس جادوگرنی کے جانے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟''

اس نے مذکورہ عورت کے حوالے سے اپنا ایک مخصوص ذہن بنا لیا تھا۔ وہ اسے کوئی ساحرہ سمجھ بیٹھا تھا اسی لیے میں نے ''جادوگرنی'' کا لفظ استعمال کیا تھا تاکہ اسے جواب دینے میں کوئی دقت نہ ہو۔ وہ تھوک نگل کر اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے بولا۔

''جب میں دوبارہ اپنے حواس میں آیا تو خود کو انہی جھاڑیوں میں پایا اور وہ پُراسرار جادوگرنی وہاں سے غائب ہوچکی تھی۔ اس کے بعد میں ہمت کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا اور باقی کی رات اسی جادوگرنی کے بارے میں سوچ سوچ کر، پریشان ہوتے ہوئے گزار دی..... اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

وہ بہت زیادہ خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے بڑی رسان سے پوچھا۔ ''کیا اس عورت کے چلے جانے کے بعد تم نے خیر دین کی قبر پر جا کر نہیں دیکھا کہ اس نے وہاں کیا چھڑکا تھا؟''

''دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ دیکھوں مگر ہمت نہیں ہوئی۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''اب تو صبح ہوچکی ہے۔ میری طرف آنے سے پہلے تو تم نے ضرور خیر دین کی قبر کا جائزہ لیا ہوگا؟''

''نہیں..... نہیں!'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم بہت زیادہ ڈر گئے ہو حاجی کریم!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے ناشتا وغیرہ کرلیا ہے؟''

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! ناشتے کا کسے ہوش ہے۔ میں تو انتظار کر رہا تھا کب سورج نکلے اور کب میں تھانے آ کر آپ کو اس واقعے کی اطلاع دوں۔''

''اندھیرے میں تم اس لیے اِدھر کا رُخ نہیں کر رہے تھے کہ تمہیں اندیشہ تھا کہ وہ پُراسرار جادوگرنی اچانک کہیں سے نکل کر تمہیں دبوچ لے گی، ہیں نا؟''

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے خوفزدہ نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''خالی پیٹ انسان کو کچھ زیادہ ہی ڈر لگتا ہے۔ تم میرے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرو پھر میں اُدھر قبرستان میں جا کر دیکھتا ہوں خیر دین کی قبر پر گزشتہ رات کیا گزری ہے۔''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے ناشتے میں اسے بھی شیئر کیا۔ حاجی کریم نے محض دو چار لقمے زہر مار کیے پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ روک لیا۔ میں نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس کے ساتھ قبرستان آ گیا۔

جب ہم خیر دین کی قبر پر پہنچے تو بوندا باندی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھانے سے نکلتے ہوئے احتیاطاً میں نے چھتری لے لی تھی۔ یہ احتیاط کام آ گئی۔ میں نے چھتری کھول لی اور گورکن کے بیان کی تصدیق کے لیے مذکورہ قبر کا جائزہ لینے لگا۔

حاجی کریم نے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ میں نے اگربتیوں کے بچے ہوئے ٹکڑوں (تیلیوں) کو خیر دین کی قبر کی مٹی میں پیوست دیکھا۔ خوشبودار مسالا سلگ کر ختم ہو چکا تھا اور مسالے سے بے نیاز ننگے قبر میں پیوست تھے۔ اس کے علاوہ مجھے مذکورہ قبر پر مسور کی دال کے دانے بھی بکھرے ہوئے دکھائی دیے۔ یقیناً یہ وہی ''شے'' تھی، پُراسرار عورت نے ڈبے میں سے نکال کر جسے قبر پر چھڑکا تھا۔

گورکن کے بیان کی تصدیق ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آنے والی رات میں خود ان جھاڑیوں میں نشست جما کر اس خوبصورت جادوگرنی کا انتظار کروں گا اور دیکھوں گا..... وہ سفید لباس والی ساحرہ کون کون سا طلسم جانتی ہے۔ ایک بات تو طے تھی کہ وہ موضع فتح گڑھ کی رہنے والی نہیں تھی کیونکہ یہاں تو اس واقعے کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ اس صورت میں اسے قبرستان کا رُخ ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال، جب وہ میرے تجربے میں آتی تو میں اس کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا۔

اور اب وہ میرے تجربے میں آ چکی تھی.....

حوالدار منصور گوندل کو تسلی دینے کے بعد میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گورکن کے بیان کے مطابق عمل کرنے لگی۔

اگر زلیخا کی جگہ کوئی اور عورت یہ کام کر رہی ہوتی تو شاید مجھے اس قدر حیرت نہ ہوتی۔ زلیخا کو چونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا اس لیے اس منظر نے مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ زلیخا کو اس نوعیت کے گندے عمل کی ضرورت کیوں پیش آ گئی، یہ سوچ سوچ کر میرا ذہن اُلجھ رہا تھا اور اسی اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ میں اسے مصروفِ کار بھی دیکھ رہا تھا۔

اس نے اگربتیوں کو سلگا کر خیر دین کی قبر کی مٹی میں پیوست کر دیا پھر وہ اپنے ساتھ لائے ہوئے ڈبے میں سے کچھ نکال کر اس قبر پر چھڑکنے لگی۔ اس ''کچھ'' کو آج صبح میں اپنی آنکھوں سے مذکورہ قبر پر پڑے دیکھ چکا تھا۔ وہ مسور کی دال تھی۔

زلیخا اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے وہ تھیلا بھی اٹھا لیا تھا جس میں اگربتیوں والا پیکٹ اور مسور کی دال والا ڈبا رکھا تھا پھر وہ محتاط قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے رُخصت ہونے لگی۔

حوالدار کا صبر جواب دے گیا۔ اضطرابی انداز میں اس نے سرگوشی کی۔ ''ملک صاحب! وہ جا رہی ہے۔''

''جانے دو.....!'' میں نے بھی جواباً سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

وہ اُلجھ کر رہ گیا۔ ''جانے دو..... کیا مطلب جناب! اگر وہ بچ کر نکل گئی تو ہماری ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔''

حوالدار کی تفتیش بجا تھی لیکن اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میرا ذہن ایک فیصلہ کر چکا تھا اور..... وہ فیصلہ تھا، سرِدست زلیخا پر ہاتھ نہ ڈالنے کا! میں نے حوالدار کی تشویش کے جواب میں کہا۔

''تم بے فکر رہو۔ ہماری محنت بے کار نہیں جائے گی۔ میں زلیخا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب چاہوں گا، اسے قابو کر لوں گا۔''

''لیکن جناب.....'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''رنگے ہاتھوں گرفتاری کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

''جانتا ہوں..... یہ بات میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔''

میرے حتمی جواب نے حوالدار کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

واپسی کے سفر میں، میں نے جب منصور گوندل کو زلیخا کے بارے میں بتایا تو اس کے بے چینی دماغ اور بے قرار دل کو سکون مل گیا پھر اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

☆☆☆

زلیخا، بختا پہلوان کی بیوی تھی۔ بختا پہلوان کا تعلق موضع چنی وال سے تھا اور وہ گولو پہلوان کے نام سے مشہور تھا۔ بختا کے مجھ سے بڑے دوستانہ مراسم تھے۔ انتہائی نیک سیرت اور شریف النفس انسان تھا وہ۔ ہماری ملاقات زیادہ نہیں ہوتی تھی لیکن جب کبھی بھی سامنا ہوتا، ہم اچھے دوستوں کی طرح ملتے تھے۔ میں نے اس کے بے حد اصرار پر اس کی ایک دو کشتیاں بھی دیکھی تھیں۔ وہ بڑا پھرتیلا اور کاری گر قسم کا ہنرمند پہلوان تھا۔ مجھے میلے ٹھیلے اور دنگل وغیرہ میں جانے کا شوق تو تھا لیکن پیشہ ورانہ مصروفیات کے باعث میں یہ شوق پورا نہیں کر پاتا تھا تاہم بختا کی فرمائش پر میں نے اس کی کشتیوں کو دیکھنے کا وقت نکال ہی لیا تھا۔ بختا پہلوان سے میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسا ہی گہرا تعلق تھا کہ میں نے اس کی بیوی زلیخا کو قبرستان میں گرفتار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان لوگوں سے تو گھر میں بیٹھ کر ہر قسم کی بات ہوسکتی تھی اسی لیے میں نے اگلی صبح یعنی سات اگست کو چنی وال جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میری اس وضاحت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ گزشتہ رات حوالدار منصور گوندل نے قبرستان میں جس بات پر زور دیا تھا، وہ غلط تھی۔ حوالدار کی بات غلط تھی اور نہ ہی وہ خود غلط کہہ رہا تھا۔ اُصولی طور پر مجھے زلیخا کو وہیں رنگے ہاتھوں گرفتار کرلینا چاہیے تھا۔ یہ تفتیش بعد میں بھی ہوسکتی تھی کہ وہ راتوں کو چھپ کر قبرستان میں کس قسم کا عمل کرتی پھر رہی ہے۔

میں نے ان لمحات میں جو بھی فیصلہ کیا اس میں مصلحت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ بختا پہلوان ایک انتہائی عزت دار اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ گاؤں والے بڑے احترام سے اس کا نام لیتے تھے۔ اسے چنی وال کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے فنِ شہ زوری نے چنی وال کا نام دور دور تک روشن کررکھا تھا۔ اس ہوا اور فضا میں اگر یہ خبر اُڑ جاتی کہ بختا پہلوان المعروف بہ گولو پہلوان کی بیوی زلیخا کو رات پولیس نے قبرستان میں کوئی سفلی عمل کرتے ہوئے گرفتار کرلیا ہے تو بختا کی گردن احساسِ ندامت سے جھک جاتی۔ بختا کی بے عزتی کا مطلب تھا چنی وال کی جگ ہنسائی۔ اگر بختا پہلوان میرا دوست نہیں بھی ہوتا تو میں اس جیسے نیک انسان کے لیے اپنے دل میں یہ نرم گوشہ ضرور روا کردیتا۔

یاد رکھیں..... عزت بنانے میں انسان کو برسوں لگ جاتے ہیں اور گنوانے میں ایک لمحہ نہیں لگتا۔ میں بختا پہلوان کی برسوں کی محنت پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتا تھا۔ آپ اسے میری کوئی کمزوری سمجھ لیں یا مصلحت..... بہرحال، مجھے اطمینان تھا کہ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی زلیخا نے کوئی ایسا سنگین جرم نہیں کیا تھا کہ اسے اُدھر قبرستان ہی میں پھانسی دے دی جاتی۔

جہاں تک اس کی گرفتاری اور پوچھ گچھ کا تعلق تھا تو میں اسی سلسلے میں چنی وال جارہا تھا۔ اے ایس آئی افتخار باجوہ کا کام ختم ہوگیا تھا۔ گورکن حاجی کریم کی ''نگرانی'' کا اب کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا لہٰذا میں اسے اپنے ساتھ لے کر چنی وال روانہ ہوگیا۔

موضع چنی وال، فتح گڑھ سے شمال مشرق میں واقع تھا۔ فاصلے کے اعتبار سے چنی وال مجموعی طور پر فتح گڑھ سے ڈیڑھ میل دور تھا۔ ہم ایک ہی گھوڑے پر سوار ہوکر چنی وال کی جانب بڑھ رہے تھے۔ پہلے ہمیں تیم پختہ سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایک میل شمال میں سیدھا جانا تھا پھر وہاں سے مشرق کی سمت مڑ جانا تھا۔ کھیتوں کے اندر کچے راستے پر سفر کرتے ہوئے آدھا میل طے کرکے ہم چنی وال پہنچ جاتے۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہورہی تھی اسی لیے ہم نے دو کے بجائے ایک گھوڑے کا انتخاب کیا تھا۔ مذکورہ گھوڑے کی لگام اے ایس آئی افتخار باجوہ کے ہاتھ میں تھی اور میں چھتری تھامے اس کے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا تھا۔ میں نے چھتری کو ایسے زاویے سے سنبھال رکھا تھا کہ ہم دونوں کے جسموں کا بالائی حصہ بھیگنے سے محفوظ رہے۔ ہم دونوں پولیس کی یونیفارم میں تھے۔

ہم تھانے سے نکلے اور گھوڑے کی پشت پر سوار ہوکر آگے بڑھنے لگے۔ نہر کا پل عبور کرنے کے بعد اے ایس آئی نے کہا۔ ''ملک صاحب! میں تو گورکن پر شک کررہا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی معاملہ نکلا۔''

''ہاں، بعض اوقات اس قسم کی صورتِ حال سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

وہ کریدنے والے انداز میں بولا۔ ''میں نے سنا ہے آپ اس عورت کو جانتے ہیں جس نے خیر دین کی قبر میں سوئیوں والا پتلا دبایا تھا؟''

میں نے زلیخا کے بارے میں حوالدار منصور گوندل کو بتادیا تھا لیکن ساتھ ایسی کوئی ہدایت نہیں کی تھی کہ وہ آگے کسی اور کو نہ بتائے۔ یقیناً اس کی زبان سے یہ خبر پورے تھانے میں پھیل گئی ہوگی۔ میں نے اے ایس آئی کی کریدکے جواب میں اسے بھی اتنا بتادیا کہ وہ مزید کوئی سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے..... اور ایسا ہی ہوا بھی۔

ہم لگ بھگ دس بجے چنی وال پہنچ گئے۔ میں نے بختا پہلوان کا گھر دیکھ رکھا تھا لہٰذا وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

بختا پہلوان اس وقت گھر ہی میں تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے جاکر بجی سجائی بیٹھک میں بٹھادیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ہماری خاطر تواضع کے لیے گھر والوں کو ''آرڈر'' دے دیا۔ میں نے اس سلسلے میں اسے روکنے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ اس مہم سے فارغ ہوچکا تو ہمارے پاس آبیٹھا اور ہماری آمد کی غرض و غایت کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''بختا جی! میں آج ایک ضروری کام سے تمہارے پاس آیا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں بتائیں ملک صاحب!'' وہ یکدم سنجیدہ ہوگیا۔

''مجھے آپ کے کام آ کر بہت خوشی ہوگی۔''

میں نے کہا۔''ایک قانونی معاملے میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''آپ کھل کر بتائیں، معاملہ کیا ہے؟''

''معاملہ تمہارے گھر کا ہے بختا جی!''

''میرے گھر کا.....؟'' اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔''میں تمہاری بیوی سے مل کر تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ مزید الجھ گیا اور متذبذب انداز میں بولا۔''آپ میری کون سی بیوی سے ملنا چاہتے ہیں؟''

شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ بختا پہلوان نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ زلیخا اس کی پہلی بیوی تھی۔ ان کی شادی کو کم و بیش پانچ سال ہو گئے تھے۔ زلیخا میں سے بختا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بختا نے ایک سال پہلے زیتون نامی ایک لڑکی سے دوسری شادی کی تھی۔ زیتون بھی انتہائی خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی۔ یہ دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں بختا کے ساتھ زندگی گزار رہی تھیں۔

میں نے بختا کے سوال کے جواب میں کہا۔''میں تمہاری بڑی بیوی زلیخا سے ایک اہم معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایسا کون سے معاملہ آن پڑا ہے ملک صاحب کہ آپ زلیخا سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔''اور اس سلسلے میں آپ کو میرے تعاون کی بھی ضرورت ہے؟''

اس کی تشویش اور پریشانی اپنی جگہ بالکل دُرست تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص بھی ہوتا تو بیوی کے بارے میں ایسے استفسار پر یہی ردِعمل ظاہر کرتا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں بختا سے کہا۔

''یار! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم بھابی کو یہاں بلالو۔ میں تمہارے سامنے ہی اس سے سوال جواب کروں گا پھر ساری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔''

''لیکن یہ فوری طور پر تو ممکن نہیں۔'' اس نے تامل کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''دراصل، بات یہ ہے کہ زلیخا گھر میں موجود نہیں اس لیے میں آپ کی فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔''

میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔''زلیخا گھر میں نہیں تو پھر کہاں ہے؟''

''وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔'' بختا پہلوان نے جواب دیا۔

میں نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔''وہ میکے کب گئی ہے؟''

''دس روز پہلے۔'' اس نے بتایا۔''اس کا چھوٹا بھائی سلطان لینے آیا تھا اور میں نے یہ سوچتے ہوئے اسے بھیج دیا کہ چلو تھوڑا گھوم پھر آئے گی تو اس کی طبیعت اچھی ہو جائے گی۔ وہ پچھلے دنوں کافی بیمار رہی ہے۔ لگاتار سات دن بخار آیا تھا اسے۔ بڑی کمزور ہو گئی تھی۔''

بختا پہلوان اپنی بیوی کے بارے میں مجھے تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا اور میرے ذہن میں خیالات نے اودھم مچا رکھا تھا۔ میں نے بڑبڑانے والے انداز میں زیرِ لب کہا۔''کیا واقعی زلیخا دس دن پہلے اپنے میکے چلی گئی تھی۔''

بختا نے میری اس بڑبڑاہٹ کو براہِ راست سوال جانا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔''ملک صاحب! میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ زلیخا دس دن پہلے اپنے میکے جمال پور گئی تھی۔''

''جمال پور!'' میں نے پُرسوچ انداز میں یہ الفاظ دُہرائے پھر بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔''تو اس کا مطلب ہے وہ روزانہ رات کو جمال پور سے فتح گڑھ والے قبرستان میں آتی ہے۔''

جمال پور اور فتح گڑھ میں محض آدھے میل کی دوری تھی۔ دونوں گاؤں کے درمیان ایک نہر بہتی تھی۔ اگر کوئی شخص نہر کے پل پر سے گزر کر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانا چاہتا تو اسے زیادہ سے زیادہ پون میل سفر طے کرنا پڑتا اور.....اتنا فاصلہ زلیخا با آسانی طے کر سکتی تھی۔

بختا پہلوان نے میری زبان سے جب یہ الفاظ سنے تو اس کی تشویش ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ انتہائی مضطرب انداز میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! زلیخا خیریت سے تو ہے نا۔ آپ فتح گڑھ کے قبرستان کو اس کے ساتھ کیوں ملا رہے ہیں؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔''تمہاری زوجۂ اول مسماۃ زلیخا بی بی تو خیر و عافیت سے ہے لیکن اس کی حرکتوں سے فتح گڑھ کے قبرستان کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکون درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب!'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔''زلیخا نے ایسا کیا کردیا ہے کہ آپ کو تفتیش کے لیے میرے گھر آنا پڑا؟''

بختا پہلوان اب حد سے زیادہ اُلجھ چکا تھا۔ یہ ضروری ہوگیا تھا کہ اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کردیا جاتا۔ وہ میرا ایک اچھا دوست تھا اور اپنی بیوی کی غیر نصابی سرگرمیوں سے بھی بالکل بے خبر تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بختا کو فتح گڑھ کے قبرستان میں پیش آنے والے سنسنی خیز واقعات کے بارے میں بتادیا۔

اس نے میری پوری بات توجہ سے سنی اور سٹپٹائے ہوئے انداز میں بولا۔''یہ نہیں ہوسکتا ملک صاحب! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ایسا ہوا ہے..... جبھی تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔''زلیخا کو ایسا مکروہ عمل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔''تمہیں یقین نہیں آرہا بختا! مگر میں پُریقین ہوں کیونکہ میں نے گزشتہ رات خود اپنی آنکھوں سے زلیخا کو وہ گندا عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' پھر میں نے اے ایس آئی کو مخصوص اشارہ کردیا۔

ہم سوئیوں والے اس گڈے کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے جو خیر دین کی قبر میں سے برآمد ہوا تھا۔ افتخار باجوہ نے مذکورہ گڈا پلاسٹک کے تھیلے میں سے نکال کر بختا پہلوان کے سامنے رکھ دیا۔ میں نے کہا۔

''بختا جی! ذرا تم بھی اس پتلے کا دیدار کرلو۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسی گڈے کا ذکر کیا تھا۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر چبھی ہوئی سوئیاں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ زلیخا کسی کی موت کی خواہاں ہے..... کس کی موت کی خواہاں؟ یہ تم بتاؤ گے۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا ملک صاحب!'' وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے کہا۔''لیکن زلیخا ضرور جانتی ہے۔''

''میں پوچھوں گا اس سے۔ وہ ذرا گھر تو.....!''

میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔''بختا جی!'' گا گے گی'' والی کوئی کہانی نہیں ہے۔ ہم ابھی اور اسی وقت موضع جمال پور روانہ ہورہے ہیں اور تم..... ہمارے ساتھ جاؤ گے۔''

''بالکل..... بالکل..... میں تیار ہوں۔'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔''لیکن..... آپ پہلے کچھ کھا پی تو لیں۔ میں نے آپ کے لیے.....''

''یہ ضروری نہیں ہے بختا جی!'' میں نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کی۔''کھانا پینا تو بعد میں بھی ہوسکتا ہے۔ پہلے مجھے زلیخا سے مل کر اس کیس کو حل کرنا ہے اور مجھے قوی اُمید ہے، میں آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

بختا پہلوان کے پاس انکار یا تکرار کی کوئی گنجایش نہیں تھی لہٰذا اس نے ہتھیار پھینک کر اپنی شکست کا اعلان کردیا۔

☆☆☆

جب ہم موضع جمال پور پہنچے تو دوپہر ہورہی تھی۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ بارش تھم گئی۔ اس کے ساتھ ہی آسمان بھی کھل گیا۔ اس فضا اور موسم کو دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ آیندہ آٹھ دس گھنٹوں تک بارش نہیں ہوگی اور..... یہ ایک خوش آیند خبر نما خیال تھا۔

بختا پہلوان کے ساتھ دو پولیس والے جب جمال پور میں داخل ہوئے تو ہر طرف افراتفری سی مچ گئی۔ جمال پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور وہاں پولیس کبھی کبھار ہی آئی تھی اور..... جب بھی آئی تھی تو کوئی سنگین واقعہ ہی رونما ہوا تھا۔ اس لیے بھی گاؤں کے لوگوں میں گہری تشویش دیکھنے کو مل رہی تھی پھر جب پولیس بختا پہلوان کی سسرال پہنچی تو وہ گھر وہاں کے لوگوں اور ان کی تشویش کا مرکز بن گیا۔

بختا پہلوان کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن اس کی سسرال اس حوالے سے نسبتاً کمزور واقع ہوئی تھی۔ بہرحال، ہماری آمد پر گھر کے اندر بھی ہلچل سی مچ گئی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور کھانا بالکل تیار تھا۔ بختا کی سسرال والے پہلے ہمیں کھانا کھلانا چاہتے تھے لیکن میں نے ایسی ہر پیشکش کو فوراً مسترد کردیا اور بختا سے کہا۔

''بختا جی! تم تو جانتے ہو..... پہلے کام، پھر طعام اور آخر میں آرام۔ میں جب تک اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوجاتا جس کے حصول کی خاطر یہاں آیا ہوں، اس وقت کسی اور کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

بختا پہلوان، زلیخا کے حوالے سے خود بھی بے حد اُلجھا ہوا تھا لہٰذا اپنی اُلجھن کو دور کرنے کے لیے وہ میرا ہم خیال بن گیا۔ یہ بات مجھے معلوم ہوچکی تھی کہ زلیخا اس وقت گھر کے اندر موجود تھی۔ میں نے اے ایس آئی کو گھر کی بیٹھک میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود گولو پہلوان کی معیت میں زلیخا کو لے کر الگ تھلگ کمرے میں آ گیا۔

زلیخا ہراساں گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ پولیس ان کے گھر آئی تھی لیکن اسے اس قدر حواس باختہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا شوہر بختا پہلوان اس وقت ہمارے درمیان موجود تھا لہٰذا فکر اندیشے والی کوئی بات ہی نہیں تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی گھبراہٹ اور حواس باختگی ''چور کی داڑھی میں تنکا'' کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

زلیخا کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس کا ایک سب یہ بھی تھا کہ بختا پہلوان ایک قانون پسند اور معقول شخص کا کردار ادا کرتے ہوئے پوری طرح مجھے فیور کر رہا تھا۔ میرے چند ابتدائی سوالات کے جواب میں زلیخا نے جو ردِعمل ظاہر کیا اس سے بختا کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا نہیں..... بلکہ پوری دال ہی کالی ہے۔

بختا نے رُعب ڈالا اور میں نے خالص تھانے دارانہ انداز میں دو چار دھپے مارے تو زلیخا زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ دو سخت گیر آدمیوں کی تفتیش کے آگے زیادہ دیر ٹھہر نہ سکی اور اس نے اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے پوری تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

میں یہاں پر اس تفصیل کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کے ذہن میں سر اٹھا کر کھڑے متعدد سوالات کو جواب موصول ہو جائیں اور آپ سکون کی سانس لیں۔ یہ سارا فتنہ دراصل ساس بہو کی باہمی چپقلش کا نتیجہ تھا جسے ایک معاشرتی ناسور نے ہوا دے کر اس بلندی پر لا کھڑا کیا تھا۔

زلیخا کی اپنی ساس یعنی بختا پہلوان کی ماں رحمت بی بی سے کبھی نہیں بنی تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ بختا اور زلیخا کی شادی رحمت بی بی کی مرضی کے خلاف یعقوب احمد کی ضد کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ یعقوب، رحمت بی بی کا شوہر یعنی بختا کا باپ تھا۔ وہ اپنی بھتیجی زلیخا کو بہو بنا کر جمال پور سے چنی وال لے آیا تھا جبکہ رحمت بی بی بختا کی شادی اپنی کسی بھانجی سے کرنا چاہتی تھی۔ اس شادی کے ساتھ ہی رحمت بی بی کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی۔

یعقوب اس شادی کے کچھ ہی عرصے بعد چل بسا اور اس کی موت کے بعد ساس بہو میں باقاعدہ ٹھن گئی۔ رحمت بی بی بڑی کائیاں اور تیز عورت تھی۔ وہ بیٹے کے سامنے زلیخا کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتی جیسے وہ اس کی سگی بیٹی ہو لیکن بختا کے نگاہ سے ہٹتے ہی وہ روایتی ساس بن جاتی۔ زلیخا کے حق میں مزید برا یہ ہوا کہ شادی کے دو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی گود ہری نہ ہو سکی۔

اب تو اٹھتے بیٹھتے رحمت بی بی نے زلیخا کو طعنے دینے شروع کر دیے۔ وہ اسے بانجھ تک کہہ جاتی اور ڈھکے چھپے الفاظ میں زلیخا کو باور کراتی رہتی کہ اگر اس نے جلد از جلد بچہ نہیں جنا تو وہ اسے طلاق دلوا کر بختا کی دوسری شادی کروا دے گی۔ یہ صورتِ حالات زلیخا کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ بختا اپنی فتنہ پرور ماں کا نہایت ہی فرماں بردار تھا اس لیے وہ اپنے شوہر سے ساس کی شکایت کرتے ہوئے ڈرتی کہ کہانی بالکل ہی اُلٹی نہ ہو جائے۔ اس کے پاس انتظار اور صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔

وہ بڑے صبر سے ساس کی زیادتیاں برداشت کر رہی تھی اور انتظار میں تھی کہ کب اللہ اس کی بھی سن لے گا۔ اگر اس کی گود میں کوئی زندگی کھیلنے لگتی تو اس کی ساس کا آپوں آپ منہ بند ہو جانا لیکن قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا اس لیے اس کی کوئی دعا، کوئی منت مراد پوری نہ ہو سکی۔

دوسری جانب جب ساس کے ظلم و ستم حد سے تجاوز کر گئے تو اس نے مجبوراً پہلی مرتبہ بختا کو اپنے مسائل سے آگاہ کیا۔ ایسا معاملہ چوں کہ پہلی مرتبہ بختا کے سامنے گیا تھا اس لیے اسے ماں کی زیادتی کا یقین ہی نہیں آیا نتیجے میں اس نے رحمت بی بی سے استفسار کیا تو وہ صاف مکر گئی اور الٹا زلیخا سے جھوٹے سچے واقعات منسوب کر کے بیٹے کے کان بھرنے لگی۔ چند روز تک گھر میں کشیدگی کی سی فضا رہی پھر سب کچھ نارمل ہو گیا۔

بختا یہی سمجھا کہ حالات معمول پر آ گئے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ رحمت بی بی نے زلیخا کا ناطقہ بند کرنے کے لیے اب خفیہ کارروائی شروع کر دی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر زلیخا کو کوئی یادگار سبق سکھانا ہے تو بختا کی ایک اور شادی ناگزیر ہے۔ بختا جوان تھا، وجیہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی شاہ زوری کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی ہر دل عزیز شخصیت تھا کہ اس کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

جب تیسرا سال بھی بن بہار گزر گیا، بختا کے گھر کے آنگن میں کوئی پھول کھلا اور نہ ہی کوئی کلی چٹخی تو رحمت بی بی نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک لڑکی کو بختا کے لیے پسند کر چکی تھی۔ مذکورہ لڑکی کا نام زیتون تھا اور حسن و جمال میں وہ اپنی مثال آپ تھی، زیتون کا تعلق ایک آسودہ حال زمیں دار گھرانے سے تھا۔ رحمت بی بی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب بات اٹھائی تو زیتون کے والدین فوراً اس رشتے کے لیے تیار ہو گئے لیکن انہوں نے ایک شرط بھی لگا دی کہ یا تو بختا اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے اور یا پھر وہ ان کی بیٹی کو الگ گھر میں رکھے۔ زیتون اپنی سوتن کے ساتھ نہیں رہے گی۔

اس شرط کا پہلا حصہ رحمت بی بی کو بہت پسند آیا اور اس نے بیٹے سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز تنہائی میسر آتے ہی اس نے بختا سے کہا۔

''زلیخا تمہاری نسل چلانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ یہ اچھا موقع ہے۔ تم دو لفظ بول کر اس سوکھے پیڑ سے جان چھڑا لو۔ میں ایک بہت اچھے خاندان میں تمہاری شادی کراؤں گی۔''

رحمت بی بی چند سال قبل اپنی جس بھانجی سے بختا کی شادی کرانا چاہتی تھی وہ اب بیاہ کر اپنی سسرال میں پہنچ چکی تھی لہٰذا مجبوراً اسے خاندان سے باہر نگاہ دوڑانا پڑی تھی۔ بختا نے اپنی ماں کی تجویز کے جواب میں کہا۔

''اماں! میں کافی دنوں سے تمہاری سرگرمیاں دیکھ اور سن رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم چودھری حشمت کی سب سے چھوٹی بیٹی زیتون سے میری شادی کرانا چاہتی ہو لیکن میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ایسا کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟''

''ضرورت ہے نا..... اسی لیے تو کرنا چاہتی ہوں۔'' رحمت بی بی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ''کیا تم بے نام ہی مرنا چاہتے ہو؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا اماں؟'' فوری طور پر بختا کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

رحمت بی بی نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''تمہاری شادی کو لگ بھگ ساڑھے تین سال ہونے کو آئے ہیں اور ابھی تک زلیخا نے خوشی کی کوئی خبر نہیں سنائی۔ مجھے تو پورا یقین ہے، یہ عورت بانجھ ہے۔ اس سے کوئی امید رکھنا سراسر حماقت ہوگی۔'' پھر وہ ایک دم اداس ہونے کی اداکاری کرنے لگی اور بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''بختا بیٹا! تمہارا کتنا نام ہے۔ تم نے اپنے باپ سے بھی زیادہ نام کمایا ہے۔ دور دور تک تمہاری شہرت پھیلی ہوئی ہے۔ تمہارا باپ بھی بڑا نامی گرامی پہلوان تھا۔ آج وہ زندہ نہیں لیکن اس کا نام زندہ ہے..... تم نے اپنے باپ کے نام اور کام کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ذرا سوچو، غور کرو..... اگر زلیخا میں سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہوئی تو تمہارا نام کون زندہ رکھے گا..... کون تمہیں یاد کرے گا؟''

ماں کی جذباتی تقریر سن کر بختا بھی تھوڑی دیر کے لیے فکرمند ہو گیا پھر کم زوری مزاحمت کرتے ہوئے بولا۔

''اماں! اللہ کی رحمت سے اتنی جلدی مایوس نہیں ہو جانا چاہیے۔ اگر ابھی تک زلیخا کی گود ہری نہیں ہوئی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آیندہ بھی یہ خوش خبری نہیں مل سکتی۔ میں نے ایسے واقعات بھی سنے ہیں جب شادی کے بیس پچیس سال بعد اولاد ہوئی ہو!'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بڑی سادگی سے بولا۔

''ویسے بھی مجھے کسی قسم کی کوئی جلدی نہیں ہے!''

''تمہیں جلدی اس لیے نہیں کہ تم ابھی جوان جہان ہو۔ تمہارے سامنے بہت سی زندگی پڑی ہے لیکن میرے پاس کوئی مہلت نہیں۔'' رحمت بی بی نے خفگی آمیز انداز میں کہا پھر وہ بیٹے پر سب سے خطرناک جذباتی حملہ کرتے ہوئے، بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''بختا پتر! میں اپنی زندگی گزار چکی ہوں۔ پتا نہیں، کب بلاوا آ جائے۔ میں مرنے سے پہلے تمہاری اولاد کو اپنی گود میں کھلانا چاہتی ہوں..... تم اسے میری آخری خواہش سمجھ لو!''

''اماں..... اماں.....!'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

رحمت بی بی نے ایک اور ردا چڑھاتے ہوئے کہا ''بختا پتر! اگر تم نے میری یہ خواہش پوری نہ کی تو میں روزِ محشر تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔ زلیخا سے تو مجھے کوئی امید نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے، میری آس پوری ہونے سے پہلے ہی آنکھ بند ہو جائے گی۔ تم اپنی مری ہوئی ماں کو کیا جواب دو گے؟''

رحمت بی بی نے دو تین مرتبہ بڑے رقت آمیز انداز میں اپنی موت کا ذکر کیا تو بختا پہلوان اندر سے کانپ کر رہ گیا۔ وہ طاقت کا پہاڑ تھا اور اپنے حریف پر کسی اندھے طوفان کے مانند ٹوٹ پڑتا تھا مگر ماں کے سامنے وہ ایک کم زور، ننھا سا بچہ ہی تھا۔ پھر وہ ماں کا اتنا فرماں بردار تھا کہ اس کی خوش نودی کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ماں نے ابھی ابھی اس کے سامنے جو ''فرمائش'' رکھی تھی اسے پورا کرنا بختا کے بس میں تھا۔ وہ ماں کے آنسوؤں کے سامنے ڈھیر ہو گیا اور ہر شے سے بے پروا ہو کر ٹھوس لہجے میں بولا۔

''اماں! اگر آپ کی خوشی اس میں ہے کہ میں چودھری حشمت علی کی بیٹی زیتون سے دوسری شادی کر لوں تو مجھے منظور ہے لیکن اس سلسلے میں، میں آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست کروں گا۔''

رحمت بی بی نے بیٹے کو اپنے اشارے پر سرنگوں دیکھا تو جلدی سے دلار بھرے لہجے میں بولی ''میرے بچے! بتاؤ، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زیتون سے میری شادی کر کے آپ اپنی خواہش ضرور پوری کرلیں لیکن زلیخا کی طلاق کی بات نہ کریں۔'' بختا نے گہری سنجیدگی سے کہا'' اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اسے بھی اسی گھر میں ہی رہنے دیں۔ ابا جی بڑے چاؤ سے اسے بیاہ کر میرے لیے لائے تھے۔ میں زلیخا کے ساتھ کوئی زیادتی کر کے ابا جی کی روح کو اذیت نہیں پہنچانا چاہتا۔ بس اتنی سی بات ہے!''

رحمت بی بی ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے بیٹے کو دیکھنے لگے۔ اسے اس بات سے سخت تکلیف پہنچی تھی کہ بختا اپنے دل میں زلیخا کے لیے ہم دردی کے جذبات رکھتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ زلیخا کا عبرت ناک حشر ہو لیکن فی الحال ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بختا دوسری شادی کے لیے آمادہ ہوگیا تھا۔ یہ .....موت دکھا کر بخار پر راضی کرنے والی صورت حال تھی۔

رحمت بی بی نے سوچا، ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ جب گھر میں زلیخا کی سوتن آجائے گی تو وہ اسے فوراً اپنی مٹھی میں لے لے گی۔ پھر زیتون اور وہ دونوں مل کر زلیخا کی وہ مٹی پلید کریں گی کہ وہ خود ہی گھر چھوڑ کر بھاگ جائے گی۔

''اماں! تم کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟'' بختا نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''آں..... ہاں.....'' وہ چونک گئی'' کچھ نہیں.....'' اس نے جلدی سے بات بنادی'' میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی..... یعنی تمہاری درخواست کے بارے میں.....اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے بیٹے کی بات ضرور مانوں گی لیکن اس سلسلے میں چودھری حشمت علی نے ایک شرط لگادی ہے!''

''کیسی شرط؟'' بختا پہلوان نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

اس کی ماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''چودھری حشمت کا کہنا ہے کہ اگر بختا اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے پر تیار نہ ہو تو پھر اسے چاہیے کہ زیتون کو الگ گھر میں رکھے۔ وہ اپنی سوتن کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی نہیں گزارے گی۔''

''علیحدہ گھر کی کیا ضرورت ہے اماں!'' بختا نے پرسوچ انداز میں کہا'' اتنے بڑے دو منزلہ گھر میں اس وقت ہم صرف تین افراد رہ رہے ہیں۔ ان میں ایک فرد کا اضافہ ہوجائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ ماشاءاللہ! اوپر والی منزل میں تین کمرے ہیں اور نیچے چار کمروں کے علاوہ کشادہ صحن بھی ہے۔ ایک اوپر رہ سکتی ہے اور دوسری نیچے۔ نہ کوئی جھگڑا اور نہ کوئی فساد!''

بیٹا اس کے بنائے ہوئے منصوبے پر بڑی حد تک عمل کرنے کو تیار تھا لہٰذا اس نے زیادہ سخت رویہ اپنانے کے بجائے نرمی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں اس سلسلے میں چودھری حشمت سے بات کروں گی اور جو تم نے تجویز دی ہے اس کے لیے چودھری کو آمادہ کرنے کی کوشش بھی کروں گی۔''

ان متانت اور عزائم کے ساتھ، ماں بیٹے میں ہونے والی میٹنگ ختم ہوگئی۔ اگلے ہی روز رحمت بی بی نے چودھری حشمت سے بات کی اور وہ مردِ معقول اس تجویز سے اتفاق کرنے پر تیار ہوگیا۔ اس گھر میں جو کچھ بھی ہو رہا تھا، کسی نہ کسی حد تک زلیخا بھی اس سے واقف تھی۔ اس کے سینے پر جو چھریاں چل رہی ہوں گی ان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ خبر اڑتے اڑتے جمال پور بھی پہنچ گئی تھی کہ رحمت بی بی اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر رہی ہے۔ ادھر سے تھوڑا شور شرابا اور احتجاج بلند ہوا لیکن رحمت بی بی نے یہ دھمکی دے کر زلیخا کے گھر والوں کو خاموش کردیا۔

''اگر آپ لوگوں کو بختا کی دوسری شادی پر اعتراض ہے تو اپنی بیٹی کو گھر لے جائیں۔ بختا اولاد کی خاطر دوسری شادی کر رہا ہے اور اس اک یہ عمل بالکل درست اور سنت نبوی کے عین مطابق ہے۔ اسے ایسا کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا!''

رحمت بی بی نے اخلاق، قانون اور مذہب کا ایسا کارڈ کھیلا تھا کہ زلیخا کے گھر والوں کی زبانوں پر قفل ڈل گئے۔ وہ کسی بھی قیمت پر یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی گلے میں طلاق کا طوق ڈال کر میکے میں آبیٹھے۔ صرف زلیخا کی ماں جمیلہ بی بی نے اتنا کہا۔

''اگر دوسری بیوی سے بھی بختا کا کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو کیا اس کی تیسری شادی کرائی جائے گی؟''

''یہ سوچنا تمہارا نہیں، میرا کام ہے!'' رحمت بی بی نے بڑے کڑے انداز میں اپنی سمدھن کو چپ کرادیا'' بختا میرا بیٹا ہے۔ تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں.....''

جمیلہ بی بی نے کم زور سا احتجاج کیا'' رحمتے! جس طرح تمہیں اپنے بیٹے کی فکر ہے ویسے ہی مجھے بھی اپنی بیٹی کی فکر ہے۔ تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں سب کچھ سمجھی سمجھائی ہوں'' رحمت بی بی نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا'' تمہاری بیٹی پر یہاں کوئی ظلم نہیں کر رہا۔ تمہیں تو ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ اسے اس گھر میں بہو کے مقام پر فائز رکھا جا رہا ہے اور جب تک تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے امن وامان سے رہنے کی نصیحت کرتی رہوگی، وہ بختا کی بیوی رہے گی۔ میرا خیال ہے، میری باتیں اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آگئی ہوں گی؟''

رحمت بی بی کے اس حتمی انداز کے بعد کسی بحث وتکرار کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ اگر جمال پور والوں کو زلیخا کا گھر بستے ہوئے دیکھنا تھا تو انہیں انہی حالات سے سمجھوتا کرنا تھا۔ ان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زلیخا اور اس کے گھر والوں نے دست یاب واحد راستے پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

بختا اور زیتون کی شادی ہوگئی۔ زلیخا کو گھر کی بالائی منزل پر منتقل کردیا گیا۔ زیتون اور رحمت بی بی نے زیریں منزل پر قبضہ جمالیا۔ گھر میں رہن سہن کا انداز کچھ اس طور دکھائی دیتا تھا جیسے زلیخا کو بالکل الگ کردیا گیا ہو۔ اگر کسی کو اس کا تھوڑا بہت خیال تھا تو وہ تھا بختا پہلوان۔ بختا کا زیادہ رجحان اور دل چسپی اگر چہ زیتون میں تھی، اس کے باوجود بھی وہ زلیخا کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ یہ اس کی مہربانی تھی ورنہ زلیخا اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

رحمت بی بی نے زیتون کی مدد اور تعاون سے زلیخا کو ایسے ایسے طریقوں سے تنگ کیا کہ بیان سے باہر ہے۔ زلیخا نے باقاعدہ روتے ہوئے مجھے اپنی داستان غم سنائی۔ بختا پہلوان ہمارے قریب بیٹھا خاموشی سے اس کا دکھڑا سن رہا تھا۔ اس نے ابھی تک بیچ میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کی عقل مندی کا مظاہرہ تھا۔ فریقین کو اپنی بات کہنے، اپنا موقف بیان کرنے کا پورا حق ہونا چاہیے۔ ابھی وہ اپنی بیوی کی کہانی سن رہا تھا، کسی درست فیصلے تک پہنچنے کے لیے اسے اپنی ماں کی بات بھی سننا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا تھا۔

زلیخا نے اپنی ساس کے ظلم وستم کی داستان اتنی تفصیل اور جذبات انگیز انداز میں مجھے سنائی کہ اسے بیان کرنے کے لیے درجنوں صفحات کی ضرورت ہوگی لہٰذا میں خاموشی سے آگے بڑھتا ہوں، تاکہ آپ جلد از جلد اس کہانی کے کلائمیکس تک پہنچ سکیں جس کا آپ بے تابی سے انتظار کررہے ہیں۔

زلیخا جیسے تیسے حالات میں گزارہ کررہی تھی پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا خطرناک موڑ آیا کہ یک دم وہ بے حد پریشان ہوگئی۔ قدرت نے زیتون پر مہربانی کردی تھی۔ اس خبر نے زلیخا کو گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ اس کے ذہن میں خدشات اور اندیشوں کی تیز آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اسے اپنا دل ڈولتا ہوا اور دماغ ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی نظر کے سامنے اس کا مستقبل تاریکی میں کہیں گم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

زیتون کی طرف سے خوشی کی خبر ملتے ہی رحمت بی بی کے تیور ہی بدل گئے۔ وہ زلیخا کے لیے اور بھی خطرناک ہوگئی۔ وہ تو پہلے بھی زلیخا کی خیر خواہ نہیں تھی، غضب تو یہ ہوا کہ بختا کا جھکاؤ زیتون کی طرف کچھ زیادہ ہی بڑھتا چلا گیا اور یہ عین فطری اور انسانی نفسیات کے مطابق بھی تھا۔

اس مرتبہ جو زلیخا میکے گئی تو کچھ زیادہ ہی افسردہ اور ملول تھی۔ اس کی ایک دور کی خالہ نگہت نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور تنہائی میسر آتے ہی اسے ٹٹولنے لگی۔ زلیخا بھری بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا دل کھول کر نگہت کے سامنے رکھ دیا۔ پوری کہانی سننے کے بعد نگہت نے ہم دردی بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے تمام مسائل کو صرف ایک ہی شخص حل کرسکتا ہے!''

''کون؟'' زلیخا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''چن باوا!''

''تمہارا مطلب ہے، عامل کامل چن باوا؟''

''ہاں، میں اسی کی بات کررہی ہوں۔'' نگہت نے اثبات میں گردن ہلائی ''وہ بہت ہی پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں اس کے پاس لے کر جاسکتی ہوں!''

امید کی کرن دیکھ کر زلیخا اندر سے جگ مگا اٹھی۔ کسی پیاسے شخص کو اگر کوئی بتائے کہ وہاں اس جگہ میٹھے پانی کا چشمہ یا کنواں واقع ہے تو وہ فوراً اسی سمت بڑھ جاتا ہے۔ ضرورت مند اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے رات اور دن کے چکر میں نہیں پڑتا۔ زلیخا نے چن باوا کا نام سن رکھا تھا اور اس کے کمالات کی کہانیاں بھی اس تک پہنچی تھیں لیکن بہ راہ راست کبھی اس کا یا اس کے گھر والوں کا چن باوا سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ چن باوا کا آستانہ جمال پور ہی میں واقع تھا۔

زلیخا نے پُر امید نظر سے خالہ نگہت کو دیکھا اور اضطراری لہجے میں بولی ''کیا واقعی، چن باوا میرے لیے کچھ کرسکتا ہے؟''

''میں تو چن باوا پر اندھا یقین رکھتی ہوں'' نگہت نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میری ایک اپنی رشتے کی عورت کا چن باوا نے علاج کیا ہے۔ دو ماہ کے اندر ہی اللہ نے اس پر کرم کردیا۔ اب وہ اس گھڑی کا، دن گن گن کر انتظار کررہی ہے جب اس کی گود کا سونا پن ختم ہوجائے گا اور وہاں کسی معصوم کی قلقاریاں سننے کو ملیں گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگہت سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر رازدارانہ لہجے میں بولی ''تمہاری سوتن کو تم پر سبقت حاصل ہو چکی ہے۔ تمہیں یہ مقابلہ برابری کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔ اگر تمہاری بھی امید بندھ جائے تو تم اپنا کھویا ہوا سب کچھ دوبارہ حاصل کر سکتی ہو..... عزت، پوزیشن اور بختا کی توجہ۔ اگر تم کارکردگی میں زینون کے برابر آن کھڑی ہو گی تو دیکھ لینا، تمہاری دنیا ہی بدل جائے گی۔''

نگہت، زلیخا کے دل کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ہیجانی لہجے میں پوچھا ''کیا چن باوا کے علاج سے واقعی میری مراد بر آئے گی؟''

''ہاں، ہاں۔ مجھے پکا یقین ہے۔'' نگہت نے پر وثوق انداز میں کہا ''باوا جی رکھنے والی دوائی دیتے ہیں۔ بس، دو تین خوراکوں ہی میں کام ہو جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے خالہ! میں تمہارے ساتھ چن باوا کے پاس جانے کو تیار ہوں۔'' زلیخا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''لیکن میرے گھر والوں کو اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے!''

''تم فکر نہ کرو، یہ راز ہم دونوں کے درمیان رہے گا۔''

زلیخا مطمئن ہو گئی۔ اس اطمینان میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔

اگلے روز زلیخا خاموشی سے نگہت خالہ کے ہم راہ چن باوا کے آستانے پر پہنچ گئی۔ اس وقت عامل کامل چن باوا اپنے حجرے میں اکیلا ہی تھا۔ وہ اس کے روبہ رو جا کر بیٹھ گئیں اور نگہت نے بڑے احترام سے چن باوا سے کہا۔

''باوا جی! میں نے کل آپ کو زلیخا کے بارے میں، پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔ آج میں اسے ساتھ لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ یہ بہت ہی دکھی اور پریشان ہے۔ اس کا کام ضرور ہونا چاہیے۔ آپ کو دعائیں دے گی!''

چن باوا جیسے روحانی عامل کامل، لوگوں کی نفسیات سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پاس آنے والوں کو کچھ اس انداز میں ٹریٹ کرتے ہیں کہ سامنے والا بے خبری میں، انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیتا ہے۔ ازاں بعد، یہ باوا ٹائپ لوگ انہی معلومات کو استعمال کر کے اپنے علم و عمل کا رعب گانٹھتے رہتے ہیں۔ بہ ہر حال، چن باوا کی طرح کے بہت سے کرداروں کو میں پہلے بھی انہی صفحات میں بے نقاب کر چکا ہوں۔ اس مرتبہ آپ چن باوا کا جلوہ بھی دیکھ لیں۔ ذرا پتا تو چلے، چن باوا کے چن (چاند) چڑھانے کا کیا طریقۂ واردات ہے!

چن باوا نے بڑی گہری نظر سے زلیخا کا جائزہ لیا اس کی سرخ سرخ آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو زلیخا ڈر ہی گئی۔ اس انداز کی آنکھیں یا تو ان لوگوں کی ہوتی ہیں جو ایک دو روز سے بالکل سوئے نہ ہوں اور یا پھر وہ لوگ جو کوئی زود اثر نشہ کرتے ہوں مثلاً چرس، بھنگ وغیرہ..... زلیخا کو چن باوا کی نظر اپنے بدن میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحات تک اسی انداز میں اسے گھورتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آنکھیں کھولے بغیر بولا۔

''ہم نے تمہارے حالات اور معاملات پر نگاہ ڈالی ہے اور یہ جاننے میں کام یاب ہو گئے ہیں کہ اس گھر میں تمہاری سب سے بڑی دشمن تمہاری ساس رحمتے ہے۔ اس نے تم پر اولاد کی بندش کروا رکھی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ بختا تمہاری طرف سے مایوس ہو کر تمہیں طلاق دے دے اور اب تو تمہاری سوتن والی ''خوش خبری'' کے بعد تمہارے لیے مصیبتیں ہی مصیبتیں آنے والی ہیں لیکن.....''

چن باوا نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو زلیخا کے منہ سے بے اختیار نکلا ''لیکن کیا باوا جی؟''

چن باوا نے یک لخت آنکھیں کھول دیں پھر سرخ سرخ آنکھوں سے زلیخا کو گھورتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''لیکن..... یہ کہ تم بروقت ہمارے پاس آ گئی ہو۔ اب کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تم اس گھر میں شان سے رہو گی۔ بختا تمہارے پاؤں دھو دھو کے پیے گا اور تم اس کے بچوں کو پالو گی.....''

''کیا واقعی، ایسا ہو سکتا ہے؟'' زلیخا کی آواز شدت جذبات سے کپکپا رہی تھی۔

''کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔'' وہ تیکھی نگاہ سے اس کے سراپا کو ٹٹولتے ہوئے بولا ''ہم کہہ رہے ہیں تو ضرور ایسا ہو گا مگر اس مشن میں کام یابی کے لیے تمہیں ہماری ہدایات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہو گا!''

چن باوا، زلیخا کو جتنی بڑی خوش خبری سنا رہا تھا اس کے لیے تو وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی۔ اسے اس بات کی خواہش نہیں تھی کہ بختا اس کے پاؤں دھو دھو کر پیے۔ وہ تو صرف اتنا چاہتی تھی کہ وہ بختا کہ بچوں کی ماں بن جائے تاکہ اس کے ماتھے پر لگا ہوا ''بانجھ'' کا لیبل ہٹ جائے۔ اس کی ساس کی زبان بند ہو جائے اور وہ امن و سکون سے اپنی سسرال میں رہنے لگے۔ یہ سب کچھ چاہنا اس کا حق بنتا تھا لیکن افسوس کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے غلط راہ اختیار کر بیٹھی تھی۔ چن باوا ان تمام خواہشات کے پورا ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا یقین دلا رہا تھا لہٰذا بے ساختہ اس نے کہہ دیا۔

''باوا جی! میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں!''

''ٹھیک ہے!'' چن باوا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ثابت قدمی بتاتی ہے کہ تم اپنے مقصد میں ضرور کام یاب ہوگی۔ تم کل اسی وقت ہمارے آستانے پر آجاؤ۔ ہم تمہیں کچھ ہدایات دیں گے۔ اگر تم نے ہماری ہدایت پر عمل کر دکھایا تو سمجھو، بیڑا پار ہے.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''لیکن شرط یہ ہے کہ کل تم اکیلی ہمارے پاس آؤ گی!''

بات ختم کرتے ہی چن باوا نے آنکھیں بند کرلیں۔ زلیخا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنا چاہے تو نگہت نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش کرا دیا، پھر وہ زلیخا کو آستانے سے باہر لانے کے بعد بولی۔

''چن باوا جب بات ختم کر کے آنکھیں بند کرلیں تو پھر کہنے سننے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ تم کل جب ان سے ملنے آؤ گی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''لیکن .....وہ تو مجھے اکیلے آنے کو کہہ رہے ہیں.....؟'' زلیخا کے لہجے میں الجھن تھی۔ وہ سنجیدگی سے بولی ''تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ میں تمہارے ساتھ آستانے تک آؤں گی لیکن حجرے میں تمہیں تنہا ہی جانا ہوگا۔ تم گھبراؤ نہیں، میں پہلے بھی کئی ضرورت مند عورتوں کو یہاں لا چکی ہوں اور وہ سب بہت خوش ہیں۔ سب کی جھولیاں مرادوں سے بھر گئی ہیں۔''

نگہت کے تسلی دلاسے اور سمجھانے بجھانے کے بعد زلیخا تیار ہوگئی اور اگلے روز وہ چن باوا سے ہدایت لینے کے لیے اس کے آستانے پر پہنچ گئی۔ پروگرام کے مطابق، نگہت باہر ہی رک گئی اور زلیخا اکیلی چن باوا کے حجرے میں داخل ہوگئی۔

حجرے میں اس روز چن باوا اور زلیخا کے درمیان جو ''میٹنگ'' ہوئی اس کا احوال بیان کرتے ہوئے بار بار زلیخا کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ اس نے متعدد توقف کے بعد وہ واقعہ مکمل کیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑی احتیاط سے اپنی کہانی میں ایڈیٹنگ کر رہی تھی۔ میں اس قصے کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔ عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور میرے خیال میں، ان چند سطور میں، سمجھنے کے لیے کئی اشارے موجود ہیں۔

زلیخا نے مجھے بتایا کہ اس روز جب وہ چن باوا کے حجرے میں پہنچی تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد چن باوا نے اس سے کہا ''رکھنے والی دوائی تو میں تمہیں بعد میں دوں گا، پہلے تمہاری سوتن کا بندوبست کرنا ہے۔''

''سوتن کا بندوبست!'' زلیخا کچھ نہ سمجھی ''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟''

چن باوا نے کہا ''اگر تمہاری سوتن کے بطن میں پرورش پانے والی ''خوش خبری'' منظر عام پر آگئی تو پھر اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں رہے گی اس لیے تمہیں پہلے اس خطرے سے اپنا بچاؤ کرنا ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' زلیخا نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

چن باوا نے کہا ''چار راتوں کا ایک خاص عمل ہے۔ اگر تم نے وہ عمل پورا کر دیا تو سمجھو تم اپنے مقصد میں کام یاب ہوگئیں۔ اس عمل کے نتیجے میں تمہاری سوتن کی کوکھ سیمنٹ کی ہوجائے گی۔ اس کے اندر نمو پانے والی زندگی کو بریک لگ جائیں گے اور اس کی کوکھ کی زمین ایسی بنجر اور بے آب و گیاہ ہوجائے گی کہ اس کی آخری سانس تک وہاں کوئی بیج پنپ نہیں پائے گا۔ بولو، تم اس عمل کے لیے تیار ہو؟''

زلیخا نے مجھے بتایا کہ وہ کسی کی جان کی دشمن نہیں بن سکتی تھی لہٰذا اس نے چن باوا کے سامنے کم زور سا احتجاج کیا ''باوا جی! کیا یہ ضروری ہے کہ.....؟''

''بہت ضروری ہے!'' چن باوا نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ کسی اور کو نظر نہیں آرہا۔ یہ زیتون تمہاری کھلی دشمن ہے اور وہ تمہاری دوسری دشمن یعنی تمہاری ساس کا بھرپور ساتھ دے رہی ہے۔ اگر زیتون کو تمہارا ذرا بھی خیال یا احساس ہوتو وہ بجائے شادی پر تیار نہ ہوتی۔ اس نے بڑی صفائی سے تمہارا شوہر چھین لیا اور تمہاری ساس نے بندش کروا کر تم سے ماں بننے کی صلاحیت چھین لی۔ یہ دونوں عورتیں تمہاری ازلی ابدی دشمن ہیں۔ یاد رکھو، دشمن سے نمٹنے کے لیے دشمنی ہی کرنا پڑتی ہے اس لیے اگر تم میری ہدایات پر عمل کرو گی تو تمہاری یہ کوشش انتہائی جائز اور برحق ہوگی!''

رحمت بی بی اور زیتون کی طرف سے زلیخا کا دل کسی پھوڑے کے مانند پکا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے بہت اذیت اور تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ ان دونوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔ اس نفرت کو چن باوا کی تقریر نے اور بھی ہوا دی۔ زلیخا کے اندر نفرت اور انتقام کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جب کوئی انسان اس بلندی پر منتقمانہ انداز میں سوچے تو پھر وہ کچھ بھی کرنے پر تیار ہوجاتا ہے..... زلیخا نے بھی آنکھیں بند کر کے چن باوا کی ''ہدایات'' پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چن باوا نے اسے سوئیاں چبھا ایک گڈا تیار کر کے دیا جو پہلی رات زلیخا کو کسی تازہ تازہ قبر میں دبانا تھا۔ باقی کی تین راتوں میں اگر بتیوں اور مسور کی دال والا عمل کرنا تھا۔ اتفاق سے ابھی دنوں موضع فتح گڑھ میں خیر دین کا انتقال ہوا تھا۔ اس قسم کے سفلی عمل کے لیے اس کی قبر نہایت ہی موزوں تھی۔ چن باوا ہی نے زلیخا کو خیر دین کی قبر کے بارے میں بتایا تھا۔ چن باوا کی ہدایت کے مطابق، زلیخا کو سفید لباس پہن کر اور سر کے بال کھلے چھوڑ کر یہ عمل کرنا تھا۔

زلیخا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تھا آدھی رات کو گھر سے نکلنے کا۔ فتح گڑھ والا قبرستان جمال پور سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں گاؤں کے درمیان چند کھیت تھے یا ایک نہر بہتی تھی، بس گھر سے نکلنے کی مشکل تھی۔ اس نے نگہت کو اپنی پریشانی کے بارے میں بتایا تو اس نے فوراً ہی حل پیش کر دیا۔

اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا ''میں تمہاری دور کی خالہ لگتی ہوں اس لیے چند دن تمہارے گھر رہنے آ جاؤں گی تو تمہارے گھر والوں کو محسوس نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سوئیں گے۔ اس طرح تمہیں گھر سے نکلنے میں آسانی رہے گی۔ تمہارے جانے کے بعد اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں سنبھال لوں گی۔''

زلیخا خوش ہوگئی اور اگلے روز سے اس نے چن باوا کی ہدایات پر عمل شروع کر دیا۔ سوئیاں چبھے گڈے کو اس نے خیر دین کی قبر میں دبایا اور آنے والی دو راتوں میں اس نے مسور کی دال اور اگر بتیوں والا عمل بھی کر ڈالا تھا۔ ایک رات کا احمقانہ عمل باقی تھا کہ میں بیچ میں کود پڑا۔

اب میرے عمل کرنے کی باری تھی اور میں پوری طرح سرگرم عمل تھا۔

جو کہانی شروع ہو جائے اسے ایک نہ ایک دن ختم بھی ہونا ہوتا ہے۔ فتح گڑھ کے گورکن حاجی کریم کے خواب سے شروع ہونے والی کہانی جمال پور میں زلیخا سے ہونے والی بھرپور ملاقات پر ختم ہوگئی تھی۔ حاجی کریم نے جاگتی آنکھوں سے وہ خواب دیکھا تھا یا واقعی حالت نیند میں قدرت کی طرف سے اسے آنے والے ایک خطرے سے آگاہ کیا گیا تھا، اس سے بھی بحث نہیں، البتہ واقعات اسی ترتیب سے پیش آئے تھے جیسا اشارہ گورکن کو ملا تھا۔

یہ بھی سچ ہے کہ کسی کہانی کے ختم ہونے اور اس کے منطقی انجام تک پہنچنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ آپ بھی یقیناً یہ جاننا چاہیں گے کہ اس کہانی کا منطقی انجام کیا ہوا؟ یہ جاننا آپ کا حق بھی ہے کیوں کہ پچھلے ایک، ڈیڑھ گھنٹے سے آپ نہایت خشوع و خضوع سے اس کہانی کے ساتھ چسپاں ہیں۔

رحمت بی بی اور زیتون نے زلیخا کی زندگی اجیرن کرنے کے لیے جو بھی گھریلو سازشیں اور ٹوٹکے آزمائے وہ قابل داخل اندازی پولیس نہیں تھے لہٰذا ان کے ذکر کو گول کر کے میں آگے بڑھتا ہوں۔ زلیخا نے جو کچھ کیا، جذبات کی انتہا کو پہنچ کر چن باوا کے بہکاوے میں آ کر کیا۔ یہ کوئی ایسا سنگین جرم نہیں تھا کہ میں اسے پھانسی پر لٹکوا دیتا یا کئی سال کے لیے جیل میں، سڑنے کے لیے بھیج دیتا۔ اس سلسلے میں جو بھی ڈانٹ ڈپٹ اور جھاڑ پونچھ ہو سکتی تھی وہ میں نے کی۔ یہ ایک طرح کی تادیبی کارروائی تھی۔

اس تمام تر فتنے کی جڑ، شیطان ابن شیطان چن باوا کو میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ ایک رات کے لیے میں نے اسے سخت گیر پولیس اہل کاروں کے حوالے کر دیا تاکہ اس کی ''مٹی پلید'' فکر کے وہ اسے ''تعاون'' پر آمادہ کر دیں۔ پہلے تو وہ اپنے عمل وعلم کی بڑی بڑی دھمکیاں دیتا رہا۔ ڈرائنگ روم میں اس کی ''خدمت'' پر مامور افراد کو اس نے یہ کہہ کر بھی ڈرانے کی کوشش کی کہ وہ ایک پھونک مار کر، انہیں جلا کر بھسم کر دے گا لیکن وہ اللہ کے بندے میری ہدایت پر کاربند رہے۔ چن باوا کی دھمکیوں میں آنے کے بجائے انہوں نے پوری رات اس کی وہ دھلائی کی کہ چن باوا کی ساری ''باویت'' جہاں جہاں سے نکل سکتی تھی، اس نے فرار ہونے میں ایک لمحے کی غفلت نہ برتی۔

دیگر تفتیشی امور سے نمٹنے کے بعد میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے دریافت کیا ''چن باوا! تم عورتوں کی سونی گودوں کو ہرا بھرا کرنے کے سلسلے میں بہت مشہور ہو۔ اپنی اس ٹیکنالوجی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ تم نے رکھنے والی دوائی میں ایسی کون سی گیڈر سنگھی پیس کر ملا رکھی ہے؟''

''میں ایک شرط پر بتاتا ہوں جی.....!'' وہ بڑی تکلیف دہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

میرے متعین کردہ تفتیشی اہلکاروں نے اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''زیر حراست کسی مجرم کو کوئی شرط رکھنے کا حق ہوتا ہے اور نہ ہی میں اس کی اجازت دیتا ہوں لیکن تم تو چاند تک پہنچے ہوئے چن باوا ہو لہٰذا تمہاری بات تو سننا ہی ہوگی۔ بولو، کیا شرط ہے تمہاری؟''

''آپ یہ ٹیکنالوجی آگے کہیں نہیں بڑھائیں گے!'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہو۔'' میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے جھوٹی تسلی دی۔

''تمہارا یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ ہاں البتہ، ریٹائرمنٹ کے بعد اگر میرا موڈ ہوا، عامل کامل بننے کا تو میں تمہاری ٹیکنالوجی کو آزما کر ضرور دیکھوں گا!''

یہ ایک انتہائی مذاق کی بات تھی اور وہ کائیاں شخص میرا مطلب بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا۔

''وہ جناب! بات دراصل یہ اصل ہے کہ میرے پاس ایک ایسی دیسی دوائی ہے جو عورتوں کے مخصوص ایام کو روک دیتی ہے۔ میں وہی دوائی انہیں استعمال کرواتا ہوں اور وہ سمجھنے لگتی ہیں، ان کی گود ہری ہونے کا سبب بن گیا ہے۔'' وہ شیطانی انداز میں مسکرایا اور لمحے بھر کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دو چار ماہ یا کبھی کبھی چھ ماہ کے بعد اس دوا کے اثرات نمودار نہیں ہوتے یا گود ہری ہونے کا ''سبب'' ہی غائب ہوجاتا ہے تو میں اس کے لیے انہیں ہی قصوروار ٹھہرا دیتا ہوں۔ کیوں کہ میں رکھنے والی دوا کے ساتھ اتنا سخت پرہیز اور کڑی احتیاطیں بتاتا ہوں کہ کسی سے، کسی بھی وقت کوتاہی ہوسکتی ہے۔ بس اتنا سا کھیل ہے!''

''اور اس سلسلے میں خالہ نگہت تم سے بھرپور تعاون کرتی ہے؟'' میں نے اسے گھورا۔

وہ شیطانی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گیا۔

تفتیش کے دوران ہی میں چن باوا نے یہ راز بھی اگل دیا تھا کہ نگہت اس کی آلہ کار ہے۔ وہ جس طرح زلیخا کی دور پار کی خالہ تھی ویسے ہی اور بھی بہت سے لوگوں کی خالہ بنی ہوئی تھی۔ نگہت ایسے کردار لگ بھگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ میں نے نگہت کی گرفتاری کے لیے دو کانسٹیبلو کو موضع جمال پور اروانہ کردیا تھا۔

مخلوق خدا کو گمراہ کرنے، انہیں مکروہ اور قبیح افعال کی ترغیب دینے اور دھوکا دہی سے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے سلسلے میں، قانون کی کتابوں میں جتنی بھی سنگین دفعات موجود تھیں میں نے انہیں نچوڑ کر چن باوا پر لاگو کردیا پھر ایک جان دار سا کیس بنا کر اسے عدالت کے حوالے کردیا۔ وہ دو چار سال کے لیے تو گیا تھا کام سے!

چن باوا ایسے معاشرتی ناسوروں کو ڈائریکٹ پھانسی کے پھندے تک پہنچانا از روئے قانون ذرا مشکل کام ہے، اِلّا یہ کہ وہ اپنے انہی شیطانی چکروں میں کسی معصوم کی جان سے نہ کھیل بیٹھیں۔ اس سلسلے میں اگر عوام پولیس سے تعاون کرے تو ایسے فراڈ لوگوں کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے لیکن عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ عوام ہمت سے کام نہیں لیتے اور توقع کرتے ہیں کہ پولیس جادو کی چھڑی گھما کر سب ٹھیک کردے، حالاں کہ یہ خاصا مشکل کام ہے۔ پولیس اور عوام اگر شانے سے شانہ ملا کر کام کریں تو معاشرے کو ہر قسم کی گندگی سے پاک صاف کیا جاسکتا ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اگر اپنے گردونواح میں چن باوا جیسے کسی کردار کو مصروف عمل دیکھیں تو اس کے خلاف جہاد میں ایک لمحے کی غفلت نہ برتیں اور اس سلسلے میں پولیس کو اپنے ساتھ رکھیں۔ میں مانتا ہوں، ہر محکمے کی طرح پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی کالی بھیڑیں موجود ہیں لیکن یقین جانیں، تمام پولیس والے برے نہیں ہوتے۔ آزمایش شرط ہے۔ آپ ہمت اور کوشش تو کر کے دیکھیں!

اس کہانی کے کرداروں میں سب سے افسوس ناک انجام زلیخا کا ہوا۔ میں نے تو ایک طرح سے اسے ''معاف'' ہی کردیا تھا لیکن بختا پہلوان نے اسے معاف نہ کیا۔ یہ راز کھل جانے کے بعد کہ زلیخا نہ صرف یہ کہ زیتون کے بطن میں موجود زندگی کی، موت کی خواہش تھی بلکہ اس نے زیتون کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بانجھ بنانے کی خاطر چن باوا کے بتائے ہوئے شیطانی عمل پر بھی عمل کر ڈالا تھا، بختا کا غم وغصہ عروج کو پہنچ گیا۔ زلیخا اس کی نظر میں گر گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بختا کو یہ یقین ہوگیا کہ اس کی ماں رحمت بی بی، زلیخا کے بارے میں جو کچھ بھی کہتی تھی، وہ سچ ہے۔ زلیخا کو دوبارہ بختا پہلوان کے گھر جانا نصیب نہیں ہوا۔ بختا نے اسے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔

انسان جذبات میں آکر غلط صحیح میں تمیز کرنا بھول جاتا ہے۔ اگر زلیخا شیطان چکر میں پڑنے کے بجائے صبر کرکے کچھ عرصہ اور اپنی سسرال میں بیٹھی رہتی تو اس کا صبر ضرور رنگ لاتا اور اس کی زندگی میں راحت اور آسانیاں پیدا ہوجاتیں مگر اس نے ایک سنگین قدم اٹھا کر اپنی زندگی کو تاریکیوں کے حوالے کردیا تھا۔ اپنی اس حرکت کے طفیل اس نے خود پر دوسری شادی کا دروازہ بھی بند کردیا تھا۔

غلط کار کو اس کی غلطی کی سزا ضرور ملتی ہے۔ یہی قانون فطرت ہے۔ زلیخا نے جو غلطی کی، وہ بھی اس کی سزا سے بچ نہیں سکی۔ اللہ سب کو سیدھی راہ دکھائے۔ آمین!

(تحریر: محمد بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دردِ مشترک

ملک صفدر حیات

آیندہ لمحے کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے اس تک کا علم کسی کو نہیں ہوتا، اس کے باوجود منصوبہ ساز مستقبل بعید کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ ایسے منصوبے جن میں سراسر ان کا مفاد پوشیدہ ہوتا ہے مگر ایک کہاوت ہے کہ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ تو ہوتا وہ ہے جو اس کی تقدیر میں نوشت کیا جاچکا ہوتا ہے۔ اسی تدبیر اور تقدیر کا شاخسانہ ..... وہ اپنی تدبیر میں الجھا ہوا تھا اور تقدیر ایک طرف کھڑی اس کی تدبیر پر خندہ زن تھی۔ ملک صاحب کی ڈائری سے انتخاب۔

پرانی دشمنیوں کے اختتام سے نئی دشمنی کے آغاز کی خوں ریز سچی کہانی

منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ دلوں میں ہیبت بٹھا دینے والا۔ احساس اور حواس کو دہشت کی مٹھی میں جکڑ کر کپکپی طاری کرنے والا۔ انسان جسے دیکھتے ہی خوف میں مبتلا ہوجائے اور نگاہ چرا کر کہیں اور تکنے لگے، بے ساختہ اُس کے دل سے نکلے۔

''اللہ کسی دشمن کو بھی ایسا منظر نہ دکھائے .....!''

میں کسی کا دشمن نہیں تھا، اس کے باوجود بھی وہ دل ہلا دینے والا منظر دیکھنے پر مجبور تھا کیونکہ فرائض کی راہ میں اپنی کمزوریوں کو کھڑا کرنے سے کام بنتا نہیں بلکہ بگڑ جاتا ہے اور میں نے اپنے کام کو بگاڑنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اسی لیے میں نے چودھری ظہیر کے عبرتناک اثر انجام سے.... ....نظر چرائی اور نہ ہی میرے وجود پر کپکپاہٹ طاری ہوئی۔ میں موقع پر موجود رہا اور قانونی کارروائی میں مصروف۔

اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع پاتے ہی میں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کسی سفاک نے بڑی بے رحمی سے چودھری ظہیر کو قتل کردیا ہے۔ اس ''بے رحمی'' کی تفصیل بڑی لرزہ خیز تھی۔ کسی شقی القلب نے چودھری کے جسم کو دو حصوں میں اس طرح کاٹ ڈالا تھا کہ ناف کے اُوپر کا حصہ ایک طرف اور ناف سے نیچے کا حصہ دوسری جانب پڑا تھا اور یہ دونوں کٹے ہوئے حصے ایک ہی پلنگ پر تھوڑے فاصلے سے رکھے نظر آرہے تھے۔

قتل کی یہ لرزہ خیز واردات چودھری کے ڈیرے پر پیش آئی تھی جو حویلی سے تھوڑی دور لہلہاتے سرسبز کھیتوں کے درمیان واقع تھا۔ کٹی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہوجاتا تھا کہ قاتل اپنے دل میں چودھری ظہیر کے لیے بے اندازہ نفرت رکھتا تھا۔ یہ اس کی نفرت اور ناپسندیدگی کا عالم تھا کہ اس نے انتقام کے لیے بڑا خوفناک راستہ چنا تھا۔

جیسا کہ میں نے اُوپر بتایا، مذکورہ ڈیرا حویلی سے کچھ فاصلے پر کھیتوں میں واقع تھا جہاں چودھری کا ایک خاص بندہ جھوری رہتا تھا۔ ڈیرے کے انتظام و انصرام کو یہ جھوری نامی بندہ ہی دیکھتا تھا۔ اُس نے اپنی مدد کے لیے دو افراد رکھے ہوئے تھے جو کبھی تو ڈیرے پر رُک جاتے اور کبھی اپنے گھر چلے جاتے تھے لیکن جھوری کا قیام اُسی ڈیرے پر تھا۔ کبھی کبھار چودھری ظہیر بھی رات گزارنے کے لیے ڈیرے پر چلا آتا اور..... وہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی جب چودھری کو اُسی ڈیرے پر بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا تھا۔

میں نے موقع پر جمع ہوجانے والے افراد کو اُس کمرے سے باہر نکال دیا جہاں ایک رنگیلے پلنگ پر چودھری کی منقسم لاش پائی گئی تھی۔ جب میں اور حوالدار صوبے خان کمرے میں اکیلے رہ گئے تو میں لاش کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے وہاں موجود پلنگ کے لیے ''رنگیلے'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُس کے دو معنی ہیں۔ ایک عمومی اور دوسرے خصوصی۔ عمومی معنی تو وہی ہیں جو عموماً گاؤں دیہات میں استعمال ہوتے ہیں یعنی جس پلنگ کے دست و بازو اور پائے خوبصورت تراش خراش کے علاوہ رنگ دار بھی ہوں اُسے رانگلا یا رنگیلا پلنگ کہا جاتا ہے۔ مذکورہ پلنگ ایسا ہی تھا۔ اُس پلنگ کے ''رنگیلا'' ہونے کے خصوصی معنی کچھ اور ہیں جو بعد میں زیر بحث لائے جائیں گے۔

میں نے اُس ذومعنی پلنگ کا بغور معائنہ کیا اور ایک چونکا دینے والے نتیجے پر پہنچ گیا اور وہ نتیجہ یہ تھا..... چودھری ظہیر کو اُس پلنگ پر قتل نہیں کیا گیا تھا۔ اُس کا قتل کہیں اور ہوا تھا اور بعد میں لاکر اُسے اُس پلنگ پر ڈال دیا گیا تھا۔

چودھری ظہیر کو جس انداز میں کاٹ کر دو برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اُس طریقۂ قتل میں بے تحاشا خون بہنا چاہیے تھا جو اُس پلنگ اور پلنگ پر موجود بستر کے اُوپر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پلنگ اور اُس پر بچھا ہوا بستر جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدرخون آلود تھا اُس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، چودھری ظہیر کو کسی اور مقام پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ازاں بعد اس کی لاش کو اس پلنگ پر پھینک دیا گیا تھا۔ پلنگ کے نیچے فرش پر خون موجود نہیں تھا۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں نے اس کے دونوں حصوں کو چادر سے ڈھانک دیا اور حوالدار صوبے خان کے ساتھ مل کر جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں موقع کی ضروری کارروائی سے فارغ ہوگیا۔

جن درجن بھر افراد کو میں نے کمرے سے باہر روک رکھا تھا ان میں چودھری ظہیر کا چھوٹا بھائی چودھری تنویر بھی شامل تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا اور وہاں موجود لوگوں سے اس واقعے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا۔ تنویر ان میں پیش پیش تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی کا انٹرویو کرڈالا۔

چودھری تنویر کی عمر پچیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور وجیہ شخص تھا۔ بڑے بھائی کی المناک موت پر وہ شدید غم و غصے کا شکار تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں اس واردات کا ذمے دار کون ہوسکتا ہے؟''

وہ نفرت آمیز انداز میں بولا۔ ''جناب! میرا دھیان تو بار بار ملک خدا بخش کی طرف جارہا ہے۔''

''ملک خدا بخش.....!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون شخص ہے؟''

چودھری تنویر نے بتایا۔ ''ملک خدا بخش موضع کرماں والی کا رہنے والا ہے جو ہمارے گاؤں کے شمال میں واقع ہے۔ ہماری اور خدا بخش کی زمینیں ایک مقام پر آپس میں مل جاتی ہیں اور کافی عرصے سے ہمارے درمیان سرحدی زمین کا تنازعہ چل رہا ہے۔ چھوٹی موٹی منہ ماری اور جھڑپیں تو اکثر و بیشتر ہوتی رہتی ہیں لیکن میں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ خدا بخش اتنا سنگین قدم اُٹھا بیٹھے گا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دراصل ملک خدا بخش نے ہماری پانچ ایکڑ سرحدی زمین پر ناجائز قبضہ کررکھا ہے۔ یہ تو چوری اور سینہ زوری والی بات ہوگئی۔ تھانے دار صاحب! بھائی جی کے قاتل کو کوئی چھوٹ نہیں ملنا چاہیے۔ ملک خدا بخش کو عبرتناک سزا دلوانے کے لیے جتنی بھی رقم خرچ ہو، میں تیار ہوں۔ آپ قانونی کارروائی کا آغاز کریں۔''

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''چودھری تنویر! تم تو ملک خدا بخش کو اس وثوق سے قصوروار ٹھہرا رہے ہو جیسے تم نے اپنی آنکھوں سے قتل کی یہ واردات دیکھی ہو۔''

''جناب! میں محسوس کررہا ہوں، آپ کو میری بات بہت بری لگی ہے۔''

''نہیں تو.....'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم نے ایسا کیوں سوچا؟''

''وہ جی.....!'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ بھی ملک ہیں نا اور خدا بخش.....!''

''یہ کیا بے وقوفی کی بات کررہے ہو چودھری تنویر!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں یہاں پر تمہارے بھائی کے قتل کی تفتیش کرنے آیا ہوں یا ذات برادری کی تعلق داریاں نبھانے؟ تمہارا کیا خیال ہے، اگر میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں تو میں نے یہاں بسنے والے ملکوں کو ہر قسم کے جرائم کی چھوٹ دے رکھی ہوگی؟''

لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ٹھوس لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''چودھری تنویر! میں قانون کا پاسدار ہوں اور میری نگاہ میں سب برابر ہیں۔ جو شخص بھی جرم کا ارتکاب کرے گا، قانون کی گرفت میں ضرور آئے گا اور اپنے قصور کی قرار واقعی سزا بھی پائے گا..... چاہے وہ کوئی ملک ہو یا راجپوت، مہر ہو یا گوندل، وڑائچ ہو یا خان، کھرل ہو یا اعوان.....! میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ گیا۔'' اس نے ندامت آمیز انداز میں گردن ہلائی۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا ملک صاحب!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ تم نے اتنے وثوق سے ملک خدا بخش کو قصوروار کیوں ٹھہرایا ہے؟''

''جناب! آپ نے پوچھا تھا کہ مجھے کس پر شک ہے تو میں نے اپنے شک کا اظہار کردیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''اور تو ہمارا ایسا کوئی دُشمن نہیں جس کی طرف دھیان جائے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم نے جس پانچ ایکڑ سرحدی زمین پر ملک خدا بخش کے ناجائز قبضے کی بات کی ہے اس کے علاوہ بھی کوئی ایسی بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ملک خدا بخش پر شک کیا جاسکے؟''

''جناب تھانے دار صاحب!'' وہ جذبات سے عاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں بولا۔ ''ہم زمینداروں کے لیے سب سے اہم چیز زمین ہی ہوتی ہے اور اس کی بنا پر ہم ہر خطرناک حد تک جاسکتے ہیں۔ ہم ملک خدا بخش سے اپنے پانچ ایکڑ نکلوا لیتے اگر اسے قانون کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔''

یہ اس نے ایک بالکل نئی اور عجیب بات کی تھی۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''قانون کا تعاون..... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''جناب! آپ اس علاقے میں نئے تعینات ہوئے ہیں اس لیے شاید آپ کو پرانے معاملات کا زیادہ علم نہیں ہے۔'' چودھری تنویر نے پُراسرار انداز میں کہنا شروع کیا۔

اس کی یہ بات تو بالکل دُرست تھی کہ میں اس علاقے میں کچھ عرصہ پہلے ہی تعینات ہوا تھا۔ میں کسی نئے انکشاف کے لیے پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ملک خدا بخش کی بہت اُوپر تک پہنچ ہے۔ تحصیل دار سے اس کے دوستانہ مراسم ہیں۔ تحصیل دار نواز گوندل کئی مرتبہ اس سے ملنے کرماں والی اس کی حویلی میں آچکا ہے اور اس علاقے کا پٹواری دوست محمد بھی پوری طرح ملک خدا بخش کی مٹھی میں ہے۔ خدا بخش نے کاغذی ہیر پھیر کے ذریعے، پٹواری کی مدد سے وہ پانچ ایکڑ زمین اپنی زمین کا حصہ بنالی ہے جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا ہے لیکن ہمارے نزدیک وہ ہماری زمین ہے جس پر ملک خدا بخش کا ناجائز قبضہ ہے۔''

''کیا آپ لوگوں کے پاس اس متنازعہ زمین کی ملکیت کا کوئی ٹھوس ثبوت ہے؟'' میں نے چودھری تنویر سے پوچھا۔

''ثبوت تو ہے جناب لیکن وہ کاغذات کچے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دراصل ہم نے وہ زمین ایک ہندو سے خریدی تھی۔ ہماری سستی سمجھ لیں کہ اس کے انتقال میں ہم نے دیر کردی۔ اگر کچے عدالتی کاغذات پر اسی وقت اس زمین کا انتقال ہوجاتا تو ہماری گرفت مضبوط ہوتی۔ آپ جانتے ہیں، پٹواریوں کو زمین کے ایک ایک سوت کی کیفیت سے آگاہی ہوتی ہے۔ پٹواری دوست محمد کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ متذکرہ بالا پانچ ایکڑ زمین کی قانونی حیثیت اتنی کمزور ہے کہ کوئی بھی طاقتور بڑی آسانی سے اسے ہڑپ کرسکتا ہے۔ دوست محمد چونکہ ملک خدا بخش کے ہاتھوں کا کھلونا ہے اس لیے اس نے دستاویزی ہیر پھیر کے ذریعے ان پانچ ایکڑ کو خدا بخش کی ملکیت بنا دیا ہے۔''

چودھری تنویر نے اس تنازع کی جو صورتِ حال بیان کی تھی اس کی رُو سے اس بات کے امکانات پر تو غور کیا جاسکتا تھا کہ زمین کے اس ٹکڑے کے چھن جانے کے سبب چودھری ظہیر، چودھری خدا بخش کو کوئی نقصان یا ضرر پہنچانے کی کوشش کرتا لیکن اس بات کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا کہ ملک خدا بخش اُلٹا چودھری ظہیر ہی کو قتل کرڈالے۔ اس تناظر میں، میں نے چودھری تنویر سے کہا۔

''ٹھیک ہے، ملک خدا بخش نے پٹواری دوست محمد کی مدد سے اراضی کی دستاویزات میں جو گڑبڑ کرکے اسے اپنی ملکیت بنالیا ہے، میں اس کی تحقیقات کراؤں گا۔ تم اس واردات کے حوالے سے اگر اور کوئی اہم بات جانتے ہو تو مجھے بتاؤ؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں جو جانتا تھا..... اور جدھر میرا شک جاسکتا تھا، میں نے آپ کو بتادیا۔''

''تم ملک خدا بخش کی فکر نہ کرو۔'' میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ ''اگر وہ کسی بھی سطح پر قتل کی اس واردات میں ملوث ہے تو میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔'' وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

''تمہارے بھائی کی لاش اس ڈیرے کے ایک کمرے میں پائی گئی ہے اس سے تو لگتا ہے، وہ پچھلی رات یہاں موجود تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ وہ وسیع و عریض، آرام دہ حویلی کو چھوڑ کر رات گزارنے یہاں کیوں آیا تھا؟''

اس وقت میں اور چودھری تنویر دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ ایک چارپائی پر ڈیرے کے صحن میں بیٹھے تھے۔ صوبے خان دیگر لوگوں سے پوچھ گچھ کررہا تھا۔ وہ اکتوبر کے آخری ایام تھے۔ خزاں کی رُخصتی ابھی پوری طرح نہیں ہوئی تھی تاہم فضا میں خنکی شامل ہوچکی تھی جو موسمِ سرما کی آمد کا خاموش اعلان بھی تھا۔ وہ صبح کا وقت تھا اور ہلکی دھوپ میں بیٹھنا خاصا خوشگوار محسوس ہورہا تھا۔ ہم دوسرے لوگوں سے اتنے فاصلے پر تھے کہ وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن نہیں سکتے تھے اس کے باوجود بھی چودھری تنویر نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے محتاط انداز سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی یہ محتاط نظر اس بات کی غماز تھی کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم بات مجھ تک پہنچانے والا تھا۔

''تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ بھائی جی کی بھابی جان کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں بنتی۔'' وہ انکشاف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انگیز لہجے میں بولا۔ ''جب کسی رات بہت زیادہ نوک جھوک ہوجائے تو بھائی جی رات گزارنے اس ڈیرے پر آجایا کرتے تھے اسی لیے انہوں نے ڈیرے کے ایک کمرے کو اپنے لیے سیٹ کررکھا تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا جس کمرے میں بھائی جی کی لاش پڑی ہے وہ کسی ڈیرے کا نہیں بلکہ کسی حویلی کا کمرا نظر آتا ہے۔''

چودھری تنویر بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے بڑی تفصیل سے مذکورہ کمرے کا معائنہ کیا تھا۔ وہ واقعی ایک آرام دہ اور پُرسکون کمرا تھا۔ میں نے چھوٹے چودھری سے پوچھ لیا۔

''کیا تم نے کبھی یہ جاننے کی ضرورت محسوس کی کہ تمہارے بھائی اور بھابی میں کیوں نہیں بنتی تھی؟''

چودھری تنویر نے ایک اہم سرا مجھے پکڑا دیا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ اگر میں اس سرے کو تھام کر قدم قدم آگے بڑھتا رہا تو جلد یا بدیر اپنی منزل پر پہنچ ہی جاؤں گا۔ دوسرے سرے پر کامیابی کسی نہ کسی صورت میری منتظر ہوگی۔

چھوٹے چودھری نے جواب دیا۔ ''نہیں..... وہ اس لیے کہ ان کے درمیان پائی جانے والی اَن بن کی وجہ بڑی واضح ہے۔''

''اچھا.....!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور وہ وجہ کیا ہے؟''

''دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔'' چودھری تنویر نے بتایا۔ ''اور بھائی جی کو یہ شادی مجبوراً کرنا پڑی تھی، صرف ابا جی کی آخری خواہش کی وجہ سے..... اسی لیے بھائی جی اور بھابی جان میں ذہنی اور دلی ہم آہنگی نہیں رہی۔''

چودھری تنویر کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں کررہا تھا۔ اگر دیانت داری سے تجزیہ کیا جائے تو دنیا میں ننانوے فیصد میاں بیوی ایسے ملیں گے جن میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ خود کو دُرست اور دوسرے کو غلط سمجھتے رہتے ہیں۔ سمجھتے رہنے کی حد تک تو پھر بھی ٹھیک ہے لیکن جب وہ اپنے ''سمجھنے'' کو ثابت کرنے کے لیے سرتوڑ کوششیں بھی کرنے لگتے ہیں تو پھر بڑی خرابی نمودار ہوتی ہے اور اکثر اوقات یہ خرابی ان کے رشتے کے لیے زہر ہلاہل ثابت ہوتی ہے۔

چودھری تنویر نے اگرچہ ایک عمومی بات کی تھی لیکن خصوصی موقع پر کی جانے والی اس عمومی بات نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا لہٰذا میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''یہ تمہارے بھائی جی کی مجبوری اور ابا جی کی آخری خواہش کا کیا قصہ ہے چودھری تنویر؟''

وہ چند لمحات تک خاموش نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے گاؤں موضع جنڈیالہ سے آٹھ میل مشرق میں ''مکھن پور'' نامی ایک گاؤں واقع ہے۔ وہاں کے چودھری خاور حیات اور ہمارے ابا جی چودھری خلیل میں مختلف وجوہ کی بنا پر سالہا سال سے دُشمنی چلی آرہی تھی.....''

''ایک منٹ!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے چودھری تنویر کو مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''میں تمہاری کہانی تسلی سے بیٹھ کر سنتا ہوں پہلے ایک نہایت ہی ضروری کام کرلوں۔''

وہ خاموش اور سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

چودھری تنویر کے انداز سے مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ کوئی طول طویل داستان کا آغاز کرنے والا ہے۔ ایسی کوئی بھی کہانی سماعت کرنے سے پہلے مجھے چودھری ظہیر کی لاش کے حوالے سے کارروائی کو مکمل کرنا تھا۔ جائے وقوعہ کے تفصیلی معائنے کے بعد مشیر نامہ تیار کیا جاچکا تھا۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اُٹھانے کا کوئی رواج تھا اور نہ ہی عدالت اسے کوئی اہمیت دیتی تھی۔ تحقیق اور تفتیش کا طریقہ کار نہایت ہی سادہ لیکن پرکار ہوا کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ چودھری ظہیر کی لاش کو جلد از جلد پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوادوں تاکہ اس کیس پر ایک خاص زاویے سے روشنی پڑ سکے۔

چودھری تنویر کو میرے عزائم کی خبر ہوئی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! بھائی جی کا جو حشر ہوا ہے اس کے بعد مزید کسی چیر پھاڑ کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔''

وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں چودھری ظہیر کی لاش کو اسپتال بھجواؤں۔ اس کی خواہش اپنی جگہ ایک جذباتی اہمیت کی حامل تھی لیکن میں بھی اپنے فرائض سے مجبور تھا لہٰذا سمجھانے والے انداز میں، میں نے اس سے کہا۔

''چودھری تنویر! میں ضرورت محسوس کررہا ہوں تو تمہارے بھائی جی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا رہا ہوں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ چودھری ظہیر کے قاتل تک پہنچانے میں بڑی معاون ثابت ہوگی۔''

پھر میں نے موقع کی کارروائی کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے حوالدار صوبے خان کی نگرانی میں چودھری ظہیر کی وحشت پرور لاش کو سرکاری اسپتال بھجوا دیا تاکہ اس کا پوسٹ مارٹم ہوسکے، اس کے بعد میں دوبارہ چودھری تنویر کو لے کر بیٹھ گیا اور کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں..... تو تم بتا رہے تھے، تمہارے ابا جی خلیل چودھری اور موضع لکھن پور کے چودھری خاور حیات کے درمیان مختلف وجوہات کی بنا پر سالہا سال سے دُشمنی چلی آ رہی تھی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بتانے لگا۔ ''اس دُشمنی میں دونوں پارٹیوں نے اکثر مواقع پر ایک دوسرے کو نقصان بھی پہنچایا تھا پھر دو سال پہلے یہ دُشمنی جڑ سے ختم ہوگئی..... یعنی دوستی اور رشتے داری میں بدل گئی۔''

''یہ تو تم بالکل انہونی بات کہہ رہے ہو چودھری تنویر!'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اتنی دیرینہ دُشمنی پلک جھپکتے میں، دوستی اور رشتے داری میں کیسے بدل گئی۔ ایسا کون سا معجزہ رونما ہوگیا تھا؟''

''اس معجزے کا نام ہے چودھری خاور حیات کی ''بیماری''.....! چودھری تنویر نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لگ بھگ دو سال پہلے ہمارا دیرینہ دُشمن چودھری خاور حیات شدید بیمار پڑا۔ ہر حکیم، ڈاکٹر اور سیانے نے اپنا اپنا علم اور ہنر آزما ڈالا لیکن اس کی صحت سنبھلنے میں نہ آئی۔ وہ روز بروز کمزور سے کمزور ہوتا چلا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آنے لگا۔ انہی دنوں چودھری خاور حیات نے ابا جی کے لیے ایک پیغام بھجوایا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا..... ہم دونوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دُشمنی میں، ایک دوسرے کی کاٹ میں گزار دیا جس کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا..... نہ تمہیں اور نہ ہی مجھے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اب زیادہ دن جی نہ سکوں گا۔ تم بھی کوئی روزِ قیامت تک زندہ رہنے والے نہیں ہو۔ ایک نہ ایک دن تمہیں بھی خاک میں اُترنا ہے۔ اگر ہم دونوں حالتِ دُشمنی میں اس دنیا سے رُخصت ہوگئے تو یہ مت سمجھنا کہ ہماری یہ دُشمنی بھی ہمارے ساتھ مرجائے گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ ہلاکت خیز رشتے داری ہماری آیندہ نسل یعنی ہماری اولاد میں منتقل ہوجائے گی۔ ہماری فنا کے بعد چودھری ظہیر اور چودھری سکندر حیات اس کھاتے کو آگے چلائیں گے جو بہت ہی بھیانک اور خونریز ہوگا۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟ نہیں نا! میں بھی ایسا نہیں چاہتا تھا اس لیے ابتدا میری طرف سے ہو رہی ہے۔ میں تو کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا ورنہ اس پیغام کے بجائے میں خود موضع جنڈیالہ تمہارے پاس آتا۔ بیماری نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے لہٰذا اس پیغام کے ذریعے میں تمہیں اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ہم کوئی ایسی راہ نکالیں گے جو ہماری آیندہ نسل کی سلامتی کی ضامن ہو۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا چودھری خلیل..... اگرچہ یہ سانسیں اب گنتی کی باقی ہیں.....''

چودھری تنویر لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اُمید نہیں تھی کہ ابا جی چودھری خاور حیات کے بلانے پر لکھن پور چلے جائیں گے کیونکہ خاور حیات سے ایسی دُشمنی چل رہی تھی کہ وہ اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے لیکن اس وقت ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب انہوں نے چودھری خاور حیات سے ملنے کے لیے جانے کا اعلان کردیا۔ ظاہر ہے ہم انہیں جانے سے نہیں روک سکتے تھے.....!'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا اور تھکی تھکی آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ابا جی واپس آئے اور اپنے ساتھ یہ خبر بھی لائے کہ دو ماہ کے اندر اندر بھائی جی کی شادی چودھری خاور حیات کی اکلوتی بیٹی فاخرہ سے ہو رہی ہے۔ کہاں تو ازلی اور جانی دُشمنی چل رہی تھی۔ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے لہو کی پیاسی تھیں اور کہاں ایسا جوڑ لگایا جا رہا تھا کہ دو خاندان مل کر ایک خاندان بننے جا رہے تھے۔ چودھری خاور حیات کی صرف دو ہی اولادیں ہیں۔ بیٹا سکندر حیات اور بیٹی فاخرہ۔ ابا جی نے بتایا کہ چودھری خاور نے پہلے اپنی بیٹی اور بیٹے کو اس دُشمنی کے خاتمے کے لیے آمادہ کیا تھا اس کے بعد انہیں اپنے پاس آنے کا پیغام بھیجا تھا۔ ابا جی نے جس انداز میں بھائی جی کی شادی کا اعلان کیا تھا اس کا واضح مطلب یہی تھا، انہوں نے چودھری خاور کی تجویز سے مکمل اتفاق کرنے کے بعد ہی واپسی کا رُخ کیا تھا۔ ہم دونوں بھائی ابا جی کے خلاف نہیں جاسکتے تھے لہٰذا دو سال پہلے بھائی جی (مقتول) اور بھابی جان فاخرہ کی شادی ہوگئی۔ اس شادی کے چند روز بعد ہی ابا جی کا انتقال ہوگیا۔ اسی ماہ چند دن کے وقفے سے چودھری خاور حیات بھی چل بسا۔''

بات کے اختتام پر چودھری تنویر کی آواز اچھی خاصی بھرا گئی تھی۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''اگر دیکھا جائے تو مرحوم چودھری خاور حیات نے اپنی موت سے قبل ایک بہت بڑا نیک کام کر ڈالا تھا اور تمہارے ابا جی مرحوم و مغفور نے چودھری خاور کی بات مان کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں چودھری تنویر!''

''جی..... میں سمجھ سکتا ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جس طرح مرحوم چودھری خاور حیات کی اولاد نے اس کی خواہش کو مقدم جانا، بالکل اسی طرح ہم بہن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھائیوں نے بھی ابا جی کی خواہش کی لاج رکھی ہے۔ بھائی جی نے اگرچہ ابا جی کی خوشی کی خاطر ہی سمجھ لیں، مجبوری میں یہ شادی کی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ بڑی خوش اسلوبی سے نباہ رہے تھے۔ دونوں خاندانوں میں پھر کوئی اختلاف دیکھنے میں نہیں آیا۔''

اس کا لہجہ غم سے معمور تھا۔ ظاہر ہے، وہ اپنے بڑے بھائی کی المناک موت پر بے حد افسردہ اور شکستہ دل ہو چکا تھا۔ میں چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات لیتا رہا پھر اپنے ذہن میں چبھنے والے ایک زاویے کی وضاحت کے لیے اس سے پوچھ لیا۔

''چودھری تنویر! تم نے دو تین مرتبہ اپنے مقتول بھائی کے حوالے سے کہا ہے کہ اس نے فاخرہ سے بحالتِ مجبوری شادی کی تھی۔ پھر تم نے یہ بھی بتایا کہ تمہارے والد صاحب کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے مقتول چودھری ظہیر اس شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مقتول، فاخرہ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیا اس میں کوئی خرابی یا عیب تھا؟''

''یہ بات نہیں ہے جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل بھائی جی نے بلقیس بھابی کے انتقال کے بعد شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر انہیں ابا جی کی خوشی کے لیے یہ سب کرنا پڑا..... شاید اسی لیے دو سال گزر جانے کے باوجود بھی میاں بیوی میں وہ محبت اور قربت پیدا نہیں ہو سکی جو لازمی تھی، پھر ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ بھائی جی اور بھابی جان کے مزاج میں بھی بہت فرق ہے..... میرا مطلب ہے، تھا۔ اب تو بھائی جی.....!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر زخمی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے نامکمل جملے کی تکمیل کے لیے کسی اسپیشل قسم کی عقل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بخوبی سمجھ گیا کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتا تھا جو اس نے نہیں کہا تھا یا کہہ نہیں پایا تھا۔ میں نے اس حوالے سے اس سے کوئی سوال کرنا ضروری نہ سمجھا کیونکہ میرا ذہن تو اس کے ابتدائی جملے ہی سے چپک کر رہ گیا تھا۔

''چودھری تنویر!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا فاخرہ مقتول کی دوسری بیوی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ''جی ہاں، کئی سال پہلے بھائی جی کی شادی بلقیس سے ہوئی تھی پھر چند سال کے بعد بلقیس بھابی کا انتقال ہو گیا اور بھائی جی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کبھی شادی نہیں کریں گے۔ بیچ میں تین سال وہ ایسے ہی رہے پھر ابا جی چودھری خاور کے بلانے پر مکھن پور گئے اور وہاں سے بھائی جی کی شادی کا پروگرام لے کر آ گئے چنانچہ بھائی جی کی فاخرہ کے ساتھ دوسری شادی ہو گئی..... اب سے کوئی دو سال پہلے۔''

''ہوں.....!'' میں اثباتی انداز میں سر کو حرکت دیتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا اور خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''..... مقتول ظہیر کو محض اپنے باپ کی خواہش کی خاطر فاخرہ سے شادی کرنا پڑی تھی ورنہ اپنی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد وہ زندگی بھر شادی نہ کرنے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا..... اور شادی کے بعد پتا چلا کہ دونوں کے مزاج میں بھی بڑا فرق ہے لہٰذا ان کے درمیان اچھی طرح بن نہ سکی۔ جب کبھی میاں بیوی میں نوک جھوک شدت اختیار کر لیتی تو مقتول وہ رات حویلی سے باہر اپنے ڈیرے پر گزارتا تھا جیسا کہ..... گزشتہ رات وہ حویلی کے بجائے اس ڈیرے پر موجود تھا..... ہیں نا؟''

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''مقتول کی دوسری بیوی سے کتنی اولادیں ہیں؟''

''ایک بھی نہیں۔'' چودھری تنویر نے جواب دیا۔

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر پوچھا۔ ''اور بلقیس کے بطن سے مقتول کے کتنے بچے پیدا ہوئے تھے؟''

''اس سے بھی بھائی جی کی کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔'' چودھری تنویر نے بتایا۔

''یہ بڑا عجیب..... بلکہ سنگین اتفاق نہیں ہے؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''جی ہے تو..... مگر یہی حقیقت ہے۔'' اس کی افسردگی میں اضافہ ہو گیا۔ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

''دراصل بات یہ ہے جناب..... کہ بلقیس بھابی سے کوئی آٹھ سال بھائی جی کی شادی رہی تھی اور اس دوران میں وہ تین مرتبہ اُمید سے بھی ہوئیں لیکن ہر بار ان کا ابارشن ہو گیا۔''

''ابارشن نہیں..... ابارشن!'' میں چونکہ سمجھ گیا تھا، چودھری تنویر کیا کہنا چاہ رہا تھا لہٰذا فوراً ہی صحیح کر دی۔

''جی جی، وہی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور آخری ابارشن..... میرا مطلب ہے، ابارشن میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھابی بلقیس زندگی ہار گئیں۔ بھائی جی کو بلقیس بھابی سے بہت محبت تھی اسی لیے انہوں نے ساری زندگی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا.....!''

اب صورتِ حال بڑی حد تک واضح ہوگئی تھی۔ مقتول چودھری ظہیر اور اس کی بیوہ فاخرہ کے درمیان اَن بن کی بنیادی وجوہ دو ہی تھیں۔ نمبر ایک، مقتول ایک ایسی بیوی کی موت کا صدمہ اُٹھائے بیٹھا تھا جس سے وہ شدید محبت کرتا تھا۔ نمبر دو، اس کے نہ چاہنے کے باوجود بھی فاخرہ سے اس کی دوسری شادی کردی گئی تھی لہٰذا وہ فاخرہ کو وہ محبت اور توجہ نہیں دے پایا ہوگا جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے چنانچہ اس حق تلفی پر فاخرہ کو اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہوگی۔ یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ فاخرہ نے بھی اپنے باپ چودھری خاور حیات کی آخری خواہش کے آگے مجبور ہوکر مقتول سے شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی ہوگی۔ اس صورت میں تو فاخرہ کو اس کے استحقاق سے کہیں بڑھ کر محبت اور توجہ ملنا چاہیے تھی اور بجائے اس کے، اسے اس کا کوٹا بھی نہیں مل سکا تھا۔ ان حالات میں نوک جھوک اور ناچاقی تو لازم ہوکر رہ جاتی ہے۔ مقتول جب بھی فاخرہ کے قریب جاتا ہوگا، اسے اپنی پہلی بیوی کی یاد آجاتی ہوگی اور فاخرہ جب مقتول کے قریب ہوتی ہوگی تو اسے اپنا شوہر بیگانہ بیگانہ سا محسوس ہوتا ہوگا۔

اس زاویے کے حوالے سے میرا ذہن صاف ہوگیا تو میں نے اپنی تمام تر توجہ مقتول کو پیش آنے والے واقعے کی طرف مبذول کردی۔ میں نے چودھری تنویر سے پوچھا۔

''یہ ڈیرا جھوری نامی کسی شخص کے تصرف میں رہتا ہے اور اس کی مدد کے لیے بھی یہاں دو افراد موجود ہوتے ہیں۔ میں ذرا ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے قاتل تک پہنچنے کے لیے کوئی سراغ وغیرہ ہاتھ لگ جائے۔ یہ تینوں افراد کہاں ملیں گے؟''

چودھری تنویر نے بتایا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، منظور عرف جھوری کو بھائی جی نے اپنے کسی ضروری کام کے لیے لنگر وال بھیجا ہوا ہے۔ وہ موضع لنگر وال سے آج شام تک واپس آئے گا۔ اُدھر ''لنگر وال'' میں ہماری اکلوتی بہن آمنہ رہتی ہے۔ میں نہیں جانتا بھائی جی نے جھوری کو لنگر وال کیوں بھیجا تھا۔ ممکن ہے آمنہ کے لیے کچھ بھجوایا ہو۔''

''اور وہ دونوں افراد کہاں ہیں جو جھوری کی مدد کرتے ہیں؟''

''ان کے نام مشتاق اور حیدر ہیں ملک صاحب!''

چودھری تنویر نے بتایا۔ ''آپ کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے تو وہ دونوں یہاں موجود تھے، اب کہیں دکھائی نہیں دے رہے..... ٹھہریں، میں انہیں بلواتا ہوں۔ لگتا ہے وہ گاؤں کی طرف نکل گئے ہیں۔''

''اگر وہ جنڈیالہ کی طرف نکلے ہیں تو انہیں اُدھر نکلا ہی رہنے دو۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی اُدھر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تمہاری بھابی اور مقتول کی بیوی فاخرہ سے بھی مجھے چار باتیں کرنا ہیں۔ وہ بے چاری بڑی غمزدہ ہوگی، اسی بہانے اس کا دل ہلکا ہوجائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' چودھری تنویر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''یہاں ڈیرے پر آپ کا اور کام باقی ہے یا ہم حویلی کی طرف چلیں؟''

''موقع کی کارروائی تو مکمل ہوچکی۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں گاؤں کی طرف ہی چلنا چاہیے۔''

یہ سچ ہے کہ میں نے اس ڈیرے کا تفصیلی معائنہ کرلیا تھا، خاص طور پر میں نے اس کمرے کا بڑا تنقیدی جائزہ لیا تھا جہاں ایک رنگیلے پلنگ پر چودھری ظہیر کی دوشخت لاش پڑی ملی تھی۔ وہ ڈیرا بھی عام ڈیروں ہی کی طرح کا تھا جس کے ایک سرے پر تین مختلف سائز کے کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے دو کمرے ڈیرے کی شمالی دیوار کے ساتھ اور تیسرا انہی سے ملا ہوا مغربی دیوار کے ساتھ واقع تھا۔ دراصل، یہ تینوں کمرے اس صورت آپس میں جڑے ہوئے تھے کہ انگریزی کا حرف ''ایل'' بن رہا تھا۔ شمالی دیوار والا پہلا کمرا لمبوترا سا تھا جس میں ناکارہ و کارآمد زرعی آلات کے علاوہ جانوروں کے چارے کا معقول ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے بعد وہ کمرا تھا جو مقتول کے لیے مخصوص تھا۔ مذکورہ کمرا دیگر دو کمروں کے درمیان شمالی اور مغربی دیوار کے ساتھ واقع تھا۔ اس کے بعد مغربی دیوار والا کمرا مربع شکل کا تھا اور یہ کمرا جھوری کے استعمال میں رہتا تھا۔ ان تینوں کمروں میں دیوار والی سائیڈ میں ایک ایک کھڑکی بھی موجود تھی لیکن مقتول والا کمرا اس حوالے سے باقی دو کمروں سے مختلف تھا کہ اس میں دو دروازے تھے۔ دوسرا دروازہ شمالی دیوار کے کونے میں واقع تھا جو باہر جانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا تاہم جب میں جائے وقوعہ پر پہنچا تو وہ دروازہ بند تھا اور اندر سے اس کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ ان تینوں کمروں کے سامنے ایل شیپ برآمدہ بھی تھا۔ ڈیرے کا باقی حصہ صحن کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صورت کھلا تھا جس میں مختلف سایہ دار درخت استادہ تھے اور مغربی دیوار کے ایک حصے میں تین چار جانور بھی بندھے دکھائی دیتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد، میں چودھری تنویر کے ساتھ اس کی حویلی پہنچ گیا۔

حوالدار صوبے خان نے موقع پر موجود افراد سے خاصی تفصیلی پوچھ گچھ کی تھی اور اسپتال روانہ ہونے سے قبل اس نے مجھے اپنی کارکردگی کی رپورٹ بھی دے دی تھی جس کے مطابق وہ لوگ چودھری ظہیر کے قتل یا قاتل کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں جانتے تھے۔ مجھے اُمید تھی بیوہ فاخرہ، جھوری، مشتاق یا حیدر میں سے ضرور کوئی اس معاملے پر روشنی ڈال سکے گا۔ چودھری تنویر نے تو اپنا شک ملک خدا بخش آف کرماں والی پر ظاہر کیا تھا۔ میں نے اسی لمحے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ملک خدا بخش کو بھی ضرور چیک کروں گا اگرچہ مجھے اس کے مجرم ہونے کے امکانات دکھائی نہیں دیتے تھے۔ چودھری تنویر کے مطابق ملک خدا بخش نے ان کی پانچ ایکڑ اراضی پر ناجائز قبضہ کررکھا تھا۔ غاصب اور قابض شخص کی نظر زمین و جائداد پر ہوتی ہے۔ وہ عموماً خون خرابے والے معاملے میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا۔

چودھری تنویر نے مجھے حویلی کی بجی سجائی بیٹھک میں بٹھایا اور خود یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ''میں بھابی جان کو آپ کی آمد کی اطلاع دے کر آتا ہوں۔''

میں اس بیٹھک کی سجاوٹ اور شان و شوکت کو دیکھتے ہوئے چودھری ظہیر کے قتل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے مقتول کے چہرے کو دیکھ کر چالیس اور بیالیس کے درمیان اس کی عمر کا اندازہ قائم کیا تھا۔ چودھری تنویر نے اپنی عمر پچیس سال بتائی تھی۔ ان کی اکلوتی بہن آمنہ درمیانی اولاد تھی۔ اس کی عمر اس وقت تیس کے قریب تھی۔ چھ سال قبل اس کی شادی لنگر وال کے فضل داد مہر سے ہوئی تھی۔ وہ اُدھر لنگر وال میں اپنے خاوند اور تین بچوں کے ساتھ راضی خوشی رہتی تھی۔ تنویر نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ چودھری ظہیر کے قتل کا علم ہوتے ہی اس اندوہناک واقعے کی اطلاع کے لیے موضع لنگر وال اور موضع ملکھن پور بندے دوڑا دیے گئے ہیں۔

چودھری کو جتنی سفاکی سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا وہ رونگٹے کھڑے کردینے والا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا، قاتل چودھری ظہیر سے شدید نفرت کرتا تھا۔ میں نے اس نکتے پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا کہ مقتول کو دو حصوں میں بانٹنے کے لیے قاتل نے کون سا آلۂ قتل استعمال کیا ہوگا۔

وہ کسی چھری، چاقو یا خنجر کا کام نظر نہیں آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آری کی مدد سے اس کو کاٹ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا گیا ہو۔ بالکل جیسے کوئی بڑھئی لکڑی کے موٹے شہتر کو کاٹتا ہے یا جیسے مخملۂ جنگلات والے بڑے گھیر والے درخت کے تنے کو کاٹ ڈالتے ہیں۔ وقوعہ کی صورتِ حال بتاتی تھی چودھری ظہیر کو کہیں اور قتل کرنے کے بعد لاکر ڈیرے پر پھینکا گیا تھا۔ واقعات کے مطابق مقتول وہ رات گزارنے ڈیرے پر آیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ پہلے چودھری ظہیر کو ڈیرے سے اغوا کرکے کہیں اور پہنچایا گیا تھا اور قتل کے بعد دوبارہ ڈیرے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ میرا ذہن یہ سوچنے سے باز نہ آیا کہ قتل کی یہ لرزہ خیز واردات کسی اکیلے شخص کا کام نہیں تھا..... اور اس نوعیت کا کام چودھری کا کوئی شدید دشمن ہی کرسکتا تھا۔

میں نہ جانے کتنی دیر انہی سوچوں میں گم رہا۔ چودھری تنویر کے اندر داخل ہونے پر میں خیالوں کی دنیا سے لوٹا تھا۔

''بھابی جان کی حالت تو بہت خراب ہے۔ بھائی جی کی موت نے ان پر بڑا گہرا اثر کیا ہے۔'' وہ غم میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بہرحال، میں نے انہیں بتادیا ہے کہ آپ ان سے تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اُمید ہے تھوڑی دیر میں وہ خود کو سنبھال لیں گی۔'' اس نے مجھے بتایا۔

''اور وہ دونوں کہاں ہیں جو اُدھر ڈیرے پر جھوری کی مدد کیا کرتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''مشتاق اور حیدر؟''

''میں نے پتا کرالیا ہے۔ وہ دونوں ادھر گاؤں ہی میں ہیں۔'' چودھری تنویر نے جواب دیا۔ ''میں نے انہیں یہاں بلانے کے لیے بندہ بھیج دیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ان دونوں میں حیدر زیادہ اہم ہے۔ اس سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں شاید کوئی کام کی بات سامنے آجائے۔''

میں نے چونک کر چودھری تنویر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''حیدر کی اہمیت کس حوالے سے ہے؟''

چودھری تنویر نے جواب دیا۔ ''بھائی جی کی لاش حیدر ہی نے دریافت کی ہے جناب!''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''ہاں، پھر تو واقعی وہ بہت اہم بندہ ہے۔''

جب تک حیدر اور مشتاق وہاں پہنچ نہیں گئے، میں چودھری تنویر سے باتیں کرتا رہا۔ میری کوشش تھی کہ کوئی ایسا سرا ہاتھ آجائے جو چودھری ظہیر کے قاتل تک میری رہنمائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر سکے۔ دیگر سوالات کے علاوہ میں نے چودھری تنویر سے پوچھ لیا۔

''تم نے بتایا ہے کہ تمہارے بھائی جی نے اپنی بیوی کی موت کے بعد زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھر جب چودھری خاور حیات مرحوم نے دیرینہ دشمنی ختم کرنے کے لیے اپنی بیٹی فاخرہ کے رشتے کا آئیڈیا تمہارے ابا جی مرحوم کو دیا تو تمہارے ابا جی کو تم نظر کیوں نہیں آئے۔ فاخرہ کی شادی تم سے بھی تو کرائی جا سکتی تھی؟''

''ایسا کرنا ابا جی نہیں چاہتے تھے۔'' چودھری تنویر نے جواب دیا۔ ''اور اس کی دو وجوہات تھیں۔''

''کون سی دو وجوہات؟'' اس کی بات مکمل ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔

ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد اس نے بتایا۔ ''پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک میری شادی ہو چکی تھی.....''

''اچھا.....!'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''کیا تم واقعی شادی شدہ ہو..... ایسے لگتے تو نہیں ہو؟''

اس نے بتایا۔ ''میری شادی بھائی جی کی دوسری شادی سے ایک سال پہلے ہو گئی تھی اور جب بھائی کی شادی کا معاملہ چلا تو اس وقت میں ایک بچے کا باپ بھی بن چکا تھا اور..... اب تو میرے تین بچے ہیں..... ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔''

''اچھا اچھا..... یہ تو بڑی ٹھوس وجہ بتائی ہے تم نے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور دوسری وجہ کون سی ہے؟''

چودھری تنویر نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بتایا۔ ''بھائی جی، بلقیس بھابی کے انتقال کے بعد بہت زیادہ خاموش اور دُکھی رہنے لگے تھے۔ ان کی یہ حالت ہم لوگوں سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ابا جی بھی اس بات پر بہت کڑھتے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ بھائی جی سے کہا کہ وہ دوسری شادی کر لیں لیکن انہوں نے ہمیشہ انکار ہی کیا۔ پھر جب فاخرہ بھابی والے معاملے میں ابا جی نے اپنی آخری خواہش کی شرط لگا دی تو بھائی جی کو ان کے سامنے ہتھیار پھینکنا ہی پڑے۔''

''ہوں.....!'' میں نے پُرمعنی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔ ''کیا تم بھی اپنی فیملی کے ساتھ اسی حویلی میں رہتے ہو؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ حیدر اور مشتاق وہاں پہنچ گئے۔

وہ دونوں عام اور واجبی سی شکل صورت کے مالک تھے۔ ان کے حلیے میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ جسے بیان کیا جا سکے۔ وہ دونوں گزشتہ شام جھوری کو ڈیرے پر چھوڑ کر گاؤں آ گئے تھے۔ اس وقت تک چودھری ظہیر ڈیرے پر نہیں پہنچا تھا۔ آج صبح حیدر اکیلا ہی ڈیرے کی طرف گیا تھا۔ مشتاق کا بچہ بیمار تھا اور اس نے حیدر کو بتا دیا تھا، وہ دوپہر کے بعد اس کے پاس پہنچے گا لیکن دوپہر سے پہلے ہی یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ کسی نے بڑے وحشیانہ انداز میں کاٹ کر چودھری ظہیر کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔

میں نے مشتاق سے چند سوالات کرنے کے بعد اسے فارغ کر دیا اور پوری طرح حیدر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تم لوگ جھوری کی کس طرح مدد کرتے ہو؟''

میں نے مشتاق کو فارغ کرتے ہی وہاں سے رُخصت کر دیا تھا اور اس وقت میرے علاوہ اس بیٹھک میں حیدر اور چودھری تنویر موجود تھے۔ حیدر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جناب! چودھری صاحب کی زمینیں بہت دور تک پھیلی ہوئیں ہیں جہاں ظاہر ہے ہر قسم کی کاشتکاری ہوتی ہے۔ جھوری کاشتکاری کی نگرانی کرتا ہے اور اسی سلسلے میں وہ ہمیں جو بھی حکم دیتا ہے، ہم دوڑ پڑتے ہیں مثلاً جا کر دیکھو..... فلاں کھیت تک پانی پہنچ گیا، فلاں کھیت میں جو مزدور فصل کی کٹائی کر رہے ہیں وہ اپنا کام دیانت داری سے کر رہے ہیں یا بیٹھے گپیں ہانک رہے ہیں..... وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہم ڈیرے پر موجود جانوروں کی دیکھ بھال بھی کرتے ہیں۔ ان میں بھی خاص طور پر بھینسوں کی کیونکہ انہی بھینسوں کا دودھ حویلی میں آتا ہے۔''

میں نے ڈیرے پر چار پانچ ہٹی کٹی بھینسیں کھڑی دیکھی تھیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور حیدر سے پوچھا۔ ''کیا ان بھینسوں کا دودھ بھی تمہی لوگ نکالتے ہو؟''

''جی ہاں.....!'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''صبح میں یا شام میں؟''

''شام میں.....!''

''کیا گزشتہ شام بھی تم لوگوں نے بھینسوں کا دودھ نکالا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی، نکالا تھا اور میں نے اکیلے یہ کام کیا تھا۔'' حیدر نے بتایا۔ ''مشتاق کے بچے کی کل صبح سے طبیعت ٹھیک نہیں اسی لیے آج مجھے اکیلے ہی ڈیرے پر جانا پڑا تھا۔ مشتاق کل دوپہر کے بعد ڈیرے سے گھر واپس آ گیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے حسبِ معمول باری باری بھینسوں کا دودھ نکالا پھر اس دودھ کو ڈرم میں ڈالا اور بیل گاڑی پر رکھ کر حویلی چلا آیا تھا۔''

''جب تم ڈیرے سے رُخصت ہوئے تو کیا جھوری وہاں موجود تھا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی ہاں، جھوری وہیں تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا جھوری نے تمہیں بتایا تھا کہ آج رات چودھری ظہیر اس ڈیرے پر آئے گا؟''

''نہیں جناب! اس نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''اپنے بارے میں کچھ بتایا ہو؟''

وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں تاڑ گیا کہ میرا سوال اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کے تذبذب کو رفع کرنے کے لیے فوری طور پر وضاحت کر دی۔

''میرا مطلب ہے کیا جھوری نے تمہیں بتایا تھا، وہ تم لوگوں کے آنے کے بعد موضع لنگر وال جائے گا؟''

''نہ جی..... اس نے یہ تو نہیں بتایا تھا۔'' حیدر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

میں نے سوالات کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کر دیا اور حیدر سے پوچھا۔ ''آج صبح جب تم معمول کے مطابق ڈیرے پر گئے تو تم نے وہاں کیا دیکھا؟''

حیدر نے جواب دینے سے پہلے چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا جیسے ذہن میں خیالات کو مجتمع کر رہا ہو پھر اس نے معتدل لہجے میں بتانا شروع کیا۔

''جناب! میں سیدھا ڈیرے پر پہنچا تو مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے وہاں کوئی موجود نہ ہو۔ ہر طرف ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ پہلے کبھی ایسی ویرانی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ عموماً جھوری مجھے ڈیرے کے صحن ہی میں نظر آ جاتا تھا یا پھر سامنے اپنے کمرے میں لیکن میں نے خلافِ معمول جھوری کے کمرے کا دروازہ بند دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی۔ حیرت اس بات پر بھی تھی کہ درمیانی کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا.....''

''درمیانی کمرے..... یعنی تم اس کمرے کی بات کر رہے ہو جو چودھری صاحب کے آرام کے لیے مخصوص ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے حیدر سے سوال کیا۔

''جی ہاں..... جی ہاں۔'' حیدر نے بڑی تیزی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''تم نے دیکھا کہ جھوری والے کمرے کا دروازہ بند تھا اور چودھری صاحب والے مخصوص کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر تمہیں شدید حیرت ہوئی..... تم نے اپنی حیرت سے مجبور ہو کر کیا کیا تھا؟''

''جناب! میں نے بے ساختہ جھوری کو آواز دی تھی تاکہ اس صورتِ حال کے بارے میں اس سے پوچھ سکوں۔'' حیدر نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔ ''لیکن جب میری پکار کا جواب نہ آیا تو مجھے اُلجھن نے گھیر لیا۔ میں نے قدرے بلند آواز میں جھوری کو پکارا۔ اس مرتبہ بھی مجھے جھوری کی آواز سنائی نہ دی۔ میں سمجھ گیا، وہ ڈیرے پر موجود نہیں۔ بے ساختہ میرے قدم اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔''

''یعنی تم بے اختیار چودھری صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''کمرے کے اندر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ میں اس کمرے کے اندر نہیں جایا کرتا تھا۔ از خود مجھے اور مشتاق کو چودھری صاحب کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں، وہ خود کسی کام سے بلوائیں تو دوسری بات ہے لیکن آج صبح ڈیرے پر جس صورتِ حال سے میرا پالا پڑا اس نے میرے ذہن سے نکال دیا کہ چودھری صاحب نے مجھے بلایا ہے یا نہیں۔ میں کھلے ہوئے دروازے پر پہنچا اور دروازے کی چوکھٹ کو تھام کر اندر جھانکا..... اگلے ہی لمحے مجھے پتا چل گیا، وہ دروازہ کھلا ہوا کیوں تھا؟''

حیدر نے ایک جھرجھری لی اور سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ''جناب! اندر پلنگ پر کسی انسان کے دو ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میرا تجسس کھینچ کر مجھے کمرے کے اندر لے گیا۔ میں چودھری صاحب والے پلنگ کے قریب پہنچا اور اسی وقت مجھے پتا چلا کہ وہ چودھری صاحب ہی کی لاش ہے۔''

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے وحشت عیاں تھی۔ یہ اس منظر کا اثر تھا جو آج صبح اس نے ڈیرے پر مقتول چودھری ظہیر کے کمرے میں دیکھا تھا۔ واقعی، وہ ایک ایسا ہی منظر تھا کہ جو یادداشت کو تلپٹ کر کے رکھ دے، ذہن اور دل کو خوف و ہراس میں جکڑ لے اور زبان کو تنگ کر کے رکھ دے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے حیدر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر تم اس ڈیرے سے واپس آ گئے تھے۔ ہیں نا؟''

''جی، تھانے دار صاحب!'' اس نے ایک مرتبہ پھر جھرجھری لی اور کہنے لگا۔ ''مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اچانک میرے پر اُگ آئے ہوں۔ پاؤں میں کسی تیز رفتار ٹرین کے پہیے لگ گئے ہوں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بھاگم بھاگ حویلی پہنچا اور یہاں آ کر چھوٹے چودھری صاحب کو سارا ماجرا سنا دیا۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے چودھری تنویر کی طرف دیکھا۔ چھوٹے چودھری سے حیدر کی مراد وہی تھا۔ چودھری تنویر نے کہا۔

''ملک صاحب! یہ ایک ایسی اطلاع تھی کہ سنتے ہی فرشتے چھوڑ گئے۔ پہلے تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا اور جب یقین آیا تو میں افراتفری کے عالم میں سیدھا ڈیرے پر پہنچا۔ پھر جب سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو میرا دل و دماغ اُلٹ کر رہ گیا۔ اتنا بڑا صدمہ آج سے پہلے میری زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ پہلے اماں جی اور کئی سال بعد ابا جی کی موت نے میرے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا اس سے زیادہ دُکھی میں پھر کبھی نہیں ہوں گا لیکن بھائی جی کی کٹی ہوئی لاش نے پچھلے تمام صدموں کا ریکارڈ توڑ دیا.....'' شدتِ جذبات اور غم کے بوجھ سے اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ شکستہ سے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! اس کے بعد..... میں نے اپنے ایک بندے کو آپ کی طرف دوڑایا اور ڈیرے پر رُک کر آپ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔''

میں نے حیدر سے دو چار مزید سوالات کیے اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اب اس آراستہ و پیراستہ بیٹھک میں، میں اور چودھری تنویر رہ گئے۔ چودھری کا چہرہ اُترا ہوا اور آنکھیں ویران تھیں۔ اس پر جو قیامت گزری تھی، میں اسے بخوبی سمجھ اور محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''چودھری تنویر! میں تمہارے دُکھ کو پوری طرح محسوس کر رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد تمہارے بھائی کے قاتل تک پہنچ کر دکھا دوں گا اور اسے ایسی عبرتناک سزا دلواؤں گا کہ اس کی موجودہ اور آنے والی نسلیں اسے یاد کر کے کانپ اُٹھیں گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

وہ روہانسے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میرے بھائی جی تو واپس نہیں آئیں گے نا!''

''تنویر!'' میں نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔ ''تم کوئی بچے نہیں ہو، ماشاء اللہ جوان جہان ہو اور خود بچوں والے ہو۔ میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو جو ایک مرتبہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتا..... خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

''یہی کوشش تو کر رہا ہوں جناب!'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نہیں تو میں بھی بھائی جی کی لاش کو دیکھتے ہی وہیں ڈھیر ہو جاتا۔''

''شاباش! مجھے تم سے یہی اُمید ہے۔'' میں نے تشفی بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہیں خود کو سنبھالنا ہی ہوگا۔ اب تم اس گھر، اس حویلی اور اس گاؤں کے بڑے ہو۔ تمہیں نہ صرف یہ کہ اپنے گھر والوں کو بلکہ گاؤں والوں کو بھی سنبھالنا ہے۔ اب سب کی آسیں اور اُمیدیں تمہی سے بندھی ہیں۔''

میری تسلی اور دلاسے نے چودھری تنویر کو کافی حد تک نارمل کر دیا۔ میں چودھری کی دلجوئی کے ساتھ ہی قتل کی اس بھیانک واردات کے بارے میں بھی مسلسل سوچ رہا تھا۔ دراصل جو لوگ کسی مخصوص پیشے سے وابستہ ہوتے ہیں ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ چاہے دنیا کے کسی بھی بکھیڑے میں کیوں نہ اُلجھے ہوئے ہوں لیکن ان کا دماغ مسلسل اپنے مقصد کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ پروفیشنل حضرات و خواتین میری بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

میں ان لمحات میں بظاہر چودھری تنویر کا حوصلہ بڑھا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میرا ذہن اپنے اپنے کام میں بھی مصروف تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس مقصد سے میرا دھیان نہیں ہٹا تھا اور سوچ بچار کے دوران میں میرے ذہن میں ایک اہم نکتہ اُبھرا۔ میں نے اس نکتے کی روشنی میں چودھری تنویر سے پوچھ لیا۔

''تنویر! تھوڑی دیر پہلے میں نے جب تم سے جھوری کے بارے میں پوچھا تھا تو تم نے بتایا تھا، مقتول نے اسے کسی ضروری کام سے لنگر وال بھیجا ہوا ہے اور یہ کہ وہ آج شام تک واپس آئے گا؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے آپ کو یہی بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے، بھائی جی نے آمنہ باجی کے لیے کچھ بھیجا ہو۔ ہماری اکلوتی بہن آمنہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اُدھر لنگر وال میں رہتی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ سب ٹھیک ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔
''لیکن ایک بات میرے ذہن کو بری طرح الجھا رہی ہے۔''
''کون سی بات ملک صاحب؟'' میرے خاموش ہونے پر اس نے پوچھا۔
میں نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''ابھی تمہارے سامنے میں نے حیدر سے خاصی طویل پوچھ گچھ کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ گزشتہ روز جب وہ بھینسوں والے دودھ کے ڈرم کو بیل گاڑی پر رکھ کر ڈیرے سے روانہ ہوا تو اس وقت جھوری ڈیرے پر موجود تھا اور..... اور یہ بھی کہ جھوری نے حیدر سے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ وہ لنگر وال جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ.....''
میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تنویر! میں یہ پتا چلانا چاہتا ہوں کہ جھوری نے اپنے لنگر وال جانے کے بارے میں بتایا تھا یا پھر بھائی جی نے ایسا کوئی تذکرہ کیا تھا؟''
''نہ بھائی جی نے ایسی کوئی بات کی۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''اور نہ ہی جھوری نے مجھے اس بارے میں کچھ بتایا تھا۔''
''تو پھر کیا تمہیں کوئی خواب وغیرہ آیا تھا؟''
''نہیں جناب، ایسی بھی بات نہیں۔''
''پھر کیسی بات ہے چودھری تنویر؟''
''وہ جی..... یہ بات مجھے بھابی جان نے بتائی تھی۔''
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''یعنی مقتول کی بیوہ فاخرہ نے؟''
''بالکل جناب! میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ بھائی جی جھوری کو لنگر وال بھیجیں گے۔ یہ اندازہ میں نے اپنے طور پر قائم کیا ہے کہ ہوسکتا ہے، بھائی جی نے آمنہ باجی کے لیے کچھ بھجوایا ہو۔''
''ٹھیک ہے، تم اندر جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ فاخرہ کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''باقی کی باتیں میں تمہاری بھابی سے پوچھ لوں گا۔''
وہ خاموشی سے اُٹھا اور حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔
میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان لوگوں سے سخت نوعیت کی تفتیش کرنا خاصا تکلیف دہ کام ہوتا ہے جن پر کوئی اُفتاد ٹوٹ پڑی ہو۔ جیسا کہ چودھری تنویر اور اس کی بھاوج فاخرہ۔ ایسے لوگ غم کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں۔ انہیں کریدنا خاصا دل گردے کا کام ہے لیکن بہرحال، فرض کی راہ میں یہ سب کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔
ابھی تک کی تفتیش، مشاہدے، شنید اور تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کیس میں جھوری ایک اہم کردار تھا۔ وہ مقتول چودھری ظہیر کا خاص آدمی تھا چنانچہ اس کے بہت سے رازوں کا امین بھی تھا اور وہی اللہ کا بندہ اس وقت میری دسترس میں نہیں تھا۔ اس سے ایک بھرپور ''ملاقات'' کے لیے مجھے شام تک اس کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔
دوسرا اہم کردار مقتول کی بیوی فاخرہ تھی۔ بیوی بھی شوہر کے بہت قریب ہوتی ہے اور اس کی اچھی بری عادتوں سے بخوبی واقف بھی اور اگر اتفاق سے میاں بیوی میں بنتی نہ ہو تو بیوی شوہر کے معاملات پر کچھ زیادہ ہی کڑی نظر رکھتی ہے۔ مقتول اور فاخرہ کے درمیان بقول تنویر کچھ ایسے ہی حالات تھے لہٰذا فاخرہ سے ہونے والی ملاقات خاصی مفید ثابت ہوسکتی تھی۔
میں اسی سوچ بچار میں غلطاں تھا کہ چودھری تنویر بیٹھک میں داخل ہوا اور آتے ہی اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! آ جائیں۔ بھابی جان کچھ سنبھل گئی ہیں۔''
میں اُٹھا اور اس کے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ وہ مجھے مختلف برآمدوں اور راہداریوں میں چلاتے ہوئے ایک بیڈ روم نما کمرے میں لے آیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ فاخرہ کی خواب گاہ تھی۔ مقتول کی راتیں حویلی میں گزرتیں، وہ اپنی بیوی فاخرہ کے ساتھ اسی خواب گاہ میں رہتا تھا۔
فاخرہ دلکش نقش و نگار کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی لیکن بیوگی کے کڑے اثرات نے اس کے حسن اور شادابی کو گہنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاصی سوئی سوئی، روئی روئی اور کھوئی کھوئی نظر آتی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے آس پاس قائم کیا۔ ازاں بعد میرا یہ قائم شدہ اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔
چودھری تنویر نے باآوازِ بلند فاخرہ کو میری اطلاع سے مطلع کیا تو اس نے نگاہ اُٹھا کر بڑے سوگوار انداز میں مجھے دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجسم پریشانی، حیرانی اور ویرانی سے میری آنکھیں چار ہوگئی ہوں۔ فاخرہ کی حالت پر مجھے دلی دُکھ ہوا۔
چودھری تنویر نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنی بھاوج کو میرے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''ملک صاحب! ضروری قانونی کارروائی کرنے آئے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی پوچھیں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ انہیں ٹھیک ٹھیک بتادیں۔ انہیں ہم سے بہت ہمدردی ہے اور یہ ہمارے ساتھ تعاون سے جلد از جلد بھائی جی کے قاتل تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ اسے عبرتناک انجام سے دوچار کرسکیں۔''

فاخرہ نے ایک مرتبہ پھر زخمی نگاہ سے مجھے دیکھا اور گردن جھکالی۔ اس نے ابھی تک اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا تھا۔ چودھری تنویر نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ بھابی جان سے جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں۔ میں اِدھر ہی بیٹھا ہوں۔''

''نہیں تنویر، تمہیں یہاں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں تمہاری بھابی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن جناب! میں تو گھر کا آدمی ہوں اور.....؟''

''میں جانتا ہوں چودھری تنویر!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''تم گھر کے آدمی ہو بلکہ اپنے بڑے بھائی کی موت کے بعد تم یہاں کے سب سے اہم شخص ہو لیکن میں پھر بھی علیحدگی میں مقتول کی بیوہ سے بات کرنا چاہوں گا۔ تم اسے قانونی ضرورت یا میری مجبوری سمجھ سکتے ہو۔''

اس نے مجھ سے مزید کوئی بحث نہ کی اور خاموشی کے ساتھ اس خواب گاہ سے نکل گیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ وہاں سے رُخصت ہوگیا بلکہ جاتے جاتے وہ خواب گاہ کے دروازے کو بھی بھیڑ گیا تھا۔ میں اس کی اس حرکت کا مطلب پلک جھپکتے میں سمجھ گیا۔

وہ میرے حکم پر نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے جانے کے لیے مجبور ہوا تھا۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ کر ہمارے درمیان ہونے والی باتیں سننا چاہتا تھا اور میں نے اسے اس ''چیز'' سے محروم کردیا تھا لیکن وہ محروم رہنے کے لیے تیار نہیں تھا جبھی اس نے خواب گاہ کے دروازے کو بھیڑ دیا تھا تاکہ وہ اس بھڑے ہوئے دروازے کے عقب میں موجود رہ کر ہماری گفتگو کو سننے کی کوشش کرسکے۔ اگر دروازہ کھلا رہتا تو اسے اپنے اس مقصد میں یقینی کامیابی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ کسی بھی وقت میری نگاہ میں آسکتا تھا۔ چودھری تنویر کی اس چال نما حرکت سے یہ تو واضح ہوگیا تھا کہ وہ جتنا سیدھا سادہ اور جذباتی دکھائی دیتا تھا، ویسا تھا نہیں۔

میں اس ''سادہ چالاک'' کو اس کے حال پر چھوڑ کر فاخرہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ہنوز گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے پُرخلوص انداز میں کہا۔

''فاخرہ! مجھے تمہارے خاوند کی المناک موت کا گہرا دُکھ ہے۔ میں چودھری ظہیر کو دوبارہ زندہ تو نہیں کرسکتا لیکن یہ تم سے میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارے شوہر کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کرکے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچادوں گا۔''

اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا اور ایسی نظر سے مجھے تکنے لگی جیسے اسے میرے کہے کا یقین نہ آیا ہو۔ میں نے اس کا اعتماد بحال کرنے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا۔

''لیکن..... اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہوگی..... بھرپور تعاون۔ تمہاری مدد کے بغیر میں اس تفتیشی راستے پر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکوں گا۔''

اس کے لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ وہ تھرتھرا کر وا ہوئے اور متذبذب انداز میں بولے۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں تھانے دار صاحب؟''

میں نے کہا۔ ''تم اپنے رضاکارانہ تعاون سے مجھے قاتل تک پہنچاؤ گی؟''

''مگر کیسے..... کس طرح؟'' اس کی اُلجھن میں اضافہ ہوگیا۔

''اس طرح کہ.....'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے جو بھی سوال کروں، تم اس کا بالکل دُرست جواب دینا۔ ٹھیک ہے؟''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''پوچھیں!''

میں نے پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، مقتول چودھری ظہیر سے تمہاری شادی ایک جبر کا نتیجہ تھی۔ تم اس شادی کے لیے تیار نہیں تھیں؟''

''میں کیا، بھائی سکندر کو بھی یہ پسند نہیں تھا کہ میری شادی چودھری ظہیر سے ہو۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے اور سکندر بھائی نے ابا جی کی آخری خواہش سمجھتے ہوئے یہ کڑوا گھونٹ بھرلیا تھا۔''

''میں نے سنا ہے، اس طرف جنڈیالہ میں بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کے الفاظ چودھری تنویر کے کانوں تک نہ پہنچیں۔

''ظہیر، تنویر اور آمنہ کو بھی یہ رشتے داری پسند نہیں تھی لیکن تم لوگوں کی طرح انہوں نے بھی چودھری خلیل کی آخری خواہش کے سامنے گردن جھکادی تھی۔''

''ہاں، کچھ ایسا ہی میں نے بھی سنا ہے۔'' وہ گہری افسردگی سے بولی۔ ''لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کمال ہے۔'' میں نے حیرت آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔''.....اس سے بہت کچھ ہوا تھا۔ چودھری خلیل اور چودھری خاور حیات کے درمیان پلنے والی دُشمنی ختم ہوگئی۔ دونوں نے اپنی ''آخری خواہش'' کے پردے میں دو خاندانوں کو ایک کر کے خوں ریزی کے متوقع طوفان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روک دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ بدستور افسردہ لہجے میں بولی۔''یہ واقعی ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ ابا جی اور میرے سسر جی کی کوشش سے دو خاندان مل کر ایک ہوگئے مگر.....!''

فاخرہ نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو بے چینی مجھے ستانے لگی۔ میں نے اضطراری لہجے میں اس سے استفسار کیا۔''مگر کیا فاخرہ؟''

''مگر یہ کہ..... دو خاندانوں کا ملاپ تو ہوگیا لیکن دو دل، دو ذہن ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔''

فاخرہ نے بڑی گہری بات کی تھی۔ اگر میں چودھری تنویر کی زبانی ان دونوں خاندانوں کی تاریخ سے آگاہ نہ ہو چکا ہوتا تو میں فاخرہ کی اس رمزیہ بات کو سمجھ نہیں سکتا تھا لیکن موجودہ صورتِ حال میں مجھے کسی قسم کی کوئی دُشواری محسوس نہ ہوئی۔ میں نے دوستانہ اور مخلصانہ لہجے میں کہا۔

''فاخرہ! میں تمہارے مسائل کو اچھی طرح سمجھ اور محسوس کر سکتا ہوں۔ میں نے.....!''

اس نے مجھے آگے بولنے نہیں دیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے خاصے تلخ لہجے میں بولی۔''تھانے دار صاحب! آپ کے سمجھنے اور محسوس کرنے کا کیا فائدہ۔ جسے سمجھنا اور محسوس کرنا چاہیے تھا وہ تو..... خیر، اب تو اس ذکر کی بھی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی فائدہ۔ میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے، مرنے والوں کی برائی کرنا چاہیے اور نہ ہی ان کا شکوہ.....!''

''تم نے بالکل دُرست سن رکھا ہے فاخرہ!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''لیکن میں اس موضوع سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے شوہر چودھری ظہیر کے قتل کے سلسلے میں تحقیقات کر رہا ہوں لہٰذا مقتول کی ذات کا ہر ہر پہلو زیرِ بحث آئے گا..... اور مقتول کی ذات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے اپنی دوسری بیوی فاخرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہر وقت اپنی پہلی بیوی کے خیالوں میں گم، ٹھنڈی اور گرم دونوں قسم کی آہیں بھرتا رہتا تھا۔ اس کے رویّے سے، قدم قدم پر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے کسی عورت سے شادی نہ کی ہو بلکہ ایک سانس لینے والے جاندار کو حویلی میں مقیم کر لیا ہو..... جس کی ضروریاتِ زندگی کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے تک محدود ہوں..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

میں نے فاخرہ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ یکلخت سسک اُٹھی تاہم اس کی سسکاری اتنی بلند نہیں تھی کہ ہوا کے دوش پر چودھری تنویر کی سماعت تک رسائی حاصل کر سکتی۔ میں نے خواب گاہ کے بھڑے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا پھر فاخرہ کو مخاطب کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''فاخرہ! تمہاری درد میں ڈوبی ہوئی سسکی نے میرے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ میں اس حوالے سے تم سے مزید کچھ نہیں پوچھوں گا۔ میں تمہارے دُکھ اور درد کی گہرائی تک پہنچ گیا ہوں۔ تم سے درخواست ہے کہ اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے دینا۔ مجھے یقین ہے کوئی ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہا ہے۔''

اس نے چور کنکھیوں سے خواب گاہ کے گوشے گوشے کو جھانکا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''لیکن یہاں تو ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے؟''

''یہاں نہیں..... وہ باہر دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑا ہے۔'' میں نے آواز کو دھیما رکھتے ہوئے پُراسرار لہجے میں کہا۔

''وہ..... کون؟'' اس کی آواز اضطراب میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''تمہارا دیور..... چودھری تنویر.....!''

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر کہا۔ ''تنویر کو ہماری گفتگو سننے سے کیا مطلب ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی؟''

''سمجھ میں تو میری بھی نہیں آئی۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔''لیکن میں بہت جلد چودھری تنویر کے مقصد اور دلچسپی کا پتا لگالوں گا۔ اس کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہے۔''

''یہ شخص مجھے بھی عجیب ہی لگا ہے۔'' وہ اُکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔''میں دو سال سے اس حویلی میں ہوں لیکن چودھری تنویر کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کبھی تو یوں لگتا ہے کہ ظہیر کا اس سے بڑا اور کوئی خیر خواہ ہی نہیں اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ چودھری ظہیر کا سگا بھائی نہ ہو۔ خیر.....'' اس نے برا سا منہ بنا کر جملہ ادھورا چھوڑا، ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''میں نے اپنے ابا جی چودھری خاور حیات مرحوم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا ہوا وعدہ نبھا دیا ہے، ان کی آخری خواہش کو پورا کر دیا۔ حالات چاہے کیسے بھی رہے ہوں، ان دو برسوں میں، میں نے چاہے کتنی ہی تکلیفیں کیوں نہ اُٹھائی ہوں لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے حالات سے تنگ آ کر واپس میکے چلی گئی ہوں۔ میں نے ظہیر کی آخری سانس تک اس کا ساتھ نبھایا ہے لیکن اب یہ میرے لیے ممکن نہیں رہا کہ اس حویلی کی قید میں زندگی بسر کروں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ فاخرہ کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس نے جی میں کچھ ٹھان رکھی ہے۔ وہ کسی ایسے حتمی فیصلے پر پہنچ چکی ہے جس کے بارے میں اس نے ابھی تک کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''فاخرہ! میں محسوس کر رہا ہوں، تم نے آیندہ زندگی کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر لیا ہے؟''

''اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھانے دار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''چودھری ظہیر کو پیش آنے والے اس اندوہناک واقعے کی خبر اُدھر مکھن پور میں میرے بڑے بھائی چودھری سکندر حیات کو بھجوا دی گئی ہے۔ وہ شام سے پہلے پہلے جنڈیالہ پہنچ جائے گا۔ میں گاہے بہ گاہے اسے اپنی پریشانیوں کے بارے میں بتاتی رہی ہوں لیکن ہر مرتبہ میری بپتا سننے کے بعد اس نے یہی کہا تھا، فاخرہ! ابا جی کی آخری خواہش کا پاس کرنا ہے..... زندگی کی آخری سانس تک، چاہے یہ تمہاری زندگی کی آخری سانس ہو یا چودھری ظہیر کی زندگی کی آخری سانس!''

وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوئی پھر بوجھل آواز میں بولی۔ ''چودھری ظہیر کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا ہے، گویا میں اس قید سے آزاد ہو گئی ہوں جو ابا جی کی آخری خواہش کی صورت مجھ پر مسلط کر دی گئی تھی۔ میں سکندر حیات سے دوٹوک انداز میں کہہ دوں گی کہ میں زیادہ سے زیادہ چودھری ظہیر کے چہلم تک اس حویلی میں رُک سکتی ہوں۔ اس کے بعد میں سیدھی مکھن پور پہنچوں گی..... جنڈیالہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر۔''

میں نے اس کے عزم و استقلال کو دیکھتے ہوئے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''ہر انسان اپنے حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے اور اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ تم نے جو فیصلہ کیا ہے، وہ غلط ہے یا دُرست..... مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ جب تک چودھری ظہیر کا قاتل قانون کی گرفت میں نہیں آ جاتا، تمہیں یہ حویلی اور جنڈیالہ چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہیے۔''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں چودھری ظہیر کے چالیسویں تک تو یہاں رُکنے کے لیے تیار ہوں۔ کیا آپ کو قاتل تک رسائی کے لیے سال چھ مہینے درکار ہیں؟''

''نہیں، اتنی لمبی مدت کی کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں انشاء اللہ چودھری ظہیر کے چہلم سے پہلے ہی اس کے قاتل کا سراغ لگا لوں گا..... اس کے لیے تم مجھ سے تعاون کرو گی۔''

''تعاون والی بات آپ پہلے بھی دو مرتبہ کر چکے ہیں۔'' وہ یاددہانی کرانے والے انداز میں بولی۔ ''اور میں نے آپ کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔ اب تک آپ نے مجھ سے جو بھی پوچھا ہے، میں نے اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیا ہے۔ پوچھیں، اگر کچھ مزید پوچھنے کو رہ گیا ہے تو؟''

میں نے بڑی گہری نظر سے فاخرہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اب وہ پہلے جیسی افسردہ اور غمزدہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یا تو اس نے بڑی بہادری سے خود کو سنبھال لیا تھا اور یا پھر وہ اتنی دُکھی اور ملول تھی ہی نہیں جیسا اس نے شروع میں ظاہر کیا تھا، وہ محض افسردگی کی اداکاری کر رہی تھی۔ میں مقتول چودھری ظہیر کے بارے میں اس کے تازہ ترین خیالات سے آگاہی حاصل کر چکا تھا اس لیے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت پیش نہ آئی کہ میرا آخر الذکر اندازہ ہی دُرست تھا یعنی فاخرہ کو چودھری ظہیر کی موت کا ویسا غم نہیں تھا جیسا کہ وہ ظاہر کر رہی تھی۔

چودھری تنویر کے لیے میں فاخرہ کے اُلجھن زدہ اور ناپسندیدہ خیالات سے واقف ہو چکا تھا لہٰذا میں نے تنویر کی ذات کے حوالے سے فاخرہ سے پوچھ لیا۔ یہ ایک طرح سے چودھری تنویر کے بیان کی تصدیق کے سلسلے میں کوشش بھی تھی۔ وہ بیان جو اس نے جھوری کے ''لنگروال'' جانے سے متعلق دیا تھا۔

''فاخرہ! تم گزشتہ دو سال سے اس حویلی میں زندگی گزار رہی ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ تم مقتول چودھری ظہیر کے ایک خاص بندے منظور عرف جھوری کے بارے میں کچھ نہ جانتی ہو؟''

''ہاں، ہاں..... جانتی ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''چودھری ظہیر نے اسے ڈیرے پر رکھا ہوا ہے۔ وہ زمینداری اور کاشتکاری کے جملہ اُمور کی نگرانی کرتا ہے۔ چودھری ظہیر اس پر بڑا اعتماد کرتا ہے..... میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مطلب ہے، اعتماد کرتا تھا۔''

''اعتماد کرتا تھا..... اسی لیے تو جھوری کو چودھری ظہیر کا خاص آدمی سمجھا جاتا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ جھوری اس وقت کہاں ہوگا..... وہ مجھے اُدھر ڈیرے پر اور اِدھر حویلی تو میں کہیں دکھائی نہیں دیا؟''

''جھوری تو کل رات سے لنگر وال گیا ہوا ہے۔'' فاخرہ نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

''لنگر وال!'' میں نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ خیریت سے وہاں گیا ہے؟''

''لنگر وال میں میری نند آ منہ رہتی ہے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے، چودھری ظہیر نے جھوری کے ہاتھ آ منہ کے لیے کچھ بھجوایا ہے۔''

فاخرہ کے ابتدائی جملے نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس جملے کی بے ساختگی اور سادگی نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''سنا ہے..... کیا مطلب؟''

''جی؟'' وہ بھی میرے استفسار پر اُلجھ کر رہ گئی۔

میں نے اس کی اُلجھن دور کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے بتایا ہے کہ تم نے جھوری کے لنگر وال جانے کے بارے میں سنا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ..... کس سے سنا ہے۔ کیا یہ بات تمہیں مقتول چودھری ظہیر نے بتائی تھی؟''

''نہیں جناب!'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''چودھری ظہیر تو مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا، پھر اپنی بہن کو کچھ بھجوانے کے بارے میں مجھے کیوں بتائے گا۔''

''تو پھر..... تمہیں جھوری نے یہ بات بتائی ہوگی؟'' میں نے ایک امکان کی طرف اشارہ کیا۔

''جھوری تو چودھری ظہیر کا خاص بندہ ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ اس کے معاملات کو چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات اس کے منہ سے نہیں نکلی۔ وہ بڑا پکا ہے جی۔''

میں نے متذبذب نظر سے فاخرہ کو دیکھا اور سوال کیا۔ ''ظہیر نے تمہیں بتایا اور نہ ہی جھوری کی زبان سے پھسلا پھر تمہیں یہ بات کس ذریعے سے معلوم ہوئی ہے؟''

''مجھے تو چودھری تنویر نے اس بارے میں بتایا ہے۔'' فاخرہ نے جواب دیا۔

''کیا واقعی؟'' میرے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

''آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا تھانے دار صاحب!'' وہ تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟''

میں ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چودھری تنویر نے حویلی کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ جھوری کے لنگر وال جانے کی خبر فاخرہ نے اسے دی تھی اور فاخرہ بتا رہی تھی، یہ اطلاع تنویر کی زبانی اس تک پہنچی تھی۔ دونوں بیک وقت سچے نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ دونوں کا بیان ایک دوسرے کے بالعکس تھا لہٰذا لازمی بات یہی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک سنگین قسم کی دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔

جب کوئی انسان جھوٹ کا سہارا لیتا ہے تو اس بیچارے کی مدد سے وہ کسی ایسی بات کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے جو جرم کے زمرے میں آتی ہو۔ اس کا مطلب تھا ان دونوں میں جو کوئی بھی جھوٹا تھا وہ کسی جرم کو چھپانے کی سعی میں مصروف تھا اور..... اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ خود بھی اس جرم میں پوری طرح شریک ہوگا..... اور اس وقت میرے سامنے سب سے بڑا جرم چودھری ظہیر کا قتل تھا۔ لامحالہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا..... کیا چودھری ظہیر کو فاخرہ یا چودھری تنویر میں سے کسی نے قتل کیا ہے؟

فاخرہ کی استفساریہ آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا۔ کیا میں نے آپ سے کوئی مشکل سوال پوچھ لیا ہے؟''

اس کا سوال میرے ذہن میں تھا لیکن ایک فوری خیال کے تحت میں نے فیصلہ کیا کہ اسے چودھری تنویر کے بیان کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا اور چودھری تنویر کو بھی اس بات کی بھنک نہیں لگنے دوں گا کہ فاخرہ نے جھوری کے لنگر وال جانے کے سلسلے میں اس (چودھری تنویر) کے بارے میں کیا بیان دیا ہے لہٰذا میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھ کر گھسنا چاہتا تھا تاکہ اصل بات تک رسائی حاصل ہو سکے۔ معاملے کو گول کرتے ہوئے میں نے فاخرہ سے کہہ دیا۔

''یقین نہ کرنے والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ واقعی، تمہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میں تمہیں غلط نہیں سمجھ رہا ہوں فاخرہ! میری خاموشی کا کوئی غلط مطلب نہ نکالو۔ میرا ذہن دراصل کسی اور معاملے میں اُلجھا ہوا تھا۔''

وہ اس وضاحت کے بعد مطمئن ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں چند لمحات تک اس سے مقتول چودھری ظہیر کے بارے میں گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوالات کرتا رہا پھر مقتول کی زندگی کے انتہائی نازک اور حساس پہلو پر ضرب لگادی۔ اتفاق سے مذکورہ پہلو فاخرہ کے لیے بھی انتہائی اہم اور دُکھتا ہوا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ تم دونوں میں زیادہ نہیں بنتی تھی۔ چودھری ظہیر تم سے اُکھڑا اُکھڑا اور خفا خفا سا رہتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ اپنی خفگی مٹانے کے لیے حویلی سے باہر ڈیرے پر رات گزارنے چلا جائے۔ وہ اسی حویلی کے کسی دوسرے کمرے میں بھی تو رات بسر کرسکتا تھا۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر تم سے ناراض ہوکر اُدھر ڈیرے پر چلا جاتا تھا۔''

''آپ نے جس سے بھی سنا ہے، بالکل ٹھیک سنا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ''اور چودھری ظہیر کے اس فرار کی ایک خاص وجہ تھی۔''

''وجہ.....'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا وجہ تھی؟''

''چودھری کے وہ شوق حویلی میں پورے نہیں ہوسکتے تھے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں بتایا۔ ''اس سلسلے میں، میں سب سے بڑی رُکاوٹ تھی۔''

''تم مقتول چودھری کے کن شوق کا ذکر کررہی ہو؟'' میرا سوال تجسس سے بھرا ہوا تھا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں محسوس کررہی ہوں کہ آپ اس حویلی کے حالات سے خاصی گہری واقفیت رکھتے ہیں لہٰذا میں آپ سے کچھ چھپانے کی حماقت نہیں کروں گی۔ ہوسکتا ہے اس طرح آپ کا تفتیشی کام آسان ہوجائے۔''

میں پوری طرح فاخرہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس نے چند لمحات کا توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں مجھے مقتول چودھری ظہیر کے ''شوق'' کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے مطابق مقتول جہاں اپنی مرحومہ بیوی کے غم میں ٹھنڈی اور گرم آہیں بھرتا تھا وہیں اس ''نامرادغم'' کو بھلانے اور مٹانے کے لیے وہ شراب کا سہارا بھی لیا کرتا تھا اور اس کی یہ عادت فاخرہ سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ شروع میں وہ یہ شغل حویلی کے اندر ہی کرتا تھا لیکن فاخرہ نے جب اس کے اس عمل کی شدت سے مخالفت کی تو وہ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ فاخرہ نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے آیندہ حویلی کی حدود میں ایسی حرکت کی تو وہ سب سے پہلے اپنے میکے والوں کو اس کے کرتوت سے آگاہ کرے گی اور پھر اسے حویلی چھوڑ کر مکھن پور چلی جائے گی۔ فاخرہ کا کہنا تھا کہ وہ اس کی اس دھمکی میں آگیا تھا۔ وہ اگرچہ فاخرہ میں ویسی دلچسپی نہیں لے رہا تھا جیسے ایک شوہر کو اپنی بیوی میں لینا چاہیے لیکن اس عدم توجہی اور ناپسندیدگی کے باوجود بھی وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ فاخرہ اسے چھوڑ کر اپنے میکے چلی جائے۔ شاید وہ بھی چاہے لولے لنگڑے انداز میں ہی سہی، اپنے باپ چودھری خلیل کی آخری خواہش کا پاس کررہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے چودھری خاور حیات اور چودھری خلیل نے مرنے سے پہلے ''آخری خواہش'' کا کارڈ کھیل کر دیرینہ دُشمنی کو ختم کرتے ہوئے دو خاندانوں کو ایک خاندان کی شکل میں متحد اور یکجا کردیا تھا مگر فاخرہ کی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں کی یہ ''کوشش'' دو دلوں کو ملانے کا سبب ثابت نہیں ہوسکی تھی۔

فاخرہ نے مزید بتایا کہ اس کی طرف سے دھمکی دار رُکاوٹ بننے کے بعد مقتول چودھری ظہیر نے اپنا یہ شوق پورا کرنے کے لیے ڈیرے کا رُخ کرلیا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار اس سے شدید ناراض ہوجاتا اور روٹھ کر شام کو حویلی سے نکل جاتا۔ پھر اس کی واپسی دوسری صبح ہی ہوتی تھی۔ فاخرہ اس کی ''مصروفیات'' سے بخوبی آگاہ تھی لیکن اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! اس حویلی کے تمام حالات اور معاملات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ خود اندازہ لگالیں کہ میں نے پچھلے دو سال کس اذیت میں گزارے ہوں گے۔ میں اگر اب یہاں مزید رُکنا نہیں چاہتی تو اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ میرے لیے یہ حویلی کسی بھی طرح جہنم سے کم نہیں۔''

میں نے اس کی دل شکستگی اور جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر کہا۔ ''مجھے تمہارے حالات کے باعث تم سے گہری ہمدردی ہے۔ تم نے واقعی گزشتہ دو سال بڑی تکلیف میں گزارے ہیں۔ میں تمہارے تعاون کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ اُمید ہے تم ایک دو مزید سوالات کے بھی ٹھیک ٹھیک جواب دوگی۔''

میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''شراب کو ''اُم الخبائث'' کا ٹائٹل دیا گیا ہے۔ یہ جہاں جاتی ہے وہاں اپنے ساتھ چند دوسری خباثتیں بھی لے کر جاتی ہے۔ جیسا کہ..... میرا خیال ہے، تم میری بات سمجھ رہی ہو؟''

اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بڑے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دینے پر اِکتفا کیا۔ وہ میری بات کی تہ میں اُتر گئی تھی۔ میں نے مزید تصدیق کے لیے اسی سے پوچھ لیا۔

''تو اس کا مطلب ہے میرا اندازہ بالکل دُرست ہے۔''

''جی ہاں..... چودھری ظہیر اس بیماری میں بھی مبتلا تھا۔''

فاخرہ نے اپنے مرحوم شوہر کی طبع رنگین کو ''بیماری'' کے لبادے میں چھپا کر پیش کرنے کی بڑی خوبصورت کوشش کی تھی۔ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو وہی بات ہوئی، باہر ثواب اور گھر میں عذاب؟''

یہاں پر ''ثواب'' کا لفظ محاورتاً استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مراد ہرگز کوئی نیک کام نہیں لہٰذا ذہن کو منفی انداز میں دوڑنے سے روکا جائے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مقتول چودھری ظہیر کی تمام تر مہربانیاں باہر والیوں کے لیے تھیں۔ گھر میں بیٹھی، اپنے استحقاق سے محروم فاخرہ ایک عذاب میں مبتلا تھی۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے تلخی سے کہا۔

''جی ہاں..... کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔''

میں نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میں تمہاری باتوں کو جھٹلا نہیں رہا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں نے جائے وقوعہ خصوصاً اس کمرے کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے جہاں تمہارے شوہر کی لاش پڑی ملی تھی مگر وہاں ایسے آثار مجھے دکھائی نہیں دیے جس سے مقتول کے شراب نوش ہونے کا سراغ ملتا ہو..... اور کچھ ایسی ہی صورتِ حال مقتول کے دوسرے سنگین اور رنگین شغل کے حوالے سے بھی ہے ورنہ میں وہیں پر چونک جاتا؟''

''جھوری بہت ہی چالاک اور تیز آدمی ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''یہ شخص بہت سے معاملات میں چودھری ظہیر کا رازدار رہا ہے۔ ہوسکتا ہے جھوری نے چودھری کے کرتوتوں کے آثار جائے واردات سے ختم کردیے ہوں۔''

''ہاں، ایسا بالکل ہوسکتا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن جھوری تو کل رات سے موضع لنگر وال گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی آج شام کو ہوگی پھر وہ.....؟''

میں نے اُلجھن زدہ سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے جھوری کو ڈیرے سے نکلتے ہوئے دیر ہوگئی ہو۔ وہ چودھری ظہیر کی ''خدمت شدمت'' سے فارغ ہونے کے بعد لنگر وال کی طرف گیا ہو..... اور اس کے جانے کے بعد قتل کی یہ واردات پیش آئی ہو۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اصل بات تو اسی وقت پتا چل سکتی ہے جب جھوری لنگر وال سے واپس آئے گا اور آپ اس سے کڑی پوچھ گچھ کریں گے۔''

''پوچھ گچھ تو میں اس سے ایسی کروں گا کہ اس کی آنے والی سات نسلوں کی تاریخ مرتب ہوجائے گی۔'' میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بندہ مجھے اس کیس میں بہت ہی اہم اور خطرناک نظر آرہا ہے۔ مجھے اُمید ہے اس کا ''انٹرویو'' اس کیس کے بہت سے ڈھکے ہوئے گوشوں کو بے نقاب کردے گا۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کررہی ہوں۔''

''ویسے تمہارے خیال میں چودھری ظہیر کا قاتل کون ہوسکتا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اچانک پوچھ لیا۔ ''تمہیں اگر کسی شخص پر شک ہو تو بتاؤ۔''

چودھری تنویر نے تو اس سلسلے میں ایک نام دیا ہے۔''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو کسی بندے پر شک نہیں البتہ اگر آپ جھوری پر ذرا سختی کریں تو اس حوالے سے خاصی اہم معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔''

''اس پر سختی تو میں کروں گا ہی.....!'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

وہ پُرتجسس لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''ویسے چودھری تنویر نے کس بندے پر شک ظاہر کیا ہے؟''

''ملک خدا بخش پر۔'' میں نے مذکورہ شخص کا نام لے دیا۔

''اچھا..... وہ موضع ''کرماں والی'' والا ملک خدا بخش؟''

''بالکل وہی۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا اور اسے تنویر کے مؤقف سے آگاہ کردیا۔

پوری بات سننے کے بعد وہ بولی۔ ''مجھے تو اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امکانات بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ میں پانچ ایکڑ زمین والے اس جھگڑے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ واقعات کے مطابق ملک خدا بخش نے چودھری ظہیر کی پانچ ایکڑ زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے بلکہ زمین کے اس ٹکڑے کی ملکیت کے کاغذات بھی بنوالیے ہیں۔ ایسی صورت میں تو میرے خاوند کو ملک خدا بخش پر چڑھائی کرنا چاہیے تھی۔ ملک خدا بخش چودھری ظہیر کو کیوں قتل کرے گا یا کرائے گا، یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''میری بھی سمجھ سے باہر ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''بظاہر ایسا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔''

''پھر چھوٹے چودھری نے ملک خدا بخش پر شک کیوں ظاہر کیا؟'' وہ اُلجھ کر رہ گئی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ بات میں چودھری تنویر سے ضرور پوچھوں گا اور اس سے پہلے میں اُدھر موضع کرماں والی میں ملک خدا بخش کو بھی چیک کروں گا۔ ہوسکتا ہے کوئی نئی بات سامنے آجائے۔''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' وہ خیال انگیز لہجے میں بولی۔

میں نے فاخرہ سے مزید دو چار سوال کیے۔ اسے تاکید کی کہ وہ ہمارے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا ذکر کسی سے نہ کرے خاص طور پر چودھری تنویر کو ان باتوں کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ اگر اس سلسلے میں کوئی استفسار کرے تو اس سے کہہ دے کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر میں نے اسے اس حوالے سے چند مشورے بھی دیے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایات کو یاد رکھے گی۔ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی پھر جانے کے لیے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور باآواز بلند کہا۔ ''اچھا، اب میں چلتا ہوں۔''

اسی لمحے مجھے خواب گاہ کے بند دروازے کی دوسری جانب کھٹر پٹر سی محسوس ہوئی پھر ایسا لگا جیسے کوئی بڑی سرعت سے وہاں سے ہٹا ہو۔ اس پُراسرار ''نقل وحرکت'' کو فاخرہ نے بھی بھانپ لیا تھا۔ بے ساختہ وہ بھی بھڑے ہوئے دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ میں چونکہ چودھری تنویر کی ''جاسوسی'' کے حوالے سے اسے بتا چکا تھا لہٰذا اس لمحے اس کے ذہن میں بھی اپنے دیور کا نام چمک رہا تھا، سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

''آپ کا اندازہ بالکل دُرست تھا تھانے دار صاحب!''

''ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ میں تمہارے دیور کو دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

میں خواب گاہ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو راہداری میں سامنے سے چودھری تنویر آتا ہوا نظر آیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ تیزی سے میری سمت بڑھا۔ میں اس کی اداکاری پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے اپنی بھاوج کے کمرے میں پہنچا کر وہ وہاں سے دور چلا گیا تھا اور اب میں اسے جیسے ہی دکھائی دیا، وہ میری جانب لپک آیا تھا۔

میرے قریب پہنچ کر اس نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''کیا رہا تھانے دار صاحب! کیا بھابی جان نے کوئی ایسی بات بتائی جس سے بھائی جی کے قاتل تک رسائی ممکن ہو؟''

میں نے اس کے ہمراہ باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ بے چاری بہت دُکھی ہے۔ خاوند کی موت نے اسے بری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے میرے سوالات کے جواب کم دیے ہیں اور رونی زیادہ رہی ہے۔ میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ وہ قتل کی اس واردات کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی بلکہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں اس سے کسی بھی قسم کی مفید معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔ ویسے ایک بات ہے.....!''

میں نے پُراسرار انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔ ''ویسے کیا بات ہے؟''

میں دانستہ فاخرہ سے ہونے والی بات چیت کو چودھری تنویر سے چھپا رہا تھا اور ایک خاص پلاننگ کے تحت اسے ڈیل کر رہا تھا۔ اس کا ایک جھوٹ تو کھل کر میرے سامنے آچکا تھا جو اس نے جھوری کے لنگر وال جانے کے حوالے سے اپنی بھاوج کے کندھے پر بندوق رکھ کر بولا تھا۔ فاخرہ نے بھی اس کے بارے میں ملی جلی رائے ظاہر کی تھی۔ گویا چودھری تنویر کی ذات متنازعہ شکل اختیار کرچکی تھی۔ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس تمام تر شک وشبہے کے باوجود بھی میں اس وقت تک تنویر کو ''چھیڑنا'' نہیں چاہتا تھا جب تک جھوری کا ''مزاج اور خیریت'' معلوم نہ کرلوں۔ اگر چودھری تنویر کسی بھی حوالے سے اپنے بڑے بھائی چودھری ظہیر کے قتل میں ملوث تھا تو پھر جھوری کا اس کا ساتھی یا آلۂ کار ہونا لازمی قرار پاتا تھا۔ اسی لیے میں پہلے جھوری سے ایک تفصیلی ''ملاقات'' کرنا چاہتا تھا۔ اس ملاقات کے بعد ہی چودھری تنویر پر مضبوط ہاتھ ڈالا جاسکتا تھا۔

چودھری تنویر کے استفسار میں جو تڑپ اور تجسس پایا جاتا تھا وہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ اپنی بھاوج سے ہونے والی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری ملاقات کا احوال جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔ میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تنویر! ویسے میں نے محسوس کیا ہے کہ فاخرہ کے خیالات تم سے بہت ملتے جلتے ہیں۔''

''جی..... بھابی جان نے ایسا کیا کہا ہے؟'' وہ تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے جواب دیا۔ ''تمہاری بھاوج فاخرہ کو بھی ''کرماں والی'' کے چودھری ملک خدا بخش پر شک ہے۔ وہ ان لوگوں کو بہت برا بھلا بھی کہہ رہی تھی۔''

چودھری تنویر کے چہرے پر اطمینان کی لہری دوڑ گئی، خاصے پُرجوش لہجے میں اس نے کہا۔ ''جناب! دیکھ لیں، اس معاملے میں بھابی جان بھی میری ہم خیال ہے۔ آپ ملک خدا بخش کو ضرور ذہن میں رکھیں۔''

''تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔'' میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی موضع کرماں والی روانہ ہو رہا ہوں۔ اس دوران میں تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا؟''

''کون سا کام تھانے دار صاحب؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے ڈیرے پر مجھے بتایا تھا کہ جھوری شام تک موضع لنگر وال سے واپس آئے گا لیکن اب چونکہ چودھری ظہیر کو پیش آنے والے واقعے کی خبر بھی وہاں پہنچا دی گئی ہے لہٰذا توقع ہے کہ وہ لوگ شام سے پہلے ہی آ جائیں۔ تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ جیسے ہی جھوری موضع جنڈیالہ میں قدم رکھے تم اسے میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ مجھے اس سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''ٹھیک ہے جناب! وہ جیسے ہی مجھے نظر آیا، میں اسے تھانے بھیج دوں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

''میں اب چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اُدھر تھانے میں بھی بہت سارے معاملات نمٹانا ہیں۔''

''تھانے دار صاحب!'' چودھری تنویر نے لجاجت بھرے لہجے میں مجھے مخاطب کیا اور بولا۔ ''بھائی جی کی موت کی خبر تمام رشتے داروں کو بھجوا دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے دوپہر کے بعد سے لوگ حویلی آنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ نے بھائی جی کی لاش کو چیر پھاڑ کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا ہے۔ وہ یہاں آ کر کس کا منہ دیکھیں گے؟''

''اس قسم کی حادثاتی اموات میں پوسٹ مارٹم بہت ضروری ہوتا ہے چودھری تنویر!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس سے بعض اوقات ایسے ایسے انکشافات ہوتے ہیں کہ عقل دنگ اور منصوبہ بھنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ سات پردوں کے پیچھے چھپا ہوا قاتل اپنی تمام تر بے داغ اور مضبوط منصوبہ بندی کے باوجود بھی قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ آج ہی چودھری ظہیر کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جائے۔ تمہیں اس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کل دن میں کسی وقت چودھری ظہیر کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم گھر کو دیکھو اور آنے والے لوگوں کو سنبھالو۔ میں چلتا ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو رات میں ایک چکر لگاؤں گا۔ جب تک میں موضع کرماں والی سے بھی ہو کر آ جاؤں گا۔ تم میرا کام یاد رکھنا..... جھوری کو تھانے بھیجنے والا؟''

''جی..... جی..... مجھے یاد ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں حویلی سے نکل کر تھانے آ گیا۔

حوالدار صوبے خان چودھری ظہیر کی لاش کو ضلعی اسپتال پہنچا کر واپس آ گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اسے بلا لیا۔ وہ بھی مجھ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ میں نے جس کانسٹیبل کے توسط سے اسے بلایا تھا اس نے بتایا کہ صوبے خان کافی دیر سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

صوبے خان میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''چودھری کی لاش کو صحیح سلامت اسپتال پہنچا دیا ہے نا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کل پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور چودھری کی لاش واپس مل جائے گی۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''مجھے پتا چلا ہے تم کافی دیر سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ خیریت تو ہے نا..... کوئی خاص بات؟''

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا پھر ایک تہ شدہ کاغذ برآمد کر کے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! دیکھیں، یہ کیا ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس کے ہاتھ سے وہ تہ شدہ کاغذ لے لیا اور کھول کر اسے پڑھنے لگا۔ کاغذ کی تحریر پر میری نگاہ پڑی تو میں چونک اُٹھا۔ نہایت ہی مختصر الفاظ میں وہاں لکھا تھا۔

''چودھری ظہیر کی دو ٹکڑے لاش کو دیکھ کر ان لوگوں کو عبرت پکڑنا چاہیے جو چودھری کی طرح ظالم اور بدکردار ہیں، اپنی طاقت کے بل پر دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھانے والوں کا ایک دن یہی انجام ہوتا ہے..... لالی!''

میں نے اس کاغذ کی تحریر کو دو تین مرتبہ پڑھا پھر نگاہ اُٹھا کر صوبے خان کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کاغذ تمہیں کہاں سے ملا اور..... یہ لالی کون ہے؟''

ویسے نام سے تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ لالی کوئی لڑکی یا عورت ہو گی۔ صوبے خان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ملک صاحب! یہ تہ شدہ کاغذ مقتول چودھری ظہیر کی جیب سے برآمد ہوا ہے اور لالی..... کبھی اس گاؤں جنڈیالہ میں رہا کرتی تھی۔ آپ کو اس علاقے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لیے لالی کی کہانی آپ کو معلوم نہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن میں نے چودھری ظہیر کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے پہلے اس کی اچھی طرح جامہ تلاشی لی تھی۔ اگر یہ کاغذ اس کی کسی جیب میں موجود تھا تو میرے ہاتھ کیوں نہیں لگا..... بہرحال۔'' میں نے سانس لینے کے لیے توقف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''غلطی کسی بھی انسان سے ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے اس کاغذ تک میرے ہاتھ اور نگاہ نہ پہنچ سکی ہو لیکن اس کاغذ کی تحریر تو بڑے خطرناک انداز میں اس جانب اشارہ کر رہی ہے کہ چودھری ظہیر کو عبرت ناک انداز میں موت کے گھاٹ اُتارنے کا سہرا اس لالی کے سر بندھتا ہے..... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ لالی کون ہے اور اس کی کہانی کیا ہے؟''

حوالدار صوبے خان نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! لالی کا اصل نام بشریٰ تھا اور وہ ایک سال پہلے تک اِدھر جنڈیالہ ہی میں رہتی تھی۔ میں نے سنا ہے، لالی نے خودکشی کر لی تھی۔''

''خودکشی!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یعنی ایک سال پہلے اپنی جان سے کھیلنے والی لالی اب چودھری ظہیر کے قتل کی ذمے داری کا اعلان کر رہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے صوبے خان؟''

''ہو سکتا ہے ملک صاحب.....!'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہ لالی کی روح نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو.....!''

''دیکھو صوبے خان!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''یہ روح والی کہانی کو اس کیس میں کہیں فٹ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے لالی کی موت، موت کے اسباب، اس کی موت سے پہلے کی زندگی اور بعد کے حالات کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔''

حوالدار صوبے خان موضع جنڈیالہ ہی کا رہنے والا تھا لہٰذا وہ یہاں کے حالات سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا۔

''ملک صاحب! کچھ عرصہ پہلے تک بشریٰ عرف لالی اسی گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کی ماں غفور بی بی کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ صرف باپ زندہ تھا اور لالی کا بڑا بھائی یوسف۔ لالی کے باپ کرم دین کی آرا مشین تھی جہاں وہ لکڑی کی تراش خراش اور کٹائی کا کام کرتا تھا۔ لالی کا بھائی یوسف اس کام میں اپنے باپ کی مدد کرتا تھا۔ پھر ایک روز کرم دین پر فالج گرا اور وہ کسی کام کے قابل نہ رہا۔ مجبوراً یوسف کو آرا مشین کا کام تن تنہا سنبھالنا پڑا۔ وہ محنت سے گھبرانے والا جوان نہیں تھا اس لیے فوراً ہی اس نے حالات پر قابو پا لیا۔ قصہ مختصر کچھ عرصہ مفلوج رہنے کے بعد کرم دین بھی چل بسا اور یہ دونوں بہن بھائی اس دنیا میں اکیلے رہ گئے۔''

صوبے خان سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لالی بہت ہی خوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ اس کے حسن کا چرچا پورے گاؤں میں تھا۔ اس کی عمر انیس بیس سال ہی تھی اور یوسف اس سے پانچ سال بڑا تھا۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اس خاندان میں صرف وہی دونوں رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں پہلے ہی محبت اور اتفاق بہت زیادہ تھا اور والدین کی وفات کے بعد تو وہ ذہنی اور دلی طور پر اور بھی قریب آ گئے تھے۔ ان کی زندگی بڑے ہموار انداز میں آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک اندوہناک واقعہ پیش آ گیا..... اور یہ واقعہ تھا، لالی کی خودکشی کا۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما پھر رواں ہو گیا۔

''جس نے بھی سنا اسے لالی کی افسوس ناک موت کا یقین نہ آیا لیکن یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجایش نہیں تھی کہ لالی نے اپنی گردن میں موت کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے جان جھولتی ہوئی لاش چھت سے لٹکی ہوئی ملی تھی۔''

صوبے خان نے لالی کے انجام کا تصور کر کے ایک جھرجھری لی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لالی کی موت نے یوسف کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ کافی دنوں تک پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا پھر ایک روز وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر غائب ہوگیا۔''

''غائب ہوگیا..... کیا مطلب؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ''جناب! یوسف اچانک لاپتا ہوگیا تھا۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ وہ اپنا گھر بار، آرامشین کاروبار سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور آج تک لوٹ کر واپس نہیں آیا۔ پھر اسے یہاں جنڈیالہ میں یا کہیں اور دیکھا نہیں گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے یوسف نے لالی کی موت سے دلبرداشتہ ہوکر اپنی جان لے لی ہوگی لیکن اس نے کب، کہاں اور کیسے خودکشی کی یہ بات کسی کو معلوم ہے اور نہ ہی سامنے آسکی۔ رفتہ رفتہ اس معاملے پر مٹی پڑ گئی اور آج یہاں اسے کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔''

میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور متعدد سوالات اُبھر کر سامنے آرہے تھے جن کے جوابات صوبے خان ہی دے سکتا تھا مگر ان سوالات سے پہلے مجھے اس سے ایک نہایت ہی اہم سوال پوچھنا تھا۔ میں نے ہیجان بھرے انداز میں استفسار کیا۔

''صوبے خان! تم نے لالی کی تاریخ اور جغرافیے کو تو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن مجھے ابھی تک ایک سوال کا جواب نہیں ملا اور وہ سوال تھا..... لالی کی موت کے اسباب سے متعلق؟''

''جناب!'' وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''لالی کی موت کا سبب تو آج تک سامنے نہیں آسکا لیکن بعض لوگوں کو ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ اس کی موت کا ذمے دار چودھری ظہیر تھا۔ وہ چودھری ظہیر کے کسی کرتوت کے ہاتھوں مجبور ہوکر خودکشی کی راہ پر گئی تھی لیکن جنڈیالہ کے لوگ چونکہ چودھری ظہیر کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرسکتے لہٰذا یہ بات عام نہیں ہوسکی۔ ہوسکتا ہے چودھری کی موت کے بعد یہ قصہ اُچھالا جائے۔ آپ سے پہلے اس تھانے میں جو انچارج صاحب تھے وہ پوری طرح چودھری ظہیر کی مٹھی کا چاول بنے ہوئے تھے۔ ہمیں مجبوراً ان کے سامنے چپ رہنا پڑتا تھا لیکن اب صورتِ حال مختلف نظر آرہی ہے۔ آپ نے اس تھانے کا چارج سنبھال لیا ہے اور چودھری بھی باقی نہیں رہا۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو صوبے خان!'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''اب واقعی صورتِ حال بدل چکی ہے۔ میں اس بات پر تو یقین نہیں رکھتا کہ چودھری ظہیر کے قتل میں بشریٰ عرف لالی کی روح کا ہاتھ ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ لالی کے بھائی یوسف کو اپنی بہن کی اندوہناک موت کا سبب معلوم ہوگیا ہو اور انتقام کی آگ میں کندن بننے کے بعد اس نے یہ سنسنی خیز قدم اُٹھایا ہو۔ چودھری کی دوشیزہ لاش کو دیکھ کر فوری طور پر ذہن کسی بڑی آری یا آرامشین کی طرف جاتا ہے اور یوسف کا ماضی اس امکان کی تصدیق کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آرامشین اور یوسف کا آپس میں بڑا گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہم یوسف کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجائیں تو چودھری ظہیر کے قتل کے معمے کو چٹکی بجاتے میں حل کیا جاسکتا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' حوالدار سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہورہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے میں مقتول چودھری ظہیر کے حوالے سے چند باتوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں تم میری مدد کروگے۔ تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو لہٰذا تم سے زیادہ اور کوئی کیا جانتا ہوگا۔''

حوالدار نے اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا تو میں نے اس سے مقتول چودھری کی رنگین مزاجی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھنا شروع کردیا۔ میں اس سلسلے میں فاخرہ سے بھی چند کہانیاں سن کر آیا تھا۔ صوبے خان نے ان تمام کہانیوں کی تصدیق کردی تو آخر میں، میں نے اس سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم تھوڑی دیر کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں اس نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہوں کہ آگے کیسے بڑھا جائے اور ہاں..... فی الحال کسی اور سے اس دھمکی آمیز کاغذ کا ذکر نہ کرنا۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سب سے زیادہ آپ کا وفادار ہوں۔''

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ..... ''تم مجھ سے پہلے والے تھانہ انچارج کو بھی اسی طرح سینہ ٹھونک کر اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوگے۔''

حوالدار کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔

حوالدار اسپتال سے جو تہ شدہ کاغذ لایا تھا وہ اس کے بقول مقتول چودھری ظہیر کی ایک جیب سے برآمد ہوا تھا۔ ظاہر ہے وہ کاغذ مقتول کی جیب میں قاتل نے رکھا ہوگا اور اس طرح گھسا پھنسا کر رکھا ہوگا کہ میری متلاشی نگاہ میں نہ آسکا۔ مذکورہ دھمکی آمیز رقعہ تحریر کی روشنی میں کسی ''لالی'' کی کارستانی نظر آتا تھا مگر میری تازہ ترین معلومات کے مطابق بشریٰ عرف لالی نے لگ بھگ ایک سال پہلے خودکشی کر کے اپنی جان لے لی تھی۔ میں ایک عملی اور منطقی انسان تھا۔ ہر سمجھ میں نہ آنے والی اور پُراسرار بات کو بھی تجربے اور منطق کی کسوٹی پر کس کر پرکھتا تھا لہٰذا میں کسی بھی قیمت پر حوالدار صوبے خان کے انداز میں نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا، لالی کی روح نے چودھری ظہیر سے بھیانک انتقام لیا ہے لیکن میں کسی اور ہی زاویے پر دماغ کھپا رہا تھا۔

میرے نزدیک لالی کے خاندان کا صرف ایک ہی فرد زندہ تھا اور وہ تھا لالی کا بڑا بھائی یوسف..... جو اس کی المناک موت پر دیوانوں کے مانند گلی گلی، کوچہ کوچہ گھوما کیے تھا اگر یہ بات صد فیصد دُرست تھی کہ لالی نے چودھری ظہیر کے کسی جبر کے نتیجے میں دلبرداشتہ ہو کر عالم سکتگی میں خودکشی کی تھی اور..... اس تلخ حقیقت کو کسی بھی طور یوسف نے پالیا تھا تو..... چودھری ظہیر کے قتل کا ذمے دار اسے ٹھہرایا جاسکتا تھا۔

یوسف کو اپنی بہن سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ لالی کو برباد کرنے والے کسی بھی شخص کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرسکتا تھا چاہے وہ جنڈیالہ کا طاقتور چودھری ظہیر ہی کیوں نہ ہو۔ محبت انسان کو اتنا مضبوط بنا دیتی ہے کہ وہ سر پہ فلک پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر اسے سرد مہری سے گھورنے کی ہمت کرسکتا ہے۔ یہ عین ممکن تھا کہ یوسف ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جنڈیالہ سے غائب ہوگیا ہو۔ اس نے کچھ عرصہ رُک کر خود کو مضبوط کیا ہو۔ اس دوران میں وہ کسی ذریعے سے چودھری ظہیر کے معمولات پر بھی نگاہ رکھے ہوئے ہو۔ اسے کسی ایسے موقع کی تلاش ہو جب وہ چودھری کو اپنے انتقام کا نشانہ باآسانی بنا سکتا ہو اور پھر گزشتہ رات اسے وہ سنہری موقع مل گیا ہو۔ اس نے اپنے ذرائع سے پتا چلالیا ہو کہ اس رات مقتول چودھری ڈیرے پر اکیلا ہی ہوگا۔ اس نے سینے میں کھولتے ہوئے انتقام کے آتش فشاں کو سرد کرلیا ہو اور اس رقعے کے ذریعے لالی کا نام استعمال کر کے وہ خوف و دہشت پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہو..... وغیرہ وغیرہ!

اس تھیوری کی روشنی میں اگر میں یوسف تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو چودھری ظہیر مرڈر کیس چٹکی بجاتے میں حل کیا جاسکتا تھا۔ میں نے پختہ تہیہ کرلیا کہ اگلی صبح یوسف کی تلاش کے کام کا آغاز کردوں گا۔ اس پُراسرار دھمکی آمیز رقعے کی ''دریافت'' کے بعد یوسف مشتبہ افراد کی فہرست میں ٹاپ پر آگیا تھا۔ اس کے نیچے فہرست میں دو نام اور بھی درج تھے۔ ایک چودھری تنویر اور دوسرا جھوری۔

چودھری تنویر کی دروغ گوئی میری پکڑ میں آچکی تھی۔ یہ جاننا باقی تھا کہ اس نے کس مقصد کی خاطر جھوٹ بولا تھا اور میں یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے جھوری کی واپسی کا بڑی شدت سے انتظار کررہا تھا۔ جھوری کا کردار کئی زاویوں سے اس کیس میں اہمیت کا حامل تھا۔ وہ مقتول کا رازداں اور ایک طرح سے دستِ راست بھی تھا۔ مقتول کی من جملہ غیر نصابی سرگرمیوں کی اسے اچھی طرح خبر تھی بلکہ وہ مقتول کے لیے ایک معاون راسد کا کردار ادا کررہا تھا لہٰذا اس سے پوچھ گچھ بڑی مفید ثابت ہوسکتی تھی۔ وہ لالی کو پیش آنے والے واقعے سے بھی بخوبی واقف ہوگا کیونکہ لالی اس کے ہاتھوں چودھری ظہیر کے رشتم کا نشانہ بننے ڈیرے پر پہنچی ہوگی اور عین ممکن ہے، اسے یہ بھی معلوم ہو کہ یوسف کو گرفتار کرنے کے لیے کہاں کہاں چھاپے مارنا چاہئیں۔

مجھے اُمید تھی آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے جھوری مجھ سے ملنے تھانے ضرور آئے گا لیکن میں اپنے کمرے میں بیٹھا انتظار ہی کرتا رہ گیا اور وہ نہیں آیا۔ نہ وہ آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر۔ موجودہ صورتِ حالات میں ''کرماں والی'' کے چودھری ملک خدا بخش کو نیچ کرنا فضول ہی تھا لہٰذا میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی پوری توجہ جھوری اور یوسف پر مرکوز کردی۔ اس کے ساتھ ہی میں چھوٹے چودھری تنویر کے بارے میں بھی تنقیدی انداز میں سوچنے لگا۔

اگلے روز دوپہر سے تھوڑا پہلے مقتول چودھری ظہیر کی لاش اسپتال سے آگئی۔ میں نے گزشتہ روز ضلعی اسپتال کے ڈاکٹر خاص یعنی وہ سرجن جس نے لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا تھا اس سے خصوصی درخواست کی تھی کہ وہ اس کام کو جلد از جلد نمٹا دے اور یہ میری اسی درخواست کا نتیجہ تھا۔ لاش کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی تھی۔ میں نے اپنے ایک آدمی کو جنڈیالہ کے چودھری تنویر کی طرف روانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردیا تاکہ وہ آ کر اپنے بڑے بھائی کی لاش وصول کر لے اور اس کے بعد میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پڑھنے لگا۔

اس رپورٹ کے مطابق چودھری ظہیر کی موت رات کے آخری نصف حصے میں واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت رات بارہ اور دو بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ رپورٹ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ جب چودھری ظہیر کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا تو وہ نشے میں دھت تھا لہٰذا قاتل کو اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہوئے کسی دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی کیمیکل انالسس کی رپورٹ بھی منسلک تھی۔ اس رپورٹ کی رُو سے مقتول کے معدے کے تجزیے سے پتا چلا تھا کہ جن لمحات میں اسے قتل کیا گیا، اس نے اچھی خاصی شراب پی رکھی تھی اور وہ تقریباً اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا۔ اسے اس کی غفلت کے دوران میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

دوپہر کے بعد چودھری تنویر اپنے بھائی کی لاش وصول کرنے تھانے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ تنویر نے آتے ہی پہلے تو بہت بہت معذرت کی کہ وہ اب تک اِدھر کا رُخ نہیں کر سکا تھا۔ اس نے کہا۔

''جناب! کل جب آپ حویلی سے رُخصت ہوئے، اس کے بعد ہی سے لوگ آنے لگے تھے پھر تو وہ تانتا بندھا کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ بھائی جی کے تعلقات بہت لوگوں سے تھے۔ ان کی موت کے بارے میں جس نے بھی سنا وہ تعزیت کے لیے حویلی کی طرف دوڑ پڑا۔ بس کیا بتاؤں کہ میں کس قدر مصروف ہوگیا تھا۔ ابھی آپ کا پیغام ملا کہ بھائی جی کی لاش اسپتال سے آ گئی ہے تو میں دوڑا دوڑا تھانے چلا آیا۔''

''کوئی بات نہیں چودھری تنویر!'' میں نے گہری نظر سے اس کی پریشانی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسے مواقع پر انسان کی مصروفیت بے پناہ بڑھ جاتی ہے۔ تم لاش لے کر حویلی جاؤ اور اپنے بھائی جی کی تجہیز وتکفین کا بندوبست کرو۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں، وہ میں بعد میں کرلوں گا اور ہاں..... کیا تم نے میرا کام کردیا؟''

''کون سا کام تھانے دار صاحب؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے تمہاری ڈیوٹی لگائی تھی کہ جیسے ہی جھوری لنگر وال سے واپس آئے تم اسے سیدھا میرے پاس بھیجو گے لیکن میں یہاں بیٹھا اس کی راہ دیکھ رہا ہوں اور اس کا کوئی پتا ہی نہیں۔ کیا وہ ابھی تک اُدھر لنگر وال ہی میں ہے؟''

''میری بھی مت ماری گئی ہے جناب!'' وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے جھوری!'' اس نے اپنے ساتھ آنے والے آدمی کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ تو کل ہی آمنہ باجی کے ساتھ واپس آ گیا تھا لیکن آپ کے حکم کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ اچھا ہوا آپ نے یاد دلا دیا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ جھوری میرے ساتھ ہی تھانے آ گیا ہے۔ اب آپ اسے اِدھر ہی بٹھالیں اور جو جو پوچھنا ہے، اطمینان سے پوچھ لیں۔ میں بھائی جی کی لاش لے کر حویلی پہنچتا ہوں۔ وہاں ایک نیا پھڈا پڑا ہوا ہے۔''

''کیسا پھڈا چودھری تنویر؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے بتایا۔ ''اُدھر مکھن پور سے بھابی جان کا بھائی سکندر حیات بھی آیا ہوا ہے۔ دونوں بہن بھائیوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ دونوں اپنے باپ کی کوششوں پر پانی پھیر کر ہی دم لیں گے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔

''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

چودھری تنویر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''ہونا کیا ہے ملک صاحب! مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ان دونوں کا دماغ خراب ہوگیا ہو۔ وہ اب تک اسی انتظار میں بیٹھے تھے کہ اِدھر بھائی جی کی آنکھ بند ہو، اُدھر وہ تنازع کھڑا کردیں۔ ان کے باپ نے ہمارے ابا جی کے ساتھ مل کر دو خاندانوں کو یکجا کیا تھا لیکن بھابی جان اس نازک موقع پر خاندانوں کو پھر الگ کرنے کی بات کر رہی ہیں۔ وہ اسی ضد پر جمی ہوئی ہیں کہ اب وہ اس حویلی میں نہیں رہیں گی۔ سکندر حیات انہیں اپنے ساتھ لے جائے جبکہ سکندر کا کہنا یہ ہے کہ وہ اس وقت تک اسے اپنے ساتھ نہیں لے کر جا سکتا جب تک وراثتی معاملات طے نہ پا جائیں۔''

''وراثتی معاملات؟'' میں نے اُلجھن زدہ نظروں سے چودھری تنویر کو دیکھا۔

وہ بولا۔ ''تھانے دار صاحب! مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم بھی آ رہی ہے لیکن کیا کروں۔ یہ حقیقت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ سکندر حیات نے بات ہی ایسی گھٹیا کردی ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ کم از کم اسے موقع محل تو دیکھنا چاہیے تھا۔ ابھی تو بھائی جی کا جنازہ بھی نہیں اُٹھا اور اس نے زمین جائداد کے بٹوارے کی باتیں شروع کردی ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان لمحات میں چودھری تنویر مجھے نہایت ہی سنجیدہ اور آزردہ نظر آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ان تمام تر معاملات میں بے قصور اور غیر جانب دار ہو۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''چودھری سکندر حیات آخر چاہتا کیا ہے؟''

''جناب! اگر آپ سچی، صاف اور کھری بات سننا چاہتے ہیں تو مجھے سکندر کے عزائم بہت ہی گھٹیا محسوس ہوئے ہیں۔'' وہ نفرت آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا دعویٰ ہے کہ فاخرہ بھابی، بھائی جی کی اکلوتی وارث ہے اس لیے اسے حویلی چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہیے اگر کل کلاں دونوں بھائیوں اور ان کے بیوی بچوں میں زمین اور جائداد کی تقسیم کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اس کی بہن کو بھی اتنا ہی ملنا چاہیے جتنا کہ مجھے یا میری بیوی بچوں کو۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جناب! یقیناً آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے؟''

''بالکل سمجھ گیا ہوں چودھری تنویر!'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہاری بھابی کا کیا مؤقف ہے؟''

''فاخرہ بھابی کا اصرار ہے کہ وہ پہلی فرصت میں مکھن پور جانا چاہے گی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ جنڈیالہ والی ہماری حویلی کو جہنم کہہ رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے، یہاں اس کا دم گھٹتا ہے۔ اسے زمین و جائداد کی ضرورت نہیں۔ بس وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے..... جتنی بھی جلدی ممکن ہو سکے جبکہ چودھری سکندر اپنی بہن کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اسے اپنے حصے سے دستبردار ہونے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔ آپ نے اچھی طرح محسوس کر لیا ہوگا کہ یہ کیسے نامعقول لوگ ہیں۔ بھائی کی تدفین ابھی ہوئی نہیں اور انہوں نے عجیب و غریب تنازع کھڑے کر دیے ہیں۔ اس بھابی جان کو دیکھیں.....'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''جس حویلی میں اس نے دو سال آرام و آسایش سے گزارے آج اسی کو جہنم کہہ رہی ہے۔ ایسی خود غرض، ناشکری اور طوطا چشمی میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھی۔''

میں اپنی کرسی سے اُٹھا اور چودھری تنویر کے پاس آ گیا پھر اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''چودھری سکندر حیات اور اس کی بہن فاخرہ کے تنازعات کو بعد میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ فی الحال تم اپنے بھائی کی لاش کو لے کر حویلی پہنچو اور اس کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کرو۔ میں اپنے دو آدمیوں کو تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔''

اس نے تہ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی جھوری نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''وہ جی..... چھوٹے چودھری صاحب..... میرے ذریعے ہی تو سارے انتظامات کریں گے۔ میں فارغ ہونے کے بعد آپ کے پاس آ جاؤں گا.....''

''تم آرام سے اِدھر ہی بیٹھو!'' میں نے کڑے انداز میں کہا۔ ''اس دنیا کے بہت سے کام تمہارے بغیر بھی ہو سکتے ہیں۔ جب میں تمہیں فارغ کر دوں تو چلے جانا..... جہاں بھی جانا ہو تمہیں۔''

وہ مسکین سی صورت بنا کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے آئندہ پندرہ منٹ میں ضروری کارروائی کر کے مقتول چودھری ظہیر کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کو چودھری تنویر کے حوالے کیا پھر اسے ایک طرف لے گیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''تنویر! میں تمہاری پریشانی کو سمجھ سکتا ہوں اس لیے نہایت ہی نرم لہجے میں بات کر رہا ہوں۔ ابھی بھی وقت ہے اگر تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ بولا ہے تو بتا دو ورنہ بعد میں اگر ایسی کوئی بات سامنے آئی تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔''

''جناب! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''اور میں ایسا کیوں کروں گا؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا یہ کہنا ہے کہ تمہیں فاخرہ نے جھوری کے لنگر وال جانے کے بارے میں بتایا تھا اور اس طرف وہ بھی یہی دعویٰ کر رہی ہے؟''

وہ اُچھل پڑا۔ ''یعنی بھابی فاخرہ یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے اسے جھوری کے لنگر وال جانے کی اطلاع دی تھی؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس نے خود یہ بات مجھے بتائی ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ بھابی نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے مگر کیوں.....؟''

میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی دروغ گوئی کو میں چیک کر لوں گا، تم فکر نہ کرو۔''

وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

اس کے بعد میں نے اپنے دو آدمیوں کو لاش کے ہمراہ حویلی کی جانب روانہ کیا اور دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاں جھوری بڑی پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا۔

''تم کافی پریشان اور اُلجھے ہوئے نظر آرہے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یہ تمہاری شکل پر پھپھیں کیوں بج رہے ہیں؟''

''نن..... نہیں!'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیسی بات ہے جھوری؟'' میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''وہ جی..... دراصل، بڑے چودھری صاحب کی موت نے مجھے..... بہت زیادہ متاثر کیا ہے.....!''

''تمہارا متاثر ہونا تو لازمی بات ہے جھوری!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''میں نے سنا ہے تم دونوں کے بیچ بڑا پکا یارانہ تھا۔ چودھری ظہیر تم پر بڑا بھروسا کرتا تھا، اپنی بیوی سے بھی زیادہ بھروسا۔ تم اس کے رازداں تھے۔ اس کے بعض ایسے رازوں میں شریک تھے جو وہ اپنی بیوی سے بھی چھپاتا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تھانے دار صاحب! میری اتنی اوقات کہاں کہ چودھری صاحب سے یارانہ رکھتا۔ بس جی، ان کی مہربانی تھی جو وہ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے تھے۔ میں تو ان کا خادم تھا..... ہر وقت خدمت کے لیے تیار رہتا تھا۔''

''اور..... ہر نوعیت کی خدمت کے لیے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ہیں نا؟''

''ظاہر ہے جناب!'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔ ''خادم، خدمت نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔''

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ مقتول چودھری ظہیر جب رات گزارنے کے لیے ڈیرے پر آتا تھا تو تم ہی اس کی رنگین اور سنگین خدمت کا بندوبست کیا کرتے تھے؟''

''جناب! میں تو حکم کا غلام تھا۔'' وہ بڑی مکاری سے بولا۔ ''وہ کیا کہتے ہیں، حکم حاکم مرگِ مفاجات.....!''

''مرگِ مفاجات..... نہیں، مرگِ مفاجات!'' میں نے فوری طور پر اس کے جملے کی تصحیح کردی اور کہا۔ ''تم حکم کے غلام تھے یا اینٹ کے اٹھے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ مقتول چودھری ظہیر تمہارے تعاون اور مدد ہی سے اپنی عیش وعشرت کا انتظام کرتا تھا۔'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو توقف کیا پھر سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''وقوعہ کی رات تم ڈیرے پر کس کو لے کر آئے تھے؟''

''کسی کو نہیں جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اس رات چودھری صاحب نے ایسی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ وہ صرف پینا چاہتے تھے..... اور آرام سے سونا چاہتے تھے..... لیکن.....!''

''لیکن۔'' پر اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''یہ..... ساری باتیں آپ کو کس نے بتائی ہیں.....؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ظاہر ہے، کسی ایسے شخص ہی نے بتائی ہیں جو تمہارے اور تمہارے چودھری ظہیر کے کرتوتوں سے واقف ہوگا۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اور..... اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چودھری تو مارا گیا۔ تم کیوں اتنے خوفزدہ ہو؟''

''میں خوفزدہ تو نہیں ہوں جناب.....!'' وہ بڑی سرعت سے بولا۔

''چہرے سے تو ایسے ہی نظر آرہے ہو۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے کوئی سنگین جرم کیا ہو؟''

''نہ جی.....!'' وہ اضطراری انداز میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

اس کے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات و سکنات سے گہرا اضطراب اور تشویش جھلکتی تھی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے خبردار کررہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ واقع ہے۔ کہاں..... اور کیا گڑبڑ، اس کا اندازہ نہیں ہو پارہا تھا اور یہ مجھے اپنے تفتیشی داؤ پیچ سے معلوم کرنا تھا اگر چودھری تنویر نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تھی تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ فاخرہ نے جھوٹ بولا تھا۔ اس صورت میں فاخرہ کا جھوٹ سب سے زیادہ چودھری تنویر کے خلاف جاتا تھا۔ وہ تنویر کے حوالے سے اپنی ناپسندیدگی کا بھی کھل کر اظہار کرچکی تھی۔ تو کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ فاخرہ، تنویر کو ظہیر مرڈر کیس میں کسی زاویے سے گھسیٹنے کی خواہش مند ہو؟ اس کی یہ خواہش اس جانب اشارہ کرتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی درجے پر اپنے شوہر کے قتل میں ملوث ہے ورنہ اسے اس قسم کی چالیں چلنے کی کیا ضرورت تھی اور..... پھر اس کا تازہ ترین رویہ بھی خاصا فکر انگیز تھا۔ وہ مجھ سے کہہ چکی تھی، چودھری ظہیر کے چالیسویں تک ضرور حویلی میں رُکے گی اور اب چودھری تنویر نے بتایا تھا کہ وہ پہلی فرصت میں اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہے۔ دوسری جانب چودھری سکندر حیات کا اصرار بھی بڑا معنی خیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ ...ھی اُلجھی ہوئی تھی اور رہ رہ کر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ...وری پر ''محنت'' کروں تو اس اُلجھی ہوئی ڈور کا ...ہاتھ آ سکتا تھا۔ میں نے ڈھنگ سے اسے ...کرلیا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''کسی مجرم کا ساتھ دینے کے لیے جرم کی راہ ہموار کرنا بھی جرم کا ارتکاب ہی کہلائے گا۔ تم چودھری ظہیر کے ہر عیب فعل میں اس کے شریک اور معاون رہے ہو لہٰذا تم بھی مجرم ہی ہوئے نا؟''

''اچھا، تو آپ کا یہ مطلب تھا۔'' اس نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ''میں تو سمجھا تھا.....''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کڑے لہجے میں کہا۔ ''تم یہی سمجھے تھے نا کہ میں تمہیں چودھری ظہیر کا قاتل سمجھ رہا ہوں؟''

''جناب! ڈرانے والی باتیں نہ کریں..... میں چودھری صاحب کو قتل کروں..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں تو ان کا پرانا نمک خوار ہوں.....!''

''اس نوعیت کے کام پرانے نمک خوار، دستِ راست اور بھروسے والے لوگ زیادہ آسانی سے کر لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''توبہ، توبہ.....!'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''قتل کے بارے میں نہیں سوچ سکتے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن چودھری ظہیر کے قاتل کے بارے میں تو ضرور سوچ سکتے ہو نا۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سنسناتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''بتاؤ..... چودھری ظہیر کو کس نے قتل کیا ہوگا؟''

''مم..... میں کیا جانوں.....'' وہ لڑکھڑاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''مجھے کیا پتا جی..... میں کیسے بتاؤں، چودھری ظہیر کو کس نے قتل کیا ہے۔ آپ بڑی سے بڑی قسم لے لیں تھانے دار صاحب..... میں قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا.....!''

''ہوں!'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''تو تم چودھری کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''جی..... بالکل نہیں جانتا۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کسی یوسف ترکھان کو تو تم اچھی طرح جانتے ہوگے۔ ہیں نا؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ تو بڑے کمال کے پولیس والے ہیں۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور خوامخواہ مجھے ذرار ہے ہیں۔''

جھوری کی بات کا کوئی سر تھا اور نہ ہی پاؤں لہٰذا میرا اُلجھنا لازمی امر تھا۔ میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو..... مجھے کیا سب معلوم ہے؟''

وہ لمحے بھر کے لیے گڑبڑایا پھر جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! آپ نے یوسف ترکھان کا نام لیا تو میں یہی سمجھا کہ آپ کو اس بندے پر شک ہے..... اور یہ شک کچھ غلط بھی نہیں۔ یوسف چودھری صاحب سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ ان کی جان لے سکتا ہے۔''

جھوری کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ یوسف کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش میں ہے حالانکہ میں نے اس سے اس حوالے سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

''میں نے تم سے یوسف کے بارے میں پوچھا تھا۔ تم نے چودھری سے اس کی نفرت کا ذکر نکالا ہے تو اس میں میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ مجھے اس کی تفصیلی کہانی سناؤ۔''

جھوری نے خود کو اور چودھری ظہیر کو محفوظ مقام پر رکھتے ہوئے بشریٰ عرف لالی کے ذکر کو گول کر کے ایک فارمولا کہانی مجھے سنا ڈالی۔

اس کی غیر ضروری طویل لنگڑی وضاحت سن کر میں اس کی طرف سے اور کھٹک گیا۔ اس کے انداز و اطوار اور بول چال میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو میرے ذہن کو اُلجھا رہی تھی۔ میں نے مقتول کے لباس میں سے برآمد ہونے والے لالی کے رقعے کا جھوری سے تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا، وہ رقعے کی حقیقت سے واقف ہو اور یہ بات اسے میری نگاہ میں مشکوک بناتی تھی۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ موجود تھی۔ دال میں کالا واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تیز نظر سے جھوری کو گھورا اور پوچھا۔

''تمہارے لنگر وال جانے کے بارے میں کس کس کو معلوم تھا؟''

''کسی کو بھی نہیں جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''چودھری صاحب نے کسی کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی۔ مجھے بھی انہوں نے اسی وقت بتایا جب رات کو ڈیرے پر آئے تھے۔''

''اچھا!'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''مقتول چودھری نے کسی سے تمہارے لنگر وال بھیجنے کا ذکر نہیں کیا، تم نے کسی نہ کسی کو یہ بات ضرور بتائی ہوگی؟''

''بالکل نہیں جناب..... اتنا وقت ہی کہاں تھا۔'' وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''وقوعہ کی رات وہ ڈیرے پر پہنچے اور مجھ سے کہا کہ میں فوراً لنگر وال چلا جاؤں۔ وہ پیچھے گے اور آرام کریں گے۔'' وہ وضاحت کرنے لگا۔ ''میں نے ان سے کہا جناب، اگر آپ کا حکم ہو تو صبح چلا جاتا ہوں۔ اب تو رات ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا، ابھی اور اسی وقت جانا ضروری ہے۔ میں ان سے بحث نہیں کرسکتا تھا لہٰذا جانے کے لیے تیار ہوگیا اور چودھری صاحب سے درخواست کی کہ واپس میں کل شام کو آؤں گا۔ اُدھر لنگر وال کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، کھار پورہ۔ جنڈیالہ سے لنگر وال جائیں تو پہلے کھار پورہ آتا ہے۔ کھار پورہ میں میرا ایک دوست رہتا ہے..... افضل ڈار۔ میں افضل ڈار کے پاس کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ چودھری صاحب نے مجھے اجازت دے دی اور میں ڈیرے سے روانہ ہوگیا۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔ ''کیا تمہیں اپنے مالک کا اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ تم اسے ڈیرے پر اکیلے چھوڑ کر جا رہے تھے؟''

''کیوں نہیں جناب! خیال تو بہت آیا تھا۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''لیکن وہی بات تھانے دار صاحب کہ یہ چودھری صاحب کا حکم تھا اور میں..... ان کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔''

میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''چودھری ظہیر کے ایسے کون سے ضروری کام سے تم راتوں رات لنگر وال روانہ ہوئے تھے؟''

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''چودھری صاحب تو اب باقی نہیں رہے لہٰذا آپ کے سامنے ان کا راز کھولنے میں کوئی حرج نہیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''اُدھر لنگر وال میں چودھری صاحب کی چھوٹی بہن آمنہ بی بی رہتی ہے۔ چودھری صاحب نے میرے ہاتھ آمنہ بی بی کے لیے ایک ہزار روپے بھجوائے تھے اور کہا تھا، صبح تڑکے آمنہ کو یہ رقم مل جانا چاہیے۔ میں گھوڑے پر سوار ہوکر لنگر وال کی طرف روانہ ہوگیا۔ جنڈیالہ سے لنگر وال کا فاصلہ کوئی دس میل ہے۔ میں آدھی رات کو کھار پورہ پہنچا اور رات کا باقی حصہ میں نے افضل ڈار کے گھر گزارا۔ اگلی صبح میں منہ اندھیرے لنگر وال روانہ ہوگیا اور تڑکے تڑکے آمنہ بی بی کو ایک ہزار روپے پہنچا کر واپس اپنے دوست افضل ڈار کے پاس آ گیا۔'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چودھری صاحب اکثر و بیشتر اپنی چھوٹی بہن کے لیے میرے ہاتھ رقم بھجواتے رہتے تھے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہو تو آمنہ بی بی سے خود جا کر پوچھ لیں۔ وہ اس وقت جنڈیالہ والی حویلی میں موجود ہے..... اور افضل ڈار سے بھی اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ میں اس کے پاس گیا تھا یا نہیں۔''

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جھوری! تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تمہارے لنگر وال جانے کے بارے میں تم دونوں (جھوری + مقتول) کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا لیکن میں ایسے دو افراد سے واقف ہوں جو تمہارے اس پروگرام سے آگاہ تھے۔''

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور بے ساختہ پوچھا۔ ''وہ دونوں کون ہیں؟''

''ایک تو ہے چھوٹا چودھری تنویر.....!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

وہ ہکا بکا رہ گیا، بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔ ''چھوٹے چودھری صاحب کو کس نے بتایا؟''

''اس کی بھابی جان فاخرہ نے.....!'' میں نے اس کی سماعت میں ایک اور دھماکا کیا۔

''نہیں، چھوٹے چودھری صاحب غلط کہہ رہے ہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بے ساختہ بولا۔ ''چودھرائن جی ایسی غلطی نہیں.....!''

وہ بولتے بولتے اچانک رُک گیا اور پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔ چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کوئی ایسی بات کہنے جا رہا تھا جس کو چھپانا مقصود تھا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی اس کی زبان کو یکلخت بریک لگ گئے تھے۔

یکلخت بریک زبان کو لگیں یا گاڑی کو، اس کا نتیجہ اچھا برآمد نہیں ہوتا..... زبان یا گاڑی کے حق میں کیونکہ یہ دونوں چلنے والی چیزیں ہیں، انہیں طریقے سلیقے سے روکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جھوری کی زبان اچانک بریک لگنے سے پھسل گئی تھی اور اس پھسلاؤ میں مجھے ایک ایسا پوائنٹ ہاتھ لگ گیا تھا جس کی مدد سے میں اس کیس کو حل کرسکتا تھا۔

میں اپنی کرسی سے اُٹھا اور خاموشی کے ساتھ جھوری کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے اس انداز نے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کردیا۔ اس کی حالت چیخ چیخ کر گواہی دے رہی تھی کہ اس سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا، اس کی ٹھوڑی کو ایک جھٹکے سے اُوپر اُٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا۔

''پیار محبت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکی نا.....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھیک ہے، تم جیسے ڈھیلوں کے لیے میرے پاس اور بھی بہت سے فارمولے موجود ہیں۔ میں دیکھتا ہوں، تم کتنے سخت جان ہو؟''

میرے لہجے میں اتنی قطعیت اور سفاکی تھی کہ وہ ہل کر رہ گیا، سراسیمہ لہجے میں بولا۔ ''جج..... جناب! میں نے کیا کیا ہے..... میں نے کچھ نہیں کیا.....''

''چودھرائن جی کیسی غلطی نہیں کرسکتی؟'' میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرنے کے بعد استفسار کیا۔

وہ اپنے متاثرہ گال کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ..... وہ جناب..... میرا مطلب یہ تھا کہ..... چودھرائن جی چھوٹے چودھری صاحب کو میرے بارے میں کیسے..... بتا سکتی ہیں..... انہیں تو خود بھی یہ بات پتا نہیں تھی.....!''

واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ اس نے بات بدل کر صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی ورنہ اس کے ادھورے جملے کا مفہوم یہی تھا کہ چودھرائن فاخرہ اس کے لنگر وال جانے والے پروگرام سے اچھی طرح واقف تھی اور اگر اس نے چھوٹے چودھری تنویر کو اس بارے میں کچھ بتایا تھا تو یہ اس کی سنگین غلطی تھی۔

میں نے جھوری کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تمہاری چودھرائن اس بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو نا۔ میں یہ خوں ریز کہانی تمہاری زبانی سنوں گا لیکن ابھی نہیں..... تھوڑی ''خاطر تواضع'' کے بعد.....!''

میرے انداز میں چھپی ہوئی وحشت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے تشویش ناک لہجے میں جاننے کی کوشش کی۔ ''آپ..... میرے ساتھ..... کیا کرنا چاہتے..... ہیں؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور حوالدار کو کمرے میں بلالیا پھر جھوری کو اس کے حوالے کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''صوبے خان! تم بھی اسی علاقے کے رہنے والے ہو لہٰذا جھوری سے ڈاک خانہ ملانے میں تمہیں زیادہ دُشواری پیش نہیں آئے گی۔ یہ آج کی رات تمہارا ''مہمان'' ہے۔ میں چاہتا ہوں تم میزبانی کا فرض ادا کرتے ہوئے حاضر اسٹاک ساری ''ڈشز'' کے ذائقے سے اسے روشناس کراؤ۔ میری طرف سے تم بالکل آزاد ہو۔ بس شرط یہ ہے کہ جب میں صبح تھانے آؤں تو..... یہ تعاون کے لیے تیار ہو، اس کی زبان سچ بولنے کے لیے آمادہ ہوچکی ہو۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!'' حوالدار صوبے خان نے ایسی نظر سے جھوری کو دیکھا جیسے کوئی قصاب ذبح کرنے سے پہلے بکرے کو دیکھتا ہے پھر میری جانب تکتے ہوئے پورے وثوق سے کہنے لگا۔ ''آپ مطمئن ہوکر جائیں۔ آپ صبح یہاں آئیں گے تو یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجتا ہوا ملے گا۔ اس کی زبان ایسی رواں ہوگی کہ کیا راوی اور چناب، سیلِ آب کے دنوں میں رواں ہوتے ہوں گے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور تھانے سے نکل آیا۔

صوبے خان نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی رات بھر کی ''خاطر داری'' نے جھوری کو زبان کھولنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں اپنے کوارٹر میں آنے سے پہلے حوالدار کو چند اہم ٹپس دے آیا تھا۔ انہی ٹپس کی مدد سے اس نے پوچھ گچھ کا تڑکا لگا کر جھوری کے اندر سے سچ اُگلوالیا تھا اور..... یہ سچ بہت ہی خطرناک تھا۔

چودھری ظہیر کے قتل کا اقرار کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اسے اپنے مالک سے بہت ساری شکایات تھیں لیکن اس کے اندر زبان کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ چودھری ظہیر کی چاکری کرتے ہوئے موقع کی تلاش میں رہا اور پھر جب موقع اس کے ہاتھ آیا تو وہ چودھری سکندر حیات کی گود میں جا بیٹھا اور اسی کے اشاروں پر ناچتے ہوئے اس نے اپنے حاکم کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ چودھری ظہیر کو ختم کرنے کا منصوبہ چودھری سکندر کا تھا۔ چودھری سکندر اپنی بہن کے حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انہوں نے اپنے باپ چودھری خاور حیات کی آخری خواہش سے مجبور ہوکر جنڈیالہ کے چودھریوں سے ناتا جوڑا تھا لیکن اتنی بڑی قربانی کے باوجود بھی مقتول نے اس کی بہن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا وہ قابلِ معافی نہیں تھا۔ سکندر حیات نے ایک خطرناک منصوبہ ترتیب دیا اور اپنے منصوبے کی یقینی کامیابی کے لیے اس نے جھوری کو خرید لیا۔ یہ کام اگرچہ اتنا آسان نہیں تھا لیکن اس نے اپنی حکمتِ عملی سے اسے ممکن کر دکھایا۔ جھوری نے چودھری سکندر کے ایما پر ایک خاص پلاننگ کے تحت وقوعہ کی رات چودھری ظہیر کو اتنی پلائی کہ وہ اپنے ہوش وحواس میں نہ رہا۔ اس کے بعد وہ مقتول چودھری کو ڈیرے سے باہر کھیتوں میں لے گیا اور کسی شقی القلب درندے کا کردار ادا کرتے ہوئے ایک تیز دھار آری کی مدد سے اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے چودھری ظہیر کی لاش کے دونوں حصوں کو ڈیرے پر لاکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے کمرے میں ڈالا اور خود لنگر وال کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس نے رات کا آخری حصہ اپنے دوست افضل ڈار کے گھر میں گزارا اور علی الصبح وہ آمنہ بی بی کے گھر پہنچ گیا۔ درحقیقت اس رات مقتول نے اسے لنگر وال بھیجا تھا اور نہ ہی اپنی بہن کے لیے کوئی رقم بھجوائی تھی۔ یہ سارا ڈراما کہانی کو حقیقت کے قریب رکھنے کے لیے کیا گیا تھا۔ جھوری نے جو رقم آمنہ بی بی تک پہنچائی وہ اسے چودھری سکندر نے دی تھی۔

اسی طرح آری سے دولخت کرنے کا سچ ایک خاص مقصد کے تحت لگایا گیا تھا اور اسی مقصد کا ایک حصہ لالی کی جانب سے لکھا ہوا وہ رقعہ بھی تھا جو اسپتال میں مقتول کی جیب سے برآمد ہوا تھا تاکہ سب کا شک لالی کی روح کی طرف جائے یا پھر..... اس کے بھائی یوسف کی جانب۔ میں اگر کمزور دماغ کا ہوتا تو شاید ایسا ہو بھی جاتا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے لالی کی روح والی کہانی کو سننے سے پہلے ہی مسترد کر دیا تھا۔

اس خوفناک کہانی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ فاخرہ کو بھی چودھری سکندر حیات نے اپنے منصوبے سے پوری طرح آگاہ رکھا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کس دن، کس طرح کون سا خطرناک کھیل کھیلا جانے والا ہے۔ چودھری سکندر کو اپنی بہن پر پورا اعتماد تھا۔ وہ اس کے گھریلو حالات سے دلبرداشتہ ہونے کے بعد ہی یہ سنگین قدم اُٹھانے پر مجبور ہوا تھا۔ اس طرح ایک طرف تو وہ اپنی بہن کو چودھری ظہیر سے نجات دلاتا اور دوسری جانب وہ مقتول کے حصے کی زمین و جائداد پر فاخرہ کے توسط سے قابض ہو جاتا۔ فاخرہ مقتول کے رویوں سے اتنی عاجز آ چکی تھی کہ اس مہلک کھیل میں وہ اپنے بھائی کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگئی۔

جھوری نے جب اقبالِ جرم کرلیا تو چودھری سکندر اور اس کی بہن فاخرہ پر ہاتھ ڈالنے میں مجھے کسی دُشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گزشتہ روز دوپہر کے بعد میں نے مقتول کی لاش چودھری تنویر کے حوالے کردی تھی۔ آج صبح جب چودھری ظہیر کی تدفین ہوگئی تو میں نے ان دونوں خطرناک کرداروں کو گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں پہنچا دیا اور اسی وقت ایک دلچسپ انکشاف ہوا کہ انہوں نے جنڈیالہ والی حویلی میں جو اختلافی بحث شروع کی تھی وہ بھی ان کی پلاننگ کا حصہ تھا تاکہ کسی کو یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وہ اندر سے ملے ہوئے ہیں۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا لیکن فاخرہ کے حوالے سے مسلسل ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ میں نے علیحدگی میں اس سے پوچھ لیا۔

''جب تمہیں اس قاتلانہ سازش کی پوری خبر تھی بلکہ تم اس سازش کا حصہ تھیں تو تم نے چودھری تنویر کو یہ کیوں بتایا کہ جھوری کو مقتول نے لنگر وال بھیجا ہے؟''

''اس نے مجھ سے جھوری کے بارے میں پوچھا تھا اور میں نے ایک امکان ظاہر کیا تھا۔ چودھری تنویر نے اگر میرے کہے کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''مقتول اکثر جھوری کو اپنی بہن کی مدد کے لیے لنگر وال بھیجتا رہتا تھا لہٰذا میں نے یہ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا تھا۔''

''اور جب میں نے تم سے اس بارے میں استفسار کیا تو تم نے بالکل کہانی ہی اُلٹ دی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے یہی بتایا تھا نا کہ جھوری کے لنگر وال جانے والی بات تمہیں چودھری تنویر سے پتا چلی تھی؟''

اس نے گردن جھٹکی اور بے پروائی سے بولی۔ ''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''واقعی..... تمہیں کوئی فائدہ نہیں لیکن مجھے ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری اس چھوٹی سی غلطی نے مجھے کیس حل کرنے میں بہت مدد دی ہے..... میرا بہت فائدہ کیا ہے۔''

اس کے پاس میری بات کے جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

میں نے چودھری ظہیر کو بے دردی سے ٹھکانے لگانے والے تینوں سازشی کرداروں کو ان کے کردار کی ''اہمیت'' کی روشنی میں ''ٹریٹ'' کیا اور ان کے خلاف ایک مضبوط رپورٹ تیار کر کے انہیں سپردِ عدالت کردیا۔ مقتول چاہے اپنی زندگی میں کتنا ہی برا کیوں نہ رہا ہو، اس کے قتل کی سازش میں ملوث کوئی بھی شخص کسی رورعایت کے قابل نہیں تھا، انہیں ان کے کیے کی سزا ضرور ملنا چاہیے تھی۔

جرم کبھی بھی پھلتا پھولتا نہیں۔ چاہے بظاہر ایسا دکھائی بھی دے رہا ہو۔ یہ سب نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔ کارخانہ قدرت میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ جلد یا بدیر مجرم قانون کی گرفت میں ضرور آتا ہے۔ ان تینوں کی بدقسمتی کہ ان کا معاملہ ''بدیر'' نہیں بلکہ ''جلد'' پر آ کر ختم ہوا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شجرِ امید

ملک صفدر حیات

جرم بسا اوقات سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کیا جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کمزور لمحے میں انسان اپنی ہوس یا لالچ سے مغلوب ہو کر جرم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے یہ بھی ایک ایسے مجرم کی کہانی ہے جس نے محض چند سکوں کی خاطر ایک لمحے میں انسانی جان سے کھیلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

زندہ گرد اروں کی سچی کہانی، ملک صفدر حیات کی زبانی سنیے تو کیا کمال ہے

اس روز صبح ہی سے آسمان نے بادل اوڑھ رکھے تھے۔ سورج کی ایک جھلک دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں، دھوپ کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر ہلکی ٹھنڈی ہوا نے موسم کی شدت میں اضافہ کردیا تھا۔ وہ دسمبر کے ابتدائی ایام تھے۔ چک دار دن میں اچھی خاصی سردی ہوتی تھی، کجا یہ کہ آج تو سورج بھی توانائی اور حرارت بہم پہنچانے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زندگی بڑی سست اور بے کیف سی ہوکر رہ گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ یہ سستی اور بے کیفی میری طبیعت کو مکدر کرتی، قدرت نے میرے حرکت میں آنے کا پیغام بھیج دیا۔ اس وقت صبح کے نو، ساڑھے نو بجے ہوں گے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا چند اہم کیسز کی فائلوں کا مطالعہ کررہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے میرے پاس آکر بتایا۔

''ملک صاحب! دریا کے کنارے ایک نوجوان کی لاش پڑی ملی ہے!''

میں فائلز کو ایک طرف ہٹا کر کانسٹیبل کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے بڑی چونکا دینے والی اور سنسنی خیز اطلاع دی تھی لہٰذا میرا حیرت سے اچھل پڑنا لازمی بات تھی۔ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں اس سے پوچھا۔

''طفیل! تم کس بدنصیب نوجوان کی بات کررہے ہو؟''

''جناب! میں تو اس کو نہیں جانتا۔'' کانسٹیبل نے جز بز ہوتے ہوئے کہا'' چاچا یعقوب یہ اطلاع لے کر تھانے آیا ہے۔ وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے!''

''ٹھیک ہے، تم اسی چاچا کو اندر بھیج دو!'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ان دنوں میں قصبہ مراداں والی کے تھانے میں تعینات تھا۔ نظام پور، فقیر کالونی، سلطان آباد، فرید نگر اور جھکے کوال نامی گاؤں دیہات میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ میں اس تھانے میں پچھلے دو سال سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا اور یہاں بسنے والے ہر قابلِ ذکر آدمی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس قصبے پر سال ہا سال سے مراد خاندان کی حکم رانی تھی لہٰذا اس کا نام ہی ''مراداں والی'' پڑ گیا تھا ورنہ میرے سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ ماضی بعید میں اس قصبے کا نام ''جگت پور'' ہوا کرتا تھا۔ مراد سینئر (حسن مراد) نے جگت پور کو مراداں والی میں بدلا پھر حسن مراد، خلیل مراد اور فضل مراد سے ہوتے ہوئے یہاں کی چودھراہٹ اب حبیب مراد کے قبضے میں تھی۔ مراد خاندان بنیادی طور پر زمین دار خاندان تھا اور طاقت ور ہونے کے سبب وہ یہاں کے چودھری کہلاتے تھے۔ مجھے موجودہ چودھری حبیب مراد سے دو تین مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ عام روایتی چودھریوں کی بہ نسبت میں نے حبیب مراد کو ایک مختلف انسان پایا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کانسٹیبل طفیل، چاچا یعقوب کو لے کر میرے کمرے میں آگیا۔ یعقوب ایک چھوٹا کاشت کار تھا۔ اس کے پاس دس ایکڑ زمین تھی لیکن یہ زمین خوش قسمتی سے دریا کے کنارے سے لگی ہوئی تھی لہٰذا وہاں کی مٹی بڑی زرخیز تھی۔ وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہوا تو میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی کانسٹیبل کو باہر جانے کا اشارہ بھی کردیا۔

چاچا یعقوب تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا'' ہاں بھئی چاچا! تم نے صبح ہی صبح کیا دیکھ لیا ہے؟''

چاچا یعقوب کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ عام سی شکل وصورت کا مالک تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! آج بڑی سردی ہے اس لیے کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ جب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں پہنچا تو ایک نوجوان کی لاش کو اپنی زمین پر پڑے دیکھ کر پریشان ہوگیا اور..... پھر میں بھاگتا ہوا سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔''

میں نے چاچا یعقوب سے سوال کیا'' کیا تم اس بد قسمت نوجوان کو جانتے ہو؟''

''نہیں.....!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب دیا'' میرے خیال میں اس کا تعلق ہمارے قصبے سے نہیں ہے۔ اگر وہ یہاں کا رہنے والا ہوتا تو میں اسے دیکھتے ہی پہچان لیتا۔ مجھے لگتا ہے، وہ کوئی پردیسی ہے اور کسی شہر سے آیا ہے!''

یعقوب کے آخری جملے پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا'' چاچا! تم نے کیسے یہ اندازہ قائم کیا کہ وہ پردیسی کسی شہر سے آیا ہے؟''

''اس کے لباس سے جناب!'' اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا'' اس بدنصیب نوجوان نے پتلون قمیص پہنی ہوئی ہے اور اس کی لاش کے قریب ہی ایک بیگ بھی رکھا ہے جیسا کہ، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والوں کے پاس ہوتا ہے!''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا ''تم نے اس اجنبی نوجوان کی لاش یا اس کے سامان کو ہاتھ تو نہیں لگایا؟''

''نہیں جناب..... بالکل نہیں۔'' اس نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

''تھانے کی طرف آتے ہوئے اور کس کس کو اس نوجوان کی لاش کے بارے میں بتایا ہے؟''

''جو بھی راستے میں ملا، اسے بتایا ہے۔'' وہ معصومیت سے بولا'' یعنی..... آپ یوں سمجھیں، تین چار بندوں کو تو میں نے بتایا ہی ہے۔''

''ہوں!'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور سوال کیا'' تم نے اس نوجوان کو ایک نظر دیکھا اور کیسے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ مر چکا ہے؟''

''جناب! اس کی حالت ہی ایسی ہے!'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا'' آپ ایک نظر کیا، آدھی نظر ہی میں اسے مردہ قرار دے دیں گے!''

میں نے چاچا یعقوب سے مزید دو تین سوالات کیے اور جائے وقوعہ پر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے اپنے ساتھ اے ایس آئی گل فراز کو بھی لے لیا تھا۔ مذکورہ دریا تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا یوں سمجھیں کہ مراداں والی کے شمال میں وہ دریا تھا اور جنوب میں ہمارا تھانہ قصبے سے جڑا ہوا تھا۔ لہٰذا تھوڑی دیر کے بعد ہم چاچا یعقوب کے معیت میں گاؤں کے اندر سے گزرتے ہوئے جائے واردات پر پہنچ گئے۔

موضع مراداں والی اور دریا کے درمیان کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور دریا سے ایک کچا راستہ قصبے کی طرف آتا تھا۔ ہم اسی راستے پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ اس اجنبی نوجوان کی کٹی پھٹی لاش چاچا یعقوب کے ایک کھیت میں پڑی تھی اور واقعی اس بدنصیب پر نگاہ پڑتے ہی میرے دل و دماغ نے بہ یک وقت گواہی دی کہ وہ پردیسی موت سے ہم کنار ہو چکا تھا۔

میں مذکورہ نامعلوم نوجوان کی لاش کے قریب بیٹھ کر تجربہ کار نگاہ سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں'' کلہاڑی'' کا لفظ چمکا۔ اس کی زخم زخم لاش بہ زبان خاموشی یہ اعلان کررہی تھی کہ اسے تیز دھار کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس نے خود کو بچانے کی کوشش میں ہاتھوں کو جو حرکت دی وہ اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اور بازو جا بہ جا زخمی تھے اور یہ زخم کوئی معمولی نوعیت کے نہیں تھے۔ یہی حال کندھوں اور پشت کا بھی تھا اور سب سے زیادہ خوف ناک، رونگٹے کھڑے کر دینے والی حالت اس کے چہرے اور سر کی تھی۔ چہرہ لہولہان تھا جبکہ کھوپڑی بھی دو تین مقامات سے بری طرح پھٹی ہوئی تھی۔ اس بدنصیب کا سینہ بھی زخموں سے چور تھا، الغرض وہ زندگی سے بہت دور موت کی وادی میں پہنچ چکا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت نہ ہوئی کہ اسے زندگی کی قید سے آزادی حاصل کیے کم از کم آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔

اس کے بدن پر پائے جانے والے متعدد زخموں کو دیکھ کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا لیکن اس وقت میں اپنے اس احساس کو کوئی نام نہ دے سکا اور لاش کی جامہ تلاشی میں مصروف ہوگیا۔

اس اجنبی مقتول کی عمر پچیس چھبیس کے قریب دکھائی دیتی تھی۔ اس نے سیاہ پتلون پر جامنی چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے اوپر نیلی جیکٹ نظر آرہی تھی جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ پاؤں میں چمڑے کے سیاہ جوتے تھے۔ اس پر اتنی تیز رفتاری سے، بے رحمانہ انداز میں کلہاڑیاں برسائی گئی تھیں کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اس کے جسم کو کاٹنے سے قبل کلہاڑی کے خونی پھل نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے لباس کا قیمہ بنا ڈالا تھا۔ اس وقت مجھے شدید حیرت ہوئی جب اس کی جامہ تلاشی کے نتیجے میں، میرے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ یہی لگتا تھا کہ اسے قتل کرنے سے پہلے یا بعد میں اچھی طرح کھنگال کر جیبوں وغیرہ کو خالی کر دیا گیا تھا۔ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی، اس بدقسمت نوجوان کی لاش کو ایک چادر سے ڈھکا اور اس کے سفری بیگ کے معائنے میں مصروف ہو گیا جو اس کی لاش سے تھوڑے فاصلے پر کھیت ہی میں پڑا تھا۔

مذکورہ بھورے رنگ کا وہ سفری بیگ کھلا ہوا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا، قاتل نے اس کی بھی اچھی طرح تلاشی لی ہو گی۔ میں بیگ میں موجود سامان کا جائزہ لینے لگا۔ دو جوڑے کپڑے، ایک سینڈل، سوہن حلوے کا ڈبا اور چھوٹا موٹا عام استعمال کا سامان دیکھنے کو ملا۔ ان اشیا کے علاوہ ایک فولڈنگ چھتری بھی بیگ میں موجود تھی گویا..... یہاں بھی کوئی ایسی شے میری گرفت میں نہ آسکی جو اس نوجوان کے قتل پر روشنی ڈالتی۔ میں نے بیگ اور اس میں سے برآمد ہونے والی چیزوں کی فہرست بنائی اور اس سامان کو اپنے قبضے میں کر لیا، اس کے بعد میں جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اے ایس آئی گل فراز اس دوران میں گھوم پھر کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے میں لگا رہا۔ موقع پر درجن بھر افراد بھی جمع ہو چکے تھے۔ وہ ان سے بھی نامعلوم شخص کی لاش کے بارے میں مختلف سوالات کر رہا تھا۔ میں جیسے ہی اپنے کام سے فارغ ہوا، گل فراز تیزی سے چلتے ہوئے میرے پاس آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں کوئی سیاہ شے پکڑ رکھی تھی۔

میں نے فوراً اس سیاہ شے کو پہچان لیا۔ وہ ایک چرمی بٹوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، وہ مذکورہ بٹوا میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! یہ مجھے ادھر پڑا ہوا ملا ہے!''

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک جانب اشارہ کر دیا۔ میں نے وہ چرمی بٹوا ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا ''اس کے اندر کیا ہے گل فراز؟''

''دو تصویریں اور ایک کارڈ!'' اے ایس آئی نے گمبھیر لہجے میں بتایا ''یہ بندہ کراچی سے آیا ہے ملک صاحب!''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بٹوے کے اندر سے متذکرہ بالا چیزیں باہر نکالیں اور بہ غور ان کا جائزہ لینے لگا۔

ان دو تصویروں میں ایک تو دو سالہ بچی کی تصویر تھی اور دوسری کسی عورت کی۔ عورت کی عمر اس تصویر کے مطابق تیس کے اریب قریب معلوم ہوتی تھی۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک پُرکشش عورت تھی۔ تصویروں پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے کارڈ کا جائزہ لیا۔ کارڈ پر مقتول کی چھوٹی سی تصویر بھی چسپاں تھی جس سے ثابت ہوتا تھا وہ کارڈ اسی کا ہے۔ کارڈ کے مطابق، اس کا نام غلام عباس جٹ ولد غلام حسین جٹ تھا۔ وہ کارڈ کراچی، صدر کے علاقے میں واقع ایک ہوٹل کا تھا جہاں مقتول غلام عباس کام کرتا تھا۔ اس ہوٹل کا نام ہم ''نیو ہیون'' فرض کر لیتے ہیں۔ اصل نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہو گا۔ اسی کارڈ کی وجہ سے اے ایس آئی نے مجھے اطلاع فراہم کی تھی..... یہ بندہ کراچی سے آیا ہے ملک صاحب!

یہ تو پتا چل گیا تھا کہ مقتول کا نام کیا ہے اور وہ کہاں کام کرتا تھا لیکن کراچی سے وہ کس مقصد کی خاطر موضع مراداں والی پہنچا تھا یہ پتا لگانا باقی تھا۔ اس کی یہاں آمد کا سبب معلوم ہو جاتا تو اس کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا آسان ہو جاتا۔ میں نے موقع پر موجود تمام افراد سے مقتول کے بارے میں پوچھا لیکن کسی نے بھی اسے پہچاننے کا اقرار نہیں کیا۔ وہ سب کے لیے اجنبی تھا۔ میں نے مقتول کے بٹوے میں سے برآمد ہونے والی تصویریں بھی ہر ایک بندے کو دکھائیں کہ شاید وہ ان میں سے کسی کو شناخت کر لیں لیکن اس کوشش کا نتیجہ بھی صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔

اس تفتیش سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مقتول کا موضع مراداں والی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور..... یہ نتیجہ ذہن کو الجھانے والا تھا!

میں نے جائے وقوعہ سے چاروں جانب، پچاس قدم تک آلۂ قتل کی تلاش میں کھیتوں کا چپا چپا بھی دیکھ لیا لیکن اس تلاش میں مجھے بری طرح ناکامی ہوئی۔

مزید ایک گھنٹے تک میں وقوعہ پر موجود افراد سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کرتا رہا لیکن کوئی بھی ایسی کارآمد بات معلوم نہ ہو سکی جو اس قتل کے اسباب اور مقاصد کو واضح کر سکے۔ یہ واردات اپنی ابتدا ہی میں ایک معما بن کر سامنے آئی تھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ کسی طرح کراچی میں واقع اس ہوٹل والوں سے رابطہ کر کے مقتول کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتیں۔

اس زمانے میں ٹیلی فون اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ بہت ہی کم لوگوں کو یہ سہولت میسر تھی لہٰذا سب سے آسان صورت یہی تھی کہ کسی کو کراچی بھیجا جاتا۔ بہ ہر حال یہ تو بعد کی بات تھی، پہلے نامعلوم مقتول کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا سوال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔

موقع کی ضروری کارروائی مکمل ہوگئی تو میں نے تھانے سے دو کانسٹیبلو بلا کر لاش کو سرکاری اسپتال بھجوانے کا بندوبست کردیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کردی کہ لاش کو فی الحال مردہ خانے میں محفوظ کردیا جائے۔ پوسٹ مارٹم کے بارے میں، میں بعد میں بتاؤں گا۔

دراصل، غلام عباس جٹ کے پُراسرار قتل نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا اور میں اس سلسلے میں اپنے علاقے کے ایس پی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے لاش کو سرکاری اسپتال بھجوایا اور خود ایس پی کے آفس پہنچ گیا۔

ایس پی احمد نواز سیال سے کوئی آدھا گھنٹا میری میٹنگ ہوئی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک بندے کو فوری طور پر کراچی روانہ کرنا چاہیے تاکہ وہ مقتول کے بارے میں معلومات حاصل کرسکے اور یہ کہ لاش کے پوسٹ مارٹم کے سلسلے میں کوئی تعطل برتنا ٹھیک نہیں۔ قانونی کارروائی ہر صورت ہونا چاہیے۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا اور ایس پی صاحب کی تائید کے بعد میرا ذہن صاف ہوگیا تھا۔ ویسے ہم دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اس مقتول کا نام اگر واقعی غلام عباس جٹ تھا تو پھر وہ کسی گاؤں دیہات ہی سے تعلق رکھتا تھا اور عین ممکن تھا، وہ ادھر ہی آس پاس کے کسی علاقے کا رہنے والا ہو۔ لہٰذا مجھے اپنی تفتیش کے دائرے کو تھوڑا پھیلانا تھا۔

ایس پی صاحب سے خصوصی ہدایات لے کر میں واپس آگیا۔

جب میں تھانے پہنچا تو شام ہونے والی تھی اور سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ آج دن کا کھانا بھاگ دوڑ میں گول ہوگیا تھا اور اب میں اچھی خاصی بھوک محسوس کررہا تھا۔ موسم سرما میں جسم کو زیادہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا دوسرے موسموں کی بہ نسبت بھوک زیادہ لگتی ہے۔ عام طور پر میں مغرب اور عشا کی نماز کے درمیانی وقفے میں رات کا کھانا کھایا کرتا تھا لیکن اس روز میں نے مغرب سے پہلے ہی کھانا منگوالیا، سوچا یہی تھا کہ کھانے سے فارغ ہوکر میں اپنے کوارٹر میں چلا جاؤں گا۔

میرا ذہن مسلسل اس مقتول میں الجھا ہوا تھا جس کی لاش کو میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھیجا تھا۔ حالات وواقعات یہ ثابت کرتے تھے کہ وہ شخص کراچی سے ایک طویل سفر طے کرکے اس علاقے میں پہنچا تھا لیکن اس کی آمد کا مقصد کیا تھا اور قتل کیوں کیا گیا اس حوالے سے ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا البتہ، یہ طے ہوگیا تھا کہ وہ موضع مرداں والی کا رہنے والا نہیں تھا اور یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

غلام عباس جٹ کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے پہلے میں نے سرکاری فوٹو گرافر کو کہہ کر لاش کی چند تصویریں بنوالی تھیں جو مقتول کی شناخت کے سلسلے میں کافی مددگار ثابت ہوسکتی تھیں۔ ویسے میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ اگلی صبح میں اے ایس آئی گل فراز کو معلومات حاصل کرنے کے لیے کراچی روانہ کردوں گا۔

کھانا آنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی لہٰذا میں مقتول کے سامان کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ بھورے رنگ کے اس بیگ کو میں اپنے ساتھ تھانے لے آیا تھا۔ میں نے بیگ کی زپ کھولی اور ایک مرتبہ پھر گہری نظر سے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے کپڑوں وغیرہ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سوہن حلوے والے ڈبے کا جائزہ لیا اور پھر فولڈنگ چھتری پر پہنچ کر میری نگاہ رک گئی۔ وہ چھتری زپ والے ایک لمبوترے سے کور کے اندر بند تھی۔ میرے جی میں آئی کہ میں اس چھتری کو کھول کر دیکھوں۔

ایسا سوچتے ہی میں نے چھتری کو، زپ کھول کر کور سے باہر نکال لیا پھر بٹن دبا کر اسے کھول دیا۔ وہ پیراشوٹ کپڑے سے بنی ہوئی ایک خوب صورت اور عمدہ چھتری تھی۔ میں نے پھیلی ہوئی چھتری کے اندرونی حصے میں نگاہ ڈالی اور چونک پڑا۔

گنبد نما اندرونی حصے کے زیریں کنارے پر سفید رنگ کا ایک لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ لیبل سفید کپڑے کا ایک چوکور ٹکڑا تھا جسے سلائی کی مدد سے وہاں فکس کیا گیا تھا۔ میں نے مذکورہ لیبل کو اپنی آنکھوں کے قریب کیا اور پڑھنے لگا۔

لیبل پر سب سے اوپر ایک انسانی ہاتھ کا نشان بنا ہوا تھا جس کی مٹھی بند اور دو انگلیاں وکٹری کے انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ نیچے جلی حروف میں ''وکٹری کیپ اینڈ اسٹک ہاؤس'' لکھا ہوا تھا اور سب سے آخر میں نسبتاً خفی حروف میں ''بولٹن مارکیٹ، بندر روڈ۔ کراچی'' کے الفاظ پڑھنے کو مل رہے تھے۔ یعنی مقتول نے وہ فولڈنگ چھتری بولٹن مارکیٹ۔ کراچی کی ایک دکان سے خریدی تھی۔ اس سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مقتول غلام عباس کراچی ہی سے آیا تھا!

مجھے دو تین مرتبہ کار سرکار کے سلسلے میں کراچی جانے کا اتفاق ہوا تھا اور میں نے کراچی کے بہت سے علاقے دیکھ رکھے تھے، بولٹن مارکیٹ ان میں سے ایک تھا..... جہاں پر ایسی کئی دکانیں تھیں جن میں مختلف قسم کی ٹوپیاں، چھڑیاں اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھتریاں فروخت ہوتی تھیں۔'' وکٹری کیپ اینڈ اسٹک ہاؤس'' انہی میں سے کوئی ایک ہوسکتی تھی۔

اے ایس آئی گل فراز نے جائے وقوعہ سے مقتول کا بٹوا تلاش کرلیا تھا جس میں سے ہوٹل کا کارڈ اور دو تصویریں برآمد ہوئی تھیں۔ کارڈ سے ظاہر ہوتا تھا، مقتول صدر کراچی کے علاقے میں واقع ایک ہوٹل میں ملازمت کرتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس پرس کے تمام خانے کھنگھوڑ ڈالے لیکن کوئی نئی شے برآمد نہ ہوسکی۔ میں انہی سوچوں میں گم کھانے کا انتظار کرنے لگا۔

کانٹینبل کھانا لے کر آیا تو میں ہر جانب سے توجہ ہٹا کر اس سے انصاف کرنے لگا۔ اگر دیانت داری اور غیر جانب داری سے دیکھا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس دنیا کے سارے بکھیڑے کھانے کے حصول کی خاطر ہیں۔ پیٹ کا دوزخ اپنی آگ کو روشن رکھنے کے لیے ہر لمحہ خوراک کا ایندھن مانگتا ہے اور اس کی طلب پوری کرنے کے لیے انسان ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے پر مجبور ہوجاتا ہے.....تو ثابت ہوا، انسان کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت کھانا ہے لہٰذا کھانے کے تقدس اور احترام کا یہ تقاضا ہے کہ جب یہ سامنے آئے تو دنیا کے ہر مسئلے اور سوچ کو ذہن سے جھٹک کر بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ اس کا ''استقبال'' کرنا چاہیے۔

ان لمحات میں، میں بھی اسی فارمولے پر عمل کررہا تھا!

☆☆☆

اگلی صبح قدرے کھلی ہوئی اور روشن تھی۔ آسمان پر بادل تو نظر آرہے تھے لیکن ان کا قبضہ بہ ہر حال، باقی نہیں رہا تھا، سورج چاچو نے کوشش کرکے اپنی روشنی اور حرارت کو زمین تک پہنچا دیا تھا۔ موسم اگرچہ اب بھی ٹھنڈا ہی تھا تاہم اس کی شدت ناقابل برداشت سے قابل برداشت میں بدل چکی تھی۔ اس ''نا'' کا بٹنا اچھا شگون نظر آتا تھا۔ اگر ''غلام عباس مرڈر کیس'' کے مختلف گوشوں سے بھی یہ ''نا'' ہٹ جاتا تو معاملہ بن سکتا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اے ایس آئی گل فراز کو طلب کرلیا۔

ایک منٹ کے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا ''جی حکم ملک صاحب!''

''کیا تم کبھی کراچی گئے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور جواب دیا ''جی ملک صاحب! میں صرف ایک مرتبہ کراچی گیا ہوں، وہ بھی ایک شادی کے سلسلے میں مجبوراً جانا پڑا تھا۔''

''پہلے تم مجبوراً گئے تھے، اب ضرورتاً جاؤ'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میں یہ چاہتا ہوں، تم آج ہی کسی ٹرین سے کراچی روانہ ہوجاؤ اور سیدھے صدر والے ہوٹل پہنچ کر مقتول غلام عباس کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور اس کے علاوہ تمہیں بولٹن مارکیٹ بھی جانا ہوگا!''

''بولٹن مارکیٹ؟'' اس نے چونک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے اسے فولڈنگ چھتری اور ''وکٹری کیپ اینڈ اسٹک ہاؤس'' کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا اور پوچھا ''تمہیں کراچی میں کسی قسم کی دشواری تو نہیں ہوگی؟''

''نہیں جناب! دشواری کیسی؟'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا ''ادھر ڈرگ کالونی میں میری خالہ رہتی ہے۔ اس کے بیٹے کی شادی میں مجھے پہلے کراچی جانا پڑا تھا۔ میں خالہ کے گھر سے کسی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ ان لوگوں نے پورا کراچی دیکھ رکھا ہے!''

''چلو، یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''پردیس میں تمہارے قیام وطعام کا مسئلہ تو حل ہوگیا لیکن اس سلسلے میں تم قانونی ضرورتوں کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کروگے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''آپ فکر نہ کریں، آپ کو یا محکمے کو میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں کراچی پہنچتے ہی سب سے پہلے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں حاضری لگواؤں گا اور انہیں اپنی آمد کی غرض وغایت سے آگاہ کروں گا۔ اس کے بعد میں متعلقہ تھانے کا رخ کروں گا۔ اس پروگرام کو پورا کرنے کے بعد ہی میں صدر میں واقع ''نیو ہیون'' ہوٹل کی طرف جاؤں گا۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔''

گل فراز ایک ذہین اور سمجھ دار پولیس اہلکار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ''نیو ہیون'' ہوٹل اور وکٹری کیپ اینڈ اسٹک ہاؤس'' سے مفید معلومات حاصل کرکے واپس آئے گا۔ میں نے ضروری ہدایات کے ساتھ اسے تھانے سے رخصت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا۔ اسے آج ہی کی تاریخ میں کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔

واضح رہے کہ ''نیو ہیون'' ایک فرضی نام ہے۔ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ہوٹل کا اصلی نام ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اسے محکمہ جاتی یا ڈائجسٹی مجبوری سمجھ لیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں تفتیشی مہم میں مصروف ہو گیا۔ میں نے حوال دار حیدر شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مقتول غلام عباس کی لاش جن کھیتوں میں پڑی ملی تھی وہ زمین چاچا یعقوب کی ملکیت تھی۔ اس کے بعد مشتاق گھسن نامی ایک زمین دار کی زمین تھی۔ مشتاق گھسن، چاچا یعقوب کی طرح ایک چھوٹا زمین دار تھا۔ کچے راستے کی دوسری طرف تا حدِ نگاہ لہلہاتے سرسبز کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور یہ وسیع و عریض اراضی چودھری حبیب مراد کی تھی جو ایک طرح سے موضع مراداں والی کا حاکم بھی تھا۔

دراصل دریا اور دریا کے ساتھ لگی ہوئی ساری زمین مراداں والی کے عقب میں پائی جاتی تھی۔ مراداں والی کی ''پیشانی جنوبی سمت میں تھی۔ گاؤں کے سامنے سے ایک نیم پختہ سڑک شرقاً غرباً گزرتی تھی اور گاؤں میں آمد و رفت عموماً اسی طرف سے ہوتی تھی۔ مذکورہ دریا گاؤں کے پچھواڑے واقع تھا اور دریا کی دوسری جانب بھی کھیتوں کا سلسلہ دراز تھا لیکن یہ کھیت موضع ''فرید نگر'' سے متعلق تھے جو کھیتوں کے اختتام پر موجود تھا۔ دونوں گاؤں کے درمیان بہنے والے دریا پر پل نہیں تھا لہٰذا دریا کے اِدھر اور اُدھر جانے کے لیے کشتی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ دریا کی دونوں جانب کشتی گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ انہیں باقاعدہ کشتی گھاٹ تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن بہ ہر حال، لوگوں کے، دریا کے آر پار جانے کا کام تسلی بخش انداز میں چل رہا تھا۔

مقتول غلام عباس کی لاش کو دیکھ کر مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ جب لاش دریافت ہوئی تو آٹھ دس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا، اسے رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اب سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ وقوعہ کے روز رات کے ابتدائی حصے میں وہاں کیا کر رہا تھا؟

یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ وہ موضع مراداں والی کا رہنے والا نہیں تھا۔ یہاں بسنے والے لوگوں میں سے کوئی اس کی شناخت نہیں کر سکا تھا۔ اس گمبھیر صورتِ حالات میں یہی سوچا جا سکتا تھا کہ کراچی سے آنے والا غلام عباس کسی خاص مقصد سے وہاں پہنچا تھا، بہ الفاظِ دیگر..... اس کی موت کھینچ کر اسے وہاں تک لائی تھی۔ مجھے پہلی فرصت میں یہ پتا لگانا تھا کہ وہ مراداں والی میں سے گزر کر چاچا یعقوب کے کھیتوں میں پہنچا تھا یا دریا کے اس پار سے اِدھر آیا تھا کیونکہ یہ عین ممکن تھا، وہ فرید آباد سے اس طرف آیا ہو!

میں نے حوال دار سے کہا ''حیدر شاہ! دریا کی دونوں جانب کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ مقتول کو ان کھیتوں میں کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یا تو دریا عبور کر کے فرید نگر کی طرف جانا چاہتا تھا اور یا پھر فرید نگر سے اس طرف آیا تھا۔ ہمیں ان دو امکانات میں سے ایک درست امکان تک پہنچنا ہے.....!''

میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اور ان دونوں امکانات میں دریا قدر مشترک ہے۔ یا تو مقتول دریا عبور کر کے اِدھر آیا تھا اور یا پھر وہ دریا عبور کر کے اس طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا!''

''ملک صاحب! آپ عین منطقی انداز میں سوچ رہے ہیں۔'' حوال دار نے کہا ''آپ نے مقتول کی آمد و شد کا جو تجزیہ کیا ہے اس کی روشنی میں میرا ذہن کشتی کی طرف جا رہا ہے۔ اگر وہ فرید نگر سے اِدھر آیا تھا تو لازماً کشتی میں بیٹھ کر اس نے دریا عبور کیا ہو گا اور اگر وہ فرید نگر کی طرف جانا چاہتا تھا تو بھی اسے کشتی والے ہی سے رابطہ کرنا تھا!''

''بالکل درست!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''اگر ہم کشتی والے کو کریدیں تو اس واردات کے سلسلے میں اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔''

حوال دار حیدر شاہ نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور ہم دریا کے کنارے کی سمت بڑھ گئے۔

اس دریا کے اِدھر اُدھر آنے جانے کے لیے جو کشتی استعمال ہوتی تھی اس کا مالک ایک غریب مچھیرا تھا۔ رمضانی نامی وہ مچھیرا اپنے بیٹے کی مدد سے دریا کے دونوں کناروں کے بیچ کشتی کھیتا رہتا تھا۔ مراداں والی اور فرید نگر میں لوگوں کی آمد و رفت اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اسے کشتی بھر سواریاں مل جاتی ہوں، بس دو چار بندے اِدھر سے اور اسی طرح چار چھ بندے اُدھر سے کشتی میں بیٹھ جاتے تھے۔ وہ ان سے معمولی سا کرایہ وصول کرتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر پہنچا دیتا۔ دریا میں سفر کے دوران ہی میں وہ ماہی گیری بھی جاری رکھتا تھا۔ یہ ماہی گیری اس کی اضافی آمدنی کا سبب تھی۔ رمضانی کی رہائش دریا کے اس پار کنارے کے ساتھ (فرید نگر کی حدود میں) واقع تھی۔ وہ اپنی بیوی جیواں اور بیٹے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قمرو کے ساتھ ایک چھوٹے سے کچے مکان میں رہتا تھا۔

ہم دریا کے کنارے بنے گھاٹ نما مقام پر پہنچے تو کشتی ہمیں نظر آ گئی۔ کشتی کا رخ ہماری جانب تھا اور وہ دریا کے عین وسط میں رواں دواں تھی۔ اس دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، اسے پندرہ سے بیس منٹ کے اندر اس کنارے سے آ لگنا چاہیے تھا۔

حوال دار نے کہا ''ملک صاحب! یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ کشتی ہماری طرف آ رہی ہے۔ اگر یہ اُدھر جا رہی ہوتی تو ہمیں لگ بھگ ادھر کھڑے رہ کر انتظار کرنا ہوتا!''

''اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت یا حکمت چھپی ہوتی ہے شاہ جی!'' میں نے رمضانی کی کشتی پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''انسان اسے نہ سمجھے یا سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اس میں قدرت کا کیا قصور؟''

''قصور تو جی انسان ہی کا ہوتا ہے!'' حیدر شاہ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''اور..... اسے قصور کی سزا بھی ضرور ملتی ہے!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

حیدر شاہ نے مزید کچھ نہیں کہا اور میری تقلید میں کشتی کو دیکھنے لگا۔

رمضانی کی کشتی اب اتنی قریب آ چکی تھی کہ اس پر سوار افراد کو بہ آسانی شمار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے رمضانی اور اس کے پیٹے قمرو کے علاوہ تین مسافروں کو کشتی میں موجود پایا۔ کشتی جیسے جیسے کنارے کی سمت بڑھ رہی تھی، اس کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد کشتی اپنے گھاٹ پر آ لگی۔

کشتی پر سوار تین مسافروں میں دو مرد اور ایک عورت شامل تھے۔ وہ مسافر کنارے پر اترے اور ہمیں سلام کر کے مراداں والی کی طرف جانے والے کچے راستے پر ہو لیے۔ میں اور حوال دار حیدر شاہ اس وقت یونی فارم میں ملبوس تھے اسی لیے ان مسافروں نے بڑے سہمے ہوئے انداز میں ہمیں سلام کیا تھا۔ پولیس کی وردی کا بھی ایک اپنا ہی رعب داب ہوتا ہے۔ مجرم تو رہے ایک طرف، سیدھے سادے شریف شہری بھی اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

ان مسافروں کے رخصت ہوتے ہی میں رمضانی کی جانب بڑھ گیا۔

وہ اس وقت گھاٹ پر لگی اپنی کشتی کے ساتھ مصروف تھا۔ ہم پر نگاہ پڑی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''سرکار! آپ دریا کے اس پار جائیں گے؟''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور ادھر بھی جائیں گے، میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے گول مول جواب دیا'' لیکن کوشش یہی ہے، مراداں والی کی حدود میں ہی کام ہو جائے!''

''کام.....!'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''ہاں رمضانی! مجھے تم سے ایک چھوٹا سا کام ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سرکار! مجھ سے آپ کو کیا کام پڑ گیا، حکم کریں!'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

حوال دار نے قدرے سخت لہجے میں اسے بتایا'' ملک صاحب تم سے اس شخص کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہیں جس کی لاش کل صبح اِدھر کھیتوں میں پڑی ملی ہے!'' بات ختم کرتے ہی حیدر شاہ نے چاچا یعقوب کے کھیتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

''ہاں، میں نے بھی اس نوجوان کے بارے میں سنا ہے!'' وہ متاسفانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' میں اس کی لاش کو تو نہیں دیکھ سکا لیکن لوگ بتاتے ہیں، اس بد نصیب کا نام غلام عباس تھا اور وہ کراچی سے یہاں پہنچا تھا۔ کسی ظالم نے بڑی بے دردی سے کلہاڑی کے وار کر کے اسے موت کے منہ میں پھینک دیا۔ پتا نہیں یہ اجنبی کون تھا اور کس نے اسے قتل کیا ہے!''

''تم تو مقتول کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے ہو رمضانی!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''اپنی بات کے اختتام پر تم نے جو دو اہم سوالات اٹھائے ہیں وہ میرے ذہن میں بھی پچھلے تین گھنٹے سے ہل چل مچا رہے ہیں..... مقتول مراداں والی کس لیے آیا تھا؟ اسے کس نے قتل کیا اور کیوں؟'' میں لمحے بھر کو تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور اس کھوج کے سلسلے میں تم میری مدد کرو گے رمضانی!''

''میں ..... میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں مائی باپ!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا'' میں تو اس بدنصیب نوجوان کو جانتا تک نہیں!''

''ایک تم ہی کیا، مراداں والی میں تو کوئی بھی اسے نہیں جانتا'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا'' یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ مراداں والی یا آس پاس کے کسی گاؤں کا باشندہ نہیں تھا۔''

''پھر .....!'' وہ متذبذب انداز میں میری طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتے ہوئے بولا ''میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں تھانے دار صاحب؟''

میں چند لمحات تک اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے ذہن میں یادوں میں کوئی چھل فریب نہیں تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو رمضانی! ایک محتاط اندازے کے مطابق، مقتول غلام عباس کو آٹھ دسمبر کی رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور جس مقام پر، نو دسمبر کی صبح اس کی لاش دریافت ہوئی وہ دریا کے انتہائی قریب ہے۔ مقتول اس علاقے کا رہنے والا نہیں لہٰذا یہی سوچا جاسکتا ہے کہ یا تو وہ دریا پار کر کے فرید نگر کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور یا پھر پار کر کے فرید نگر کی جانب سے ادھر پہنچا تھا اور..... اس دریا کو عبور کرنے کا واحد ذریعہ تمہاری کشتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میں نے پوچھا۔

''تم صرف مجھے اتنا بتاؤ گے کہ آیا وہ تمہاری کشتی پر سوار ہو کر فرید نگر سے مراداں والی پہنچا تھا یا اِدھر سے اُدھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا؟''

''جناب! ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہیں ہوسکتی۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا ''میں نے پرسوں (آٹھ دسمبر کو) پورا دن اس نوجوان کی شکل دیکھی اور نہ ہی وہ میری کشتی میں بیٹھا تھا۔ مجھے تو اس کے بارے میں کل (نو دسمبر کو) پہلی مرتبہ پتا چلا ہے۔ پھر آپ اس کے قتل کا جو وقت بتا رہے ہیں نا.....!''

وہ سانس درست کرنے کے لیے لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''اس وقت تو میری کشتی میں سواری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جناب! میں روزانہ صبح نو، ساڑھے نو بجے اپنے کام کا آغاز کرتا ہوں اور مغرب کی اذان سے پہلے کام ختم کردیتا ہوں۔ پرسوں بھی سورج غروب ہونے سے پہلے ہی میں نے کشتی کو کنارے پر باندھ دیا تھا۔ آج کل ویسے بھی ساڑھے پانچ بجے تک مغرب کی اذان ہوجاتی ہے۔ اس شخص کا میری کشتی میں سوار ہونے.....کا امکان ہی نہیں بنتا جناب!''

رمضانی ایک معقول بات کررہا تھا لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ مقتول غلام عباس سورج غروب ہونے کے بعد ہی وہاں پہنچا ہو! میں اس کیس کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا لہٰذا ذرا گھما کر اس سے پوچھ لیا۔

''رمضانی! یہ ٹھیک ہے، تم اس اجنبی مقتول کی شکل نہیں دیکھ سکے لیکن لوگوں کی زبانی اس کا حلیہ تم تک ضرور پہنچا ہوگا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، پرسوں یعنی آٹھ دسمبر کے دن کسی وقت وہ تمہاری کشتی میں بیٹھ کر اِدھر یا اُدھر آیا گیا تھا؟''

''جناب! جب آپ نے مقتول کے حوالے سے مجھ سے پوچھنا شروع کیا تھا تو میرے ذہن میں یہ آیا تھا کہ آپ ایسا سوال ضرور کریں گے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''لیکن یقین کریں، اس روز وہ اجنبی مقتول کسی بھی وقت میری کشتی میں سوار نہیں ہوا تھا۔''

''ہوں.....'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر خود کلامی والے انداز میں کہا ''اس کا مطلب ہے، وہ اندھیرا ہونے کے بعد ہی مراداں والی پہنچا تھا اور دریا کی طرف جارہا تھا کہ کسی نے اسے قتل کردیا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے، اس کا جانی دشمن پہلے سے گھات لگائے اِدھر بیٹھا تھا۔ اسے پکا یقین تھا کہ کراچی سے آنے والا غلام عباس، مراداں والی میں داخل ہونے کے بعد سیدھا دریا کی طرف جائے گا.....!''

''حالات وواقعات سے تو یہی ظاہر ہورہا ہے جناب!'' رمضانی نے خیال آرائی کی۔

میں نے مزید تین چار سوالات میں رمضانی سے آٹھ دسمبر کی مکمل تفصیل لے لی کہ اس روز اس کی کشتی میں بیٹھ کر کون کون فرید نگر سے مراداں والی سے فرید نگر گیا تھا! وہ ایک طویل عرصے سے اس دریا میں کشتی بانی اور ماہی گیری کررہا تھا اور ان دونوں گاؤں کے تقریباً سبھی افراد سے واقف تھا لہٰذا اس نے مجھے میری مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مقتول غلام عباس نے اس کی کشتی میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

ہم رمضانی کو فارغ کرکے واپسی کے لیے کچے راستے کی طرف بڑھے تو حیدر شاہ نے کہا ''ملک صاحب! یہ تو ہو نہیں سکتا کہ غلام عباس خوامخواہ ہی منہ اٹھا کر کراچی سے مراداں والی چلا آیا ہو۔ یقیناً وہ یہاں کسی کام سے، کسی سے ملنے ہی آیا ہوگا لیکن مراداں والی کے وسنیک اس کو پہچاننے سے انکاری ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مراداں والی نہیں، بلکہ اس سے آگے کہیں جانا چاہتا تھا اور اس کا دریا کی سمت بڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فرید نگر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرا خیال ہے.....!'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میرے خیال میں اگر ہم اپنی تفتیش کے دائرے کو تھوڑا وسیع کریں تو کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے..... میرا اشارہ فرید نگر کی جانب ہے جناب!''

''شاہ جی! میں آپ کا اشارہ بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا'' فرید نگر ہی نہیں، میرے ذہن میں فقیر کالونی، بھکے وال اور سلطان آباد بھی ہیں۔ میں ان چاروں گاؤں کی جانب اپنے بندے دوڑانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور انشاءاللہ! تھانے پہنچ کر میں سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔ مجھے امید ہے، صفدر علی نے اپنا کام مکمل کرلیا ہوگا!''

''صفدر علی.....؟'' حیدر شاہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

صفدر علی، سرکاری فوٹو گرافر کا نام تھا۔ کل مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے سے پہلے میں نے صفدر علی کو بلا کر لاش کے چہرے کے کلوز اپس بنوالیے تھے اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ آج مجھے ان تصاویر کے پرنٹس فراہم کردے گا اور..... مجھے یقین تھا، جب ہم تھانے پہنچیں گے تو صفدر علی اپنی فوٹو گرافیائی کارکردگی کے ساتھ ہمارا انتظار کررہا ہوگا!

میں نے حوالدار حیدر شاہ کو صفدر علی کے فرائض کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ اس کی گردن کی اثباتی جنبش سے میری بات کی تائید ہوتی تھی۔

ہم نے تھانے میں قدم رکھا تو میرا یقین صد فی صد درست ثابت ہوا۔ صفدر علی اپنے کیمرے اور اس کیمرے کی کارکردگی کے ساتھ تھانے میں موجود تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں نے ایسا کام کیا ہے کہ آپ کا دل خوش ہوجائے گا۔''

اتنا کہہ کر وہ اپنے بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں منتظر دل چسپی سے اس کے ہاتھوں کی حرکات کا جائزہ لینے لگا۔ یہ سمجھنے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ بیگ میں سے مقتول غلام عباس کی تصاویر برآمد کرنے والا تھا۔

چند لمحات کے بعد میرا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا اور صفدر علی ایک سفید لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! میں نے مقتول کے چہرے کے تین کلوز اپ لیے تھے لیکن ایک کا رزلٹ ٹھیک نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے پرنٹ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ باقی دونوں کلوز اپس کی چار چار کاپیاں بنا ڈالی ہیں۔ آپ دیکھیں..... اور میری محنت کی داد دیں!''

موقع اور وقت کی مناسبت سے، الفاظ اور اشیا کا مفہوم اور تاثر بالکل بدل کر رہ جاتا ہے۔ اگر صفدر علی کی یہ فوٹو گرافی کسی شادی یا سالگرہ یا عقیقے کی عکاسی ہوتی تو میں اس کی بہترین ماہرانہ کارکردگی پر اش اش کر اٹھتا۔ اس نے واقعی عمدہ کلوز اپس بنائے تھے لیکن وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کی محنت کو سراہتا یا اس کے فن کی داد دیتا۔ وہ ایک ایسے شخص کی لاش کی کوریج تھی جو گزشتہ دو روز سے میرے اور مرادا ں والی کے لیے ایک سنسنی خیز معما بنا ہوا تھا۔

میں نے تمام تصاویر کو بہ غور دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے صرف اتنا کہا'' صفدر علی! وقت گزرنے کے ساتھ تمہارا فن نکھرتا جارہا ہے!''

پتا نہیں، اسے میرا تعریف کرنے کا یہ مبہم انداز پسند آیا یا نہیں۔ وہ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھا پھر اجازت لے کر رخصت ہوگیا۔ میں ان حالات میں اس کے فن کو خراج تحسین پیش نہیں کرسکتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے حوالدار حیدر شاہ کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ وہ آیا تو میں نے پوچھا۔'' تمہارے تھانے میں اس وقت کتنی نفری ہے؟''

''جناب! اچھے خاصے لوگ موجود ہیں۔'' اس نے جواب دیا'' آپ حکم کریں!''

''مجھے صرف چھ اہل کاروں کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا'' جن کے ایک دن تھانے میں نہ ہونے سے کسی کام میں کوئی تعطل پیدا نہ ہو!''

''ہوجائے گا ملک صاحب!'' وہ تسلی آمیز انداز میں بولا ''میں چھ ہوشیار قسم کے کانسٹیبلز کا انتخاب کرکے آپ کے پاس حاضر کرتا ہوں۔''

''میرے پاس حاضر کرنے کی ضرورت نہیں شاہ جی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' میں آپ کو بریف کردیتا ہوں۔ ان چھ کانسٹیبلز سے کام آپ لیں گے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! جو آپ کا حکم!'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

آئندہ دس منٹ کے اندر میں نے اسے وضاحت سے سمجھا دیا کہ وہ مذکورہ چھ کانسٹیبلز کو دو دو کانسٹیبلز کی تین ٹیمیں تشکیل دے گا۔ ہر ٹیم کے پاس مقتول کی دو تصویریں ہوں گی۔ ان میں سے ایک ٹیم فرید نگر، دوسری ٹیم فقیر کالونی اور تیسری ٹیم بھکے وال مقتول کے بارے میں معلومات حاصل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے جائے گی اور ان تینوں ٹیموں کو ابھی.....اسی وقت تھانے سے روانہ ہونا ہوگا۔ وہ مقتول کی تصویریں لوگوں کو دکھا کر اس کے بارے میں پوچھیں گے اور جتنی بھی جلدی ممکن ہوں، واپس آ کر مجھے رپورٹ دیں گے۔ ٹھیک ہے؟''

''بالکل ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''ابھی دوپہر کا وقت ہے۔ مجھے امید ہے، یہ لوگ آج ہی کی تاریخ میں واپس لوٹ آئیں گے اور وہ بھی کسی حوصلہ افزا رپورٹ کے ساتھ!''

میں نے حوالدار کو دو تصاویر کے تین سیٹ دے کر اپنے کمرے سے رخصت کر دیا اور خود اس گمبھیر کیس کے نشیب و فراز پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد حوالدار میرے پاس آیا اور اس نے یہ اطلاع دی۔

''ملک صاحب! میں نے تینوں ٹیموں کو ان کی منزل کی طرف بھیج دیا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا ''یہ آپ نے بہت نیک کام کیا ہے شاہ جی!''

وہ متاملانہ انداز میں بولا ''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ملک صاحب؟''

''کون سی بات شاہ جی!'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا ''آپ نے فقیر کالونی، فرید نگر اور بھکے وال کی طرف تو بندے دوڑائے ہیں لیکن جنوب میں واقع سلطان آباد کو نظر انداز کر دیا ہے؟''

''نہیں، میں نے سلطان آباد کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''سلطان آباد میری یادداشت میں محفوظ ہے۔''

''پھر آپ نے اس طرف کسی کو کیوں نہیں بھیجا؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اِدھر میں خود جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا۔

''اوہ.....!'' حوالدار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

میں نے مزید کہا ''میں پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ہی میں سلطان آباد کی طرف روانہ ہو سکوں گا۔''

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلانے لگا۔

سلطان آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو موضع مراداں والی کے جنوب میں لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ مراداں والی سے ایک کچا راستہ سیدھا سلطان آباد کی طرف جاتا تھا۔

میں حوالدار کے ساتھ بیٹھا غلام عباس کے مرڈر پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا کہ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی۔ میں نے فوراً اس رپورٹ کو کھول کر پڑھا۔ وہ ایک اہم سیدھی سادی اور مختصر سی رپورٹ تھی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی پیچیدگی یا ٹیکنیکل پرابلم نہیں تھی۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق، مقتول غلام عباس کی موت آٹھ دسمبر کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور اس کی موت کا سبب دماغ میں لگنے والی کلہاڑی کی خطرناک ضربات تھیں، اس کے بدن پر کل سینتیس زخم شمار کیے گئے تھے جو دو مختلف کلہاڑیوں کے واروں سے آئے تھے اور ان میں سے سب سے زیادہ مہلک وار سر کی چوٹوں کے حوالے سے تھے جو مقتول کے لیے جان لیوا ثابت ہوئے تھے۔ وہ ان سنگین زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی جان بحق ہو گیا تھا۔

اس رپورٹ میں چونکا دینے والی اور اہم بات صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ مقتول غلام عباس دو کلہاڑی بردار حملہ آوروں کا نشانہ بنا تھا، یعنی اگر قاتلوں کی فہرست مرتب کی جاتی تو اس میں دو افراد کا نام شامل ہوتا۔ یہ ایک ہل چل مچا دینے والا انکشاف تھا۔

میں نے موقع پر سے ملنے والے، مقتول کے سامان کا کئی مرتبہ جائزہ لیا تھا۔ اس میں کوئی بھی قیمتی شے شامل نہیں تھی۔ بٹوا بھی خالی تھا، اس میں سے ایک روپیا بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ غلام عباس کا قتل کہیں راہ زنی کی کوئی واردات تو نہیں.....اسے لوٹنے کے بعد قتل کر دیا گیا ہو!

اپنی اس سوچ میں مجھے زیادہ توانائی محسوس نہیں ہوئی لیکن بہرحال، یہ ایک قوی امکان تھا جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا پیش آنا ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ رات تک وہ تینوں پولیس ٹیمیں واپس لوٹ آئیں جنہیں میں نے مقتول کی شناخت کے سلسلے میں فقیر کالونی، فرید نگر اور بھکے وال روانہ کیا تھا۔ میں نے باری باری، ایک ایک پارٹی کو اپنے پاس بلا کر اس سے رپورٹ لی۔ ان سب کا جواب یک ساں تھا.....مقتول غلام عباس ان تینوں گاؤں میں سے کہیں کا بھی رہنے والا نہیں تھا اور وہاں کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ تینوں ٹیمیں اس کی شناخت میں ناکام رہی تھیں۔

یہ ایک الجھی ہوئی اور گمبھیر صورتِ حال تھی!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگلی صبح سلطان آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ جب تک اے ایس آئی کراچی سے واپس نہ آتا، یہاں کے معاملات کو نمٹانا ضروری تھا تاکہ کیس کی کوئی واضح صورت نکل کر سامنے آسکے۔ اس کے بعد ہی بھرپور کارروائی ممکن تھی۔ اس رات میں زیادہ دیر تک تھانے میں نہیں بیٹھا اور اندھیرا پھیلتے ہی میں اپنے کوارٹر میں چلا گیا جو تھانے کی حدود ہی میں عقبی جانب واقع تھا۔

☆☆☆

سلطان آباد میرے تھانے سے جنوبی سمت میں واقع تھا اور موضع مراداں والی سے اس کا فاصلہ لگ بھگ چار میل رہا ہوگا۔ آئندہ روز میں نے کانسٹیبل طفیل کو اپنے ساتھ لیا اور سلطان آباد کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ زمانے نے تھوڑا آگے کو سفر کیا تھا اور ہم لوگ آمدورفت کے لیے گھوڑوں سے اتر کر سائیکلوں پر سوار ہوگئے تھے۔ گھوڑے کی پیٹھ اور سائیکل کی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرنے کا الگ الگ مزہ ہے، یہ الگ بات کہ دونوں سواریوں میں راحت اور مشقت کے معیارات جدا جدا ہیں۔ ہم اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہو کر سلطان آباد پہنچ گئے۔

گاؤں میں داخل ہونے لگے تو کانسٹیبل نے مجھ سے پوچھا ''ملک صاحب! سلطان آباد چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ہم گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے میں اپنا کام نمٹالیں گے۔ آپ نے اس کام کے لیے اپنے ذہن میں کوئی طریقہ تو سوچ رکھا ہوگا؟''

''بالکل!'' میں نے جواباً قطعی لہجے میں کہا ''میرے ذہن میں نہایت ہی شان دار منصوبہ ہے اور میں اسی منصوبے پر عمل کروں گا اور..... میرا خیال ہے، گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا تم زیادہ بتا رہے ہو۔ میرے اندازے کے مطابق، یہ آدھے گھنٹے سے زیادہ کا کام نہیں!''

''واقعی..... پھر تو آپ کا یہ منصوبہ بہت ہی شان دار ہوگا!'' کانسٹیبل نے تعریفی انداز میں کہا ''اس کے بارے میں مجھے بھی تو کچھ بتائیں؟''

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ''ہم اس وقت سیدھے چودھری ناظم کی حویلی میں جا رہے ہیں..... باقی جو بھی ہوگا، وہ تم وہیں جا کر دیکھ لینا!''

اس کے بعد کانسٹیبل نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

پانچ منٹ کے بعد ہم حویلی میں پہنچ گئے۔ موضع سلطان آباد پچاس سے ساٹھ گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر چودھری ناظم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ ناظم سے میری اچھی یاد اللہ تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ گھر جا کر دروازہ کھٹکھٹانے سے بہتر ہے کہ میں ناظم کی حویلی کا رخ کروں۔ وہ اپنے گاؤں میں بسنے والے ہر بندے سے بہ خوبی واقف تھا لہٰذا اس کے پاس حویلی میں بیٹھے بیٹھے میرا کام ہو جاتا۔

چودھری ناظم نے حویلی کے گیٹ پر آکر بہ نفس نفیس ہمارا استقبال کیا اور بڑی محبت سے ہمیں حویلی کے اندر لے گیا۔ جب ہم اس کی سجی سجائی بیٹھک میں پہنچے تو وہاں پہلے سے ایک آدمی کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگالیا کہ چودھری ناظم ہمارے خیر مقدم کے لیے یہیں سے اٹھ کر گیا تھا، ہماری آمد سے قبل وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

چودھری نے اس شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ''یہ ملک صفدر حیات ہیں..... ہمارے علاقے کے تھانے دار..... اور ملک صاحب! یہ چودھری ظفر ہے۔ بھکے وال کے چودھری مطلوب حسین کا بھتیجا۔ یہ ادھر قصور میں رہتا ہے۔ پچھلے دو دن سے بھکے وال آیا ہوا ہے، آج مجھ سے ملنے یہاں چلا آیا۔''

''اچھا اچھا..... تو اس جوان کا تعلق'' میرا سوہنا شہر قصور'' سے ہے!'' میں نے چودھری ظفر سے گرم جوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا اشارہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' چودھری ناظم نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سمجھیں گے کیسے نہیں چودھری صاحب!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''شہر قصور کی تین چار چیزیں ہی تو مشہور ہیں..... قصوری میتھی، قصوری فالودہ، قصوری پتنگ ڈور اور وہ شخصیت جس نے ''میرا سوہنا شہر قصور'' گایا ہے..... یعنی ملکۂ ترنم!''

میری اس وضاحت پر چودھری ناظم اور چودھری ظفر نے فراخ دلی سے قہقہہ لگایا پھر چودھری ناظم ہماری خاطر مدارات کے لیے اپنے ملازم کو احکام جاری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بے تکلفی سے گفتگو میں مصروف ہوگئے۔

چودھری ناظم نے مجھ سے پوچھا ''ملک صاحب! سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ آج میری یاد کیسے آگئی مجھے امید ہے، کسی سرکاری کام ہی سے ادھر آنا ہوا ہوگا؟''

''آپ کی امید خاصی تن درست ہے چودھری صاحب!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل، میں ایک شخص کا سراغ لگانے کے لیے آیا ہوں۔ پچھلے دو تین روز سے اس معاملے نے مجھے چکرا رکھا ہے!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ دونوں گہری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ ہو گئے۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں صورتِ حال کی وضاحت کی پھر اپنی آمد کی غرض و غایت سے چودھری ناظم کو آگاہ کیا۔ میرے خاموش ہونے پر چودھری ظفر نے کہا۔

''ملک صاحب! یہ وہی معاملہ تو نہیں جس کے لیے کل آپ کے آدمی بھکے وال پہنچے ہوئے تھے؟''

''بالکل، یہ وہی کیس ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا ''صرف بھکے وال ہی نہیں، میں نے فقیر کالونی اور فرید نگر کی طرف بھی اپنے بندے دوڑائے تھے لیکن وہ گزشتہ رات اس تلاش میں ناکام ہو کر واپس آ گئے۔ غلام عباس نامی اس نامعلوم پردیسی کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں اس کی شناخت کے سلسلے میں ادھر آیا ہوں!''

چودھری ناظم نے کہا ''مجھے یہ تو خبر ملی تھی کہ ادھر مراداں والی میں کسی اجنبی نوجوان کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے لیکن اس واردات کی تفصیلات آپ کی زبانی پتا چلی ہیں، خیر.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لائیں.....وہ تصویریں تو دکھائیں مجھے!''

میں نے مقتول کی لاش کے کلوز اپ چودھری ناظم کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے ہاتھ میں لے کر ان تصویروں کا بہ غور جائزہ لیا پھر نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ بندہ سلطان آباد کا رہنے والا تو نہیں۔ میں نے اسے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔''

سلطان آباد پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اگر چودھری ناظم نے مقتول غلام عباس کو وہاں نہیں دیکھا تھا تو اس کا سیدھا سادہ یہی مطلب نکلتا تھا، اس کا تعلق اس گاؤں سے بھی نہیں تھا۔ میں ایک مضمحل سی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

چودھری ناظم نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''ملک صاحب! آپ مایوس نہ ہوں۔ میں اس بندے کا پتا لگانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ دیکھتا ہوں۔''

''دوسرا راستہ؟'' میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

چودھری نے بہ آواز بلند پکار کر اپنے اس ملازم کو بلا لیا جو تھوڑی دیر پہلے اشیائے خورونوش سے لدی پھندی ٹرے ہمارے سامنے رکھ کر گیا تھا۔ مذکورہ ملازم حاضر ہوا تو چودھری نے اس سے استفسار کیا۔

''کیا شوکا اس وقت حویلی میں موجود ہے؟''

''جی چودھری صاحب!'' ملازم نے باادب، باملاحظہ، ہوشیار جواب دیا ''تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔''

چودھری ناظم نے تحکمانہ انداز میں اپنے ملازم سے کہا ''ٹھیک ہے.....اسے یہاں بھیج دو!''

ملازم ''جی چودھری صاحب'' کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں نے چودھری ناظم سے پوچھا ''یہ شوکا کون ہے اور اس کی ہسٹری کیا ہے۔ یہ اس کیس میں میری کیا مدد کر سکتا ہے؟''

''آپ نے ایک ساتھ اتنے سارے سوالات پوچھ لیے ملک صاحب!'' چودھری ناظم معنی خیز انداز میں زیرلب مسکراتے ہوئے بولا ''خیر، میں آپ کو ترتیب وار جواب دیتا ہوں.....!''

چودھری ظفر نے، چودھری ناظم سے کہا ''آپ لوگ باتیں کریں اور مجھے جانے کی اجازت دیں۔ ابا جی نے آج ہر حال میں واپس آنے کو کہا تھا۔''

چودھری ناظم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''آؤ، میں تمہیں رخصت کر دوں۔''

چودھری ظفر، چودھری ناظم کی تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا اور چودھری کی معیت میں بیٹھک سے نکل گیا۔ ان کے جاتے ہی طفیل کے ہاتھوں کی حرکات میں غیر معمولی تیزی آ گئی۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا ''کیا تم ایسے ہی کسی موقع کا انتظار کر رہے تھے؟''

وہ ہاتھ اور منہ کو روکے بغیر بولا ''ملک صاحب! انواع واقسام کی کھانے کی چیزیں سامنے رکھی ہوں تو انہیں نظر انداز کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ میں تو چودھری صاحب کی موجودگی کے باعث ذرا ہاتھ روک کر چل رہا تھا کہ کہیں وہ کچھ غلط نہ سوچ لیں اور.....ایک مجبوری آپ کی وجہ سے بھی!''

''میری وجہ سے تمہیں کیا مجبوری تھی بھئی؟'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ نعمت خداوندی سے پوری طرح انصاف نہیں کرتے۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

''پاس بیٹھے آدمی کا بھرپور ساتھ نہ ہو تو پھر مزہ نہیں آتا انصاف کرنے میں!''

اس کی وضاحت سن کر مجھے ہنسی آ گئی لیکن میں نے خود پر کنٹرول کیا اور جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا ''میں انصاف کے تقاضوں کو موقع محل کی مناسبت سے نبھاتا ہوں طفیل.....اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب معاملہ خورونوش کا ہوتو میں نعمت خداوندی سے انصاف کرنے سے قبل اپنے پیٹ سے انصاف کرنا نہیں بھولتا..... تم لگے رہو کام سے!''

لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن اس نے ہاتھ روکنے یا کسی قسم کی معذرت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سر جھکا کر، دونوں ہاتھوں سے اپنے مشن میں مصروف رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد چودھری ناظم، ظفر کو رخصت کر کے واپس آ گیا اور میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا'' ملک صاحب! آپ شونکا کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں نا..... تو سنیں!''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں ہمہ تن گوش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

'' ملک صاحب! شوکت عرف شونکا میری حویلی میں رہتا ہے۔ دوسروں کی نظر میں اس کی حیثیت ایک ملازم ایسی ہے اور یہ کوئی غلط بات بھی نہیں۔ وہ بھی خود کو میرا خادم ہی سمجھتا ہے مگر میرے نزدیک وہ خادم سے بڑھ کر ہے۔ میں بعض حساس اور نازک معاملات میں اس سے مشورہ بھی کرتا ہوں۔ وہ اپنے تجربے کی روشنی میں بڑی ٹھوس اور مفید رائے دیتا ہے.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا'' ملک صاحب! میں نے آپ کو شونکا کے بارے میں سننے کے لیے کہا تھا، ہاتھ روکنے کو نہیں..... اپنے کانٹیبل کا ساتھ بھی دیتے رہیں!''

اس نے الفاظ'' اپنے کانٹیبل'' پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔ میں اس کی بات کی تہ میں اتر گیا لیکن کوئی تبصرہ یا رائے ظاہر کرنے کے بجائے اپنا ہاتھ ٹرے کی جانب بڑھا دیا۔ وہ زیرِلب مسکرایا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

'' یہ شونکا کسی زمانے میں بہت بڑا بدمعاش ہوا کرتا تھا۔ لوگ اس کا نام سن کر ڈر جاتے تھے۔ کوئی اس کے منہ لگنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ وہ کئی مرتبہ جیل بھی کاٹ آیا تھا اور تھانہ کچہری تو اس کے ساتھ ہوتی ہی رہتی تھی پھر اللہ نے اس کی فرعونیت کو ختم کرنے کے لیے اسے ایک بیٹی کا باپ بنا دیا۔ میرا خیال ہے، مجھے مزید تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے، اس نوعیت کی کہانیوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے؟''

'' بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا'' بیٹی اللہ کی رحمت ہے۔ یہ بڑے بڑے پتھر دل ٹیڑھوں کو موم کر دیتی ہے۔ میں نے ایسے غنڈے بھی دیکھے ہیں جو قریب سے گزرنے والوں پر دانستہ تھوک کر جھگڑے کی راہ نکالتے تھے۔ ادھر سامنے والے نے ان کی کمینی حرکت پر کچھ منہ سے نکالا، ادھر انہوں نے اس کی دھلائی شروع کر دی لیکن یہ بھی میرے دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے شیطانوں کو نمونہ عبرت بنانے کے لیے خدا انہیں بیٹی کا باپ بھی بنا دیتا ہے۔ ان کی ساری مستی اور بدمعاشی ناک کے راستے نکل جاتی ہے اور..... وہ کسی کونے میں مسکین بنے بیٹھے نظر آتے ہیں!''

'' شونکا کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کے حالات پیش آئے تھے۔ جب وہ آخری مرتبہ جیل گیا تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ نہ بیٹی، نہ اکڑفوں اور نہ ہی غنڈا گردی کا حوصلہ!'' چودھری ناظم نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا'' شونکا کے بارے میں جب مجھے پتا چلا کہ اس نے تمام گناہوں سے توبہ کر کے ایک اچھے انسان کی طرح زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں نے اپنی کوشش اور اثر رسوخ کو استعمال کر کے کسی طرح اس کی سزا میں کمی کروائی اور رہائی کے بعد اسے اپنی حویلی میں رکھ لیا۔ کسی زمانے میں وہ اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو منفی انداز میں استعمال کرتا تھا لیکن اب وہ پوری طرح مثبت ہو چکا ہے۔ میں نے اسے ایک تجربہ کار مشیر پایا ہے۔''

چودھری ناظم سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے فوراً پوچھ لیا'' یہ تو شونکا کی ہسٹری ہوگئی۔ اب جلدی سے یہ بھی بتا دیں کہ آپ نے اسے یہاں کیوں بلایا ہے۔ وہ غلام عباس مرڈر کیس میں میری کیا مدد کر سکتا ہے؟''

'' میں اسی طرف آ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا'' شونکا کی دیگر صلاحیتیں تو رہیں ایک طرف، میری نگاہ میں وہ اس علاقے کی جنتری ہے۔''

'' جنتری؟'' میں نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا۔

وہ شاید، شونکا کے لیے'' انسائیکلو پیڈیا'' کے مفہوم کا کوئی لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے'' جنتری'' کہہ کر کام چلا لیا تھا۔ بہرحال، اس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ویسے، اس معاملے میں'' جنتری'' کا ٹائٹل بھی کچھ برا نہیں تھا۔

چودھری ناظم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کسی جنتری میں ہر قسم کی معلومات بھری ہوتی ہیں، بالکل ویسے ہی یہ شونکا بھی اس علاقے کے چپے چپے اور یہاں بسنے والے ایک ایک شخص سے اچھی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقف ہے۔ مجھے امید ہے، وہ اجنبی مقتول کی تصویروں کو دیکھ کر ضرور اسے پہچان لے گا!''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

اسی لمحے چودھری کا ملازم شونکا کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ میں شونکا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عام سی شکل وصورت کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس کی ایک آنکھ اور ایک ٹانگ میں عیب تھا اور وہ بیساکھی کے سہارے وہاں پہنچا تھا۔ جوانی میں وہ یقیناً صحت مند اور طاقت ور رہا ہوگا لیکن اب وہ جوانی اور نادانی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ بڑھاپے نے ہرشان اور ہر اکڑ کو سرنگوں کر دیا تھا۔ وقت کا سفاک پہیہ ہر خاص وعام کو روندڈالتا ہے!

شونکا نے بیٹھک میں داخل ہو کر چودھری ناظم کو سلام کیا پھر چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ ہم اس وقت پولیس کی وردی میں تھے اور یہی اس کے چونکنے کا سبب بھی تھا۔ پولیس والوں کو وہاں بیٹھے دیکھ کر اسے الجھن آمیز حیرت ہوئی تھی جو سوال بن کر اس کی ایک سلامت آنکھ سے جھلک رہی تھی۔ کسی زمانے میں، اس کا پولیس کے ساتھ آنکھ مچولی کا ساتھ رہا تھا!

چودھری ناظم نے شونکا کے چہرے پر نمودار ہونے والی حیرت کو بھانپ لیا اور تسلی آمیز لہجے میں بولا ''خیر ہے شونکا! یہ اپنے ملک صاحب اس علاقے کے تھانہ ان چارج ہیں اور میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ انہیں ایک کیس کو حل کرنے کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

شونکا کے چہرے پر اطمینان ابھر آیا اور وہ مجھے سلام کرنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ گیا۔

چودھری نے مختصر الفاظ میں اسے مقتول غلام عباس کے بارے میں بتانے کے بعد اس کی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا ''انہیں غور سے دیکھو اور بتاؤ، یہ بندہ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟''

''کیا نام بتایا ہے آپ نے.....غلام عباس!'' وہ تصویروں ''پر سنگل آنکھ'' جمائے ہوئے بولا۔

اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے، اس کی یک چشم میں شناسائی کی چمک ابھری اور وثوق بھرے لہجے میں اس نے اعلان کر دیا۔

''یہ بندہ غلام حسین جٹ کا پتر ہے جو ادھر نظام پور میں رہتا ہے!''

''نظام پور.....!'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

شونکا نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور تصدیقی لہجے میں بولا ''جی تھانے دار صاحب! میں نے اس جوان کو پہچان لیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق، یہ بندہ کمانے کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ غلام حسین جٹ کو اس سے بڑی امیدیں ہیں جناب..... بلکہ امیدیں تھیں! اب تو یہ باقی نہیں رہا۔ ہائے غلام حسین بدنصیب.....!'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنے سرکو نفی میں جنبش دی اور افسوس ناک لہجے میں کہا۔

''غلام حسین اور اس کی گھر والی ارشاد بی بی کی صرف ایک ہی اولاد تھی.....یہی غلام عباس.....ان کی ساری آسوں اور امیدوں کا سہارا!''

شونکا نے مقتول کی لاش کی تصویروں کو دیکھ کر شناخت کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا کام بھی آسان ہو گیا تھا۔ مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ غلام عباس کے والی وارث کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ باقی کی باتیں میں غلام حسین جٹ اور اس کی بیوی ارشاد بی بی سے مل کر معلوم کر سکتا تھا۔

شونکا کی حوصلہ افزا رپورٹ کے بعد میں نے اسے وہ دو چھوٹی تصاویر بھی دکھائیں جو مجھے مقتول کے پرس میں سے ملی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر کسی دو سالہ معصوم بچی کی تھی اور دوسری تیکھے نقوش والی ایک پُرکشش لڑکی کی۔ یہ تصویریں بھی میرے لیے ایک پُراسرار معمابنی ہوئی تھیں۔ مجھے امید تھی کہ شونکا انہیں بھی بہ خوبی پہچان لے گا.....لیکن میری یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔

ان تصویروں کو بہ غور دیکھنے کے بعد شونکا نے اعلان کر دیا ''میں ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، شونکا سے وہ تصاویر واپس لے کر اپنی جیب میں رکھیں اور چودھری ناظم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ چودھری صاحب! میں اب یہاں سے سیدھا نظام پور جاؤں گا۔'' پھر میں نے یک چشم، سنگل لیگ ریٹائرڈ بدمعاش شونکا کو مخاطب کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''شوکت! میں تمہارا بھی شکر گزار ہوں۔ تم نے میرے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔''

اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ یہ شونکا کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ اس کے علاقے کا تھانہ ان چارج اس کی خدمات کو سراہ رہا تھا۔ اس کے بعد چودھری ناظم نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں کانسٹیبل طفیل کے ہم راہ چودھری کی حویلی سے نکل کر نظام پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

موضع سلطان آباد میرے تھانے کے جنوب میں لگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھگ چار میل کے فاصلے پر واقع تھا اور نظام پور، سلطان آباد کے جنوب مغرب میں۔ ان دونوں گاؤں میں کم وبیش تین میل کی دوری حائل تھی۔ موسم خاصا خنک تھا لہٰذا سائیکلنگ میں کوئی پریشانی پیش نہیں آرہی تھی۔ ہم مقتول غلام عباس کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے بڑی تیزی سے نظام پور کی سمت بڑھ رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کیس کا ایک مضبوط سرا میرے ہاتھ آگیا ہو۔ میں اس سرے کو دھیرے دھیرے کھینچ کر دوسرے سرے تک رسائی حاصل کرسکتا تھا، اس کیس کے حل ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں تھی!

☆☆☆

تھوڑی دیر کے بعد ہم نظام پور پہنچ گئے۔

نظام پور، سلطان آباد سے نسبتاً بڑا گاؤں تھا۔ یہاں سو سے زیادہ گھر آباد تھے اور یہ بھی میرے تھانے کی حدود ہی میں آتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں غلام حسین جٹ تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے یہی حوالہ کافی تھا کہ..... وہ غلام حسین جٹ جس کا اکلوتا بیٹا غلام عباس جٹ کمانے کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔

گاؤں میں داخل ہونے کے پانچ منٹ بعد ہم غلام حسین کی دکان پر کھڑے تھے۔ وہ موضع نظام پور میں دودھ دہی وغیرہ کی دکان چلاتا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور سیدھا سادہ شخص تھا، دودھ کا کاروبار کرنے والے دیگر افراد سے قطعی مختلف ورنہ اس کام سے وابستہ اور منسلک لوگوں کو عموماً ہٹا کٹا اور صحت مند ہی دیکھا گیا ہے!

وہ ہم پر اور ہماری وردیوں پر نظر پڑتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اپنے ہاتھ کو اضطراری انداز میں پیشانی سے لگاتے ہوئے اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی غلام حسین جٹ ہوگا کیونکہ وہ مقتول سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ یعنی مقتول میں اس کی شباہت پائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں شدید نوعیت کے الجھن آمیز تاثرات کو فوراً نوٹ کرلیا۔ وہ ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر یک دم پریشان ہوگیا تھا اور اس پریشانی میں وہ بولنا بھی بھول گیا تھا۔ ویسے پلک جھپکتے میں، میں نے اس بات کا اندازہ تو لگالیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو پیش آنے والے المناک واقعے سے آگاہ نہیں تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''غلام حسین! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں لیکن وہ باتیں یہاں کھڑے کھڑے نہیں ہوسکتیں۔ کیا تم اپنی دکان بند کرکے میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر چل سکتے ہو؟''

''جی..... ایسی کیا بات ہے.....؟'' اس کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

دراصل، میں اسے یک لخت اس کے بیٹے کی موت کی خبر نہیں سنانا چاہتا تھا۔ اگرچہ یہ ایک سفاک اور ناقابلِ تردید حقیقت تھی لیکن انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ میں یہ اندوہ ناک اطلاع دیتے ہوئے اسے کم سے کم صدمہ پہنچاؤں اور ویسے بھی، یوں بازار میں کھڑے ہوکر اس موضوع کو کھولنا مناسب نظر نہیں آتا تھا۔

''اگر یہاں بتانے والی بات ہوتی تو پھر مجھے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ دکان بند کرکے گھر چلو۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا ''میں نے جو کہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو غلام حسین!''

میرے لہجے میں اتنی قطعیت اور تحکم پایا جاتا تھا کہ وہ چپ چاپ میری ہدایت پر عمل کرنے کو تیار ہوگیا۔ اس کا گھر چند قدموں کی دوری پر تھا۔ اس نے اپنی دکان کو بند کیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس کے گھر میں بیٹھے تھے۔ اس کی گھر والی ارشاد بی بی بھی ہمارے پاس آگئی۔

اس نے گہری فکرمندی سے سوال کیا ''اب تو بتائیں جناب! آخر معاملہ کیا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا ''میں تم سے تمہارے بیٹے غلام عباس کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں..... وہ جو کراچی کے ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے!''

''کیا ہوا ہے، میرے عباس کو؟'' ارشاد بی بی بے ساختہ بیٹے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

کسی ماں کو، اس کی اولاد کی حادثاتی موت کی خبر دینا دنیا کا سب سے مشکل اور دل گرفتہ کام ہے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اپنے فرائض کے سامنے بالکل بے بس ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے ہر حال میں وہ بری خبر ان تک پہنچانا تھی۔ اس سے فرار یا پہلوتہی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے نہایت ہی نرم الفاظ کا انتخاب کرکے ان میاں بیوی کو حقیقت حال سے آگاہ کردیا۔

اس خبر کو سن کر ان کے دل پر کیا گزری ہوگی اور انہوں نے کس نوعیت کے مامتی ردِعمل کا مظاہرہ کیا ہوگا اس کی تفصیل بیان کرکے میں خوامخواہ آپ کو دکھی نہیں کرنا چاہتا۔ حساس دل اور دل میں درد رکھنے والا ہر شخص اس صدمے کا اندازہ بہ خوبی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا سکتا تھا، خاص طور پر وہ لوگ..... جو صاحب اولاد ہیں!

ارشاد بی بی اور اس کے خاوند غلام حسین جٹ کو نارمل ہونے میں کم وبیش آدھا گھنٹا لگا۔ جب وہ میرے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل ہوئے تو انہوں نے مجھے مقتول کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

مقتول غلام عباس کو موضع نظام پور سے کراچی گئے پانچ سال سے زیادہ عرصہ ہوا تھا۔ غلام حسین کے مطابق، وہ وہاں کسی ہوٹل میں کام کرتا تھا، کس ہوٹل میں، یہ نہ تو اس نے بتایا اور نہ ہی انہوں نے جاننے کے لیے زور مارا۔ وہ ہر ماہ ایک مخصوص رقم انہیں بھیج رہا تھا۔ اگر چہ وہ کوئی بڑی رقم نہیں ہوتی تھی لیکن وہ لوگ پھر بھی خوش تھے۔ مقتول نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنے پاس رقم جمع کر رہا ہے۔ ان پانچ سالوں میں وہ چار مرتبہ ان سے ملنے گاؤں آیا تھا اور آخری بار اسے آئے ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا تھا۔

اولاد نظروں سے دور ہو تو والدین کو ان کی یاد ستاتی ہے، خصوصاً ماں کو اپنے بچوں کی کچھ زیادہ ہی یاد آتی ہے۔ یہی حال ارشاد بی بی کا بھی تھا اسی لیے چند روز قبل اس نے اپنے بیٹے کے لیے ایک خط لکھوا کر کراچی بھیجا تھا جس میں اپنی بیماری کا بہانہ کر کے اسے جلد از جلد گاؤں پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ وہ بیمار رہنے لگی تھی لیکن بیٹے کو جلد از جلد گاؤں بلانے کے پیچھے، اپنی بیماری کے علاوہ اس کا ایک اور مقصد بھی تھا اور وہ نیک مقصد یہ تھا کہ اسے اپنی بہن کی بیٹی فرزانہ پسند آ گئی تھی۔ وہ فرزانہ کو اپنی بہو بنانے کی خواہش مند تھی۔ یہ بات اس نے صرف اپنے خاوند غلام حسین کو بتائی تھی، اور کسی کو نہیں حتیٰ کہ غلام عباس کو بھی نہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ جب عباس گاؤں پہنچ جائے گا تو پھر اسے یہ خوش خبری سنا کر چونکا دے گی۔ خط میں اس نے غلام حسین کی جانب سے خاص طور پر یہ لکھوایا تھا کہ تمہاری ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو، گھر آ جاؤ اور جو کچھ جمع جوڑ کر رکھا ہے وہ رقم بھی لیتے آنا، پیسوں کی سخت ضرورت ہے وغیرہ وغیرہ.....!

وہ لوگ خط پوسٹ کرنے کے بعد غلام عباس کی راہ دیکھ رہے تھے کہ وہ بدنصیب کسی اور راہ کی مسافرت پر چلا گیا۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا، گویا ان کی دنیا ہی اجڑ کر رہ گئی تھی۔

ان کو قدرے معتدل ہوتے دیکھا تو میں نے کہا ''میں آپ لوگوں کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ میں آپ کے بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن آپ دونوں سے میرا یہ وعدہ ہے کہ میں غلام عباس کے قاتلوں کو جلد از جلد گرفتار کر کے انہیں عبرت ناک سزا دلواؤں گا۔''

''قاتلوں؟'' غلام حسین نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا میرے بیٹے کی موت میں ایک سے زیادہ لوگوں کا ہاتھ ہے؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں بتایا اور کہا ''میرے اندازے کے مطابق، کم از کم دو افراد اس کی موت کے ذمے دار ہیں.....'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اس سے پوچھا۔

''غلام حسین! تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''میں آپ کی کیا مدد کروں۔''..... وہ بے بسی سے بولا ''آپ ہی بتائیں جناب.....؟''

میں چند لمحات تک ہمدردی بھری نظر سے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ جوان بیٹے کی اندوہ ناک موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان سے ایسے مائی حالات میں سوال و جواب کرنا مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن میں اپنے فرائض کے ہاتھوں مجبور تھا تاہم میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ انہیں اپنے الفاظ سے کم از کم تکلیف پہنچنے دوں گا لہٰذا تھوڑی سوچ بچار کے بعد میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''غلام حسین! میری بات غور سے سنو۔ میری سوچ کے مطابق، تمہارے بیٹے کو پیش آنے والے حادثے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک یا پھر دونوں ایک ساتھ میں.....''

''کون سی دو وجوہات جناب؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''میں وہی بتانے والا ہوں، تم پوری توجہ سے صبر کے ساتھ میری بات سنتے جاؤ!''

وہ اس وقت جتنی بڑی قیامت سے نبرد آزما تھا اس کے پیش نظر میں اس کے ساتھ نہایت نرمی کا برتاؤ کر رہا تھا لہٰذا اس کے ٹوکنے پر کسی جھنجلاہٹ یا خفگی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے میں نے سمجھانے والے انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم نے بتایا ہے کہ تم لوگوں نے اسے فوراً یہاں پہنچنے کے لیے چند روز پہلے ایک خط لکھا تھا اور اس خط میں یہ بھی تاکید کی تھی کہ اس نے اپنے پاس جو بھی جمع جوڑ کر رکھا ہے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے ساتھ لیتا آئے کیونکہ آپ لوگوں کو پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ یہ عین ممکن ہے، اس نے آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ادھر کا رخ کیا ہو اور کسی کو یہ خبر ہوگئی ہو کہ اس کے پاس ایک بڑی رقم موجود ہے لہٰذا دولت کے لالچ میں اس نے غلام عباس کو قتل کر دیا ہو۔ غلام عباس کے لباس اور سامان کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی جیسے وارداتیے کو کسی شے کی تلاش ہو۔ ایک وجہ تو یہ ہے اور دوسری وجہ.....!'' میں سانس درست کرنے کے لیے لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''دوسری وجہ کوئی خطرناک دشمنی ہوسکتی ہے۔ جانی دشمن اس بات سے باخبر ہوگیا یا گئے ہوں کہ وہ کس وقت یہاں پہنچ رہا ہے لہٰذا انہوں نے اسے گھیر گھار کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی جامہ تلاشی و سامان تلاشی میں سے جو بھی ہاتھ لگا وہ بھی لوٹ کر لے گئے!''

غلام حسین نے بے بسی سے مجھے دیکھا اور گلوگیر لہجے سے بولا ''تھانے دار صاحب! آپ کی باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مجھے نہیں پتا، وہ اپنے ساتھ کوئی بڑی رقم لے کر آبھی رہا تھا یا نہیں، پھر میرا بیٹا ایسا نہیں جو دشمن وغیرہ پالتا رہے۔ آج تک اس کا کسی سے کوئی دنگا فساد نہیں ہوا۔ اس کا ایسا کون دشمن ہوسکتا ہے جو اتنی بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دے۔ نہیں جناب.....'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا ''میں نہیں مان سکتا، یہ کسی دشمنی کا نتیجہ ہو۔ میں نے تو زندگی میں اسے کسی سے ''تو تو میں میں'' کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا.....!''

میں نے غلام حسین کی ذہنی اور قلبی کیفیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا ''میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط بیانی کر رہے ہو۔ یقیناً غلام عباس بہت ہی امن پسند اور صلح جو رہا ہوگا لیکن پچھلے پانچ سال سے وہ کراچی میں رہ رہا ہے، تمہاری نظر سے دور..... ممکن ہے، وہاں کسی سے اس کی دشمنی چل نکلی ہو اور دشمن موقع کی تاک میں لگ گیا ہو پھر جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے دشمنی نکال لی.....؟''

''میرا دماغ کام نہیں کر رہا جناب!'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔

ارشاد بی بی نے دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا ''تھانے دار صاحب! کراچی میں کسی سے دشمنی والی بات تو بالکل دماغ میں نہیں بیٹھ رہی۔ اگر وہاں پر اس کی کسی سے دشمنی ہو بھی گئی تھی تو وہ وہیں پر دشمنی نکال سکتا تھا۔ دشمن کو اس کا پیچھا کر کے یہاں تک آنے کیا ضرورتھی۔ مجھے تو یہ لوٹ مار کی واردات ہی لگتی ہے جناب..... اور ایک بات تو میرے ذہن کو بہت الجھا رہی ہے.....!''

ارشاد بی بی نے بڑے منطقی انداز میں حالات کا تجزیہ کیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا ''کون سی بات تمہارے ذہن میں الجھن ڈال رہی ہے ارشاد بی بی؟''

''دیکھیں جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''اس بات میں تو کسی شک وشبے کی گنجایش نہیں کہ عباس کراچی سے سیدھا گھر آرہا تھا۔ ٹرین کے ذریعے صرف ہم ساہی وال تک آسکتے ہیں۔ اس کے بعد بس میں بیٹھ کر مراداں والی تک آنا پڑتا ہے اور مراداں والی سے ادھر نظام پور آنے کے لیے تانگے چلتے ہیں۔ اصولی طور پر اسے مراداں والی پہنچنے کے بعد تانگے میں بیٹھ کر اپنے گھر آجانا چاہیے تھا لیکن آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس کے مطابق تو وہ مراداں والی میں سے گزر کر دریا کے قریب پہنچا تھا جس کی دوسری جانب فرید نگر گاؤں واقع ہے۔ یہ بات بری طرح میرے ذہن کو الجھا رہی ہے کہ وہ گھر آنے کے بجائے دریا کی طرف کیوں گیا؟''

''یہ الجھن میرے ذہن میں بھی ہے ارشاد بی بی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بہرحال، میں نے ایک اے ایس آئی کو کل کراچی روانہ کیا ہے۔ ممکن ہے، وہ وہاں سے کوئی ایسی خبر لے آئے جس سے عباس کے قتل کا معما حل کرنے میں مدد مل سکے۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ اس سلسلے میں میری جو بھی مدد کرسکتے ہیں وہ ضرور کریں۔ میں آپ کے بیٹے غلام عباس کے قاتل یا قاتلوں کو عبرت ناک سزا دلوانے کے لیے بے چین ہوں!''

''ہم جو کچھ جانتے تھے وہ سب آپ کو بتا دیا ہے تھانے دار صاحب!'' غلام حسین نے روہانسی آواز میں کہا ''اس سے زیادہ ہم آپ سے کوئی تعاون نہیں کرسکتے۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ تصویریں نکال لیں جو عباس کے پرس میں سے برآمد ہوئی تھیں۔ ان میں ایک کسی لڑکی کی تصویر تھی اور دوسری ایک دو سالہ بچی کی۔ میں نے وہ تصاویر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ لوگ ان کو جانتے ہیں؟''

انہوں نے وہ تصویریں اپنے ہاتھ میں لے کر بہ غور ان کا جائزہ لیا پھر یکے بعد دیگرے نفی میں گردن ہلا دی۔ غلام حسین نے مجھ سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ کن کے فوٹو ہیں؟''

''یہ تو مجھے نہیں پتا۔'' میں نے مذکورہ تصاویر واپس لیتے ہوئے کہا ''یہ عباس کے بٹوے میں سے ملی ہیں۔''

ارشاد بی بی نے کہا ''ہم نے اس لڑکی اور بچی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا اس لیے انہیں نہیں جانتے۔'' اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر وہ گلوگیر آواز میں اضافہ کرتے ہوئے بولی ''میرا عباس زندہ ہوتا تو میں اس سے ان فوٹو کے بارے میں پوچھتی۔ میں..... میں.....!'' اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے ان غم زدہ میاں بیوی کو مزید پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور پوچھ گچھ کے سلسلے کو موقوف کر دیا۔ قانونی تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ میں ان لوگوں سے جو کچھ پوچھ سکتا تھا وہ پوچھ لیا تھا لہٰذا میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''غلام حسین! میں کوشش کروں گا کہ کل صبح تمہیں غلام عباس کی لاش مل جائے۔ تم اپنی مرضی سے اس کی تجہیز و تکفین کر سکتے ہو اور اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ میں تمہارے اس درد میں پوری طرح شریک ہوں اس لیے اگر تمہیں اس واردات کے سلسلے میں، کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پتا چلے تو مجھے بتانے میں کوئی کوتاہی نہ کرنا..... اور مجھ سے جس بھی نوعیت کی مدد چاہیے ہو، بلا جھجک کہہ دینا!''

ان دونوں نے باری باری میرا شکریہ ادا کیا۔ میں ان حالات میں فی الحال تسلی دلاسا ہی دے سکتا تھا۔ ابھی تک قاتل یا قاتلوں کا کوئی سراغ میرے ہاتھ نہیں لگا لیکن مجھے قوی امید تھی کہ میں بہت جلد اس کیس کو حل کر لوں گا۔

آئندہ روز میں نے ضروری کارروائی کے بعد مقتول غلام عباس کی لاش اس کے ورثا کے حوالے کر دی اور اس دن عصر اور مغرب کے درمیان اس کی تدفین بھی ہو گئی۔

اس کیس نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ کوئی راستہ مجھے ڈھونڈنا تھا جس پر چل کر میں قاتل تک پہنچ جاتا۔ بادی النظر میں یہ ایک لوٹ مار کی واردات دکھائی دیتی تھی۔ لیکن میں ان تصویروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا جو مقتول کے بٹوے میں سے برآمد ہوئی تھیں۔ کوئی بھی شخص اپنے پیاروں کی تصویروں کو پرس میں رکھتا ہے۔ اس کا مطلب تھا، وہ تیکھے نقوش والی پُرکشش لڑکی اور معصوم بچی مقتول کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں جبھی اس نے ان کی تصاویر کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ یہاں ایک بھی شخص مجھے ایسا نہیں ملا تھا جو ان دونوں کو شناخت کر سکے۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اس لڑکی اور بچی کا تعلق کراچی سے ہو گا!

میں بڑی بے چینی سے گل فراز کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

تیرہ اور چودہ دسمبر کی تاریخیں بھی کسی کامیابی کے بغیر ہی گزر گئیں۔ غلام عباس کو آٹھ دسمبر کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان قتل کیا گیا تھا۔ اس حساب سے اس افسوس ناک واقعے کو لگ بھگ ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا لیکن ابھی تک کوئی ایسا مضبوط سراغ میرے ہاتھ نہیں لگا جو اس کیس کو حل کرنے میں راہ نما کا کردار ادا کرتا۔

میں مایوس تو نہیں ہوا تھا تاہم ہر گزرتے دن کے ساتھ میری جھنجلاہٹ میں اضافہ ضرور ہو رہا تھا پھر قبل اس کے کہ یہ جھنجلاہٹ بیزاری اور اکتاہٹ میں تبدیل ہوتی، اچانک میری نگاہ کے سامنے سے وہ گھنے بادل چھٹ گئے جو پچھلے پانچ چھ روز سے منظر کو اپنی اوٹ میں چھپائے ہوئے تھے۔ پندرہ دسمبر کی دوپہر کو ایس آئی گل فراز کراچی سے لوٹ آیا اور اپنے ساتھ ایک ایسی خبر بھی لے کر آیا جس نے بالکل اس کیس کو حل کر دیا۔

میں نے فوراً گل فراز کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ دس دسمبر کو تھانے سے روانہ ہوا تھا اور آج پندرہ دسمبر کی دوپہر تھی۔ سفر مسلسل کی تکان اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی تاہم اس تکان نے اسے مضمحل نہیں کیا تھا، اس کی آنکھوں میں کوئی بڑا معرکہ سر کر لینے کی مخصوص چمک دکھائی دیتی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پُرجوش لہجے میں بتایا۔

''ملک صاحب! کراچی کا دورہ بہت کامیاب رہا ہے۔ اب تھوڑی سی محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد ہم بہ آسانی اس کیس کو حل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے کام کا آغاز ساہی وال سے کرنا ہو گا!''

اس کے غیاب میں یہاں جو واقعات پیش آ چکے تھے ان کے بارے میں، میں نے اے ایس آئی کو تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اس کی زبان سے ساہی وال کا سن کر میں چونک اٹھا اور پوچھا۔

''ساہی وال کیوں..... وہاں کیا رکھا ہے؟''

''ساہی وال میں آفتاب رہتا ہے جناب!'' اے ایس آئی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا ''یہ بندہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ مقتول کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا!''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا ''یہ آفتاب کون ہے؟''

''آفتاب وہ شخص ہے جناب جو کراچی سے مقتول کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ٹرین پر سوار ہوا تھا۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا'' وہ سات دسمبر کی سہ پہر کراچی ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے تھے اور عبدالقدیر نے خود انہیں گاڑی میں بٹھایا تھا۔ قدیر اس وقت تک اسٹیشن پر موجود رہا تھا جب تک ٹرین روانہ نہیں ہوگئی!''

''اور..... یہ عبدالقدیر کون ہے؟'' میں نے متذبذب انداز میں دریافت کیا۔

''قدیر مقتول کے ساتھ ''نیو ہیون'' ہوٹل میں کام کرتا ہے جناب!'' اے ایس آئی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا'' میں قدیر کو بھی اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں لیکن ٹھہریں..... میں آپ کو ترتیب سے بتاتا ہوں.....''

میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ایک گہری سانس چھوڑی پھر بڑے پُرجوش انداز میں مجھے کراچی والی کارگزاری کے بارے میں بتانے لگا۔

اس کے مطابق، اس نے کراچی پہنچ کر سب سے پہلے محکمہ جاتی ذمے داریوں کو پورا کیا پھر صدر میں واقع ''نیو ہیون'' ہوٹل کا رخ کیا اور اس ہوٹل میں عبدالقدیر سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ قدیر نے اس بات کی تصدیق کی کہ مقتول اسی ہوٹل میں کام کرتا تھا اور یہ کہ اس نے اپنے گاؤں جانے کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لی تھی۔ وہ اپنی بیماراں کو دیکھنے جارہا تھا۔ قدیر ہی کی زبانی اے ایس آئی کو پتا چلا کہ سات دسمبر کو آفتاب نامی ایک شخص بھی مقتول کے ساتھ ہی گاڑی پر سوار ہوا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اے ایس آئی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ عبدالقدیر نامی اس بندے کو اپنے ساتھ تھانے لے کر آیا ہے لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بہ راہ راست قدیر سے سوالات کروں تاکہ جلد از جلد اس کیس کو نمٹایا جاسکے۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔

''ٹھیک ہے گل فراز! تم قدیر کو یہاں بلالو۔ باقی باتیں میں اس سے خود کرلوں گا۔''

''او کے سر!'' کہتے ہوئے اے ایس آئی اٹھا اور تھوڑی دیر کے بعد قدیر کو لے کر آگیا۔

میں نے عبدالقدیر کو بیٹھنے کے لیے کہا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ عام سی شکل صورت کا مالک ایک میانہ قد شخص تھا۔ رنگت گندمی اور صحت غیر تسلی بخش۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس اور چالیس کے درمیان لگایا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نہیں تھے۔

میں نے اس کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے پوچھا'' قدیر! تو مقتول غلام عباس تمہارے ساتھ ہوٹل نیو ہیون میں کام کرتا تھا؟''

''جی ہاں.....'' وہ دکھی لہجے میں بولا'' اس کی موت کا سن کر مجھے سخت افسوس ہوا ہے جناب! عباس بہت ہی اچھا بندہ تھا..... بالکل ہیرے جیسا!''

''وہ اس ہوٹل میں کام کیا کرتا تھا؟'' میرا اشارہ مقتول عباس کی جانب تھا۔

قدیر نے بتایا'' اس کی ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی لیکن عام طور پر وہ روم سروس پر رہتا تھا اور اس کام پر وہ بہت خوش بھی رہتا تھا کیونکہ اس قسم کی ڈیوٹی میں اضافی آمدنی بھی ہوجاتی ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرنے والے اچھی خاصی ٹپ دے دیتے ہیں۔ وہ ہوٹل کے منیجر سے منت کر کے روم سروس کی ڈیوٹی لگوایا کرتا تھا..... آہ! اب وہ باقی نہیں رہا!''

اس نے دل گرفتہ انداز میں بات مکمل کی تو میں نے استفسار کیا'' تم اس ہوٹل میں کس قسم کا کام کرتے ہو قدیر؟''

''جی..... میں باورچی ہوں۔'' اس نے جواب دیا'' کچن میں کام کرتا ہوں۔''

''لگتا تو نہیں ہے!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''جی..... کیا نہیں لگتا؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' قدیر! تمہاری صحت کو تو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں خوراک سے کوسوں دور رکھا جاتا ہے ورنہ باورچی کو یہ غیر یقینی صحت تو زیب نہیں دیتی!''

وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا'' تھانے دار صاحب! مجھے کھانے کا زیادہ شوق نہیں ہے ورنہ ہوٹل میں کسی شے کی کمی ہے اور نہ ہی پابندی!''

''کھانے کا شوق نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا!'' میں نے سرسری انداز میں کہا'' تمہیں تو اشتہار انگیز اور لذت آمیز کھانوں کی خوش بوئیں سونگھ سونگھ کر ہی صحت مند ہوجانا چاہیے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے میرے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔

میں نے پوچھا'' ہوٹلوں والے باورچی..... اچھے باورچی کو عموماً بڑی مشکل سے چھٹی دیتے ہیں۔ تمہیں یہاں آنے میں کسی دشواری کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟''

''سیٹھ تو نہیں چاہتا تھا کہ میں آؤں!'' اس نے سادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے لہجے میں جواب دیا ''لیکن آپ کے اے ایس آئی صاحب نے قانونی دباؤ ڈال کر میرے سیٹھ کو مجبور کر دیا اور میں سمجھتا ہوں، میرے حق میں یہ اچھا ہی ہوا ہے!''

''کیا اچھا ہوا ہے، ذرا وضاحت کرو؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

قدیر نے بتایا ''مجھے اپنے گھر گئے ایک سال ہونے کو آیا ہے۔ کئی بار سیٹھ سے چھٹی مانگی، وہ اگلے مہینے کا کہہ کر ٹال دیتا تھا۔ اب آپ کے کام سے آیا ہوں تو اپنے بیوی بچوں سے بھی مل کر ہی جاؤں گا۔ میرا گھر ادھر لودھراں میں ہے جناب!''

کسی زمانے میں، جب دیگر شہروں سے آ کر کراچی میں کام کرنے والے افراد کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی آج کل دیکھنے کو ملتی ہے تو ''کام'' کے آدمی کو سیٹھ حضرات بڑی مشکل سے چھٹی دیا کرتے تھے۔ ایک تو اس کی غیر حاضری سے کام کا حرج ہوتا تھا، دوسرے یہ دھڑکا بھی ہر وقت لگا رہتا تھا کہ کہیں اس کام کے بندے کو کوئی دوسرا سیٹھ توڑ کر نہ لے جائے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات میں تبدیلی آتی گئی۔ اور اب تو صورتِ حال بالکل الٹ ہو کر رہ گئی ہے۔ ماضی کے بالعکس، آج کل ملازم لمبی چھٹی پر جاتے ہوئے ڈرتا ہے کہ اس کے جاتے ہی نوکری بھی ہاتھ سے چلی جائے گی اور جب وہ اپنے گاؤں گوٹھ سے واپس آئے گا تو اسے اپنی جگہ پر کوئی اور شخص کھڑا کام کرتا دکھائی دے گا۔

ہم دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جنہوں نے بڑی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین ترقی کی ہے۔ ہمارے ہاں جتنی تیزی سے روزگار میں اضافہ ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے بے روزگاری بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ پندرہ بیس سال بعد ایسے مناظر بھی دیکھنے کو ملیں گے کہ ملازم صرف اس شرط پر بھی کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ انہیں ان کے کام کے عوض، زندہ رہنے کے لیے بس دو وقت پیٹ بھر کر کھانا مل جائے تو بہت کافی ہے اور..... اگر واقعی یہ شرم ناک نوبت آ ہی گئی تو پھر زندہ رہنے کے لیے ہر شخص کو ملازمت کرنا ہو گی چاہے اس کی عمر ایک سال ہو، دس سال یا سو سال..... یا پھر.....؟

یہ ایک لمحہ فکریہ ہو گا..... مزدور سے زیادہ آجر کے لیے!

میں نے چند لمحات میں ان تلخ حقائق کو ذہن سے گزارا اور قدیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، تمہیں حالات نے ایسا سنہری موقع فراہم کر ہی دیا ہے تو اپنے بیوی بچوں سے اچھی طرح مل ملا کر واپس جانا لیکن میں تمہیں اس وقت تک فارغ نہیں کروں گا جب تک میری تسلی نہیں ہو جائے گی۔ اے ایس آئی اگر بہ زورِ قانون تمہیں کراچی سے لے کر یہاں تک آیا ہے تو مجھے امید ہے، تم سے خاصی مفید معلومات حاصل ہوں گی!''

''ملک صاحب! یہ قدیر بہت ہی کام کا آدمی ہے جناب!'' اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے کہا ''اس کے تعاون سے میں نے مقتول کے بڑے والا راز بھی پا لیا ہے!''

''بڑے والا راز؟'' فوری طور پر میں اے ایس آئی کا زاویہ سمجھ نہ سکا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''جناب! مقتول عباس کے بٹوے میں سے جو دو تصویریں برآمد ہوئی تھیں نا، میں ان ماں بیٹی سے بھی مل آیا ہوں۔ قدیر مجھے اپنے ساتھ لے کر ان کے گھر گیا تھا۔ اس پُرکشش عورت کا نام راحیلہ ہے جبکہ دو سالہ بچی سدرہ، راحیلہ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ یہ لوگ ادھر کراچی کے علاقے منظور کالونی میں رہتے ہیں۔ مقتول ان کا پڑوسی تھا۔ راحیلہ کے باپ اصغر علی کا فرنیچر کا کاروبار ہے۔''

اے ایس آئی کے منہ سے برآمد ہونے والی انکشاف انگیز معلومات نے ایک لمحے کے لیے مجھے حیران کر کے رکھ دیا۔ یہ اس کہانی کا وہ تشنگی خیز موڑ تھا جو مجھے دور کافی فاصلے پر دکھائی تو دے رہا تھا لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس موڑ پر پہنچ کر کہانی کیا رخ اختیار کرے گی، وہیں کھڑی رہے گی یا دائیں بائیں کہیں مڑ جائے گی اور یا پھر..... خطِ مستقیم میں آگے بڑھتی چلی جائے گی؟

میں نے عبدالقدیر باورچی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ''مقتول تمہارے ساتھ ہوٹل نیو ہیون میں کام کرتا تھا اور کافی عرصے سے تم اس کے ساتھ تھے، مجھے یقین ہے، تم دونوں میں اچھی خاصی دوستی بھی رہی ہو گی۔ تم نے اس کی موت پر جس انداز میں دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے اس سے میری باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولا ''عباس میرا بہت اچھا یار تھا۔''

''یار، یار سے دل کی باتیں نہیں چھپایا کرتے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اس لیے مجھے یقین ہے کہ مقتول نے بھی تم سے اپنے دل کی بات نہیں چھپائی ہو گی۔ راحیلہ اور اس کی بیٹی سدرہ کی تصویریں مقتول کے بٹوے میں سے برآمد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ان دونوں سے کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنجیدہ تعلق تھا..... ہیں نا؟''

''ایسا تعلق تھا تو نہیں.....'' قدیر نے متاملانہ انداز میں کہا ''لیکن سنجیدہ تعلق قائم ہونے کے روشن امکانات تھے!''

''میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا ''ذرا وضاحت کرو؟''

قدیر نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بتانے لگا'' وہ دراصل، بات یہ ہے جناب کہ لگ بھگ تین سال پہلے اصغر علی نے اپنی بیٹی راحیلہ کی شادی کی تھی۔ راحیلہ، اصغر کی اکلوتی بیٹی ہے۔ شادی کے ایک سال بعد سدرہ پیدا ہوئی۔ راحیلہ اور اس کا شوہر خلیل بہت خوش تھے۔ ایک سال اسی خوشی میں گزر گیا، جب سدرہ کی پہلی سالگرہ منائی گئی تو ان کے آشیانے پر ایک بجلی سی آن گری۔ عین سالگرہ والے دن خلیل کی موٹر سائیکل کا ایسا خطرناک ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ اسپتال پہنچائے جانے سے پہلے ہی کہیں اور پہنچ گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس واقعے نے راحیلہ، سدرہ اور اصغر علی کو کس صدمے سے گزارا ہوگا؟''

قدیر سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں اس انداز میں سر ہلانے لگا جیسے اس کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کچھ عرصہ تو راحیلہ اپنی سسرال میں رہی پھر اپنے باپ کے پاس آگئی۔ سسرال والوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا تو یہ خیال تھا کہ راحیلہ کی نحوست نے خلیل کی جان لے لی تھی۔ وہ منحوس تھی یا کچھ اس سے قطع نظر وہ اپنے باپ کی آنکھ کا نور تھی لہٰذا اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو جگر میں سمیٹ لیا اور اس کے ساتھ ہی ننھی نواسی کو بھی سینے سے لگا لیا۔''

قدیر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ بعض اوقات انسان کسی قدر نامعقول رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ دوسرے کو بدبخت اور منحوس قرار دیتے ہوئے یک سر یہ حقیقت فراموش کر جاتا ہے کہ نصیب لکھنے کا اختیار کسی اور ذات پاک کو ہے۔ انسان تو اس معاملے میں انتہائی بے بس ہے۔ وہی قدرت والا موت اور زندگی کے معاملات بھی دیکھتا ہے!

''عباس میرے سامنے ڈھکے چھپے الفاظ میں راحیلہ کی تعریف کرتا رہتا تھا'' قدیر نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا'' وہ چونکہ اصغر علی کے پڑوس میں رہتا تھا لہٰذا ان کے گھریلو حالات کی اسے پوری خبر رہتی تھی اور میں نے چند روز ہی میں یہ محسوس کرلیا کہ وہ دانستہ ''خبر'' رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

اس نے اپنا بیان ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں قدیر کے بتانے سے چند روز قبل ہی مقتول کے بٹوے سے برآمد ہونے والی تصاویر کو دیکھ کر بہت کچھ سمجھ چکا تھا لہٰذا خاموشی سے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''پھر ایک سال پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ سدرہ دو سال کی ہوگئی۔ راحیلہ کی بیوگی کا ایک سال مکمل ہوگیا اور عباس نے بھی اپنے مشن میں اچھی خاصی ترقی کرلی۔ ابھی دو ماہ پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اور راحیلہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اصغر علی کو ان کے معاملے کی پوری خبر ہے۔ اس کی اصغر علی سے اس معاملے پر سنجیدہ گفتگو بھی ہوچکی ہے۔ وہ اپنی بیٹی سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کی خواہش کی مخالفت میں نہیں۔ وہ عباس سے اپنی بیٹی کی شادی کو تیار ہے لیکن اس رضامندی کے ساتھ ہی اس نے ایک شرط بھی لگا دی ہے!''

اتنا بتا کر عبدالقدیر چند لمحات کے لیے متوقف ہوا، ایک افسردہ سانس خارج کی اور غم گیں لہجے میں بولا'' ہائے.....عباس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہوگیا۔ وہ کتنا خوش تھا.....!''

''تم اصغر علی کی کس کڑی شرط کا ذکر کررہے تھے؟'' میں نے اسے ٹوک دیا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' عباس نے مجھے بتایا کہ اصغر علی اس شرط پر اپنی بیٹی کی اس سے شادی کرنے پر تیار ہے کہ وہ ہوٹل کی ملازمت چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کا قابلِ عزت کام کرنے لگے اس نے عباس کو اپنے ساتھ فرنیچر کے کام میں شریک کرنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اصغر علی کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ عباس کو کراچی ہی میں مستقل رہائش اختیار کرنا ہوگی۔ وہ راحیلہ کو اپنے ماں باپ سے ملوانے تو لے جاسکتا تھا راحیلہ کے مستقل گاؤں میں رہنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے راحیلہ کو نمایاں تعلیم دلوائی تھی اور چاہتا تھا کہ اس کی نواسی بھی زیورِ تعلیم سے اچھی طرح آراستہ ہو جو ظاہر ہے، گاؤں میں رہتے ہوئے تو ممکن نہیں تھا اور..... میں سمجھتا ہوں، اصغر علی کا مطالبہ بالکل معقول اور جائز بھی تھا!''

اس نے رک کر لمحے بھر کے لیے، تائید طلب نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ اپنی بات کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے عباس سے پوچھا، تم نے پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا، میں اصغر علی کی باتیں ماننے کو تیار ہوں۔ میں ہوٹل کی ملازمت چھوڑ دوں گا، راحیلہ اور اس کی بچی کو ادھر کراچی میں رکھوں گا۔ میں نے اس کے عزم کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا، کیا تمہارے ماں باپ اتنے بڑے قدم کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو؟ اس نے بتایا، جب میں راضی ہوں تو انہیں بھی راضی کر کے ہی دم لوں گا۔ اماں اکثر بیمار رہنے لگی ہے۔ ابھی کل بھی ایک خط آیا ہے۔ یہاں اس کا مناسب علاج بھی ہو سکے گا اور مجھے بھی اطمینان رہے گا۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اماں ابا کو بھی کراچی ہی میں لے آؤں۔ میں نے کہا، سوچ لو۔ تم بہت بڑی بات کر رہے ہو۔ وہ لوگ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر کراچی آنے پر تیار نہیں ہوں گے؟ اس نے بڑے وثوق سے کہا، میں بھی انہی کا بیٹا ہوں۔ انہیں کسی نہ کسی طرح منا ہی لوں گا.....'' وہ لمحے بھر کو رکا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''چند روز پہلے عباس مجھے خاصا پریشان نظر آیا۔ میں نے سبب دریافت کیا تو اس نے بتایا، یار قدیر! گاؤں سے خط آیا ہے۔ اماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ابا نے کہا ہے کہ فوراً پہنچوں اور انہیں پیسوں کی بھی ضرورت ہے! میں نے پوچھا، پھر تم نے کیا سوچا ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ پہلی فرصت میں گاؤں جانا چاہتا ہے۔ میں نے کوشش کر کے اسے چھٹی دلوائی اور کراچی سے روانہ کر دیا..... مجھے کیا پتا تھا، میں اسے آخری بار زندہ حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ آیندہ جب اس سے ملاقات ہوگی تو وہ منوں مٹی کے نیچے گہری نیند سو رہا ہوگا.....!'' بولتے بولتے اس کی آواز بھیگ گئی اور وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے چند لمحات تک قدیر کو اسی دل گرفتگی کی کیفیت میں بیٹھا رہنے دیا تاکہ وہ اپنے دوست کی موت کا غم منا سکے۔ ایک منٹ کے بعد اس نے نگاہ اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اے ایس آئی گل فراز اور قدیر میرے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''گل فراز! کیا اصغر علی اور راحیلہ کو عباس کی موت سے آگاہ کر دیا گیا ہے؟''

''جناب! یہ الم ناک خبر ان سے چھپائی نہیں جا سکتی تھی!'' اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''لہٰذا مجبوراً انہیں بتانا پڑا۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا'' ان لوگوں کو..... خصوصاً راحیلہ کو تو عباس کی موت سے بہت دھچکا پہنچا ہوگا؟''

''جی ملک صاحب!'' اے ایس آئی نے اثبات میں سر ہلایا'' اس نے اس واقعے کا بڑا گہرا اثر لیا ہے۔ وہ بہ ضد تھی کہ ہمارے ساتھ یہاں آئے گی لیکن اصغر علی نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس نے بیٹی کو سمجھایا کہ وہ صبر کرے۔ عباس اس کی قسمت ہی میں نہیں تھا۔ جب وہ باقی نہیں رہا تو اس کا تعاقب کرنے سے کیا فائدہ۔ یہ سراسر خود کو دھوکا دینے والی بات ہوگی اور..... اس سے اس کی یعنی راحیلہ کی تکلیفوں ہی میں اضافہ ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ باپ کی بات راحیلہ کی سمجھ میں آ گئی!''

''اصغر علی ایک حقیقت پسند اور دانش مند انسان ہے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا پھر عبدالقدیر سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم بھی منظور کالونی، کراچی ہی میں رہتے ہو؟''

''نہیں جناب! میں ادھر کورنگی میں رہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا'' میں نے عباس سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ بھی میرے پاس ہی آ جائے لیکن وہ اس موضوع کو بڑی خوب صورتی سے ٹال جاتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس کا دل منظور کالونی میں نہیں بلکہ راحیلہ میں اٹکا ہوا تھا جب یہ حقیقت مجھے معلوم ہو گئی تو میں نے اس سے، منظور کالونی چھوڑ کر کورنگی آنے کے لیے اصرار کرنا چھوڑ دیا۔''

''تم کورنگی چھوڑ کر منظور کالونی چلے جاتے!'' میں نے سرسری انداز میں کہا'' آخر وہ تمہارا دوست تھا!''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب!'' قدیر نے سادہ سے لہجے میں کہا'' بس، میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں کورنگی میں آفتاب کے ساتھ مل کر رہا ہوں اور مجھے وہاں کوئی تکلیف یا پریشانی نہیں۔ آفتاب ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا ہے۔''

''اوہ ہاں.....!'' میں نے چونک کر کہا'' اے ایس آئی نے مجھے بتایا ہے کہ سات دسمبر کی سہ پہر تم نے مقتول غلام عباس کے ساتھ ہی آفتاب کو بھی ٹرین میں بٹھایا تھا۔ وہ دونوں کراچی سے ایک ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ اے ایس آئی کا کہنا ہے کہ عباس کے قتل کے سلسلے میں آفتاب سے ہمیں مفید معلومات حاصل ہو سکیں گی لیکن اس کے لیے ہمیں ساہی وال جانا ہوگا۔ ذرا یہ تو بتاؤ، آفتاب اور مقتول میں ایسا کیا تعلق تھا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''کوئی خاص تعلق نہیں تھا جناب!'' قدیر نے ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔ ''بس، وہ دونوں میرے ذریعے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ عباس جب کبھی مجھ سے ملنے کے لیے کورنگی آتا اور اس وقت اگر آفتاب بھی گھر میں ہوتا تو دونوں میں رسمی علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ آفتاب چند روز کے لیے اپنے گھر ساہی وال آ رہا تھا، انہی دنوں عباس کا بھی پروگرام بن گیا۔ عباس کو اپنے گاؤں نظام پور آنے کے لیے کراچی سے ٹرین میں ساہی وال تک آنا ہوتا تھا۔ وہاں سے وہ بس میں بیٹھ کر یہاں پہنچ جاتا۔ دونوں کو کراچی سے ساہی وال تک ٹرین میں سفر کرنا تھا لہٰذا میں نے انہیں ایک ساتھ ہی وہاں روانہ کر دیا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسی لیے میرا خیال ہے کہ اگر آپ ساہی وال جا کر آفتاب سے ملیں تو وہ عباس کے بارے میں کوئی اہم بات بتا سکتا ہے۔ میں نے یہ بات اے ایس آئی صاحب سے کہی تھی اور ساہی وال پہنچ کر خواہش ظاہر کی تھی کہ ذرا آفتاب کو پنچ کر لیتے ہیں..... لیکن انہوں نے کہا کہ پہلے تھانے میں حاضری ضروری ہے لہٰذا ہم ادھر ہی آ گئے۔''

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ مراداں والی سے ساہی وال زیادہ دور نہیں تھا۔ بس آدھے پونے گھنٹے میں وہاں پہنچا دیتی تھی۔ یعنی ابھی اتنا وقت تھا کہ میں بہ آسانی آفتاب سے ایک بھرپور ''ملاقات'' کر کے واپس آ سکتا تھا۔ میں نے قدیر سے استفسار کیا۔

''کیا تم جانتے ہو، آفتاب ساہی وال میں کس جگہ رہتا ہے؟''

''جی..... اس کا گھر شہر میں ہے۔''

''میں نے تم سے اس کے گھر کے ایڈریس کے بارے میں پوچھا ہے قدیر؟''

''مجھے اس کے گھر کا پتا معلوم ہے تھانے دار صاحب!'' وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا ''آپ نوٹ کر لیں۔ میں لکھوا دیتا ہوں۔''

''تمہیں لکھوانے یا مجھے نوٹ کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا ''تم میرے ساتھ ساہی وال جاؤ گے..... ابھی اور اسی وقت!''

اے ایس آئی نے فوراً میرا ارادہ بھانپ لیا، جلدی سے بولا ''ملک صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا ''تم ایک لمبے سفر سے واپس آئے ہو نہاؤ دھو اور تھوڑا آرام کرو۔ میں قدیر کے ساتھ ساہی وال سے ہو آتا ہوں۔'' پھر میں نے قدیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیا تم تیار ہو؟''

''جی..... بالکل تیار ہوں۔ میری طرف سے ابھی نکل چلیں۔''

میں نے ستایشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''قدیر! مجھے احساس ہے کہ تم بھی گل فراز کی طرح بری طرح تھکے ہوئے ہو لیکن تمہیں اپنے ساتھ لے جانا میرے نزدیک کئی حوالوں سے بہت ضروری ہے اس لیے تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ آفتاب سے ملنے کے بعد میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ تمرات کی کوئی ٹرین یا بس پکڑ کر لودھراں کی طرف نکل جانا اور..... ہفتہ، دس دن اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزار کر واپس کراچی جانا۔ اگر تمہارا سیٹھ کوئی الٹی سیدھی بات کرے تو کہہ دینا، میں نے تفتیش کے سلسلے میں تمہیں موضع مراداں والی میں روک رکھا تھا۔ اور..... اگر یہ بات بھی تمہارے سیٹھ کی کھوپڑی میں نہ سمائے تو سیدھا متعلقہ تھانے پہنچ جانا۔ تھانے میں اس بات کا ریکارڈ موجود ہے کہ اے ایس آئی گل فراز ایک مرڈر کیس کی تفتیش کے سلسلے میں تمہیں کراچی سے اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔ پولیس والوں کا ایک دبکا تمہارے سیٹھ کا دماغ درست کر دے گا!''

وہ ایک دم بہت زیادہ خوش ہو گیا۔ سفر کی تھکن، بے آرامی اور نیند وغیرہ کو بھول کر مسرت آمیز لہجے میں بولا ''جناب! جب آپ کی جانب سے مجھے یہ آسانی فراہم ہے تو پھر میں دس پندرہ دن سے پہلے تو ہرگز واپس جانے کے بارے میں نہیں سوچوں گا!''

''لیکن پندرہ سے سولہ نہیں ہونا چاہیے قدیر!'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا ''اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے میری نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے تو یاد رکھنا، میں تمہیں کراچی میں سکون سے رہنے دوں گا اور نہ ہی لودھراں میں..... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی سمجھ گیا..... بالکل سمجھ گیا!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

☆☆☆

موضع مراداں والی سے ساہی وال کی جانب آتے ہوئے، میں نے بس میں عبدالقدیر سے ایک نہایت ہی اہم سوال کیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے مقتول غلام عباس کے ماں باپ نے بتایا ہے اور تم نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ اچھی خاصی رقم اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ کیا تمہیں پتا ہے، اس کے پاس کتنے پیسے تھے؟''

''ہاں، اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پورے دو ہزار روپے لے کر گاؤں جا رہا ہے جو اس نے پچھلے پانچ سالوں میں، بڑی محنت سے تھوڑے تھوڑے بچا کر جمع کیے تھے۔'' قدیر نے تشویش بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ رقم کو سنبھال کر لے جائے۔ یہ معمولی رقم نہیں تھی جناب!''

''تم ٹھیک کہتے ہو قدیر!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا ''اتنی بڑی رقم کہ اس کے حصول کے لیے کسی کی جان بھی لی جا سکتی ہے!''

''نہیں آپ یہ تو نہیں کہنا چاہ رہے کہ خدانخواستہ آفتاب نے.....؟''

اس نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے سپاٹ لہجے میں کہا ''میں قبل از وقت حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ایسا سوچنے میں کوئی مضائقہ یا حرج بھی نہیں!''

''جناب! میں آفتاب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ فکرمندی سے بولا ''اس کے خراج کو سمجھتا ہوں۔ وہ اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔''

''میں نے کہا نا، ابھی کچھ بھی حتمی نہیں ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''آفتاب سے ملنے کے بعد میں کوئی رائے قائم کروں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا آفتاب کو یہ بات معلوم تھی کہ عباس کے پاس دو ہزار روپے ہیں؟''

''میں نے تو اسے نہیں بتایا تھا۔'' وہ یقینی لہجے میں بولا۔ ''اگر راستے میں عباس نے خود ہی اس سے ذکر کر دیا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

میں نے جب سے سنا تھا کہ عباس کے پاس دو ہزار روپے تھے تو میں نے ایک خاص انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا اور ابھی تک مشکوک افراد کی فہرست میں صرف ایک نام ہی درج ہو سکا تھا یعنی..... آفتاب!

یہ ٹھیک ہے، آج کل دو ہزار روپے وہ اہمیت نہیں رکھتے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں لیکن ذہن میں رہے کہ یہ آج سے برسوں پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، آج کل کے حساب سے آپ اسے دو، ڈھائی لاکھ روپے سمجھ لیں اور..... یہ ایسا ہینڈسم اماؤنٹ ہے کہ اس کے لیے کسی انسان کا خون کیا جا سکتا ہے، یعنی مجرمانہ ذہن رکھنے والے لوگ بہ خوشی ایسا سوچ سکتے ہیں۔

آفتاب کا گھر بس اڈے سے زیادہ دور نہیں تھا ہم جلدی وہاں پہنچ گئے۔ آفتاب اس وقت گھر کے اندر موجود تھا۔ وہ عبدالقدیر کے ساتھ ایک پولیس افسر کو دیکھ کر چونکا۔ اس کے لیے یہ ہی غیر متوقع تھا کہ قدیر کراچی کے بجائے ساہی وال میں نظر آ رہا تھا۔ وہ چند روز قبل اسے کراچی میں چھوڑ کر آیا تھا، پھر وہ ایک پولیس والے کے ساتھ تھا لہٰذا اس کی حیرت اور پریشانی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ بہ ہر حال، اس نے ہمیں لے جا کر اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھا دیا۔

اس سے قبل کہ آفتاب کوئی سوال کرتا، قدیر نے مختصر الفاظ میں اسے ہماری آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کر دیا۔ میں اس دوران میں خاموش نظر سے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ آفتاب کی عمر تیس اور بتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ دراز قامت اور متناسب البدن تھا۔ قدیر کی زبانی، عباس کے انجام سے آگاہ ہو کر اس کا چہرہ غم اور افسوس کے ملے جلے تاثرات سے سج گیا تھا۔ اگر وہ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہا تھا تو پھر کہا جا سکتا تھا، اسے عباس کی موت کا سن کر گہرا رنج ہوا تھا۔

جب قدیر خاموش ہوا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا ''مجھے تو وہ آدمی شکل ہی سے اچھا نہیں لگا تھا.....!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا تم عباس کو بری شکل والا کہہ رہے ہو؟''

''نہیں جی..... عباس تو بہت اچھا تھا۔''

''پھر تم نے کس کا ذکر کیا ہے؟''

''اس نے اپنا نام عطاءاللہ بتایا تھا۔'' آفتاب نے جواب دیا ''لیکن عباس اسے ''گوگا'' کہہ کر بات کر رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے لیکن پتا نہیں، مجھے گوگا بالکل اچھا نہیں لگا مگر میں نے عباس کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔''

''آفتاب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا ''اپنے ذہن کو ٹھکانے پر رکھتے ہوئے مجھے عطاءاللہ عرف گوگا کے بارے میں بتاؤ..... ترتیب سے۔ کیا گوگا بھی تم لوگوں کے ساتھ کراچی سے ٹرین میں بیٹھا تھا؟''

''نہیں جناب!'' آفتاب نے نفی میں گردن ہلائی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتایا ''وہ بندہ میاں چنوں کے اسٹیشن سے ٹرین پر چڑھا تھا۔ وہ ہمارے ڈبے میں پہنچا تو اس وقت ٹرین پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی تھی۔ عباس نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ دونوں میں دونوں انداز میں باتیں ہونے لگیں۔ میں ان کی گفتگو میں ''ہوں، ہاں'' کی حد تک شریک رہا تھا۔ ان کی باہمی بات چیت سے مجھے پتا چلا کہ وہ کسی ضروری کام سے میاں چنوں آیا ہوا تھا اور اب واپس اپنے گھر فرید نگر جا رہا تھا۔ عباس نے اس سے کہا کہ اچھا ہے، ہم ساہی وال سے ایک ساتھ ہی بس میں بیٹھ کر مراداں والی پہنچیں گے۔ اس کے بعد تم فرید نگر کی طرف چلے جانا اور میں نظام پور چلا جاؤں گا۔ آفتاب تو ساہی وال میں ہی رہ جائے گا۔ تم مل گئے ہو تو مجھے اکیلے سفر نہیں کرنا پڑے گا۔''

''تم کوئی محنت سے تیار کی ہوئی کہانی تو نہیں سنا رہے ہو؟'' میں نے چیک کرنے کے لیے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

وہ جلدی سے بولا ''مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے جناب۔ جو سچ تھا وہ میں نے بتا دیا۔ یقین کرنا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔''

''میں اپنے کام کو بڑی اچھی طرح سمجھتا ہوں!'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''یہ بتاؤ، جب تم تینوں ساہی وال کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترے تو پھر کیا ہوا تھا؟''

''بسوں کا اڈا ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''مجھے تو شہر ہی میں آنا تھا اس لیے میں انہیں بس میں بٹھانے کے لیے ان کے ساتھ بس اڈے چلا گیا تھا۔ میں نے انہیں مراداں والی کی جانب جانے والی بس پر سوار کرایا اور ٹہلتے ہوئے اپنے گھر آ گیا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''اس کے بعد کس کے ساتھ کیا ہوا، مجھے کچھ خبر نہیں!''

''تم تو اس روز خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئے تھے لیکن غلام عباس اس دن کیا، کبھی بھی اپنے گھر میں داخل نہیں ہو سکا...'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''اس کے ساتھ، فرید نگر والے دریا کے قریب جو واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل عبدالقدیر نے بتا ہی دی ہے!''

''مجھے اس کی اندوہ ناک موت کا گہرا دکھ ہے تھانے دار صاحب!'' وہ رنجیدہ لہجے میں بولا ''میرا شک تو بار بار گوگا ہی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ بندہ شکل ہی سے مجھے چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔ منحوس چہرے والا کالا کلوٹا..... پتا نہیں، عباس اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں گفتگو کیوں کر رہا تھا!''

''وہ تو کسی سے دشمنی کر ہی نہیں سکتا تھا!'' قدیر نے دکھی لہجے میں کہا ''ہنس مکھ اور ملن سار۔''

آفتاب نے مجھ سے پوچھا ''تھانے دار صاحب! آپ نے کراچی تک تو اپنے بندے دوڑا دیے۔ کیا فرید نگر کو بھی چیک کیا ہے؟''

''ہاں، چیک کیا تھا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''لیکن اس چیکنگ کا انداز دوسرا تھا۔ اب تم نے ایک نیا زاویہ دکھایا ہے تو فرید نگر کو دوبارہ چیک کرنا لازم ہو گیا ہے اور اس مرتبہ چیکنگ میں تم بھی میرے ساتھ ہو گے؟''

''میں..... میرا کیا کام تھانے دار صاحب!''

''تمہارا کام ہے..... اور بہت اہم کام ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''تم نے عطا اللہ عرف گوگا کو دیکھا ہے۔ تم اس کی شناخت میں تعاون کر سکتے ہو اور ایک دوسرا پہلو بھی ہے.....!''

میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا ''گوگا سے مل کر مجھے یہ تصدیق کرنا ہے کہ تم نے ان دونوں کو آٹھ دسمبر کے روز صحیح سلامت بس میں سوار کرایا تھا۔ اگر گوگا نے تمہاری بات کی تصدیق کر دی تو پھر تم بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ تم جیسے ہی شک کے دائرے سے باہر آؤ گے، میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ پھر میں جانوں اور وہ گوگا.....!''

''ٹھیک ہے!'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا ''اگر آپ کی تسلی ایسے ہی ہوتی ہے تو میں آپ کے ساتھ فرید نگر جانے کو تیار ہوں۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب؟'' عبدالقدیر نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارا کام ختم ہو گیا۔'' میں نے جواب دیا ''تم چاہو تو ابھی لودھراں کے لیے روانہ ہو سکتے ہو۔ باقی کا کام میں آفتاب کے ساتھ مل کر کروں گا۔''

''آپ سے ایک چھوٹی سی گزارش ہے جناب!'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''ہاں بولو؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں لودھراں کل چلا جاؤں گا!''

''تو پھر؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ فرید نگر لے چلیں۔'' اس نے کہا ''جب تک عباس کا قاتل قانون کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرفت میں نہیں آجاتا، مجھے سکون نہیں آئے گا۔ اس کے بعد ہی میں تسلی سے کہیں جاسکوں گا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں قدیر!'' میں نے بے دھڑک کہہ دیا۔

اس فوری اجازت کے پیچھے میری ایک مخصوص سوچ تھی۔ عطا اللہ عرف گوگا آفتاب سے مل چکا تھا لہٰذا آفتاب کو سامنے لانا مناسب نہیں تھا۔ وہ گوگا کی گرفتاری کے بعد شناخت کے لیے کام میں لایا جاسکتا تھا البتہ، میں قدیر کے ذریعے گوگا کو آسانی ٹریپ کرسکتا تھا۔ وہ گوگا کے لیے بالکل اجنبی ہوتا لہٰذا گوگا بڑی آسانی سے میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھ دیتا۔ گوگا کو قابو کرنے کا یہ آسان نسخہ ہوتا۔

اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اگر ہم فوری طور پر مراداں والی کے لیے روانہ ہوجاتے تو چار، سوا چار بجے وہاں پہنچ سکتے تھے۔ یہ بات میرے پیش نظر تھی کہ ہمیں فرید نگر کے لیے دریا عبور کرنا تھا اور یہ کام شام سے پہلے ہی کیا جاسکتا تھا کیونکہ سورج غروب ہوجانے کے بعد ریاستی کشتی کو روک دیتا تھا جو دریا عبور کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔

میں نے قدیر اور آفتاب کو اپنے ساتھ لیا اور ساہی والی سے مراداں والی آنے والی بس میں سوار ہوگیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج کی تاریخ میں گوگا میری گرفت میں ہوگا اور یہ کیس بھی حل ہوجائے گا!

☆☆☆

تفتیش کی گاڑی ایک ایسی متحرک شے ہے جو شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ جب تک کسی معاملے میں کسی پر شک نہ ہو، آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ عباس مرڈر کیس اس وقت تک جمود کا شکار رہا جب تک کوئی مشکوک شخص سامنے نہیں آیا تھا اور..... گوگا کا نام منظر پر ابھرتے ہی کارروائی میں اچانک بہت زیادہ تیزی آگئی تھی۔

میں اے ایس آئی گل فراز اور عبدالقدیر کے ہم راہ دن ڈھلنے سے پہلے دریا عبور کرکے فرید نگر کی حدود میں داخل ہوچکا تھا۔ آفتاب کی زبانی پتا چلا تھا کہ گوگا فرید نگر کا رہنے والا ہے۔ میرے تھانے میں بھی ایک کانسٹیبل فرید نگر سے تھا۔ میں نے آگے قدم بڑھانے سے قبل اس کانسٹیبل سے گوگا کے بارے میں تصدیق کرلی تھی۔ آفتاب نے گوگا کا جو قد کاٹھ اور حلیہ بیان کیا تھا اسے سن کر مذکورہ کانسٹیبل نے تصدیق کردی کہ گوگا فرید نگر ہی کا رہنے والا ہے بلکہ اس نے گوگا کے گھر کی لوکیشن بھی ہمیں سمجھا دی۔ لہٰذا ہمیں مطلوبہ گھر تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

میں اور اے ایس آئی گل فراز سادہ لباس میں تھے تاکہ ہمیں پولیس کی وردی میں دیکھ کر فرید نگر میں کوئی ہل چل نہ مچے اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ ہم تینوں کسی کی نظر میں تشویش پیدا کیے بغیر گوگا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ گوگا اس گھر میں اپنی بوڑھی ماں جنت بی بی کے ساتھ رہتا تھا۔

میں اور اے ایس آئی تھوڑے فاصلے پر رک گئے اور قدیر سے کہا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ قدیر کو سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

قدیر کی دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور ایک سیاہ بھجنگ چہرہ کھلے ہوئے دروازے میں نمودار ہوا۔ تاریکی کے باوجود بھی میں نے اس شخص کے حلیے اور خدوخال سے پہچان لیا کہ وہ گوگا ہی تھا۔ میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

گوگا نے اپنے سامنے ایک اجنبی کو کھڑے پایا تو اس کے چہرے پر سیکڑوں سوالیہ لکیریں کھنچ گئیں۔ قدیر نے میری ہدایت کے مطابق اس سے کہا ''تم گوگا ہی ہو نا؟''

''ہاں..... مگر تم کون ہو..... اور میرے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟'' گوگا نے بات ختم کرنے سے پہلے نگاہ اٹھا کر ہماری جانب دیکھا اور قدیر سے کہا ''میں تو تمہیں نہیں جانتا!''

میں اور اے ایس آئی ایسے زاویے سے کھڑے تھے کہ تاریکی کے باعث گوگا ہمارے چہرے پوری طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ قدیر نے اس سے کہا۔

''میں بھی تمہیں نہیں جانتا لیکن وہ دونوں تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ میاں چنوں سے تمہیں ملنے آئے ہیں..... کمال دین اور افتخار احمد!''

''میاں چنوں؟'' وہ ایسے اچھلا جیسے اپنے سامنے کسی خوف ناک بلا کو دیکھ لیا ہو۔ اس استفسار کے ساتھ ہی گوگا نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔

قدیر کو اس کی جانب سے ایسی حرکت کی بھرپور توقع تھی لہٰذا پلک جھپکتے میں اس نے گوگا کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس نے میکانکی انداز میں گوگا کو ایک دھکا دیا تو وہ توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اگلے ہی لمحے وہ ''دھڑام'' کی آواز کے ساتھ گھر کے صحن میں جا گرا۔

قدیر کا کردار بس اتنا سا تھا۔ اس کے بعد میں بجلی کی سی سرعت سے متحرک ہوا اور ایک جست بھر کر گوگا کے گھر میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داخل ہوگیا۔ پھر اس سے قبل کہ گوگا خود کو سنبھال کر اٹھتا، میں اس کے سر پر پہنچا اور اس کے دونوں بازوؤں کو موڑ کر پشت پر کس دیا۔

میری تقلید میں گل فراز بھی چھلانگ لگا کر گھر میں گھس آیا تھا۔ اس نے گوگا کو میری گرفت میں بے بس دیکھا تو فوراً ہتھ کڑی برآمد کرلی۔

میں گوگا کے ہاتھوں کو اس کی پشت پر جکڑے کھڑا تھا لہٰذا اے ایس آئی نے الٹی ہتھ کڑی لگادی۔ میں نے گوگا کے سامنے جاتے ہوئے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

''بتاؤ، تم نے کراچی سے آنے والے عباس کے ساتھ کیا کیا تھا؟''

''عباس .....کون عباس؟'' وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اس کے گالوں پر دو چار کرارے تھپڑ رسید کیے اور پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا'' میں اس عباس کی بات کررہا ہوں جو موضع نظام پور کار ہنے والا ہے اور آٹھ دسمبر کو تم اس کے ساتھ ساہی وال کے اڈے سے بس میں سوار ہوکر مراداں والی پہنچے تھے.....کچھ یاد آیا یا کوئی دوسرا فارمولا آزماؤں؟''

اٹھا پٹخ کی آوازیں سن کر گوگا کی ماں جنت بی بی ایک کمرے سے برآمد ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھنے لگی'' آپ کون لوگ ہیں اور میرے بیٹے کو ماریوں رہے ہیں؟''

میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا'' میں اس علاقے کا تھانہ ان چارج ملک صفدر حیات ہوں اور غلام عباس نامی ایک بندے کے قتل کی تفتیش کررہا ہوں۔''

میرے اس تعارف سے گوگا کے چہرے کے تاثرات میں کوئی نمایاں تبدیلی دیکھنے کو نہ ملی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/300

جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا''ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں''۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا ''میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں''نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/225

اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی المناک داستان

قیصر و کسریٰ -/300

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی حالات اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

پاکستان سے یارِ حرم تک -/125

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

گمشدہ قافلے -/300

انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/200

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت -/275

اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلہ حجاز -/300

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون -/300

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی -/275

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ -/150

بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ -/225

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اُندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی -/125

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیئوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر مجاہد برسرِ میدان کھانی پڑی

محمد بن قاسم -/225

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش -/100

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان -/275

سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی -/300

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

شاہین -/275

اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد -/125

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا -/225

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین -/225

اُندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس

• لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدر آباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعارف سے پہلے ہی مجھے پہچان چکا تھا۔ میں جب اس کے سامنے آیا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ مجھے تھانے دار کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا تھا۔

جنت بی بی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا'' تھانے دار صاحب! میرے بیٹے کا کسی عباس کے قتل سے کیا تعلق ہے؟''

''تم خاموش بیٹھ کر دیکھتی رہو'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا'' سارا تعلق اور تمہارے بیٹے کا کھیل تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ میں تم سے کچھ بھی چھپا کر نہیں کروں گا۔'' پھر میں نے گوگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس روز میاں چنوں سے ٹرین پر سوار ہوئے تھے۔ مقتول غلام عباس، آفتاب نامی ایک بندے کے ساتھ کراچی سے آرہا تھا۔ تم اور عباس پہلے سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے لہٰذا تم میں بے تکلفی سے گفتگو ہونے لگی۔ آفتاب کو ساہی وال تک ہی جانا تھا لہٰذا وہ تم دونوں کو بس میں سوار کرا کے اپنے گھر چلا گیا تھا اور.....!''

''جناب! آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے نیم احتجاجی لہجے میں بولا'' میں کسی آفتاب اور عباس کو نہیں جانتا اور یہ کہ..... میں تو کافی عرصے سے میاں چنوں گیا ہی نہیں۔ آپ مجھ سے.....''

پہلے اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی تھی، اب کی بار میں نے اس پر لات گھونسے برساتے ہوئے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ اس کی مناسب سی'' خاطر تواضع'' کے بعد میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔

''گوگا! یہ مت سمجھنا کہ میں نے تم پر کچا ہاتھ ڈالا ہے اور یہ کہ تم اپنی کسی مکاری سے مجھے فریب دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ جس آفتاب کی شناسائی سے تم انکاری ہو، وہ اس وقت تھانے کے اندر بیٹھا ہے۔ میں آج سہ پہر میں اسے ساہی وال سے لے کر آیا ہوں! اور اب تمہیں بھی تھانے پہنچانے والا ہوں۔ تم آفتاب کو دیکھتے ہی پہچان لو گے اور تمہیں یہ بھی یاد آجائے گا کہ تم آٹھ دسمبر کو میاں چنوں سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے، پھر ساہی وال کے بس اڈے سے آفتاب نے تمہیں اور مقتول عباس کو بس میں بٹھایا تھا۔'' میں لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو متوقف ہوا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''اور کوشش کر کے تمہیں یہ بھی یاد کرنا ہوگا کہ مقتول عباس کے پاس جو دو ہزار روپے تھے وہ کہاں غائب ہو گئے۔ جائے وقوعہ پر اس کا جو سامان مجھے ملا، میں نے اسے اچھی طرح کھنگالا ہے اور مقتول کی جامہ تلاشی بھی میں لے چکا ہوں لیکن دو ہزار کی تگڑی رقم میرے ہاتھ نہیں لگی۔ اس'' راز'' سے تم ہی پردہ اٹھا سکتے ہو؟''

وہ ایک سیاہ رو شخص تھا۔ میں نے حقیقت بیان کرتے ہوئے، حالات کی جو بھیانک شکل اسے دکھائی تھی اس نے اسے بے پناہ خوف زدہ کر دیا اور اسی خوف کے باعث اس کا چہرہ سیاہ ترین نظر آنے لگا تھا۔ اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

''جناب.....! آپ کی کوئی..... غلط فہمی.....!''

''غلط فہمی کی اولاد!'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور غصیلے لہجے میں کہا'' تم خود کو ٹیڑھی کھیر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن یاد رکھو، میں نے کتے کی دم جیسی ٹیڑھی چیزوں کو بھی خاص'' ٹریٹ منٹ'' سے سیدھا کیا ہے۔ تم کس کھیت کی مولی ہو؟''

گوگا اس دھمکی پر، اندر سے لرز کر رہ گیا لیکن اوپر سے وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اے ایس آئی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! اس کو تھانے لے چلتے ہیں۔ وہاں اس کی زبان بولنے کے'' قابل'' ہو جائے گی!''

''میرا بھی یہی خیال ہے گل فراز!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' لیکن یہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ایک ضروری کام بھی کرنا ہے۔''

اے ایس آئی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے کہا۔

''میں اس سورما کو سنبھالے ہوئے ہوں۔ تم قدیر کے ساتھ مل کر اس کے گھر کی تلاشی لو..... بہت اچھی طرح، ایک ایک شے کو چیک کرنا ہے۔ اگر گوگا نے ایک سوئی بھی کہیں چھپا کر رکھی ہے تو اسے برآمد ہونا چاہیے۔''

میرے اس احکام پر گوگا کا چہرہ متغیر ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں بھی مجھے بڑے اونچے درجے کا اضطراب ہلکورے لیتا ہوا محسوس ہوا مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ دال میں کچھ کالا تھا اور..... گوگا کی رنگت کو دیکھتے ہوئے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ یہاں تو پوری دال ہی کالی تھی جو اس کے کالے کرتوتوں کی بڑی سنسنی خیز کہانی سنا رہی تھی۔ میری تجربہ کار نگاہ نے فوراً بھانپ لیا کہ گوگا کو اپنے انجام کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقین ہوگیا ہے!

تھوڑی ہی دیر کے بعد میرا اندازہ صد فی صد درست ثابت ہوا۔ اے ایس آئی جوش بھرے انداز میں ایک کمرے سے برآمد ہوا۔ قدیر بھی اس کے عقب میں دکھائی دیا۔ میں نے گل فراز کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تھیلی دیکھی جو اس نے نمایاں کر کے پکڑ رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا اس کے چہرے پر اور حرکات وسکنات میں جو جوش اور ولولہ نظر آرہا ہے وہ اسی چرمی تھیلی کا رہین منت ہے اور..... میرے اس اندازے کی تصدیق عطاءاللہ عرف گوگا نے بھی کردی۔

میری طرح اس نے بھی گل فراز کے ہاتھ میں مذکورہ چرمی تھیلی دیکھ لی تھی اور اس تھیلی کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر کچھ ایسی نوعیت کے آثار ابھرے تھے جیسے اس کا کروڑوں' اربوں مالیت کا کوئی مال بردار جہاز بیچ سمندر کے غرق آب ہوگیا ہو۔ وہ ہراحتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس تھیلی کی جانب دوڑ پڑا تھا۔ ان لمحات میں اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں الٹی ہتھکڑی لگی ہوئی ہے!

اے ایس آئی نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور چرمی تھیلی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا صاحب! اس بدبخت کے جرم کا ٹھوس ثبوت مل گیا ہے۔ اس تھیلی کے اندر پورے دو ہزار روپے کے نوٹ بھرے ہوئے ہیں جو اس نے کپڑوں والے صندوق میں، ایک قمیص کی تہ میں چھپائی ہوئی تھی۔''

بات ختم کرتے ہی اے ایس آئی، زمین پر پڑے گوگا کی طرف لپکا پھر بڑی بے دردی سے اس پر ٹھڈے برسانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قدیر بھی اس نیک کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ میں ایک سکون بخش گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ بالآخر، عباس کے قتل کا معما حل ہوگیا تھا!

جب گل فراز اور قدیر اپنے ارمان نکال چکے تو میں نے گوگا سے، چرمی تھیلی والی رقم کے بارے میں استفسار کیا۔ اس کے پاس کوئی بھی معقول اور تسلی بخش جواب نہیں تھا جو اس کے مجرم ہونے کی ایک ٹھوس دلیل تھی۔

اس رات میں نے رمضانی ماہی گیر کو کچی نیند سے جگایا اور اسے ''نائٹ ڈیوٹی'' کرنے پر مجبور کیا۔ وہ اپنی کشتی میں مجھے، گل فراز، قدیر اور زیر حراست گوگا کو بٹھا کر فرید نگر سے موضع مراداں والی لے آیا۔

گوگا راستے بھر خاموش رہا تھا اور میں نے بھی اسے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے مجرم ہونے میں کسی شک وشبے کی گنجایش باقی نہیں تھی اور رہی سہی کسر اس وقت پوری

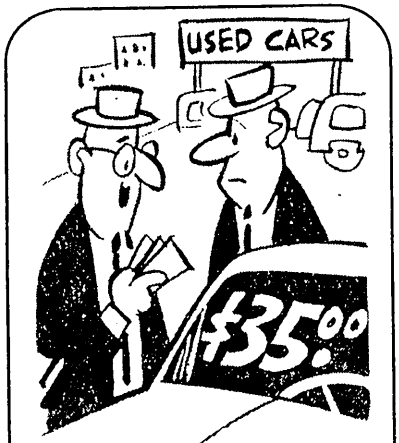

''ذرا اس کی قیمت بتادیں۔ مجھے یہ کار کسی کو تحفے میں دینی ہے۔''

ہوگئی جب گوگا پر نگاہ پڑتے ہی آفتاب پکار اٹھا تھا۔

''یہی ہے وہ بندہ..... جسے اس روز، میں نے عباس کے ساتھ ساہی وال کے اڈے سے بس میں بٹھایا تھا!''

میں نے گوگا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' تم شرافت سے اپنے جرم کا اقبال کرتے ہو یا آج کی رات میں تمہیں حوال دار حیدر شاہ کے حوالے کردوں۔ حیدر شاہ بہت ہی مہمان نواز اور متواضع ثابت ہوا ہے۔ تمہاری یہ رات بڑے آرام وسکون سے گزرے گی!''

میرا معنی خیز استفسار اس کی عقل میں، جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ پولیس والوں کی مہمان نوازی اور خاطر داری کا مفہوم اچھی طرح سمجھتا تھا لہٰذا مجھے یا حوال دار کو اس پر زیادہ ''محنت'' نہیں کرنا پڑی۔ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے غلام عباس کے قتل کا اقرار کرلیا۔

اس کے اقبال جرم کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔ عباس کی زبانی گوگا کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے پاس دو ہزار روپے ہیں اور یہ پتا چلتے ہی اس کی نیت خراب ہوگئی۔ مراداں والی پہنچنے سے پہلے ہی وہ اسے لوٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر عباس اس کے لیے کوئی اجنبی ہوتا تو لوٹنا ہی کافی تھا لیکن بعد میں پکڑے جانے کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے اس نے عباس کو جان سے مارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جب وہ لوگ مراداں والی پہنچ کر بس سے نیچے اترے تو گوگا نے عباس سے کہا'' تمہیں تو اپنے گاؤں جانے کے لیے یہاں سے سیدھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تانگا مل جائے گا لیکن مجھے دریا کے کنارے تک پیدل ہی جانا ہوگا۔ اب رات ہو چکی ہے۔ پتا نہیں، کشتی والا بھی ملتا ہے یا نہیں۔ تم ایسا کرو کہ دریا تک میرے ساتھ چلو۔ اگر مجھے کشتی مل گئی تو میں اس میں بیٹھ کر فرید نگر چلا جاؤں گا، تم واپس آ جانا اور اگر کشتی نہ مل سکی تو میں بھی تمہارے ساتھ واپس آ جاؤں گا۔ مراداں والی سے مجھے سالم تانگا کرنا پڑے گا جو اوپر سے گھما کر، دریا کے پرانے پل پر سے گزارتے ہوئے مجھے فرید نگر پہنچا آئے گا۔ یہ سفر خاصا طویل تو ہو جائے گا لیکن کیا کریں مجبوری ہے، گھر تو جانا ہے نا۔ اگر ٹرین لیٹ نہ ہوتی تو ہم سورج غروب ہونے سے پہلے ہی مراداں والی پہنچ جاتے۔''

یہ بات عباس کو بھی معلوم تھی کہ ٹرین اپنے مقررہ وقت سے ڈھائی تین گھنٹے لیٹ تھی۔ اس نے گوگا کی بات پوری توجہ سے سنی اور مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ مقتول ایک شریف انسان تھا، اس سے کسی ایسی ہی اخلاقی پیش کش کی توقع کی جا سکتی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ دریا تک چلتا ہوں لیکن وعدہ کرو، اگر تمہیں کشتی نہ ملی تو اِدھر اُدھر خوار ہونے کے بجائے تم تانگے میں میرے ساتھ بیٹھ کر نظام پور چلو گے۔ رات میرے گھر میں گزارنا اور صبح واپس آ جانا۔''

گوگا اگر چہ رات کو اپنے گھر ہی جانا چاہتا تھا لیکن عباس سے ایسا وعدہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس کے لیے یہی خوشی کی بات تھی کہ عباس اس کے ہم راہ دریا کی سمت جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ دریا کے قریب کسی ویران مقام پر اسے موت کے گھاٹ اتارتا اور دو ہزار روپے لے کر غائب ہو جاتا..... اور آٹھ دسمبر کی رات کے ابتدائی حصے میں اس نے ایسا ہی کیا تھا!

میں نے گوگا سے کلہاڑی کے بارے میں سوال کیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ مقتول کو کلہاڑیوں کے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ تمہارے پاس کلہاڑی کہاں سے آئی اور تم نے بعد میں آلۂ قتل کو کہاں چھپایا؟''

''جب ہم مراداں والی کے اندر سے گزر کر دریا کی جانب جانے والی بگ ڈنڈی پر آئے تو وہ کلہاڑی مجھے راستے میں پڑی ملی تھی۔'' گوگا نے جواب دیا۔ ''پہلے میرا ارادہ عباس کو گلا گھونٹ کر مارنے کا تھا مگر کلہاڑی مل جانے کے بعد میں نے اپنے پروگرام میں فوراً تبدیلی کر لی اور..... اس کے قتل کے بعد میں نے وہ خون آلود کلہاڑی دریا میں پھینک دی تھی۔''

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایک ایسا نکتہ بھی درج تھا جو ابھی تک میرے ذہن کو الجھائے ہوئے تھا۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتول پر دو کلہاڑیوں سے وار کیے گئے تھے۔ میں نے اس تناظر میں جب گوگا سے پوچھ گچھ کی تو اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

''جناب! میرے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اکیلے ہی عباس کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے یک ساں کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور اس رات بھی میں نے ہاتھ بدل بدل کر عباس پر کلہاڑیاں برسائی تھیں۔ کبھی اس ہاتھ سے وار کیا اور کبھی دوسرے ہاتھ سے اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب زندہ نہیں رہا تو میں نے دونوں ہاتھ روک لیے۔''

میں نے خوں خوار نظر سے گوگا کو دیکھا اور ایک بوجھل سانس خارج کی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں درج نکتہ بھی حل ہو گیا۔ کلہاڑی کے مختلف واروں کے زاویے ایک دوسرے سے جدا تھے لہٰذا یہی اندازہ قائم کیا گیا تھا کہ عباس کو دو کلہاڑیوں کی مدد سے قتل کیا گیا تھا، جبکہ کلہاڑی تو ایک ہی تھی لیکن عباس پر وار کرنے والے ہاتھ دو تھے، یہ الگ بات کہ وہ دونوں ہاتھ کسی ایک ہی شخص کے تھے..... عطاء اللہ عرف گوگا..... غلام عباس کا قاتل!

قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے میرے اختیار میں جو کچھ بھی تھا، میں نے گوگا کو سخت ترین سزا دلوا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا اور اس کے گھر کی تلاشی کے دوران میں برآمد ہونے والے دو ہزار روپے مقتول کے والدین کے حوالے کر دیے۔ اس رقم پر انہی کا حق بنتا تھا۔

اس زمانے میں دو ہزار روپے ایک غیر معمولی رقم تھی لیکن کسی بھی ماں باپ کے لیے یہ رقم اس کی اکلوتی اولاد کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں نے کیا۔ میں ان کے نقصان کو تو پورا نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نقصان کے ذمے دار شخص کو میں نے عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیا تھا۔

لالچ کو اسی لیے بری بلا کہا گیا ہے کہ یہ انسان کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دیتا ہے کہ پھر حصولِ مقصد کے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ گوگا نے دو ہزار روپے کے لالچ میں، ایک جیتے جاگتے شریف انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا..... وہ انسان جو اپنے والدین اور راحیلہ کے ''شجر امید'' کی حیثیت رکھتا تھا۔

نامراد گوگا نے اس درخت کو جڑ ہی سے کاٹ ڈالا تھا!

(تحریر حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیسرا زاویہ

ملک صفدر حیات

حقیقت کو چھپانا اگرچہ مشکل ضرور ہوتا ہے مگر کچھ فن کار ایسے ہوتے ہیں جو سچ کو اس طرح جھوٹ کے اندھیروں میں گم کر دیتے ہیں کہ پھر سچائی جھوٹ کا حصہ بن جاتی ہے ..... تاہم یہ فن کاری ایک حد تک ہی چل سکتی اور پھر حقیقت سے پردہ اٹھتا ہے تو بے شمار کراہت آمیزہ کردار سامنے آجاتے ہیں..... ایک سچ کی کہانی جسے جھوٹ کی دیواروں میں قید کر کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا گیا تھا۔ ملک صفدر کی ڈائری خصوصی انتخاب

زندہ کرداروں پر مشتمل ایک داستان الم ناک ایک معاشرتی المیے کی سچی کہانی

ایک کام یاب پولیس افسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی نفسیات سے بھرپور واقفیت رکھتا ہو کیوں کہ علم نفسیات دنیا کا سب سے بڑا علم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کائنات کا سب سے اہم پرزہ انسان ہے لہٰذا انسان کے بارے میں آگاہی دینے والا علم کائناتی سائنس قرار پائے گا۔ ایک ماہر نفسیات بھی بغیر وردی کا تفتیشی افسر ہی ہوتا ہے!

آج میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا جو واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اس میں انسانی نفسیات کا بڑا گہرا عمل دخل دیکھنے کو ملے گا لہٰذا کہانی کو بڑی توجہ اور انہماک سے پڑھنے کی ضرورت ہے ورنہ آپ کا ذہن الجھ سکتا ہے اور الجھا ہوا ذہن بہرحال انسان کو کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جاتا ہے یا پھر تھانہ ان چارج سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

وہ بڑے خوش گوار دن تھے۔ موسم میں ایک مستی اور ترنگ سی بھری ہوئی تھی۔ خزاں رخصت ہونے کو تھی اور گلابی جاڑے کی آمد دکھائی دینے لگی تھی۔ آسمان صاف شفاف فضا معطر اور ماحول ہر نوعیت کی سرگرمیوں کے لیے انتہائی سازگار۔ ایسے ہی ایک اجلے اور نکھرے ہوئے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ کانسٹیبل نے میرے پاس آکر بتایا۔

''ملک صاحب! ایک بندہ آپ سے ملنے کی ضد کر رہا ہے!''

''کیا پریشانی ہے اس کو؟'' میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا ''جناب ہم تو پوچھ پوچھ کر تھک گئے لیکن وہ ایک ہی بات پر اڑا ہوا ہے کہ اسے جو کچھ بھی کہنا ہے وہ آپ ہی سے کہے گا۔ صورت سے وہ خاصا پریشان نظر آتا ہے۔''

''اچھا..... تو اب تمہیں صورتیں پڑھنا بھی آگئیں!'' میں نے گھور کر کانسٹیبل کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا۔ جلدی سے اس نے کہا۔ ''نہیں ملک صاحب! میں اتنا مردم شناس تو ابھی نہیں ہوا۔ بس اس کی حرکتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔''

میں نے کانسٹیبل کو ڈانٹنے کے لیے ایسا سوال نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ سے میرا یہ انداز رہا ہے کہ جونیئرز کی تربیت کے لیے میں اکثر و بیشتر ان سے ایسے چبھتے ہوئے استفسارات کرتا رہتا تھا۔ اس سے وہ کچھ نہ کچھ سیکھتے تو تھے ہی اس کے ساتھ ہی انہیں چاق و چوبند رہنے کی عادت بھی ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے حواس اور ذہن کو بیدار رکھتے کہ پتا نہیں' میں کس وقت ان سے کون سا ٹیڑھا سوال پوچھ لوں گا۔ بہرحال' میرے استفسار پر کانسٹیبل نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا تو میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ ''ابھی'' سے تمہاری کیا مراد ہے۔ تمہیں مردم شناس بننے میں اور کتنا وقت لگے گا۔ میرے خیال میں تمہیں پولیس کے محکمے میں آئے ہوئے دو سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ یہ اچھی خاصی مدت ہوتی ہے؟''

''جی..... میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد.....!''

وہ وضاحت کرنے لگا تو میں نے اس کی بات کاٹ دی پھر سرسری انداز میں اس سے کہا ''بھیجا ٹھیک ہے' تم اس پریشان حال بندے کو میرے پاس بھیج دو۔''

''وہ یس سر!'' کہتے ہوئے جانے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''نام کیا ہے اس بندے کا؟''

''نام تو اس کا رحیم بخش ہے جناب!'' کانسٹیبل نے جواب دیا ''لیکن ''لالی'' کے نام سے مشہور ہے۔ لوگ اسے اصل نام سے کم ہی بلاتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' تم اسے اچھی طرح جانتے ہو؟''

''جی' وہ اسی قصبے کا رہنے والا ہے۔''

''ٹھیک ہے' بھیجو اسے!''

اِدھر کانسٹیبل کمرے سے نکلا' اُدھر رحیم بخش عرف لالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے سامنے حاضر ہوگیا۔ میں گہری نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ کانسٹیبل نے اس کی جس نامعلوم پریشانی کا ذکر کیا تھا' وہ اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور ساتھ ہی اپنی میز کی دوسری طرف بچھی کرسی کی جانب اشارہ بھی کردیا۔

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

لالی کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت کا حامل' اوسط شکل وصورت کا انسان تھا۔ صحت نہ تو بہت زیادہ اچھی تھی اور نہ اسے مخدوش قرار دیا جاسکتا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا کہ شاید وہ بیمار ہے۔

میں نے بدستور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی لالی! تمہیں مجھ سے ایسا کون سا کام پڑ گیا ہے جو کسی اور کو نہیں بتا سکتے۔ کانسٹیبل نے بتایا ہے کہ تم مجھ سے ملنے کی ضد کررہے تھے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا ''تھانے دار صاحب! بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں کسی اور سے ذکر نہیں کرسکتا.....!''

''ایسی کیا بات ہے رحیم بخش؟'' اس کے پُراسرار انداز نے میرے ذہن میں تجسس کو بیدار کردیا اور میں قدرے آگے کو جھک آیا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''جناب! آپ میرا مذاق تو نہیں اُڑائیں گے ناں؟''

''ہرگز نہیں!'' میں نے یقین دلانے والے انداز میں کہا پھر پوچھا ''کیا تم مجھ سے کوئی ایسی بات کہنے والے ہو جس پر مذاق اُڑایا جاسکتا ہے؟''

''نہیں جی' بات تو مذاق والی نہیں لیکن کیا پتا.....!'' اس نے متاملانہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تم بے فکر ہوکر بول سکتے ہو۔ اگر بات مذاق والی نہیں تو میں پوری توجہ اور سنجیدگی سے تمہارا مسئلہ سنوں گا۔''

وہ چند لمحات تک ذہنی کش مکش میں مبتلا نظر آیا پھر ہمت کر کے اس نے کہہ ہی دیا ''وہ جناب! میں دراصل زری کی شکایت کرنے آیا ہوں۔''

''زری..... یہ کون ہے؟''

''زری میری بیوی کا نام ہے..... زرینہ!''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہرا سانس خارج کیا پھر پوچھا۔ ''رحیم بخش! تمہاری بیوی نے ایسا کیا کردیا ہے جو تمہیں اس کی شکایت کے لیے تھانے آنا پڑا؟''

''جناب! وہ مجھے بہت تنگ کرتی ہے.....'' وہ مبہم انداز میں بولا۔

''یہی تو میں بھی جاننا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''زرینہ عرف زری تمہیں کیا تنگ کرتی ہے؟''

''وہ مجھے مارتی ہے جناب.....!'' اس نے بڑے یتیمانہ انداز میں بتایا۔

''مارتی ہے.....؟'' میں حیرت بھری نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

''آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا ناں تھانے دار صاحب!'' وہ شاکی لہجے میں بولا۔

میں نے تیز نظر سے اسے گھورا اور شک زدہ لہجے میں پوچھ لیا ''رحیم بخش! کیا تم نے ایسی بات کی ہے کہ میں فوراً تمہارا یقین کرلوں۔ کیا زرینہ اتنی ہی طاقت ور ہے کہ تم اس کے ہاتھوں بہ آسانی پٹ جاتے ہو۔ تم بڑی انوکھی اور عجیب سی شکایت لے کر آئے ہو میرے پاس اور بہ ضد ہو کہ میں تمہاری بات کا یقین بھی کرلوں..... ہیں؟''

''جناب!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا ''یہ بات انوکھی اور عجیب ضرور ہے لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ میں نے آپ سے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ واقعی میری پٹائی کرتی ہے!''

''اور تم بڑی شرافت سے مار کھا لیتے ہو؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''جناب! یقین کریں' میں اس کے سامنے بے بس ہوجاتا ہوں!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''میں مان لیتا ہوں' وہ زبردست ہے' تم پر کسی وجہ سے حاوی ہے۔ تم اس کے سامنے پھس ہوکر رہ جاتے ہو۔ وہ تمہاری پٹائی کرتی ہے اور تم خاموشی سے پٹ بھی جاتے ہو لیکن مجھے ایک بات بتاؤ.....!''

میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تاہم اس نے کچھ پوچھنے کی زحمت نہ کی۔

میں نے پوچھا ''ذرا سوچ کر بتاؤ' کیا تمہاری بیوی کوئی پاگل عورت ہے؟''

''نہیں جناب' ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''کیا اس پر کوئی جن وغیرہ آتا ہے؟''

''نہیں جی..... یہ جن بھوت والا معاملہ بھی نہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جب اس کا دماغ درست ہے اور جن وغیرہ والی بھی کوئی بات نہیں ہے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتی ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوگا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''یقیناً تم مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

وہ چند لمحات تک متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر قدرے مجبور سے لہجے میں بولا ''تھانے دار صاحب! میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ آپ میری بات کا یقین کریں' وہ بیٹھے بٹھائے خوامخواہ ہی لڑائی شروع کر دیتی ہے۔ زبانی کلامی تو میں اس کا مقابلہ کرتا ہوں لیکن جب وہ ہاتھ پاؤں چلاتی ہے تو اس کے آگے میری پیش نہیں جاتی اور وہ مجھے سوتی کپڑے کی طرح دھو ڈالتی ہے۔ اس دوران میں وہ بالکل خاموش رہتی ہے تاکہ آس پڑوس والوں کو ہمارے جھگڑے کی خبر نہ ہو اور اس کے ساتھ ہی مجھے بھی وہ دھمکی دیتی ہے کہ اگر میں نے اس مار پیٹ کے بارے میں کسی کو بتایا تو وہ میرے ساتھ بری طرح پیش آئے گی لیکن..... میری برداشت اب جواب دے گئی ہے' اس لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔'' بات ختم کرتے ہی وہ مدد طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

رحیم بخش عرف لالی خاصا دلچسپ کردار ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''وہ تمہیں روئی کے مانند دھنک کر رکھ دیتی ہے پھر اس دھمکی کی کیا اہمیت ہے کہ وہ تمہارے ساتھ بری طرح پیش آئے گی؟''

''جناب!'' وہ خوف زدہ انداز میں آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا ''وہ بڑے خطرناک طریقے سے مجھے ڈراتی ہے کہ اگر میں نے اس کے سلوک کا ذکر کسی سے کیا تو وہ مجھے کھانے میں زہر ملا کر موت کی نیند سلا دے گی یا کسی رات سوتے میں تیز چھری سے میری شہ رگ کاٹ ڈالے گی اور مشہور کر دے گی..... گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے' لالی نے ان کے سامنے مزاحمت کی اور وہ اس کی گردن کاٹ کر چلے گئے۔ ان باتوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کی عورت ہے!''

''تمہاری اس جنگ جو بیوی کے بارے میں کوئی اندازہ تو میں بعد میں قائم کروں گا لیکن میں نے بہ خوبی یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ تم بڑے بودے مرد ہو۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''ایک مرد ہو کر اپنی بیوی کے سامنے اس طرح بے بس ہو جاتے ہو کہ جو بھی سنے گا' تمہاری مردانگی پر شک کرے گا۔ کیا تمہیں شرم محسوس نہیں ہوتی؟''

''مجھے بہت زیادہ شرم آتی ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا ''اسی لیے تو آج تک کسی کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ اب آپ ہی اس مسئلے کو حل کر دیں اور.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر کمزور سے سینے کو حد سے زیادہ پھلاتے ہوئے بولا ''جہاں تک مردانگی کا تعلق ہے نا تو..... ایسی ویسی تشویش کی کوئی بات نہیں۔ میں بس اس بات سے ڈرتا ہوں کہ جگ ہنسائی نہ ہو..... بس اتنی سی بات ہے!''

لالی بات ختم کر کے خاموش ہوا تو مجھے اس کی حالتِ زار پر ترس آنے لگا۔ ایسے مجبور اور لاچار قسم کے شوہر بڑے قابلِ رحم دکھائی دیتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ ایسے شوہروں کو جب گہرائی تک کریدا جائے تو نوے فی صد کیسز میں وہی قصور وار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی بعض مخصوص خامیوں اور نااہلیوں کے سبب بیویوں کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں اور پھر زندگی بھر ان کے لات جوتے کھاتے رہتے ہیں۔ لالی بھی مجھے کچھ اسی نوعیت کا کیس نظر آ رہا تھا لیکن اس کی کسی عملی مدد سے پہلے مجھے یہ پتا لگانا تھا کہ اس کے اور زری کے درمیان خرابی کہاں واقع تھی اور یہ معلومات اس سے گفتگو کر کے ہی حاصل کی جا سکتی تھی..... یہ معلومات حاصل کرنے سے پہلے میں نے اس کے سامنے ایک چال چلی۔

ٹٹولتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے میں نے اس سے کہا ''رحیم بخش! تم اپنی بیوی سے اس قدر عاجز ہو اور ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ کسی بھی وقت تمہاری جان لے لے گی تو..... ایسی خوں خوار اور خطرناک بیوی سے تم ہمیشہ کے لیے جان کیوں نہیں چھڑا لیتے؟''

''ہمیشہ کے لیے جان چھڑا لوں.....'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''یعنی آپ کا مطلب ہے.....؟''

اس نے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں جناب! یہ ممکن نہیں ہے.....!''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''پہلی بات تو یہ جناب.....! کہ زری بہت خوب صورت ہے۔ میں اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ موت سے پہلے ہی مجھے قتل کر دے گی۔ وہ..... وہ بہت جنونی ہو جاتی ہے۔''

میں چند لمحات تک متذبذب انداز میں دیکھتا رہا پھر میں نے تسلی آمیز لہجے میں لالی سے کہا ''تم بالکل ٹھیک جگہ پر آ گئے ہو۔ تمام فکروں اور پریشانیوں کو اپنے اندر سے نکال دو۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے لیے جو کچھ کرسکتا ہوں، وہ ضرور کروں گا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھ سے بھرپور تعاون کرو۔ میں تم سے جو کچھ بھی پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ آپ پوچھیں' کیا پوچھنا ہے!''

میں نے پوچھا ''تمہاری عمر اس وقت کیا ہوگی؟''

''آنے والے ساون میں پورے چالیس سال کا ہوجاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تمہاری بیوی زری کی عمر کتنی ہے؟''

''بائیس سال!'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے فوراً ذہن میں حساب لگایا۔ زری' لالی سے عمر میں کم وبیش آدھی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ شوہر کی عمر بیوی سے چند سال..... زیادہ سے زیادہ آٹھ دس سال زیادہ ہونا چاہیے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ عمر کے اس تفاوت پر ہوں کہ دیکھنے والوں کو باپ بیٹی نظر آئیں!

شوہر کی بہ نسبت بیوی کی عمر کم ہونے میں ایک حکمت پوشیدہ ہے۔ انسانی جسم کی بناوت' ذہن کی نفسیات اور بعض تغیر و تبدل کے پیش نظر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مرد کی بہ نسبت عورت جلد بوڑھی ہونے لگتی ہے۔ عورت میں عموماً ازدواجی زندگی کی امنگ چالیس سال کے بعد ماند پڑنے لگتی ہے جب کہ مرد پچاس سال کا ہونے کے باوجود بھی بے رغبتی کا شکار نظر نہیں آتا۔ دونوں کی عمروں میں اگر مناسب فرق ہو تو وہ زیادہ طویل عرصے تک پُرمسرت اور خوشگوار زندگی بسر کرسکتے ہیں لیکن لالی کا کیس اس حساب کتاب اور اعداد وشمار میں نہیں آتا تھا۔ میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ ان کے درمیان جاری ''جنگ وجدل'' کا ایک سبب عمروں کا یہ تفاوت بھی ہوسکتا تھا۔

وہ منتظر نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا ''لالی! تمہارے بچے کتنے ہیں؟''

''بچے تو ابھی نہیں ہیں جناب!'' وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''دو سال پورے ہوگئے ہیں..... تیسرا شروع ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کوئی اچھی امید؟'' میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلادی۔

''گھر میں تمہارے اور زری کے علاوہ اور کتنے افراد رہتے ہیں؟''

''کوئی نہیں' صرف ہم دونوں ہی ہیں۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولا ''ایک بوڑھی والدہ تھی۔ پچھلے سال اس کا بھی انتقال ہوگیا!''

بات ختم کرتے کرتے اس کا لہجہ خاصا افسردہ ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا' اس نے اپنی والدہ کی ابدی جدائی کا بڑا گہرا اثر لیا تھا۔ گویا گزشتہ ایک سال سے وہ میاں بیوی' گھر میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر زندگی گزار رہے تھے۔ ہر شادی شدہ جوڑے کے لیے زندگی کا وہ حصہ بڑا بھاری اور بے کیف ہوتا ہے۔ جب وہ گھر میں اکیلے رہتے ہوں اور ان کی کوئی اولاد نہ ہو۔ جس طرح پھولوں کے بغیر چمن' چمن نہیں بلکہ بیاباں لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح بچوں کے بغیر بھی گھر قبرستان سے کم ویران اور ہولناک نہیں ہوتا جہاں موت کا سناٹا گونجتا ہے' بے بسی کی وحشت برستی ہے اور نا آسودہ خواہشات کے نوحے سنائی دیتے ہیں۔ زندگی ایک ماتم کدہ بن کر رہ جاتی ہے!

ایک بات میری سمجھ میں یہ بھی آئی کہ لالی اور زری کے بیچ پائی جانے والی چپقلش کی ایک وجہ محرومی بھی ہوسکتی ہے جو بے اولادی کی شکل میں اس جوڑے کی ازدواجی زندگی کو زہر آلود کررہی تھی!

میں نے اس سے ایک اہم سوال کیا ''جب تمہاری والدہ زندہ تھیں کیا تب بھی زری اسی طرح تمہاری پٹائی کیا کرتی تھی؟''

اس نے شرمندگی بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''تھانے دار صاحب! اس زمانے میں زری کی توپوں کا رخ میری ماں کی طرف ہوتا تھا۔ ساس بہو نے ایک دن اتفاق سے نہیں گزارا ہوگا۔ ہر روز ایک نیا جھگڑا سامنے آتا اور مجھے منصف کا کردار ادا کرنا پڑتا۔ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام تھا تھانے دار صاحب! میں ہر صبح جیتا اور ہر رات مرتا تھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں' میں نے وہ سال' سوا سال کس اذیت میں گزارا ہوگا۔ اماں کے قبر میں اترتے ہی زری نے مجھے نشانہ بنالیا۔ پتا نہیں' وہ چاہتی کیا ہے!''

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں اسے پکارا اور کہا ''رحیم بخش! ذرا سوچ کر بتاؤ' تم دونوں کے درمیان جھگڑا عموماً کس بات پر ہوتا ہے؟''

''اس کے مطالبات سے!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''مطالبات.....!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پوچھا ”کیسے مطالبات؟“

وہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”تھانے دار صاحب میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں ایک غریب آدمی ہوں اور زری کا مطالبہ یہ ہے کہ میں اسے کم از کم دو طلائی زیورات بنا کر دوں جو میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ بس میرے انکار پر جھگڑا شروع ہو جاتا ہے جو بالآخر مار پیٹ پر جا کر ختم ہوتا ہے..... یعنی وہ مارتی ہے اور میں مار کھاتا ہوں۔“

لالی کی اس وضاحت سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ بزدل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک احمق انسان بھی ہے۔ ان حالات میں زری کا زیور والا مطالبہ مجھے جائز نظر آیا۔ ہر بیوی کا حق ہے کہ وہ اپنے شوہر سے ان تمام اشیا اور لوازمات کا مطالبہ کرے جو اس کے بناؤ سنگار اور آرائش و زیبائش کا لازمی حصہ ہوں لیکن اس معاملے میں بیوی کو اپنے شوہر کی مالی استطاعت کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے اور کوئی بھی ایسی فرمائش نہیں کرنی چاہیے کہ شوہر بے چارے کو بینک میں ڈاکا ڈالنا پڑ جائے۔ اگر انسان اعتدال کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھے تو زندگی خوشیوں اور شادمانیوں سے بھر جاتی ہے۔

میں نہیں جانتا تھا' لالی کی معاشی حیثیت کیا ہے لہٰذا اپنی معلومات کے لیے میں نے اس سے پوچھ لیا ”رحیم بخش! تم کیا کام کرتے ہو؟“

”جی..... میں برتنوں کے کارخانے میں کام کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا ”ادھر جی ٹی روڈ کے کنارے مٹی کے برتنوں کا ایک کارخانہ ہے..... ”پاک پاٹری“ میں پاک پاٹری میں چاک مشین چلاتا ہوں۔ سارا دن مٹی کے گولوں سے کھیلتے کھیلتے میں بھی مٹی کا مادھو بن گیا ہوں جناب!“

مجھے بروقت مذاق سوجھا اور پھر مجھے اپنی زبان پر اختیار نہ رہا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں اس سے کہا ”رحیم بخش! تم

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/300

جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ”ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں“۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا ”میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں“ نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/225

اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

قیصر و کسریٰ -/300

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی حالات اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/125

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

گمشدہ قافلے -/300

انگریز کی اسلام دشمنی، یہنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی کرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/200

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت -/275

اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلہ حجاز -/300

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون -/300

سنسنی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی -/275

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ -/150

بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ -/225

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اُندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی -/125

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیئوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم -/225

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش -/100

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان -/275

سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی -/300

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

شاہین -/275

اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد -/125

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا -/225

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو ردِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین -/225

اُندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس

• لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدر آباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مٹی کے گولوں سے کھیلتے کھیلتے نہیں بلکہ بیوی کی مار کھا کر مادھو بن گئے ہو!''

وہ نگاہ چرا کر جھینپے ہوئے انداز میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''پاک پاٹری۔'' نامی برتنوں کا وہ کارخانہ میں نے دیکھ رکھا تھا بلکہ مذکورہ کارخانے کے مالک بابو شفیق کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ بابو شفیق ایک امن پسند اور شریف النفس انسان تھا۔ ''پاک پاٹری'' میں مٹی اور چینی کے برتن تیار کیے جاتے تھے جن میں ٹی سیٹ' ڈنر سیٹ' اور مرتبان وغیرہ شامل تھے۔ لالی اسی کارخانے میں چاک مشین چلاتا تھا۔ چاک مشین دراصل ایک ایسی مشین ہوتی ہے جس کی مدد سے مٹی کے گولوں کو برتنوں کی باقاعدہ شکل دی جاتی ہے۔ مشین کے میکانکی عمل کے علاوہ اس میں کاریگر (مشین مین) کے ہاتھوں کا فن بھی شامل ہوتا ہے۔

میں نے لالی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''رحیم بخش! تم بھی عجیب آدمی ہو۔ زری کو دو طلائی زیور نہیں بنوا کر دے رہے اور روزانہ اس سے لات جوتے کھاتے ہو۔ کوئی چھوٹی موٹی دو انگوٹھیاں یا بالیاں وغیرہ بنوا دو..... اور جان چھڑاؤ۔'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا اور پوچھا

''وہ تمہارے کارخانے کے مالک بابو شفیق سے میری اچھی سلام دعا ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمہیں کچھ رقم پیشگی دلوا دیتا ہوں؟''

''جناب آپ میری بات نہیں سمجھے!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا ''دو بالیوں یا دو انگوٹھیوں کی بات ہوتی تو میں جیسے تیسے کب کا بنوا کر زری کو دے چکا ہوتا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میرے لہجے میں بھی الجھن در آئی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! دو زیور سے زری کی مراد..... دو مکمل طلائی زیورات کے سیٹ' ہر ایک سیٹ میں انگوٹھیاں' بالیاں' جھمکے' جھومر' چوڑیاں' گلو بند اور دیگر ہر قسم کی چھوٹی بڑی چیز شامل ہونا چاہیے اور..... میری اتنی پسلی نہیں جناب!''

لالی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ زری کا ''دو زیور'' کا مطالبہ پندرہ سے بیس تولے فی زیور کی کہانی تھی اور یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی کہ لالی بے چارہ اپنی بیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فوری طور پر یا تاخیر سے بھی پینتیس چالیس تولے سونے کے زیورات کا بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ واقعی' وہ اتنی پسلی کا آدمی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے' میں تمہاری بیوی کو سمجھاؤں گا!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''جناب میں اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ میرے اس مسئلے کو کسی بھی طرح حل کر دیں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا ''لیکن اس سلسلے میں میری آپ سے ایک درخواست ہے!''

''وہ کیا رحیم بخش؟'' میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا ''آپ اسے میرے سامنے نہیں سمجھائیں گے ورنہ وہ یہی سمجھے گی کہ میں نے آپ سے اس کی شکایت کی ہے۔ اس پر وہ اور زیادہ برہم ہو سکتی ہے۔''

''اتنی عقل ہے تجھ میں۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ایک بات اور ہے جناب!'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا ''آپ زری کو تھانے بھی نہیں بلوائیں گے۔ کچھ بھی ہے میری عزت.....''

''میں نے کہا ناں اس سلسلے میں تم پریشان نہ ہو۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''میں دیکھ لوں گا اس معاملے کو۔'' پھر لمحے بھر کو رک کر میں نے اس سے پوچھا۔ ''قصبے میں تمہارا گھر کس طرف واقع ہے؟''

اس نے بتایا ''جناب! ہمارا قصبہ جیون پور جی ٹی روڈ سے لگا ہوا ہے اور میرا گھر قصبے میں داخل ہوتے ہی دوسری گلی میں ہے..... مسجد والی گلی میں..... بلکہ مسجد کے ساتھ ہی۔''

''ٹھیک ہے' میں کوئی مناسب وقت دیکھ کر تمہارے گھر کی طرف چکر لگاؤں گا۔ تم کارخانے کب جاتے ہو اور وہاں سے تمہاری واپسی کتنے بجے ہوتی ہے؟''

''جناب! میں صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتا ہوں اور دس منٹ میں کارخانے پہنچ جاتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا ''اور پانچ بجے میری چھٹی ہوتی ہے۔''

میں نے اسے یقین دلایا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ میں جلد از جلد اس کے مسئلے کو حل کر دوں گا۔ وہ مطمئن ہو کر تھانے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

میں نے بیویوں سے ڈرنے والے شوہروں کی ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں سن رکھی تھیں۔ ان میں بعض معقول اور بعض نامعقول تھیں لیکن لالی کا کیس سب سے منفرد اور دلچسپ تھا۔ ہر معقول اور سمجھ دار شوہر کسی نہ کسی حد تک بیوی سے ضرور ڈرتا ہے اور اگر بیوی بچوں والی ہو تو یہ ڈر اور بھی مستند ہو جاتا ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہاں ''ڈر'' سے مراد دب کر رہنا نہیں بلکہ اپنے بیوی بچوں کا خیال رکھنا ہے' بیوی کی عزت کرنا ہے..... رحیم بخش عرف لالی کی طرح بیوی کے لات جوتے کھانا نہیں!

☆☆☆

''جیون پور'' ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا لہٰذا اس قصبے میں بسنے والوں کے مسائل حل کرنا میرے فرائض میں آتا تھا۔ رحیم بخش عرف لالی اپنی ازدواجی زندگی کا جو مسئلہ لے کر میرے پاس آیا تھا، اسے حل کرنے کے لیے میرا اس کی بیوی سے ملنا بہت ضروری تھا۔ ابھی تک اس معاملے کا ایک رخ میرے سامنے آیا تھا جو کہ لالی نے اجاگر کیا تھا۔ جس طرح ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں' اسی طرح ہر معاملے کے بھی دو رخ ہوتے ہیں۔ زری سے ملنے اور اس کا موقف سننے کے بعد ہی کسی عملی کوشش کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

دو روز کے بعد مجھے کسی ضروری کام سے سنت نگر جانے کا اتفاق ہوا۔ جیون پور اور سنت نگر قریب قریب واقع تھے۔ واپسی میں' میں نے زری سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ تاہم سورج کی میٹھی تمازت بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ اکتوبر کے مہینے میں موسم کچھ ایسی نوعیت کا ہو جاتا ہے۔ جب ہی اُن دنوں کو گلابی جاڑے کا نام دیا جاتا ہے۔

میں جی ٹی روڈ کو چھوڑ کر جیون پور کے اندر داخل ہو گیا۔ سنت نگر میں کارِ سرکار سے نہیں بلکہ اپنے ایک ذاتی کام سے گیا تھا لہٰذا اس وقت میں یونی فارم کے بجائے عوامی لباس میں تھا۔ لالی کا گھر قصبے کے زیادہ اندر نہیں تھا۔ میں ایک گلی سے دوسری گلی یعنی مسجد والی گلی میں پہنچا پھر مطلوبہ دروازے پر دستک دے ڈالی۔

میری معلومات کے مطابق' اس وقت لالی کی بیوی زری کو گھر میں اکیلا ہونا چاہیے تھا۔ لالی کی فیکٹری میں پانچ بجے چھٹی ہوتی اور وہ سوا پانچ سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتا تھا گویا زری سے ملاقات کے لیے میرے پاس اچھا خاصا وقت تھا۔

میری دستک کے جواب میں ایک منٹ کے بعد کنڈی گرنے کی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ تھوڑا سا کھلا لیکن کسی کی صورت نظر نہیں آئی' تاہم نیم وا دروازے کے عقب سے آواز ابھری ''کون؟''

''یہ میں ہوں..... ملک صفدر حیات۔ اس علاقے کا تھانہ انچارج۔'' میں نے دھیمے لہجے میں اپنا تعارف کرایا پھر پوچھا۔ ''کیا یہ رحیم بخش عرف لالی کا گھر ہے؟''

''جج..... جی.....'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولی۔

''ستر سال کے آدمی کی حیثیت سے آپ کی صحت بہت اچھی ہے..... لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ آپ کی عمر ابھی صرف چالیس سال ہے۔''

''لیکن..... لالی تو کارخانے گیا ہوا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا ''تم غالباً لالی کی بیوی زری ہو۔ میں تم ہی سے مل لیتا ہوں۔ بہت ضروری بات کرنا ہے!''

''خیریت تو ہے ناں؟'' پولیس اور تھانے کا نام سن کر وہ گھبرا گئی تھی ''آپ..... کون سی ضروری بات کرنے آئے ہیں!'' اس نے استفسار کیا۔

''بات چونکہ ضروری ہے..... اس لیے گلی میں کھڑے کھڑے نہیں کی جا سکتی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے گھر میں کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔''

میں زری کو ہینڈل کرنے کے لیے ذہن میں ایک موثر اور فوری منصوبہ تیار کر چکا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق' میری پہلی چال ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ اس نے میرے لیے اپنے گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں اس بیٹھک میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔

لالی نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ زری خوب صورت ہی نہیں بلکہ بے حد پُرکشش اور دلکش بھی تھی۔ لالی نے اس کی عمر بائیس سال بتائی تھی۔ وہ کم و بیش اسی عمر کی تھی۔ میں زری کے حسن و خوب صورتی کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا' بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی کسی بھی زاویے سے ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ پتا نہیں' زری نے کیا سوچ کر اس رشتے کے لیے آمادگی ظاہر کی ہوگی۔ مجھے تو یہ زور زبردستی کی شادی نظر آتی تھی۔ زری بھرے بھرے بدن کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مالک ایک خوبرو عورت تھی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اس کے سراپا کا تنقیدی جائزہ لے لیا تھا۔

وہ لمحے بھر کے لیے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر پوچھا۔

''جی تھانے دار صاحب! اب بتائیں' آپ کون سی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے گہری ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شک زدہ انداز میں کہا۔

''کیا تم واقعی لالی کی بیوی ہو؟''

''ہاں..... میں زری ہی ہوں!'' وہ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا؟''

''دراصل میں لالی کو کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے بات بناتے ہوئے کہا ''تمہارا اس کا کوئی میل دکھائی نہیں دیتا اس لیے میں.....''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولی۔

''آپ واقعی ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔ ہم دونوں میں بالکل نہیں بنتی' پر کیا کروں..... اب تو اسی کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔''

''میں محسوس کر رہا ہوں، تم دونوں میں مجبوری کا ساتھ ہے۔'' میں نے اپنی پلاننگ کے تحت اس کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے کہا ''لگتا ہے' تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف لالی سے بیاہا گیا ہے؟''

''مرضی تو میری شامل تھی جناب.....!'' وہ تامل کرتے ہوئے بولی ''لیکن مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ ایسا نکما نکلے گا۔ میں تو سلمٰی ہی کو قصوروار سمجھ رہی تھی' مگر اس گھر میں آنے کے بعد مجھے احساس ہو گیا سلمٰی غلط نہیں تھی..... ساری خرابی اسی لالی میں ہے۔''

''سلمٰی.....!'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ سلمٰی کون ہے؟''

ان دونوں میاں بیوی کی کہانی میں سلمٰی نامی اس کردار نے میری دل چسپی میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا' زری کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے والی ہے۔ میرے حیرت بھرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

''سلمٰی لالی کی پھوپی کی بیٹی ہے۔ پھوپی صدیقہ لالی کے باپ کریم بخش کی سگی بہن نہیں' بس یوں سمجھ لیں کہ وہ لالی کے رشتے کی پھوپی ہے۔ اسی پھوپی صدیقہ کی بیٹی سلمٰی لگ بھگ چار سال تک لالی کی بیوی رہی ہے!''

''کیا مطلب.....!'' میں نے چونک کر زری کو دیکھا اور پوچھا ''کیا تم لالی کی دوسری بیوی ہو؟''

اس نے بڑی رسان سے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔

''لالی کی پہلی شادی سلمٰی سے ہوئی تھی۔ سلمٰی چار سال تک اس گھر میں رہی اور اس دوران میں ان لوگوں میں لڑائی جھگڑے ہی ہوتے رہے۔ اللہ معاف کرے..... کہتے ہیں مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے حقیقت یہی ہے کہ لالی کی ماں اللہ وسائی بڑی فتنہ پرور عورت تھی.....!''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوئی' ایک گہرا سانس خارج کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''جب میں لالی کی بیوی بن کر اس گھر میں آئی تو مجھے پتا چلا کہ اللہ وسائی کیسی سازشی اور منافق عورت تھی۔ وہ کہتے ہیں ناں..... جب تک واسطہ نہ پڑے' انسان کی اصلیت کھل کر سامنے نہیں آتی۔ جب اللہ وسائی میرے تجربے میں آئی تو مجھے حقیقت کا علم ہوا کہ سلمٰی غلط نہیں تھی بلکہ اللہ وسائی نے اسے غلط مشہور کر دیا تھا اور لالی..... تو اپنی اماں کے اشاروں پر ناچنے والا کاٹھ کا الو تھا۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی تو میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا ''زری کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ سلمٰی کا انجام کیا ہوا؟''

''ضرور بتاؤں گی تھانے دار صاحب!'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولی ''لیکن ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ کون سی ضروری بات کرنے آپ ہمارے گھر آئے ہیں؟''

''اس ضروری بات کا تعلق تمہاری اور لالی کی زندگی سے ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہر کرتے ہوئے کہا ''لیکن پہلے تم سلمٰی کی کہانی مکمل کر لو..... پھر میں تم سے بات کرتا ہوں۔''

اس نے لمحے بھر کے لیے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا' ایک گہرا سانس خارج کیا اور میری فرمایش کے مطابق' سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی اللہ وسائی نے سلمٰی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ پھوہڑ' بدزبان' بے ہنر اور..... جانے کیا کیا اسے مشہور کر دیا۔ اس معاملے کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ لالی بھی اپنی ماں کا طرف دار اور ہم زبان ہو گیا تھا۔ یہ دونوں ماں بیٹا اتنی صفائی اور ڈھٹائی سے سلمٰی کا تذکرہ کرتے کہ سننے والے انہیں سچا اور سلمٰی کو قصوروار سمجھنے لگتے۔ خود میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ یہ تو مجھے اس گھر کی بہو بننے کے بعد تجربہ ہوا کہ کون غلط تھا اور کون صحیح۔ اگر میں پہلے اللہ وسائی اور لالی کی اصلیت اور فطرت سے واقف ہو جاتی تو اس شادی کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتی..... خیر' میں تو آپ کو سلمٰی کے بارے میں بتا رہی تھی!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنا کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی' سانس کو ہموار کیا اور اپنی وضاحت کو دراز کرتے ہوئے بولی ''جب سلمٰی اور لالی کی شادی کو دو سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر گیا تو اللہ وسائی نے سلمٰی کے بانجھ پن کی کہانی کو ہوا دینا شروع کر دی کیونکہ سلمٰی کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ اس بھیانک سازش میں اللہ وسائی نے غفوری نامی ایک دائی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جس نے سلمٰی کا اندرونی اور بیرونی معائنہ کر کے یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ وہ ایک بانجھ عورت ہے جو کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد تو اللہ وسائی کی لگائی' بجھائی اور دہائی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ ہر جگہ یہ کہتی پھرتی تھی کہ اسے پوتے پوتیاں کھلانے کا بڑا ارمان ہے لیکن افسوس کہ سلمٰی کے بطن سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ بعض لوگوں کو یہ جتلا بھی چکی تھی کہ اگر سال' دو سال تک سلمٰی کے بچہ نہیں ہوا تو وہ اپنے لالی کی دوسری شادی کروائے گی یہ ساری ساز شانہ باتیں کسی نہ کسی طرح سلمٰی کے کان تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں تھانے دار صاحب! سلمٰی اس صورتِ حال میں کس ذہنی اذیت سے گزرتی ہو گی!''

''ہاں زری.....!'' میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی ''میں بخوبی سلمٰی کی حالت کو محسوس کر سکتا ہوں..... خیر' تم بتاؤ۔ سلمٰی کا کیا انجام ہوا؟''

''جی میں اسی طرف آ رہی ہوں۔'' زری نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا ''سلمٰی کا بڑا ہی ہولناک انجام ہوا تھا۔ اللہ وسائی نے من مانی کر دکھائی تھی۔ ساس بہو میں' ہر گزرتے دن کے ساتھ جھگڑا بڑھتا چلا گیا اور اس جھگڑے میں لالی ہمیشہ اپنی ماں کا ساتھ دیتا تھا بالآخر شادی کے چار سال بعد لالی نے سلمٰی کو طلاق دے دی۔ دیگر چھوٹے بڑے الزامات کے علاوہ سلمٰی کے دامن پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا کہ وہ بانجھ ہے!''

وہ لمحے بھر کے متوقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''طلاق کے بعد' صرف دو ماہ تک سلمٰی زندہ رہی۔ اسے کوئی بہت ہی گہرا روگ لگ گیا تھا۔ اس نے چپ سادھ لی تھی۔ روز بروز وہ اندر ہی اندر گھلتی چلی گئی۔ صرف دو ماہ کے عرصے میں وہ ایسی ہو گئی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد' گال پچکے ہوئے' آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور بدن ہڈیوں کا پنجر.....! پھر ایک روز وہ زندگی سے روٹھ کر موت کی وادی میں چلی گئی۔''

زری نے اپنا بیان ختم کیا تو میں حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ خاصی سنجیدہ اور گمبھیر نظر آ رہی تھی۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''زری! اس سب کے باوجود بھی تم لالی سے شادی پر تیار ہو گئیں..... کیوں؟''

وہ خیالوں میں گم ہو گئی' چند لمحات کے سکوت کے بعد اس نے جواب دیا ''تھانے دار صاحب! میں نے آپ کو بتایا ہے ناں' اس تلخ حقیقت کا مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا' اس وقت تک میری شادی ہو چکی تھی۔ شادی سے پہلے اکثر لوگوں کی طرح میں بھی سلمٰی کو قصوروار سمجھتی تھی..... آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں!''

آخری جملہ اس نے بڑے بے بس اور لجاجت بھرے انداز میں کہا تھا۔ میں نے اپنے سر کو بڑے معنی خیز انداز میں اثباتی جنبش دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میں بڑی اچھی طرح تمہاری بات سمجھ گیا ہوں زری.....! اور میں جس مقصد کے لیے یہاں آیا تھا وہ مقصد تقریباً پورا ہو گیا ہے۔''

''جی..... کون سا مقصد؟'' اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے رحیم بخش عرف لالی کا نام ظاہر کیے بغیر کہا ''مجھے باخبر ذرائع سے پتا چلا تھا' تم میاں بیوی آپس میں بہت لڑائی جھگڑا کرتے ہو۔ آج میرا ادھر سے گزر ہوا تو میں نے سوچا کہ تم سے بات کر لوں۔ لالی تو گھر میں موجود نہیں اس لیے میں تم سے بات کرنے کو رک گیا لیکن.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں داستہ جملہ نامکمل چھوڑا پھر لجاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''.....لیکن تم نے اللہ وسائی' لالی اور سلمٰی کی جو کہانی سنائی ہے' اس کی روشنی میں تم دونوں کے جھگڑے کی وجہ صاف نظر

ہندوستانی عورت

یہ ہندوستان کی عورتیں چاہے حامد میاں کی بیوی ہوں یا مہاتما گاندھی کی بیوی، اپنے شوہر کی ایسی فرمانبردار ہوتی ہیں کہ سبحان اللہ! یہ جھانسی کی گرمی ملاحظہ فرمایئے اور پھر وہاں کے باورچی خانوں کی کیفیت کا تصور کیجیے۔ اس کے بعد اخلاق الرحم کے دوروں کو پیشِ نظر رکھیے اور انیس حامد کا ہم لوگوں کے لیے کھانا تیار کرنا دیکھیے، واللہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر مرد عورتوں کی بیویاں ہوا کرتے تو چاہے طلاق ہی تک کیوں نہ نوبت پہنچتی لیکن وہ کام نہ ہو سکتا جو انیس حامد نے کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً دورہ پڑا۔

بحر تبسم از شوکت تھانوی سے اقتباس

مرسلہ: رفعت رضا، کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ گئی ہے۔ اللہ وسائی تو پچھلے سال گزر گئی لیکن یہ نامعقول لالی تو ہے۔ مجھے امید ہے' یہ تمہیں بھی طعنے مارتا ہوگا۔ تمہاری شادی کو بھی دو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اور میری معلومات کے مطابق' ابھی تک تمہاری کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں!''

میں نے اس کے دل کا حال اور صورتِ حال کی حقیقت جاننے کے لیے یہ چال چلی تھی۔ لالی کو نامعقول کہتے ہوئے میں نے زری کی طرف داری کی اور ہمدردی کی بات کی تھی۔ میری اس حکمتِ عملی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ وہ چوکنا نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے کہ ہم میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا رہتا ہے..... کیا لالی نے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہے؟''

''نہ لالی نے..... اور نہ ہی کسی اور نے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مبہم انداز میں کہا ''میں نے بتایا ناں' مجھے باخبر ذرائع سے تم دونوں کے جھگڑے کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ مجھ تک یہ خبر کیسے پہنچی۔ بس' اس بات کی تصدیق کردو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست ہے؟''

''بالکل درست تو نہیں البتہ کسی حد تک ٹھیک ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''میں سمجھا نہیں' تھوڑی وضاحت کرو؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''تھانے دار صاحب! یہ بات تو بالکل سولہ آنے صحیح ہے کہ ہم دونوں میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی وجہ لالی کے طعنے یا روک ٹوک نہیں.....''

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی اور افسردہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے نرمی سے پوچھا ''پھر کیا وجہ ہے؟''

''چھوڑیں..... رہنے دیں اس بات کو!'' وہ کنی کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں چھوڑ نہیں سکتا زری۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''مجھے بتایا گیا ہے کہ جب بھی تم میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا ہے تو تم اس کی دھنائی اور دھلائی کرتی ہو۔ وہ بڑے آرام سے تمہاری مار کھاتا رہتا ہے..... کیا تم نے اس پر کوئی سفلی وغیرہ کر رکھا ہے؟''

''نہیں جی..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی ''بس' سمجھ لیں کہ وہ تھوڑا سا بزدل ہے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھ سکتا زری!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا ''میں نے بزدل اور کمزور شوہر دیکھے ہیں لیکن لالی جس طرح تمہارا لات جوتے کھاتا ہے ایسی کوئی مثال میرے علم میں نہیں۔ میں اس راز تک ضرور پہنچوں گا جو تم میاں بیوی کے درمیان چھپا ہوا ہے!''

''آپ کو تو ہمارے بارے میں بہت کچھ پتا چل چکا ہے!'' وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا ''بہت کچھ..... سے بھی زیادہ۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ لڑائی کا آغاز تم کرتی ہو۔ تم اس سے مطالبہ کرتی ہو کہ وہ تمہیں طلائی زیورات کے دو بھرپور سیٹ بنوا کر دے۔ تم اس کی آمدنی اور حیثیت سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ بے چارہ پینتیس چالیس تولے سونے کے جھمکے' جھومر' بالیاں' چوڑیاں' گلوبند اور کنگن کہاں سے بنوا کر دے۔ تمہارا یہ مطالبہ سراسر ناجائز اور غلط ہے!''

وہ یک ٹک مجھے دیکھی رہی۔ چند لمحے اسی کیفیت میں رہنے کے بعد وہ گویا ہوئی۔ اس کی آواز میں زمانے بھر کی یاسیت اور افسردگی بھری ہوئی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے استفسار کیا۔

''تھانے دار صاحب! کیا ایک عورت..... شادی شدہ عورت ہونے کے ناطے میں زیورات کی خواہش نہیں کرسکتی؟''

''کیوں نہیں کرسکتی..... ضرور کرسکتی ہو۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''لیکن انسان کو اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے!''

''اور..... جس انسان کی چادر میں جگہ جگہ سوراخ ہوں' وہ کہاں سے پاؤں پھیلانا شروع کرے اور کہاں تک پھیلائے..... چادر اوڑھنے کے باوجود بھی اگر انسان کے سر پاؤں ننگے ہی رہیں تو ایسی چادر کا کیا فائدہ!''

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو زری؟'' میں نے چونک کر اس سے سوال کیا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی ''تھانے دار صاحب! میں تو لالی سے صرف دو زیورات کی فرمائش کرتی ہوں اور میرا یہ مطالبہ کسی بھی صورت ناجائز نہیں۔ ہر شادی شدہ عورت کو بننے سنورنے کا حق حاصل ہے اور عورت کا اصل بناؤ سنگار کو اس کی تخلیق ہوتی ہے۔ میں بھی اپنے سنار سے صرف دو زیورات مانگتی ہوں لیکن اس کی ذات تو مٹی مٹی ہے۔ وہ اپنی مٹی وجود سے کھوکھلے اور بے جان برتن تو تیار کرسکتا ہے لیکن میری آرائش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور زیبائش کے لیے دو طلائی زیور فراہم کرنے سے قاصر ہے..... سلمٰی پر بانجھ ہونے کا الزام سراسر غلط تھا۔ ایک بے برگ و بے ثمر سوکھا پیڑ کسی کو فیض نہیں پہنچا سکتا اسی لیے .....حالات اور واقعات ہر لمحہ اس پر لات جوتے برساتے رہتے ہیں!''

بات ختم کرتے ہی اس نے گردن جھکالی اور دبی دبی سسکیوں میں رونے لگی۔ میں نے اس کے اس عمل میں رکاوٹ بننے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ بچی تھی تو یہ رونا اس کے حق میں بہتر تھا۔ پتا نہیں' کب سے آنسوؤں کے سیلِ آب کو اس نے سینے میں روک رکھا تھا۔ اس کھارے پانی نے اس کے دل و جگر پر آبلے ڈال دیے ہوں گے۔ اس کی روح تک اذیت کا ناسور اتر چکا ہوگا۔ اس نے بڑے خوب صورت الفاظ میں اپنا دکھ مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ میں نے جس پکے ہوئے زخم کا منہ نوچ ڈالا تھا اس کا سارا مواد خارج ہوگیا۔ طوفان گزرا تو انعام میں اسے خاموشی اور سناٹا دے گیا۔ وہ میرے سامنے سر جھکائے چپ چاپ ساکت بیٹھی تھی۔

انسان کی زبان بولنے کے لیے بے تاب رہتی ہے اور جب انسان اپنی کہہ گزرتا ہے تو گوشت کے اس لوتھڑے کو بھی قرار آجاتا ہے۔ زری نے چند الفاظ میں حالات کا ایک جہاں معنی کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ جس کے بعد کچھ پوچھنے اور بتانے کی کوئی گنجایش تھی اور نہ ہی ضرورت!

میں اٹھ کھڑا ہوگیا اور یہ کہتے ہوئے اس کے گھر سے نکل آیا۔ ''زری! تم فکر نہ کرو۔ اللہ نے چاہا تو ''سب ٹھیک ہوجائے گا!''

☆☆☆

یہ جاننا خاصا مشکل ہے کہ اللہ کیا چاہتا ہے!

جو لوگ محنت' فہم و فراست اور سچی لگن سے اس راز تک رسائی حاصل کرلیتے ہیں پھر ان کے لیے ''سب ٹھیک'' ہو جاتا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے نابلد ہی ہوتے ہیں جب ہی وہ فکروں اور پریشانیوں میں گھرے رہتے ہیں۔ بہر حال' اگر طلب اور جستجو میں کوئی کھوٹ نہ ہو تو انسان ایک روز ''شاد باد منزل مراد'' ہو کر رہتا ہے۔

زری کے تاثیر بھرے الفاظ سے جو حقیقت مجھ تک پہنچی تھی اس نے لالی کے لیے میرے دل و دماغ کو غصے سے بھر دیا تھا۔ وہ کاغذی شیر میرے سامنے بڑے بڑے دعوے کر گیا تھا لیکن زری کی ایک ہی بوچھاڑ نے اس کاغذی شیر کو بھگو کر زمین سے چپکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے تھانے بلواؤں گا اور اس کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جس کا وہ قرارِ واقعی استحقاق رکھتا تھا۔

آئندہ دو تین روز تک تھانے میں کچھ اس قسم کی ہنگامی مصروفیات رہیں کہ لالی جیسا نامعقول آدمی میرے ذہن میں ٹھہر نہ سکا۔ دو زمیندار خاندانوں میں دیرینہ دشمنی کی چنگاری کو ایک معمولی سے واقعے نے ہوا دے کر شعلہ جوالا کا روپ عطا کر دیا تھا۔ دونوں خاندانوں میں ایک رات خونیں ٹکراؤ ہوا اور دونوں جانب سے مجموعی طور پر گیارہ افراد ہلاک اور نصف درجن شدید زخمی ہوئے تھے۔ میں اس واقعے کو نمٹانے میں بے حد مصروف رہا لہٰذا لالی کی جانب میرا دھیان گیا ہی نہیں۔ آئندہ کسی ماہ میں اس خوں ریز واقعے کی داستان قارئین سسپنس کی خدمت میں پیش کروں گا۔

یہ اس واقعے کے پانچ یا چھ دن بعد کا ذکر ہے۔ میں حسبِ معمول تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک افسوس ناک واقعے کی اطلاع میری منتظر تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ جیون پور میں ایک شخص نے چھت سے لٹک کر خودکشی کرلی ہے۔

''کون تھا وہ بد بخت؟'' میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے دریافت کیا۔

''جناب! اس بندے کا نام ہے لالی۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا ''ہفتہ' دس دن پہلے وہ آپ سے ملنے یہاں بھی آیا تھا۔''

کانسٹیبل کے انکشاف نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لالی کا نام سنتے ہی میں چونک اٹھا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی زندگی کی کہانی بھی میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ اس نے اپنی بیوی کے ظلم و ستم کی داستان سناتے ہوئے اسے سمجھانے کے لیے مجھ سے درخواست کی تھی لیکن جب میں جا کر زری سے ملا تو حقائق کی کوئی دوسری ہی سنگین صورت دیکھنے کو ملی۔ بہر حال اس واقعے پر زری ہی روشنی ڈال سکتی تھی۔

میں نے اپنے ساتھ اے ایس آئی جمال دین کو لیا اور فوراً موضع جیون پور پہنچ گیا۔ لالی کے گھر چند روز پہلے میں آچکا تھا لہٰذا وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہ ہوا۔ گھر کے باہر درجن بھر محلے دار اکٹھا تھے۔ ہم انہیں ایک طرف ہٹاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

مذکورہ مکان دو کمروں' ایک بیٹھک اور وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ میں پہلے جب یہاں آیا تھا تو زری کے ساتھ بیٹھک میں بات چیت کی تھی۔ مکان کے دونوں کمرے پچھلے حصے میں واقع تھے۔ ان کے آگے عرض کے رخ برآمدہ تھا اور اس کے بعد کشادہ صحن آتا تھا۔ بیٹھک نامی کمرا گھر کے ابتدائی حصے میں تھا۔

میں زری کی راہنمائی میں اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاش لٹکی ہوئی تھی۔ جب تک لالی کی ماں اللہ وسائی زندہ تھی' یہ کمرا اس کے تصرف میں تھا۔ برابر والے کمرے میں لالی اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر لالی کی لاش کا بہ غور جائزہ لیا۔

کمرے کی چھت میں شاہ تیر کے ساتھ بندھا ہوا ایک رسا نیچے لٹک رہا تھا جس کے دوسرے سرے پر بنے ہوئے پھندے میں لالی کی گردن پھنسی ہوئی تھی۔ پھندا لگنے کے باعث اس کی آنکھیں باہر ابل آئی تھیں اور گردن اپنے معمول کے سائز سے کچھ لمبی ہو گئی تھی۔ لالی کی پھانسی لگی لاش بڑی بے سروسامانی سے جھول رہی تھی۔ میں نے اس کے معلق پاؤں کے نیچے دکھائی دینے والے منظر کا جائزہ لیا۔

پاؤں سے عین ڈیڑھ فٹ نیچے ایک چوبی میز رکھی نظر آ رہی تھی۔ مذکورہ میز کے پہلو میں' کمرے کے فرش پر ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ لالی نے اپنے "مشن" کی تکمیل کے لیے چوبی میز پر اس کرسی کو رکھا ہوگا پھر کرسی پر چڑھ کر اس نے پھانسی کا پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا ہوگا۔ وہ پھندا جو اس نے پہلے شاہ تیر کے ساتھ باندھ کر نیچے لٹکا لیا تھا۔ اس کے بعد کا مرحلہ بیک وقت بڑا جاں گسل اور آسان ہوتا ہے۔ جاں گسل ان معنوں میں کہ گردن میں سانس کا پھندا لگ کر موت واقع ہو جاتی ہے اور آسان اس طرح کہ صرف اس شے کو ٹھوکر لگانا ہوتی ہے جس پر کھڑے ہو کر جان گنوانے کا عزم کیا ہو۔

لالی نے بھی کرسی کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹا کر خود کو موت کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے آئندہ آدھے گھنٹے میں جائے واردات کا مکمل نقشہ تیار کیا اور لالی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال روانہ کر دیا۔ اے ایس آئی جمال دین لاش کے ساتھ ہی اسپتال چلا گیا تھا۔

موقع کی ضروری کارروائی سے نمٹنے کے بعد لوگوں کے بیانات کی باری تھی لیکن میں نے کسی محلے دار یا پڑوسی کو اس سلسلے میں آزمایش میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور صرف زری کو لے کر بیٹھک میں بیٹھ گیا۔ باقی تمام افراد کو میں نے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس واقعے کے بارے میں زری جو مدد کر سکتی تھی اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے پہلے تو زری سے لالی کی حسرت ناک موت پر دلی ہمدردی اور اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ یہ رسم زمانہ بھی تھی اور موقع کی ضرورت بھی۔ وہ بڑی ویران نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں اس جذباتی کیفیت کو کوئی واضح نام نہ دے سکا۔ نہ تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ لالی کی موت پر بے حد غم زدہ ہے اور نہ ہی کہنا ممکن تھا کہ اسے اس واقعے سے کوئی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ وہ ایک عجیب سے سناٹے میں گرفتار دکھائی دیتی تھی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ آخر یہ ہوا کیا ہے!

"زری! مجھے اس واقعے کا دلی افسوس ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "تمہارے خیال میں یہ سب کیسے ہوا؟"

"مم..... میں کچھ نہیں جانتی....." وہ نحیف سی آواز میں بولی۔

"کوئی بھی شخص خوامخواہ اپنی جان سے نہیں کھیلتا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم بات ہوتی ہے۔ لالی نے اگر گلے میں پھندا ڈال کر جان دی ہے تو اس کا کوئی فوری محرک بھی ضرور ہوگا..... اور اس بارے میں صرف تم ہی مجھے بتا سکتی ہو!"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن جھکا کر گود میں رکھے ہوئے اپنے ہاتھوں سے کھیلنے لگی۔ اس وقت وہ مجھے جذباتی کیفیت میں گرفتار کسی تذبذب میں مبتلا نظر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو' مجھے کچھ بتانا چاہ رہی ہو لیکن الفاظ زبان تک پہنچنے سے پہلے ہی توانائی سے خالی ہو جاتے ہوں اور وہ الجھ کر پھر سوچنے لگتی ہو۔

میں نے ہمدردی بھرے دھیمے لہجے میں اسے پکارا۔

"زری! لالی تو چلا گیا۔ اسے واپس نہیں لایا جا سکتا۔ اگر کسی شخص نے اس کی جان لی ہوتی تو میں قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے اپنی آخری سی کوشش کر ڈالتا لیکن اس نے تو خود ہی اپنے آپ کو ختم کر ڈالا۔ وہ قاتل بھی ہے اور مقتول بھی لیکن اگر تم میرے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو گی تو یہ تمہاری ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے بہت اچھا ہوگا۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھو!"

میرے مرہم بردار الفاظ نے اس کی گھائل سوچ کی بڑی مناسب تیمارداری کی۔ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ویرانی' حیرانی اور پریشانی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اضطراب' اضطرار اور الجھاؤ بھی نظر آیا۔ وہ تذبذب اور تامل کی آخری منزل سے گزر رہی تھی۔ اسے مسلسل خاموش اور متامل پا کر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کیا پچھلی رات بھی تم دونوں کا کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

وہ زبان سے کچھ نہ بولی تاہم اقرار میں گردن ہلا دی۔

اس کا یہ اثباتی جواب پا کر میں نے نرمی سے استفسار کیا۔

"اور یہ بھی ایک ویسا ہی جھگڑا تھا جیسا اکثر تم دونوں کے بیچ ہوتا رہتا تھا؟"

اس نے مختصر سی لب کشائی کی "جی!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اور اس مرتبہ بھی تم ہی نے اس کی پٹائی کی ہوگی؟''

میں بہ آہستگی اسے بولنے کی راہ پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس معاملے میں اس کا زبان کھولنا بہت ضروری تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ لالی نے کس بات سے دل برداشتہ ہو کر اپنی جان لے لی تھی۔ یہ ٹھیک ہے..... اس بدقسمت کے ساتھ ایک ایسا میڈیکل مسئلہ تھا کہ اسے اپنی زندگی سے بیزار، شرمندہ اور دل برداشتہ ہونا چاہیے تھا مگر اس کی تاریخ یہ بتاتی تھی کہ وہ اپنی خامی کے لیے بہت زیادہ جذباتی اور حساس نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ بہت پہلے کچھ کر چکا ہوتا۔ وہ نااہل ہی نہیں بلکہ اول درجہ کا بزدل اور ڈرپوک بھی تھا جبکہ اس قسم کے اقدامات کے لیے ایک خاص قسم کی جرأت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے..... اگر گزشتہ رات اس نے پھندا ڈال کر اپنی جان دے دی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا' اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ گیا تھا' کوئی ایسی بات ضرور ہوئی تھی جس پر اس نے یہ ردعمل ظاہر کیا تھا۔ میں اسی نکتے تک پہنچنے کے لیے زری کو کرید رہا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے لب کشائی کے معاملے میں تھوڑی اور فراخ دلی دکھائی اور بولی ''جی تھانے دار صاحب..... ایسا ہی ہوا تھا۔''

میں نے نرمی اور ملائمت کا برتاؤ جاری رکھا ''ایسا تو ایک عرصے سے ہوتا چلا آ رہا تھا زری.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''لیکن اس نے ایسا سنگین قدم اٹھانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا پھر گزشتہ رات وہ اپنی جان کا دشمن کیوں بن گیا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار جی!'' اس نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا اور خلا میں گھورنے لگی۔

میں خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا۔ اس بات کے آثار واضح ہو رہے تھے کہ وہ مجھے پچھلی رات سے متعلق کسی اہم راز سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ میں بہ غور اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولی۔

''یہ جھگڑا بھی معمول کی نوعیت کا تھا۔ پہلے میں زبانی کلامی اس پر برستی رہی۔ وہ بھی حسب استطاعت جواب دیتا رہا پھر کسی فلم کے طے شدہ سین کے مطابق اس رات بھی اس کی پٹائی کرنے لگی مگر آج میرے دل و دماغ میں لالی کے لیے ایک خاص قسم کا غصہ تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کو اتنا ماروں..... اتنا ماروں کہ وہ مر ہی جائے!''

وہ یک لخت خاموش ہو گئی۔ میں نے معتدل لہجے میں پوچھا ''زری! پچھلی رات ایسی کیا بات تھی کہ تمہیں ایسا جنونی غصہ آ رہا تھا پہلے تو تم نے کبھی لالی کی موت کے بارے میں نہیں سوچا تھا؟''

اس نے ٹھہری ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بتانے لگی۔

''تھانے دار صاحب! چند روز پہلے آپ ہمارے گھر آئے تھے۔ اسی بیٹھک میں بیٹھ کر ہم نے ڈھیروں باتیں کی تھیں جو میرے' لالی' سلمٰی اور اللہ وسائی کے بارے میں تھیں۔ آپ نے اپنی آمد کی وجہ یہ بتائی تھی کہ آپ ہمیں سمجھانے آئے ہیں' ہم لڑائی جھگڑا نہ کیا کریں۔ میں نے پوچھا تھا' آپ کو ہمارے لڑائی جھگڑے کے بارے میں کس نے بتایا؟ آپ نے مجھے تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ آپ کو باخبر ذرائع سے یہ بات پتا چلی ہے۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ لالی ہی میری شکایت لے کر آپ کے پاس تھانے گیا ہوگا۔ میں نے اس بارے میں بھی آپ سے سوال کیا تھا مگر آپ بات گول کر گئے۔ پچھلی رات میں نے لالی سے صاف صاف کہہ دیا تھا.....!''

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''مجھے لالی پر' اس بات کا شدید غصہ تھا کہ اس نے گھر کے معاملے کو تھانے تک کیوں پہنچایا۔ میں جب دو ڈھائی سال سے ایک ٹنڈ منڈ' بے برگ و بے ثمر درخت کے نیچے بیٹھی ناکامیوں و نامرادیوں کی چلچلاتی دھوپ میں اپنے ناآسودہ ارمانوں اور تشنہ کام خواہشات کو جھلسا رہی تھی تو اس کے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھا جو وہ آپریشن کروانے آپ کے پاس پہنچ گیا' یہ تو ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' والی بات ہوگئی۔ یہی سوال جب میں نے اس سے کیا تو وہ ڈھٹائی سے صاف مکر گیا۔

''میں تو تھانے نہیں گیا تھا۔'' وہ نظر چراتے ہوئے بولا۔

میں نے غصیلے لہجے میں کہا ''تھانے دار کو کوئی خواب آیا ہے اور نہ ہی وہ غیب کا علم رکھتا ہے۔ تم نے ضرور میری شکایت کی ہوگی جو وہ مجھے سمجھانے گھر آیا تھا؟''

وہ ٹال مٹول کرنے لگا تو مجھے اس پر اور غصہ آیا۔ میں نے کہا ''مجھے تمہارے تھانے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ تم نے تھانے دار کو آدھی بات بتائی۔ میرے ظلم و ستم کی کہانی سنا کر تم نے اپنی خامیوں کو موٹی چادر کے نیچے ڈھانپ دیا۔ یہ تو کوئی انصاف نہ ہوا ناں..... تمہیں اپنے بارے میں بھی تھانے دار کو کھل کر بتانا چاہیے تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی ڈھٹائی نے میرے غصے کو اور بھی بڑھا دیا۔ وہ بے خبری کی سی کیفیت میں بولا "مجھ میں ایسی کون سی خامیاں ہیں جو میں نے تھانے دار صاحب سے چھپائی ہوں؟"

اس کا یہ جواب اس بات کا اقرار تھا کہ وہ آپ کے پاس میری شکایت لے کر آیا تھا۔ اس تصدیق کے بعد میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔ میں نے غراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"لالی! تم میں ایک ایسی خامی ہے جو سیکڑوں' ہزاروں خامیوں پر بھاری ہے۔ تمہیں یہ سوال پوچھتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ مرد کو اپنی شان کا تحفظ کرنا چاہیے۔"

"کیا تم مجھے مرد نہیں سمجھتی ہو؟" وہ میرا ہاتھ روک کر' سینہ تان کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اس قسم کا ردعمل میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا ورنہ آج تک وہ مجھ سے دبتا اور پٹتا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کیسے تن کر کھڑا ہے۔ اس کی جانب سے ایسی جرأت کی میں توقع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے کہہ دیا۔

"لالی! میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے!"

میرے اس تیکھے جملے نے گویا جلتی پر تیل کا کام دکھایا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔

"میں بتانا چاہتا ہوں تمہیں آج..... کہ میں کتنا بڑا مرد ہوں.....!" بات ختم کرتے ہی وہ کسی بھوکے درندے کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑا تھا۔

اتنا بتا کر زری خاموش ہو گئی۔ میں نہیں جانتا تھا' اس کا یہ توقف کوئی پڑاؤ تھا یا اس کی کہانی "اینڈ" ہو گئی تھی۔ اس کے بیان کردہ قصے نے میرے تجسس کو ساتویں آسمان تک بلند کر ڈالا تھا لہٰذا میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"پھر..... پھر کیا ہوا زری؟"

اس نے جواب میں خاموشی سے گردن جھکا لی۔

اس کی جھکی ہوئی گردن کا زاویہ آگے کی کہانی بڑی وضاحت سے سنا رہا تھا..... اور سمجھا رہا تھا کہ زری سے مزید کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں..... اور برسنے والوں کو گرجنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ لالی اگر زری کا سنار ہوتا تو ڈھائی سال میں اسے طلائی زیورات چڑھا کر سونے سے پیلا کر چکا ہوتا۔ وہ مٹی کے گولوں سے کھیلنے والا مٹی کا مادھو تھا جو زندگی کے ایک اہم میدان میں ہمیشہ مٹی کا گھوڑا ثابت ہوا تھا۔ یہ بے جان' بے طوفان اور بے ہیجان گھوڑا گزشتہ رات بھی یقیناً ریس ہار گیا ہوگا!

ہار اور جیت انسان کے کندھوں پر سوار ہو کر جلوہ دکھاتی ہے' یہ چہروں پر دکھائی دیتی ہے اور زبان کی حرکات و سکنات سے اپنے وجود کا یقین دلاتی ہے۔ میں زری کی جھکی ہوئی گردن' ڈھلکے ہوئے کندھوں' گنگ زبان اور اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ پچھلی رات بھی تاریخ خود کو دہرانا نہیں بھولی ہوگی۔

"اوہ.....!" میں نے ایک پُرمعنی' بوجھل اور تعزیت بھرا سانس خارج کیا۔

زری نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی "پھر..... وہ جھنجلا کر کمرے سے نکل گیا تھا!"

میں یک ٹک اسے دیکھتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ اس افسوسناک واقعے کے حسرت بھرے انجام پر کیا روشنی ڈالتی ہے۔ اس نے میری آنکھوں میں مچلتے سوالات کو پڑھ لیا اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

"ہمارے درمیان جب بھی بدمزگی حد سے بڑھ جاتی تو وہ دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ پہلے وہ کمرا میری ساس اللہ وسائی کے استعمال میں تھا لیکن اس کی موت کے بعد سے خالی تھا۔ میں کل رات بھی یہ ہی سمجھی کہ خود کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے وہ اپنی اماں والے کمرے میں چلا گیا ہے اور وہ رات وہیں گزارے گا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ.....!" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"تمہیں کب پتا چلا کہ وہ خود کو پھانسی لگا کر ختم ہو چکا ہے؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

وہ ایک تھکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"تھانے دار صاحب! میں بالکل سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا سنگین قدم اٹھا لے گا۔ وہ رات کو جب کمرے سے نکل گیا تو میں آرام سے سو گئی تھی۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا کہ ہم دونوں نے دو مختلف کمروں میں راتیں گزاری ہوں۔ میں ایسی سوئی کہ دوسری صبح..... یعنی آج صبح ہی آنکھ کھلی۔ پہلے جب بھی وہ علیحدہ کمرے میں سویا تھا تو صبح جلدی..... مجھ سے بھی پہلے اٹھ گیا تھا۔ ہم دونوں پھولے ہوئے منہ کے ساتھ ناشتا کرتے اس کے بعد وہ کارخانے چلا جاتا اور میں گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔ شروع شروع میں مجھے یہ بڑا عجیب لگا تھا لیکن پھر میں اس کی عادی ہوتی چلی گئی اور یہ سب مجھے معمول محسوس ہونے لگا مگر آج صبح یہ معمول بری طرح بگڑ کر رہ گیا۔"

وہ ایک مرتبہ پھر سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی' ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی "آج صبح جب مجھے گھر کے اندر لالی کی موجودگی محسوس نہ ہوئی تو میں تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برابر والے کمرے میں پہنچی تو لالی مجھے چھت سے لٹکتا ہوا دکھائی دیا..... اسے اس حالت میں دیکھ کر میری چیخ نکل گئی پھر لالی کی پھانسی والی خبر آس پڑوس میں پہنچ گئی اور اس کے بعد اطلاع بن کر آپ کے پاس..... آپ یقین کریں' مجھے کچھ پتا نہیں چلا' لالی ساتھ والے کمرے میں جانے کے بعد کیا کرتا رہا۔ میں نہیں جانتی' اس نے کب چھت والے شاہ تیر میں اپنے لیے پھانسی تیار کی اور کب گلے میں پھندا ڈال کر اس نے جان دے دی.....!''

بات ختم کرتے ہی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ اچھا تھا' اس واقعے کا ٹھوس غبار آنسوؤں کی صورت مائع بن کر اس کی آنکھوں سے بہ جاتا۔ لالی جیسا بھی لولا لنگڑا اور بے فیض تھا' بہرحال زری کا شوہر تھا۔ اس کی خودکشی کے بعد وہ ایک طرح سے اکیلی رہ گئی تھی۔

موقع کی ضروری کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ یہ سیدھا سیدھا خودکشی کا ایک کیس تھا اور اس خودکشی کا سبب بھی روزِ روشن کے مانند میرے سامنے جلوہ افروز تھا' یہ الگ بات کہ اس سبب کو زبان زدِ خاص و عام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بے چاری زری کے لیے لوگوں کو جواب دینا مشکل ہو جاتا کہ اس کے شوہر نے... خودکشی کیوں کی تھی!

وہ ذرا سا سنبھلی تو میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''زری! حالات کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی تمہارا گھر تعزیت کے لیے آنے والوں سے بھر جائے گا۔ وہ تم سے طرح طرح کے سوالات کریں گے۔ یہ بات کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ لالی نے خودکشی کی ہے۔ اگر خود کو سنبھال کر ذہن کو قابو میں رکھو گی تو لوگوں سے نمٹ سکو گی۔ ورنہ بات کا بتنگڑ بنتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے تمہیں اس صورتِ حال سے نمٹنا ہے..... میری بات سمجھ رہی ہو ناں؟''

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی ''جی..... سمجھ رہی ہوں!'' میں نے مزید دس پندرہ منٹ تک اسے تسلی دلاسے کی باتوں کا تحفہ دیا پھر اس کے گھر سے نکل آیا۔ میں زری کے لیے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

لالی کے حسرت ناک انجام نے مجھے دل گرفتہ کر دیا تھا۔ اس روز میں واپس آ کر تھانے میں بیٹھا کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ کسی شخص کا نااہل یا نالائق ہونا ایک خامی کی بات ہے مگر انسان کوشش کرے تو اپنی خامیوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ اس مسئلے کا یہ حل تو نہیں کہ انسان اپنی زندگی ہی سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ لالی نے کچھ اسی قسم کی حرکت کی تھی۔

لالی کے بارے میں سوچتے ہوئے اس سے ہونے والی وہ ملاقات بھی یاد آئی جب وہ پہلی اور آخری مرتبہ زری کی شکایت لے کر میرے پاس آیا تھا۔ اس کی کتھا سننے کے بعد میں نے اس کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ زری کے ہاتھوں اتنا ہی تنگ ہے تو اس سے نجات حاصل کر لے۔ جواب میں اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''جناب! وہ بڑے خطرناک طریقے سے مجھے ڈراتی ہے کہ اگر میں نے اس کے سلوک کا کسی سے ذکر کیا تو وہ مجھے زہر کھلا کر مار ڈالے گی یا پھر کسی رات سوتے میں تیز دھار چھری سے میری شہ رگ کاٹ ڈالے گی اور مشہور کر دے گی کہ گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے۔ لالی نے ان کے سامنے مزاحمت کی اور وہ اس کی گردن کاٹ کر چلے گئے۔''

اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا ''تھانے دار صاحب! زری کو چھوڑ دینا تو اور بھی مشکل کام ہے۔ وہ بعض اوقات بہت جنونی ہو جاتی ہے۔ اگر میں نے اس قسم کی کوئی بات کی تو وہ موت سے پہلے ہی مجھے قتل کر ڈالے گی۔ وغیرہ وغیرہ.....!''

پتا نہیں کیوں' ان لمحات میں میرا ذہن لالی کی موت کے بارے میں مختلف زاویوں سے سوچ رہا تھا اور ان میں سے ایک زاویہ زرینہ عرف زری کا بھی تھا۔ اس بات میں شک و شبے کی گنجایش نہیں تھی کہ لالی فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا اور یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ اس گھر میں گزشتہ رات ڈاکو نہیں گھسے تھے۔ میں نے جائے وقوع پر پہنچ کر' چھت سے جھولتی ہوئی اس کی لاش کا بغور جائزہ لیا تھا۔ وہ سیدھا سادی خودکشی ..... کی ایک واردات دکھائی دیتی تھی۔ لالی نے چھت سے لٹک کر اپنی جان دے دی تھی۔ اس نے یہ سنگین قدم اپنے ایک دعوے کی ناکامی کے بعد اٹھایا تھا۔ اس واقعے کے بارے میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں زری نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ شدید نوعیت کے جذباتی دباؤ کے زیرِ اثر لالی نے اپنی جان لے لی تھی۔ یہ سارے کردار اور واقعات اس کہانی میں اپنی جگہ فٹ تھے لیکن جانے کیوں' میرا دل مطمئن نہیں تھا!

زری سے ہونے والی پہلی ملاقات میں اس نے مجھے اپنے اور لالی کے خاندانی پس منظر کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ لالی کی ماں اللہ وسائی ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آئی تھی۔ اس وقت لالی جوان تھا۔ یہ ماں بیٹا خاندان کے دیگر افراد کو وہیں ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ لالی کے باپ اور ماں میں بہت پہلے علیحدگی ہو گئی تھی۔ یہ لوگ علی گڑھ میں رہتے تھے۔ لالی کے باپ کریم بخش کا علی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گڑھ میں تالے بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ اللہ وسائی سے ناچاقی کے بعد کریم بخش نے دوسری شادی کرلی تھی اور اس بیوی سے اس کے تین بچے بھی تھے جبکہ رحیم بخش عرف لالی اکیلا ہی تھا۔ اس کا کوئی اور سگا بہن بھائی نہیں تھا چنانچہ جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تو اللہ وسائی اپنی اکلوتی اولاد کو لے کر پاکستان آ گئی۔ یہاں پر ان ماں بیٹے کا قریبی رشتے دار کوئی نہیں تھا اور..... اب تو وہ ماں بیٹا بھی باقی نہیں رہے تھے!

لالی کی پہلی بیوی سلمٰی کے بارے میں ابتدائی صفحات میں بتایا جا چکا ہے اور اس کا انجام بھی بیان کردیا گیا ہے۔ لالی کی دوسری بیوی زرینہ عرف زری کا خاندان بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی ماں آسیہ فوت ہو چکی تھی۔ باپ خوشی محمد زندہ تھا اور کپڑے کی ایک دکان چلاتا تھا۔ زرینہ سے چھوٹی دو بہنیں تھیں، جن میں سے روبینہ کی عمر بارہ سال اور زاہدہ کی آٹھ سال تھی۔ یہ لوگ بھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ جہاں کی سلمٰی رہنے والی تھی۔

اگلے روز پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے ساتھ لالی کی لاش سرکاری اسپتال سے تھانے پہنچ گئی۔ میں نے زری کو لاش کی آمد کے بارے میں اطلاع دینے کے لیے ایک بندے کو اس کے گھر روانہ کردیا اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔ مذکورہ رپورٹ نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس کے الفاظ میں سنسنی خیزی اور انکشاف انگیزی پائی جاتی تھی۔ لالی کی موت کا وقت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان بتایا گیا اور موت کا سبب تھا زہر خورانی..... اس کے خون اور معدے کے مخصوص لیبارٹری ٹیسٹ سے پتا چلا تھا کہ اسے کوئی زود اثر زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ لالی کے طبعی تجزیے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ جب وہ پھانسی لگا اس وقت زندہ نہیں تھا۔ زود اثر زہر نے اس سے پہلے ہی اس کی زندگی کا چراغ گل کردیا تھا۔ اس رپورٹ کو میں نے کئی بار اوپر سے نیچے تک پڑھا اور ہر مرتبہ ذہن میں یہی سوال ابھرا۔

''کیا لالی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد چھت سے لٹکایا گیا تھا؟''

اگر منطقی انداز اور حالات کی روشنی میں دیکھا جاتا تو یہی جواب ابھر کر سامنے آتا تھا ''ہاں!'' اسی لمحے لالی کی باتیں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ اس کے بقول زری اسے کئی مرتبہ دھمکی دے چکی تھی کہ وہ تیز دھار چھری سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالے گی..... یا پھر کھانے میں زہر ملا کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دے گی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے پہلے یہی نظر آ رہا تھا کہ لالی نے اپنی مردانہ لاج کی ناؤ ڈوبنے پر دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرلی تھی لیکن میرے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی یہ رپورٹ سوچنے سمجھنے کے لیے کئی سنگین دروا کر رہی تھی۔ لالی پھانسی ضرور لگا لیکن اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا فٹ ہونے سے قبل وہ یہ دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں جا چکا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کی لاش کو زبردستی پھانسی دی گئی تھی تاکہ دیکھنے والوں کو یہی نظر آئے کہ اس نے خودکشی کی ہے اور..... ایسا کون کرسکتا تھا؟''

اس سوال کے جواب کی تلاش میں میری سوچ لالی کی بیوی زرینہ عرف زری سے شروع ہو کر اس پر ختم ہو جاتی تھی۔ اس گھر میں وہ دونوں میاں بیوی رہتے تھے۔ کسی ایک کو کوئی حادثہ پیش آ جانے کی صورت میں دوسرا ہی بہتر طور پر بتا سکتا تھا اور زری نے مجھے اس سنگین واقعے کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے باطل کردیا تھا۔

لالی نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا!

لالی کی موت کسی زود اثر زہر کے سبب واقع ہوئی تھی اور زری اسے ایک سے زیادہ مرتبہ زہر کھلا کر مارنے کی دھمکی دے چکی تھی لہٰذا مجھے فوری طور پر زری کا ایک کڑا ''انٹرویو'' کرنا تھا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کیا جا سکے..... اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ دودھ میں پانی ملایا گیا ہے یا پانی میں دودھ!

اگر زری ہی نے زہر کھلا کر اپنے شوہر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا تو پھر یہ بھی طے تھا کہ وہ اس قتل کی واردات میں اکیلی ملوث نہیں رہی تھی۔ کوئی اور بھی اس کھیل میں اس کے ساتھ شامل تھا اور..... وہ کوئی یقیناً ایک مرد تھا کیونکہ لالی کو پھانسی پر لٹکانا اکیلی زری کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے کسی شخص نے اس کی بھرپور مدد کی ہوگی!

میں ایک منطقی اور سنسنی خیز نتیجے پر پہنچ چکا تھا، بس زری کی زبان سے اقبالِ جرم کروانا باقی تھا۔ میں نے فوری طور پر زری کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس سے پہلے کہ میں تھانے سے روانہ ہوتا، دو افراد مجھ سے ملنے آ گئے۔

ان میں سے ایک شخص کا چہرہ مجھے شناسا لگا۔ تھوڑا ذہن پر زور ڈالا تو فوراً مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے جائے وقوعہ پر دیکھا تھا۔ غالباً وہ زری اور لالی کا پڑوسی تھا یا کم از کم انہی کی گلی میں رہتا تھا۔ میری مشکل آسان کرتے ہوئے مذکورہ شخص ہی نے تعارف کرایا۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام یعقوب ملہی ہے۔ اُدھر جیون پور میں میرا ابھینسوں کا باڑا ہے اور میں لالی کے پڑوس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہتا ہوں۔'' لمحے بھر کو توقف کر کے اس نے اپنے ساتھی کی جانب اشارہ کیا اور بتانے لگا ''یہ خوشی محمد ہے۔ زری کا باپ۔ ہم لالی کی لاش لینے آپ کے پاس آئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں' لالی کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اس کے کفن دفن کا بندوبست ہمیں ہی تو کرنا ہوگا!''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے خوشی محمد سے استفسار کیا ''خوشی محمد! تمہاری بیٹی کا کیا حال ہے؟''

''کچھ نہ پوچھیں تھانے دار صاحب!'' وہ آزردہ لہجے میں بولا ''بے چاری کا بہت برا حال ہے۔ اسے تو غش پر غش آرہے ہیں۔ ابھی بھی میں اسے بے ہوش چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''کون سے گھر.....'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا ''کیا وہ ابھی تک لالی والے گھر میں ہی ہے یا آپ اسے اپنے گھر لے گئے ہیں؟''

لالی کی موت کے فوراً بعد میں جائے واردات پر زری سے ایک بھرپور ملاقات کر چکا تھا اور میں نے اسے ایسا دل گرفتہ یا دکھی نہیں پایا تھا کہ اسے غشی جیسے معاملات سے گزرنا پڑے۔ وہ لالی کے انجام پر پریشان اور ملول ضرور تھی مگر اسے خود پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ دور دور تک اس بات کے امکانات دکھائی نہیں دیتے تھے کہ لالی کی جدائی میں اسے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگیں گے لہٰذا جب خوشی محمد نے مجھے اس کی کیفیت کے بارے میں بتایا تو میرا ماتھا ٹھنک اٹھا اور میرے اندر سے ایک لہر آواز بن کر ابھری کہ زری جو کچھ کر رہی ہے' وہ ایک ڈرامے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان دونوں کی زندگی جس انداز سے گزر رہی تھی' وہ اس نوعیت کے جذباتی ردعمل کا تقاضا نہیں کرتی تھی۔ میں اپنے خیالات سے چونک کر خوشی محمد کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے سوال کا جواب دے رہا تھا۔

''جناب! میری کوشش تو یہی تھی کہ اسے اپنے گھر لے جاؤں لیکن وہ اس گھر سے قدم نکالنے کو تیار نہیں حالانکہ لالی کی موت کے بعد وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ اس ویران گھر میں اکیلی رہ کر کیا کرے گی لیکن وہ ایک ہی ضد پر اڑی ہوئی ہے کہ جب تک اس کی عدت پوری نہیں ہو جاتی' وہ اس گھر کو نہیں چھوڑے گی یا کم از کم لالی کے چالیسویں تک وہ ضرور وہاں رہے گی۔ ہم اس کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئے لہٰذا میں نے اس کی دونوں چھوٹی بہنوں روبینہ اور زاہدہ کو بھی اسی کے پاس چھوڑ دیا ہے تاکہ اس کا خیال رکھ سکیں' اس کی دیکھ بھال کر سکیں۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں تھانے دار صاحب!''

''ٹھیک کہتے ہو خوشی محمد!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا ''کیا زری اس حالت میں بھی نہیں کہ اس سے بات چیت کی جا سکے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے دکھی لہجے میں جواب دیا ''اسے تھوڑی دیر کے لیے ہوش آتا ہے پھر دوبارہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ یہی سلسلہ کل سے وقفے وقفے سے جاری ہے۔''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

خوشی محمد نے تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا ''آپ اس سے کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''ہاں..... ہیں چند خاص باتیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا ''لیکن یہ باتیں اسی وقت کی جا سکتی ہیں جب وہ مکمل ہوش و حواس میں ہو۔''

خوشی محمد کے ساتھ آئے ہوئے لالی کے پڑوسی یعقوب ملہی نے کہا ''تھانے دار صاحب! ہمارا پروگرام یہ ہے کہ لالی کی لاش کو عصر اور مغرب کے درمیان سپرد خاک کر دیا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ابھی لاش ہمارے حوالے کر دیں تاکہ مقررہ وقت سے پہلے تمام تیاریاں مکمل کر لی جائیں۔''

میں نے چند لمحات تک موجود صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا پھر لاش خوشی محمد کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لالی کی تجہیز و تکفین میں رکاوٹ بننا ٹھیک نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں' میں بعد میں بھی زری سے کڑی تفتیش کر سکتا تھا اور اگر وہ واقعی اپنے شوہر کے قتل کی سازش کا حصہ تھی تو پھر اس کے ساتھ قرار واقعی سلوک کرنے سے مجھے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔

قانونی کاروائی پوری کرنے کے لیے میں نے چند ضروری کاغذات پر خوشی محمد کے دستخط لیے اور لالی کی لاش اس کے حوالے کر دی اور پھر کہا۔

''خوشی محمد! میں شام کے بعد کسی وقت زری سے ملنے آؤں گا۔ تم اس وقت زری کے گھر میں موجود ہو گے ناں؟''

''مجھے کہاں جانا ہے جناب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''اپنی دکان تو میں لالی کے تیجے کے بعد ہی کھولوں گا۔ میں اور میری دونوں بچیاں اُدھر زری کے پاس ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''رات کو پھر اُدھر ہی ملاقات ہو گی۔''

تھوڑی دیر بعد جب خوشی محمد اور یعقوب ملہی لالی کی لاش کو لے کر تھانے سے رخصت ہو گئے تو میں اپنے کمرے میں آکر زری کے کردار کے بارے میں سوچنے لگا۔ حالات و واقعات کی روشنی میں' میں اس نتیجے پر پہنچا کہ زری سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملاقات تو رات کو ہوگی لیکن ابھی اور اسی وقت سے مجھے اس کی خفیہ نگرانی کا انتظام کر لینا چاہیے۔ جب تک اس کی ذات کے حوالے سے میری تسلی نہ ہو جاتی' اسے اپنے گھر سے باہر قدم نہیں نکالنا چاہیے تھا۔

میں نے اپنے اسٹاف کے دو انتہائی قابلِ اعتماد اور ہوشیار قسم کے کانسٹیبلو کا انتخاب کیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر زری کے گھر کی نگرانی کے لیے روانہ کر دیا۔ انہوں نے سادہ لباس میں رہتے ہوئے زری والے گھر پر کڑی نگاہ رکھنا تھی۔ مذکورہ دونوں کانسٹیبلو میرے کئی بار کے آزمائے ہوئے تھے۔ وہ نگرانی اور تعاقب والے معاملات میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ مجھے امید تھی کہ بہت جلد ان کی طرف سے کوئی ایسی خبر مل جائے گی جو میرے لیے بہت مفید ثابت ہوتی اور.....اور اس کیس کو حل کرنے کا سبب بھی!

☆☆☆

میری پیشہ ورانہ زندگی میں اتنے زیادہ سنگین' سنسنی خیز اور دلچسپ واقعات بھرے ہوئے ہیں کہ ہر بار کہانی شروع کرنے سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آج کسی واقعے کو موضوع بناؤں۔ ان میں ہر نوعیت اور ہر زاویے کے کیس شامل ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں جن کو حل کرنے کے لیے مہینے نہیں بلکہ سال لگ گئے اور بعض ایسے بھی ہیں جو ہفتوں اور دنوں میں حل ہو گئے۔ واقعات کچھ اس ترتیب سے پیش آتے گئے کہ اصل مجرم تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے پاپڑ پیلنا پڑے اور نہ ہی ہل بیل کے استعمال کی نوبت پیش آئی۔ لالی کی موت کا واقعہ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جو کیس آسانی اور سہولت سے نمٹ گئے ان میں درسِ عبرت کا اتنا ہی زیادہ سامان موجود ہوتا تھا۔

میں شام میں جیون پور جانے کے لیے تھانے سے نکلنے ہی والا تھا کہ ایک عمر رسیدہ کمر خمیدہ عورت مجھ سے ملنے کے لیے آ گئی۔ اس کے ساتھ بارہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا۔ میں رک گیا اور ان دونوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''میرا نام رحمت بی بی ہے تھانے دار پتر!'' اس بڑھیا نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا پھر اپنے ساتھ آنے والے لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی'' یہ میرا پوتا وقار ہے۔ ہم قادر آباد سے آئے ہیں۔''

قادر آباد بھی جیون پور کی طرح میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ میں نے رحمت بی بی نامی اس بڑھیا سے پوچھا'' اماں! بتاؤ' میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''اللہ تمہارا بھلا کرے!'' وہ دعائیہ انداز میں بولی'' مجھے پتا چلا ہے' لالی کی لاش اسپتال سے تھانے آ گئی ہے۔ میں وہ لاش لینے قادر آباد سے یہاں آئی ہوں۔''

میں نے چونک کر رحمت بی بی کی طرف دیکھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا'' لالی کی لاش؟''

''ہاں پتر.....لالی کی لاش!'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''پاکستان میں اگر اس کا کوئی حقیقی وارث ہے تو وہ میں ہی ہو سکتی ہوں' اس لیے اس کی لاش وصول کرنے کا حق بھی سب سے زیادہ مجھ کو ہے۔''

رحمت بی بی کی دعویٰ نما باتیں دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ انکشاف انگیز بھی تھیں۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا'' میری معلومات کے مطابق' لالی کا پاکستان میں کوئی قریبی رشتے دار موجود نہیں۔ ایک اس کی ماں تھی اللہ وسائی.....پچھلے سال وہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اماں! آپ لالی کی کیا لگتی ہو؟''

''میں اس کی رشتے کی خالہ ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی'' اللہ وسائی میرے چاچے کی بیٹی تھی اور اس رشتے سے وہ میری بہن ہی لگی ناں.....اور بہن کا بیٹا لالی میرا بھانجا لگا کہ نہیں؟''

''اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ آپ اللہ وسائی کی چچری بہن ہو یا نہیں اور اس رشتے سے لالی آپ کا بھانجا ہوا کہ نہیں۔'' میں نے گہری نظر سے رحمت بی بی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا'' آپ ذرا یہ بتاؤ کہ جب لالی کی بیوی زندہ ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو لالی کی لاش کو کیسے دیا جا سکتا ہے۔ لالی کی لاش پر سب سے زیادہ حق تو زری ہی کا بنتا ہے ناں؟''

وہ ایک ہاتھ کو ہوا میں نچاتے ہوئے بولی'' زری بد بخت اتنی حق دار کیسے ہو گئی۔ اس نے اللہ وسائی اور لالی کو ایک ذرا سکھ نہیں دیا تھا۔ مجھے تو شک ہے کہ اس منحوس نے لالی کے ساتھ بھی وہی کیا ہوگا جو ایک سال پہلے اللہ وسائی کے ساتھ کیا تھا؟''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا'' زری نے اپنی ساس کے ساتھ کیا کیا تھا رحمت بی بی؟''

''اللہ وسائی میری ماں جائی نہ سہی۔'' وہ ایک دم جذباتی ہو گئی'' لیکن رشتے میں میری بہن تو تھی۔ کتنی حسرت ناک موت ہوئی تھی اس کی۔ بے چاری پچھلے سال خون کی الٹیاں کرتے کرتے مری ہے۔ زری نے ہر طرف یہی مشہور کیا تھا کہ اللہ وسائی کو ہیضہ ہوا ہے۔ بھلا ہیضے میں بھی خون کی الٹیاں بھی ہوئی ہیں۔ میں اس موقع پر بہت پیچی تھی' بہت چلائی تھی لیکن کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے میری بات نہیں سنی۔ اللہ وسائی کو ایسے ہی دفنا دیا گیا۔ حالانکہ اس کا پوسٹ آفس ہونا چاہیے تھا۔''

''پوسٹ آفس.....؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ جی.....کیا کہتے ہیں اس کو جس میں چیر پھاڑ کرتے ہیں۔'' وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''ڈاکٹر لاش کو چیر پھاڑ کر پتا چلا لیتے ہیں کہ بندہ اپنی آئی سے مرا ہے یا اسے قتل کرایا.....یا قتل کیا گیا ہے۔''

''پوسٹ آفس نہیں.....پوسٹ مارٹم!'' میں نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔

''جی ہاں.....وہی!'' وہ جلدی سے بولی ''اگر اللہ وسائی کا پوسٹ آفس .....میرا مطلب ہے' پوسٹ مارٹم ہو جاتا تو ساری حقیقت سامنے آسکتی تھی۔''

رحمت بی بی ایک دل چسپ' سنسنی خیز اور انکشاف انگیز کردار کے طور پر ابھر کر اچانک میرے سامنے آئی تھی۔ اس کی باتیں کیسی بھی الزامی سہی مگر میں اس کے دعوؤں کو نظر انداز کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''رحمت بی بی! تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اللہ وسائی کی موت میں اس کی بہو زری کا ہاتھ شامل تھا؟''

''جی مجھے تو پکا شک ہے!'' وہ پُروثوق لہجے میں بولی ''اس نامراد نے میری بہن کو ضرور زہر دیا ہوگا اور.....لالی بھی اسی کی کرتوت کی وجہ سے مرا ہوگا.....'' وہ اچانک متوقف ہوئی اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تھانے دار پتر! کیا آپ نے لالی کا پوسٹ.....مارٹم کرایا ہے؟''

موضع جیون پور کے تمام لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ پوسٹ مارٹم کے لیے میں نے لالی کی لاش کو سرکاری اسپتال بھیجا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا' پوسٹ مارٹم میں کس سنگین حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ میں نے رحمت بی بی کو گھسنے کے لیے ایسے ہی کہہ دیا۔

''لالی کی موت پھانسی لگنے سے واقع ہوئی ہے۔ میں نے خود جائے وقوع پر جا کر چھت سے لٹکتی اس کی لاش کو دیکھا تھا۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ زری نے پکڑ کر زبردستی اسے پھانسی دے دی ہو؟''

''یہ تو میرے بھی سننے میں آیا ہے کہ لالی اپنے گھر میں چھت سے لٹکا ہوا پایا گیا ہے۔'' وہ فکرمندی سے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے بولی ''میں آپ کی بات مانتی ہوں کہ لالی اتنا بھی گیا گزرا نہیں تھا کہ زری اسے خود کو پھانسی لگانے پر مجبور کر دیتی.....خیر۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''آپ لالی کی لاش تو میرے حوالے کریں۔''

''مجھے افسوس ہے رحمت بی بی! کہ میں تمہاری یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اول تو میں لالی کی لاش کو اس کے گھر بھجوا چکا ہوں اور مجھے یقین ہے' اب تک اسے دفنا بھی دیا گیا ہوگا۔ دوسرے' اگر لاش تھانے میں موجود بھی ہوتی تو میں اسے زری ہی کے حوالے کرتا۔ میرے نزدیک وہی اس کی حقیقی وارث بنتی ہے اور قانون کی نظر میں بھی یہی درست ہوتا۔''

وہ ہائے دوائے کرنے لگی ''غضب خدا کا! دیکھیں تو بھلا.....کسی نے مجھے بتایا ہی نہیں اور لالی کو قبر میں بھی اتار دیا۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا۔ آخر میں اس کی خالہ ہوں ارقادر آباد' جیون پور سے زیادہ دور تو نہیں لیکن وہی بات ہے کوئی مجھے کیوں اطلاع دے گا۔ میں شور مچاتی ہوں۔ اللہ وسائی کی موت کے وقت بھی میں نے بڑا واویلا کیا تھا.....اس لیے انہوں نے لالی کو چپ چپاتے ہی دفن کر دیا.....ہائے' ایک خاندان ختم ہو گیا.....!''

وہ اپنے جذبات کا اظہار کر کے فارغ ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا لیا ''رحمت بی بی! کیا تم اُدھر لالی کے گھر سے ہو کر آئی ہو؟''

''نہیں پتر! ہم دونوں سیدھے تھانے ہی آئے ہیں۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی ''سوچا تھا' لالی کی لاش کو اپنے ساتھ قادر آباد لے جاؤں گی تاکہ لالی نہ سہی' اس کی قبر ہی نشانی کے طور پر میرے قریب رہے مگر یہ بھی ممکن نہیں رہا.....اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں لالی کی قبر کھلوانے کی مہم میں لگ جاؤں۔ یہ تو لاش کی بے حرمتی کرنے والی بات ہوگی۔''

رحمت بی بی نے اللہ وسائی کی موت کے حوالے سے اپنے جس قوی خدشے کا اظہار کیا تھا اس میں کتنی حقیقت تھی' اس سے قطع نظر اللہ وسائی کی موت' رحمت بی بی کے دعوے کی روشنی میں لالی کی موت سے بہت مطابقت اور مماثلت رکھتی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے لالی کی موت کی قلعی کھول دی تھی۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجایش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ لالی کو زہر کھلا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اس کی لاش کو پھانسی پر لٹکا کر خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

میں نے رحمت بی بی کو فی الحال لالی کو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بارے میں بتانا ضروری نہ سمجھا اور نہایت ہی سنجیدہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں کہا ''میں اُدھر زری کے گھر جارہا ہوں۔ اگر تم چلنا چاہو تو آؤ میرے ساتھ!''

''میں تو اس منحوس کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی ''میرا بھانجا منوں مٹی کے نیچے سو چکا تو اب میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔'' وہ سانس لینے کے لیے ٹھہری پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا ''ہم تو واپس قادر آباد جائیں گے۔''

لالی کی موت والا واقعہ ایسے سنگین اور سنسنی خیز مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ جب تک میں زری سے ایک بھرپور اور تفصیلی ملاقات نہ کر لیتا' کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا لہٰذا میں نے رحمت بی بی سے مزید کوئی بات نہیں کی اور ان دادی پوتا کو تھانے سے رخصت کر دیا۔ اس کے ٹھیک دس منٹ بعد میں بھی جیون پور کی جانب روانہ ہو گیا۔ کانسٹیبل خالد بھٹی بھی میرے ساتھ تھا۔

جیون پور میرے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن راستے بھر میں لالی کی پوسٹ مارٹم اور رحمت بی بی کے مشکوک و شبہات کو آپس میں تیج کرنے کی تگ و دو میں لگا رہا۔ حالات و واقعات اور حقائق و شواہد کی روشنی میں یہ دونوں اموات کسی ایک ہی زنجیر کی کڑیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے ذہن میں یہ طے کر لیا کہ اگر زری ہی نے لالی کو زہر دے کر فنا کی وادیوں میں دھکیلا ہے تو پھر اس کام میں کوئی مرد بھی اس کا معاون رہا ہوگا..... میرے ذہن کا یہ تجزیہ نہایت ہی خوف ناک اور سنسنی خیز تھا!

ہم مسجد والی گلی میں داخل ہوئے تو مجھے سامنے سے اللہ رکھا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اللہ رکھا ان دو کانسٹیبلوں میں سے ایک تھا جنہیں میں نے زری کی خفیہ نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھی کانسٹیبل کا نام نبی بخش تھا۔

اللہ رکھا نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ تیزی سے چلتے ہوئے میرے جانب بڑھنے لگا۔ اگرچہ اس وقت اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں نے اللہ رکھا کے چہرے اور انداز سے جھلکتی پریشانی کو خاص طور پر نوٹ کر لیا۔ اس کی اضطراری اور اضطرابی چال ہی سب کچھ کھول کر بیان کر رہی تھی۔

وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے اس سے پوچھا ''اللہ رکھا! تم اس طرح افراتفری میں کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ سب خیریت تو ہے ناں؟''

''ملک صاحب! میں ایک مشکوک بندے کے تعاقب میں ہوں۔'' اس نے گلی کے کونے کی جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے جواب دیا ''میں تھوڑی دیر میں واپس آ کر آپ کو سب بتاتا ہوں۔ اگر میں یہاں رک گیا تو وہ بندہ.....''

''ٹھیک ہے' تم جاؤ۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''اور اپنے ساتھ خالد بھٹی کو بھی لے جاؤ۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے بھٹی کی سمت اشارہ بھی کر دیا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے میرے ہمراہ آنے والے خالد بھٹی کانسٹیبل کی طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ دونوں جانے لگے تو میں نے اللہ رکھا سے پوچھ لیا۔ ''زری تو گھر میں ہے ناں؟''

''جی وہ اندر ہے۔'' اس نے جواب دیا ''نبی بخش نے اس گھر پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔''

اتنا وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں اللہ رکھا سے اس نامعلوم مشکوک بندے کے بارے میں مزید سوال و جواب کرتا۔ اللہ رکھا کے مبہم انکشاف نے میرے ذہن میں ہل چل مچا دی تھی۔ وہ جس افراتفری میں مذکورہ بندے کے پیچھے گیا تھا، اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ لالی مرڈر کیس میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا۔ میں اسی قسم کی سوچ کے ساتھ زری کے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں نے نبی بخش کو ایک طرف کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اس نے میری جانب بڑھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اشارہ کر کے ایسا کرنے سے روک دیا۔ وہ اجنبی بن کر دوسری سمت دیکھنے لگا تھا۔

زری کا باپ خوشی محمد اس وقت گھر کے اندر موجود تھا۔ اس نے مجھے لے جا کر بیٹھک میں بٹھا دیا اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے ہمدردی بھرے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔

''لالی کی تدفین وغیرہ خیریت سے ہو گئی؟''

''جی! ابھی تھوڑی دیر پہلے قبرستان سے آئے ہیں!'' اس نے جواب دیا۔

''زری کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اس نے حالت زیادہ اچھی نہیں جناب!'' وہ تشویشناک لہجے میں بولا ''اس نے لالی کی موت کا بہت زیادہ اثر لے لیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اسے ہوش آیا ہے لیکن گم صم بیٹھی دیوار کو دیکھے جا رہی ہے۔''

''یہ اچھی خبر ہے کہ وہ اس وقت ہوش میں ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ''میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں' بس وہ اس کا جواب دے دے تو میرا کام مکمل ہو جائے گا۔ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ضرور ہوں لیکن ایسا نہیں کہ میرے اوپر کوئی اور نہ بیٹھا ہو۔ مجھے اپنے علاقہ ایس پی کو ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غیر معمولی واقعے کی تفصیلی رپورٹ کرنا ہوتی ہے اور لالی والے معاملے کی رپورٹ ابھی ادھوری ہے۔ میں زری سے چند سوالات کر کے ہی اس رپورٹ کو پورا کر سکتا ہوں ورنہ خوامخواہ میرا ذہن اس کیس میں اٹکا رہے گا۔''

''میں اندر جا کر دیکھتا ہوں تھانے دار صاحب!'' خوشی محمد نے گمبھیر صورتحال کو فوراً محسوس کر لیا ''اگر وہ جاگ رہی ہے تو میں آپ سے اس کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے خوشی محمد! میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا پھر دو تین منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا اور تھکے ہوئے لہجے میں اس نے مجھے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! زری دوبارہ بے ہوش ہو چکی ہے۔''

''اوہ.....!'' میں ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

یہ میرے پیشہ ورانہ تجربے کا کمال تھا یا پھر میری چھٹی حس کا کوئی تنبیہی اشارہ کہ مجھے لگا جیسے اب کی بار زرینہ اپنی مرضی سے بے ہوش ہوئی ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ میں اس گھر کے اندر موجود تھا۔ صبح میں نے خوشی محمد کو بتا دیا تھا کہ شام کو میں ادھر چکر لگاؤں گا اور اس وقت میں پولیس یونی فارم میں بھی تھا۔ میری آمد کی اطلاع یقیناً زری کو بھی پہنچ گئی ہو گی۔ خوشی محمد نے مجھے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ ہوش میں تھی لہٰذا اس زاویے پر سوچا جا سکتا تھا کہ اس گھر میں میری آمد نے زری کو بے ہوش ہونے پر ''مجبور'' کر دیا تھا۔

اور.....ایسا سوچتے ہوئے یہ شک مزید پختہ ہو جاتا تھا کہ زری بلاواسطہ یا بالواسطہ لالی مرڈر کیس میں ملوث ہے۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر خوشی محمد نے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ میری بیٹی سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا اس کی جگہ میں آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''وہ سوالات اتنے نازک اور ذاتی نوعیت کے ہیں کہ صرف زری ہی سے پوچھے جا سکتے ہیں اور وہ بھی بالکل علیحدگی میں!''

وہ الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں اٹھ کھڑا ہو گیا اور خوشی محمد سے کہا ''خوشی محمد! اپنی بیٹی کا خاص خیال رکھو اور کوشش اس بات کی کرنا کہ اسے ہوش آ جائے۔ میں صبح آؤں گا۔ اس وقت زری کو بالکل ہشاش بشاش ہونا چاہیے۔''

''جی' میں اپنے تئیں پوری کوشش کروں گا۔'' وہ گمبھیر آواز بولا۔

میں اس گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے برآمد ہوتے دیکھ کر نبی بخش کے پاؤں میں جنبش ہوئی اور وہ تھوڑا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے چلنے لگا۔ جب میں مسجد والی گلی سے باہر آیا تو نبی بخش میرے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اس کی موجودگی کو محسوس کر کے استفساریہ لہجے میں کہا۔

''نبی بخش! تم اس وقت اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہو۔ تمہیں زری اور اس کے گھر کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہے۔ تم وہ جگہ چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے؟''

''وہ جناب! میں آپ کو ایک بندے کے بارے میں بتانا ہے۔'' وہ اپنی صفائی میں بولا ''اللہ رکھا اس ہی بندے کے پیچھے گیا ہے۔ اس بندے کی حرکتیں کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔''

''تم کس بندے کی بات کر رہے ہو نبی بخش؟'' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس گلی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی کھڑا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی اندھیرے کے باعث ہم خاصے محفوظ تھے۔ نبی بخش بھی بہت احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ تک پہنچا تھا لہٰذا اس مقام پر کھڑے ہونے اور اس کی بات سننے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ہماری گفتگو سے کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ نبی بخش سادہ لباس میں پولیس والا ہے اور ایک خاص مقصد کے تحت وہ لالی کے گھر کی نگرانی کر رہا ہے۔

نبی بخش نے میرے سوال کے جواب میں بتایا ''ملک صاحب! جب سے ہم اس گھر کی نگرانی کر رہے ہیں' بہت سے لوگوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور اکثر عورتوں کے ساتھ بچے بھی۔ یہ ایک نارمل سی بات ہے۔ جس گھر میں مرگ ہو جائے وہاں تعزیت اور پرسے کے لیے لوگ آیا ہی کرتے ہیں لیکن انہی لوگوں میں ایک بندے نے ہمیں چونکا دیا۔ اس کا نام الطاف معلوم ہوا ہے۔ گھنگریالے بال' صحت مند' لمبا قد' گورا چٹا رنگ اور خاصا وجیہ شکیل ہے یہ شخص.....عمر کوئی چھبیس ستائیس سال ہو گی۔''

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا' لمبی لمبی سانسیں کھینچ کر اپنے تنفس کو درست کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''الطاف نامی یہ بندہ تین چار مرتبہ گھر کے اندر ہو کر آیا۔ اس کے رویے اور انداز سے ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ سوگ کے لیے آنے والوں سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ وہ کسی اور مقصد کے لیے وہاں کے پھیرے لگا رہا ہو۔ جب یہ لوگ لالی کی لاش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو دفنانے کے لیے قبرستان لے گئے تھے تو الطاف نے اچھا خاصا وقت اندر گزارا ہے اور آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ گھر سے نکلا ہے۔ دروازے سے جب وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ گلی میں قدم رکھتے ہی اس نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھا اور مذکورہ پوٹلی کو اپنے نیفے میں اڑس لیا پھر وہ تیز تیز قدموں سے ایک طرف جانے لگا۔ ہم ایسے محفوظ گوشے میں کھڑے تھے کہ وہ ہمیں دیکھ نہ سکا البتہ ہم نے اس کی ایک ایک مشکوک حرکت کو نوٹ کیا ہے۔ ہم دونوں کا مشترکہ خیال ہے کہ وہ بندہ کسی خاص مشن پر ہے، اسی لیے اللہ رکھا اس کے پیچھے گیا ہے تاکہ اس کے کرتوتوں کا جائزہ لیا جاسکے۔''

''اللہ رکھا سے میری ملاقات گلی میں داخل ہوتے وقت ہوگئی تھی۔'' اس لمبی کہانی کے اختتام پر میں نے کہا ''جس بندے کا نام تم الطاف بتا رہے ہو وہ اسی کے تعاقب میں گیا ہے اور میں نے کاکسیل خالد بھٹی کو بھی اس کے ہمراہ بھیج دیا ہے۔ مجھے امید ہے وہ لوگ جلد واپس آجائیں گے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب!'' نبی بخش نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا ''تم فی الفور واپس جاؤ اور نگرانی کے سلسلے کو جاری رکھو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا ''اور زری کو کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کرنا۔ اگر وہ اکیلی یا کسی کے ساتھ گھر سے باہر نکلے تو نہایت ہی خفیہ طریقے سے اس کا تعاقب کرو۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔ اگر اس نوعیت کی صورتِ حال پیدا ہوجائے تو تم دونوں کوئی بھی سخت قدم اٹھانے کے لیے آزاد ہو'' میں لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں تھانے جارہا ہوں۔ کل صبح پھر ادھر کا چکر لگاؤں گا۔ تم دونوں باری باری رات کو آرام کرلینا۔ اللہ رکھا واپس آکر اگر کوئی چونکا دینے والی خبر سنائے تو اسے فوراً میرے پاس بھیج دینا یا پھر خالد بھٹی کے ذریعے اطلاع مجھ تک پہنچا دی جائے۔ تم میری بات سمجھ گئے ناں؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''بڑی اچھی طرح سمجھ گیا جناب!''

بات ختم کرتے ہی وہ چونک کر میرے عقب میں دیکھنے لگا۔ میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھ لیا ''کیا بات ہے نبی بخش؟''

''مجھے لگتا ہے وہ واپس آرہے ہیں۔'' وہ بہ دستور میرے پیچھے دیکھتا رہا تھا۔

''وہ کون ہے.....؟'' بے اختیار میں نے ایڑیوں پر یوٹرن لیا۔

اور اسی لمحے میری ان پر نظر پڑ گئی۔ اللہ رکھا اور خالد بھٹی تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ میں بھی ان کی جانب بڑھنے لگا۔ جلد ہی ہم ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی خالد بھٹی نے کہا۔

''ملک صاحب! فوری ایکشن کی ضرورت ہے ورنہ وہ بندہ ہاتھ سے نکل بھی سکتا ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا ''تم اسی بندے کا ذکر کررہے ہو ناں جس کے تعاقب میں تم دونوں گئے تھے یعنی.....الطاف!''

''جی ہاں' وہی.....!'' اللہ رکھا نے سراثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا ''اس نے جو حرکت کی ہے اس سے یہی لگتا ہے لالی والے معاملے میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔''

''وہ بندہ کسی پوٹلی کو اپنے نیفے میں اڑس کر یہاں سے گیا تھا'' میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا ''تم دونوں نے اس کے تعاقب سے کیا نتائج حاصل کیے ہیں۔''

''ہم دونوں مناسب فاصلہ رکھ کر' بڑی احتیاط سے اس کا پیچھا کرتے رہے۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ کوئی اس کے تعاقب میں ہے۔'' خالد بھٹی نے اپنی کارکردگی کی تفصیل بتانے لگا ''وہ محتاط نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے نہر کے قریب پہنچ گیا۔ نہر کے کنارے کے ساتھ جھاڑیاں واقع ہیں۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس بیٹھ کر زمین کھودنے لگا۔ وہاں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا لیکن ہم چونکہ اس کے نزدیک ہی ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپے بیٹھے تھے لہٰذا اس کی حرکات وسکنات ہم سے چھپی نہ رہ سکیں۔''

اتنا بتا کر خالد بھٹی نے لمحاتی توقف کیا تو آگے کی کہانی سنانے کا فرض اللہ رکھا نے اپنی زبان کو سونپ دیا۔ اس نے بتایا۔

''ملک صاحب! الطاف زری کے گھر سے جو پوٹلی نیفے میں چھپا کر اس طرف گیا تھا وہ اس نے نہر کے کنارے' ایک جھاڑی کے نیچے زمین کھود کر دبادی اور پھر واپس آبادی کی طرف چل پڑا۔ ہم نے واپسی کے راستے میں بڑی احتیاط سے اس کا پیچھا کیا اور اس کا گھر دیکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ جیون پور کے دوسرے کنارے پر واقع ایک گھر میں داخل ہوا تھا ہم تھوڑی دیر وہیں اس کا انتظار کرتے رہے کہ وہ گھر سے نکلے تو ہم اس کا تعاقب کریں لیکن پندرہ بیس منٹ گزر جانے کے بعد بھی جب اس کی شکل دکھائی نہ دی تو ہم یہی سمجھے کہ وہ رات بھر اطمینان سے اس گھر کے اندر موجود رہے گا' لہٰذا صورتِ حال سے آگاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے لیے ہم اِدھر چلے آئے۔''

ان دونوں نے باہمی تعاون سے الطاف کے بارے میں جو واقعات بیان کیے تھے، وہ بڑے انکشاف انگیز اور سنسنی خیز تھے۔ میں نے جب بھی لالی کے قتل کے حوالے سے سوچا تھا تو مجھے زری کے ساتھ کوئی مرد کھڑا دکھائی دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے جب میرے شک کی تصدیق کردی تو مجھے اس مرد کی تلاش شروع ہوئی' زری نے جس کے تعاون سے لالی کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا ہوگا اور اب .....الطاف نامی یہ بندہ اس کہانی کو فائنل ٹچ دینے کے لیے منظر نامے میں داخل ہوگیا تھا۔

میں نے خالد بھٹی سے پوچھا ''بھٹی! کیا تمہیں وہ مقام اچھی طرح یاد ہے جہاں الطاف نے زمین کھود کر پوٹلی دبائی ہے اور کیا وہاں تک تم میری راہ نمائی کر سکتے ہو؟''

''جی ہاں..... بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''میں اس جھاڑی کو نہیں بھول سکتا کیونکہ اس کے قریب ہی نہر کے کنارے ایک شیشم کا خاصا بلند درخت بھی لگا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا ''اور جیون پور کے دوسرے کنارے پر واقع وہ گھر بھی تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا' الطاف جس میں داخل ہوا تھا؟''

''جی' ملک صاحب!'' اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

میں نے اللہ رکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تم واپس اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔ نبی بخش تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے موجودہ صورتحال کے پیش نظر اسے چند ہنگامی ہدایات بھی دے دی ہیں۔ مجھے امید ہے تم لوگوں کو صرف یہی رات ڈیوٹی دینا ہوگی!''

وہ بڑی فرماں برداری سے بولا ''ملک صاحب! میں جا رہا ہوں۔''

''آؤ' ہم نہر کی طرف چلتے ہیں۔'' میں نے خالد بھٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں خالد کی راہ نمائی میں' نہر کے کنارے واقع اس جھاڑی کے پاس پہنچ گیا جہاں الطاف نے کوئی پوٹلی دبائی تھی۔ میری ہدایت پر خالد بھٹی زمین کھودنے لگا۔ میں ٹارچ دکھا کر اس کے کام میں آسانی فراہم کرنے لگا۔

میری ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ جب بھی میں محکمہ جاتی فرائض نبھانے کے لیے تھانے سے نکلتا ہوں تو پاکٹ سائز چند ضروری اشیا اپنے لباس میں ضرور رکھ لیتا ہوں جو موقع کی مناسبت سے کسی بھی وقت کام آجاتی ہیں اور نہایت ہی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً چھوٹا سا چاقو' ننھی سی قینچی اور پینسل ٹارچ وغیرہ۔ اس نوعیت کی چیزوں کو بہ آسانی جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔ میں اس وقت جس ننھی ٹارچ کی روشنی میں خالد بھٹی کے کام کو آسان بنا رہا تھا، وہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

خالد بھٹی نے زمین کھود کر جلد ہی مذکورہ پوٹلی برآمد کر لی۔ کھدائی میں کوئی مشکل اس لیے پیش نہیں آئی تھی کہ پوٹلی دبانے کا کام تھوڑی دیر پہلے ہی کیا گیا تھا۔ پوٹلی کو جتنے پُراسرار انداز میں' الطاف نامی اس بندے نے زمین میں دبایا تھا' اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ پوٹلی کوئی نہیں بلکہ کسی سنسنی خیز راز کو دفن کر کے گیا تھا۔

میرے حکم پر خالد بھٹی نے برآمد شدہ کپڑے کی وہ پوٹلی کھول لی۔ پوٹلی کے اندر سے جو کچھ نکلا اس نے ہم دونوں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کانچ کی ایک چھوٹی سی شیشی تھی جیسی کہ ڈی سی وی والی انجیکشن وائل ہوتی ہے۔ ٹارچ کی روشنی میں اس شیشی کا معائنہ کیا۔ اس کا کانچ گہرے بھورے رنگ کا تھا۔ شیشی کے منہ پر ایک ربر کا مخصوص ڈاٹ لگا ہوا تھا تاہم مذکورہ شیشی اندر سے خالی تھی۔

بھٹی نے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''ملک صاحب! یہ تو کسی ٹیکے والی خالی بوتل ہے۔''

''ہاں' ہے تو ٹیکے والی ہی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے لہجے میں کہا ''لیکن ٹیکے (انجیکشن) والی کسی خالی شیشی کو اس طرح ٹھکانے لگانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اسے کہیں بھی کوڑے کے ڈھیر پر پھینکا جا سکتا ہے۔ الطاف نے جس رازداری سے اس شیشی کو پوٹلی میں رکھ کر یہاں دفن کیا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انجیکشن والی خالی بوتل کو ازاں بعد کسی اور مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور وہ مقصد خاصا خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''مثلاً.....!'' خالد بھٹی نے سراسیمہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے اسی انداز میں جواب دیا ''مثلاً یہ مقصد..... کسی کا قتل بھی ہو سکتا ہے.....اس شیشی کو کسی زہریلی دوا یا زود اثر زہر کے لیے بھی تو استعمال کیا جا سکتا ہے!''

خالد پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اگر پوسٹ مارٹم کے بارے میں اسے پتا ہوتا تو شاید وہ اتنا حیران نہ ہوتا۔ اس کا ذہن بھی فوراً ان ہی خطوط پر سوچنے لگتا جن پر اس وقت میں سوچ رہا تھا۔ ایک لمحے کی حیرت زدگی کے بعد اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''الطاف نے کس کو قتل کیا ہوگا ملک صاحب؟''

''یہ سوال ملک صاحب..... یعنی مجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا ''آؤ' اسی کے پاس چلتے ہیں جس نے شیشی والی پوٹلی کو دفن کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس راز سے حقیقی معنوں میں وہی بندہ پردہ اٹھا سکتا ہے۔''

میں نے مذکورہ شیشی کو بڑی احتیاط سے دوبارہ پوٹلی میں بند کیا اور کانسٹیبل خالد بھٹی کے ہمراہ الطاف کے گھر کی سمت روانہ ہوگیا جو قصبہ جیون پور کے دوسرے کنارے پر واقع تھا۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی عدالت میں فنگر پرنٹس رپورٹ کو کوئی خاص اہمیت دی جاتی تھی پھر بھی میں نے مذکورہ شیشی کا جائزہ لیتے ہوئے حتی الامکان احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا اور اسی لمحے فیصلہ بھی کرلیا تھا کہ اگلی صبح میں اس شیشی کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے ضرور بھجواؤں گا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ آخری مرتبہ اس شیشی میں کس قسم کا مواد ڈالا یا نکالا گیا تھا۔

مجھے قوی امید تھی' مذکورہ شیشی کی ٹیسٹ رپورٹ بڑی سنسنی خیز ہوگی۔

☆☆☆

میری ہدایت کے مطابق کانسٹیبل خالد بھٹی نے الطاف کے دروازے پر دستک دی اور ہم دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ گھر واقعی جیون پور کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ یہاں قصبہ جیون پور کی رہائشی حدود ختم ہوجاتی تھی۔ اس سے آگے تاحد نگاہ کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ خالد بھٹی نے بڑے زوردار انداز میں دستک دی تھی۔ وہ رات کا ابتدائی پہر تھا اور مکینوں کے سوجانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا اور اگر اس گھر میں بسنے والے سو بھی چکے تھے تو اس دھواں دھار دستک کے بعد انہیں ہڑبڑا کر اٹھ جانا چاہیے تھا لیکن وہاں وہی صورتحال تھی کہ..... زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد!

جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی دروازہ نہ کھلا تو میں نے سوالیہ نظر سے خالد بھٹی کی طرف دیکھا اور تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا ''تم مجھے مطلوبہ دروازے پر ہی لے کر آئے ہو ناں؟''

وہ فوراً میرے سوال کی تہ تک پہنچ گیا اور جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''جی ملک صاحب! وہ الطاف نامی بندہ اسی گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس سلسلے میں' میں کوئی غلطی نہیں کرسکتا۔ یہ دیکھیں..... میں نے اس نشانی کو یاد رکھا ہوا ہے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے ٹہلی کے ایک درخت کی سمت اشارہ کیا جو ہمارے مطلوبہ دروازے کے عین سامنے استادہ تھا۔ میں نے اس قطار میں بنے ہوئے آٹھ دس گھروں کی جانب نگاہ دوڑائی۔ وہ یہ بلند وصحت مند ٹہلی کا درخت مجھے کسی اور گھر کے سامنے دکھائی نہ دیا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ خالد بھٹی اس نشانی اور الطاف کے گھر کے بارے میں کوئی غلطی نہیں کررہا تھا۔

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''اگر یہی الطاف کا گھر ہے تو پھر دستک کے جواب میں کوئی دروازہ پر کیوں نہیں آیا۔ دروازے پر باہر سے کنڈی یا تالا وغیرہ بھی نہیں لگا ہوا کہ یہ خیال کیا جاتا' اس گھر کے اندر کوئی موجود نہیں!''

''ٹھہریں جناب!'' خالد بھٹی آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میں ایک اور کوشش کرکے دیکھتا ہوں۔''

گھر کے اندر چھائی خاموشی نے مجھے عجیب سی وحشت میں مبتلا کردیا تھا۔ میرے اندر سے ایک ہی آواز اٹھ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ ہے..... یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا!

خالد بھٹی دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے تشویش بھری نظر سے اوپر آسمان کی سمت دیکھا اور اسی لمحے مجھے ایک جھٹکے سے گزرنا پڑا۔ میں نے اس گھر کی چھت پر ایک سایہ سا متحرک دیکھا جیسے کسی انسانی ہیولے نے بڑے محتاط انداز میں حرکت کی ہو۔ ایسا محسوس ہوا کہ سامنے والے کمرے کی چھت پر سے کوئی شخص اندھیرے میں چھپ کر ہمیں دیکھ رہا تھا اور جیسے ہی میری نگاہ اوپر کو اٹھی وہ وہاں سے کھسک لیا تھا۔

میرے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے بڑے واضح انداز میں مجھے بتادیا کہ حرکت میں آنے کا وقت سر پر آن پہنچا ہے چنانچہ ایک لمحے کی تاخیر بھی کسی بڑی کوتاہی سے کم نہیں ہوگی..... اور میں ایسی کسی کوتاہی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا.....!''

میں تیزی سے آگے بڑھا اور بھٹی کو دستک دینے سے روک دیا۔ وہ ہکا بکا میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! آپ مجھے روک کیوں رہے ہیں؟''

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی خالد۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا ''تم بجلی کی سی سرعت سے اس مکان کے عقب میں پہنچو..... اور جس شخص کو بھی چھت سے کودتے دیکھو' فوراً قابو کرلو' چاہے اس مقصد کے لیے ہاتھ پاؤں کا بے دریغ استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

''اس کا مطلب ہے' آپ نے مکان کی چھت پر کچھ دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا ہے.....!''

''یہ ساری باتیں بعد میں بھی ہوسکتی ہیں۔' میں تحکمانہ انداز میں کہا''ہری اپ!''

خالد بھٹی مزید ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر میرے حکم کی تعمیل کے لیے دوڑ گیا۔ میں نے گھر کے بیرونی دروازے کو دبا کر دیکھا' دروازہ اندر سے بند تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہیے لیکن گھر کی بیرونی دیوار نے مجھے اس ارادے پر عمل کرنے سے روک دیا۔ وہ دیوار بہ مشکل چھ فٹ بلند تھی۔ میں بہ آسانی اس دیوار پر چڑھ سکتا تھا اور اگلے ہی لمحے گھر کے اندر کود سکتا تھا۔ وہ بڑے ہی نازک لمحات تھے اور ایسے لمحات میں سوچنے سے زیادہ عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے کندھے کو طوفانی ضرب سے دروازہ توڑنے کا ارادہ ترک کیا' دیوار کی منڈیر کو گرفت میں لے کر خود کو ہوا میں اچھالا اور اس جمپ کے نتیجے میں دیوار کے اوپر پہنچ گیا پھر اگلے ہی لمحے میں نے گھر کے صحن میں چھلانگ لگادی۔

اندر سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔ میں الطاف کی تلاشی میں تیزی سے مکان کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا لیکن چند لمحات ہی میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ میری تلاش بے معنی تھی' میرے محسوسات کے مطابق' اس گھر میں کوئی بندہ تھا اور نہ کوئی بندے کی ذات!

کمروں کو اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد میں بانس کی سیڑھی کی مدد سے مکان کی چھت پر پہنچ گیا اور اسی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔ میری آنکھوں نے رات کی تاریکی میں' مکان کے پچھواڑے میں ایک ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے جوش سے بھر دیا۔ وہاں دو افراد آپس میں گتھم گتھا تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ الطاف اور خالد بھٹی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا!

میں تقریباً دوڑتے ہوئے چھت کے کنارے پر پہنچا' دو دو ڈنڈے پھلانگ کر سیڑھی سے نیچے اترا اور گھر کا دروازہ کھول کر مکان کے عقب میں دوڑ لگادی۔ جب میں جائے فساد پر پہنچا تو اندھیرے میں ایک شخص کو دوسرے کے سینے پر سوار پایا۔ میں نے فوراً پنسل ٹارچ روشن کر کے صورتِ حالات کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر بے چین ہوگیا کہ خالد بھٹی' دوسرے شخص کے نیچے دبا ہوا تھا اور یہ دوسرا شخص یقیناً الطاف ہی تھا۔

میں نے گرج دار آواز میں کہا''الطاف! رک جاؤ' تمہارا کھیل ختم ہوگیا!''

میری تحکمانہ دھمکی نے غالب شخص پر کوئی اثر نہ دکھایا اور وہ خالد بھٹی کے سینے پر سوار' بہ دستور اس کی گردن دبانے میں مصروف رہا۔ بہ حالت مجبوری مجھے مداخلت اور خالد بھٹی کی مدد کے لیے آگے بڑھنا پڑا۔ میں اپنے محکمے کے ایک فعال رکن کی کسی سرکاری سانڈ کے ہاتھوں یوں درگت بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ الطاف خاصا صحت مند اور طاقت ور دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ٹارچ آف کر کے جیب میں رکھی اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میرے ہاتھ بڑے ماہرانہ انداز میں الطاف کی قمیص کے کالر پر پہنچے پھر کالر کی گرفت مضبوط کر کے میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

مجھے اپنی اس کوشش میں جزوی کامیابی حاصل ہوئی۔ الطاف کو میں خالد بھٹی کے اوپر سے اٹھا کر دور تو نہ پھینک سکا البتہ خالد کی گردن اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہوگئی تھی۔ میری اس جزوی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ میرے جھٹکے نے الطاف کی قمیص کو اوپر سے نیچے کی طرف چیر ڈالا تھا لہٰذا اس کھینچنے کے وہ نتائج برآمد نہ ہوسکے جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ بہرحال' ایک لمحہ سوچے بغیر میں نے الطاف کو ٹھڈوں اور طمانچوں پر رکھ لیا۔

وہ لاکھ گبرو اور طاقتور سہی لیکن میری فائٹنگ اسکل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے چند لمحات میں اسے کاسنک سوڈے سے دھوڈالا۔ اسی دوران میں خالد بھٹی بھی اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ بڑے منتقم انداز میں الطاف پر پل پڑا۔ میں نے بھٹی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ تھوڑی دیر کے بعد الطاف بے بس زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔

اس اٹھا پٹخ نے نصف درجن افراد کو اس جانب متوجہ کر دیا تھا۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں لالٹینیں بھی دکھائی دیں۔ وہ موقع' وقت اور مقام ایسا نہیں تھا کہ میں الطاف سے پوچھ گچھ شروع کرتا لہٰذا ہم اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے۔

الطاف کی عمر کوئی چھبیس اور ستائیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ گورا چٹا اور دراز قامت' خوش شکل وصحت مند شخص تھا۔ گھونگریالے بالوں نے اس کی وجاہت اور شخصیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا لیکن اس وقت الطاف کی ساری خوبصورتی اور رعنائی خاک میں مل کر رہ گئی تھی۔ اس کے گھر کے عقب میں اسے اکیس ٹھڈوں کی جو سلامی دی تھی، اس نے اس کا حشر خراب کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا بس خیر میں خالد بھٹی نے بھی خاطر خواہ میرا ہاتھ بٹایا تھا۔ اس نے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ الطاف کے چہرے کی کھال مختلف جگہوں سے ادھڑ چکی تھی اور وہاں سے خون بھی رس رہا تھا۔ وہ اس وقت گردن جھکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے حوالدار چمن شاہ کو اپنے پاس بلایا۔ جب وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے کمرے میں آیا تو میں نے اس سے پوچھا ''شاہ جی! حاضر اسٹاک اسلحے میں سے وہ رائفل لے آؤ جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔''

الطاف نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا لیکن میں اسے یکسر نظر انداز کیے بیٹھا رہا۔

حوالدار میرا حکم بجالانے کے لیے روانہ ہوگیا تو میں نے الطاف سے پوچھا ''تم کرتے کیا ہو؟''

''ہماری تھوڑی سی زمین ہے۔'' اس نے بدستور الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''بس ہم کھیتی باڑی کرتے ہیں۔''

''ہم..... ہماری.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دہرایا پھر پوچھا ''تمہارا مطلب ہے' اس گھر میں تمہارے علاوہ اور لوگ بھی رہتے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''میں اپنے بڑے بھائی سکندر اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ اس کے گھر میں رہتا ہوں۔ ہم دونوں بھائی مل کر زمین داری کرتے ہیں۔''

''میں نے تو اس گھر میں کسی بندے بشر کو نہیں دیکھا۔'' میں نے تیز نظر سے الطاف کو گھورا ''کیا ان لوگوں نے سلیمانی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں!''

''وہ بات دراصل یہ ہے.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''بھائی سکندر اور اس کے بیوی بچے دو دن سے وزیر آباد گئے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک شادی ہے۔ انہیں واپس آنے میں مزید دو تین دن لگ جائیں گے۔''

''اچھا' تو یہ بات ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے بہت اچھا وقت چنا تھا..... جب گھر میں کوئی نہ ہو اور تم آسانی سے وہ کر گزرو جس کے بارے میں تم نے سوچ رکھا تھا۔ ہوں.....؟''

''جناب! میں نے کچھ نہیں کیا.....'' وہ مصنوعی سماجت کرتے ہوئے بولا ''آپ کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے.....''

''غلط فہمی کے گھوڑے.....!'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''تمہیں اندازہ نہیں کہ میں نے تم پر کتنا مضبوط ہاتھ ڈالا ہے۔ تمہاری باقی کی ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے استفسار کے جواب میں کچھ کہتا' حوالدار چرن ایک شان دار رائفل اٹھائے میرے کمرے میں داخل ہوا پھر میرے قریب پہنچ کر اس نے رائفل کو میز پر رکھ دیا اور پوچھا۔

''رائفل حاضر ہے ملک صاحب! اور کوئی حکم!''

''رائفل کو تھام کر کھڑے ہو جاؤ شاہ جی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میں اس بندے سے چند ضروری سوالات کروں گا۔ اگر اس نے میرے سوالات کے جوابات نہ دیے یا کسی قسم کی غلط بیانی کرنے کی کوشش کی تو آپ میرا اشارہ پاتے ہی اسے گولی سے اڑا دینا..... باقی میں سنبھال لوں گا!''

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلنا تھے کہ الطاف کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں حوالدار کو ایسا سنگین آڈر دے ڈالوں گا تاہم حوالدار چرن شاہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ میں نے محض الطاف کو دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ اقدام کیا ہے۔ وہ اس ڈرامے میں تڑکا لگانے کے لیے رائفل سونت کر بڑے خطرناک انداز میں کھڑا ہوگیا۔

میں نے الطاف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا ''تمہارے گاؤں میں لالی نامی ایک بندے نے خودکشی کی ہے۔ وہ تمہارا کیا لگتا تھا؟''

میں نے ''خودکشی'' کے الفاظ دانستہ استعمال کیے تھے تاکہ الطاف اندازہ نہ لگا سکے کہ میں اس کے ساتھ کون سی چال چل رہا ہوں جب کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے طفیل میں اس حقیقت تک پہنچ چکا تھا کہ رحیم بخش عرف لالی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ الطاف میرے سوال کے جواب میں بولا۔

''میرا لالی سے کوئی تعلق یا رشتہ نہیں۔''

''اور اس کی بیوی..... یعنی بیوہ زری سے؟''

میرے اس سوال میں اتنی چبھن تھی کہ اس کا رنگ اڑ گیا تاہم قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا ''جب لالی سے کوئی رشتہ نہیں تو زری سے بھی کوئی واسطہ نہیں.....''

''اس کے باوجود بھی تم نے آج دن میں اس کے گھر کے چکر لگائے ہیں۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا ''اور آخری پھیرے میں تو تم اس کے گھر سے ایک پوٹلی لے کر نکلے تھے جو دروازے سے باہر آتے ہی تم نے اپنی شلوار کے نیفے میں اڑس لی تھی اور بڑی خاموشی سے نہر کی طرف چل پڑے تھے پھر.....''

''جناب! پتا نہیں' آپ کیا کہتے جا رہے ہیں۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا ''میں..... میں تو کبھی لالی کے گھر کی..... طرف گیا بھی..... نہیں.....''

میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا ''نہر کے کنارے واقع ایک جھاڑی کے نیچے تم نے زمین کھودی اور وہاں وہ چھوٹی سی پوٹلی دبا دی جو زری کے گھر سے لے کر نکلے تھے پھر خاموشی سے اپنے گھر آگئے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جناب! آپ کی باتیں میرے سمجھ میں نہیں آرہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ زچ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا ''میں بھلا نہر کی طرف کیوں جاؤں گا اور..... کسی پوٹلی سے میرا کیا تعلق.....!''

''جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ناں.....!'' میں نے گھور کر اسے دیکھا ''اسے دیکھتے ہی تم فوراً سمجھ جاؤ گے.....!''

بات ختم کرتے ہوئے میں نے اپنی میز کی دراز میں سے وہ پوٹلی نکال لی جو جھاڑی کے نیچے سے کھود کر نکالی تھی اور اسے الطاف کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا ''اسے پہچانتے ہو؟''

''یہ وہی پوٹلی ہے جس کا ابھی ذکر ہو رہا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر اسے مزید خوف زدہ کرنے کی غرض سے اضافہ کیا ''تم زری کے گھر سے جب یہ پوٹلی لے کر نکلے تو میرا ایک آدمی تمہارا تعاقب کرتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ میں نے پچھلے چند روز سے تمہاری نگرانی کے لیے اپنا ایک بندہ مقرر کر رکھا ہے۔ تم پوٹلی کو دفن کر کے اپنے گھر کی طرف گئے تو میرے بندے نے یہ پوٹلی کھود کر نکال لی اور اب یہ میرے پاس ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اس چھوٹی سی پوٹلی کے اندر کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا..... میں کچھ نہیں جانتا.....'' وہ احتجاجی انداز میں چلایا۔

میں نے کہا ''اگرچہ تم اچھی طرح جانتے ہو لیکن میں پھر بھی تمہیں بتاؤں گا۔'' میں نے لمحے بھر کو توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''اس پوٹلی کے اندر ایک چھوٹی سی کانچ کی شیشی ہے جو اس وقت خالی ہے لیکن لالی کی موت سے قبل اس میں ایک خطرناک زہر بھرا ہوا تھا۔ یہ زہر لالی کے جسم میں اترا اور وہ موت کی وادی میں چلا گیا۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لالی کو قتل کیا گیا ہے.....''

''مم..... مگر لالی نے تو گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کی ہے.....!'' وہ جلدی سے بولا۔

''سب لوگ یہی سمجھ رہے ہیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''لیکن مجھے اور تمہیں تو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے ناں..... ہوں؟''

''کک..... کیوں.....!'' وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔

''مم..... مجھے کیوں.....؟''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''مجھے اس لیے لالی کی موت کو خودکشی نہیں سمجھنا چاہیے کہ میں نے اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروایا ہے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہی ہے کہ لالی کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اس کی موت کے بعد اسے پھانسی پر لٹکا کر اس واقعے کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب پھانسی کے پھندے نے لالی کی گردن کو طوالت دی اس سے پہلے وہ بدنصیب زندگی کی قید سے نجات حاصل کر چکا تھا۔ زری اتنا تو کر سکتی تھی کہ کھانے پینے کی کسی شے میں زہر ملا کر لالی کو موت کی نیند سلا دے لیکن اس کی لاش کو ''پھانسی دینا'' اس کے بس کا کام نہیں تھا اور اس کٹھن کام کے لیے کسی صحت مند اور طاقت ور مرد نے اس کا ہاتھ بٹایا تھا اور تمہیں لالی کی موت کو خودکشی اس لیے نہیں سمجھنا چاہیے کہ.....''

میں نے دانستہ ڈرامائی توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔

''اس لیے کہ..... وہ مرد تم ہی ہو جس نے لالی کے قتل میں زری کی بھرپور مدد کی تھی!''

''مم..... میں نے کچھ..... نہیں کیا.....!'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔

میں نے اس کے بے مقصد احتجاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا بیان مکمل کر دیا ''میں اس زہر والی خالی شیشی کو صبح ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری بھجوا رہا ہوں۔ مجھے قوی امید ہے دو تین گھنٹے میں اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ اس شیشی والے زہر سے لالی کو ہلاک کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی .....'' میں نے الطاف کے اعتماد کی بوسیدہ عمارت کو زمین بوس کرتے ہوئے اپنی طرف سے یہ شاٹ بھی کھیل دیا ''اس کے ساتھ ہی اس شیشی پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس کا تجزیہ بھی کیا جائے گا۔ مجھے اس بات کی بھی پوری امید ہے کہ تمہارے فنگر پرنٹس، شیشی پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس سے ضرور میچ کر جائیں گے.....! اس کے بعد تمہیں سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا!''

میری نفسیاتی اور عین منطقی تقریر نے جادوئی اثر دکھایا۔ الطاف میری باتیں سن کر بے انتہا خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مجھے موت کے سائے لہراتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرے خطرناک وار نے اس کی ہٹ دھرمی کا جنازہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا پھر گلوگیر آواز میں بولا۔

''مجھے معاف کر دیں تھانے دار صاحب..... میں نے لالی کو قتل نہیں کیا..... میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں زری کی باتوں میں آ گیا تھا..... اس کے حسن اور جوانی نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا..... مم..... میں نے..... اس کا صرف اتنا ساتھ دیا ہے کہ لالی کو پھانسی.....!'' وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ وہ مزید کیا بولتا..... اس سے آگے بولنے کے لیے کچھ بچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فلسفۂ احتجاج

میں 1980ء میں لندن کے ٹریفالگر اسکوائر سے گزر رہا تھا کہ میں نے جنوبی افریقا کے سفارت خانے کے سامنے چند کالے اور گورے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک گروہ دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں جھنڈے لیے کھڑا تھا جن پر لکھا تھا ''نیلسن منڈیلا کو رہا کرو۔'' سفارت خانے کا بڑا دروازہ بند تھا اس لیے کہ انگلستان اور جنوبی افریقا میں سفارتی تعلقات ختم ہو چکے تھے۔ میں نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

''آپ لوگ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟''

اس نے جواب دیا ''کوئی پانچ برس ہو گئے۔''

''اور کب تک کھڑے رہنے کا ارادہ ہے؟''

نوجوان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''جب تک نیلسن رہا نہیں ہو جاتا۔''

''آپ کو اس کی کوئی امید ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

نوجوان نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا ''احتجاج حق کے لیے کیا جاتا ہے۔ کامیابی کی ضمانت کی بنیاد پر نہیں۔''

اقتباس: ''لکھتے رہے جنوں کی حکایت'' از الطاف گوہر

مرسلہ: اقتدار احمد خان' باغ و بہار' خان پور کٹورہ

ہی نہیں تھا۔

اس کے چپ ہوتے ہی حوالدار کوتاہ آ گیا، رائفل کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! اس بندے کی زبان بند ہو گئی ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو گولی سے اڑا دوں!''

''شاہ جی! مرے ہوؤں پر گولی چلانا مرد کی شان نہیں۔''

میں نے حوالدار کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا ''لالی مرڈر کیس حل ہو گیا ہے۔ آپ الطاف کو یہاں سے لے جاؤ۔ اس کی تھوڑی خاطر مدارت ہونا چاہیے۔ اسے تھانے میں حاضری کے آداب سکھاؤ پھر میں اس کا بیان قلم بند کرتا ہوں..... اس کا بیان ہو جائے تو پھر زری کی گرفتاری کے لیے بھی جانا ہے۔ آج رت جگا ہے شاہ جی!''

اس کے بعد تمام مراحل' ایک کے بعد ایک طے ہوتے چلے گئے۔ ایک مناسب سی خاطر تواضع کے بعد حوالدار نے الطاف کو میرے حوالے کر دیا۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ یہ بیان ایک طرح سے اس کا اقبالِ جرم بھی تھا۔ واقعات کے مطابق .....الطاف کو پہلے زری سے ہمدردی ہوئی پھر وہ اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اس قربت نے اسے زری کے عشق میں مبتلا کر دیا پھر وہ وقت آ گیا جب زری نے الطاف سے کہا کہ وہ لالی کو راہ سے ہٹانے کے منصوبے میں اس کا ساتھ دے تو وہ بعد میں اس سے شادی کر لے گی۔ وہ زری کی محبت میں اتنی گہرائی تک ڈوب چکا تھا کہ اس کے اشاروں پر عمل کرتا چلا گیا۔ وہ زہر بھی الطاف نے ہی کہیں سے لا کر زری کو دیا تھا۔ زری نے کھانے میں زہر ملا کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لالی کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور ازاں بعد الطاف کی مدد سے لالی کی لاش کو پھانسی پر لٹکا کر خودکشی کا ڈراما اسٹیج کر دیا۔ اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے زری نے مجھے لالی کی تجرباتی عملی نااہلی کی ایسی کہانی سنائی کہ سب کچھ منطقی نظر آئے اور شروع میں بالکل ایسا ہی ہوا تھا لیکن ازاں بعد' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس کہانی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔

الطاف کے اعانتِ جرم اور اقبالِ جرم کے بعد زری پر ہاتھ ڈالنا میرے لیے نہایت ہی آسان ثابت ہوا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی اس سلسلے میں پوری طرح معاون تھی۔ پہلے میرے ذہن میں آیا کہ صبح جیون پور جاؤں لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس سوچ کو رد کر دیا اور فی الفور زری کی گرفتاری کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کا سوگ اور بے ہوشی کے دورے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ لالی کی قاتل تھی لہٰذا اس کے معاملے میں کوئی رعایت برتنا مناسب نہیں تھا۔

میں نے جیون پور پہنچ کر زری کو لالی کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ اس کا باپ خوشی محمد ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں آدھی رات کو یہ ظالمانہ کارروائی کیوں کر رہا ہوں۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ اور الطاف کے اقرارِ جرم کے تناظر میں' نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور زری کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے تھانے میں جب زری سے کڑی پوچھ تاچھ کا آغاز کیا تو پہلے وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔ میں نے پوسٹ مارٹم اور زہر والی شیشی کا حوالہ دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا ''میں نے اس شیشی کا لیبارٹری ٹیسٹ کرایا جو الطاف نے نہر کے کنارے ایک جھاڑی کے نیچے دبائی تھی۔ شیشی پر الطاف کی انگلیوں کے نشانات کے علاوہ ایک عورت کے فنگر پرنٹس بھی پائے گئے ہیں اور..... الطاف نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے مجھے بتایا ہے کہ زہر والی شیشی اسی نے لاکر تمہیں دی تھی۔ وہ پوری طرح لالی کے قتل کی سازش میں تمہارا شریک رہا ہے۔ تم نے اسے آسرا دیا تھا کہ اگر وہ لالی کو راہ سے ہٹانے میں مدد کرے تو بعد میں تم اس سے شادی کرلوگی۔ وہ تمہارے عشق میں کندھے کندھے ڈوب چکا تھا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہرا سانس خارج کیا اور پھر اضافہ کرتے ہوئے زری سے پوچھا۔

''اب بتاؤ' تمہارا کیا ارادہ ہے۔ شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کرتی ہو یا تمہاری زبان کھلوانے کے لیے وہی حربے آزماؤں جنہیں عام طور پر اذیت اور تشدد کا نام دیا جاتا ہے لیکن ہم پولیس کی زبان میں اس کارروائی کو تفتیش کا نام دیتے ہیں؟''

اس کے چہرے پر بے پناہ خوب اُمڈ آیا۔ وہ الطاف کی گرفتاری اور اس کے حلفیہ اقراری بیان' پوسٹ مارٹم کی اصلی رپورٹ اور فنگر پرنٹس کی فرضی رپورٹ کی روشنی میں کسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر کے خود کو کسی کڑے امتحان سے گزارنے کی حماقت نہیں کرسکتی تھی لہٰذا تھوڑی سوچ بچار کے بعد اس نے اقبالِ جرم کرلیا۔ میں دراصل زری کو ایسی صورتِ حال میں باندھ کر رکھ دیا تھا جس کے لیے یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے..... نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن!

اس کھٹ راگ سے نمٹنے کے بعد میں نے زری سے سوال کیا ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''لالی سے انتقام لینے کے لیے!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

اچانک رحمت بی بی کی کہی ہوئی بات میری سوچ میں چمک اٹھی۔ رحمت بی بی نے خود کو لالی کی خالہ بتاتے ہوئے زری کے بارے میں یہ اظہارِ خیال کیا تھا کہ اس نے اپنی ساس اللہ وسائی کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ میں نے اضطراری لہجے سے استفسار کیا۔

''اور..... اللہ وسائی کے ساتھ تم نے کیا کیا تھا؟''

''قتل ایک کرو یا ایک سو.....'' وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی ''اس جرم کی سزا میں کوئی فرق نہیں آتا اس لیے آج میں اللہ وسائی کے قتل کا بھی اقرار کرتی ہوں۔ میں نے اسے بھی زہر دے کر مارا تھا۔'' وہ ایک دم جذباتی ہوگئی ''میں ان ماں بیٹے سے شدید نفرت کرتی تھی۔ میں نے جانتے بوجھتے ہوئے لالی سے شادی کی تھی تاکہ اس سے انتقام لے سکوں۔ اب میں بہت مطمئن ہوں کہ میرا مشن پورا ہوگیا۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور آخر میں پوچھا۔

''تم نے لالی اور اللہ وسائی سے کس بات کا انتقام لیا ہے؟''

''سلمٰی کا انتقام.....!'' وہ ٹھوس انداز میں بولی۔

''سلمٰی.....!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یعنی لالی کی پہلی بیوی؟''

''جی' تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''سلمٰی لالی کی پھوپھی کی بیٹی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ میری گہری سہیلی بھی تھی۔ لالی نے اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے اور اللہ وسائی نے اپنی کمینگی کو چھپانے کے لیے سلمٰی کے ساتھ جو بھی زیادتی اور ظلم کیے، وہ سلمٰی نے زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتادیے تھے۔ سلمٰی پر بانجھ ہونے کا الزام لگا کر اسے طلاق دی گئی تھی جب کہ وہ بانجھ نہیں تھی بلکہ لالی ہی بے فیض تھا۔ سلمٰی کا انجام جتنا افسوس ناک ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ میں نے سلمٰی کو آخری سانسوں میں قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا حساب برابر کروں گی۔ ان ماں بیٹے کو بڑی بھیانک موت ماروں گی..... اور دیکھ لیں' میں اپنے مشن میں کامیاب رہی ہوں۔ اب قانون مجھے جو بھی سزا دے' میں اس کی پروا نہیں کرتی۔ میرا جو بھی حشر ہو مگر میرا ضمیر' دل اور دماغ مطمئن ہیں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے' ٹھیک کیا ہے..... لالی جیسے نااہل مرد اور اللہ وسائی جیسی کمینی عورتیں ایسے ہی عبرتناک سلوک کی مستحق ہیں جو اپنی جھوٹی شان کی خاطر دوسروں کی زندگی میں زہر بھر دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے' آج سلمٰی کی بے چین روح کو بھی قرار آجائے گا!''

زری کی اس جذباتی وضاحت پر میں اسے کسی ایوارڈ یا ریوارڈ سے نوازنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے قانون کو ہاتھ میں لیتے ہوئے ایک نہیں بلکہ دو سنگین جرائم کا ارتکاب اور اقبال کیا تھا لہٰذا وہ سزا سے نہیں بچ سکتی تھی۔ میں قانونی تقاضا پورا کرنے کے لیے مجبور تھا۔

اس واقعے کے اختتام نے مجھے بے حد افسردہ کردیا۔ میں فیصلہ نہ کرسکا کہ یہ اداسی اور افسردگی لالی کے حشر سے متعلق تھی یا پھر زری کے انجام کے لیے!

تحریر: حسام بٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندہ کرداروں کی کہانی، حقیقی واقعات وسانحات اوران کے عوامل کا چشم کشا ماجرا

ملک صفدر حیات

حسبِ خواہش

کرہ ارض پر فساد کی بنیادی وجوہات میں ایک "خواھش" ھے ھر شخص کی خواھش ھے کہ دنیا اس کے انداز کے مطابق ھوجائے۔ وہ جو چاھتا ھے بس وھی ھو لیکن یہ بھلا کیسے ھو کہ ھر شخص کی خواھش پوری ھوسکے تو جو اپنی خواھشات کی غلامی میں آنکھیں بند کرکے نیک وبدکو فراموش کر دیتے ھیں تو پھر فتنہ وفساد نہ پھیلے تو کیا ھو..... یہ بھی ایسے ھی اپنی خواھش کے غلام کا عبرت ناک افسانہ ھے۔ جس نے محض ایک زمینی ٹکڑے کی خاطر معصوم جانوں کا خون لینے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔

وہ دہرے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات تھی!

اطلاع ملتے ہی میں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ لاشوں کو دیکھ کر مجھے عجیب سا محسوس ہوا اور ذہن میں سب سے پہلا تاثر یہی پیدا ہوا "ان بے چاروں کو قتل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

وہ ایک بوڑھے اور ایک بڑھیا کی لاشیں تھیں۔ مرد کی عمر پینسٹھ کے قریب ہوگی۔ عورت بھی کم وبیش ساٹھ سال کی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ رشتے میں وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ اس گھر میں وہ سال ہا سال سے تنہا رہ رہے تھے۔ ان کی لاشیں گھر کے صحن میں بچھی، دو چارپائیوں پر پائی گئی تھیں۔ وہ موسم گرما کے دن تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ دونوں رات کو صحن میں چارپائیاں ڈال کر سوئے ہوں گے اور پھر کسی وقت حالتِ نیند میں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دونوں کو بڑی بے دردی سے گردنیں کاٹ کر زندگی کی قید سے آزاد کیا گیا تھا۔ وہ جو زندگی تقریباً گزار چکے تھے اور اپنی طبعی عمر کی آخری منازل طے کر رہے تھے، انہیں اس سفاکی سے فنا کے گھاٹ اتار دینا ذہن کو الجھا تا تھا اور یہ الجھن کسی شدید ترین نفرت کی جانب اشارہ کرتی تھی..... ورنہ وہ ایسے کردار نہیں تھے جنہیں اس عبرت ناک انجام سے دوچار کیا جاتا۔

میں نے بڑی توجہ اور باریک بینی سے دونوں میاں بیوی کی لاشوں کا ماہرانہ جائزہ لیا۔ گردن کٹنے سے کسی انسان کو جو تکلیف ہوسکتی ہے اور اس کا جسم اس کے ردِعمل میں جو حرکات کرتا ہے، وہ تمام تر آثار دونوں کی چارپائیوں پر بڑے واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔ چارپائیوں پر بچھی چادریں اور ان کے لباس خون آلود تھے۔ ان میاں بیوی نے زندگی سے موت کی جانب سفر کرتے ہوئے جو اذیت سہی، وہ مجھ سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس گاؤں میں آس پاس کہیں بھی ان بدنصیب میاں بیوی کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا لہٰذا میں نے لاشوں کے ضروری معائنے کے بعد پوسٹ مارٹم کے لیے انہیں سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔

اس بوڑھے مقتول کا نام خضر علی اور اس کی بیوی کا نام سلیمہ معلوم ہوا۔ وہ اس چھوٹے سے کچے گھر میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ خضر علی کے پاس چار ایکڑ زرعی اراضی تھی۔ جب تک اس کے جسم میں توانائی اور ہمت موجود تھی، وہ اس چار ایکڑ زمین پر خود ہی کاشت کاری کیا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی کارکردگی کا گراف گرنے لگا تو اس نے اپنی مدد کے لیے کھیت مزدوروں سے اجرت پر کام لینا شروع کر دیا تاہم ایک نگراں کی حیثیت سے وہ بہ نفسِ نفیس کھیتوں میں موجود رہتا تھا اور وہاں کام کرنے والوں کو مختلف نوعیت کی ہدایت بھی دیتا رہتا تھا۔ چار ایکڑ زمین کی کاشت سے دونوں میاں بیوی کی تمام ضروریات پوری ہوجایا کرتی تھیں۔ کسی بھی شے کے لیے انہیں کسی کی طرف نہیں دیکھنا پڑتا تھا بلکہ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ کسی ضرورت مند کی مدد کر سکتے تھے۔ یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کہ قدرت نے انہیں دینے والا ہاتھ عطا کیا تھا، لینے والا نہیں!

اور اب یہ مثالی ضعیف جوڑا اس دارِفانی سے کوچ کر گیا تھا۔ موت جن کی دہلیز پر کھڑی تھی لیکن ان کی زندگی کو چھونے سے گریزاں تھی، کسی شقی القلب کے دستِ ستم نے انہیں بڑی بے رحمی سے قتل کر ڈالا تھا۔ پتا نہیں، اس نامراد قاتل کو ان سے کیا دشمنی تھی!

میں نے گھوم پھر کر بائے وقوعہ کا بھی جائزہ لیا۔ وہ کچا گھر تین کمروں اور ایک کشادہ صحن پر مشتمل تھا۔ عقبی حصے میں واقع دو کمروں میں سے ایک کمرا اسٹور روم کے طور پر استعمال ہو رہا تھا جہاں سال بھر کے، ہر نوعیت کے اناج کا وافر اسٹاک موجود اور محفوظ تھا۔ علاوہ ازیں ایسا سامان بھرا ہوا تھا جو روزمرہ کے استعمال میں نہیں آتا بلکہ ان اشیا کی بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھار ہی ضرور پڑتی ہے۔

دوسرا کمرا جو اسٹور روم کے پہلو سے جڑا ہوا تھا، اس کی سیٹنگ بتاتی تھی کہ وہ انہوں نے اپنی رہائش یعنی آرام و قیام کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ میں نے اس کمرے اور وہاں موجود سامان کا بڑی توجہ سے جائزہ لیا تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ کہیں وہ چوری وغیرہ کی واردات تو نہیں تھی، حالانکہ اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر یہ محض چوری کی واردات ہوتی تو بھی اس ضعیف جوڑے کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ اگر مقتولین نے چوروں کی راہ میں کوئی مزاحمت پیش کی ہوتی اور یہ سوچا جاتا کہ چوروں نے اپنے بچاؤ میں ان کی جان لی ہے مگر ایسے شواہد اور آثار کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ کمرے میں..... بلکہ اس گھر میں موجود کسی بھی شے کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا تھا۔ ان دونوں کی لاشیں صحن میں بچھی چارپائیوں پر اس حالت میں پڑی ملی تھیں کہ یہ واضح ہو جاتا تھا، قاتل صرف اور صرف ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے وہاں آیا تھا اور..... سنگ دلی کا عظیم الشان مظاہرہ کر کے خاموشی سے واپسی چلا گیا تھا۔

''ان دونوں میاں بیوی کا ایسا خطرناک دشمن کون ہو سکتا ہے؟'' میں اس پُراسرار سوال کو ذہن میں لیے گھر کے تیسرے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔

مذکورہ کمرا گھر کے سامنے والے حصے میں، ایک کونے میں واقع تھا۔ دوسرے دونوں کمروں کی بہ نسبت اس کی چھت خاصی نیچی تھی۔ اس کمرے میں زراعت سے متعلق مختلف آلات بھرے ہوئے تھے یا پھر خنک چارے کا اسٹاک تھا اور یہ چارا اس بھینس کے لیے تھا جو صحن میں ایک درخت کے نیچے بندھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس بھینس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

بھورے رنگ کی وہ بھینس بڑی افسردہ بیٹھی تھی اور گاہے بہ گاہے نگاہ اٹھا کر ان چارپائیوں کی طرف دیکھ لیتی تھی جہاں سے تھوڑی دیر پہلے اس کے مالکان کی لاشیں اٹھائی گئی تھیں۔ اسے ان دونوں بوڑھوں کی المناک موت کا بڑا دکھ تھا۔ عین ممکن تھا، گزشتہ رات اس نے اپنی آنکھوں سے انہیں قتل ہوتے دیکھا ہو۔ اگر واقعی ایسا تھا تو میں اس بھوری بھینس کے درد کو سمجھ سکتا تھا۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ بڑے معنی خیز انداز میں میری طرف بھی دیکھا اور پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو، مجھے کچھ بتانا چاہ رہی ہو۔ اگر میرا احساس غلط نہیں تھا تو پھر وہ یقیناً مجھے اس ضعیف جوڑے کے قاتل کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ ان لمحات میں، میں نے بڑی شدت سے سوچا..... کاش! یہ جانور بولنے کی صلاحیت رکھتا۔

پورے گھر کے تفصیلی معائنے کے بعد بھی آلۂ قتل کہیں ملا تھا اور نہ ہی اس کے حوالے سے کوئی سراغ نظر آیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، ان میاں بیوی کو کسی تیز دھار چھری یا خنجر سے قتل کیا گیا تھا۔ ان کی شہ رگیں بڑی بے دردی سے کٹی ہوئی ملی تھیں۔ اس کارروائی کے دوران میں لگ بھگ دو گھنٹے گزر گئے تھے اور اب چاروں طرف سورج کی تیز، چمک دار اور چبھتی ہوئی دھوپ پھیلی دکھائی دیتی تھی لہٰذا میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے آ بیٹھا اور موقع پر موجود لوگوں کے بیانات لینے لگا۔ سب سے پہلے میں نے کبیر شاہ سے پوچھ تاچھ کی۔

کبیر شاہ کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ وہ ایک وجیہہ و شکیل شخص تھا۔ دراز قامت، مضبوط بدن اور صحت قابلِ رشک۔ مجھے پتا چلا کہ وہ فوج میں بھرتی تھا اور آج کل چھٹی پر اپنے گاؤں آیا ہوا تھا۔ کبیر شاہ وہی شخص تھا جس نے اس اندوہ ناک واقعے کی اطلاع تھانے پہنچائی تھی۔ اس ضعیف جوڑے کی لاشوں کو سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا۔

واقعات کے مطابق، کبیر شاہ ''مارننگ واک'' کا عادی تھا۔ گاؤں دیہات میں تقریباً سبھی لوگ علی الصباح اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں، یہ الگ بات کہ صبح اٹھ کر کام کاج میں لگ جانا یا باقاعدہ مارننگ واک پر نکلنا دو مختلف مصروفیات ہیں۔ بہرحال، اس صبح بھی کبیر شاہ اپنے معمول کے مطابق سیر کے لیے گھر سے نکلا تھا اور اس کا کتا بھی ہم راہ تھا۔ جب وہ دونوں خضر علی کے گھر کے قریب پہنچے تو کبیر شاہ کے کتے نے پُراسرار انداز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ کبیر شاہ اپنے کتے کی ایک ایک ادا، ایک ایک عادت سے بہ خوبی واقف تھا۔

اس نے اشاروں کی زبان میں اپنے کتے سے بھونکنے کا سبب پوچھا تو وہ جواب میں خضر علی کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ کبیر شاہ نے اس کی تقلید میں قدم بڑھائے اور پھر اس کی آنکھوں نے وہ لرزہ خیز منظر دیکھا جس میں دو گردنیں کٹے انسان، چارپائیوں پر مردہ پڑے تھے۔ اس ہولناک منظر نے اسے وحشت زدہ کر دیا اور وہ ''سحر خیزی'' کو بھول کر لوگوں کو یہ اطلاع فراہم کرنے میں مصروف ہو گیا کہ موضع جلال پور میں دہرے قتل کی ایک خوفناک واردات ہو گئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں درجن بھر افراد خضر علی کے گھر میں جمع ہو گئے اور مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کرنے لگے تاہم ایک نقطے پر وہ سب حیرت زدہ تھے کہ ان بے چارے میاں بیوی کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی نے کیوں قتل کر دیا!

جب کچھ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا تو کسی بوڑھے نے مشورہ دیا کہ اس واقعے کی اطلاع تھانے تک پہنچانی چاہیے۔ لاشوں کو کبیر شاہ نے دریافت کیا تھا لہٰذا یہ ذمے داری بھی اسی کو سونپی گئی اور وہ سیدھا میرے پاس آیا تھا۔

تھانا مین روڈ پر واقع تھا۔ یہ مین روڈ ایک نیم پختہ سڑک تھی جس پر اکا دکا بسیں اور ویگنیں چلتی تھیں، البتہ بیل گاڑیاں اور تانگے وغیرہ خوب نظر آتے تھے۔ اس نیم پختہ سڑک پر اگر بمشرق کی جانب پچیس میل سفر کیا جاتا تو لائل پور (موجودہ فیصل آباد) شہر آجاتا تھا۔ موضع جلال پور میرے تھانے سے شمال کی سمت صرف آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ تھانے کے مغربی جانب ایک پرائمری اسکول تھا اور مشرقی طرف جلال پور کا بس اسٹاپ۔ تھانا..... بس اسٹاپ اور گورنمنٹ پرائمری اسکول کے درمیان واقع تھا۔ تھانے کی عقبی سمت، جلال پور گاؤں تک کھیتوں کا وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ موضع جلال پور کے فضائی مزاج اور محل وقوع سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

کبیر شاہ جب اس واردات کی اطلاع لے کر میرے پاس پہنچا تو میں نے اس سے نہایت ہی مختصر گفتگو کی تھی۔ اس وقت جائے وقوعہ پر پہنچنے کی جلدی تھی اور اب میں جائے وقوعہ پر ہی تھا۔ میں نے کبیر شاہ سے پوچھا۔

''شاہ جی! کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہیں آپ؟''

''ایک ماہ.....'' اس نے جواب دیا'' اور یہ بھی بڑی مشکل سے ملی ہے۔ اگر شادی کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید اتنے دن کی چھٹی منظور نہ ہوتی۔''

میں نے چونک کر پوچھا۔''شادی کا کیا معاملہ ہے شاہ جی؟''

''میرے شادی ہو رہی ہے جناب!'' وہ فخریہ لہجے میں بولا''آیندہ جمعہ کو نکاح ہے۔ چار چھٹیاں گزر گئیں، چھبیس باقی ہیں۔''

''اوہ!.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا''جبھی''مارننگ واک'' پر اتنا زور ہے۔''

''یہ تو میری بہت پرانی عادت ہے جناب۔'' وہ قدرے جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا''یہ ایسا موقع تو نہیں کہ میں پُرجوش انداز میں آپ کو شادی کی مبارک باد دوں، بہرحال..... میری طرف سے آپ کو مبارک ہو۔''

''شکریہ تھانے دار صاحب!'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔''شاہ جی! فوج میں رینک کیا ہے آپ کا؟''

''میں لانس نائیک ہوں جناب!''

''آپ نے بتایا ہے کہ اپنے کتے کے بھونکنے پر آپ خضر علی کے گھر کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا''کیا آپ گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے یا.....؟''

''دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔''اگر دروازہ بند ہوتا تو شاید میں کتے کے بھونکنے پر اتنی توجہ نہ دیتا اور اسے اپنے ساتھ آگے بڑھا لے جاتا لیکن جب میں نے کتے کے''توجہ'' دلانے پر اس سمت میں دیکھا تو خضر علی کے گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا دکھائی دیا اور.....اس کھلے ہوئے دروازے میں سے چارپائیوں کے منظر نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا پھر جب میں نے چارپائیوں کے نزدیک جا کر دیکھا تو صورتِ حال مجھ پر واضح ہو گئی۔ اس کے بعد ہی میں نے گاؤں کے لوگوں کو یہاں جمع کر لیا تھا۔ پھر میں اس خون ریز واردات کی اطلاع دینے آپ کے پاس تھانے گیا تھا۔''

''آپ نے چارپائیوں کو یا ان کی لاشوں کو چھونے کی کوشش تو نہیں کی؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ قطعیت سے بولا۔

اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میں نے استفسار کیا۔''آپ کے خیال میں ان ضعیف میاں بیوی کو کس نے قتل کیا ہوگا؟''

''یہ بہت ہی مشکل اور پے چیدہ سوال ہے جناب!'' وہ پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا''اور مجھے امید نہیں اس گاؤں کا کوئی شخص آپ کو اس سوال کا جواب دے۔ میرے تھانے آنے سے پہلے یہاں پر جمع لوگوں میں قیاس آرائیاں ہوئی تھیں۔ ہر ایک کو اس بات پر حیرت تھی کہ انہیں کس پاگل کے بچے نے قتل کر دیا!''

''قاتل..... پاگل کا بچہ ہے یا پاگل کا باپ، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا شاہ جی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا''دہرا قتل تو بہرحال ہوا ہے اور حالات و شواہد سے یہ ثابت ہو رہا ہے، قاتل صرف اور صرف انہیں موت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھاٹ اتارنے آیا تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی سے اپنا کام کیا اور واپس چلا گیا۔ اس گھر میں موجود کسی شے کو چھونے یا چرانے کی کوشش نہیں کی گئی جو اس بات کی نشان دہی ہے کہ قاتل ایک خاص مشن کے تحت ہی وہاں آیا تھا۔ اگر مجھے پتا چل جائے کہ ان کی کس کس سے دشمنی تھی تو قاتل کا سراغ لگانے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر کبیر شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ جی! آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

''یہی تو مشکل ہے جناب!'' وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سمیت اس گاؤں کا کوئی شخص یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ ان میاں بیوی کا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ تھانے آنے سے پہلے ہم لوگوں میں اس حوالے سے اچھی خاصی بحث ہو چکی ہے جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔''

وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا ''خضر علی اور اس کی بیوی سلیمہ انتہائی صلح جو اور امن پسند لوگ تھے، اپنے کام سے کام رکھنے والے۔ وہ لوگوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے بھی نہیں تھے اور ان کے گاؤں والوں سے جس حد تک بھی مراسم تھے، اسے ''دوستانہ تعلقات'' ہی کہا جا سکتا تھا۔ نہ وہ کسی کے دشمن تھے اور نہ ہی کوئی ان کا دشمن تھا!''

''شاہ جی! اگرچہ آپ نے بڑی سیدھی اور واقعاتی بات کی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''آپ کے اس تجزیے کو گاؤں والوں کی تائید بھی حاصل ہے لیکن پھر بھی میں اس تھیوری یا اس صورتِ حالات سے اتفاق کرنے کو تیار نہیں۔''

میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اگر ان کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی یا کوئی ان کا دشمن نہیں تھا تو پھر انہیں قتل ہونے کے بجائے طبعی موت مرنا چاہیے تھا۔ یہ لرزہ خیز واقعہ اس امر کی دلیل ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص ان میاں بیوی سے شدید نفرت کرتا تھا اور اسی نفرت کے نتیجے میں بڑی بے دردی سے انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ ایسا ''کارنامہ'' کوئی دشمن ہی سرانجام دے سکتا ہے۔''

''تھانے دار صاحب! آپ کی بات میں وزن ہے۔'' کبیر شاہ نے پُرسوچ انداز میں کہا ''میں مانتا ہوں، آپ غلط نہیں کہہ رہے۔ کوئی دوست اپنے کسی دوست کو اتنی سنگ دلی اور بے رحمی سے موت کے منہ میں نہیں دھکیلتا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ان کے دشمن کو کہاں تلاش کریں گے۔ اس گاؤں سے ملنا تو ممکن نہیں!''

''شکر ہے شاہ جی، آپ نے ''گاؤں'' کی شرط لگا دی۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ''اگر آپ یہ کہہ دیتے کہ ان کا کوئی دشمن کہیں بھی تلاش نہیں کیا جا سکتا تو مجھے آپ کی ذہنی صحت پر شک ہونے لگتا اور اس کے ساتھ ہی آپ کی لائسنا نائیکی پر بھی۔'' میں زیرِ لب مسکرایا پھر دوستانہ انداز میں کہا۔

''بہر حال، شاہ جی! اگر خضر اور اس کی بیوی کا کوئی دشمن مجھے جلال پور میں نہ ملا تو میں اسے گاؤں سے باہر بھی تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے، بہت جلد میں قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔'' وہ دعائیہ انداز میں بولا ''میری بھی شدت سے یہی خواہش ہے کہ ان بے چاروں کا قاتل جلد از جلد عبرت ناک سزا پائے!''

''آمین..... انشاءاللہ! ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے تہ دل سے کہا۔

مزید دو چار سوالات کے بعد میں نے کبیر شاہ کو فارغ کر دیا۔

مقتولین کے گھر میں اس وقت اور لوگ بھی موجود تھے اور گاہے بہ گاہے ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے کبیر شاہ کو فارغ کرنے کے بعد انہیں باری باری اپنے پاس بلایا اور ضروری پوچھ گچھ کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ کوئی بھی شخص یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جلال پور میں ان کا کوئی دشمن ہے۔ کوئی، ان کے کسی سے جھگڑے یا لڑائی کا بھی گواہ نہیں تھا۔ ایک ضعیف جوڑا جو اتنے امن اور آشتی سے گاؤں میں رہ رہا تھا، اسے اچانک قتل کر دیا گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز اور تشویش ناک واقعہ تھا۔ اس گاؤں میں لگ بھگ ڈیڑھ سو گھر ہوں گے لیکن ان میاں بیوی کی کسی گھر کے کسی فرد سے کوئی ناراضی یا دشمنی نہیں تھی تو پھر ان کا ایسا حسرت ناک انجام کیوں!

مجھے پتا چلا تھا، مقتول خضر کھیتی باڑی کے معاملات میں دو افراد سے بھی مدد لیا کرتا تھا۔ وہ دونوں بھی وہاں موجود تھے۔ ان کھیت مزدوروں میں سے ایک کا نام صفدر اور دوسرے کا ہارون تھا۔ صفدر کی عمر پینتیس سال ہوگی جب کہ ہارون تیس کے قریب دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ان دونوں سے بھی پوچھ تاچھ کی کیوں کہ وہ دونوں مقتولین کے زیادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب نظر آتے تھے۔ صفدر کو کوئی ضروری کام تھا لہٰذا میں نے چند سوالات کے بعد جانے کی اجازت دے دی اور ہارون سے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہارون مضبوط جسم کا مالک ایک جفاکش شخص تھا۔ ان دونوں میاں بیوی کے بہیمانہ قتل نے اسے خاصا افسردہ کر دیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''ہارون! تمہیں جلال پور میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''جناب! یہیں کی پیداوار ہوں۔'' اس نے جواب دیا ''اسی گاؤں میں آنکھ کھولی تھی اور اب تک کی ساری زندگی یہیں پر گزری ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہارے ماں باپ بھی اِدھر ہی کے رہنے والے ہیں؟''

''رہنے والے تھے.....!'' اس نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا ''اللہ بخشے، اب تو وہ دونوں مرحوم ہو چکے ہیں۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے، خضر علی اور اس کی بیوی بھی جلال پور ہی کے رہنے والے تھے یا کہیں اور سے آ کر یہاں بس گئے تھے؟''

ہارون نے جواب دیا ''جناب! میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، انہیں جلال پور ہی میں دیکھا ہے۔ اگر میرے پیدا ہونے سے پہلے وہ کہیں اور سے آئے ہوں تو مجھے اس کی خبر نہیں۔ ہمارے گاؤں کے سب سے زیادہ ضعیف شخص کا نام کرم دین ہے۔ وہ نوے کا ہندسہ عبور کر چکا ہے۔ اس گاؤں کی تاریخ اس سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ آپ بابا کرمو سے خضر اور اس کی گھر والی کے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں۔''

بات ختم کرنے کے بعد اس نے مجھے کرمو بابا کے گھر کی لوکیشن بھی سمجھا دی۔ اس ضعیف العمر شخص کے گھر کی سب سے بڑی نشانی یہ تھی کہ گھر کے سامنے ایک کنواں موجود تھا اور کنوئیں کے نزدیک ہی ٹہلی کا ایک بڑا درخت بھی تھا جس کی وجہ سے وہ ''ٹہلی والا کھوہ'' مشہور تھا۔ یہ ایک جاری کنواں تھا اور لوگ بہ وقت ضرورت اس کنوئیں سے پانی نکالا کرتے تھے۔

میں نے ہارون سے کہا۔ ''چلو، اچھا ہے کہ تم نے مجھے کرمو بابا کے بارے میں بتا دیا۔ اگر میں ضرورت محسوس کروں گا تو اس سے بھی مل لوں گا۔ بہرحال، تم بتاؤ کہ خضر علی کے پاس کام کرتے ہوئے تمہیں کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''لگ بھگ پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

''کیا صفدر نے بھی تمہارے ساتھ ہی کام شروع کیا تھا؟''

''نہیں جناب! وہ مجھ سے زیادہ پرانا ہے۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''پہلے پہل خضر چاچا اکیلا ہی کاشت کاری کرتا تھا۔ جب تک اس میں ہمت موجود تھی، اس نے کسی کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں کی پھر سات سال پہلے اس نے صفدر کو اپنی مدد کے لیے رکھ لیا... پھر مزید دو سال گزرنے کے بعد میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ آج کل خضر چاچا کا کام صرف نگرانی اور ہدایت جاری کرنا رہ گیا تھا۔ کھیتی باڑی اور کاشت کاری کے سارے معاملات ہم دونوں ہی دیکھا کرتے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ ''یہ سوال میں نے ہر شخص سے کیا ہے اور سب نے ایک سا جواب دیا۔ پتا نہیں، تم کیا بتاتے ہو؟'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا تو اس نے جلدی سے پوچھ لیا۔

''کون سا سوال جناب؟''

''یہ سوال کہ..... خضر علی اور سلیمہ کا دشمن کون ہو سکتا ہے؟''

''جناب! کم از کم جلال پور کی حد تک تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہاں پر ان دونوں سے کسی کی کوئی ہلکی پھلکی بھی دشمنی نہیں تھی۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کے قاتل کا تعلق کسی اور علاقے سے ہے؟''

یہ سوال میں نے اتنی بے ساختگی سے پوچھا کہ وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا ''جناب! میں..... اس بارے میں..... کیا کہہ سکتا..... ہوں.....!''

''دیکھو ہارون!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''جس کسی نے بھی اس ضعیف جوڑے کو موت کے منہ میں پھینکا ہے، وہ ان کا دوست، ہم درد یا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب ہے، وہ ان کا جانی دشمن تھا لہٰذا اس نے بڑی بے دردی سے ان کی جان لے لی۔ اب تک کی پوچھ گچھ سے مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں جلال پور میں ان کا کوئی دشمن نہیں تھا اور یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ ان کا کوئی عزیز رشتے دار بھی نہیں ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ یہ دونوں انا ج کی طرح زمین سے اگے ہوں۔ ان کا کوئی نہ کوئی رشتے دار تو ہو گا۔ اگر یہاں نہیں تو کہیں اور..... کسی دوسرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاقے میں۔تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟''

وہ مایوسی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میرا خیال ہے، اگر آپ کرمو بابا سے مل لیں تو آپ کو اپنے اس سوال کا جواب ضرور مل جائے۔''

''کرمو بابا سے ملنے کی میں شدت سے ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں سیدھا ٹبلی والے کھوہ کی طرف ہی جاؤں گا۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اس سے پوچھ لیا۔

''کیا تم متقولین کی اولاد وغیرہ کے بارے میں کچھ علم رکھتے ہو؟''

''وہ بے اولاد تھے!'' ہارون مضبوط لہجے میں جواب دیا۔''میں نے بھی خضر چاچا کو اپنی اولاد یا کسی اور رشتے دار کے بارے میں بات کرتے نہیں سنا اور نہ ہی اس گھر میں کسی مہمان وغیرہ کو آتے دیکھا ہے۔ میرے خیال میں، ان دونوں کا دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔''

''ہوں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی پھر پوچھا۔''خضر کی چار ایکڑ زمین کی لوکیشن کیا ہے؟''

''لوکیشن۔'' کا لفظ اس کی سمجھ میں نہ آیا تو میں نے آسان الفاظ میں اپنے سوال کی وضاحت کر دی۔ یہ سوال میں نے ایک خاص مقصد کے تحت ہارون سے پوچھا تھا۔ دراصل زن، زر اور زمین ایسے نازک موضوعات ہیں کہ ان معاملات میں چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اوقات کوئی انتہائی غیر اہم اور معمولی سی بات بھی کسی بہت بڑی الجھن کو سلجھن میں بدلنے کا باعث بن جاتی ہے۔ خضر علی اور اس کی بیوی سلیمہ کی زندگی کے جو گوشے اب تک مجھ پر واضح ہو چکے تھے، ان کی روشنی میں دوہرے قتل کی یہ واردات زن اور زر سے مبرا نظر آتی تھی لہٰذا میرا فوکس خود بہ خود ''زمین'' پر ٹھہر گیا تھا۔ اس واردات کے پیچھے زمین کا حصول بھی کارفرما ہو سکتا تھا!

ہارون نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔''خضر چاچا کی چار ایکڑ زمین نہر کے کنارے سے لگی ہوئی ہے لہٰذا اس کی زرخیزی کا بڑی آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس مختصر سے قطعۂ اراضی کے ایک پہلو میں صدیق مہر کی زمین واقع ہے۔ صدیق مہر ایک چھوٹا زمین دار ہے اور اس کی زمین لگ بھگ پچیس ایکڑ پر مشتمل ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

''دوسری جانب چودھری سردار علی کی زمین شروع ہو جاتی ہے۔ چودھری صاحب کی اراضی بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے بلکہ اس کا پھیلاؤ تو آس پاس کے دوسرے گاؤں کی زمینوں تک ہے۔ چودھری صاحب اس گاؤں کے مالک و مختار ہیں۔''

میں چودھری سردار علی کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک ملن سار، ہم درد اور معقول چودھری تھا۔ میں اس سے کئی مرتبہ مل بھی چکا تھا۔ ہمارے درمیان اچھی سلام دعا تھی۔ ہارون کے جواب نے میرے ذہن میں موجود خدشے کو خاصی تقویت دی تھی۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے ہر شے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا میری عادت سی بن گئی ہے اور یہ عادت اکثر اوقات سود مند ہی ثابت ہوتی ہے۔ دراصل، تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے لہٰذا میں نے فوری طور پر اپنے ذہن میں چودھری سردار علی اور صدیق مہر کے ناموں پر دائرہ لگا دیا۔ کسی مناسب اور ضروری موقع پر انہیں چیک کیا جا سکتا تھا۔ کم ہی سہی مگر اس امر کے امکانات بہرحال موجود تھے کہ ان دونوں میں سے کوئی خضر کی زمین پر نگاہ لگائے بیٹھا ہو.....!

اسی تناظر میں، میں نے ہارون سے پوچھ لیا۔''ذرا سوچ کر بتاؤ..... کیا کبھی کسی نے خضر چاچا کی زمین خریدنے کی بات بھی کی تھی۔ میرا اشارہ چودھری صاحب اور صدیق مہر کی طرف ہے؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا۔'' کچھ عرصے پہلے تک صدیق مہر، خضر چاچا کے پیچھے پڑا رہا تھا کہ وہ اپنے چار ایکڑ اس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ اس زمین کے لیے وہ خضر چاچا کو منہ مانگی قیمت بھی دینے کو تیار تھا لیکن چاچا کسی بھی صورت زمین بیچنے کے لیے راضی نہ ہوا۔ صدیق مہر نے یہاں تک بھی پیش کش کی کہ اگر چاچا رقم لینے پر آمادہ نہیں تو وہ اس چار ایکڑ کے بدلے میں اسے دوسری جگہ آٹھ ایکڑ دینے کو تیار ہے مگر خضر چاچا نے اس کی ایک نہ مانی۔ صدیق مہر تھک ہار کر خاموش ہو گیا۔''

''اور چودھری صاحب کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی چودھری صاحب نے ایسی کوئی کوشش کی ہے!''

''ہوں!'' میں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا اور ہارون کو فارغ کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تعارف نامہ

بیسویں صدی، 90 کی دہائی.....ایک دن بھائی سے شدید لڑائی کے بعد اپنے اسکول بیگ کی تلاش میں سارے گھر میں مارے مارے پھرنے کے بعد اسٹور کا رخ کیا۔ پیٹی کے پیچھے سے اسکول بیگ تو مل ہی گیا لیکن لکڑی کی میز پر رکھے ہوئے کارٹن نے ہمارا دھیان اپنی طرف کرلیا۔ تجسس سے مجبور ہوکر اسے کھولا تو وہ زیب النساء اور حور (خواتین کے ڈائجسٹ) سے بھرا پڑا تھا۔ عادت سے مجبور ہوکر (چوری کی نہیں بلکہ مطالعہ کی عادت) دو تین رسالے پار کیے اور اسکول بیگ میں چھپا کر اپنے کمرے میں لے آئے۔ رات نے اپنے پنکھ چاروں طرف پھیلائے اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف سارے گھر والے تھک ہار کر محوِ خواب ہوئے تو ہم نے ایک ڈائجسٹ نکالا اور پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔ چند دن اسی طرح گزرے۔ ہماری بہن نے کچھ عرصہ تو صبر کا مظاہرہ کیا پھر امی کو بتانے کی دھمکی دے کر ہمیں نرم گرم بستر سے ٹھنڈے ٹھار باتھ روم کی چوکی پر بٹھا

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ذہن میں موجود صدیق مہر کے نام پر ڈبل سرکل لگادیا اور فیصلہ کیا کہ اس واردات کی تفتیش میں اسے بھی شامل رکھوں گا۔

موقع پر موجود افراد کے بیانات مکمل ہو چکے تھے، اس لیے میں نے چند معتبر لوگوں کی موجودگی میں مقتولین کے گھر کے کمروں پر سرکاری تالے لگادیے اور وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔

مجھے دیکھ کر نذر حسین میرے نزدیک آیا اور پوچھنے لگا: ''تھانے دار صاحب! آپ نے گھر کے تینوں کمروں پر سرکاری تالے ڈال دیے ہیں۔ گھر کے داخلی دروازے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

نذر حسین مقتولین کا پڑوسی تھا۔ میں نے اس کا بھی طویل انٹرویو کیا تھا اور کام کی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ کئی سال پہلے نذر حسین ان کے پڑوس میں آکر آباد ہوا تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی پہلے سے وہاں رہ رہے تھے۔ خضر اور سلیمہ کے بارے میں اس کے بھی وہی خیالات تھے، جن خیالات کا اظہار دیگر افراد نے کیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''ظاہر ہے، گھر کے بیرونی دروازے پر بھی سرکاری تالا ہی لگے گا۔''

''پھر اس بے چاری بھینس کا کیا ہوگا!'' وہ سوالیہ انداز میں بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں نذر حسین! میں نے اس کے حوالے سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک اس کیس کی کوئی واضح شکل نکل کر سامنے نہیں آجاتی، یہ بھینس تمہاری تحویل میں رہے گی اور اس تحویل کی دو صورتیں ہیں۔''

میں لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا تو اس نے پوچھ لیا۔

''دو صورتیں کون سی جناب؟''

''نمبر ایک.....!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تم اس بھینس کو اپنے مویشیوں کے ساتھ رکھ لو۔ نمبر دو، یہ ادھر اپنے گھر ہی میں رہے اور بیرونی دروازے کی چابی میں تمہیں دے دوں تاکہ تم اس کی مناسب دیکھ بھال کرسکو؟''

''جناب! میرے خیال میں پہلی صورت ہی ٹھیک رہے گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اسے اپنے مویشیوں کے ساتھ رکھ لیتا ہوں۔ گھر کی چابی آپ مجھے نہ دیں۔ یہ ذمے داری میں نہیں اٹھا سکوں گا، خاص طور پر ایک ایسے گھر کی ذمے داری جہاں دو بندوں کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا ہو!''

وہ ایک معقول بات کررہا تھا لہٰذا میں نے اس کی یہ بات مان لی!

☆☆☆

دن کے گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے کا وقت ہوگا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سورج سوا نیزے پر آگیا ہے۔ دھوپ میں ایسی تیزی تھی کہ لگتا تھا، برچھیاں سی بدن میں اتر رہی ہوں۔ میں نے جائے وقوعہ سے فارغ ہونے کے بعد ٹہلی والے کھوہ کا رخ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ پہلی فرصت میں مجھے کرمو بابا سے ملاقات کرنی چاہیے تاکہ مقتولین کی تاریخ اور جغرافیے پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ یہ بہت ضروری تھا!

ٹہلی والا کھوہ اسی گاؤں یعنی جلال پور ہی میں واقع تھا لہٰذا مجھے وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں زیادہ وقت لگا اور نہ ہی کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ جب میں مطلوبہ مقام پر پہنچا تو کھوہ (کنوئیں) پر تین چار عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردو بارہ محو مطالعہ کر دیا۔ کچھ عرصہ تو امی نے خاص دھیان نہ دیا۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے ان کے وجدان نے ان کے کان میں سرگوشی کی کہ آپ کی وہ دختر جو کبھی اتنی ''نیک اختر'' نہیں رہی کہ بغیر لعن طعن، پڑھائی کی جانب توجہ مبذول کرے..... خدانخواستہ اتنی پڑھاکو کیسے ہوگئی کہ آدھی آدھی رات تک مطالعہ میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ معلوم کریں کہیں دشمنوں کی طبیعت ناساز تو نہیں جبکہ امتحانوں کے بھوت کا بھی ان مہینوں میں چکر لگانے کا قطعاً ارادہ نہیں۔ بس جناب! ہماری امی ٹھہریں سدا کی بھولی بھالی اور معصوم۔ فوراً سسپنس میں مبتلا ہوگئیں اور ہماری جاسوسی کرتے ہوئے بالآخر ہمیں باتھ روم میں پکڑ ہی لیا۔ اب آپ تو جانتے ہی دنیا کا کارخانہ صرف اسی وجہ سے درست چل رہا ہے کہ زمین پر ربِ باری نے ماؤں کی صورت میں ایک عظیم مخلوق بھیج رکھی ہے۔ جو موقع دیکھتی ہے نہ محل..... بس عزت افزائی میں مزید افزودگی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔ چنانچہ جونہی والدہ نے چھاپے کے بعد ہمیں رنگے ہاتھوں گرفتار کیا۔ اس کے بعد ہمارے حسب نسب پر انتہائی

میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا لہٰذا مجھے دیکھ کر وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں اور اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔ میں سیدھا انہی کے پاس پہنچا۔

مجھے اپنے سامنے پا کر ان کے چہرے متغیر ہوگئے۔ چہروں کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا جیسے وہ بہ زبان خاموشی کہہ رہی ہوں..... تھانے دار صاحب! ہم نے تو اس بڈھی بڈھے کو قتل نہیں کیا۔ آپ ہمیں کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟

اس سے پہلے کہ وہ گھبراہٹ میں کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھتیں، میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا۔ ''کرمو بابا کا گھر کون سا ہے؟''

ان کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ایک نے سامنے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے لرزیدہ آواز میں بتایا ''وہ..... وہ گھر ہے..... بابا کرموکا.....!''

میں نے اس گھر کی طرف دیکھا جدھر عورت نے اشارہ کیا تھا پھر شکریہ ادا کرنے والے انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور کرمو بابا کے گھر کی سمت بڑھ گیا۔ مجھے اپنے عقب میں سرگوشیانہ چہ میگوئیوں کی مخصوص بھنبھناہٹ سنائی دی لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور اپنے مطلوبہ دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اِدھر میں نے کرمو بابا کے دروازے پر دستک دی، اُدھر دروازہ کھل گیا۔ کسی دستک کا ایسا فوری ردِعمل آج سے پہلے میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ شخص دروازہ کھولنے ہی والا ہوگا کہ میں نے دستک دے دی اور یہ اتفاق پیدا ہوگیا۔ بہرحال، میں نے دروازے میں کھڑے شخص کا بہ غور جائزہ لیا۔

اس کی عمر ساٹھ سے متجاوز دکھائی دیتی تھی۔ صحت ویسی ہی تھی جیسی اس عمر میں عموماً ہوتی ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کرمو بابا نوے کا ہندسہ عبور کر چکا ہے۔ اگر میرے سامنے موجود شخص کرمو ہی تھا تو پھر بلا جھجک یہ کہا جاسکتا تھا..... کرمو بابا نے خود کو بہت سینت کر رکھا ہوا تھا!

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس شخص کی بوڑھی آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے الجھن کے تاثرات پیدا ہوئے پھر سنبھل کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

''ست بسم اللہ تھانے دار صاحب..... آئیں آئیں، تشریف لائیں۔'' وہ ایک طرف ہٹ گیا اور مجھے گھر میں داخل ہونے کا راستہ دیا پھر بولا ''میری..... اور اس گھر کی خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں آئے۔''

میں دروازے سے گزر کر گھر کے اندر داخل ہوا پھر وہ شخص مجھے بیٹھک میں لے آیا اور ایک آرام دہ جگہ پر بٹھانے کے بعد بولا ''آپ تشریف رکھیں، میں آپ کے لیے لسی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ آج تو قیامت کی گرمی ہے۔''

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں کرمو بابا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اِدھر ہی بیٹھو۔ میں چند ضروری باتیں کر کے واپس چلا جاؤں گا۔''

اس نے مڑ کر حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولا ''آپ مجھے کرم دین سمجھ رہے ہیں؟''

''تو کیا تم کرمو بابا نہیں ہو؟'' اس مرتبہ حیران ہونے کی میری باری تھی۔

''کرم دین میرے اباجی کا نام ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں محمد دین ہوں، لوگ مجھے دینو بابا کہتے ہیں..... آپ اباجی سے ملنے آئے ہیں نا؟''

''ہاں دینو! میں تمہارے باپ کرمو ہی سے ملنے آیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عظیم الشان الفاظ میں ایسی روشنی ڈالی کہ چاند، ستاروں، ٹیوب لائٹ، بلب حتیٰ کہ سورج کی روشنی بھی ماند پڑ گئی۔ اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھنے لگا۔

میٹرک کے امتحانوں تک تو صبر کیا لیکن کیا کیجیے کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

دوبارہ اسٹور کا رخ کیا لیکن وہاں نہ کارٹن نہ رسالے..... خالی میز ہمارا منہ چڑا رہی تھی۔ چند دن لٹریٹر (فارغ) پھرنے کے بعد رسالوں کے حصول کے لیے امی کے ترلے ڈالے، اپنی فراغت کا ذکر کیا جو بوریت کی نذر ہو رہی تھی لیکن وہ امی ہی کیا جو مان جاتیں۔ بجائے اس کے کہ ہماری درخواست کو قبول کرتے ہوئے رسالے ہمارے حوالے کر ڈالتیں، الٹا ہمیں فرسٹ ایئر کے مضامین کی ٹیوشن رکھوا دی۔ چلو جی گل ہی مک گئی لیکن ہم بھی تھے تو آخر انہی کی اولاد۔ ٹیوشن سینٹر میں ہماری ایک سہیلی

ہوں۔'' میں نے بابا کے بیٹے کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تو پتا ہی ہوگا، اِدھر کسی نے خضر چاچا اور اس کی گھر والی کو رات سوتے میں قتل کر دیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں کرمو بابا سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔''

وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''جی تھانے دار صاحب! ان دونوں بے چاروں کے ساتھ تو بہت ہی برا ہوا ہے۔ پتا نہیں، ان غریبوں سے کسی کو کیا بیر تھا.....!''

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ ابا جی سے کسی قسم کی باتیں کرنا چاہتے ہیں؟''

''مجھے پتا چلا ہے، تمہارے ابا جی اس گاؤں میں بسنے والے لوگوں میں سب سے زیادہ عمر کے ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا ''اب تک میں نے جن لوگوں کا بیان بھی لیا ہے وہ اس امر سے ناواقف ہیں کہ خضر اور اس کی بیوی کا ماضی کیا رہا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کرمو بابا سے ملاقات کرلوں۔ ممکن ہے، کام کی کوئی بات سامنے آجائے جو ان میاں بیوی کے قاتل تک میری راہ نمائی کر سکے!''

''آپ اس کام کے لیے آئے تو بڑی ٹھیک جگہ پر ہیں لیکن مجھے نہیں امید کہ آپ کا مقصد بھی پورا ہو سکے گا!'' وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''دینو! اس بات سے تمہارا مطلب کیا ہے؟''

''ابا جی کی عمر اتنی ہوگئی ہے کہ انہیں بہت کم دکھائی اور سنائی دیتا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، وہ آپ کی بات سمجھ بھی سکیں گے کہ نہیں!''

''تم مجھے کرمو بابا سے ملوا تو دو۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''باقی کے معاملات میں خود دیکھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں دیکھتا ہوں انہیں اور پھر آ کر آپ کو بتاتا ہوں۔''

ازاں بعد اس دہرے قتل کے حوالے سے دینو بابا سے بھی میری مختصر سی گفتگو ہوئی تھی اور اس کی معلومات گاؤں کے دیگر افراد سے زیادہ ثابت نہیں ہوئیں۔ دینو بھی ایک طرح سے ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا۔ گھر کی معیشت کو اس کے بیٹے یعنی کرمو کے پوتے اسلام دین عرف ''سلامو'' نے سنبھال رکھا تھا۔ ان کی دس ایکڑ اراضی تھی جس پر سلامو محنت کرتا تھا اور اس محنت کے نتیجے میں، اس خاندان کے لیے سال بھر کے اخراجات کا بندوبست ہوتا تھا۔ دینو کی گھر والی کا انتقال ہو چکا تھا اور سلامو اس کی اکلوتی اولاد تھا۔ سلامو شادی شدہ تھا اور اس کے تین بچے تھے تاہم ان دنوں سلامو کی بیوی رخسانہ تینوں بچوں کے ساتھ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ گھر میں صرف سلامو ولد دینو ولد کرمو موجود تھے اور اس وقت سلامو بھی زمینوں کی طرف گیا ہوا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد دینو واپس آیا اور مجھ سے کہنے لگا ''تھانے دار صاحب! آپ کو ابا جی کے پاس چلنا ہوگا۔ میں انہیں یہاں نہیں لا سکوں گا۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے چلو۔''

ہم دونوں بیٹھک سے نکل کر گھر کے صحن میں پہنچے۔ وہ ایک کشادہ صحن تھا۔ اگر اتنی زمین کراچی میں کسی بلڈر کے ہتھے چڑھی ہوتی تو وہ اس پر سپر لگژری اپارٹمنٹ بلڈنگ کھڑی کر کے کروڑوں روپے..... بلکہ اربوں روپے کا کاروبار کر چکا ہوتا۔ بہرحال، وہ ایک متاثر کن صحن تھا جس میں چھوٹے پودوں کے علاوہ تین چار بڑے، سایہ دار درخت بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بنی۔ جس کے گھر کے مرد حضرات (ابو اور بھائی) سسپنس اور جاسوسی پڑھتے تھے۔ اس نے ہمارے شوق کو دیکھتے ہوئے ہمارے ذوق کو مزید DEVELOP کرنے کے لیے یہ دونوں رسالے ہمیں لا کر دیے۔ گلی محلے کی عشق و محبت سے مبر کہانیاں ہمیں بہت پسند آئیں۔ پھر تو ہم تھے اور یہ رسالے (اس زمانے میں ''ٹک ویلوٹ کی چوریاں'' ہمارا محبوب سلسلہ تھا) اور آج جبکہ ہم عمر عزیز کا اٹھائیسواں پہاڑہ پڑھ رہے ہیں۔ تب بھی یہ دونوں رسالے ہمارے ہم قدم ہیں۔ پہلے ہم ان کا مطالعہ کرتے ہیں پھر ہمارے معصوم سے میاں جی ان سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ (معصوم سے مراد یہ ہے کہ شادی سے قبل ان سے پہلے ان رسالوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا اور اب سامنے موجود ہونے کے باوجود وہ انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ بھئی نقص امن کا اندیشہ جو ہوتا ہے) یہ تھی ہماری سسپنس سے دوستی کی رام کہانی۔

مرسلہ = عائشہ وحید از لاہور

استادہ دکھائی دیتے تھے اور انہی میں سے ایک بجلی کے درخت کے نیچے کرموبابا ایک چارپائی پر مزے سے لیٹا ہوا تھا۔

دینو نے اس مختصر سے سفر کے دوران میں مجھے بتایا کہ وہ کرموبابا کو میری آمد اور مقصد سے آگاہ کر چکا ہے۔ میرے بیٹھنے کے لیے دینو نے کرموبابا کی چارپائی کے نزدیک ہی ایک موڑھا ڈال دیا تھا۔ میں جب اس آرام دہ موڑھے پر براجمان ہوا تو دینو نے مجھ سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ ابا جی سے بات کرنے کی کوشش کریں۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

اس نے ''کوشش کریں'' پر خاصا زور دیا تھا جس کا یہی مطلب نکلتا تھا کہ کرمو سے بات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

میں نے دینو سے پوچھ لیا۔ ''چاچا! تم کہاں جا رہے ہو؟''

وہ عمر میں مجھ سے اتنا سینئر تھا کہ میں بے دھڑک اسے چاچا کہہ سکتا تھا۔ اس نے بھی میرے چاچا کہنے کا برا نہیں منایا اور جواب دیا۔

''میں آپ کے لیے ٹھنڈی نمکین لسی لینے جا رہا ہوں جناب!''

کوئی اور موقع ہوتا تو میں یقیناً اس سے یہ کہتا..... بزرگو! تکلیف نہ کرو لیکن اس وقت خاصی مختلف صورتِ حال تھی۔ گرمی اور پیاس نے میرا برا حال کر رکھا تھا، میں نمکین ٹھنڈی لسی کی شدت سے ضرورت محسوس کر رہا تھا، دوسرے دینو بابا مجھے کوئی بڈھا ٹھڈا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی چال اور گفتگو میں جوانوں جیسی توانائی اور چستی پائی جاتی تھی۔ میں پہلی نگاہ میں اسے کرمو سمجھا تھا جبھی میں نے لسی پانی کے تکلف سے اسے صاف منع کر دیا تھا لیکن اس بار میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔

دینو کے جانے کے بعد میں کرمو کی طرف متوجہ ہوا اور قدرے بلند آواز میں اسے پکارتے ہوئے اپنا تعارف کرایا ''کرمو بابا! میں ملک صفدر حیات ہوں۔ اس علاقے کا تھانا ان چارج۔''

اس نے دھندلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا کہ اسے اپنے سامنے والے کا چہرہ واضح دکھائی نہیں دیتا ہوگا بلکہ اس کے بجائے نگاہ کے سامنے سایے سے لہراتے محسوس ہوتے ہوں گے۔ اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''جی..... کی کہندے او.....؟''

''میں تھانے دار ہوں۔'' میں نے کرموبابا کی سماعت کے ضعف کو پیش نظر رکھتے ہوئے آواز کو مزید بلند کر لیا۔ ''بزرگو! آپ سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔''

''دینو نے مینوں دسیا اے۔'' کرمو اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پتر تھانے دار..... کی پچھنا اے؟''

میں نے ایسی زبان کا استعمال کیا جو اس کے سمجھنے کے لیے نہایت ہی آسان ہوتا کہ میں بہ خوبی اپنا مقصد حاصل کر سکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موڑھے کو اس کے قریب کھینچ لیا اور اپنی آواز کو بھی قدرے بلند کر لیا۔

''بزرگو! میں آپ سے خضر اور اس کی بیوی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کرموبابا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں ایک دم اداسی سمٹ آ گئی۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ میری بات اس نے سن لی تھی اور اسے ان دونوں کے بہیمانہ قتل پر شدید رنج بھی تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بہت برا ہویا اوتھاں دے نال..... بہت برا!''

اسی وقت دینو میرے لیے لسی سے بھرا ہوا ایک برتن اور گلاس لے کر آ گیا۔ برتن میں دو لیٹر کے قریب ٹھنڈی نمکین لسی موجود تھی۔ اس نے لسی والے برتن اور گلاس کو میرے قریب ہی لکڑی کے ایک اسٹول پر رکھ دیا اور گلاس میں لسی انڈیل کر اپنے باپ کے نزدیک ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''پیئیں تھانے دار صاحب!'' اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو کھانے کا وقت بھی ہونے والا ہے لیکن اتفاق سے سلامو کی گھر والی اپنے میکے گئی ہوئی ہے، لسی ہی اس وقت موجود ہے۔''

''یہ بھی بہت ہے دینو!'' میں نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا ''میں جس مقصد کے لیے کرمو بابا کے پاس آیا ہوں اگر وہ پورا ہو جائے تو میں سمجھوں گا، میں نے تمہارے گھر میں سب کچھ کھا پی لیا۔''

''کیا ابا جی سے آپ کوئی بات کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، ایک آدھ بات ہوئی تو ہے۔''

اسے میرے بات کا یقین نہیں آیا، سرسری سے لہجے میں بولا۔ ''اچھا، اچھا!''

آئندہ ایک گھنٹے کے دوران میں ٹھنڈی نمکین لسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے دینو کے توسط سے، کرمو بابا سے جو گفتگو کی اسے من و عن بیان کرنا آپ کے لیے بوریت کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ اس بات چیت میں بار بار کرمو کے مخصوص استفسار یہ جملے..... کی کہندے او..... سنیا نئیں، ذرا اچی بولو..... جی، ہاں، ہوں..... آجاتے تھے لہٰذا اپنی بات اس کی سماعت اور فہم تک پہنچانے میں مجھے خاصی دقت محسوس ہوئی تھی۔ بہرحال، میں آپ کی خدمت میں اس ملاقات کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

کرمو بابا بھی دوسرے لوگوں کی طرح خضر اور اس کی بیوی کے قتل پر شدید حیرت زدہ تھا۔ اس کے مطابق، موضع جلال پور میں ان کا ایسا کوئی دشمن نہیں تھا جو ان کی جان لیتا۔ میں جب اپنے سوالات کو گاؤں سے باہر لے گیا اور خضر کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہا تو کرمو بابا کو جو کچھ معلوم تھا یا اس کی یادداشت نے جہاں تک اس کا ساتھ دیا، وہ اس نے مجھے بتا دیا۔ کرمو کے مطابق، یہ جوڑا لگ بھگ چالیس سال پہلے جلال پور میں آ کر بسا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ کرمو بابا کو جہاں تک یاد پڑتا تھا، خضر نے اسے بتایا تھا کہ وہ لوگ لائل پور کے ایک نزدیکی گاؤں سے آئے تھے۔ گاؤں کے نام میں وہ گڑبڑ کر رہا تھا۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ کرمو بابا اپنی عمر کی جس منزل پر کھڑا تھا وہاں اسے ایسی ہر گڑبڑ کی کھلی اجازت تھی۔ اس کے خیال میں متقولین کا گاؤں یا تو قادر نگر تھا یا پھر حسن آباد۔ وہاں ان کی اپنے خاندان والوں سے نہیں بنتی تھی، اس لیے وہ یہاں آ گئے تھے اور پھر جلال پور اور یہاں کے لوگ انہیں ایسے پسند آئے کہ انہوں نے زندگی بھر کہیں اور جانے کے بارے میں سوچا تک نہیں۔

میں نے متقولین کی اولاد وغیرہ اور دیگر رشتے داروں کے حوالے سے بھی مختلف سوالات کیے لیکن اس سلسلے میں مجھے مایوسی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کرمو بابا کے بیان کے مطابق، وہ دونوں اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک بے اولاد ہی رہے۔ وہ ایک دوسرے میں اس قدر مگن رہتے کہ انہیں دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا، شاید انہیں کسی اور کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ چوں کہ اپنے خاندان والوں سے قطع تعلق کر کے یہاں آئے تھے لہٰذا نہ تو اُدھر سے کوئی ان کی خیر خبر لینے آیا اور نہ ہی انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی۔

میں نے دینو بابا اور اس کے ضعیف باپ کرمو بابا کا بے حد شکریہ ادا کیا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دینو نے وقتِ رخصت مجھ سے کہا ''تھانے دار صاحب! جس حد تک ممکن تھا، ہم نے آپ کی مدد کر دی۔ اگر خضر یا اس کی بیوی سلیمہ کے بارے میں مجھے کوئی اور خاص بات پتا چلی تو میں آپ تک اطلاع ضرور پہنچاؤں گا۔''

میں نے کہا ''دینو چاچا! اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری نیکی ہو گی۔ بہرحال، یہ بتاؤ کہ تم صدیق مہر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''صدیق مہر.....!'' اس نے پُرسوچ انداز میں دہرایا۔ ''جناب! صدیق مہر اسی گاؤں کا ایک زمین دار ہے۔ اُدھر چودھری صاحب کی حویلی کے نزدیک اس کا پکا مکان ہے۔''

گاؤں دیہات میں زیادہ تر مکانات کچے ہی ہوتے ہیں (کم از کم اس وقت جس زمانے کا یہ ذکر ہے) پختہ مکانوں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور یہ انگلیوں پر بہ آسانی گنے جا سکتے تھے۔ ایسے مکانات انہی لوگوں کے ہوتے جو کسی نہ کسی حوالے سے، دوسروں کی بہ نسبت نمایاں حیثیت کے مالک ہوں۔ دینو کی بات سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ صدیق مہر یہاں کا ایک کھاتا پیتا اور صاحبِ حیثیت شخص تھا۔ میں نے دینو سے مزید پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر میں صدیق مہر سے ملنا چاہوں تو تمہارے خیال میں، مجھے کدھر کا رخ کرنا چاہیے۔ اس کے گھر کا یا زمین کا جہاں اس کے کھیت واقع ہیں؟''

اس نے جواب دیا ''میرے خیال میں تو آپ کو سیدھا اس کے گھر جانا چاہیے۔ مہر صاحب نے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے بندے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اتنی گرمی میں وہاں کیا کریں گے!''

میں نے دینو کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کیا اور صدیق مہر کے گھر کا راستہ پوچھ کر باہر نکل آیا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تھانے واپسی سے پہلے میں صدیق مہر سے بھی ایک بھرپور ملاقات کروں گا۔ مہر کی زمین مقتول خضر کی زمین سے لگی ہوئی تھی اور مجھے پتا چلا تھا، صدیق مہر نے کچھ عرصہ پہلے مقتول کی چار ایکڑ زمین خریدنے کے لیے بہت زور مارا تھا اور ناکامی کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ خضر اور سلیمہ کے قتل کے بعد اس نکتے کو ذہن میں رکھ کر صدیق مہر کو ٹٹولنا بہت ضروری تھا۔

☆☆☆

کرموبابا سے ہونے والی ملاقات بے سود ثابت نہیں ہوئی تھی!

میں صدیق مہر کے گھر کی سمت قدم اٹھاتے ہوئے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کم از کم یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ ماضی بعید میں مقتولین کا تعلق لائل پور کے کسی نزدیکی گاؤں سے رہا تھا۔ اب اس گاؤں کا نام قادر نگر تھا یا حسن آباد، یہ معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں لائل پور جا کر اس سلسلے میں چھان بین کر سکتا تھا۔ اگر لائل پور کے آس پاس اتفاق سے یہ دونوں گاؤں بھی موجود ہوتے تو میرے لیے یہ جاننا دشوار نہ ہوتا کہ خضر اور سلیمہ ان میں سے کس گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ تو طے تھا کہ قادر نگر یا حسن آباد جو بھی ان کا آبائی گاؤں تھا وہاں اب بھی ان کے عزیز رشتے دار موجود ہوں گے۔ ان سے مل کر یہ پتا چلایا جا سکتا تھا کہ آخر مقتولین اور ان کے خاندان والوں میں ایسا کیا بگاڑ پیدا ہو گیا تھا کہ انہوں نے پلٹ کر کبھی پیچھے نہیں دیکھا اور ان کے رشتے داروں نے بھی کبھی ان کی خیر خبر لینے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ خضر اور سلیمہ کے قتل کی گتھی سلجھانے میں ان کا آبائی گاؤں نہایت ہی اہم کردار ادا کرے گا۔

یہ سب کچھ تو اپنی جگہ تھا لیکن مجھے امید تھی، صدیق مہر سے ملاقات بھی کوئی نہ کوئی رنگ ضرور لائے گی۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں اپنے مطلوبہ شخص کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ دینو نے بالکل ٹھیک کہا تھا، صدیق مہر کا پختہ مکان چودھری سردار علی کی حویلی کے بہت قریب تھا۔ چودھری صاحب سے میری اچھی یاد اللہ تھی اور میں ایک آدھ مرتبہ اس کی حویلی بھی جا چکا تھا لیکن صدیق مہر سے میں آج پہلی مرتبہ ملاقات کرنے والا تھا۔ اس سے قبل میں نے صرف اس کا نام ہی نام سن رکھا تھا۔

صدیق مہر کے گھر کے باہر ایک بندے سے میرا سامنا ہوا۔ اس نے بڑے ادب آداب سے مجھے سلام کیا اور فدویانہ لہجے میں پوچھا ''تھانے دار صاحب! لگتا ہے کہ آپ مہر صاحب سے ملنے آئے ہیں!''

''تمہیں بالکل ٹھیک لگتا ہے۔'' میں نے اثبات میں

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسہابرس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربے تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک ہفتے آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جو ہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی ہاتھ پیروں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائینگی جسکے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سر ہلاتے ہوئے کہا پھر قدرے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔
''تم کون ہو.....اور تمہارا صدیق مہر سے کیا تعلق ہے؟''

اس بات کا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بندہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا، اسے معلوم تھا کہ میں اس علاقے کا تھانا ان چارج ہوں۔ میں بھی جلال پور کے اکثر لوگوں کا صورت آشنا تھا لیکن ایک ایک بندے کی شکل یاد رکھنا ممکن نہیں تھا۔ جس شخص نے مجھے ''تھانے دار صاحب'' کہہ کر پکارا تھا، میں اسے نہیں جانتا تھا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

''سرکار میرا نام محمد بوٹا ہے اور میں اِدھر مہر صاحب ہی کی خدمت میں ہوتا ہوں۔''

''پھر تو بڑے صحیح بندے سے سامنا ہوا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''بوٹا جی! کیا تمہارے مہر صاحب اس وقت گھر پر ہیں؟''

''ہاں جی.....!'' اس نے اپنے سر کو خاصی صحت مند اثباتی جنبش دی۔ ''وہ اندر موجود ہیں۔ آپ آئیں میرے ساتھ.....''

بات ختم کرتے ہی وہ صدیق مہر کے گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گیا پھر اس نے ''جیرا'' نامی کسی بندے کو آواز دے کر دروازہ کھلوایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔

''آپ یہاں تشریف رکھیں تھانے دار صاحب!'' اس نے ایک صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مؤدب لہجے میں کہا ''میں مہر صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔''

میں بہ آہستگی صوفے پر بیٹھ گیا۔ محمد بوٹا نے دروازے پر پہنچ کر مجھ سے پوچھا۔ ''ویسے تھانے دار صاحب! سب خیریت تو ہے نا؟''

بوٹا، صدیق مہر کا خاصا مستعد ملازم لگتا تھا۔ اس کا شمار ''شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار'' قسم کے لوگوں میں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی عیاری اور چالاکی نوٹ کی تھی۔ وہ پولیس کو اپنے آقا کے دروازے پر دیکھ کر ٹھٹک گیا اور بڑی مکاری سے اس ٹوہ میں تھا کہ وہاں میری آمد کا سبب جان سکے۔ اس کا یہ سوال اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

میں نے اسے چکر دینے کے لیے گول مول انداز میں جواب دیا ''محمد بوٹا! تم بھی کتنے بھولے ہو۔ بھلا پولیس بھی خیر خیریت سے کہیں پہنچتی ہے؟''

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے تاہم اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور معنی خیز انداز میں سر کو حرکت دیتے ہوئے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا، وہ صدیق مہر کو میرے ان تشویش بھرے الفاظ کے بارے میں ضرور بتائے گا جس سے مہر صاحب کھٹک کر رہ جائیں گے۔ میں نے تھوڑی دیر کے لیے صدیق مہر اور اس کے خدمت گار محمد بوٹا کی جانب سے دھیان ہٹایا اور اس بیٹھک کا تنقیدی جائزہ لینے لگا جس کے ایک آرام دہ صوفے پر اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ بیٹھک پیمائش کے اعتبار سے پندرہ بائی اٹھارہ فٹ ہو گی جس کی دو طولی دیواروں کے ساتھ آمنے سامنے صوفے لگائے گئے تھے جب کہ باقی ماندہ عرضی دیواروں کے ساتھ کرسیاں اور موڑھے سجے ہوئے تھے۔ گنجائش کے حساب سے وہ ایک مناسب بلکہ کشادہ بیٹھک تھی جہاں بہ یک وقت پچاس ساٹھ افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ دیواروں پر آرائش و زیبائش سے متعلق مختلف اشیا آویزاں دکھائی دیتی تھیں۔ ایک دیوار پر خاندان کے دو تین بزرگوں کی فریم شدہ تصاویر بھی نظر آ رہی تھیں۔ جنہوں نے کسی زمانے میں بڑی آن، بان اور شان سے وہ تصویریں کھنچوائی ہوں گی۔ بیٹھک کے وسط میں ایک بڑی سی چوبی میز رکھی ہوئی تھی۔ ازیں علاوہ کمرے کے چاروں کونوں میں بھی کارنر ٹیبل ٹائپ میزیں موجود تھیں، الغرض صدیق مہر نے اپنی بیٹھک کی سجاوٹ میں اچھا خاصا خرچا کر رکھا تھا۔

میں اس سجیلی بیٹھک کے معائنے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دو افراد بیٹھک کے اندرونی دروازے سے نمودار ہوئے۔ آگے ایک دراز قامت اور صحت مند شخص تھا۔ اس کے پیچھے محمد بوٹا نظر آ رہا تھا۔ دونوں کی چال اور ڈھال سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ آگے والا شخص صدیق مہر ہو گا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!'' دراز قامت شخص نے کراری آواز میں کہا ''جناب! آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔ اگر حکم کیا ہوتا تو میں تھانے میں حاضر ہو جاتا!''

اس کے تکلم نے کھول دیا کہ وہی صدیق مہر تھا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر کہا۔ ''مہر صاحب! میں تو دراصل اِدھر خضر اور سلیمہ کے قتل کی تفتیش کرنے آیا تھا۔ واپسی میں سوچا، آپ سے بھی ملاقات کرتا چلوں۔ آپ جلال پور کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ اس دہرے حیرت انگیز قتل پر آپ کی رائے یقیناً نہایت ہی قیمتی اور اہمیت کی حامل ہو گی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے بڑی گرم جوشی سے، مجھ سے مصافحہ کیا اور بڑے اخلاق سے بولا ''تشریف رکھیں ملک صاحب۔ چلیں کسی بھی بہانے سہی، آپ نے میرے غریب خانے کو رونق تو بخشی!''

میں واپس صوفے پر بیٹھا تو وہ بھی میرے مدمقابل صوفے پر براجمان ہوگیا۔ ہمارے درمیان کنگ سائز کی ایک چوبی میز تھی۔ گفتگو کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے میں نے سوالیہ نظروں سے محمد بوٹا کی جانب دیکھا جو بیٹھک کے داخلی دروازے کے پاس کھڑا بڑی کھوج بردار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ایک پولیس آفیسر کو پولیس والی نظر سے دیکھنا مجھے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

صدیق مہر نے میری نگاہ کے تاثر کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور تحکمانہ انداز میں اپنے ملازم سے کہا۔ ''بوٹا! تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ جاؤ، جلدی سے ملک صاحب کی خاطر تواضع کا بندوبست کرو۔''

''جناب! میں آپ کا یہی حکم سننے کے لیے تو یہاں منتظر کھڑا تھا۔'' وہ عیاری سے بولا پھر سر کو تسلیمی جنبش دے کر بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

صدیق مہر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! اس عجیب و غریب دہرے قتل نے تو سارے گاؤں والوں کے ذہنوں کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس بددماغ، خبطی بڈھے اور اس کی پاگل بیوی سے ایسی جان لیوا دشمنی کون کرسکتا ہے؟''

صدیق مہر نے مقتولین خضر اور سلیمہ کا جن الفاظ اور جس انداز میں تذکرہ کیا تھا، اس سے ان دونوں کے لیے اس کے دلی جذبات اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کدورت کی ایک وجہ تو واضح تھی اور وہ یہ کہ صدیق مہر منہ مانگی قیمت پر خضر کی چار ایکڑ زمین خریدنے کا خواہش مند تھا لیکن اس سلسلے میں خضر نے منہ نہیں کھولا تھا، وہ محض گردن سے انکار کرتا رہا تھا چنانچہ مہر صاحب کی ہر کوشش ناکام ہوگئی تھی۔ اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا کہ خضر کی چار ایکڑ زمین اس کی پچیس ایکڑ زمین میں شامل ہوجائے۔ خضر کے مذکورہ چار ایکڑ ایک کونے میں واقع تھے اور یہ زمین مہر کی زمین سے لگی ہوئی تھی۔ اگر مہر کی کوشش اور خواہش پوری ہوجاتی تو اسے کھیتوں کے آخری سرے تک رسائی حاصل ہوجاتی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا اور سب کو معلوم بھی تھا لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس سے آگے بھی کچھ تھا..... اور اگر تھا تو وہ کیا تھا؟

''مہر صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں اپنے سامنے بیٹھے زمیں دار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، آپ ان دونوں مقتولین کی عادات اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپ نے ابھی ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے۔ اس جانب کسی اور نے میری توجہ مبذول نہیں کرائی..... میرا مطلب ہے، مقتولین کے بددماغ، بدمزاج اور خبطی ہونے کے بارے میں!''

میں نے دانستہ اس کی مرضی کی بات کی تھی تاکہ وہ مجھے اپنا ہم خیال سمجھے اور اس طرح وہ اپنے دل اور ذہن میں جو کچھ چھپائے بیٹھا ہے، وہ بے ساختہ اس کی زبان پر آجاتا۔ کسی کو اپنی راہ پر لانے کے لیے پہلے چند قدم اس کی راہ پر چلنا پڑتا ہے۔ جب وہ آپ کے ساتھ کا عادی ہوجائے تو خاموشی سے اپنی راہ پر آجانا چاہیے۔ وہ بھی آپ کے ساتھ سے جڑا جڑا بے دھیانی میں آپ کی راہ پر آجائے گا۔ میں ان لمحات میں اسی حکمتِ عملی پر کام کر رہا تھا۔

''ملک صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ جب تک کسی سے واسطہ نہ پڑے، اس کی اوقات اور ذات کا پتا نہیں چلتا۔'' صدیق مہر نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، گاؤں کے دوسرے لوگوں کو خضر کو اتنے قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع نہ ملا ہو جتنا قریب سے میں نے دیکھا اور پرکھا ہے۔ وہ سیانے کیا کہتے ہیں جناب..... یا واہ پیا جانے یا راہ پیا جانے!''

اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب تک کسی سے کوئی واسطہ نہ پڑے یا کسی کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق نہ ہو اس کی حقیقت اور اصلیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''مہر صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے، آپ کا مقتول خضر سے واسطہ بھی پڑا تھا؟''

''آپ نے صحیح سنا ہے ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں بولا ''میرا اس بددماغ بڈھے سے زندگی میں صرف ایک بار واسطہ پڑا تھا اور یہ میرے لیے بڑا تلخ تجربہ تھا۔ میں نے ہر طریقے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میری بات اس کے دماغ میں بیٹھ نہ سکی۔ تنگ آکر میں نے اس کے بھلے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔''

اگر صدیق مہر کی مقتول خضر سے ماضی میں کوئی ناراضی رہی تھی تو کم از کم یہ ایسا موقع نہیں تھا، اس ناپسندیدگی کے اظہار کا۔ عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ برے سے برا انسان بھی مرنے کے بعد اچھا ہوجاتا ہے، اسی حوالے سے کہا بھی جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ مرنے والے کی برائی نہیں کرنی چاہیے لیکن صدیق مہر کے دل میں مقتول خضر کے لیے جو خفگی اور غصہ بھرا ہوا تھا، وہ اس کے اظہار میں کسی موقع محل کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

میں نے کریدنے والے انداز میں کہا ''مہر صاحب! سننے میں آیا ہے کہ آپ اس کی زمین خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے؟''

''میں نے جو..... واہ پیا اور راہ پیا کی مثال دی ہے نا، وہ اسی حوالے سے تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''اس کی چار کلے زمین ایک کونے میں پڑی تھی۔ اس کے بعد میری زمین شروع ہوتی ہے۔ میں اسی لیے اس کے چار ایکڑ خریدنے میں دل چسپی لے رہا تھا اور زمینی پڑوسی ہونے کے ناتے یہ میرا حق بھی بنتا تھا لیکن بات اس کی عقل میں نہیں آئی۔ آپ یقین کریں ملک صاحب.....!''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں خضر کو اپنی زمین کی منہ مانگی قیمت لگانے کی پیش کش کی تھی۔ یہ بہت بڑی پیش کش تھی اور میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جو بھی رقم منہ سے نکالے گا، میں اسے ادا کروں گا مگر وہ تو لگتا تھا، منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا تھا۔ اس نے میری ایک نہ سنی۔ میں نے اس چار ایکڑ قطعۂ اراضی کے بدلے کسی دوسری جگہ آٹھ ایکڑ زمین دینے کی بات بھی کی تھی لیکن اس نے سمجھنا ہوتا تو سمجھتا نا..... کسی پاگل اور خبطی کو کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے اور اب دیکھ لیں.....!'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا۔ اس کے بعد بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس کی یہ لاڑلی زمین گئی نا کھوہ کھاتے!''

''زمین کھوہ کھاتے گئی.....!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''مہر صاحب! اس بات کا کیا مطلب ہے؟''

''او ملک صاحب! آپ تو ماشاءاللہ عقل مند اور تجربہ کار انسان ہیں۔'' وہ آواز دبا کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''میرا اشارہ مقتولین کی اولاد کی طرف ہے!''

میں جان بوجھ کر بھولا بن گیا اور کہا ''لیکن میں نے تو سنا ہے، وہ بڈھی بڈھا بے اولاد تھے؟''

''آپ نے بالکل درست سنا ہے جناب!'' وہ بہ دستور دھیمے لہجے میں بولا ''وہ دونوں نہ صرف بے اولاد تھے بلکہ ان کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی والی اور نہ ہی کوئی وارث..... اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ان کی زمین گئی کھوہ کھاتے..... جب کوئی وارث اور حق دار سامنے نہیں آئے گا تو ظاہر ہے وہ چار ایکڑ زمین اور مکان سمیت ان کی چھوڑی ہوئی ہر شے خود بہ خود بحق سرکار ضبط ہو جائے گی۔ ویسے میں پوری کوشش کروں گا کہ گورنمنٹ سے وہ زمین اس کی موجودہ قیمت پر خرید لوں۔ اس قطعۂ اراضی پر سب سے زیادہ میرا ہی حق بنتا ہے ملک صاحب!''

''خضر کی وہ مختصر سی زمین ایک پہلو سے چودھری سردار علی کی زمین سے بھی ملی ہوئی ہے شاید آپ کی طرح چودھری صاحب بھی ان چار ایکڑ کو اپنی زمین کا حصہ بنانا چاہیں گے۔ اگر انہوں نے گورنمنٹ سے بات کر لی تو آپ پیچھے رہ جائیں گے!''

''میرا خیال ہے، چودھری صاحب ایسی کوشش نہیں کریں گے۔'' وہ پُروثوق لہجے میں بولا ''اگر ان کی، اس زمین پر نظر ہوتی تو وہ خضر سے ویسے ہی بات کر سکتے تھے اور مجھے یقین ہے، وہ بڈھا کتنا بھی بددماغ سہی، کسی بھی صورت چودھری صاحب کو انکار نہیں کرتا۔''

''پھر تو سمجھیں مہر صاحب! یہ زمین آپ ہی کی ہوئی۔'' میں نے خوش کرنے کے لیے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ ''آپ قانونی کارروائی کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیں۔''

''میں تو بالکل تیار بیٹھا ہوں ملک صاحب!'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا ''اور کیا تیاری کرنی ہے۔''

ان لمحات میں مجھے صدیق مہر کے چہرے پر ایک انجانی سی مسرت کھیلتی ہوئی نظر آئی۔ ایسی خوشی اور اطمینان اس بچے کے چہرے پر دکھائی دیتا ہے جسے اس کا من پسند کھلونا ملنے کی نوید سنائی جائے۔ میں بہ ظاہر صدیق مہر سے گفتگو کر رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میرا ذہن ایک گمبھیر سچائی کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ وہ سفاک سچائی جو انسان کی نفسیات سے متعلق ہے۔

انسانی زندگی اس کائنات کی سب سے قیمتی اور ان مول شے ہے لیکن ایک انسان اپنے کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کی زندگی کو بعض اوقات انتہائی ارزاں اور بے وقعت بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سامنے والے کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اسی تناظر میں اور صدیق مہر کی باتیں سن کر میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ایسا ممکن ہے، مہر صاحب نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اور اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے اس بے بس اور بے کس جوڑے کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو یا اتروا دیا ہو۔ زن، زر اور زمین جس نوعیت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہولناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے گل کھلا سکتے ہیں، اس سے آپ بھی اچھی طرح واقف ہیں اور میں بھی۔

میں نے صدیق مہر سے ملاقات سے قبل اس کے نام پر سرخ دائرہ لگایا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ خضر اور سلیمہ کے قتل کے سلسلے میں اسے ضرور ٹٹولوں گا۔ اور اب اس کی باتیں سن کر.....اس کے عزائم جان کر میرا شک اور بھی پختہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ تھانے پہنچتے ہی میں صدیق مہر کی خفیہ نگرانی کا بندوبست کروں گا۔

میں نے اس کے ''تیار بیٹھنے'' کے ذکر پر تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ کی تیاری تو اپنی جگہ درست نظر آتی ہے لیکن اگر کل کلاں ان مقتولین کا کوئی والی وارث جاگ اٹھا تو آپ کا پروگرام بھی کھوہ کھاتے جا سکتا ہے مہر صاحب!''

''آپ کی بات سے انکار تو نہیں کروں گا ملک صاحب لیکن ایک عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اول تو اس بات کی ایک فیصد بھی امید نہیں کہ اس زمین کا کوئی حق دار زندہ ہوگا اور وہ سامنے بھی آئے گا.....اور اگر بالفرض محال ایسا ہو بھی جاتا ہے تو ہو جائے۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اگر ایسا کوئی کردار ابھر کے سامنے آتا ہے تو اسے خود کو مقتولین کا وارث ثابت کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہوگا۔ اس صورتِ حال کے باوجود بھی اگر وہ وارث خود کو ان کی زمین و جائیداد کا حق دار ثابت کر دیتا ہے تو یہ چار ایکڑ زمین اس سے خریدی بھی جا سکتی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ وہ بھی خضر کی طرح بد دماغ اور خبطی ہی ہو!''

''ہاں، یہ قطعاً ضروری نہیں۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''آنے والا معقول سوچ کا مالک ہو سکتا ہے۔ وہ حالات کی نزاکت اور معاملات کی سنجیدگی کو سمجھ سکتا ہے۔ اس طرح چار ایکڑ اراضی آپ کی ملکیت بننے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔''

''میں بھی تو یہی کہنا چاہ رہا ہوں جناب!'' وہ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''اللہ آپ کا بھلا کرے ملک صاحب! آپ میری بات کی تہ میں اتر گئے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بڑے دوستانہ انداز میں بولا۔

''اور مجھے تو پوری امید ہے ملک صاحب.....کہ اگر مجھے اس معاملے میں کسی قسم کی قانونی مدد کی ضرورت پیش آئی تو آپ ضرور تعاون کریں گے!''

''بالکل.....بالکل'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ''قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے مجھ سے جائز انداز میں جو بھی ہو سکا، وہ میں آپ کے لیے ضرور کروں گا۔ اس سلسلے میں آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

''بہت بہت شکریہ ملک صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

اسی وقت صدیق مہر کا خاص ملازم محمد بوٹا اشیائے خورد و نوش سے لدی پھندی اور کپڑے سے ڈھکی ہوئی ایک ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا۔ بوٹا کی آمد کے ساتھ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو چند لمحات کے لیے رک گئی۔ بوٹا نے ٹرے کو چوبی میز پر رکھا اور اپنے مالک کا اشارہ پا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد صدیق مہر نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا تو مجھے وہاں انواع و اقسام کی، اللہ کی نعمتیں رکھی دکھائی دیں۔ صدیق مہر نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔ ''ملک صاحب! بسم اللہ کریں جناب!''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مہر صاحب! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کرمو بابا کے گھر سے ٹھیک ٹھاک لسی چڑھا کر آ رہا ہوں۔ پیٹ میں کوئی گنجائش تو باقی نہیں لیکن میں بھلا آپ کی پیشکش کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ تو لینا ہی پڑے گا جناب!''

''کچھ نہ کچھ نہیں ملک صاحب!'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''میری تو یہ خواہش ہے کہ آپ تھوڑا تھوڑا سب کچھ ہی لیں۔''

میں نے ''بسم اللہ'' گڑ کے شربت سے کی۔ موسم گرما اور خصوصاً تیز چمکیلی دھوپ کے مضر اثرات کو توڑنے کے لیے گڑ کا شربت اکسیر کا کام کرتا ہے۔ یہ دل و دماغ کو ٹھنڈک دینے کے ساتھ ہی انسانی غذائی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ بھاری پن بھی پیدا نہیں کرتا۔ صدیق مہر نے میرے لیے بڑا اسپیشل گڑ کا شربت تیار کروایا تھا جس میں گڑ کے علاوہ لیموں کا رس اور چاندی کے ورق بھی شامل کیے گئے تھے۔ میں اپنی گنجائش اور ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک کے بعد ایک اللہ کی نعمت کا ''شکر'' ادا کرنے لگا۔

اسی دوران میں صدیق مہر نے سرسری سے انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ ادھر ٹبلی والے کھوہ کی طرف کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لینے گئے تھے؟''

میں فوراً سمجھ گیا، اس کا واضح اشارہ کرموبابا کی جانب تھا۔ میں نے جواب میں اسے بتایا ''مہر صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ جائے وقوعہ پر میں نے بہت سے لوگوں کے بیانات قلم بند کیے ہیں۔ ان میں مقتولین کے پڑوسی نذر حسین اور دونوں کھیت مزدوروں صفدر و ہارون وغیرہ کے بیانات بھی شامل ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر یہ بات دیکھنے میں آئی کہ کوئی بھی شخص مقتولین کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا..... اور میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ آیا وہ دونوں بڈھی بڈھا اسی گاؤں کے پیدائشی ہیں یا کسی اور علاقے سے آکر جلال پور میں بسے تھے کیونکہ جن حالات میں ان کا قتل ہوا ہے، وہ بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کررہے ہیں۔'' میں نے سانس لینے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے جتنی پوچھ تاچھ کی اس سے یہی بات سامنے آئی کہ مجھے اس گاؤں کے سب سے زیادہ عمر والے شخص کرم دین عرف کرموبابا سے ضرور ملنا چاہیے۔ وہ ضرور مقتولین کے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا لہٰذا میں نوے سالہ کرموبابا سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کھوہ کی طرف چلا گیا تھا۔''

صدیق مہر نے متاسفانہ انداز میں میری جانب دیکھا اور بولا ''اور اس کرموبابا سے مل کر آپ کو بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ وہ بے چارہ تو اس عمر میں دیکھنے اور سننے کی صلاحیت تقریباً کھو ہی چکا ہے۔ لگتا ہے، اس کی یہ دونوں صلاحیتیں، بولنے کی صلاحیت میں شامل ہوگئی ہیں اور اس کے بولنے میں بھی..... ''کی کہندے او'' وغیرہ ہی کی تکرار ہوتی ہے۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا جناب!''

بات ختم کرکے اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے متحمل لہجے میں جواب دیا ''مہر صاحب، آپ کا فرمایا ہوا کچھ زیادہ غلط تو نہیں، اس عمر میں انسان بصارت اور سماعت کیا، پتا نہیں اور کون کون سی صلاحیتیں کھو بیٹھتا ہے جن کے کھونے کا اسے بصارت، سماعت اور گویائی سے کہیں زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ وہ بڑی شدت سے ان کی کمی محسوس کرتا ہے..... بہرحال.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو کرموبابا ہے۔ ہم اگر اس کی عمر کو پہنچ گئے تو معلوم نہیں کیا کیا کھو بیٹھیں گے۔ ضعیف العمری اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ اس کی تلخی کو صرف وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو اس کا حامل ہو۔''

''ہوں!'' صدیق مہر نے ایک معنی خیز ہنکارا بھرا پھر مجھ سے مستفسر ہوا ''تو ملک صاحب! یہ بتائیں، کرموبابا سے ہونے والی ملاقات سے کچھ حاصل بھی ہوا یا آپ نے وقت ہی ضائع کیا ہے؟''

''مہر صاحب ایک بات ذہن میں رکھ لیں کہ میرا وقت بہت قیمتی ہے اور میں اسے کسی بھی صورت ضائع کرنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تاکیدی انداز میں کہا ''اگر میں نے کرموکے گھر پر گھنٹا، ڈیڑھ گھنٹا گزارا ہے تو وہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ کچھ نہ کچھ حاصل کرکے ہی آیا ہوں۔''

''جناب! میں بھی تو وہی جاننا چاہتا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ''کرموکی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ کم وبیش چالیس سال پہلے خضر اور سلیمہ اس گاؤں میں آکر بسے تھے پھر یہاں کی آب وہوا اور لوگ انہیں اس قدر پسند آئے کہ انہوں نے کہیں اور جانے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ کرموکے مطابق، ان دونوں کا تعلق لائل پور کے ایک نزدیکی گاؤں قادر نگر یا حسن آباد سے تھا۔ اپنے خاندان والوں سے ان کی زیادہ نہیں بنتی تھی لہٰذا ایک طرح سے انہوں نے اپنے خاندان سے علیحدگی اختیار کرلی تھی جو ان کی زندگی کی آخری سانس تک برقرار رہی۔''

''ہوں.....'' صدیق مہر نے ایک مرتبہ پھر پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا، اس کے بعد مجھ سے پوچھا ''ملک صاحب! ان معلومات کی روشنی میں آپ کس قسم کی قانونی کارروائی کرنا چاہتے ہیں؟''

''دیکھیں مہر صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جائے وقوعہ کی کارروائی مکمل ہوچکی، مقتولین کی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوایا جاچکا ہے۔ کل یا پرسوں تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے ساتھ ان کی لاشیں واپس آجائیں گی پھر ان کو ظاہر ہے، جلال پور کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا جائے گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا! گاؤں والوں کے نزدیک ان کی کہانی ختم ہوجائے گی۔ چند دنوں تک لوگ انہیں تواتر سے یاد کریں گے اور پھر رفتہ رفتہ فراموش کردیں گے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، دستورِ زمانہ یہی ہے لیکن.....!''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''میں گاؤں والا پتا نہیں، ہوں یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ہوں مگر پولیس والا ضرور ہوں۔ میں ''اللہ اللہ خیر سلا'' پر قناعت کر کے بیٹھا نہیں رہ سکتا کیونکہ میرے نزدیک مقتولین کی تدفین کے ساتھ ان کی کہانی ختم نہیں ہو جائے گی۔ ان دونوں کی یاد کم از کم اس وقت تک میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکتی جب تک میں ان کے قاتل یا قاتلوں تک رسائی حاصل نہ کر لوں۔ قاتل کو گرفتار کرنے کے بعد میں سکھ کی سانس لوں گا اور سخت چالان کے ساتھ اسے عدالت کے حوالے کر کے ہی میری تسلی ہو گی پھر جب اس نامراد کو عدالت سے کڑی سزا سنائی جائے گی تو اس روز میرا کام ختم ہو گا اور میں یہ کہنے کی پوزیشن میں آ جاؤں گا..... اللہ اللہ، خیر سلا!''

''میری دعا ہے، اللہ بہت جلد آپ کو اس مقصد میں کامیاب کرے!'' اس نے کہا۔

''آمین!'' میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

اس نے پوچھا ''ملک صاحب! آپ قاتل کی تلاش کا کام کب سے اور کہاں سے شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''مہر صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''بھئی، میں تو اسی لمحے سے قاتل کی تلاش میں ہوں جب مجھے اس واردات کی اطلاع ملی تھی اور ظاہر ہے، اس تلاش کا آغاز تو جلال پور ہی سے ہونا تھا، سو ہو چکا۔ اسی سلسلے میں، میں آپ سے بھی ملاقات کے لیے آپ کے دولت خانے پر حاضر ہوں..... اور پتا نہیں، یہ قاتل بدبخت مجھے کہاں کہاں دوڑائے گا!''

میں نے صدیق مہر کے چہرے پر مختلف رنگوں کی جھلملاہٹ دیکھی۔ ان میں تشویش اور پریشانی کا رنگ بھی تھا اور تفکر و الجھن کا بھی۔ اس کے ساتھ ہی احتراز، فرار اور تکرار کے رنگ بھی پائے جاتے تھے۔ ایک لمحے کی سوچ بچار کے بعد وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ نے مجھے کچھ سمجھا اور قاتل کی تلاش کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں نے اپنی بساط بھر معلومات آپ کو فراہم بھی کی ہیں اور آئندہ بھی انشاءاللہ! یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو خضر اور سلیمہ کے قاتل کی تلاش میں جلال پور سے باہر نگاہ دوڑانی چاہیے۔ یہاں تو ان کا ایسا کوئی بھی بدخواہ یا دشمن نظر نہیں آتا جو انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہو!''

''آپ نے بجا فرمایا مہر صاحب!'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''بھئی، میں تو اسی لمحے سے قاتل کی تلاش میں ہوں جب مجھے اس واردات کی اطلاع ملی تھی اور ظاہر ہے، اس تلاش کا آغاز تو جلال پور ہی سے ہونا تھا، سو ہو چکا۔ اسی سلسلے میں، میں آپ سے بھی ملاقات کے لیے آپ کے دولت خانے پر حاضر ہوں..... اور پتا نہیں، یہ قاتل بدبخت مجھے کہاں کہاں دوڑائے گا!''

میں نے صدیق مہر کے چہرے پر مختلف رنگوں کی جھلملاہٹ دیکھی۔ ان میں تشویش اور پریشانی کا رنگ بھی تھا اور تفکر و الجھن کا بھی۔ اس کے ساتھ ہی احتراز، فرار اور تکرار کے رنگ بھی پائے جاتے تھے۔ ایک لمحے کی سوچ بچار کے بعد وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ نے مجھے کچھ سمجھا اور قاتل کی تلاش کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں نے اپنی بساط بھر معلومات آپ کو فراہم بھی کی ہیں اور آئندہ بھی انشاءاللہ! یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو خضر اور سلیمہ کے قاتل کی تلاش میں جلال پور سے باہر نگاہ دوڑانی چاہیے۔ یہاں تو ان کا ایسا کوئی بھی بدخواہ یا دشمن نظر نہیں آتا جو انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہو!''

''آپ نے بجا فرمایا مہر صاحب!'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''بھئی، میں تو اسی لمحے سے قاتل کی تلاش میں ہوں جب مجھے اس واردات کی اطلاع ملی تھی اور ظاہر ہے، اس تلاش کا آغاز تو جلال پور ہی سے ہونا تھا، سو ہو چکا۔ اسی سلسلے میں، میں آپ سے بھی ملاقات کے لیے آپ کے دولت خانے پر حاضر ہوں..... اور پتا نہیں، یہ قاتل بدبخت مجھے کہاں کہاں دوڑائے گا!''

میں نے صدیق مہر کے چہرے پر مختلف رنگوں کی جھلملاہٹ دیکھی۔ ان میں تشویش اور پریشانی کا رنگ بھی تھا اور تفکر و الجھن کا بھی۔ اس کے ساتھ ہی احتراز، فرار اور تکرار کے رنگ بھی پائے جاتے تھے۔ ایک لمحے کی سوچ بچار کے بعد وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ نے مجھے کچھ سمجھا اور قاتل کی تلاش کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں نے اپنی بساط بھر معلومات آپ کو فراہم بھی کی ہیں اور آئندہ بھی انشاءاللہ! یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو خضر اور سلیمہ کے قاتل کی تلاش میں جلال پور سے باہر نگاہ دوڑانی چاہیے۔ یہاں تو ان کا ایسا کوئی بھی بدخواہ یا دشمن نظر نہیں آتا جو انہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہو!''

''آپ نے بجا فرمایا مہر صاحب!'' میں نے بدستور

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میں نے عرض کیا ہے نا، ابھی تو اس معاملے کی ابتدا ہوئی ہے۔ آگے آگے دیکھتے جائیں، ہوتا ہے کیا! میں... انشاءاللہ کل صبح لائل پور جا رہا ہوں۔ قادر نگر اور حسن آباد کا چکر بھی لگانا ہے۔ کچھ نہ کچھ نتیجہ تو سامنے آ ہی جائے گا جناب!'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر محض اسے سنانے کے لیے کہہ دیا۔ ''ویسے مہر صاحب! آپ کی طرح میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ قاتل کا تعلق جلال پور سے قطعاً نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی باہر ہی کے شخص کی کارروائی نظر آتی ہے!''

''ظاہر ہے!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''یہاں بھلا کسی کو ان سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

یہ جملہ ادا کر کے وہ مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر وہ سکون اور اطمینان دیکھا جو آخری پرچے کے بعد کسی طالب علم کے چہرے پر نظر آتا ہے!

مزید دو چار سرسری باتوں کے بعد میں نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔ وہ گھر کے باہر تک مجھے چھوڑنے آیا تھا۔

☆☆☆

جائے وقوعہ پر ہارون کے بیان کی روشنی میں، میں نے چودھری سردار علی اور صدیق مہر کے ناموں کو سرکل کیا تھا کیونکہ مجھے پتا چلا تھا، یہ دونوں افراد ہی مقتولین کی چار ایکڑ زمین کو اپنی زمین کا حصہ بنانے کے خواہاں تھے۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ گرمو بابا سے نمٹنے کے بعد میں پہلے صدیق مہر سے ملوں گا اور اس کے بعد چوہدری سردار علی سے تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ ان دونوں میں سے تو کوئی اس دہرے قتل کی واردات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث نہیں!

یہ میں ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے سوچ رہا تھا ورنہ میں چودھری سردار علی سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کسی بھی زاویے سے خضر اور سلیمہ کے قتل میں ملوث ہو گا۔ وہ جلال پور کا چودھری تھا، وہاں کا مالک و مختار۔ وہ جس شخص کی جس بھی شے پر ہاتھ رکھ دیتا، وہ اس کے سامنے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس ذیل میں، میں صدیق مہر کی رائے سے متفق تھا کہ اگر چودھری سردار علی، خضر سے اس کی چار ایکڑ زمین مانگ لیتا تو مقتول کو چودھری کی بات ماننے میں کوئی پریشانی نہ ہوتی لیکن میں موصوف..... صدیق مہر کی طرف سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔

اس بندے نے مقتولین کے لیے اپنی جس ناپسندیدگی، نفرت اور غصے کا اظہار کیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا، خضر کے انکار پر وہ بہت بلبلایا ہوا تھا۔ صدیق مہر بنیادی طور پر مجھے ایک غاصب اور کینہ پرور شخص لگا جو خضر کی افسوس ناک موت پر کسی دکھ کے اظہار کے بجائے اس کی زمین کھوہ کھاتے جانے اور اس زمین کو قانونی چارہ جوئی سے حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اس نوعیت کی سوچ کسی سنگ دل اور سفاک شخص ہی کی ہو سکتی ہے..... اور جو شخص سفاک اور سنگ دل ہوتا ہے، اس سے کسی بھی قسم کی بربریت کے مظاہرے کی توقع بہرحال ہوتی ہے!

میں صدیق مہر کے گھر سے نکلا تو اپنے ذہن میں اسے ٹارگٹ بنا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ تھانے پہنچتے ہی اس کی خفیہ نگرانی کا فوری انتظام کر دوں گا۔ تاکہ اس کی نقل و حمل اور چال بازیوں کو مانیٹر کیا جا سکے۔ ازیں علاوہ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ سردست چودھری سردار علی سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ملاقات کل کسی وقت بھی کی جا سکتی ہے۔ صدیق مہر سے ملنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد میرا دھیان اسی پر مرتکز ہو کر رہ گیا تھا۔

جلال پور میں تو تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری رکھنا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اگلی صبح میں نے لائل پور جانے کا بھی ارادہ کیا تھا لہٰذا اس سفر سے پہلے تھوڑا ہوم ورک ضروری تھا اور اس ہوم ورک کے لیے میں بس اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا۔

آپ کو ایک بات کی شاید حیرت یا الجھن ہو رہی ہوگی کہ میں کافی دیر سے اکیلا ہی تفتیشی گاڑی کو بھگائے لیے جا رہا ہوں ورنہ میرے ساتھ عملے کا کم از کم ایک فرد تو ہوا ہی کرتا ہے۔ تو اس سلسلے میں عرض کرتا چلوں کہ جلال پور کے تھانے میں نفری کی بہت کمی تھی۔ جو چار پانچ افراد تھے بس انہی سے کام چلایا جاتا تھا لہٰذا مجھے بہت زیادہ سرگردی دکھانی پڑتی تھی اور..... یہ ایک طرح سے میرے لیے اور عملے کے دیگر افراد کے لیے اچھا ہی تھا۔ اس طرح انسان مستعد اور چاق چوبند رہتا ہے۔ تھانے کا عملہ زیادہ ہونے کی سہولت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اکثر اہل کاروں کی توندیں نکل آتی ہیں۔ فراغت اور فرصت کے باعث باہر نکل آنے والی یہ توندیں پھر مشکل ہی سے اندر جاتی ہیں اور ہر وقت آرام طلبی کا تقاضا کرتی رہتی ہیں!

جلال پور کا بس اسٹینڈ میرے تھانے کے پہلو میں واقع تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک کچا راستہ گاؤں کی طرف جاتا تھا جو بس اسٹینڈ سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر تھا۔ اس کچے راستے پر اکثر و بیشتر سائیکلوں، بیل گاڑیوں اور تانگوں وغیرہ کی آمد و رفت دیکھنے کو ملتی تھی اور اسی راستے کے کنارے ڈھور ڈنگر بھی ایک قطار بنائے بڑی شرافت سے چلتے نظر آ جاتے تھے۔

میرا تھانا دراصل، ایک نیم پختہ لنک روڈ پر واقع تھا۔ یہ لنک روڈ لائل پور سے جھنگ آنے والی مین روڈ میں سے نکل کر واپس اس میں ہی داخل ہو جاتی تھی۔ اس لنک روڈ کی لمبائی لگ بھگ پچیس میل تھی یعنی جلال پور، میرے تھانے سے پندرہ میل لائل پور کی طرف اور دس میل جھنگ کی جانب تھا۔ لائل پور والی سمت پر اس کے اختتام پر فرید کوٹ نامی ایک چھوٹا سا قصبہ آباد تھا جب کہ جھنگ کی جانب اس کے آخری سرے پر موضع قلعہ نہال چند واقع تھا۔

میں بس اسٹینڈ پر پہنچ گیا۔ دوپہر اگرچہ ڈھل چکی تھی تاہم دھوپ کی تمازت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بس اسٹینڈ کا مالک بابو سلطان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سلطان ایک پستہ قامت اور گول مٹول شخص تھا۔ وہ میری بہت عزت کرتا تھا۔ نہایت ہی خوش مزاج اور ملنسار واقع ہوا تھا۔ اس سے مل کر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ بس اسٹینڈ چلاتا ہوگا! بابو سلطان ہر وقت اپنے سر پر ایک منقش ٹوپی لگائے رہتا تھا۔

''آیئے..... آیئے ملک صاحب!'' وہ بڑی اپنائیت سے میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

ہم نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر وہ مجھے ایک کرسی پیش کرتے ہوئے بولا ''آپ تشریف رکھیں جناب! میں آپ کے لیے ٹھنڈا منگواتا ہوں۔''

پھر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کسی کارندے کو آواز دی ''اوئے کاکا جھورے! جا، نس کے دو ٹھنڈی بوتلیں پکڑ لا۔ ملک صاحب کی برکت سے میں بھی پی لوں گا۔ آج تو گرمی نے حد ہی کر دی ہے۔''

جب تک بابو سلطان کولڈ ڈرنکس کا آرڈر دے کر فارغ ہوتا، میں اس کی پیش کردہ کرسی پر تشریف رکھ چکا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے میری آمد کی غرض و غایت دریافت کی تو میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

''آپ نے گاؤں میں ہونے والی دہرے قتل کی واردات کے بارے میں تو سنا ہوگا!''

''جی، سنا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کام کی زیادتی کے باعث میں ادھر جا نہیں سکا، ویسے مجھے اس واقعے کا دلی دکھ ہوا ہے۔ پتا نہیں، ان دونوں میاں بیوی سے کسی کو کیا دشمنی تھی؟''

''بابو جی! جس طرح آپ نہیں جانتے کہ کسی نامراد کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس ضعیف جوڑے کے ساتھ کیا عداوت تھی بالکل اسی طرح یہ بات میں بھی نہیں جانتا..... بلکہ یہ راز یہاں کسی کو بھی معلوم نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر اضافہ کیا۔

''میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے امید ہے، آپ کے تعاون سے میں اس بد بخت سفاک قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں اس حوالے سے آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

اس سے پہلے کہ میں اسے جواب دیتا، جھورا نامی وہ بچہ جسے سلطان نے کولڈ ڈرنکس لینے بھیجا تھا واپس آ گیا۔ اس نے دو بوتلیں اور ان کی ''چابی'' میز پر رکھی اور نو دو گیارہ ہو گیا۔

بابو سلطان نے مذکورہ چابی سے بوتلوں کے ڈھکن کھولے، ایک میری جانب بڑھائی اور دوسری اپنے سامنے رکھ لی پھر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کولڈ ڈرنک میں سے ایک گھونٹ بھرا تو حلق سے معدے تک ایک ٹھنڈی لہر سی اترتی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا، دکان دار نے ان بوتلوں کو برف کے بہت نیچے ''ڈیپ فریز'' کر رکھا تھا۔ میں نے ایک مزید گھونٹ لینے کے بعد بابو سلطان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اب تک میں نے اس دہرے قتل کے سلسلے میں جو بھی پوچھ گچھ کی ہے، اس کے نتیجے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کا تعلق جلال پور سے نہیں بلکہ باہر کے کسی علاقے سے ہے۔''

میں نے دانستہ اس سے صدیق مہر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ مہر صاحب کے ساتھ جو کارروائی کرنے والا تھا، اس کی کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ یہ میرا ایک خفیہ مشن تھا۔ بابو سلطان پوری طرح میری جانب متوجہ تھا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ ماضی میں مقتولین کا لائل پور کے کسی قریبی گاؤں سے تعلق رہا ہے۔ یہ لوگ کسی خاندانی ناراضی کی وجہ سے چالیس سال پہلے وہ گاؤں چھوڑ کر جلال پور آ گئے تھے۔ ممکن ہے، یہ واردات کسی دیرینہ دشمنی کا نتیجہ ہو لہٰذا میں نے کل صبح تحقیقات کے لیے لائل پور جانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''سو بسم اللہ جناب!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کا خادم ہوں ملک صاحب، جھنگ سے لائل پور جانے والی پہلی بس صبح آٹھ بجے اس اڈے پر پہنچتی ہے۔ آپ اپنی تیاری کر کے رکھیں۔ وہ بس اڈے میں لگے گی تو میں اپنے کسی بندے کو آپ کی طرف بھیج دوں گا جب تک آپ آ کر اس بس میں بیٹھ نہیں جائیں گے، بس اڈے سے نہیں نکلے گی۔ میں آپ کے لیے فرنٹ سیٹ بھی خالی کروا دوں گا..... اور کوئی حکم ہو تو بتائیں!''

''یہ تو صبح میری لائل پور روانگی کا بندوبست ہو گیا۔'' میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ''اب ذرا اس پر بھی بات ہو جائے جس کے حوالے سے میں نے آپ کے تعاون کا ذکر کیا تھا!''

''کیا وہ کوئی علیحدہ بات ہے؟'' اس نے چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''بالکل الگ..... اور نہایت ہی اہم.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر میرا یہ اندازہ درست ہے کہ خضر اور سلیمہ کا قاتل باہر سے آیا تھا تو پھر زیادہ امکانات اس بات کے ہیں کہ اس کا تعلق لائل پور یا اس کے کسی قریبی گاؤں سے ہو گا!''

''ہوں.....!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اگرچہ میرے شک کی بیشتر توپوں کا رخ صدیق مہر کی جانب تھا لیکن میں اس کیس کے کسی بھی پہلو، کسی بھی زاویے کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ جب سے مجھے پتا چلا تھا کہ ماضی بعید میں خضر اور سلیمہ لائل پور کے کسی گاؤں میں رہا کرتے تھے، اسی لمحے سے میرے ذہن نے سوچنے کے سلسلے میں ''لائل پور'' کا ایک کوٹا مقرر کر لیا تھا اور خاص طور پر اس بنیاد پر کہ یہ ضعیف جوڑا اپنی جوانی میں خاندان والوں سے سارے تعلقات توڑ کر یہاں آ بسا تھا اور پھر پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور نہ ہی خاندان والوں نے خبر لینے کی کوشش کی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ خاندان سے اس نوعیت کا سنگین قطع تعلق کسی بڑی ناراضی یا دشمنی کی جانب اشارہ کرتا تھا..... اور دشمنی بڑی ہی کتی شے ہوتی ہے۔ یہ کسی وقت..... کہیں بھی نکالی جا سکتی ہے!

حالات کے اس تناظر میں، میں کسی بھی قیمت پر لائل پور اور اس کے نواحی گاؤں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بابو سلطان میرے مزید بولنے کا انتظار کر رہا تھا لہٰذا میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''بابو جی! دہرے قتل کی یہ واردات پچھلی رات عمل میں آئی ہے۔ میں نے بڑی توجہ سے ان دونوں کی لاشوں کا معائنہ کیا ہے اور اس معائنے نے مجھے بتایا ہے کہ انہیں آدھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات کے بعد موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ اب ہم دوبارہ لائل پور کی طرف آجاتے ہیں.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے اندازے کے مطابق، اگر قاتل کا تعلق لائل پور یا اس کے کسی نواحی گاؤں سے ہے تو پھر یہ بھی طے ہے کہ وہ شخص کل کسی وقت لائل پور سے جلال پور پہنچا ہوگا۔ یہ بات آپ مجھے بتائیں گے کہ دن میں کتنی گاڑیاں لائل پور سے اس طرف آتی ہیں اور کس کس وقت؟''

''بات یہ ہے ملک صاحب.....!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا'' لائل پور اور جھنگ کے درمیان اس وقت صرف دو بسیں ایسی چل رہی ہیں جو جلال پور سے بھی ہو کر جاتی ہیں۔ باقی اس روٹ پر چلنے والی بسیں مین روڈ سے گزرتی ہیں۔ اگر کوئی بندہ لائل پور سے جلال پور آیا ہوگا تو وہ انہی دو میں سے کسی ایک بس پر سوار ہو کر آیا ہوگا جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ لنک روڈ پر یہ دو بسیں دن میں دو پھیرے لگاتی ہیں۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے پوچھ لیا'' ان دونوں بسوں کی ٹائمنگ وغیرہ کیا ہے؟''

''میں آپ کو وہی تو بتانے والا تھا!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' کل صبح آٹھ بجے آپ جس بس میں بیٹھ کر لائل پور جانے والے ہیں وہ واپسی میں دو بجے دوپہر دوبارہ یہاں سے گزرے گی۔ صبح یہ جھنگ سے لائل پور جاتی ہے اور دوپہر میں لائل پور سے واپس جھنگ۔ دوسری بس دوپہر میں جھنگ سے یہاں پہنچے گی پھر اس کی لائل پور سے واپسی لگ بھگ شام پانچ بجے ہوگی۔ آپ کا مطلوبہ بندہ یا تو دوپہر دو بجے یہاں پہنچا ہوگا یا پھر شام پانچ بجے۔''

''کیا میں ان دونوں بسوں کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے بات کر سکتا ہوں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا'' میرا مطلب ہے، میں ان لوگوں کو ٹٹول کر قاتل کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ تو بہت ہی آسان ہے ملک صاحب!'' وہ کولڈ ڈرنک کو خالی کرتے ہوئے بولا۔ میں یہ کام اس سے پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور بولا'' بتی پینتی تو آنے ہی والی ہے۔ آپ ایک انٹرویو تو اسی وقت کر لیں۔''

''بتی پینتی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' دراصل بتی پینتی (بتیس پینتیس) اس بس کا نمبر ہے جو چند منٹ میں لائل پور کی طرف سے یہاں پہنچنے والی ہے۔ ٹرانسپورٹ کی لائن میں اکثر گاڑیوں کو ان کے نمبروں سے یاد رکھا اور پکارا جاتا ہے۔''

''یہ تو آپ نے اچھی خبر سنائی ہے بابو جی۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔'' دوسری بس والوں کا صبح انٹرویو ہو جائے گا۔''

اِدھر میری بات ختم ہوئی، اُدھر بابو سلطان نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے نعرہ لگایا۔

''لیں ملک صاحب! اپنی بتی پینتی تو آ گئی!''

میں نے اس کے اشارے کی سمت میں دیکھا تو ایک بس، اڈے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ اتنے فاصلے سے بس کی نمبر پلیٹ تو نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن بابو سلطان کا مشاہدہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا یہ روز کا کام تھا۔ اگر اس نے نعرہ لگایا تھا کہ'' بتی پینتی'' آ رہی ہے تو پھر وہ کوئی اور بس نہیں ہو سکتی تھی!

بابو سلطان نے ایک مرتبہ پھر جھورا کو آواز دی۔ جب جھورا کسی چراغی جن کے مانند پلک جھپکتے میں حاضر ہو گیا تو اس نے اسے حکم دیا۔

''جاؤ.....اور امانت علی، عباس احمد وغیرہ کو میرے دفتر میں بھیج دو۔ کہنا، میں ان سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا'' امانت علی اس بس کا ڈرائیور ہے اور عباس احمد کنڈیکٹر۔ آپ نے ان سے جو کچھ بھی پوچھنا ہو، اِدھر دفتر ہی میں پوچھ لیں۔''

وہ جس'' مقام'' کو اپنا دفتر کہہ رہا تھا وہ درحقیقت ایک شیڈ کے نیچے بچھی ہوئی ایک میز اور اس کے سامنے رکھی چار کرسیاں تھیں۔ یہ بابو سلطان کی بیٹھک اور دفتر سبھی کچھ تھا۔ جب اس نے جھورا کو حکم دیا تھا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو بلا رہا ہے، ازاں بعد اس نے خود ہی اس کی وضاحت کر دی تھی۔

بابو سلطان بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے'' دفتر'' میں حاضر ہونے سے قبل مجھے یہ تفصیل بھی بتا چکا تھا کہ'' بتی پینتی'' راجا ٹریولز کی بس ہے اور دوسری یعنی جس میں اگلی صبح میں لائل پور جانے والا تھا، اس کا تعلق کوہستان بس سروس سے تھا۔ اس بس پر سلیم اور مشتاق علی الترتیب ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی حیثیت سے چلتے تھے اور اس کا نمبر تھا'' پینٹھ بیالی''.....یعنی پینسٹھ بیالیس!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امانت علی اور عباس احمد جھورا کی معیت میں تھوڑی دیر کے بعد ہمارے پاس پہنچ گئے۔ میں نے بتی پیشتی کے اس مختصر سے اسٹاف کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ اپنی شکل، حلیے اور بول چال سے بالکل ویسے ہی تھے جیسا کہ عام طور پر ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہوا کرتے ہیں۔ مجھے بابو کے پاس بیٹھے دیکھ کر وہ خاصے پریشان ہوگئے تھے۔ بابو نے انہیں کوئی ضروری بات کرنے کے لیے اپنے پاس بلایا تھا اور اس کے قریب ہی مکلف وردی والا ایک تھانے دار بھی موجود تھا۔ ان بے چاروں کا خوف زدہ ہوجانا ایک لازمی امر تھا۔

میں نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر نرمی سے اضافہ کیا۔ ''ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں کسی جرم کی تفتیش کے لیے نہیں بلایا گیا بلکہ میں تم سے چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم لوگ ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو میں تمہیں دس منٹ میں فارغ کردوں گا۔''

میری اس وضاحتی تسلی پر ان کی جان میں جان آئی۔

میں نے بابو سلطان سے کہا ''ان بے چاروں کو ٹھنڈا پانی تو پلا دیں۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر صدا لگائی ''کا کا جھورا.....!''

یوں لگتا تھا، جھورا کو بابو نے صرف اپنے احکام کی تعمیل کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جھورا ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا ایلومینیم کا ایک جگ اور دو گلاس لے آیا۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر نے بلا تکلف دو دو پانی کے گلاس اپنے حلق سے اتارے پھر گہری سانسیں خارج کرتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے اپنا کام شروع کرتے ہوئے کہا ''کیا کل بھی تم لوگ اسی وقت جلال پور کے بس اسٹینڈ پر پہنچے تھے؟''

ڈرائیور امانت علی نے جواب دیا ''تھانے دار صاحب! ویسے ہمارے پہنچنے کا وقت تو یہی ہے لیکن دس پندرہ منٹ کبھی اوپر نیچے بھی ہوجاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔ ''کل کے دن کو ذہن میں تازہ رکھو اور سوچ کر بتاؤ، جب تم لوگ لائل پور کے بس اسٹینڈ سے نکلے تھے تو کیا تمہاری بس بھری ہوئی تھی؟''

اس مرتبہ کنڈیکٹر عباس احمد نے جواب دیا ''جناب! بس بھری ہوئی تو نہیں تھی، یوں سمجھ لیں کہ بس، سیٹ بائی سیٹ تھی۔''

''سیٹ بائی سیٹ۔'' بھی ٹرانسپورٹ لائن کی ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کے معنی یہ لیے جاتے ہیں کہ گاڑی کی تمام سیٹیں بھری ہوئی ہیں۔

کنڈیکٹر کے جواب پر میں نے گھور کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا..... تمہاری بس ''سیٹ بائی سیٹ'' بھی تھی اور یہ بھی کہہ رہے ہو کہ بھری ہوئی نہیں تھی۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟''

بابو سلطان نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! بھری ہوئی بس یہ لوگ اس کو سمجھتے ہیں جس کی تمام سیٹوں پر تو مسافر بیٹھے ہوئے ہوں اور گزرگاہ میں بھی ڈنڈا پکڑے کھڑے ہوں..... اگر موقع توفیق دے تو چھت پر بھی بہار نظر آئے۔''

''ہوں۔'' میں نے بہ دستور عباس احمد کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔ ''لائل پور سے جلال پور تک راستے میں کتنے اسٹاپ آتے ہیں؟''

''صرف ایک جناب!'' اس نے بڑی فرماں برداری سے جواب دیا ''فرید کوٹ کے اسٹاپ پر ہم دس منٹ رکتے ہیں اور پھر اگلا اسٹاپ یہ ہے۔ یہاں ہم لگ بھگ پندرہ منٹ رکتے ہیں۔''

''اور اگر راستے میں سے کوئی سواری مل جائے یا کوئی سوار مسافر اترنے کی فرمائش کردے تو کیا آپ لوگ گاڑی روک کر اس کی فرمائش پوری کردیتے ہو؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہ تو ہمیں کرنا ہی پڑتا ہے جناب۔''

''ٹھیک ہے، ذرا ذہن پر زور دو اور سوچ کر بتاؤ کہ کل جب تم لوگ اس وقت والا پھیرا لے کر لائل پور سے روانہ ہوئے تھے تو فرید کوٹ کے اسٹاپ کے علاوہ بھی راستے میں سے کوئی سواری بٹھائی یا اتاری تھی؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''جناب! مجھے اچھی طرح یاد ہے، کل فرید کوٹ سے دو میل پہلے میں نے راستے میں سے ایک بوڑھے بابے کو اپنی بس میں بٹھایا تھا۔ اس کے بعد ہم نے فرید کوٹ کے اڈے پر اسٹاپ کیا۔ وہاں دو مسافر اترے اور تین سوار ہوئے تھے۔ فرید کوٹ سے جلال پور تک کہیں بھی بس روکنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''جلال پور کے بس اسٹینڈ پر کیا صورتِ حال رہی تھی..... میرا مطلب ہے، یہاں کتنے مسافر بس سے اترے اور کتنے سوار ہوئے؟''

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم نے کوئی سواری نہیں اتاری تھی۔ ہاں البتہ، یہاں سے ہماری بس میں دو نئے مسافر سوار ہوئے تھے جنہیں سیدھا جھنگ جانا تھا۔''

'اور وہ بڈھا بابا جسے تم نے فرید کوٹ سے دو میل پہلے اپنی بس پر سوار کرایا تھا، اسے کہاں اتارا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''وہ بابا جی قلعہ نہال چند پر اترے تھے۔'' کنڈیکٹر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''قلعہ نہال چند۔'' نامی یہ گاؤں جلال پور سے جھنگ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑتا تھا۔ اب تک میں نے بتی پیتی کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کا جو انٹرویو کیا تھا، اس سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ کل کی تاریخ میں، ان کی بس میں بیٹھ کر کوئی مسافر لائل پور، فرید کوٹ یا بیچ میں کہیں سے جلال پور نہیں پہنچا تھا۔ اب ''پینسٹھ بیالیس'' کے انشاف کا انٹرویو کرنا باقی تھا۔

میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور سرسری انداز میں پوچھا۔ ''اس پھیرے کے دوران میں کوئی اور غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہو تو بتائیں؟''

''نہیں.....'' دونوں نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بہ یک زبان بولے ''ایسا کوئی بھی واقعہ پیش نہیں آیا جسے خاص کہا جائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بابو سلطان کی طرف دیکھا اور کہا ''انہیں جانے دیں بابو جی۔ ان کو وقت پر جھنگ پہنچنا ہوگا۔''

ڈرائیور امانت علی نے الجھن زدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں بھی ایک سوال کر سکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں، پوچھو..... کیا پوچھنا ہے تمہیں؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

اس نے پوچھا ''آپ یہ ساری تفتیش کس سلسلے میں کر رہے ہیں۔ کیا کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے؟''

''ہاں بھئی، گڑبڑ ہی سمجھو۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ''جلال پور سے ایک بچہ گم ہوگیا ہے اور مجھے شک ہے کہ اسے یہاں سے اغوا کر کے جھنگ کی طرف لے جایا گیا ہے۔ کچھ شہادتیں ایسی بھی ملیں ہیں کہ اغوا کنندہ کسی بس وغیرہ میں بیٹھ کر لائل پور سے یہاں پہنچا تھا۔ میں اس سلسلے میں یہ ساری پوچھ تاچھ کر رہا ہوں۔''

ان دونوں کی آنکھوں میں تشویش کے سایے لہرانے لگے جس سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہوگیا کہ انہوں نے میری بات کو سچ مان کر اس پر یقین کر لیا تھا۔

☆☆☆

کسی بات کو سچ مان کر اس پر یقین کرنا کوئی آسان کام نہیں!

ایک ذی شعور اور سمجھ دار انسان دیکھنا چاہتا ہے، سننا چاہتا ہے..... پرکھنا اور برتنا چاہتا ہے پھر کہیں جا کر اس کی تسلی ہوتی ہے۔ جب تک تسلی اور اطمینان نہ ہو اسے یقین نہیں آتا۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

میں نے دن میں صدیق مہر سے جو طویل ملاقات کی تھی، اس کا حاصل تو یہی نکلتا تھا کہ اس دہرے قتل کے حوالے سے اس پر شک کیا جائے لیکن اس شک کی بنیاد پر میں اسے مجرم یا قاتل نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے لیکن اس چلتی ہوئی گاڑی کو منزلِ مقصود پر پہنچانے کے لیے ڈرائیور کا ذی فہم اور عقل مند ہونا ضروری ہے۔ یہ وہ گاڑی نہیں کہ جس کے بارے میں آنکھیں بند کر کے کہہ دیا جائے..... نہ انجن کی خوبی، نہ ڈرائیور کا کمال۔ چلی جا رہی ہے سہارے ہوا کے!

میں بھی عقل کے گھوڑے دوڑا رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ صدیق مہر پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجھے کوئی مضبوط ثبوت مل جائے۔ میں اس پر کچا ہاتھ ڈال کر پکی پکائی دیگ کا سواستیاناس نہیں مارنا چاہتا تھا جبھی میں نے اس کی خفیہ نگرانی کے بارے میں سوچا تھا۔

بس اسٹینڈ سے واپس تھانے آنے کے بعد میں نے یوسف خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اور مغرب کی اذان میں دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ میرے بلاوے پر فوراً حاضر ہوگیا اور مستعد انداز میں بولا۔

''جی حکم ملک صاحب!''

یوسف خان رینک کے اعتبار سے ایک کانسٹیبل تھا لیکن صلاحیتوں کے معاملے میں وہ اچھے سے اچھے سب انسپکٹر کو بھی بہت پیچھے چھوڑتا تھا۔ مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور مجھے اس بات پر حیرت تھی، سال ہا سال کی محنت کے باوجود بھی ابھی تک یوسف خان کی ترقی کیوں نہیں ہوئی تھی۔ وہ کانسٹیبل کا کانسٹیبل ہی تھا۔ اس حیرت کے ساتھ ہی میں نے یہ عزم بھی کیا تھا کہ اگر میں کچھ عرصہ اس علاقے میں ٹک گیا تو یوسف خان کے بہتر مستقبل کے لیے ضرور کوشش کروں گا۔

میں نے مختصر الفاظ میں یوسف خان کو بتایا کہ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صدیق مہر کی بڑی باریک بینی سے خفیہ نگرانی کروانا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ہوشیار قسم کا کاٹیبل تھا اور اس نوعیت کے مشنز میں، میں نے اسے خاصا فعال پایا تھا۔ وہ بھیس بدلنے کا بھی ماہر تھا، ازیں علاوہ اسے اردو، پشتو، پنجابی اور سرائیکی پر بھی یکساں عبور حاصل تھا۔ اداکاری کا بھی اسے بہت شوق تھا۔ کسی زمانے میں اس نے فلم اسٹوڈیوز کے بھی چکر کاٹے تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی کہہ لیں یا اس کی بدقسمتی کہ اس صنعت میں اسے قدم جمانے کا موقع نہیں مل سکا تھا حالانکہ میں نے خود چیک کیا تھا، اس اللہ کے بندے میں اداکارانہ صلاحیتیں بہ درجہ اتم موجود تھیں لیکن..... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف قابلیت اور صلاحیت سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ جب تک قدرت ہاتھ نہ تھام لے، کسی بھی شعبۂ زندگی میں نام کمانا ممکن نہیں!

یوسف خان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک زود فہم شخص تھا۔ اسے کوئی بات سمجھانے کے لیے زیادہ محنت یا کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ میری باتیں اس نے پوری توجہ سے سنیں اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''ملک صاحب! آپ صدیق مہر والے معاملے کی جانب سے بالکل بے فکر ہو جائیں۔ سارا کام آپ کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔''

''تم سمجھ رہے ہو نا، اس نگرانی سے میرا مقصد کیا ہے؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''صدیق مہر اپنے گھر کے اندر یا گھر سے باہر جن جن غیر معمولی کاموں میں مصروف پایا گیا، ان کی رپورٹ آپ کو تازہ بہ تازہ ملتی رہے گی۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''گھر سے باہر والی مصروفیات کی نگرانی تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن تم گھر کے اندر اس کی سرگرمیوں پر کیسے نگاہ رکھو گے؟''

''آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں نا ملک صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''مجھے گھروں کے اندر سرنگ لگانا بھی آتا ہے۔ آپ کو نتائج چاہئے نا..... بس، ایک دو دن میں، میں آپ کو حیرت انگیز نتائج دوں گا بہ شرط یہ کہ صدیق مہر واقعی اس دہرے قتل میں ملوث ہوا تو!''

یوسف خان میرا آزمایا ہوا بھروسے کا بندہ تھا لہٰذا یہ ذمے داری سونپنے سے پہلے میں نے اسے صدیق مہر کے بارے میں اپنے خیالات سے تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا، یہ ضروری بھی تھا۔ اس طرح اس کا اپنا ایک ذہن بن جاتا اور وہ حالات و واقعات، مظاہر و مشاہد کو ایک خاص زاویے سے دیکھتا چنانچہ مقصد میں کامیابی فوری اور یقینی ہو جاتی۔

جب میں نے یوسف خان کو اپنے کمرے سے رخصت کیا تو مغرب کی اذان کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے تھانے میں اپنی مصروفیات کا جائزہ لیا اور مجھے ایسا کوئی کام دکھائی نہ دیا جس کے لیے تھانے میں بیٹھنا میرے لیے ضروری ہوتا لہٰذا میں اٹھا اور اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا جو تھانے ہی کی حدود میں عقبی حصے میں واقع تھا۔

جب کبھی تھانے میں مصروفیت زیادہ ہوتی تو میں مغرب کی نماز اُدھر ہی ادا کر لیا کرتا تھا، بہ صورت دیگر اپنے کوارٹر میں آ جاتا تھا جیسا کہ اس روز میں نے کیا تھا۔ میں نے نماز ادا کی، رات کا کھانا کھایا پھر ایک ضروری فائل کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ حبس اور گرمی کافی زیادہ تھی لہٰذا میں نے اپنی چارپائی کوارٹر کے صحن میں بچھا رکھی تھی۔

فائل کے مطالعے کے دوران ہی میں عشا کی نماز کا وقت ہو گیا۔ میں نے اپنے برسوں کے معمول کے مطابق یہ نماز بھی ادا کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کل صبح مجھے لائل پور جانا تھا۔ وہاں کس قسم کی مصروفیت رہتی اور کس نوعیت کے حالات پیش آتے اس بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا، کسی سخت دن کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک بھرپور نیند لینا از حد ضروری تھا۔

اگلی صبح میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو تھوڑی دیر کے بعد ہی بابو سلطان کا کارندہ جھورا آن ٹپکا۔ اس وقت آٹھ بجنے میں ایک دو منٹ ہی باقی تھے۔ بابو سلطان نے گزشتہ روز مجھے بتایا تھا کہ جھنگ سے آنے والی ''پینٹھ بیالی'' آٹھ بجے اسٹینڈ میں پہنچتی تھی۔ جھورا کی آمد کا یہی مقصد تھا کہ مذکورہ بس اڈے میں لگ گئی تھی۔

میں نے گزشتہ رات ہی اپنے عملے کے اے ایس آئی مظفر شاہ کو بتا دیا تھا کہ آئندہ روز مجھے لائل پور جانا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ میرے غیاب میں اسے تھانے کا نظم و نسق کس طرح سنبھالنا تھا لہٰذا مجھے کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔ میں اٹھا اور جھورا کے ساتھ بس اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

جھورا کی عمر بچوں والی نہیں تھی لیکن قد و قامت اور صحت سے وہ بری طرح مار رکھاتا تھا، اسی لیے بابو سلطان اسے ''اوئے کا کا!'' کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ کاکا بہ معنی بچہ! میں اس کا کاکا جھورا کے ہم راہ دو منٹ میں بس اسٹینڈ پہنچ گیا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں کوہستان بس سروس کی ''پینٹھ بیالیس'' کھڑی نظر آگئی۔

میں سیدھا بابو سلطان کے قریب چلا گیا۔ ہم دونوں نے رسمی علیک سلیک کی پھر اس نے بتایا۔ ''ملک صاحب! بس تیار کھڑی ہے، صرف آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔ میں نے آپ کے لیے فرنٹ سیٹ خالی کروادی ہے۔ آپ بس پر سوار ہو کر لائل پور روانہ ہو سکتے ہیں۔''

''میری اس بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے بات کیسے ہوگی؟'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ''کیا آپ نے انہیں میرے مقصد سے آگاہ کر دیا ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میں نے صرف انہیں اتنا بتایا ہے کہ آپ ان سے کل والے پھیرے کے حوالے سے چند اہم سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لائل پور پہنچ کر ان کے پاس کافی وقت ہوگا۔ آپ پورے اطمینان کے ساتھ جو پوچھنا چاہیں، ان سے پوچھ لیں۔''

بابو سلطان کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔

وہ فوراً میری کیفیت کو بھانپ گیا، جلدی سے بولا ''اگر آپ کا حکم ہو تو میں بس کو ادھر ہی رکوالیتا ہوں۔ آپ پہلے اپنی تفتیش مکمل کر لیں، اس کے بعد ہی بس آگے بڑھے گی۔''

میرے خیال میں یہی مناسب ہوگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس پوچھ گچھ میں کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس کا تعلق یہیں جلال پور سے ہو..... اور وہ بات اتنی اہم، اتنی سنسنی خیز ہو کہ میں لائل پور جانے کے بجائے یہیں رک جانے کا فیصلہ کر لوں!''

''ہاں..... یہ تو ہوسکتا ہے۔'' وہ خیال افروز انداز میں بولا پھر اس نے ایک مرتبہ پھر مخصوص صدا لگائی۔ ''اوئے کاکا جھورا! پینٹھ بیالی کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو تو ذرا ادھر بھیج۔''

چند لمحات کے بعد ڈرائیور سلیم اور کنڈیکٹر مشتاق میرے سامنے موجود تھے۔ یہ دونوں کوہستان بس سروس کی اس گاڑی کے ساتھ ہوتے تھے جو لائل پور سے جھنگ جاتے ہوئے لگ بھگ دو بجے دوپہر جلال پور سے گزرتی تھی۔ اس اسٹاپ پر وہ تقریباً دس منٹ ٹھہرتی تھی۔

بابو سلطان نے سلیم اور مشتاق کو چونکہ پہلے ہی میرے بارے میں بتا دیا تھا لہٰذا ان کے چہروں پر مجھے وہ خوف و ہراس دکھائی نہ دیا جو ان سے پہلے امانت علی اور عباس احمد کی شکلوں پر نظر آیا تھا۔ میں نے ان سے بھی وہی سیدھے سادے سوالات کیے جو کل شام میں نے بتی پیتی کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے کیے تھے۔ انہوں نے پوری توجہ سے میرے سوالات سنے اور سوچ سمجھ کر ان کے جوابات دیے۔

دس منٹ کی ذہنی مشقت کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال مجھے لائل پور جانے کا ارادہ ملتوی کر دینا چاہیے۔ بالآخر میں اس کیس کا ایک سرا پکڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سلیم اور مشتاق کے اس انٹرویو سے ایک سنسنی خیز حقیقت سامنے آئی تھی۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ کل لائل پور سے ایک دراز قامت صحت مند آدمی ان کی بس میں سوار ہو کر جلال پور آیا تھا اور اسے کسی خضر چاچا کے گھر جانا تھا۔

خضر چاچا کا ذکر مجھے بے چین کر دینے کے لیے کافی تھا!

میں نے چوکنا نظروں سے باری باری مشتاق اور سلیم کے چہروں کا جائزہ لیا پھر ڈرائیور سلیم سے پوچھا۔ ''کیا اس بندے نے تمہیں یہ بات بتائی تھی کہ وہ کسی خضر چاچا کے گھر جانا چاہتا ہے یا.....''

''نہیں تھانے دار صاحب!'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے حنیفو سے باتیں کرتے سنا تھا۔''

''یہ حنیفو کون ہے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

ڈرائیور سلیم نے جواب دیا۔ ''حنیفو کا اصل نام تو حنیف ہے جی۔ اس کی اِدھر بس اسٹاپ پر شربت کی دکان ہے۔ کل جب دو بجے دوپہر ہماری بس یہاں پہنچی تو مجھے شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ ہمارا یہاں دس منٹ کا اسٹاپ ہوتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ حنیفو کی دکان سے ٹھنڈا شربت پینا چاہیے۔ میں دکان پر پہنچا تو اس بندے کو حنیفو سے باتیں کرتے سنا۔ وہ حنیفو سے خضر چاچا کے گھر کا پتا پوچھ رہا تھا۔ یہ بندہ چوں کہ ہماری بس میں بیٹھ کر آیا تھا، اس لیے اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔''

''ذرا اس کے حلیے اور قد کاٹھ کے بارے میں بتاؤ؟'' میں نے سلیم سے پوچھا۔

اس نے جواباً بتایا ''وہ لمبا چوڑا اور صحت مند شخص تھا۔ اس نے ہلکی ہلکی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی جیسے آٹھ دس دن کا شیو بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور کان بڑے بڑے تھے۔ سر کے بالوں میں اس نے سائیڈ مانگ نکالی ہوئی تھی.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں اس بندے کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں جانتا تھانے دار صاحب!''

''یہ بھی کافی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر سلیم سے پوچھا۔ ''کیا اس کے نام وغیرہ کا کچھ پتا ہے تمہیں، میرا مطلب ہے..... جب وہ حنیفو سے باتیں کر رہا تھا تو اس دوران میں کہیں اس کا نام بھی آیا تھا؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

''جب میں حنیفو کی دکان پر پہنچا تو ان کے درمیان صرف یہی بات ہوئی تھی پھر وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ میں نے ایک گلاس صندل کا اور ایک گلاس بزوری کا شربت اپنے معدے میں اتارا، حنیفو کو پیسے دیے اور اپنی بس میں آ بیٹھا۔''

وہ تھوڑا متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بولا ''اس کے بعد ہم جھنگ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔''

میں نے ایک دو سوالات کے بعد ''پنٹھ بیالی'' کے ڈرائیور سلیم اور کنڈیکٹر مشتاق کو فارغ کر دیا تو سلیم سوالیہ نظروں سے بابو سلطان کو دیکھنے لگا۔ بابو فوراً اس کی نگاہ کا مفہوم سمجھ گیا اور مجھ سے پوچھنے لگا۔ ''ملک صاحب! کیا آپ لائل پور جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

میں نے نفی میں گردن ہلائی اور جواب دیا ''فی الحال نہیں..... اگر ضرورت پڑی تو کل دیکھوں گا۔'' پھر میں نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ میری وجہ سے اپنا راستہ کھوٹا نہ کرو۔ بس کے مسافر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ تم جا سکتے ہو۔''

ان دونوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور بابو سلطان کے ''دفتر'' سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بابو کا شکریہ ادا کیا، اس سے گرم جوش مصافحہ کیا اور حنیف عرف حنیفو کی دکان کی جانب بڑھ گیا۔ بابو سلطان کی زبانی مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حنیفو کا تعلق جلال پور ہی سے تھا۔ وہ روزانہ صبح اپنی سائیکل پر سوار ہو کر گھر سے بس اڈے پہنچتا اور پھر شام کو واپس گھر چلا جاتا تھا۔ جب میں حنیفو کی دکان پر پہنچا تو وہ دکان کھول ہی رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ فوراً تین شین ہو گیا۔

''آئیں جی..... آئیں تھانے دار صاحب!'' وہ اپنی دکان میں سے لکڑی کا ایک اسٹول نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میری خوش قسمتی کہ آپ اِدھر آئے..... تشریف رکھیں!''

یہ اس کی دکان کا اکلوتا اسٹول تھا جس پر بیٹھ کر وہ دن بھر ٹھنڈا ٹھار شربت بیچتا تھا۔ شربت نوش کرنے والے گاہک کھڑے ہو کر ہی اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ حنیفو نے ایک کپڑے سے مذکورہ اسٹول کو جھاڑا اور بڑے ادب سے میرے سامنے رکھ دیا۔

میں اس اسٹول پر تشریف رکھ چکا تو حنیفو نے کہا۔ ''بس ایک منٹ تھانے دار صاحب، میں ذرا شربت کی بوتلیں وغیرہ سیٹ کر لوں پھر آپ کے لیے سونے اور چاندی کے ورق والا خاص شربت بناتا ہوں۔''

''میں یہاں شربت پینے نہیں آیا حنیفو!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا ''مائی باپ! میری دکان پر تو صرف شربت ہی ہے۔ میں نے تو اور کچھ بھی نہیں رکھا ہوا.....''

''مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں حنیفو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میں دراصل تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ دکان کی سیٹنگ تم بعد میں کرتے رہنا، پہلے میرے سوالوں کے جواب دو۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے اسے پرسوں والے واقعے کے بارے میں مختصراً بتایا۔ لائل پور سے جلال پور پہنچنے والا وہ دراز قامت مسافر اسے فوراً یاد آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''کیا اس بندے نے اپنا نام وغیرہ بھی بتایا تھا؟''

''نہیں جی۔'' حنیفو نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

''اس نے صرف مجھ سے یہ پوچھا کہ جلال پور میں خضر چاچا کا گھر کس طرف ہے۔ میں نے اسے چاچا کے گھر کا پتا اچھی طرح سمجھا دیا، اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اس کچے راستے کی جانب بڑھ گیا جو سیدھا گاؤں کو جاتا ہے۔''

''کیا تم نے پہلے اس بندے کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب، وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ جلال پور کا رہنے والا نہیں۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''جلال پور میں بسنے والے بچے بچے سے تم اچھی طرح واقف ہو۔''

''ہاں جی۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا ''اگر وہ اِدھر ہی کا رہنے والا ہوتا تو چاچا خضر کے گھر کا پتا کیوں پوچھتا۔ خضر چاچا کو تو پورا جلال پور جانتا ہے.....'' وہ ایک دم بے حد افسردہ ہو گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بے چارے چاچا خضر اور چاچی سلیمہ کے ساتھ بہت برا ہوا جناب۔ پتا نہیں، کس کم بخت نے انہیں قتل کر دیا۔ وہ دونوں میاں بیوی تو کسی کے لینے دینے میں بھی نہیں تھے۔''

میں نے اندازہ لگا لیا کہ حنیفو شربت فروش سے مزید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی اہم بات معلوم نہیں کی جا سکتی۔ حنیفو اور پینٹھ بیالی کے ڈرائیور سلیم کے مشترکہ بیان کے مطابق، وہ نامعلوم دراز قد بندہ آٹھ نمبر کی سہ پہر لائل پور سے قصبہ جلال پور پہنچا تھا۔ اس سے پہلے اسے جلال پور میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ آٹھ اور نو نمبر کی درمیانی شب خضر چاچا اور اس کی بیوی سلیمہ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اگلی صبح یعنی نو نمبر سے میں تفتیش اور تفتیش کے میدان میں اتر آیا تھا اور آج دس نمبر کی صبح تھی۔ اگر فرض کر لیا جاتا کہ وہی دراز قد نامعلوم شخص ان میاں بیوی کا قاتل تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آٹھ نمبر کی سہ پہر سے لے کر آدھی رات تک اس نے وقت کہاں گزارا.....؟ ازیں علاوہ، کیا وہ اس واردات کے بعد آدھی رات ہی کو جلال پور سے روانہ ہو گیا یا اگلی صبح رخصت ہوا۔ اگر اگلی صبح یعنی نو نمبر کو گیا تو پھر رات کا باقی حصہ اس نے کہاں بسر کیا؟ ان سوالات سے ایک اور سوال بھی ابھر کے سامنے آتا تھا..... جلال پور میں ایسا کون ہے جس نے اس نامعلوم شخص کی میزبانی کے فرائض انجام دیے؟

اگر اس ''قدرداں'' میزبان کا پتا چل جاتا تو قاتل کی شناخت اور گرفتاری آسان ہو جاتی۔ میں نے حنیفو کو فارغ کرنے سے پہلے آخری سوال کیا۔

''وہ بندہ پرسوں دوپہر کے بعد یہاں پہنچا اور تم سے چاچا خضر کے گھر کا پتا پوچھ کر گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔ کیا اس کے بعد بھی تم نے اسے گاؤں میں یا اِدھر بس اسٹاپ پر کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں جناب.....!'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں واپس تھانے آ گیا۔

☆☆☆

اے ایس آئی مظفر شاہ مجھے دیکھتے ہی چونک اٹھا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! میں تو توقع کر رہا تھا کہ آپ رات تک ہی لائل پور سے واپس آئیں گے۔ کیا اُدھر جانے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے؟''

''ظاہر ہے، پروگرام کی منسوخی کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ایسا کوئی تیز رفتار ذریعہ آمدورفت تو ابھی تک ایجاد نہیں ہوا کہ اتنی سی دیر میں، میں لائل پور سے ہو کر واپس بھی آ جاتا۔ بہرحال.....'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''شاہ جی! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ایک دن کی تھانے داری کرنے کا موقع نہ مل سکا!''

''اوہ!..... کیوں شرمندہ کرتے ہیں جناب!'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ''اس تھانے کے ان چارج تو آپ ہی ہیں۔ مجھے تو اپنی غیر موجودی میں آپ نے.....!''

''اس وضاحت کی ضرورت نہیں شاہ جی! میں نے تو ایسے ہی شغلاً ایک بات کہہ دی تھی۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''وہ کانسٹیبل یوسف خان تو نہیں آیا؟''

میں نے گزشتہ رات یوسف خان کو صدیق مہر کی خفیہ نگرانی کا کام سونپا تھا۔ اب اسے زیادہ وقت تھانے سے باہر ڈیوٹی دینی تھی۔ میرے ذہن میں اس وقت خضر چاچا، سلیمہ اور دراز قامت اجنبی کے میزبان کے حوالے سے مختلف سوالات سر ابھار رہے تھے اور ایک عجیب سی کھچڑی پک رہی تھی۔ اس لیے میں نے مظفر شاہ سے یوسف خان کے بارے میں پوچھ لیا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

''ملک صاحب! وہ آپ کے روانہ ہونے کے فوراً بعد تھانے آیا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ آپ جا چکے ہیں تو وہ چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''آپ اپنی معمول کی ڈیوٹی پر لگ جائیں اور کسی بندے کو بھیج کر یوسف خان کو بلا لیں۔ میں دیکھوں تو سہی، آپ کے اندازے کے مطابق، مجھ سے کون سی ضروری بات کرنا چاہتا ہے!''

اے ایس آئی میرے کمرے سے نکل گیا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد یوسف خان میرے سامنے موجود تھا۔ وہ مظفر شاہ کی تلاش کے نتیجے میں نہیں ملا تھا بلکہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے خود ہی اِدھر آ رہا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ لائل پور نہیں گئے؟''

''گیا تھا اور پلک جھپکتے میں واپس بھی آ گیا۔'' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، تم پہلے بھی مجھے تلاش کرتے ہوئے اِدھر آئے تھے حالانکہ تمہیں تو میں نے رات ہی کو بتا دیا تھا کہ صبح مجھے لائل پور جانا ہے اور واپسی شام تک ہو گی۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''خیریت تو ہے نا..... تم بڑے پُرجوش نظر آ رہے ہو، کوئی خاص خبر ہے؟''

''بہت ہی خاص ملک صاحب!'' وہ آواز کو دھیما

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھتے ہوئے پُراسرار لہجے میں بولا۔ ''اگرچہ مجھے پتا تھا کہ آپ کو آج لائل پور جانا ہے لیکن بات اتنی اہم ہے کہ میں نے سوچا، شاید ابھی آپ تھانے سے نہ نکلے ہوں، اس لیے اِدھر آ گیا تھا۔ مظفر صاحب نے بتایا کہ آپ تھانے سے روانہ ہو گئے ہیں تو میں سیدھا بس اسٹینڈ پہنچ گیا۔ بابو سلطان سے آپ کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا آپ نے لائل پور جانے کا پروگرام کینسل کر دیا ہے اور حنیفو شربت والے سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ میں حنیفو کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا، آپ واپس تھانے آ گئے ہیں..... اور میں بھی گھوم پھر کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

میں نے اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹکائیں اور آگے کو جھکتے ہوئے کانسٹیبل سے دریافت کیا۔ ''یہ تفصیل تو رہی ایک طرف، تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ خاص خبر کون سی ہے؟..... جس نے تمہیں میری تلاش میں دوڑایا تھا۔''

وہ رازدارانہ انداز میں بولا ''اس خبر کا تعلق صدیق مہر کے ایک خفیہ مہمان سے ہے!''

''خفیہ مہمان.....؟'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے اسے گھورا۔

اس نے بہ دستور دھیمے لہجے میں بتایا۔ ''صدیق مہر نے اپنی زمینوں پر ایک چھوٹا سا ڈیرا بنایا ہوا ہے جس کی دیکھ بھال داور نامی ایک بندہ کرتا ہے۔ داور زمین وغیرہ کی نگرانی کے لیے اُدھر ڈیرے پر ہی رہتا ہے۔ میں نے جس خفیہ مہمان کا ذکر کیا ہے نا، وہ ایک رات اس ڈیرے پر گزار کر گیا ہے.....!''

''بات کو گھما پھرا کر نہیں کرو یوسف خان!'' میں نے اس کا بیان مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''سادہ الفاظ مجھے بتاؤ کہ وہ مہمان کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور ایک رات صدیق مہر کے ڈیرے پر گزارنے کے بعد وہ کہاں چلا گیا؟''

لائل پور سے آنے والے دراز قامت اجنبی کے حوالے سے میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی اور یوسف کی بات سن کر میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ وہ یقیناً اسی شخص کا تذکرہ کر رہا ہے۔ وہ مجھے بتانے لگا۔

''ملک صاحب! یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ مہمان کہاں سے آیا تھا اور واپس کہاں چلا گیا؟ میں نے جو ''تفتیش'' کی ہے اس کے مطابق، آٹھ مئی کی دوپہر کے بعد یعنی پرسوں وہ شخص جلال پور پہنچا تھا اور اس نے سیدھا صدیق مہر کے ڈیرے کا رخ کیا تھا۔ وہ صدیق مہر کا ایک ایسا مہمان تھا جسے صدیق مہر نے اپنے گھر نہیں آنے دیا بلکہ خود ڈیرے جا کر اس

گھر صحرا سے بدتر ہے

جو اولاد نہیں

اِس دنیا میں لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں مگر اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی گناہ ہے۔ خاتون کو اندرونی کوئی مرض ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور نایاب قیمتی اجزاء سے ایک خاص قسم کا ایسا بے اولادی کورس ایجاد کیا ہے جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے ہاں بھی ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔

آج ہی فون پر اپنے تمام حالات سے آگاہ کریں اور گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP دی پی بے اولادی کورس منگوالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع وشہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے دوپہر 2 بجے تک

عصر 4 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ کا کام فون کرنا

دوائی آپ تک پہنچانا ہمارا کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ملاقات کی۔ صدیق مہر اس دن کوئی گھنٹا بھر ڈیرے پر رہا پھر اپنے گھر واپس آ گیا۔ اگلی صبح وہ مہمان نہایت ہی خفیہ طور پر غائب ہو گیا۔ میں یہی بات آپ کو بتانا چاہ رہا تھا جناب!''

''کیا اس رات ڈیرے کا نگراں داور بھی ڈیرے پر ہی رہا تھا؟'' کانسٹیبل کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' یوسف نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''داور اور اس بندے نے ایک ساتھ وہ رات ڈیرے پر گزاری تھی بلکہ جب صدیق مہر اپنے مہمان سے ملنے ڈیرے پر پہنچا تو اس دوران میں بھی داور وہیں موجود رہا تھا۔''

''ظاہر ہے، تم نے اس شخص کو تو نہیں دیکھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس کے حلیے اور قد و قامت کے بارے میں تو کچھ پتا چلا ہو گا؟''

یوسف خان نے ''جی، ملک صاحب.....'' کہتے ہوئے مجھے بتایا شروع کیا تو میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اونچا قد، صحت مند وجود، ہلکی ہلکی داڑھی۔ بڑے بڑے کان، ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور بالوں میں سائیڈ کی مانگ.....!

''بس، یوسف خان!'' میں نے ہاتھ کا مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا ''میں اس بندے کی تہ میں پہنچ گیا ہوں بلکہ..... یوں سمجھو کہ میں نے خضر چاچا اور اس کی بیوی کے قاتل کا سراغ لگا لیا ہے!''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اسے، پینٹھ بیالی کے ڈرائیور سلیم سے ہونے والی اپنی گفتگو کے بارے میں مختصراً بتایا پھر تحکمانہ انداز میں کہا ''تم فوراً ایک کانسٹیبل کو لے کر صدیق مہر کے ڈیرے پر پہنچو اور پہلی فرصت میں داور کو گرفتار کر کے یہاں لے آؤ۔''

''اور صدیق مہر جناب.....؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''وہ تمہارے بس کا نہیں ہے۔'' میں نے پُرعزم انداز میں کہا ''اس کو لینے کے لیے میں خود اس کے گھر جا رہا ہوں۔''

اب اس کیس کی فضا بڑی واضح ہو گئی تھی۔ بس تھوڑی قانونی کارروائی کی ضرورت باقی تھی۔ داور اور صدیق مہر کو جب تفتیش کی چکی میں ڈالا جاتا تو سچ بولنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ ہوتا۔ پولیس کو اپنی منزل کا تعین کرنے کے لیے ایک موہوم سے سراغ کی ضرورت ہوتی ہے اور مجھے وہ سراغ مل گیا تھا۔ میں اس سراغ کی انگلی تھام کر داور اور صدیق مہر کے راستے اس اجنبی شخص تک رسائی حاصل کر سکتا تھا جو صدیق مہر کا خفیہ مہمان تھا لیکن میری اور قانون کی نظر میں ایک شقی القلب قاتل تھا۔

مجھے صدیق مہر کی زبان کھلوانے کے لیے زیادہ ''محنت'' نہیں کرنی پڑی کیونکہ اس کا نمک خوار داور بہت ہی بودا آدمی ثابت ہوا تھا۔ تھانے کی ابتدائی خاطر تواضع ہی نے اس کا کام کر دیا اور اس نے سب کچھ بک دیا۔

اس دراز قامت شخص کا نام اکرام جٹ تھا اور اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، وہ صدیق مہر کے حکم پر ہی کیا تھا۔ صدیق دونوں مقتولین کو اس صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتا تھا کہ کسی بھی حوالے سے اس پر شک نہ جائے۔ اسی لیے اس کام کے لیے اس نے لائل پور کے ایک جرائم پیشہ شخص اکرام جٹ سے یہ دہرا قتل کروایا تھا۔ اکرام جٹ نے بس اسٹاپ پر خضر چاچا کے بارے میں پوچھ کر یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ انہی سے ملنے آیا ہے۔

داور کے حلفیہ بیان کے بعد، صدیق مہر کے لیے فرار کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی لہٰذا اس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ ازاں بعد اس کی نشان دہی پر میں نے لائل پور کے بدنام مجرم اکرام جٹ کو بھی گرفتار کر لیا۔

صدیق مہر نے بڑی چالاکی سے ایک خونیں کھیل کھیلا تھا۔ اس نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے دو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا، صرف چار ایکڑ اراضی کے حصول کے لیے۔ زمین کا یہ معمولی سا ٹکڑا اس کے لیے انا کا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا اور..... انا کے کھیل اتنے ہی خطرناک اور عبرت انجام ہوا کرتے ہیں۔ اس بدبخت کی چال بارود کے ڈھیر میں کسی چنگاری کی طرح گری اور بہت کچھ جل کر خاکستر ہو گیا۔ اس بارودی دھماکے نے دو معصوم انسانوں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

جو شخص دوسروں کی زندگی میں اندھیرا بھرتا ہے، وہ کبھی سکھی نہیں رہ سکتا۔ داور نے وعدہ معاف گواہ بن کر اپنی جان بچالی تھی لیکن میں نے اکرام جٹ اور اس کے آقا صدیق مہر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر ہی دم لیا۔

کاش انسان ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار ہو جائے کہ اگر زندگی میں سب کچھ اس کے حسبِ خواہش نہ ہو تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا!

(تحریر: حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راضی برضا

ملک صفدر حیات

دولت واقتدار دونوں اس دنیا کے باسیوں کے لیے سخت امتحانات ھیں۔ یہ نہ ھوں تو ترستا بلکتا انسان کچھ بھی کرنے پہ آمادہ ھوجاتا ھے اور جب ان کی فراوانی ھوتب بھی ان کی موجودگی حضرت انسان کو نت نئی راھیں سجھاتی ھے اور ضروری نہیں کہ ھر راہ سیدھی ھی ھو وہ راستہ ایسا بھول بھلیاں بھی ھوسکتا ھے جس سے انسان کبھی واپس نہیں لوٹ پاتا۔

جوانی کے نشے میں مست قابل نفرت کردار کا فسانہ ملک حیات کی ڈائری سے انتخاب

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب سیلاب نے سرزمین پنجاب کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا۔ پانچ دریاؤں کی دھرتی اکثر وبیش تر موسم برسات میں سیلاب کی مہربانیوں کا نشانہ تو بنتی ہی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی اس مہربان مہمان کی آمد ایسی تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے کہ میزبان دھرتی کو سنبھلنے اور سدھرنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ اس دوران میں ایسے سنسنی خیز اور عبرت ناک واقعات بھی جنم لیتے ہیں کہ جن کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔

وہ سال بھی اسی نوعیت کے واقعات کا منظرنامہ تھا۔

ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک چونکا دینے والی اطلاع میری منتظر تھی۔ کانسٹیبل حق نواز نے میرے کمرے میں آکر بتایا کہ کھیتوں میں سے ایک جوان لڑکی کی لاش ملی ہے!

''کس کے کھیتوں میں؟'' میں نے دریافت کیا۔

کانسٹیبل نے جواب دیا۔'' حاجی مبارک کے کھیتوں میں جناب!''

حاجی مبارک اسی علاقے کا رہائشی ایک چھوٹا زمیں دار تھا اور اس کی زمین دریا کے کنارے سے لگی ہوئی تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے پوچھا'' اس واقعے کی اطلاع کس نے دی ہے؟''

''سراج دین لاش کے بارے میں اطلاع دینے تھانے آیا تھا'' کانسٹیبل نے بتایا'' وہ بھی اس قصبے میں رہتا ہے۔ وہ صبح کھیتوں میں سے گزر کر دریا کی طرف جارہا تھا تو اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ سیلاب زدہ زمین پر ایک جوان لڑکی کو بے سدھ پڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ مذکورہ لڑکی کے قریب چلا گیا اور جبھی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی زندگی کی رونق سے خالی ہوچکی ہے۔ اس کے بعد وہ سیدھا تھانے چلا آیا تھا۔''

کانسٹیبل حق نواز نے ایک ہی سانس میں لڑکی کی لاش اور اطلاع کنندہ کے بارے میں تفصیل بیان کردی تو میں نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔'' سراج دین اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ تو چلا گیا جناب!'' کانسٹیبل نے بتایا۔

''کمال ہے!'' میں نے تیز نظروں سے کانسٹیبل کو گھورا'' مجھ سے ملے بغیر وہ کیسے چلا گیا؟''

''بات دراصل یہ ہے جناب'' کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا'' سراج کی بیوی زچگی کے عمل سے گزرنے والی ہے۔ وہ دریا کے اس پار ایک دائی کے پاس جارہا تھا۔ کھیتوں میں پڑی لڑکی کی لاش دیکھ کر وہ مجبور ہوگیا کہ پہلے اس واقعے کی تھانے میں اطلاع دے، اس کے بعد دائی کو بلانے کے لیے دریا کی دوسری جانب جائے۔ اس کے جذبے نے مجھے بے حد متاثر کیا لہٰذا میں نے اسے فوراً جانے کی اجازت دے دی۔'' کانسٹیبل سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔'' سراج دین نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دائی کو اپنی بیوی کے پاس چھوڑ کر دوبارہ تھانے آئے گا پھر ہم اس سے ضروری پوچھ کچھ کرسکتے ہیں!''

''ابھی قیامت کو آنے میں کافی دیر لگے گی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قیامت.....؟'' اس نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے اس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا'' حق نواز! میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ جب تک انسانیت سے بھرپور کوئی ایک انسان بھی اس روئے زمین پر باقی ہے، قیامت نہیں آسکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اچھے لوگوں کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے لیکن میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں، ابھی اس دنیا میں ایسے نیک دل، ہم درد اور مہربان افراد موجود ہیں جن کے دم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسانیت کا بھرم قائم ہے اور..... سراج دین بھی انہی میں سے ایک ہے۔''

میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا ''دیکھو، اس اللہ کے بندے کی گھر والی بچے کو جنم دینے والی ہے۔ وہ اس عمل کو آسان اور محفوظ بنانے کے لیے دریا کے اس پار سے ایک دائی کو لینے جا رہا تھا لیکن انسانی... ہمدردی اور اخلاقی فرض نے اسے روک لیا پہلے اس نے تھانے میں اطلاع دی پھر اپنے مقصد کے حصول کے لیے آگے بڑھا۔ دوسروں کے کام آنا ہی انسانیت کی معراج ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' حق نواز تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''میں سراج کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ واقعی، بڑا ہی باہمت بندہ ہے۔''

میں نے پوچھا ''چودھری فرید کہاں ہے؟''

فرید نامی یہ کانسٹیبل میرے تھانے کے عملے میں شامل تھا۔ اس کا کسی چودھری خاندان سے کبھی کوئی تعلق رشتہ نہیں رہا تھا، اس کے باوجود بھی اس کے نام کے ساتھ ''چودھری'' کا لفظ جڑا ہوا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ کانسٹیبل فرید کو ہر کام، ہر معاملے میں پیش پیش رہنے کا بہت شوق تھا۔ وہ خود کو لیڈر سمجھتا تھا۔ اس کے اسی چودھرانہ اسٹائل نے اسے ''چودھری فرید'' مشہور کر دیا تھا۔ مذاق مذاق میں جوڑا جانے والا یہ لفظ اب اس کے نام کا حصہ بن چکا تھا۔

حق نواز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا ''ملک صاحب! فرید تو امدادی پارٹی کے ساتھ گیا ہوا ہے۔''

اس سال سیلاب نے جس طوفانی انداز میں تباہ کاری مچائی تھی اس کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت کی جانب سے ہر علاقے کے تھانے کو یہ احکام موصول ہوئے تھے کہ وہ امدادی پارٹیاں تشکیل دیں جو گرد و نواح کے علاقوں کا گشت کریں اور سیلاب زدگان کی ہر ممکنہ مدد اور بحالی کے لیے کام کریں چناں چہ میں نے اپنے تھانے کے عملے میں سے تین افراد کی ایک امدادی پارٹی ترتیب دی تھی جن کی قیادت کانسٹیبل چودھری فرید کے ذمے تھی۔ یہ لوگ علاقے کے افراد کے ساتھ مل کر فوری امدادی کاموں میں مصروف تھے لہٰذا ان تینوں کا زیادہ تر وقت تھانے سے باہر ہی گزرتا تھا۔ فرید کے ساتھ دوسرے دو کانسٹیبل آفتاب اور منظور تھے۔

پہلے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں فرید کو اپنے ہم راہ جائے وقوعہ پر لے جاؤں گا مگر اس کی عدم دستیابی کو دیکھتے ہوئے میں نے حق نواز کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے سے اسے آگاہ بھی کر دیا۔ میرا اشارہ پاتے ہی وہ ضروری تیاری میں مصروف ہو گیا۔

ٹھیک دس منٹ کے بعد ہم جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

حاجی مبارک کی زمین دریا کے کنارے سے لگی ہوئی تھی۔ ایسی زمین کی زرخیزی میں کوئی کلام نہیں ہوتا لیکن جب کبھی بھی دریا میں طغیانی آجائے اور اس کا پیمانہ چھلک جائے تو سب سے زیادہ نقصان بھی اسی قطعۂ اراضی ہی کو پہنچتا ہے۔ یہ تو ایک آفاقی فارمولا بھی ہے۔ انسان کو سب سے زیادہ فائدہ جس شے سے حاصل ہو رہا ہو، اگر وہ شے اس سے بگڑ جائے تو سب سے زیادہ ضرر رساں بھی وہی ثابت ہوتی ہے!

اس سیلاب نے دریا کے کناروں کو مختلف مقامات سے اس قابل نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ دریائی پانی پر قابو رکھ سکیں۔ دریا کے کنارے دو مضبوط اور توانا بازوؤں کے مانند ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ بہنے والے پانی کو اپنی آغوش میں سمیٹے رکھتا ہے۔ اگر کسی شخص کے دونوں بازو کندھوں سے کٹ جائیں تو اپنی آغوش میں موجود کسی شے پر گرفت قائم رکھنا اس کے بس میں نہیں رہتا۔ کچھ ایسا ہی حال اس دریا کا بھی تھا!

سیلاب نے دریا کے اس کنارے کو بری طرح پچھاڑ ڈالا تھا جو ہمارے علاقے سے لگا ہوا تھا۔ حاجی مبارک کی اراضی چوں کہ دریا کے کنارے سے لگی ہوئی تھی لہٰذا اسے اچھا خاصا نقصان پہنچا تھا۔ اس جوان لڑکی کی لاش اسی زیرِ آب زمین پر پڑی ملی تھی۔ چند منٹ کے بعد ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

ہم سے پہلے بھی چند افراد وہاں موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ میں مذکورہ لاش کے قریب چلا گیا اور باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس بات کا یقین مجھے پہلی نظر ہی میں ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی زندگی سے بہت دور جا چکی تھی۔

میں نے اس کی لاش کو الٹ پلٹ کر ضروری امور کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی موت واقع ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس نے گزشتہ شام یا رات کے ابتدائی حصے میں موت کو گلے لگایا ہو۔ اس کے بدن پر بہ ظاہر ایسی کوئی چوٹ نظر نہیں آ رہی تھی جسے اس کی موت کا سبب سمجھا جاتا۔ صحیح صورتِ حال کا اندازہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد ہی لگایا جا سکتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ میں نے موقع پر موجود نصف درجن افراد سے باری باری اس متوفی لڑکی کے بارے میں سوال کیا۔

ان سب کا تعلق اسی گاؤں یعنی موضع چک جمال سے تھا۔ انہوں نے مختلف الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے ایک جیسا جواب دیا..... اور وہ جواب یہ تھا کہ متوفی بدنصیب چک جمال کی رہنے والی نہیں تھی!

یہ جواب خاصا فکر انگیز اور تشویش ناک تھا۔ اگر وہ چک جمال سے تعلق نہیں رکھتی تھی تو پھر کہاں سے آئی تھی؟ اسے کس نے موت کے حوالے کیا اور کیوں؟

یہ تمام وہ سوالات تھے جن کے جوابات مجھے تلاش کرنے تھے تاکہ اس اجنبی لڑکی کی پُراسرار موت کا معما حل کیا جا سکے۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ ایک حسین وجمیل لڑکی تھی۔ اس کی عمر بھی میرے محتاط اندازے کے مطابق، انیس بیس سال ہوگی۔

ایک خطرناک سوال میری سوچ کو خاصا منتشر اور بے چین کر رہا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ وہ چک جمال کی رہنے والی نہیں تھی، ایک خاص قسم کی تشویش نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس بات کے امکانات بہت کم تھے کہ اس... بدنصیب کی موت طبعی ہوئی ہوگی۔ اگرچہ اس کے بدن کے کھلے حصوں پر مجھے ایسے آثار دکھائی نہیں دیے تھے جس سے یہ اندازہ قائم کیا جاتا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ہاں پوسٹ مارٹم سے حالات کی اصلی صورت سامنے آسکتی تھی۔ فی الوقت میں اس اجنبی لڑکی کی موت کے حوالے سے کوئی حتمی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے سے پہلے میں نے گاؤں سے مزید افراد کو جائے وقوعہ پر طلب کیا اور ان سے متوفی لڑکی کے بارے میں استفسار کیا۔ دراصل میں اپنے طور پر یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی وہ لڑکی چک جمال رہنے والی نہیں!

چک جمال میں بسنے والے متعدد معتبر افراد نے جب مجھے یقین دلایا کہ اس لڑکی کا ان کے گاؤں سے کوئی تعلق نہیں تو میں نے جلدی جلدی موقع کی ضروری کارروائی نمٹائی اور مذکورہ لڑکی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔

جائے وقوعہ پر موجود افراد سے میں نے ضروری پوچھ گچھ کر لی تھی اور اس کوشش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا، نہ ہی کوئی ایسا اشارہ مل سکا جو اس لڑکی کی شناخت یا موت کے معاملے پر روشنی ڈال سکتا۔ حاجی مبارک بھی وہاں موجود تھا۔

اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ''ملک صاحب! یہ لڑکی مجھے کسی اور علاقے کی لگتی ہے!''

''ظاہر ہے حاجی صاحب!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''جب وہ اس علاقے کی نہیں تو کسی دوسرے علاقے ہی کی ہوگی۔''

وہ دریا کے ٹوٹے ہوئے کنارے کی جانب دیکھنے لگا۔ میں اس کی نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''حاجی صاحب! یہ نکتہ ہے میرے ذہن میں بھی۔ آپ فکر نہ کریں، انشاء اللہ! میں اسے ضرور چیک کروں گا!''

''جی.....!'' وہ الجھن زدہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی مبہم بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''حاجی صاحب! یہ آپ کی زمین کے ساتھ ساتھ جو دریا رواں ہے نا، اس نے اس سال کھڑی فصلوں کے علاوہ خالی کھیتوں کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے..... خاص طور پر وہ مقامات جہاں جہاں سے دریا کا کنارہ ٹوٹا ہے، امنڈ آنے والے سیلابی ریلوں نے تو قیامت ہی برپا کر دی ہے۔ آپ کی زمین بھی ایسے ہی متاثرہ قطعات اراضی میں شمار ہوتی ہے۔ سیلاب کا پانی اپنے ساتھ پتا نہیں، کون کون سی چیزوں کو بہا لے آیا ہے۔ اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ یہ اجنبی لڑکی بھی دریا میں بہتے ہوئے کہیں اور سے یہاں پہنچی ہو لہٰذا.....!'' میں نے سانس درست کرنے کے لیے توقف کیا پھر لمحاتی خاموشی کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس دریا کے ساتھ ساتھ بالائی جانب پائے جانے والے تمام گاؤں دیہات کو چیک کروں گا۔ ہوسکتا ہے، یہ مصیبت کی ماری ہوئی کوئی لڑکی ہو۔ اس کا گھر، خاندان، سب کچھ سیلاب کی نظر ہوگیا ہو اور اسی قیامت خیزی میں یہ بھی موت کے منہ میں جا گری ہو پھر اس کی لاش دریا کے پانی کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے ہمارے علاقے میں پہنچ گئی ہو اور یہاں سے دریا کا کنارہ ٹوٹا ہونے کے سبب وہ آپ کے کھیتوں میں نکل آئی ہو.....!''

''آپ بہت ذہین پولیس آفیسر ہیں تھانیدار صاحب!'' حاجی مبارک نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے بڑے منطقی انداز میں موجود حالات کا تجزیہ کیا ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اس میں ذہانت سے زیادہ موقع شناسی اور معاملہ فہمی کو دخل ہے۔ بہرحال، یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ تھانے داری کوئی آسان کام تو نہیں نا!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ پُرسوچ انداز میں بولا ''یہ دریا مشرق سے مغرب کی سمت بہتے ہوئے ہمارے گاؤں چک جمال کے قریب سے گزرتا ہے۔ اگر ہمارا اندازہ درست ہے تو پھر یہ بدقسمت لڑکی اوپر کے کسی گاؤں کی رہنے والی ہے۔ میری معلومات کے مطابق، بالائی جانب لگ بھگ تین میل کے فاصلے پر پہلا گاؤں کوٹلی مراد ہے۔ میرا خیال ہے، آپ سب سے پہلے اسی گاؤں کو چیک کرنا پسند فرمائیں گے!''

''نہیں.....!'' میں نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کوٹلی مراد سے پہلے کسی اور شے کو چیک کرنا چاہتا ہوں!''

''کوئی اور شے.....؟'' وہ متذبذب نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا ''اور..... وہ شے ہے، حاجی مبارک علی!''

''کک..... کیا..... آپ مجھے چیک..... کریں گے.....؟'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''حاجی صاحب!'' میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''آپ کے پاس یہی زمین ہے یا اس کے علاوہ بھی کسی قطعۂ اراضی کے مالک ہیں آپ؟''

حاجی مبارک علی میری معلومات کے مطابق ایک چھوٹا زمیں دار تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے پاس کتنی زمین ہے۔

وہ اپنی حیرت اور الجھن کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میرے پاس بس یہی چودہ ایکڑ زمین ہے۔''

''اور یہ ساری کی ساری زمین زیرِ آب آچکی ہے؟'' میں نے دریا کی سمت انگلی اٹھا کر ادھر سے ادھر دیکھتے ہوئے کہا ''لہٰذا آج کل آپ کو خاصی فرصت ہوگی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''آپ کہہ تو بالکل درست رہے ہیں۔'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''مگر یہ فرصت بڑی تکلیف دینے والی اور افسوس ناک ہے!''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے آپ کے نقصان اور پریشانی کا بہ خوبی اندازہ ہے حاجی صاحب..... اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک آپ کے لیے زمین داری کا کام نہیں نکلتا، آپ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ اس طرح آپ کا دل بھی بہلا رہے گا اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ کیا آپ کو میری یہ پیش کش منظور ہے؟''

''تو..... یہ آپ..... مجھے..... چیک کر رہے ہیں؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''بالکل ٹھیک سمجھے آپ..... پھر کیا ارادہ ہے؟''

''لیکن میں آپ کے ساتھ مل کر کیا کام کرسکتا ہوں!''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے جن معاملات میں آپ کی خدمات کی ضرورت ہوگی، میں آپ کو بتا دیا کروں گا۔''

''مجھے خوشی ہوگی آپ کے ساتھ مل کر کام کرنے کی۔'' وہ قدرے جوش بھرے لہجے میں بولا۔

حاجی مبارک خاصا معقول اور پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس نے پرائمری تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں تعلیم کا معیار آج کل کے مقابلے میں بہت بلند ہوا کرتا تھا۔ جو بچہ میٹرک پاس کرلیتا تھا وہ بابو کہلاتا تھا اور کیوں نہ ہو، اس زمانے کے میٹرک کو جتنا کچھ آتا تھا وہ قابلیت اور اہلیت آج کل ایم اے پاس لوگوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ حاجی مبارک کو فارغ دیکھ کر میں نے اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اس علاقے اور گردونواح کے گاؤں دیہات وغیرہ کے تاریخ جغرافیے پر اتھارٹی مانا جاتا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں سیلاب کی تباہ کاریوں نے کچھ اس نوعیت کے ہنگامی حالات پیدا کر دیے تھے کہ تھانے کا عملہ کم پڑنے لگا تھا۔ ایسے میں مفید لوگوں کا ساتھ خاصا کارآمد ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے حاجی مبارک علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حاجی صاحب! آپ دوپہر کے کھانے کے بعد تھانے آجائیں۔ میں اس متوفی لڑکی کا اتا پتا لگانے مشرق کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں، آپ میرے ساتھ چلیں۔''

''ٹھیک ہے جناب، جو آپ کا حکم۔'' وہ فرماں برداری سے بولا ''میں کھانے کے بعد تھانے میں حاضر ہوجاؤں گا۔''

چائے وقوعہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے نامعلوم لڑکی کی لاش پوسٹ مارٹم کی غرض سے سرکاری اسپتال بھجوادی تھی لہٰذا اب وہاں میرے لیے کوئی کام باقی نہیں بچا تھا۔ اس بات نے صورتِ حال کو کافی حد تک الجھا کر رکھ دیا تھا کہ متوفی اس گاؤں سے تعلق نہیں رکھتی تھی لہٰذا اس کی شناخت اور معلومات کے لیے مجھے زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت تھی۔ میں کانسٹیبل حق نواز کے ہمراہ واپس تھانے کی جانب چل پڑا۔

ہم تھانے سے ابھی چند گز دور ہی تھے کہ سامنے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک شخص تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ میں اس شخص کا صورت آشنا نہیں تھا لہٰذا الجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ حق نواز نے میری الجھن کو فوراً دور کردیا۔

''ملک صاحب! یہ تو سراج دین ہے۔'' حق نواز سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ''بڑی تیزی میں نظر آرہا ہے!''

اتنی دیر میں سراج دین ہمارے قریب پہنچ گیا۔

سراج دین نے میری جانب دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! سوہنے اللہ نے مجھے بیٹی دی ہے!''

''بہت بہت مبارک ہو بھئی سراج دین۔'' میں نے خلوص دل سے کہا ''بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ یہ سمجھو اللہ نے بیٹی کی شکل میں تم پر اپنی رحمت نچھاور کردی ہے۔''

حق نواز نے بھی باپ بننے پر اسے مبارک دی۔ سراج دین شاید بیٹی کی ولادت پر اس لیے بھی بہت زیادہ خوش تھا کہ یہ اس کے گھر میں پیدا ہونے والا پہلا بچہ تھا۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! صبح ادھر پہلی والا جانا بہت ضروری تھا اس لیے میں تھانے میں رک نہیں سکا۔ میں ابھی اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہو، اب پوچھ لیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''سراج دین! کیا تمہیں دائی حنیفاں اپنے گھر میں مل گئی تھی؟''

اس سوال پر سراج دین نے چونک کر مجھے دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''جی، وہ اپنے گھر ہی میں موجود تھی۔''

میں نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ میری معلومات کے مطابق حنیفاں بے حد مصروف دائی تھی۔ اس کی مانگ اتنی زیادہ تھی کہ وہ اکثر دبیش تر گاؤں سے باہر کہیں نہ کہیں گئی ہوتی تھی۔ تاہم حالیہ سیلابی معاملات نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اس کے ''کام'' کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا تھا جبھی سراج دین کو وہ بہ آسانی گھر پر مل گئی تھی۔ بہرحال ..... اس مصروفیت کے دو بڑے سبب تھے۔ نمبر ایک اس علاقے میں اور کوئی قابل ذکر دائی موجود نہیں تھی۔ نمبر دو۔ وہ اپنے کام..... بلکہ فن میں اس قدر ماہر تھی کہ لوگ اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔

میں نے وہیں کھڑے کھڑے دس منٹ تک سراج دین سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے میرے سوالات کے معقول اور سادہ جواب دیے اور وہ تمام جوابات میرے کسی کام کے نہیں تھے۔ چک جمال کے دیگر افراد کی طرح وہ بھی نامعلوم نوجوان متوفی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے آج صبح زندگی میں پہلی مرتبہ اس کو..... بلکہ اس کی لاش کو دیکھا تھا..... میں نے اس پوچھ گچھ کے اختتام پر اسے ہدایت کی کہ اگر متوفی لڑکی کے حوالے سے اسے کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی پتا چلے تو وہ فوراً تھانے آکر مجھے اطلاع دے۔ اس نے یقین دلایا کہ من وعن میری ہدایات پر عمل کرے گا۔

میں نے قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اور جب تھانے کی طرف چکر لگے تو خالی ہاتھ نہیں آنا!''

''جی..... جی.....'' وہ بڑی تیزی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا ''آپ فکر نہ کریں جناب! آپ کی مٹھائی تو میں سب سے پہلے پہنچاؤں گا۔''

''بھئی سراج دین! تم تو بہت ہوشیار آدمی ہو۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا ''میرے مٹھائی والے اشارے کو تم نے فوراً سمجھ لیا۔''

''بس جناب، بچی کی اتنی خوشی ہے کہ دل چاہتا ہے، پورے چک جمال کے لوگوں کو مٹھائی کھلاؤں۔'' وہ جذبات سے مغلوب لہجے میں بولا۔

میں نے تہ دل سے کہا ''اللہ تمہاری بچی کا نصیب اچھا کرے!''

پھر ہم سراج دین سے الگ ہو کر تھانے کی طرف قدم اٹھانے لگے اور وہ اپنے گھر کی سمت بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل حق نواز نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! میں آپ کی بات کا قائل ہوگیا ہوں!''

''کون سی بات بھئی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہی جناب کہ..... قیامت کو آنے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔''

''ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن کس وجہ سے تم قائل ہوئے یہ تو بتاؤ؟''

''سراج دین کے گھر میں بچی پیدا ہوئی ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ قیامت سے کچھ عرصہ پہلے بچوں کی پیدائش کا عمل رک جائے گا اور جس وقت قیامت برپا ہوگی، روئے زمین پر کوئی بھی معصوم چھوٹا بچہ موجود نہیں ہوگا!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم اسی موضوع پر باتیں کرتے ہوئے تھانے پہنچ گئے۔

☆☆☆

اس سال وقت سے پہلے بارشیں شروع ہوگئی تھیں اور معمول سے بڑھ کر ہوئی تھیں۔ موسم برسات کا آغاز عموماً ساون کی آمد کے ساتھ ہوا کرتا تھا جو جولائی کے وسط میں شروع ہوتا ہے لیکن اس دفعہ اساڑھ کے آخری دنوں ہی میں برسات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو کہ اب تک ساون کے اختتام پر بھی جاری تھا۔ اسی بارش نے دریا کے سینے کو بھر کر امنڈنے پر مجبور کردیا تھا جو سیلاب کی صورت اختیار کر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک من مانیاں کرتا پھر رہا تھا۔ ہزاروں گھر اور کھیت کھلیان زیر آب آگئے تھے۔ بعض علاقوں میں کھڑی فصلوں کو بھی شدید نقصان پہنچا تھا۔ اگر اس سال کی سیلابی تباہ کاریوں کو رقم کیا جاتا تو ہزاروں صفحات پر مشتمل ایک عبرت انگیز اور رونگٹے کھڑے کردینے والی ضخیم کتاب مرتب کی جاسکتی تھی۔ حاجی مبارک علی کے کھیتوں میں جو نامعلوم نوجوان لڑکی کی لاش ملی تھی وہ بھی اسی خرابے کا ''کارنامہ'' تھا۔

اس روز حسب پروگرام حاجی مبارک علی دوپہر کے کھانے کے بعد مجھ سے ملنے تھانے پہنچ گیا لیکن ہم بالائی جانب واقع کوٹلی مراد نہ جاسکے اور اس کا سبب اچانک شروع ہوجانے والی بارش تھی۔ لگ بھگ دو بجے دوپہر جب ہم تھانے سے نکلنے کا ارادہ کررہے تھے کہ بارش نے ہماری راہ کھوٹی کردی۔ ہم اس کے رکنے کا انتظار کرنے پر مجبور تھے کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے طوفانی ڈھنگ اختیار کرلیا تھا۔

ہمیں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چک جمال سے کوٹلی مراد کی سمت بڑھنا تھا اور تین میل کا یہ فاصلہ ہم سائیکلوں پر سوار ہوکر طے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس چھاجوں برستی بارش نے کچے راستے کو اتنا مخدوش اور پھسلن زدہ بنادیا تھا کہ اس پر سفر کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہوتا۔ جیسے جیسے بارش رکنے کے لیے ہمارا انتظار طویل ہورہا تھا، ویسے ہی بارش کی تندی اور تیزی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا بالآخر مغرب کے وقت ہم نے ہار مان لی اور اس پروگرام کو آئندہ روز کے لیے اٹھادیا۔ حاجی مبارک واپس اپنے گھر چلا گیا۔

دوسری صبح مطلع صاف وشفاف تھا۔ آسمان پر دور دور تک بادل کی کوئی چھوٹی سی ٹکڑی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ گزشتہ روز دوپہر کے بعد برسات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ کم وبیش نصف شب جا کر تھما تھا۔ میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو حاجی مبارک علی بھی آگیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا ''ملک صاحب! اس سے پہلے کہ دوبارہ بارش شروع ہوجائے، ہمیں کوٹلی مراد روانہ ہوجانا چاہیے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''اگرچہ اس وقت دور دور تک بارش کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا لیکن ساون کا کوئی بھروسا نہیں اور یہ تو ویسے بھی ساون کا اختتام چل رہا ہے۔ اپنی رخصت کے وقت تو یہ اور بھی شدید اور غضب ناک ہوجاتا ہے۔''

میں نے حوال دار حکمت یار کو اپنے پاس بلا کر چند ہدایات دیں تاکہ میری غیر موجودگی میں ان لوگوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ کانسٹیبل چودھری فرید اپنی امدادی پارٹی کے ہمراہ واپس آگیا تھا۔ اس کے تھانے میں ہوتے ہوئے مجھے امید تھی کہ کسی قسم کی کوئی مشکل سر نہیں اٹھائے گی۔

ہم سائیکلوں پر سوار ہوکر کوٹلی مراد کی جانب روانہ ہوگئے۔

ایک لحاظ سے یہ میرا ایک غیر روایتی سا دورہ تھا کیونکہ اس محکمہ جاتی کارروائی میں میرے عملے کے کسی فرد کے بجائے علاقے کا کوئی شخص میری فرمائش پر حصہ لینے جارہا تھا۔ میں پیچھے اس امر کی وضاحت کرچکا ہوں۔

بارش اگرچہ رک گئی تھی بلکہ اسے تھمے ہوئے بھی کئی گھنٹے گزر چکے تھے لیکن اس کے باوجود بھی کچے راستے کی خطرناکی اور تباہ کاری ابھی باقی تھی لہٰذا ہمیں بہت سنبھل سنبھل کر سائیکل چلانی پڑرہی تھی۔ کوٹلی مراد اور چک جمال میں لگ بھگ تین میل کی دوری تھی۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو یہ فاصلہ بڑی آسانی سے آدھے پونے گھنٹے میں طے کیا جاسکتا تھا۔ حالات چونکہ موافق اور سازگار نہیں تھے اس لیے ہمیں چک جمال سے کوٹلی مراد پہنچنے میں کم وبیش ڈھائی گھنٹے کا وقت لگا۔

کوٹلی مراد نامی وہ چھوٹا سا گاؤں بھی دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ چودھری قادر بخش اس گاؤں کی بااثر شخصیت تھا۔ پورے گاؤں پر اس کا حکم چلتا تھا۔ وہاں رہنے والے اسے اپنا آقا، اپنا بادشاہ سمجھتے تھے۔ میں نے چودھری کی حویلی جانے کا فیصلہ کیا کہ وہاں سے مفید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اگر ہم ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر نامعلوم متوفی لڑکی کا سراغ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگانے کی کوشش کرتے تو اس طرح بہت سا وقت ضائع ہوتا اور پریشانی الگ سے اٹھانی پڑتی۔

چودھری قادر بخش اس وقت اپنی حویلی میں ہی موجود تھا۔ اس کے نمک خواروں نے فوراً مجھے اور حاجی مبارک کو ایک سجی سجائی بیٹھک میں پہنچا دیا۔ میں اس بیٹھک کی آرائش و زیبائش دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کے حکمراں کی بیٹھک ایسی مزین اور شان دار ہوسکتی ہے، یہ میرے تصور میں نہیں تھا۔ بہرحال، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اللہ نے اگر کسی شخص کو بے تحاشا دولت کے ساتھ ذوقِ جمال اور شوقِ آرائش بھی دے رکھا ہو تو پھر خوب صورتی اور دل کشی کے ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد چودھری قادر بخش بہ نفسِ نفیس وہاں موجود تھا۔ چودھری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی البتہ حاجی مبارک پہلے بھی کئی بار چودھری سے شرفِ ملاقات حاصل کر چکا تھا لہٰذا حاجی پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی کی مخصوص چمک ابھر آئی تھی۔ میں اس وقت سرکاری وردی میں تھا اور مجھے یقین تھا، ہماری آمد کی اطلاع دینے والے نے چودھری کو ضرور بتایا ہوگا کہ اس علاقے کا تھانے دار اس سے ملنے آیا ہے۔ کوٹلی مراد نامی وہ گاؤں میرے تھانے کی حدود ہی میں آتا تھا۔

چودھری قادر بخش نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! دیکھیں، یہ کیسا اتفاق ہے کہ میں سوچتا ہی رہا اور آپ نے پہل کر دی۔''

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا ''چودھری صاحب! اسی لیے سیانوں نے کہا ہے..... سوچی پیا، تے بندہ گیا!''

مطلب..... جس نے بہت زیادہ سوچ بچار کی، وہ گیا کام سے!

''آپ کو اس تھانے کا چارج سنبھالے ہوئے ایک سال ہونے کو آرہا ہے لیکن ہماری ملاقات آج ہو رہی ہے۔'' چودھری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میں نے کئی مرتبہ پروگرام بنایا کہ سلام کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے معاملہ ٹلتا رہا۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تشریف لے آئے۔ چلو آپ سے ملاقات تو ہوگئی۔''

''چودھری صاحب! شاید ہماری قسمت میں اتفاقیہ ملاقات ہی لکھی تھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''ایک اندوہ ناک واقعے کی تفتیش نے مجھے چک جمال سے یہاں آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر نا معلوم لڑکی کی لاش چک جمال کے کھیتوں میں پڑی نہیں ملتی تو ہوسکتا ہے، ہماری ملاقات میں کچھ اور تاخیر ہو جاتی!''

''لاش..... نا معلوم لڑکی.....!'' چودھری قادر بخش کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے چونکتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا ''کیا کسی لڑکی کا قتل متعلق ہوگیا ہے؟''

''ابھی اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''قتل، خودکشی، حادثاتی موت..... کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ لڑکی کی شناخت کا مسئلہ حل ہو جائے تو پھر اس سلسلے میں تفتیش کی گاڑی کو آگے بڑھانے میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ میں نے کل ہی اس نا معلوم متوفی لڑکی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے چودھری کو بتایا۔

''اس بات کا میں نے اچھی طرح پتا لگا لیا ہے کہ وہ لڑکی چک جمال کی رہنے والی نہیں۔ اس کی لاش حاجی صاحب کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے۔'' میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے حاجی مبارک کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''ان کی زمین دریا کے کنارے سے لگی ہوئی ہے اور وہاں سے دریا کا کنارہ بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ وہ لاش دریا کے پانی میں بہتے ہوئے حاجی صاحب کے کھیتوں تک پہنچی ہے۔ چک جمال سے دریا کی آمد کی رخ پر سفر کیا جائے تو تین میل کے فاصلے پر آپ کا گاؤں کوٹلی مراد پڑتا ہے۔ اسی لیے میں نے اپنی تفتیش کا آغاز آپ کے گاؤں سے کیا ہے۔ اگر وہ لڑکی یہاں کی رہائشی بھی ثابت نہ ہوئی تو پھر میں اس کا سراغ لگانے کے لیے اور اوپر جاؤں گا.....!''

میں ایک مرتبہ پھر موقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا ''میں تو کل دوپہر ہی میں آپ کی طرف آنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن موسلا دھار بارش نے کوئی پیش نہ چلنے دی، مجبوراً اس کے سامنے مجھے ہتھیار پھینکنے پڑے اور آج ادھر کا رخ کیا ہے۔ اب تو آپ میری آمد کی غرض و غایت کو بہ خوبی سمجھ گئے ہوں گے!''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ بدنصیب لڑکی کون ہوسکتی ہے؟'' چودھری نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''یہی جاننے کے لیے تو میں چک جمال سے یہاں آیا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''اب..... تلاش اور شناخت کے سلسلے میں آپ ہی میری مدد کریں گے!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہوں.....!'' وہ ایک مرتبہ پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

چودھری قادر بخش کی عمر ساٹھ کے قریب ہوگی لیکن وہ اپنی صحت اور رکھ رکھاؤ سے پینتالیس سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ اسے ان لوگوں میں شمار کیا جا سکتا تھا جو خود کو بہت سنبھال کر رکھنا جانتے ہیں۔ واقعتاً آج یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ میں اس سے قبل چودھری قادر بخش سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے پہلے کہیں اسے دیکھا ہے۔ اس کے چہرے کے خال وخط شناسا سے نظر آتے تھے۔ باوجود کوشش کے بھی میں یہ یاد نہ کر سکا کہ پہلے میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا ہوگا۔ ملتی جلتی شکلوں کے لوگ اس دنیا میں پائے تو جاتے ہیں یہ ہو سکتا تھا، میں نے چودھری کی مشابہت رکھنے والے کسی شخص کو کہیں دیکھا ہو۔

چودھری چند لمحات کی خاموشی کے بعد گمبھیر لہجے میں گویا ہوا ''ملک صاحب! آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں پتا کرتا ہوں کہ کوٹلی مراد میں بسنے والوں کی کوئی لڑکی گھر سے غائب تو نہیں۔ آپ کو جس بدنصیب لڑکی کی لاش ملی ہے، اس کا تعلق اگر میرے گاؤں سے ہے تو ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ویسے اگر ایسا کوئی واقعہ یہاں پیش آیا ہوتا تو مجھے فوراً اس کی خبر ہو جاتی!''

وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' آپ لوگ اطمینان سے یہاں بیٹھیں، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھک سے نکل گیا۔

حاجی مبارک علی نے کہا'' ملک صاحب! مجھے یقین ہے، وہ اپنے بندوں کو ہدایات دینے گیا ہے تاکہ وہ اس بات کا پتا لگائیں کہ جو لڑکی مردہ حالات میں ہمیں ملی ہے اس کا تعلق کوٹلی مراد سے ہے یا نہیں!''

''اگر وہ یہی سب کرنے گیا ہے تو میری نظر میں، اس سے بڑا نیکی کا اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔'' میں نے حاجی مبارک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' ویسے یہ چودھری قادر بخش خاصا معقول انسان لگتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے حاجی صاحب؟''

''آپ کی تو چودھری قادر بخش سے یہ پہلی ملاقات ہے۔'' وہ ایک معنی خیز گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں اس کے ماضی سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

میں نے چونک کر حاجی مبارک کی طرف دیکھا اور پوچھا'' آپ کی بات کے انداز سے لگتا ہے، چودھری کے ماضی میں کوئی پراسرار کہانی چھپی ہوئی ہے؟''

''ہاں، ایسی ہی بات ہے!'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے پوچھا'' اس ''ایسی ہی بات'' کی تفصیلات کیا ہیں؟''

حاجی مبارک نے چند لمحات تک گہری خاموش نظروں سے مجھے دیکھا پھر ایک بوجھل سانس چھوڑتے ہوئے چودھری قادر بخش کے بارے میں بتانے لگا۔

''ملک صاحب! کہتے ہیں، جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ بندہ دیوانہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ چودھری قادر بخش پر بھی کبھی جوانی آئی تھی اور یہ کچھ زیادہ ہی بدیوانہ ہو گیا تھا، اس کی آنکھوں پر جوانی اور طاقت کے نشے نے ایسے پٹی باندھی کہ یہ برے بھلے کی تمیز کھو بیٹھا۔ اس کی مذموم سرگرمیاں روز بہ روز بڑھتی چلی گئیں۔ اس زمانے میں بڑے چودھری صاحب رحیم بخش زندہ تھے۔ اللہ بخشے، انہوں نے بیٹے کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کسی کی نہیں سنتا تھا پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ چودھری قادر بخش کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی۔ یہ نامعقول سے مردِ معقول بن گیا۔''

حاجی مبارک علی کی وضاحت خاصی دل چسپ اور سنسنی خیز تھی۔ وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔

''ایسا کون سا واقعہ پیش آ گیا تھا حاجی صاحب؟''

وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا'' بڑے چودھری صاحب کی زندگی میں ایک درویش بزرگ کبھی کبھی کوٹلی مراد کا چکر لگایا کرتے تھے اور چودھری رحیم بخش سے بھی ان کی ملاقات ہوتی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا، وہ بزرگ کون ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں؟ یہاں تک کہ کسی کو ان کا اصل نام بھی معلوم نہیں تھا۔ ہر چھوٹا بڑا انہیں ''سائیں جی'' کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ جس سے سامنا ہوتا، بس اس کے لیے دعا کر دیتے۔ ہاں، سائیں جی کے بارے میں ایک بات بہت مشہور تھی اور وہ یہ کہ وہ جس شخص کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ دیتے وہ بالآخر پورا ہو کر رہتا تھا۔ ایک روز چودھری رحیم بخش سے سائیں جی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چودھری صاحب! قدرت کا قانون بڑا عجیب ہے۔ اس دنیا میں زندگی کا ہر رنگ، ہر ڈھنگ اور ہر انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ کہیں ولی کے گھر میں شیطان پیدا ہوتا ہے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہیں شیطان کے گھر میں ولی۔ اس کے نظام کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔''

چودھری رحیم بخش، سائیں جی کے اشارے کو سمجھ گیا۔ سائیں جی نے اس کے بیٹے قادر بخش کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی جو مزاج، عادات اور کردار میں اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔

چودھری رحیم بخش نے دھیمے لہجے میں کہا ''ایک انسان کسی دوسرے انسان کو سمجھا ہی سکتا ہے، سو اس سلسلے میں، میں نے پوری کوشش کی ہے اور گاہے بہ گاہے کرتا ہی رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتا رہتا ہوں کہ اللہ اسے ہدایت دے!''

''اللہ ہدایت ضرور دیتا ہے لیکن اس کام کے لیے بھی اس کا اپنا ایک خاص طریقہ ہے۔'' سائیں جی نے معنی خیز انداز میں کہا ''سب ٹھیک ہو جائے گا!''

''سائیں جی!'' چودھری رحیم بخش نے بڑی عاجزی سے کہا ''آپ جانتے ہیں، اولاد جب تک بچہ ہوتی ہے، والدین انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے ہر حربہ بڑی آسانی سے استعمال کر سکتے ہیں حتیٰ کہ اگر ضرورت پیش آئے تو انہیں مار پیٹ بھی جا سکتا ہے لیکن جب یہی اولاد جوان اور طاقت ور ہو جاتی ہے تو والدین ایک لحاظ سے ان کے سامنے بے بس اور مجبور ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

''والدین مجبور ہو سکتے ہیں لیکن قدرت نہیں!'' سائیں جی نے اٹل انداز میں کہا۔

''سائیں جی! قادر بخش کے لیے آپ ہی دعا کریں!''

''میں نے کہا نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' سائیں جی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''انشاء اللہ! بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے!'' چودھری رحیم بخش نے تہ دل سے کہا۔

اور پھر واقعی سب کچھ ٹھیک ہو گیا.....!

حاجی مبارک کے آخری جملے نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''سب کچھ کیسے ٹھیک ہو گیا حاجی صاحب؟''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور گہری سنجیدگی سے بولا ''درویش کی پیش گوئی کے چند روز بعد چودھری قادر بخش بیمار پڑ گیا۔ بظاہر اسے بخار چڑھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ کم زور ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹروں، حکیموں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ کس قسم کا بخار ہے جو کسی دوا دارو سے ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا۔ ہر جتن، ہر ٹوٹکا بھی آزمایا گیا لیکن اطمینان بخش نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج کے ساتھ ساتھ دعا مدد اور پڑھنا پڑھوانا بھی جاری تھا خصوصاً قادر بخش کے بیوی بچے اس کی بیماری سے بے حد پریشان تھے۔ اس کا بڑا بیٹا نادر بخش، باپ کی حالت دیکھتا تو اس کا دل کٹنے لگتا۔ لگتا تھا جیسے قادر بخش ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے بدن پر بہ قول شخصے، گوشت کی ایک بوٹی نظر نہیں آتی ہے۔ یہ سب چل ہی رہا تھا کہ ایک روز قادر بخش کا بخار اتر گیا.....''

حاجی مبارک چند لمحات کے لیے خاموش ہوا، دو تین گہری سانسیں لے کر اس نے اپنے تنفس کو ہموار کیا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''ڈاکٹروں کا دعویٰ تھا کہ ان کے علاج سے چھوٹے چودھری کا بخار اترا ہے، دوسری جانب حکیموں کا کہنا تھا کہ ان کی معجونوں نے کمال دکھایا ہے۔ بہر حال، چودھری قادر بخش کا بخار ختم ہوا اور وہ بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگا، حیرت انگیز طور پر مہینے، ڈیڑھ مہینے میں وہ پہلے والی صحت حاصل کرنے میں کام یاب ہو گیا اور اسی وقت ایک خوف ناک انکشاف ہوا.....'' حاجی مبارک نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''چودھری کی جسمانی اور ذہنی صحت تو بہ حال ہو گئی لیکن اس کا مان اور غرور خاک میں مل کر رہ گیا۔ وہ اپنی جس طاقت کے بل بوتے پر غیر نصابی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا، وہ اس کے وجود میں کہیں ڈھونڈنے سے نہیں مل رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی اسٹنگ اور ترنگ کا فیوز اڑ گیا ہو۔ جیسے لائٹ چلے جانے سے گہری تاریکی چھا جاتی کچھ ایسا ہی حال اس کے من کا بھی ہو گیا۔ چودھری کے وجود میں پھیلے ہوئے سناٹے اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹروں کو نظر انداز کر کے صرف حکیموں کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن تمام کشتے، معجونیں اور روغنیات فیل ہو گئے۔ سارے تجربہ کار حکیم مل کر بھی قادر بخش کی محرومی کو ایک انچ ادھر سے ادھر ہلا نہ سکے۔ وہ شاخ ہری بھری نہ ہو سکی جس پر کبھی بلبل چہکا کرتا تھا۔ اب اس ٹنڈ منڈ ٹہنی پر ہر وقت الو بولتے رہتے تھے۔ سائیں جی نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا..... واقعی، اللہ کا ہدایت دینے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ وہ کسی ایک شخص کو ''ہدایت'' فرما کر اس جیسے بہت سوں کے لیے درسِ عبرت کا بندوبست کر دیتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاجی مبارک نے یہاں تک بتانے کے بعد تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا'' وہ دن اور آج کا دن..... چودھری قادر بخش اپنی اسی محرومی کے ساتھ زندہ ہے اور دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ آپ کو، ایک سدھرے ہوئے قادر بخش کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ چودھری رحیم بخش کا عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اب قادر بخش ہی کوٹلی مراد کا بڑا چودھری ہے۔ اس کا بڑا بیٹا نادر بخش ''چھوٹا چودھری'' کہلاتا ہے اور سننے میں آیا ہے کہ نادر بخش اپنے باپ کی تاریخ کو دہرانے کی کوشش کر رہا ہے..... رب خیر کرے ملک صاحب!''

''رب تو ہمیشہ خیر ہی کرتا ہے حاجی صاحب!'' میں نے اس کی بات سننے کے بعد کہا'' یہ بندہ ہی بڑا ظالم ہے جو دوسروں پر ظلم کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور خود پر بھی ظلم کرنے سے نہیں چوکتا۔''

حاجی مبارک علی نے غمبیر لہجے میں کہا'' اللہ چودھری نادر علی کو ہدایت دے!''

میں نے قدرے تلخی سے کہا۔'' اگر چھوٹے چودھری نے اپنی روش جاری رکھی تو اللہ اس کو بھی کوئی عبرت ناک ہدایت ہی دے گا..... پتا نہیں، انسان کی عقل کہاں گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ باپ کا حسرت ناک انجام اس کے سامنے ہے، اس کے باوجود بھی وہ ہوش کے ناخن نہیں لے رہا..... ویسے ایک بات ہے حاجی صاحب.....؟''

میں نے رک کر مبارک علی کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا'' کون سی بات ملک صاحب؟''

''حاجی صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا'' آپ رہائشی تو چک جمال کے ہیں لیکن کوٹلی مراد کے چودھریوں کی ہسٹری آپ کو زبانی یاد ہے؟''

وہ کھسیاہٹ بھرے انداز میں بولا'' وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ جب ہسٹری دل چسپ اور مسالے دار ہو تو اسے یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ وہ خود بہ خود از بر ہو جاتی ہے۔ چودھری قادر بخش کا معاملہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہے۔''

''ہاں، یہ تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں حاجی صاحب.....!''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر چودھری قادر بخش بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس کے عقب میں دو ملازم صورت افراد بھی نظر آ رہے تھے جن میں سے ایک نے ڈھکی ہوئی خاص بڑی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ کپڑے سے ڈھکی مذکورہ ٹرے میں خاطر داری کے لوازمات ہوں گے میں دل چسپ نظروں سے چودھری قادر بخش اور اس کے ملازمین کی کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔

ایک ملازم نے کونے میں پڑی بڑی سی چوبی میز اٹھا کر ہمارے سامنے سجادی، دوسرے نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائی ہوئی ٹرے کو مذکورہ میز پر رکھ دیا پھر وہ دونوں سوالیہ نظروں سے اپنے آقا کو دیکھنے لگے۔ چودھری نے نگاہ ہی نگاہ میں انہیں وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب وہ وہاں سے چلے گئے تو چودھری قادر بخش نے ٹرے سے کپڑا ہٹا دیا اور بولا'' ملک صاحب! بسم اللہ کریں!''

میں نے ٹرے میں موجود لوازمات کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ایک بڑی سی پلیٹ کے اندر کٹے ہوئے آم رکھے تھے جن کی خوشبو ہی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ آموں کی کس نسل اور کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آموں کی ایک بڑی مقدار کے علاوہ ایک کٹورے میں پکی ہوئی جامن بھری ہوئی تھیں جنہیں مناسب مسالا لگا کر یہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ نمک کے ساتھ ہی ان پر بھنے اور پسے ہوئے زیرے کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تیسرا آئٹم کچی نمکین لسی سے بھرا ہوا ایک جگ تھا۔ جگ کے ساتھ دو کنگ سائز پیتل کے گلاس بھی رکھے ہوئے تھے۔ موسم کی مناسبت سے یہ ایک..... خوبصورت ''ریسیپشن'' تھا۔

میں نے جائزہ مکمل کرنے کے بعد چودھری قادر بخش کی طرف دیکھا اور کہا'' اس تکلف کی کیا ضرورت تھی چودھری صاحب؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں ملک صاحب!'' وہ دوستانہ انداز میں بولا'' آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کچھ کھائے پیے بغیر یہاں چلے جائیں۔ یہ تو ابتدائی تواضع ہے۔ آپ بسم اللہ کریں۔ میں نے دوپہر کے کھانے کے لیے بھی خصوصی احکام دے دیے ہیں۔ آج آپ میرے مہمان ہیں۔''

''چودھری صاحب!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''مہمان نوازی کے لیے آپ کو اور بھی مواقع ملتے رہیں گے۔ شاید بھول رہے ہیں کہ میں یہاں آپ کے پاس ایک بہت ضروری اور ہنگامی نوعیت کے کام سے آیا ہوں۔ میں آپ کے جانے کے بعد یہی سمجھ رہا تھا کہ.....؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے ملک صاحب!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ''میں آپ کی آمد کے مقصد کو بالکل نہیں بھولا ہوں۔ میں نے اپنے بندوں کو کام پر لگا دیا ہے۔ اتنی تھوڑی دیر میں پتا چل جائے گا کہ کوٹلی مراد کی کوئی جوان لڑکی اپنے گھر سے غائب ہے یا نہیں۔ آپ خیر سے بسم اللہ کریں جناب؟''

اور..... ہم نے بسم اللہ کر دی۔

قدرت کا ہر نظام بڑا ہی مکمل اور جامع ہے۔ وہ موسم اور جغرافیائی حالات کے مطابق، پھل اور سبزیاں پیدا کرتی ہے۔ موسم گرما میں حدت اور حرارت کے توڑ کے لیے تمام سبزیاں اور پھل گرم تاثیر رکھنے والے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح موسم سرما میں پیدا ہونے والی سبزیاں اور پھل ٹھنڈی تاثیر کے حامل ہوتے ہیں۔ ''لوہا لوہے کو کاٹتا ہے.....'' کے اصول کے مطابق، یہ سبزیاں اور پھل انسان کی صحت کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوتے ہیں۔ جس طرح قدرت ایک دوسرے کا توڑ پیدا کرتی ہے، ویسے ہی میل بھی پیدا کرتی ہے۔ اگر گرمیوں کے موسم میں ملیریا پھیلانے کے لیے مچھر نمودار ہوتا ہے تو اس سے پہلے ہی میٹھا مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ باقاعدگی سے میٹھے چوسنے والوں کو ملیریا ہوتا ہے اور نہ ہی ٹائی فائیڈ۔ ہیضہ پھیلانے والی مکھی کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ لیموں اور پیاز کا استعمال کرنا چاہیے۔ آم کے جوش، حدت اور تندی کو کنٹرول کرنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ جامن بھی آجاتی ہیں۔ کہتے ہیں، آپ چاہے ایک جگہ بیٹھ کر سیروں آم کھا جائیں اور ان کے اوپر سے چند جامنیں کھالیں تو ہر قسم کے مضر اثرات سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اس طرح نمکین پکی لسی بھی آم کی گرمی کے توڑ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ چودھری قادر بخش نے آموں کی وافر مقدار کے ساتھ اس کے ممکنہ دونوں توڑ بھی ہماری خدمت میں پیش کر دیے تھے۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ ان میں سے، ایک وقت میں صرف ایک توڑ کا استعمال کیا جائے!

''یہ آم میرے ذاتی باغ کی سوغات ہیں۔'' چودھری قادر بخش نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''دسہری آم مجھے بہت پسند ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں جناب کہ دانے دانے پر مہر لگی ہوتی ہے۔ آموں کا موسم تقریباً ختم ہونے والا ہے۔ آپ کا نصیب کھینچ کر لے آیا ہے لہٰذا.....'' اس نے معنی خیز انداز میں توقف کیا پھر بولا۔

''لہٰذا کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں چلے گا ملک صاحب!'' ہم نے خوب سیر ہو کر آم کھائے۔ ہم نے آموں سے انصاف کرنے کے تمام تر تقاضے نبھا دیے تھے۔ اس دعوتِ آم سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پتا چلا، چودھری قادر بخش نے جن بندوں کو کام سے دوڑایا تھا، وہ واپس آگئے ہیں اور اپنے ساتھ ایک بوڑھی عورت کو بھی پکڑ کر لائے ہیں۔ اطلاعات لے کر آنے والے شخص کا نام معراج دین عرف ماجھو تھا۔

''ماجھو! کس مائی کو پکڑ لائے ہو؟'' چودھری نے اطلاع کنندہ سے پوچھا۔

''چودھری صاحب! وہ اللہ رکھی ہے نا..... خوشیا اندھے کی بیوی'' ماجھو نے باادب باملاحظہ ہو کر چودھری کو بتایا ''خوشیا تو کہیں آنے جانے کے قابل نہیں، ہم اللہ رکھی کو حویلی میں لے آئے ہیں۔ اس کی بیٹی چھیمو کے بارے میں پتا چلا کہ وہ دو دن سے غائب ہے..... ہو سکتا ہے، وہ لڑکی چھیمو ہی ہو جس کی لاش ادھر چک جمال کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے!''

چودھری قادر بخش نے اپنے بندوں کو روانہ کرنے سے پہلے اس معاملے کے حوالے سے کافی تفصیل سے بتا دیا تھا۔ اس نے تحکمانہ انداز میں ماجھو سے کہا ''اللہ رکھی کو ادھر لے کر آؤ۔''

پھر وہ ہماری جانب دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بڑبڑایا ''اگر اللہ رکھی کی بیٹی چھیمو دو دن سے غائب ہے تو اس نے اس بات کو چھپا کر کیوں رکھا ہے!''

میں نے محسوس کیا کہ اللہ رکھی اور چھیمو کا ذکر سن کر چودھری قادر بخش کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ تاہم میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ اس کی پریشانی کا سبب اور نوعیت کیا ہے۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ چونکہ کوٹلی مراد کا چودھری ہے اس لیے اس کے گاؤں کی ایک لڑکی کی گم شدگی نے اسے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔

اللہ رکھی بیٹھک میں داخل ہوئی اور چودھری کے اشارے پر ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی چپ چپ اور اداس سی تھی۔ میں نے گہری نظروں سے اللہ رکھی کا جائزہ لیا۔ وہ کہیں سے بھی مجھے بوڑھی مائی نظر نہ آئی۔ میرے اندازے کے مطابق، اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی تاہم اداسی اور غمزدگی کی کیفیت نے اس کی عمر میں پانچ چھ سال کا اضافہ ضرور کر دیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں بھی کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ جوانی میں بڑی حسین و دلکش رہی ہوگی۔ اللہ رکھی سے ابتدائی پوچھ گچھ چودھری قادر بخش ہی نے کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''چھمو دو دن سے غائب ہے اور تم منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی ہو اللہ رکھی؟''

وہ نظریں جھکائے گہری سنجیدگی سے بولی'' چودھری صاحب! مجھے کیا پتا کہ وہ اچانک کہیں غائب ہو جائے گی۔ وہ تو ابھی ابھی ماجھو نے.....'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا'' چودھری نے قدرے سخت لہجے میں کہا'' کیا چھمو پچھلے دو دن سے گھر میں نہیں تھی؟''

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ چھمو کا اصل نام شمیم بی بی تھا۔

اللہ رکھی نے بہ دستور نگاہ جھکائے ہوئے جواب دیا۔ ''چودھری صاحب! آپ تو جانتے ہیں، اس سال سیلاب نے کیا تباہی مچائی ہے۔ ہمارے گھر کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ دو کمروں کی تو دیواریں ہی بیٹھ گئی ہیں، صحن میں بھی پانی بھرا ہوا ہے۔ صرف ایک کمرا سلامت بچا ہے جس میں ہم میاں بیوی نے ڈیرا جمایا ہوا ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکی پھر اپنی بپتا کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔

''دو دن پہلے سخی ہمارے گھر آیا تھا۔'' پتا چلا کہ سخی، اللہ رکھی کے دیور کا نام تھا'' اس نے ہمارے گھر کی حالت دیکھی تو کہنے لگا، تم سب لوگ ہمارے گھر چلو۔ سخی کا گھر قدرے بلندی پر واقع ہے اور سیلاب کے ریلوں نے اسے بہت کم نقصان پہنچایا ہے۔ میں اور چھمو تو تیار تھیں لیکن خوشیا اڑ گیا۔ کہنے لگا، یہ وقتی پریشانی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد دور ہو جائے گی۔ چودھری صاحب! آپ کو تو پتا ہے، دونوں بھائیوں میں زیادہ نہیں بنتی.....'' وہ ایک بار پھر متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔

''جب خوشیا نے سخی کے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا تو وہ ضد کر کے چھمو کو اپنے ساتھ لے گیا۔ سخی کی دو بیٹیاں رضوانہ اور سلطانہ چھمو کی عمر ہی کی ہیں اور ان کے ساتھ چھمو کی اچھی بنتی ہے، میں نے یہ سوچ کر اسے جانے دیا کہ چلو دو تین دن وہ ان کے پاس گزارے گی۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ چھمو اپنے چاچے کے گھر میں ہے۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھیگ گئی'' یہ تو جب ماجھو نے بتایا کہ ادھر چک جمالی میں کسی اجنبی نوجوان لڑکی کی لاش ملی ہے اور ایک تھانے دار تفتیش کرتے ہوئے ہمارے گاؤں آیا ہے تو مجھے پریشانی ہوئی.....''

چودھری قادر بخش نے اللہ رکھی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میرا تعارف کرا دیا'' یہ ملک صفدر حیات صاحب ہیں۔ اس علاقے کے تھانا ان چارج۔ یہی اس سارے معاملے کی تفتیش کر رہے ہیں۔''

اللہ رکھی نے نگاہ اٹھا کر دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور ایک مرتبہ پھر گردن جھکالی، چودھری قادر بخش نے چونکہ میرا تعارف کرا دیا تھا اس لیے میں فوراً ڈائریکٹ ہو گیا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی ادھیر عمر افسردہ عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔'' اللہ رکھی! جب تمہیں ماجھو کی زبانی پتا چلا کہ چک جمال میں کسی لڑکی کی لاش ملی ہے اور میں اسی لڑکی کا سراغ لگانے وہاں سے کوٹلی مراد پہنچا ہوں تو تم نے کیا کیا؟''

''چھمو کا باپ تو اپنی آنکھوں سے مجبور ہے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بتانے لگی'' اس کی بینائی اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ لوگوں نے تو اسے اندھا خوشیا کہنا شروع کر دیا.....''

وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوئی پھر اسی غم زدہ لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولی'' میں نے خوشیا کو گھر میں چھوڑا اور سیدھی ماجھو کے ساتھ سخی کے گھر پہنچ گئی اور وہاں سے مجھے ایک بہت ہی بری خبر سننے کو ملی۔ سخی تو اس وقت گھر میں موجود نہیں لیکن اس کی بیوی اور دونوں بیٹیوں نے مجھے بتایا کہ چھمو جس صبح وہاں گئی تھی اسی شام واپس آ گئی تھی۔ اس نے رضوانہ اور سلطانہ سے کہا تھا کہ اس کا دل نہیں لگ رہا لہٰذا وہ واپس اپنے گھر جا رہی ہے۔ وہ لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ چھمو اپنے گھر میں ہے اور ہم میاں بیوی کا یہ خیال تھا کہ چھمو اپنے چاچا کے گھر میں ہے.....'' وہ جذبات سے بوجھل آواز میں متوقف ہوئی پھر دعائیہ انداز میں بولی۔'' اللہ کرے..... وہ میری چھمو نہ ہو!''

''وہ'' سے اس کی مراد ظاہر ہے، وہی لڑکی تھی جس کی لاش کل صبح ہمیں حاجی مبارک علی کے کھیتوں سے ملی تھی۔ میں نے واقعات اور شواہد کا جائزہ لیا تو سمجھ میں یہ آیا کہ نو اگست کی صبح چھمو اپنے گھر سے چچا سخی کے گھر پہنچی، پھر اسی شام وہ واپس اپنے گھر آنے کے لیے چچا کے گھر سے نکلی لیکن اللہ رکھی کے مطابق، وہ گھر نہیں پہنچی۔ وہ دونوں میاں بیوی یہی سمجھتے رہے کہ چھمو، سخی کے گھر میں ہے اور سخی وغیرہ اس بات پر مطمئن رہے کہ لڑکی واپس اپنے گھر چلی گئی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ چھمو کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آیا تھا وہ نو اگست کی شام یا رات کو پیش آیا تھا کیونکہ اگلی صبح یعنی دس اگست کو ہمیں مبارک علی کے کھیتوں میں سے ایک اجنبی نوجوان لڑکی کی لاش ملی تھی۔ میں نے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بات کی تصدیق کر لینا ضروری جانا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اللہ رکھی!'' میں نے چھیمو کی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا'' مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری دعا قبول ہو سکے گی مجھے جس لڑکی کی لاش چک جمال کے کھیتوں سے ملی ہے، میں اس کا حلیہ بیان کرتا ہوں۔ تم توجہ سے میری بات سنو اور بتاؤ کہ وہ تمہاری بیٹی چھیمو پر کتنے فیصد فٹ بیٹھتا ہے.....؟'' اس کے بعد میں نے اپنی یادداشت کو کام میں لاتے ہوئے بولنا شروع کیا'' عمر انیس اور بیس کے درمیان، جسم دبلا پتلا، رنگت گندمی، دراز قد، بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، چہرے کے نقش ونگار انتہائی پُرکشش اور دل کش، ناک پر بائیں طرف مسور کے دانے کے برابر ایک تل اور.....''

''یہ تو ہو بہو چھیمو کا حلیہ ہے!'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی چودھری قادر بخش بول اٹھا پھر اضطراری لہجے میں اللہ رکھی سے مستفسر ہوا'' ہیں نا اللہ رکھی.....؟''

اللہ رکھی نے جواب دینے کے بجائے رونا شروع کر دیا۔

بیٹھک کی فضا یک لخت ماتمی ہوگئی۔ اللہ رکھی کے ماتمی ردِعمل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ حاجی مبارک علی کے کھیتوں میں سے گزشتہ صبح ہمیں جس اجنبی لڑکی کی لاش ملی تھی وہ شمیم عرف چھیمو تھی۔

میں نے افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے چودھری قادر بخش سے کہا'' چودھری صاحب! کوٹلی مراد کوئی بہت بڑا گاؤں تو نہیں۔ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے ایسی بے خبری سخی اینڈ کمپنی سمجھتے رہے، چھیمو اپنے گھر واپس چلی گئی اور چھیمو کے والدین مطمئن رہے کہ وہ اپنے چچا کے گھر میں بڑے مزے سے رہ رہی ہے.....!''

''یہ ساری خرابی اس سیلاب کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے ملک صاحب!'' چودھری قادر بخش اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے بولا'' سیلاب کے پانی نے جو افراتفری مچائی ہے اس نے ہر بندے کی مت ماردی ہے۔ قدرتی آفات کے نتیجے میں اس نوعیت کے سنسنی خیز واقعات تو رونما ہوتے ہی رہتے ہیں جناب!''

مجھے چودھری کی اس بات سے پوری طرح اتفاق تھا۔ زلزلہ ہو، بادی طوفان ہو یا سیلاب جب یہ قدرتی آفات نازل ہوتی ہیں تو بڑے ہولناک اور عبرت انگیز واقعات جنم لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ نواگست کی شام چھیمو کے ساتھ کوئی ایسا خطرناک سانحہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں وہ بدنصیب لڑکی مردہ حالت میں چک جمال جا پہنچی تھی اور..... مجھے اسی سانحے کا پتا لگانا تھا۔ اس بات کے امکانات ففٹی ففٹی تھے کہ چھیمو کسی اتفاقی حادثے کا شکار ہوئی تھی یا اسے اس جان لیوا حادثے کا شکار بنایا گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ صورتِ حال کو مکمل طور پر واضح کر دے گی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور چودھری قادر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' چودھری صاحب! اللہ رکھی تو ہر صورت میں میرے ساتھ چک جمال جائے گی تاکہ اس نامعلوم لڑکی کی لاش کو دیکھ کر، اس کے چھیمو ہونے کی تصدیق کر سکے۔ لیکن.....'' میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر لحاظ تو قف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا'' لیکن.....کوٹلی مراد سے روانہ ہونے سے پہلے میں سخی اور اس کے گھر والوں سے بھی مکمل بیانات لینا چاہتا ہوں۔ ذرا پتا تو چلے، وہ لوگ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔''

''آپ کو ان لوگوں سے پوچھ تاچھ کرنے کے لیے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا'' میں سخی محمد اور اس کے گھر والوں کو ادھر حویلی ہی میں بلا لیتا ہوں۔''

چودھری کا آئیڈیا مجھے پسند آیا لہٰذا میں نے اس سے اتفاق کر لیا۔

آئندہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک میں سخی محمد، اس کی بیوی شبانہ اور دونوں بیٹیوں رضوانہ و سلطانہ کا'' انٹرویو'' کرتا رہا۔ میں نے ان سے، مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر درجنوں سوالات کیے لیکن کوئی بھی نئی یا اہم بات سامنے نہ آسکی۔ ان تمام لوگوں کے بیانات کا لب لباب یہی تھا کہ نواگست کی شام جب چھیمو اپنے گھر واپس چلی گئی تو وہ مطمئن ہوگئے۔ انہوں نے یہ تصدیق کرنا ضروری نہیں سمجھی کہ آیا وہ اپنے گھر پہنچی ہے یا نہیں! ان کے نزدیک کوئی خاص یا اہم بات نہیں تھی کیونکہ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے وہ لوگ ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے تھے لہٰذا سخی محمد اور اس کے گھر والے بھی اس حوالے سے مطمئن بیٹھے تھے۔

یہ ساری تفتیشی کارروائی چونکہ چودھری قادر بخش کی بیٹھک میں ہو رہی تھی اور وہ بہ نفسِ نفیس وہاں موجود تھا اس لیے ایک وقفے کے دوران میں، میں نے اس سے کہا۔ ''چودھری صاحب! اللہ رکھی اور دیگر لوگوں سے میں نے جو کچھ پوچھنا تھا وہ پوچھ لیا۔ میرا خیال ہے انہیں باہر بھیج دیں تاکہ ہم آپس میں چند اہم امور پر گفتگو کر سکیں۔'' اس نے فوراً میری فرمائش پوری کر دی۔ جب بیٹھک میں صرف ہم تینوں رہ گئے تو میں نے چودھری سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ کیا کہتے ہیں جناب اس معاملے میں؟''

''ملک صاحب! حالات وواقعات کی روشنی میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چھمو اس شام اپنے چاچا کے گھر سے نکلی اور اپنے گھر آنے کے بجائے دریا کی سمت نکل گئی۔ آپ جانتے ہیں، آج کل یہ دریا کتنا وحشی اور خطرناک ہو رہا ہے۔ اس کے کنارے جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے ہیں اور کناروں کے جو حصے سلامت ہیں ان کا بھی کوئی بھروسا نہیں۔ ممکن ہے، چھمو ایسے ہی..... کنارے کے کسی حصے کو ''سلامت'' سمجھ کر اس پر جا کھڑی ہوئی ہو اور پھر..... اسے پتا ہی نہ چلا ہو کہ کب وہ کنارے کی مٹی کے ساتھ چیختے چنگھاڑتے دریا میں پہنچ گئی۔''

وہ سانس ہم وار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی بات کو اختتام دیتے ہوئے بولا ''کوٹلی مراد اور چک جمال میں کم از کم تین میل کا فاصلہ حائل ہے۔ چھمو بے چاری کو تیرنا ویرنا تو آتا نہیں ہوگا۔ پتا نہیں، وہ کب موت کے منہ میں چلی گئی..... اور اس کی لاش دریا کے پانی کے ساتھ آپ کے علاقے میں جا پہنچی!''

''چودھری صاحب!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''آپ نے حالات وواقعات کا جو تجزیہ فرمایا ہے اس میں چند ایک باتوں پر مجھے سخت اعتراض ہے جن میں سرفہرست تو یہی ہے کہ چھمو مزے سے کھیلتے ہوئے دریا کے کنارے پر پہنچی ہوگی۔ اس خونی دریا نے پچھلے چند دنوں سے جو تباہ کاری بپا کر رکھی ہے اس کے پیش نظر کوئی لڑکی اس کے ہولناک نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ادھر کا رخ نہیں کر سکتی اور وہ بھی شام کے وقت.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے چودھری کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اس لڑکی کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے سے پہلے جائے وقوعہ پر اس کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا اور اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دریا کے پانی میں ڈوب کر نہیں مری۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں چودھری صاحب! ڈوب کر مرنے والے افراد کی لاشوں کا کیا حشر ہو جاتا ہے۔ اس نوعیت کی موت میں مردے کے جسم میں پانی کی وافر مقدار بھر جاتی ہے جس کے سبب اس کا پھول جانا ایک لازمی امر ہے۔ ازیں علاوہ اس کی جلد کے رنگ میں بھی نمایاں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اس لڑکی کی لاش کی حالت یہ تو بتاتی ہے کہ وہ دریا کے پانی کے ساتھ بہتے ہوئے چک جمال کے کھیتوں میں پہنچی ہے لیکن یہ کہیں سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کی موت پانی میں ڈوبنے سے واقع ہوئی ہے۔ اب ایک ہی قوی امکان باقی رہ جاتا ہے.....!''

میں نے بڑے سنسنی خیز انداز میں توقف کیا اور انکشاف انگیز لہجے میں کہا''..... اور وہ یہ کہ اس لڑکی یعنی چھمو کی لاش کو دریا برد کیا گیا ہو اور وہ لاش پانی کے ساتھ ساتھ تیرتے ہوئے کوٹلی مراد سے چک جمال جا پہنچی ہو..... اور اس صورت میں یہ سوچنا لازم ہو جاتا ہے کہ چھمو طبعی موت نہیں مری بلکہ اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے اور پھر مردہ حالت میں دریا میں پھینک دیا گیا ہے..... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناچودھری صاحب؟''

''ہوں.....!'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''چودھری صاحب! میں ایک انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تھانے دار بھی ہوں لہٰذا شک کو میرے سوچنے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اسی شک کی بنا پر میں یہ سوچنے کے لیے مجبور ہوں کہ چھمو کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد دریا میں پھینکا گیا تھا یا دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ دریا میں اتری..... یعنی اس کا بدن دریا میں اترا تو وہ زندگی سے خالی ہو چکا تھا..... خیر!'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔

''بس، آج شام تک کی بات ہے۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ شام سے پہلے پہلے کسی وقت مجھے موصول ہو جائے گی پھر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔''

''میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''اور میری دلی خواہش ہے کہ اگر واقعی چھمو کو قتل کیا گیا تو اس کے قاتل کو آپ جلد از جلد گرفتار کر لیں۔ بتائیں، اس سلسلے میں میں آپ سے کیا تعاون کر سکتا ہوں؟''

میں نے کہا ''فی الحال، آپ صرف اتنا تعاون کریں کہ ہمارے تھانے پہنچنے کا بندوبست کر دیں۔ ہم دونوں سائیکلوں پر سوار ہو کر یہاں پہنچے تھے لیکن واپسی میں اللہ رکھی بھی ہمارے ساتھ ہوگی لہٰذا کسی تانگے وغیرہ کا انتظام ہو جائے تو اور بھی اچھی بات ہے۔''

''حویلی میں میرے ذاتی استعمال کا تانگا موجود ہے۔'' چودھری قادر بخش نے بتایا ''آپ لوگ اس تانگے میں بیٹھ کر جا سکتے ہیں لیکن میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے جناب!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی، فرمائیں چودھری صاحب!'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کھانے کا وقت ہوگیا ہے اور کھانا بھی بالکل تیار ہے'' وہ خلوص بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں آپ کو کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دوں گا۔''

کھانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں چودھری قادر بخش کی پُرخلوص پیش کش کو ٹھکرا نہ سکا اور اس کی فرمائش پوری کردی۔

☆☆☆

وہ ایک سجا سجایا تانگا تھا۔

ظاہر ہے، چودھری قادر بخش کی ذاتی سواری کی سجاوٹ تو لازمی بات تھی۔ واپسی کے سفر میں سخی محمد بھی ضد کرکے ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ وہ متوفی چھمیو کا سگا چاچا لہٰذا میں اسے روک نہ سکا پھر یہ کہ چھمیو اس کے گھر سے نکلنے کے بعد لاپتا ہوئی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر اس سے مزید پوچھ گچھ کروں گا۔

تانگے کی اگلی سیٹ میں بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر اللہ رکھی سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ حاجی مبارک علی اپنی سائیکل پر تھا جب کہ میری سائیکل سخی محمد نے سنبھال لی تھی۔ کوچوان صدیق بڑی مہارت سے دریا کے کچے کنارے کے ساتھ تانگے کو آگے بڑھا رہا تھا۔

حویلی میں پوچھ گچھ کے دوران جب اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ نامعلوم متوفی لڑکی چھمیو ہی ہے تو اللہ رکھی نے زور و شور سے رونا شروع کردیا تھا لہٰذا مجھے چودھری سے کہہ کر اسے بیٹھک سے باہر بھجوانا پڑا تھا۔ اب وہ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے رونے کا کوٹا پورا کرچکی ہے یا اگر کچھ تھوڑا بہت بچا ہوا ہے تو وہ بیٹی کی لاش کو دیکھ کر رو لے گی۔ کیونکہ ابھی تو زبانی کلامی تصدیق ہوئی تھی۔ اللہ رکھی کا چھمیو کی لاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا باقی تھا۔

اللہ رکھی میرے بالکل عقب میں نہیں بیٹھی تھی بلکہ وہ تانگے کی پچھلی نشست کے ایک کونے میں ٹکی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی پوزیشن ایسے زاویے کی تھیں کہ میں گردن موڑ کر بہ آسانی اس سے گفتگو کرسکتا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر اللہ رکھی کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

''شاہی سواری میں بیٹھ کر سفر کرنا کیسا لگ رہا ہے؟''

یہ ایک غیر متعلق سوال تھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اگر انسان کے دل میں سکون ہو تو پیدل چلنا بھی ہوائی گھوڑے کی سواری لگتا ہے تھانے دار صاحب..... مگر اس وقت چودھری صاحب کا یہ آرام دہ تانگا مجھے کانٹوں بھرا بستر محسوس ہو رہا ہے۔ میرے دل کی حالت کا شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے.....!''

''اچھی طرح اندازہ ہے اللہ رکھی۔'' میں نے..... ہمدردی سے کہا ''میں جانتا ہوں اس وقت تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔''

وہ چادر کے پلو سے آنکھوں کے نم گوشوں کو پونچھنے کے بعد گلوگیر آواز میں بولی ''مجھے یقین آگیا کہ آپ میری کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔''

ہمدردی اور خلوص کے دو بول ایک انسان کو دوسرے انسان کے کتنا قریب لے جاتے ہیں اس بات کا اندازہ عملی تجربے سے گزرنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اللہ رکھی مجھ پر بھروسا کرنے لگی ہے۔ میں نے چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس سے پوچھا۔ ''اللہ رکھی! سچ سچ بتاؤ، یہ تمہارا دیور کیسا بندہ ہے؟''

''آپ سخی محمد کی بات کررہے ہیں نا!''

''کیا تمہارے ایک سے زیادہ دیور ہیں؟''

''نن..... نہیں'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی ''یہی ایک دیور ہے۔ پتا نہیں، میرے دماغ کو کیا ہوگیا ہے..... میں اس سخی کی بات کررہی ہوں..... میرا مطلب ہے، آپ سخی محمد کے بارے میں پوچھ رہے ہیں نا.....؟''

اس کے ذہن کی حالت اچھی نہیں تھی۔ میں نے بڑی رسان سے کہا ''ہاں اللہ رکھی! میں اسی سخی محمد کی بات کررہا ہوں جو اس وقت ایک سائیکل پر سوار ہوکر ہمارے تانگے کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔'' میں نے سانس لینے کی غرض سے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری نگاہ میں یہ سخی محمد کیسا بندہ ہے؟''

''بس، ٹھیک ہی ہے جناب'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''یہ بات میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ چھمیو دو دن پہلے شام میں سخی محمد کے گھر سے نکلی تھی اور پھر اپنے گھر پہنچنے کے بجائے اس کی لاش چک جمال کے کھیتوں میں پہنچ گئی۔ کہیں چھمیو کو پیش آنے والے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس اندوہ ناک واقعے میں کسی طرح سخی محمد کا کوئی ہاتھ تو نہیں؟''

''نہیں جناب!'' وہ بڑی قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی'' مجھے نہیں لگتا کہ سخی محمد کا اس معاملے میں کوئی ہاتھ ہو..... وہ اس قسم کا بندہ نہیں ہے۔''

''اور اس کے گھر والوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے ٹٹو لنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''میرا اشارہ اس کی بیوی اور بیٹیوں کی طرف ہے.....!''

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سر کو نفی میں جنبش دی اور مضبوط لہجے میں بولی'' نہیں، تھانے دار صاحب! مجھے ان میں سے کسی پر شک نہیں۔''

''ٹھیک ہے، ان پر شک نہیں۔'' میں نے بڑی نرمی سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ جاری رکھا۔

''گاؤں کے کسی اور بندے کو اس معاملے میں ملوث سمجھتی ہو تو اس کے بارے میں بتاؤ؟''

اس نے چند لمحات تک سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''نہیں جناب، کسی اور شخص پر بھی مجھے شک نہیں..... کوٹلی مراد میں کسی بندے سے ہماری دشمنی نہیں ہے۔''

''دیکھو اللہ رکھی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا'' اگر تمہاری بیٹی چھیمو کسی اتفاقی حادثے کے نتیجے میں دریا میں گر گئی ہوتی اور پانی میں ڈوبنے کے سبب اس کی موت واقع ہوئی ہوتی تو اس کی لاش اتنی اچھی حالت میں نہیں مل سکتی تھی جیسی کہ چک جمال کے کھیتوں میں پڑی ملی ہے۔ ڈوب کر مرنے والوں کی لاش عموماً پھول جایا کرتی ہے اور ان کی جلد بھی نیلی پڑنے لگتی ہے لیکن چھیمو کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین ہے کہ تمہاری بیٹی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد دریا کے حوالے کیا گیا تھا اور..... یہ کام کوئی دوست نہیں کرسکتا۔ اس قسم کی ظالمانہ کارروائی کی توقع کسی دشمن ہی سے کی جاسکتی ہے اور مجھے اس دشمن تک پہنچنا ہے..... بتاؤ..... ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟''

''مم..... میں..... کیا بتاسکتی ہوں..... تھانے دار صاحب.....!'' وہ ہکلاہٹ آمیز انداز میں بولی۔

ممکن ہے، اللہ رکھی کی یہ ہکلاہٹ اور ہچکچاہٹ اس پر ٹوٹنے والی افتاد کے پیش نظر ہو لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی ہے۔ اس احساس کا سبب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ میں اس معاملے میں ہر شے کو گہرے شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے ایک طویل، بوجھل سانس خارج کی اور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا'' ٹھیک ہے اللہ رکھی! میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں کہ تم اپنے کسی دشمن سے واقف نہیں ہو لیکن میں اس دشمن تک پہنچ کر ہی رہوں گا!''

وہ کچھ نہیں بولی، خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھی رہی۔

سہ پہر چار بجے ہم یہ خبریت تھانے پہنچ گئے اور پھر خیریت نہ رہی۔ شاید آسمان کو اسی بات کا انتظار تھا کہ میں کوٹلی مراد والی کارروائی کرکے واپس آجاؤں کیونکہ ہم نے جیسے ہی تھانے کی عمارت میں قدم رکھا، بارش شروع ہوگئی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار شکل اختیار کرگئی۔ ساون کی برسات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ جب چاہے، جہاں چاہے اپنا ٹھکانا خود بنالیتی ہے۔

میں نے اللہ رکھی اور سخی محمد کو باہر برآمدے میں بٹھایا اور چودھری فرید کو اپنے پاس کمرے میں بلالیا۔ کانسٹیبل چودھری فرید کے ساتھ اس وقت پورا عملہ تھانے میں موجود تھا۔

چودھری فرید میرے کمرے میں پہنچا، مجھے سلام کیا پھر میرے ہی اشارے پر ایک کرسی سنبھال لی۔ جب وہ اطمینان سے بیٹھ چکا تو میں نے اس سے پوچھا'' جی چودھری صاحب! کیا خبریں ہیں؟''

دوسرے لوگ تو اسے ''چودھری'' کہتے ہی تھے لیکن کبھی کبھار میں بھی اسے اسی انداز میں مخاطب کرلیتا تھا تو وہ فخر سے پھول جاتا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ مجھے امدادی پارٹی اور اس کی کارکردگی کی رپورٹ دینے لگا۔ میں نے توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا'' یہ سب تو تھانے سے باہر کی سرگرمیاں ہیں۔ اب یہ بتاؤ، میری غیر موجودگی میں یہاں کیا کیا ہوتا رہا ہے؟''

''جناب! ادھر تھانے میں تو کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا'' نامعلوم لڑکی کی لاش گزشتہ روز صبح میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوائی تھی۔ اسپتال کی طرف سے اس بارے میں کوئی اطلاع آئی؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا'' ابھی تک تو ایسی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

فرید نے پوچھا'' ملک صاب! آپ کوٹلی مراد سے جن لوگوں کو اپنے ساتھ لائے ہیں ان کا تعلق کیا اس نامعلوم لڑکی سے ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہارا انداز بالکل درست ہے۔'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دی'' ان میں ایک لڑکی کی ماں اللہ رکھی ہے، دوسرا اس کا چاچا نثار محمد ہے اور تیسرا چودھری قادر بخش کا ملازم کوچوان محمد صدیق اور..... حاجی مبارک علی تو یہیں سے میرے ساتھ گیا تھا۔''

''یہ لوگ لڑکی کی لاش لینے آئے ہوں گے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا'' اور اس نامعلوم لڑکی کا نام بھی معلوم ہوگیا ہے ہمیں جس... بدنصیب لڑکی کی لاش حاجی مبارک کے کھیتوں میں پڑی ملی تھی اس کا نام شمیم بی بی عرف چھمو ہے۔''

''کچھ پتا چلا.....!'' چودھری فرید کے انداز میں ایک خاص قسم کی سنسنی تھی'' چھمو کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''حالات وواقعات ابھی تک تو یہی بتاتے ہیں کہ جب وہ دریا کے پانی میں شامل ہوئی تو زندگی کی بازی ہار چکی تھی۔ اس کی موت پانی میں ڈوبنے سے واقع نہیں ہوئی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔'' صحیح صورتِ حال کا اندازہ تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی ہوگا۔''

''ہوں.....!'' فرید نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے کہا'' چودھری فرید! میں نے تمہیں ایک خاص کام کے لیے اپنے پاس بلایا ہے۔ تمہیں اسپتال تک جانا ہوگا!''

''جو حکم ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''لیکن باہر کے موسم کو بھی دیکھ لیں۔''

''اگر ہم موسم کے تیور دیکھ دیکھ کر خوف زدہ ہوتے رہے تو پھر یہ معاملہ التوا کا شکار ہوجائے گا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا'' میرا خیال یہی تھا کہ جب میں کوٹلی مراد سے واپس آؤں گا تو چھمو کی کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہاں میرا انتظار کررہی ہوگی لیکن ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں، جتنی جلدی ممکن ہو، لاش کی شناخت کا مسئلہ حل ہوجائے تاکہ کسی خاص سمت میں تفتیش کی گاڑی کو ڈالا جاسکے۔''

چودھری فرید نے چونک کر میری جانب دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا'' شناخت کا مسئلہ..... کیا ابھی اس لڑکی کے چھمو ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک ہے؟''

''مجھے تو کوئی شک نہیں۔'' میں نے پُروثوق انداز میں کہا'' لیکن قانونی کارروائی کا تقاضا ہے کہ جب تک اللہ رکھی لاش کو دیکھ کر یہ تصدیق نہ کردے کہ وہ اسی کی بیٹی ہے، اس وقت تک اس نوجوان متوفی لڑکی کو چھمو نہ سمجھا جائے..... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی ہاں، بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا'' میں ابھی اور اسی وقت سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہوجاتا ہوں۔ آپ بے فکر ہوجائیں۔ میں اس لڑکی کی لاش کو اپنے ساتھ لے کر واپس آؤں گا!''

''شاباش..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' میں نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔'' چودھری قادر بخش کا تانگا اور تانگے کا کوچوان اس وقت تھانے میں موجود ہیں۔ تم انہیں اپنے ساتھ لے کر فوراً روانہ ہوجاؤ۔''

میں نے چودھری فرید کو اسپتال روانہ کردیا۔ اس کی مدد کے لیے میں نے احتیاطاً حق نواز کو بھی اس کے ہمراہ کردیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں حاجی مبارک علی کے پاس چلا گیا جو سخی محمد اور اللہ رکھی کے پاس بیٹھا تسلی دلاسے کی باتیں کررہا تھا۔ میں اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔

''حاجی صاحب۔ آپ کافی دیر سے چھمو کی ماں اور چاچے کا انٹرویو کررہے ہیں۔'' وہ کرسی سنبھال چکا تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا'' کوئی کام کی بات بھی پتا چلی کہ نہیں؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' نہیں جناب! ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جو اس کیس میں ہمارے مدد کرسکے۔''

''ان دونوں کے تاثرات اور خیالات کیا ہیں؟''

''سخی محمد اپنی بھتیجی کی اندوہ ناک موت پر بہت دکھی اور افسردہ ہے۔'' حاجی مبارک نے جواب دیا'' غم زدہ تو اللہ رکھی بھی بہت نظر آتی ہے لیکن وہ زیادہ بات نہیں کررہی۔ لگتا ہے، چھمو کی موت نے اس کے ذہن پر بڑا گہرا اثر کیا ہے!''

''جوان اولاد کی موت اور وہ بھی..... حادثاتی موت!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا'' والدین کے دل اور جگر کو پھاڑ کر رکھ دیتی ہے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''حاجی صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا'' آپ صبح سے میرے ساتھ در بہ در ہورہے ہیں۔ میرا خیال ہے، اب آپ اپنے گھر جاکر آرام کریں۔''

''اگر میری ضرورت ہو تو میں رک جاتا ہوں!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''فی الحال تو ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا'' اور اگر ضرورت پیش آ بھی گئی تو میں آپ کو دوبارہ گھر سے بلالوں گا۔'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر کمرے کے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔'' اس وقت بارش کا زور ٹوٹا ہوا ہے۔ آپ چھتری سنبھال کے نکل جائیں۔''

اس نے میرے مشورے کو راست جانا اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

کانسٹیبل چودھری فرید مغرب کی اذان سے پہلے ہی واپس لوٹ آیا۔ وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا بلکہ میں نے اسے جس مقصد سے سرکاری اسپتال بھیجا تھا وہ اس میں سرخ رو ہو کر آیا تھا۔ اس کی اتنی جلدی واپسی پر مجھے حیرت بھی ہوئی پھر جب اس نے وضاحت کی تو میری حیرت جاتی رہی۔

فرید کے مطابق، ابھی وہ اسپتال نہیں پہنچا تھا کہ راستے میں ان لوگوں سے ملاقات ہوگئی جو چھمو کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش لے کر آ رہے تھے۔ شدید بارش نے انہیں راہ میں ایک جگہ رکنے پر مجبور کر دیا اور وہ بارش کے تھمنے یا کم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ اسپتال سے نکلے تو بارش نہیں ہو رہی تھی ورنہ وہ اپنے پروگرام کو ملتوی کر دیتے۔ بہرحال، وہ لوگ اسپتال اور تھانے کے درمیان ایک مقام پر رک کر بارش کا زور ٹوٹنے کا انتظار کرنے لگے جب بارش کی تیزی میں کمی واقع ہوئی تو چودھری فرید بھی وہاں پہنچ گیا پھر وہ سب لوگ ایک ساتھ یہاں آئے تھے۔

میں نے اسپتال کے متعلقہ عملے سے لاش اور پوسٹ مارٹم رپورٹ وصول کرنے کے بعد ضروری کاغذات پر دستخط کیے اور انہیں رخصت کر دیا۔ اس وقت تک بارش پوری طرح رک گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا مطالعہ کرنے سے پہلے میں نے اللہ رکھی اور سخی محمد کو لاش کے دیدار کے لیے بلالیا۔

اسپتال والوں نے موسم برسات کا خیال کرتے ہوئے لڑکی کی لاش کو اچھی طرح ایک صندوق میں پیک کر کے بھیجا تھا۔ اگرچہ جب وہ اسپتال سے نکلے تو بارش نہیں ہو رہی تھی لیکن ان کی یہی احتیاط بعد میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ اگر انہوں نے یہ حفاظتی انتظامات نہیں کیے ہوتے تو روایتی غسل سے پہلے چھمو کی لاش برسانی غسل ضرور کر چکی ہوتی۔

وہ منظر بڑا ہی دل دوز اور عبرت انگیز تھا جب اللہ رکھی نے اپنی مردہ بیٹی کا منہ دیکھا۔ وہ چھمو کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی ماتمی انداز میں زار و قطار رونے لگی جو اس امر کا بیّن ثبوت تھا کہ وہ نامعلوم نوجوان لڑکی اس کی بیٹی چھمو ہی تھی۔

سخی محمد کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے تھے۔ ظاہر ہے، چھمو اس کی بھتیجی تھی۔ دونوں بھائیوں میں لاکھ اختلافات رہے ہوں، اولاد تو اولاد ہی ہوتی ہے اور بھائی کی اولاد سے بہرحال محبت ضرور ہوتی ہے پھر چھمو سخی محمد کی بیٹیوں کی ہم عمر بھی تھی۔ رضوانہ اور سلطانہ چھمو کی گہری سہیلیاں تھیں۔

شناخت، صدمے، زیاں اور آہ و فغاں کے معاملات قدرے سنبھلے تو سخی محمد میرے کمرے میں آیا۔ میں ان دونوں دیور بھابی کو چھمو کی لاش کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ سخی محمد صدمے سے چور تھا۔ اس نے گلوگیر آواز میں مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! اس وقت بارش اتفاق سے رکی ہوئی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم چھمو کی لاش کو لے کر فوراً کوٹلی مراد روانہ ہو جاتے ہیں۔''

اس کی بات برمحل اور خاصی معقول تھی۔ اگرچہ اس وقت تک رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا لیکن چونکہ بارش رکی ہوئی تھی اور ان لوگوں کے پاس اپنا تانگا بھی موجود تھا اس لیے اگر وہ فوراً نکل جاتے تو آدھے پونے گھنٹے میں کوٹلی مراد پہنچ سکتے تھے۔ میں نے سخی محمد سے کہا۔

''تم ادھر اللہ رکھی کے پاس جاؤ اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میں لاش کے سلسلے میں ضروری بندوبست کرتا ہوں۔ انشاء اللہ! دس پندرہ منٹ میں آپ لوگوں کو تھانے سے روانہ کر دیا جائے گا اور آپ کے ساتھ میں اپنے عملے کے ایک بندے کو بھی بھیجوں گا تاکہ راستے میں کسی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے سخی محمد سے ''ضروری بندوبست'' کی بات بس ایسے ہی کر دی تھی۔ دراصل، پے در پے مصروفیات کے باعث میں ابھی تک پوسٹ مارٹم رپورٹ کا مطالعہ نہیں کر سکا تھا۔ لاش کی آمد کے ساتھ ہی تھانے میں وہ رونا پیٹنا مچ گیا تھا کہ مجھے ساری توجہ پہلی فرصت میں تازہ ترین صورتِ حالات کی جانب مبذول کرنی پڑی تھی۔ بہرحال، سخی محمد کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو کھول کر پڑھنی شروع کر دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس رپورٹ کے مطابق، شمیم بی بی عرف چھمو کی موت نو اور دس اگست کی درمیانی رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا سبب کوئی سریع الاثر زہر بتایا گیا تھا۔ چھمو کے معدے کے مختلف نمونوں کے لیبارٹری ٹیسٹ نے زہر خورانی کی تصدیق کردی تھی۔ وہ زہر چھمو نے اپنی مرضی سے کھایا تھا یا کسی نے دھوکے سے زہر دے کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ بتانے سے قاصر تھی۔ بہرحال، میرے لیے اتنا سا اشارہ ہی کافی تھا۔ میں اپنی تحقیق و تفتیش سے حقیقت کی تہ تک پہنچ سکتا تھا۔ رپورٹ کا آخری پیراگراف انکشاف انگیز اور چونکا دینے والا تھا اور وہ یہ کہ اپنی موت کے وقت شمیم بی بی عرف چھمو امید سے تھی۔ اس امید کی مدت کم و بیش دو ماہ بتائی گئی تھی۔

میں نے رپورٹ کے آخری پیراگراف کو دو تین مرتبہ پڑھا لیکن اس کے الفاظ اور مفہوم میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوسکی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اس حیرت، الجھن اور تذبذب کا باعث یہ تھا کہ اب تک چھمو کے حوالے سے جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں ان میں کہیں یہ بات موجود نہیں تھی کہ چھمو شادی شدہ ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس ہنگامی صورتِ حال میں چھپ نہیں سکتی تھی۔ اس کے شوہر کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور آتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

جب میرا ذہن بہت زیادہ الجھ گیا تو میں نے چھمو کی ماں اللہ رکھی کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تو سخی محمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ مجھے اللہ رکھی سے تنہائی میں بات کرنی چاہیے۔ یہ اتنا نازک معاملہ تھا کہ ممکن ہے، وہ اپنے دیور کی موجودگی میں زبان نہ کھولتی۔ حالات اچانک سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔

''سخی محمد! تم ادھر باہر ہی بیٹھو۔ میں اللہ رکھی سے علیحدگی میں دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ خاموشی سے واپس چلا گیا تو میں نے اللہ رکھی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد الجھن بھرے انداز سے، میز کی دوسری جانب بچھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔

''تھانے دار صاحب! ایسی کون سی خاص بات ہے جو آپ نے سخی کو واپس بھیج دیا؟''

''بات بہت ہی خاص اور خطرناک ہے اللہ رکھی!'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا'' اسپتال سے تمہاری بیٹی کی لاش کے ساتھ جو رپورٹ آئی ہے اس میں دو باتیں ایسی لکھی ہوئی ہیں جنہوں نے مجھے چکرا کر رکھ دیا ہے۔ تم جانتی ہو، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ غلط نہیں ہوسکتی اس لیے میں تنہائی میں تم سے بات کررہا ہوں۔ ہوسکتا ہے، تم پسند نہ کرو کہ وہ باتیں تمہارے دیور تک پہنچیں؟''

''ایسی کون سی باتیں ہیں جناب؟'' وہ بے حد فکرمندی سے بولی۔

میں نے کہا'' پہلی بات تو یہ کہ چھمو کی موت زہر سے ہوئی ہے۔ یا تو اس نے خود ہی زہر کھا کر اپنی جان لی ہے اور یا پھر کسی نے دھوکے سے اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ جب اسے دریا میں پھینکا گیا تو اس کا وجود زندگی سے خالی تھا!''

وہ پہلے ہی صدمے سے چور بیٹھی تھی۔ میری بات نے اس کی پریشانی میں اضافہ کردیا۔ وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی'' تھانے دار صاحب! میں نے چھمو کو سخی محمد کے ساتھ اس کے گھر بھیجا تھا۔ وہاں پر تو اس کا کوئی بھی دشمن نہیں۔ رضوانہ، سلطانہ اور ان کی ماں شبانہ بھی اس سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ وہ میری چھمو کو زہر کیوں دیں گی.....!''

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے گردن جھکالی۔ ممکن ہے، صدمے کی شدت نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کردیا ہو لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو مجھ سے چھپانے کے لیے گردن جھکائی ہے۔ میں نے اس لمحاتی احساس کو نظرانداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''اللہ رکھی! اگر سخی کے گھر میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو دشمنی میں اسے زہر کھلا دے تو پھر دوسری صورت یہی رہ جاتی ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے زہر کھا کر خودکشی کی ہے!''

''خودکشی.....!'' اس نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا'' اللہ رکھی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لیبارٹری ٹیسٹ جھوٹ نہیں بولتے۔ چھمو کے معدے سے زہر کے آثار ملے ہیں اور اس کی موت کا سبب زہر ہی کو بتایا گیا ہے۔''

''لل.....لیکن.....'' وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی'' چھمو نے خودکشی کیوں کی ہوگی؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' اللہ رکھی! چھمو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پاس خودکشی کا بڑا مضبوط جواز موجود تھا اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ہوسکتا ہے، اس نے زہر کھا کر خود کو موت کے حوالے کردیا ہو!''

''جواز.....کون سا جواز تھا نے دار صاحب؟'' وہ ہکلیں چھپا کر بولی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو؟''

''کس بارے میں؟'' اس نے یہ کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر گردن جھکالی۔

اس کی جھکی ہوئی گردن اس بات کا خاموش اعلان تھی کہ میں اس سے جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں وہ اس بارے میں بہت کچھ جانتی ہے لیکن اسے چھپانے کی کوشش بھی کررہی ہے۔ میں نے تفتیش کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''اللہ رکھی! کیا چھیو کی شادی ہوچکی ہے؟''

اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''نہیں!''

''تو پھر.....؟'' میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تاہم گہری نگاہ سے اسے بدستور گھورتا رہا۔

''پھر.....پھر کیا.....؟'' وہ لکنت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے نہایت ہی جامع الفاظ میں اسے لیبارٹری ٹیسٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹس کے بارے میں بتایا اور چھیو کی امید کا تذکرہ کرتے ہوئے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔

''یہ کیا معاملہ ہے اللہ رکھی؟''

میری بات سن کر یک دم اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کے چہرے کی تیزی سے بدلتی ہوئی کیفیت کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اچانک پھٹ جائے گی۔ وہ اب تک مجھ سے جو کچھ چھپائے بیٹھی تھی، وہ بلاکسی رکاوٹ اس کی زبان سے پھسل جائے گا۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کررہی رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اسے رونے دیا۔ وہ ان لمحات میں جس نوعیت کی جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ جی بھر کر آنسو بہالے تاکہ اس کے دل کا غبار اور ذہن کا بخار ڈھل جائے۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی پھر اس ہچکی کے دوران میں اس کو سنے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے اس خبیث کو منع بھی کیا تھا.....مگر وہ باز نہیں آئی.....''

''کس خبیث کو منع کیا تھا تم نے؟'' میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے چوٹ لگائی۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولی'' اسی نامراد چھیو کی بات کررہی ہوں۔''

''اللہ رکھی!'' میں نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ ''تم نے چھیو کو کس بات سے منع کیا تھا؟''

مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں حقیقت سے چند ہاتھ کی دوری پر ہوں۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''میں نے اسی سختی سے روکا تھا کہ چودھری نادر سے نہ ملے لیکن وہ باز نہیں آئی۔ آپ رپورٹ کے حوالے سے جو کچھ بتارہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے، چھیو نے میری نصیحت پر عمل نہیں کیا.....ہائے رہا! اس بدبخت نے یہ کیا کر ڈالا.....میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔''

چودھری نادر کا نام سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ حاجی مبارک علی نے چودھری قادر بخش کے ماضی کا احوال بیان کرتے ہوئے اس کے فرزند ارجمند چودھری نادر بخش کا بھی خصوصی تذکرہ کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایک سنگین اتفاق نے چودھری قادر بخش کو تو ''بندے دا پتر'' بنادیا ہے لیکن آج کل اس کا بیٹا نادر بخش اسی روش پر چل رہا تھا جس پر کبھی اس کا باپ دوڑا کرتا تھا۔ میں نے اپنی تصدیق کی خاطر اللہ رکھی سے پوچھا۔

''تم چھوٹے چودھری نادر بخش کی بات کررہی ہو نا؟''

''ہاں.....'' اس نے اثبات میں سرہلایا'' میں نے چھیو کو ہزار بار منع کیا تھا کہ چودھری نادر سے دور رہے لیکن وہ باز نہیں آئی۔ میں اگر اسے روک رہی تھی تو اس کی کوئی وجہ تھی نا۔ جو کچھ میں جانتی ہوں وہ اس نادان کو کیا پتا بے وقوف کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ بڑے فخر سے مجھے بتاتی تھی کہ نادر بخش نے اس سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔ اس بھلی کو کیا پتا کہ اس کی شادی نادر بخش سے کسی قیمت پر بھی نہیں ہوسکتی تھی.....یہ بہت بڑا گناہ ہوتا.....توبہ، توبہ!''

اللہ رکھی کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس نے لفظ ''گناہ'' کا استعمال کرکے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ اس وقت وہ جس جذباتی کیفیت سے گزر رہی تھی اس میں اس کی زبان سے جھوٹ کے اخراج کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر میں ہمدردی بھرے انداز میں اسے کریدتا رہا تو وہ حقیقت کو کھل کر بیان کردے گی۔ اس کیس کے حل ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ چودھری قادر بخش کا بیٹا نادر بخش شادی شدہ تھا اور خیر سے اس کے دو بچے بھی تھے۔ میں نے ذرا مختلف انداز میں اسے ٹٹولنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''اللہ رکھی! چودھری نادر بخش اور چھمیو کی شادی کو تم اس لیے ناممکن بتا رہی ہو نا کہ چودھری پہلے سے شادی شدہ ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں؟''

''یہ بات تو اپنی جگہ ہے ہی۔'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔ ''لیکن اس کے علاوہ بھی ایک ایسی وجہ ہے کہ.....!'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

اس نازک موقع پر میں اس کے خاموش رہنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ گردن جھکا کر ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ میں اس کی ذہنی اور قلبی حالت کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھی کہ جس میں انسان کسی ہم درد اور مہربان کے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دینے کے لیے بے قرار ہوتا ہے۔ میں نے نرم روی سے اس کا ''علاج'' جاری رکھا۔

''اللہ رکھی!'' میں نے دھیمے لہجے میں مخاطب کیا اور کہا۔ ''جب سب کچھ بتا دیا ہے تو وہ ''وجہ'' بھی بیان کردو جس کی بنا پر چودھری اور چھمیو کی شادی کسی قیمت پر نہیں ہوسکتی تھی..... بلکہ تم نے اس شادی کے لیے ''بہت بڑا گناہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟''

اس نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھائی اور ویران نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ مجھے ان آنکھوں کی ویرانی میں یہ سوال مچلتا ہوا بڑا واضح دکھائی دیا..... آیا مجھے تھانے دار پر اعتماد کرنا چاہیے یا نہیں؟

اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے میں نے.... ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ''اللہ رکھی! تم مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھ سکتی ہو۔ مجھ سے جو کچھ بھی کہو گی، سمجھو کہ اس کمرے کے اندر ہی دفن ہوجائے گا۔ میں چھمیو کے قتل کا معما حل کرنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے، اس سلسلے میں تم اپنے چھوٹے بھائی کی ضرور مدد کرو گی!''

''مم..... میں..... کیا مدد کروں..... جناب؟'' اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

''صرف اتنا بتا دو کہ چھوٹے چودھری اور چھمیو کی شادی ہوجانا کس حوالے سے گناہ کا کام تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''باقی سب میں سنبھال لوں گا۔''

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ ان لمحات میں وہ آٹھ دس سالہ ایک معصوم سی بچی نظر آرہی تھی۔ بچے بڑے ہی صاف گو اور ریاکاری سے دور ہوتے ہیں۔ انہیں کسی قسم کی مصلحت یا منافقت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جو کہنا چاہیں، بے دھڑک کہہ دیتے ہیں۔ انہیں کسی کے خفا ہونے یا خود کو کوئی نقصان پہنچنے کی پروا نہیں ہوتی۔

اللہ رکھی نے بھی آنسو بہانے کے دوران میں ایک خطرناک حقیقت کا بے دھڑک انکشاف کردیا وہ بھرائی ہوئی آواز میں بڑی سادگی سے بولی'' تھانے دار صاحب..... چھمیو اور چودھری نادر بخش میں بہن بھائی کا رشتہ ہے.....!!''

بات ختم کرتے ہی اس نے گردن جھکالی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ میں حیرت اور استعجاب سے یک ٹک اپنے سامنے بیٹھی اللہ رکھی کو دیکھتا چلا گیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اتنی بڑی اور تلخ حقیقت کے اظہار کے لیے اسے کتنی بڑی اذیت سے گزرنا پڑا ہوگا لیکن یہ بھی ایک عملی سچائی ہے کہ ساری تکالیف اسی وقت تک ہوتی ہیں جب تک انسان کا دل سلامت ہو۔ دل ٹوٹ جائے تو پھر کوئی تکلیف، تکلیف نہیں رہتی۔ اللہ رکھی کا دل بھی اس بری طرح ٹوٹ چکا تھا کہ حقیقت کے اظہار میں اسے کسی دشواری کا احساس نہ ہوا۔

جب میں کوٹلی مراد میں چودھری قادر بخش سے ملا تھا تو مجھے بڑی شدت سے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کے خال وخط شناسا سے لگ رہے تھے لیکن جب باوجود کوشش کے بھی مجھے یاد نہ آیا تو میں نے اس احساس کو نظر انداز کردیا مگر اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی تھی کہ میں نے چودھری کو پہلے کہاں دیکھا تھا..... یہ روشن حقیقت بڑی سنسنی خیز اور عبرت انگیز تھی۔

میں نے چودھری قادر بخش کو نہیں بلکہ ایک روز قبل شمیم بی بی عرف چھمیو کو مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ دونوں کے نقش و نگار میں گہری مشابہت پائی جاتی تھی!

☆☆☆

اگلی صبح میں نے کانسٹیبل چودھری فرید کو اپنے ساتھ لیا اور ایک مرتبہ پھر کوٹلی مراد میں، چودھری قادر بخش کی حویلی پہنچ گیا۔ گزشتہ رات میں نے اللہ رکھی اور حاجی محمد کو چھمیو کی لاش لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے تسلی تشفی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاوہ اس سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ اس کے ماضی کے حوالے سے اس کیس کی تفتیش کے دوران میں کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس نے اگر مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہوئے ماضی کے کسی خطرناک راز سے آگاہ کیا تھا تو اس راز کی حفاظت کرنا میرا فرض بنتا تھا۔

اللہ رکھی سے کیا ہوا وعدہ اپنی جگہ لیکن محکمہ جاتی فرائض کا تقاضا تھا کہ میں یہ جاننے کی ضرور کوشش کروں کہ کیا چھمو نے کسی معاملے سے دل برداشتہ ہو کر خود ہی زہر کھا کر اپنی جان لے لی تھی یا کسی نے اسے قتل کیا تھا؟

ان اہم معلومات کے حصول کے لیے چودھری نادر بخش کا ''انٹرویو'' بہت ضروری تھا..... اور اس انٹرویو سے قبل چودھری قادر بخش سے ایک سنجیدہ ملاقات بھی ضروری تھی اس لیے میں اس وقت اس کی حویلی میں موجود تھا۔ چودھری فرید کو میں نے بیٹھک سے باہر ہی رکنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ بیٹھک میں میرے اور چودھری قادر بخش کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! مجھے چھمو کی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اللہ رکھی رات آپ کے تھانے سے اس کی لاش لے آئی تھی۔ مارے غم کے اس کا بھی برا حال ہے۔ آج ظہر کی نماز کے بعد تدفین کا پروگرام ہے۔''

''چودھری صاحب! جوان جہان اولاد کی موت کا صدمہ واقعی بڑا جاں گسل ہوتا ہے۔'' میں نے قادر بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا ''اور موت بھی ایسی کہ.....؟''

میں نے اس کا ردِعمل جاننے کے لیے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں جلدی سے بولا ''ملک صاحب! کیا آپ نے چھمو کی موت کا معما حل کر لیا ہے؟''

''پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ نے اس معمے کے تمام تر جوابات پوری تفصیل سے واضح کر دیے ہیں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تمہیدی انداز میں کہا ''چھمو کی موت طبعی ہرگز نہیں..... جب دریا کی موجوں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹا تو وہ زندگی ایسی خوب صورت نعمت سے محروم ہو چکی تھی۔''

''ہوں.....'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا ''اس کا مطلب ہے، چھمو نے خودکشی کی ہے!''

''ہرگز نہیں!'' میں نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی ''اگر وہ دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی جان سے کھیلتی تو پانی میں ڈوب کر مرنے کے سبب اس کی لاش کا حشر خراب ہو چکا ہوتا۔''

میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر چند کاغذات چودھری قادر بخش کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی ذرا ان کا مطالعہ کر لیں۔''

اس نے مذکورہ کاغذات اپنے ہاتھ میں لیے اور ان پر سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا ''یہ کیا ہے، ملک صاحب؟''

''یہ پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹس ہیں۔''

''لیکن یہاں تو سب کچھ انگلش میں لکھا ہوا ہے۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا ''اور میں انگریزی پڑھنا نہیں جانتا۔''

''تو پھر میں پڑھ کر آپ کو سناتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''کیوں کہ ان رپورٹس میں درج سنگین حقائق کا جاننا آپ کے لیے ضروری ہے۔''

وہ آنکھیں سکیڑ کر متذبذب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کی رضا کارانہ خاموشی کا یہی مطلب تھا کہ وہ ہمہ تن گوش ہے، میں اسے ان رپورٹس کی تفصیلات سے آگاہ کروں۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا، وہ پوری توجہ اور انہماک سے سنے گا!

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں یہ فریضہ ادا کر دیا۔

پوری بات سننے کے بعد وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''اب بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ چھمو اپنے گناہ کی وجہ سے شدید ترین ذہنی دباؤ کا شکار تھی لہٰذا اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی اور پھر خود کو دریا کے حوالے کر دیا۔''

''چودھری صاحب!'' میں نے قدرے بلند آواز میں قادر بخش کو مخاطب کیا ''آپ تو ماشاء اللہ! بڑے سمجھ دار اور عقل مند انسان ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ چھمو نے خود ہی زہر کھا کر اپنی جان لی ہے تو پھر یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ ایک مردہ انسان خود کو دریا میں کیسے پھینک سکتا ہے.....؟''

میں نے سانس درست کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا ذہن خودکشی سے زیادہ قتل کی طرف جا رہا ہے.....!''

''قتل.....!'' چودھری نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا ''چھمو کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟''

''وہی شخص جس کی وجہ سے وہ ایک گناہ کا بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نو اگست کی صبح چھمو کا چاچا سخی محمد اسے اپنے گھر لے جاتا ہے کہ چند روز وہ وہاں رہ لے۔ رضوانہ، سلطانہ، ان کی ماں شبانہ اور سخی محمد کے مطابق، اسی شام یعنی نو اگست کی شام چھمو ان لوگوں سے یہ کہہ کر اپنے گھر واپس آجاتی ہے کہ اس کا وہاں دل نہیں لگ رہا۔ اللہ رکھی کا بیان ہے کہ چھمو مذکورہ شام گھر نہیں پہنچتی۔ وہ میاں بیوی یہی سمجھ رہے ہیں کہ چھمو اپنے چاچے کے گھر میں ہے حتیٰ کہ جب گیارہ اگست کی صبح میں یہاں آکر ایک نامعلوم نوجوان لڑکی کی لاش کے حوالے سے تفتیش کرتا ہوں تو اللہ رکھی اور سخی محمد وغیرہ کو تشویش ہوتی ہے کہ کہیں وہ نامعلوم لڑکی ان کی چھمو تو نہیں۔ آپ غور فرمائیں چودھری صاحب.....!''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ موجودہ حالات وواقعات میں چھمو کی موت کا صرف ایک ہی سبب باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ.....نو اگست کی شام وہ اپنے چاچا سخی محمد کے گھر سے نکل کر اس بندے کے پاس پہنچی جو اس گناہ میں اس کا شریکِ کار تھا۔ چھمو نے اس ساری صورتِ حالات بتانے کے بعد شادی کا مطالبہ کیا ہوگا۔ وہ شخص کسی بھی طور شادی کے لیے تیار نہیں ہوا ہوگا۔ چھمو نے اسے سنگین نتائج کی دھمکی دی ہوگی۔ اس شخص نے کسی بھی خراب صورتِ حال سے محفوظ رہنے کے لیے کسی بہانے یا دھوکے سے چھمو کو زہر کھلا دیا پھر جب شریع الاثر زہر نے چھمو کا کام تمام کر دیا تو اس ظالم شخص نے چھمو کی لاش کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا۔ چھمو شام کے وقت سخی محمد کے گھر سے نکلی تھی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، اس کی موت رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے، اس نے مذکورہ قاتل کے پاس بہت سا وقت گزارہ تھا لہٰذا اس قاتل کو کسی بھی خطرناک کارروائی کے لیے اچھا خاصا موقع مل گیا ہوگا۔ اس نے چھمو کو راہ سے ہٹانے ہی میں اپنی عافیت جانی ہوگی!''

چودھری قادر بخش نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''ملک صاحب! آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں مفروضات کا بڑا عمل دخل ہے۔ یوں ہوا ہوگا.....وں ہوا ہوگا.....وغیرہ وغیرہ۔ اس سے مسئلہ تو حل نہیں ہوگا نا؟''

''مسئلہ حل ہو جائے گا چودھری صاحب!'' میں نے نہایت ہی ٹھوس لہجے میں کہا ''جب وہ قاتل میری تفتیش کی چھری کے نیچے آئے گا نا تو میرے بیان کردہ تمام تر مفروضات حقائق میں بدل جائیں گے۔ وہ خود زبان سے اپنے جرم کا اقرار کرے گا۔''

''لیکن آپ اس شخص کو تلاش کیسے کریں گے!'' وہ الجھن زدہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا ''اب تو چھمو بھی زندہ نہیں رہی کہ وہ اس کی نشان دہی کر سکتی۔''

''قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے چھمو کی نشان دہی کی ضرورت نہیں چودھری صاحب!'' میں نے اٹل انداز میں کہا ''میں نے اس شخص کا سراغ لگا لیا ہے!''

''کون.....!'' چودھری پہلو بدلتے ہوئے اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا ''کون ہے وہ شخص؟''

''آپ سنیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''آپ کو یقین نہیں آئے گا چودھری صاحب!''

''آپ .....بتائیں تو.....؟'' اس کی بے چینی ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔

میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''اس شخص کا نام ہے چودھری نادر بخش!''

''کک .....کیا.....!'' چودھری قادر اچھل پڑا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....؟''

میں نے نیم تاریکی اور ملگجے اجالے میں نشانہ باندھ کر ایک تیر چلایا تھا جو میرے اندازے کے مطابق ٹارگٹ کے بہت قریب جا کر لگا تھا۔ حالات وواقعات کی روشنی چونکہ مجھے راہ دکھا رہی تھی لہٰذا میں اندھیرے میں تیر چھوڑنے ایسی کیفیت کا شکار نہیں تھا۔ چودھری کے بے ساختہ اچھلنے نے مجھے شیر بنا دیا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں چودھری صاحب.....اور پوری تحقیق کرنے کے بعد ہی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔

''مجھے باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے سے چھمو اور چودھری نادر بخش کے درمیان خاصا سنجیدہ تعلق رہا ہے۔ آپ اپنے بیٹے اور اس کی غیر نصابی سرگرمیوں کو مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں لہٰذا میں اس خاص زاویے سے کوئی تفصیل پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا.....'' میں رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''نو اگست کی شام چھمو اپنے چاچا کے گھر سے نکلی اور اپنے گھر آنے کے بجائے وہ اس ڈیرے کی سمت چلی گئی جو دریا کے کنارے واقع ہے۔ وہ ڈیرا ایک طرح سے نادر بخش کی بیٹھک کے طور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر استعمال ہوتا ہے۔ چھیو نے جو سنگین بوجھ اٹھا رکھا تھا وہ اس کے بارے میں چودھری نادر سے دوٹوک بات کرنے کے لیے ڈیرے پر گئی تھی لیکن اسے کیا معلوم تھا.....''

''آپ بادثوق ذرائع کی بات کررہے ہیں۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیز لہجے میں بولا'' کیا آپ کو یہ سب کچھ اللہ رکھی نے بتایا ہے؟''

میں نے کہا'' اللہ رکھی کا ان معلومات سے کوئی تعلق نہیں!''

''پھر آپ کو کیسے خبر ہوئی۔''

''چودھری صاحب! آپ جانتے ہیں، پولیس کے اپنے خفیہ ذرائع ہوتے ہیں۔ ہمارے مخبر ہر جگہ، ہر علاقے میں...!''

میں نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر بیٹھک کے بند دروازے کی سمت دیکھا۔ دروازے کے کواڑ بھڑے ہوئے تھے تاہم کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ اپنے بیان کے دوران میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اس بند دروازے کے پیچھے موجود ہے اور نہایت ہی خفیہ طریقے سے ہماری باتیں سننے کی کوشش کررہا ہے۔ یہ احساس اتنا فوری اور طاقت ور تھا کہ میں اپنی بات کو نامکمل چھوڑ کر دروازے کی جانب دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

''کیا ہوا.....؟'' چودھری قادر بخش نے الجھن بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''کوئی ہماری باتیں سننے کی کوشش کررہا ہے!'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

وہ بیزاری سے بولا'' آپ کو وہم ہوا ہے!''

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ میں بیٹھک کے دروازے کی طرف پیش قدمی کرتا، دروازے کی دوسری جانب کچھ اس نوعیت کی آوازیں ابھریں جیسے کوئی افراتفری میں وہاں سے رخصت ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ میں نے کسی چیتے کے مانند، بند دروازے کی سمت جست لگادی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ چودھری قادر بخش اپنی نشست پر بیٹھا رہا تھا یا وہ بھی میرے پیچھے ہی صورتِ حال جاننے کے لیے بیٹھک سے نکل آیا تھا۔ جب میں نے بیٹھک سے باہر قدم رکھا تو ایک پست قامت شخص کو حویلی کے گیٹ میں سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا لیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تقریباً دوڑتے ہوئے گیٹ کے اس طرف چلا گیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر اس پست قامت شخص کے تعاقب میں دوڑ لگادی۔ یقیناً یہی شخص بیٹھک کے دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

میں مذکورہ شخص کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن میں جیسے ہی حویلی کے گیٹ سے باہر نکلا وہ مجھے نظر آگیا۔ وہ شخص ایسی ہڑبونگ میں بھاگا تھا کہ سامنے سے آتا ہوا کانسٹیبل بھی اسے دکھائی نہ دیا اور وہ سیدھا اس سے جا ٹکرایا۔ اسی لمحے میں نے تحکمانہ انداز میں کانسٹیبل سے کہا۔'' چودھری فرید پکڑو اس کو..... جانے نہ پائے.....!''

چودھری فرید کانسٹیبل پکڑنے دھکڑنے، دبوچنے جھپٹنے کا ماہر تھا۔ میرا تحکمانہ اشارہ پاتے ہی اس نے مذکورہ پست قامت شخص کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیا۔

اس شخص کی عمر اٹھائیس انتیس سال ہوگی۔ وہ دبلا پتلا اور پھرتیلا انسان تھا لیکن چودھری فرید بھی ایسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اس نے پلک جھپکتے میں پست قامت شخص کی پھرتی تمام کردی۔

اس لمحے مجھے اپنے عقب میں چودھری قادر بخش کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔'' یہ تو وارثی ہے..... نادر کا خاص آدمی.....!''

''اب تو ساری بات آپ کی سمجھ میں آگئی نا چودھری صاحب؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تحکمانہ انداز میں اس پست قامت شخص سے کہا۔'' وارثی ..... بیٹھک میں آجاؤ!''

تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ایک مرتبہ پھر چودھری قادر بخش کی عالی شان بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اس بار میرے اور چودھری کے علاوہ وارث علی عرف وارثی بھی وہاں موجود تھا۔ وہ سر جھکائے ایک جانب کھڑا تھا۔ بیٹھک میں اس دفعہ قدم رکھنے سے قبل میں نے چودھری فرید کو ایک طرف لے جا کر یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ فوراً ڈیرے پر پہنچے اور نہایت ہی خفیہ انداز میں چھوٹے چودھری نادر بخش کی نگرانی شروع کردے۔ وہ میری بات سمجھ گیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حویلی کے گیٹ کی سمت بڑھ گیا تھا۔ تھانے سے روانہ ہوتے وقت میں نے اسے چودھری نادر کے حوالے سے اچھی طرح بریف کردیا تھا لہٰذا وہ خاصا چوکنا اور چاق چوبند تھا۔

چودھری کے اور میرے درمیان تھوڑی دیر پہلے جس نوعیت کی گفتگو ہورہی تھی اس نے چودھری کو اپنے بیٹے کے حوالے سے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ کسی بھی طور میرے پیش کردہ حقائق پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وارثی کے ''کردار'' اور ''گرفتاری'' نے چودھری کی پریشانی میں بے حد اضافہ کر دیا لہٰذا وارثی سے پوچھ گچھ کا آغاز اسی نے کیا۔

''وارثی! تم ادھر بیٹھک کے بند دروازے کے پیچھے چھپ کر کیا کر رہے تھے؟''

وارثی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لہٰذا بوکھلاہٹ میں وہ ڈھنگ کا کوئی بہانہ بھی نہ کر سکا جب اس نے آئیں بائیں شائیں شروع کی تو میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''چودھری صاحب! یہ پاپی شرافت کی زبان نہیں سمجھے گا۔ میں اسے باندھ کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ جب وہاں اس کی تشریف پرنو، چار کے چھتروں کی بارش ہوگی تو اس کی زبان کسی ریکارڈ کی طرح بولنے لگے گی..... کئی دنوں تک یہ تشریف کے بل بیٹھنے کے قابل نہیں رہے گا..... اور نہ ہی کسی کو بتا سکے گا کہ آخر وہ بیٹھے بٹھائے اچانک کس مرض میں مبتلا ہو گیا ہے!''

وارثی نے سراسیمہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ چودھری قادر بخش نے غصیلے لہجے میں اس سے پوچھا ''سچ سچ بتاؤ، کیا تم دروازے کے باہر کھڑے ہو کر ہماری باتیں سن رہے تھے؟''

''نن..... نہیں چودھری جی.....'' وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے چودھری سے بولا ''بس جی، میں تو ادھر سے گزر رہا تھا..... تھانے دار صاحب کو خوامخواہ مجھ پر شک ہو گیا ہے.....''

''اوئے خوامخواہ کی اولاد!'' میں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا اور سخت لہجے میں کہا ''اگر تم بس ایسے ہی ادھر سے گزر رہے تھے تو پھر مجھے دیکھ کر بھاگے کیوں..... تم ایسی افراتفری میں حویلی سے باہر نکلے تھے کہ جیسے باؤلے کتوں کا ایک غول تمہاری بوٹیاں بھنبھوڑنے کے لیے تعاقب کر رہا ہو..... یا جنہی بلا میں تمہارا پیچھا کر رہی ہوں اور..... اسی بوکھلاہٹ میں تم میرے سپاہی سے بھی جا ٹکرائے.....'' بس ایسے ہی'' گزرنے والوں کے بھلا یہ کرتوت ہوتے ہیں؟''

چودھری نے وارثی کی مجرمانہ کیفیت دیکھی تو غصیلے لہجے میں بولا ''بتاؤ وارثی، تم کس کے کہنے پر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں تمہاری کھال کھنچوا لوں گا!''

وہ سہمی ہوئی رحم طلب نظروں سے چودھری قادر بخش کو دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''چودھری صاحب! آپ یہ ''کھال کھنچوانے'' کی زحمت نہ کریں۔ میرے تھانے میں اس نوعیت کے کاموں کے لیے بڑا شاندار بندوبست موجود ہے۔'' پھر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور وارثی کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے اپنے ساتھ تھانے لے کر جا رہا ہوں۔ صرف ایک گھنٹے کی ''خاطر تواضع'' سے اس کے بدن کا ایک ایک اعضا بولنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس کے اندر سے صرف ایک ہی آواز نکلے گی..... مجھے آپ لوگوں کی باتیں سننے کے لیے چودھری قادر بخش نے حکم دیا.....!''

''قادر بخش نہیں، نادر بخش.....!''

وہ بولتے بولتے یک لخت خاموش ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مجھے اور کبھی بڑے چودھری کو تکنے لگا۔ میرا نفسیاتی حربہ بڑا کارگر ثابت ہوا تھا۔ میں نے دانستہ اپنے بیان میں نادر کے بجائے قادر کا لفظ استعمال کیا تھا تاکہ وارثی کو ٹریپ کر سکوں اور اس نے بڑی آسانی سے میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھا تھا۔

ان لمحات میں پست قامت، فتنہ پرور وارثی اس قدر خوف زدہ اور سہما ہوا تھا کہ اس کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہیں کہے۔ ایک طرف چودھری قادر بخش اسے کھال کھنچوانے کی دھمکی دے رہا تھا اور دوسری جانب میں اس کی تشریف کو چند دنوں کے لیے ناقابلِ استعمال بنانے کی بات کر رہا تھا اور اس کی سراسیمہ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اسے یقین ہے، ہم میں سے کوئی بھی اسے خالی خولی دھمکیاں نہیں دے رہا بلکہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کر بھی گزریں گے۔

چودھری قادر بخش نے خوں خوار لہجے میں دریافت کیا ''کیا چودھری نادر نے تمہیں اس کام پر مامور کیا تھا؟''

''چودھری صاحب! سچ اس کی زبان سے پھسل چکا ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔

وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے وارثی سے مستفسر ہوا ''تم گونگے کیوں ہو گئے ہو۔ بد بخت! میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔ کیا میں تمہیں کرم دین لوہار کی دکان میں لے جاؤں اور اس کے آگ میں انگارا زنبور سے پکڑ کر تمہاری زبان کو بولنے پر مجبور کروں۔ تم مجھے جانتے ہو نا.....؟''

انسان سب سے زیادہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے اور جب اس کی جان پر بن آئے تو وہ ساری وفاداریوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پس پشت ڈال کر خود کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وارثی چودھری قادر بخش کے جلال اور غضب سے بہ خوبی واقف تھا لہٰذا اس نے اپنی جان کی امان چاہتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ ''جی چودھری صاحب! اس کام کے لیے مجھے چھوٹے چودھری صاحب نے ہی حکم دیا تھا۔ چھوٹے چودھری صاحب ادھر ڈیرے پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں انہیں رپورٹ دینے جا رہا تھا کہ.....!'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور معاندانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں قادر بخش سے کہا۔ ''چودھری صاحب! دیکھ لیں، میں نے کہا تھا نا، میرے مفروضات بہت جلد سنگین اور تلخ حقائق میں بدل جائیں گے۔ مجرم میری تفتیش کی چھری تلے آچکا ہے اور آپ جانتے ہیں، چودھری نادر سے اس کے جرم کا اقبال کروانا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا؟''

چودھری قادر بخش نے تشویش بھری نظروں سے مجھے دیکھا پھر وارثی کی طرف رخ کر کے جارحانہ انداز میں بولا۔ ''اوئے بدبخت! تم باہر جا کر بیٹھو۔''

میں سمجھ گیا کہ چودھری قادر بخش تنہائی میں مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے اور مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ کس قسم کی بات کرے گا۔ چودھری کے اشارے پر وارثی بیٹھک سے نکلنے لگا تو میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''چودھری صاحب نے باہر جا کر بیٹھنے کو کہا ہے تو ادھر بیٹھے بھی رہنا تمہاری حیثیت ایک اہم گواہ جیسی ہے.....اگر تم نے ادھر ادھر ہونے کی کوشش کی تو یاد رکھو، جسم پر شہد مل کر.....سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

''جی.....میں سمجھ رہا ہوں'' وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ ''میں کہیں نہیں جا رہا۔ ادھر ہی موجود رہوں گا۔''

وارثی کے جانے کے بعد چودھری قادر بخش نے نرم لہجے میں سب توقع مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! کہانی سمجھ میں آرہی ہے لیکن اگر آپ چاہیں تو سب کچھ ٹھیک ہوسکتا ہے۔''

''مثلاً.....میں کیا چاہوں تو؟'' میں نے خاصے روکھے لہجے میں پوچھا۔

وہ عاجزی سے بولا۔ ''میں نادر کو ادھر ہی بلا لیتا ہوں۔ اس سے جو بھی پوچھ گچھ کرنا ہے یہاں بیٹھک ہی میں کر لیں۔ میرا خیال ہے، گھر کا معاملہ گھر ہی میں نمٹ جائے تو اچھا ہے۔''

''چودھری صاحب! آپ یا تو حالات کی سنگینی کو سمجھے نہیں ہیں اور یا پھر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ مجھ سے کوئی ڈیل وغیرہ ہو جائے گی!'' میں نے بڑی واضح الفاظ میں کہا۔ ''میرا نام ملک صفدر حیات ہے چودھری صاحب! میں ایک سال سے اس علاقے میں تھانے داری کر رہا ہوں۔ آپ کو میرے مزاج، اسٹائل اور اصول پسندی کے بارے میں تو اچھی طرح معلوم ہوگا؟''

''جناب! آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش تو کریں.....!'' چودھری قادر بخش لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

''میں بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ گھر کا معاملہ ہے، گھر ہی میں نمٹ جائے گا۔ ایک انسان کی زندگی ضائع ہوئی ہے۔ اسے زہر دے کر مارا گیا ہے۔ یہ قتل کی ایک سنگین اور سفاک واردات ہے!''

چودھری قادر بخش حالات کی نزاکت کا بہ خوبی اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے مذموم کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کسی زمانے میں وہ ...خود بھی اس میدان کا ایک بڑا کھلاڑی رہا تھا۔ چھیمو جن حالات سے گزر کر موت کے منہ میں گئی تھی، چودھری کو اس کا احساس ہو چکا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ چھیمو اور نادر کے تعلقات سے بھی واقف ہو لیکن اس وقت چونکہ اس کے بیٹے کی زندگی پر بن آئی تھی اس لیے وہ مجھے شیشے میں اتار کر اپنے بیٹے کو بچانے کا خواہاں تھا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ بادشاہ ہیں۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

''میں بادشاہ نہیں ہوں چودھری صاحب!'' میں نے دوٹوک انداز میں اس پر واضح کرنے کی کوشش کی ''میں صرف عوام کا خادم ہوں۔ بادشاہ واقعی بڑے بااختیار ہوتے ہیں۔ انسان کی نسلیں ختم کر دیں انہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ سب کچھ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے لیکن میں.....'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''.....میں اتنا بااختیار نہیں ہوں چودھری صاحب کہ چٹکی بجاتے میں سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر ڈالوں۔ ایک بات نوٹ کر لیں آپ، یہ معاملہ گھر میں نہیں نمٹ سکے گا۔ چودھری نادر سے جو بھی پوچھ گچھ ہوگی وہ ادھر تھانے میں ہوگی۔''

''چھیمو دوبارہ زندہ تو نہیں ہوسکتی، اس کے.....!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے فوراً اس کی بات کاٹی اور تلخی بھرے لہجے میں کہا ''اگر چھیمو دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتی تو آپ کا کیا مطلب ہے، اس کے قاتل کو آزاد چھوڑ دیا جائے؟''

وہ بڑے واضح الفاظ میں بولا ''اگر آپ چھیمو کی موت کو ایک حادثہ قرار دے کر اس کیس کی فائل بند کردیں تو میں ہرجانے کے طور پر آپ کو منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے چودھری صاحب!'' میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا ''شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ پوسٹ مارٹم اور لیبارٹری ٹیسٹ وغیرہ کی رپورٹ کی تین کاپیاں تیار کی جاتی ہیں۔ ایک کاپی اسپتال کے ریکارڈ میں رہتی ہے، دوسری کاپی پوسٹ مارٹم شدہ لاش کے ساتھ متعلقہ تھانا ان چارج کو بھیجی جاتی ہے اور تیسری کاپی ایس پی علاقہ یا ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر والوں کو روانہ کردی جاتی ہے لہٰذا اس واقعے کو ایک اتفاقیہ حادثہ قرار دینے کے بارے میں تو آپ سوچیں بھی نہیں!''

وہ بہت دور کی کوڑی لایا ''چھیمو کی موت کو خودکشی کے خانے میں بہ آسانی فٹ کیا جاسکتا ہے..... اگر تھوڑا سا تعاون آپ کردیں تو؟''

وہ اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے ہر راستہ اپنانے کی کوشش کررہا تھا لیکن میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اس کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ چودھری قادر بخش لاکھ ایک معقول انسان سہی لیکن اس کے فرزند نما خلف نے جو کارنامہ انجام دیا تھا وہ انتہائی نامعقول اور قابلِ مذمت تھا۔

میری دیکھا دیکھی چودھری قادر بخش بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی حویلی سے نکلنے سے پہلے اس سے کہا۔ ''چودھری صاحب! مجھ سے آپ کسی نوعیت کے تعاون کی امید نہ رکھیں!''

میرے لہجے میں ایسی قطعیت تھی کہ اسے اندازہ ہوگیا، ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مجھے گھورتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ آپ سے دوستی ہوجائے۔ آپ میرا دوستی والا ہاتھ جھٹک کر جارہے ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔ اب میں اوپر ہی بات کروں گا۔ آپ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کی بات کرتے ہیں نا..... آپ کو شاید پتا نہیں، میری رسائی آئی جی صاحب تک ہے۔ میں کسی بھی طرح اپنے بیٹے کو بچا ہی لوں گا۔''

''یہ آپ کی بھول ہے چودھری صاحب!'' میں نے دروازے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں، آپ کی پہنچ پولیس کے اعلیٰ افسران تک ہوگی مگر شاید آپ یہ بات نہیں جانتے کہ مظلوم کی آہ کی رسائی اس قادرِ مطلق تک ہوتی ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے..... کیا آپ نے اپنی مثال سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔ آپ کا ماضی بھی تو.....!''

میں جملہ نامکمل چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میری بات پوری ہوتی، چودھری قادر بخش کے آنسو نکل آئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ زاروقطار رونے لگا۔ میں ہکا بکا اس کی برستی آنکھوں کو دیکھتا چلا گیا۔

چودھری قادر بخش ماضی میں جن حالات سے گزرا تھا، اس کی تفصیل حاجی مبارک علی مجھے سنا چکا تھا۔ وہ اپنی تمام خرمستیوں سے تائب ہوکر ایک اچھا انسان بن گیا تھا لیکن چودھری نادر نے تاریخ کو دہرا کر اسے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا۔ کہتے ہیں اس دنیا میں انسان کے لیے سب سے بڑے امتحانات صرف دو ہیں۔ نمبر ایک، مال کی محبت۔ نمبر دو، اولاد کی محبت۔ ان دونوں محبتوں کے لیے وہ جائز و ناجائز کی پہچان بھی بھول جاتا ہے۔

چودھری قادر بخش کو بھی بیٹے کی محبت نے مجبور کردیا تھا جو وہ ماضی کے ہر سبق کو فراموش کرکے نادر کو بچانے کے لیے مجھ سے سودے بازی پر اتر آیا تھا، بہرحال اس کی موجودہ بھیگی ہوئی کیفیت نے مجھے کافی متاثر کیا۔ اس کی غم ناک حالت اس بات کا بیّن ثبوت تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ آنسو کی بھی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، اپنا ایک بیان ہوتا ہے اور..... میں چودھری قادر بخش کے آنسوؤں کی زبان و بیان کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا لہٰذا اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس کے بعد کے تمام مراحل بغیر کسی رکاوٹ کے طے ہوگئے۔ چودھری قادر بخش نے پولیس کارروائی میں کوئی روڑا نہ اٹکایا اور نہ ہی دوبارہ میری منت سماجت کی کوشش کی۔ اس کی معاملہ فہمی، فطرت شناسی اور معقول روی نے میرا کام آسان کردیا۔

چودھری قادر بخش کی افسردہ دلی کو دیکھ کر مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا لیکن اسی افسردگی کے عمیم بیچ اس کے چہرے پر ایک سکون اور اطمینان بھی ٹھہرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ایسا سکون اور اطمینان صرف ان لوگوں میں نظر آتا ہے جو راضی بہ رضا ہوتے ہیں۔

قادر بخش نے قدرت کے فیصلے کے سامنے گردن جھکالی تھی!

(تحریر: حُسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غیرت کا معاملہ

ملک صفدر حیات

ایک ناتواں ' نیم جاں کے اشتعال کا احوال۔
غیرت کے پیہم تقاضے... اور طعنے اس کے دامن کو داغ دار کیے ہوئے تھے۔
اس نے ان داغوں کو خون سے دھونے کی کوشش کی تھی۔

ملک صاحب کی یادداشتوں سے ایک خونچکاں روداد

ایک روز میں تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ کسی عارف نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔ یہ خبر چونکا دینے والی ہونے کے علاوہ خاصی واہیات بھی تھی۔ میں نے آج تک کسی عورت کا نام عارف نہیں سنا تھا لہٰذا اطلاع لے کر آنے والے کو میں نے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس شخص کا نام یوسف حلوائی تھا۔ عمر لگ بھگ چالیس سال، قد صرف پانچ فٹ۔ اس پست قامتی پر اس نے اپنے وزن کو بڑی فراخ دلی سے بڑھا رکھا تھا، شاید یہ اس کے پیشے کے اثرات تھے۔ حلوائی چاہے خود مٹھائی کھائے یا نہ کھائے، وہ اس نعمتِ شیریں کو سونگھ سونگھ کر ہی فربہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں نے بہت کم مٹھائی فروشوں کو دبلا پتلا دیکھا ہے۔ یوسف حلوائی پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں کسی کنگ سائز فٹ بال کا تصور ابھرا تھا..... وہ کچھ ایسا ہی گول مٹول اور مضحکہ خیز تھا۔

میں نے اسے ایک چوبی بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''یوسف! کیا تم یہ بتانے آئے ہو کہ عارف نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا ہے؟''

''جج..... جی ہاں.....!'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ ''اور عارف کے شوہر کا نام کیا ہے؟''

''شاہدہ!'' وہ سادگی سے بولا۔

''لگتا ہے، بدن کے ساتھ ساتھ تمہاری عقل بھی موٹی ہو گئی ہے..... بلکہ تمہاری عقل کی تو ندبھی نکل آئی ہے۔'' میں نے یوسف حلوائی کو تیز نظروں سے گھورا۔ ''او بے وقوف! کیا کوئی عورت کسی مرد کا شوہر ہو سکتی ہے یا کوئی مرد کسی عورت کی بیوی ہو سکتا ہے؟''

''جی..... ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا ''لیکن ان میاں بیوی کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔''

اس کے جواب نے مجھے مزید الجھا دیا۔ میں نے اپنی الجھن دور کرنے کے لیے نہایت ہی آسان الفاظ میں یوسف حلوائی سے استفسار کیا ''یعنی تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ بیوی نے مردوں والا نام عارف اور شوہر نے عورتوں والا نام شاہدہ رکھا ہوا ہے؟''

''بالکل نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عارف ایک مرد ہے اور شاہدہ ایک عورت لیکن عارف، شاہدہ کی بیوی بن کر زندگی گزار رہا تھا، اس میں شوہروں والا رعب داب اور سختی نظر ہی نہیں آتی جب کہ شاہدہ بڑی دھانسو قسم کی عورت تھی، بالکل شوہروں کی طرح اس نے عارف کو دبا رکھا تھا۔ وہ اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ شاہدہ اسے اپنے اشاروں پر نچاتی تھی.....'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ان میاں بیوی کی انہی حرکتوں کو دیکھ کر لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ عارف، شاہدہ کی بیوی بن کر زندگی گزار رہا ہے اور شاہدہ اس پر شوہروں کی طرح حکم رانی کرتی ہے۔ یہ بات اور تاثر اتنا عام ہے کہ بے ساختہ میں نے بھی کہہ دیا عارف نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا ہے۔''

میں نے پوری توجہ سے یوسف حلوائی کی وضاحت سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اب بات آئی ہے سمجھ میں..... مجھے نہیں معلوم تھا، یہاں ان میاں بیوی کی شہرت کیسی ہے!''

''آپ کو یہ بات اس لیے بھی عجیب اور نئی لگی کہ آپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں۔'' یوسف نے قدرے مضبوط لہجے میں کہا۔

اور اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مجھے اس قصبے میں تعینات ہوئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ بخت پور نامی وہ قصبہ ضلع جھنگ میں واقع تھا۔ وہ ایک بھرا پرا قصبہ تھا جہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے محتاط اندازے کے مطابق، دوسو، سوا دوسو گھر آباد تھے۔

میں نے آگے بڑھنے سے پہلے یوسف حلوائی سے پوچھا۔ ''تو اب صورتِ حال یہ ہے کہ عارف نے اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے اور تم قتل کی اس واردات کی اطلاع لے کر میرے پاس آئے ہو؟''

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''بالکل یہی بات ہے۔''

میں نے جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہونے سے پہلے یوسف حلوائی سے چند اہم سوالات کیے تاکہ اندازہ قائم کرسکوں کہ یوسف اور عارف کا آپس میں کیا تعلق ہے اور اسے کیسے پتا چلا کہ عارف نے اپنی بیوی شاہدہ کو قتل کردیا ہے۔ میرے ان سوالات کے جواب میں اس نے جو معلومات فراہم کیں اس کا خلاصہ یہ ہے۔

یوسف حلوائی کی دکان قصبہ بخت پور کے مین بازار میں تھی اور اس کی دکان کے ساتھ ہی عارف کی دکان تھی۔ عارف اپنی دکان میں تکے کباب وغیرہ فروخت کرتا تھا۔ کاروبار کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی تھے لہٰذا ان میں اچھی خاصی بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ یوسف کو ہمدرد اور مخلص دوست سمجھتے ہوئے عارف اس سے اپنے دکھ بیان کرتا رہتا تھا۔ یوسف کو عارف کی بے بسی، بے چارگی اور کسمپرسی کا پورا احساس تھا لیکن وہ اس کی مشکلات کو دور کرنے یا کم کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یوسف خود بھی شادی شدہ تھا اور اس بات کا اسے بہ خوبی احساس تھا کہ میاں بیوی کا معاملہ بہت ہی نازک ہوتا ہے اور اس معاملے میں کسی تیسرے آدمی کی براہِ راست مداخلت ہمیشہ خطرناک نتائج ہی لاتی ہے۔ اس کی یہ سوچ بڑی ہی معقول تھی۔

جس حد تک ممکن تھا، یوسف اسے مشورے دیتا رہا لیکن اس کی بتائی ہوئی ہر ترکیب ناکام رہی۔ عارف نے شاہدہ کو قابو کرنے کی جتنی کوشش کی وہ اتنی ہی بے قابو ہوتی چلی گئی۔ جب اس کی خودسری، سرکشی اور من مانی حد سے تجاوز کرگئی تو عارف کو اس کے کردار پر شبہ ہونے لگا۔ اپنے اس درد کو اس نے یوسف حلوائی سے بھی شیئر کیا۔ یوسف بھی یہ سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''یار! تم شاہدہ کی حرکتوں اور زیادتیوں سے پہلے ہی بہت پریشان تھے اور اب یہ ایک نئی ہول ناک خبر سنا رہے ہو۔''

''یار! سمجھ میں نہیں آرہا، میں کیا کروں!'' عارف نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں صرف شک ہے یا.....؟'' یوسف نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عارف ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میں سمجھا کہ شاید مجھے وہم ہوا ہے لیکن چند روز تک جب میں نے اس جانب خصوصی توجہ دی تو میرا وہم پہلے شک میں بدلا اور اب تو مجھے یقین ہوگیا ہے کہ شاہدہ غلط راہ پر چل رہی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں یوسف!''

''یہ بات ہی پریشانی کی ہے۔'' یوسف نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میرا مشورہ مانو..... تم اس موضوع پر تنہائی میں شاہدہ سے بات کرو اور اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔''

''میں ایسی ایک کوشش کرچکا ہوں۔''

''پھر کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

''کچھ بھی نہیں!''

''کیا مطلب؟'' یوسف نے الجھن زدہ انداز میں سوال کیا۔

عارف نے بے بسی سے جواب دیا۔ ''نتیجہ تو اس وقت برآمد ہوتا ہے جب سامنے والا کوئی بات سننے کو تیار ہو۔ میں نے بڑی نرمی سے بات کی لیکن شاہدہ بھڑک اٹھی۔ الٹا اس نے مجھے ہی برا بھلا کہنا شروع کردیا۔ کہنے لگی کہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے جو میرے بارے میں ایسا سوچ رہے ہو۔ تمہیں یہ سب کہتے ہوئے شرم نہیں آئی..... بے شرم کہیں کے؟''

''اوہ.....!'' عارف کی بات سن کر یوسف نے ایک تشویش بھری سانس خارج کی۔ ''یہ تو کام ہی خراب ہوگیا!''

ان کے درمیان چند لمحات تک گمبھیر خاموشی چھائی رہی پھر یوسف نے پوچھا۔

''ان حالات میں تم نے کیا سوچا ہے عارف؟''

''میری تو سوچ اور سمجھ کام ہی نہیں کررہی۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔

''تو پھر میرا ایک مشورہ مانو۔'' یوسف نے بردباری سے کہا۔ ''تمہاری شادی کو لگ بھگ چار سال ہوگئے ہیں اور ابھی تک کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی۔ انسان اولاد کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنے شریکِ حیات کی زیادتی اور ظلم برداشت کرتا رہتا ہے۔ تمہارے ساتھ ایسی کوئی مجبوری یا مسئلہ نہیں ہے..... تو پھر گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ اس شے سے نجات حاصل کرلی جائے جس نے زندگی میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زہر بھر دیا ہو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں یوسف!'' عارف نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''یار! یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی کہ شاہدہ کو طلاق دے کر اپنی زندگی کی اذیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں لیکن یہ بتاؤ..... گزرے ہوئے چار سالوں کا حساب کون دے گا؟''

''چار سال کا حساب؟'' یوسف حلوائی نے چونک کر عارف کی طرف دیکھا۔

عارف نے معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور پُراسرار انداز میں بولا۔ ''ان چار سالوں میں، میں ہر رات مرا ہوں اور ہر صبح مجھے دوبارہ زندہ ہونا پڑا ہے۔ میں نے شاہدہ کا ہر ظلم، زیادتی اور بے ہودگی برداشت کی۔ میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ لوگوں کو ہمارے لڑائی جھگڑے کی خبر نہ ہو۔ مجھے اپنی خالہ کی باتیں بھی یاد آجاتی تھیں۔ تم جانتے ہو نا یوسف! شاہدہ میری خالہ کی بیٹی ہے.....؟''

یوسف حلوائی نے اثبات میں گردن ہلائی، عارف سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''کنیز خالہ نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا، میری ایک ہی بیٹی ہے اور یہ میں تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔ تم ہر طرح سے اس کا خیال رکھنا۔ خالہ، امی کی چھوٹی اور بڑی لاڈلی بہن تھی۔ اب تو یہ دونوں بہنیں اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی امی کا انتقال ہوا ہے۔ میں محض کنیز خالہ کی وجہ سے شاہدہ کو..... اور اس کی ہر بے ہودگی کو برداشت کر رہا تھا لیکن اب میری برداشت کی حد ختم ہوگئی ہے۔ میں جس خالہ کی وجہ سے یہ اذیت اور تکلیف جھیل رہا تھا وہ قبر میں اتر گئی۔ اب اگر میں.....!'' وہ ڈرامائی انداز میں رکا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''اب اگر میں شاہدہ کو طلاق دے کر اپنی زندگی سے نکال دوں تو وہ تو آزاد ہو جائے گی لیکن میں نے پچھلے چار سالوں میں پل پل جو زہر پیا ہے اس کا حساب کون دے گا..... میں شاہدہ کو اتنی آسانی سے آزاد نہیں کر سکتا!''

یوسف نے محسوس کیا کہ عارف کا لہجہ یک دم سنگین ہو گیا تھا۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔ ''پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

''میں شاہدہ کو نہیں چھوڑوں گا!'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

''اچھا..... یعنی اسی اذیت ناک صورتِ حال میں جیتے رہو گے؟''

''ہاں!'' عارف نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کچھ دنوں تک تو اسی کیفیت میں جینا ہوگا!''

یوسف نے عارف کی باتوں کی قطعیت سے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر شاہدہ کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کر چکا ہے۔ فیصلہ کیا تھا.....؟ بس، یہ جاننا باقی تھا۔ عارف نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''یار یوسف! میں تم سے ہر قسم کی بات کر لیتا ہوں اس لیے یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ میں نے شاہدہ کے بارے میں کیا سوچا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے بتایا۔ ''میں نے شاہدہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو اسے ختم کر دوں گا..... نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری!''

یوسف نے تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''یعنی، تمہارا مطلب ہے..... قتل؟''

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے!'' وہ بے رحمی سے بولا۔

یوسف نے پوچھا۔ ''جانتے ہو، تمہاری اس حرکت کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟''

''مجھے کسی نتیجے کی فکر نہیں!'' وہ بے پروائی سے بولا۔

یوسف نے حقِ دوستی نبھاتے ہوئے کہا۔ ''عارف! اگر تم نے شاہدہ کو قتل کر دیا تو تمہاری باقی کی زندگی جیل میں گزرے گی۔''

''تو کیا تمہارے خیال میں، میں پچھلے چار سال سے جنت میں رہ رہا ہوں!'' عارف نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے، جیل کی زندگی میری موجودہ زندگی سے کہیں بہتر ہوگی۔''

یوسف نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یار! میں تمہاری اس خطرناک سوچ کی حمایت نہیں کروں گا۔ گھریلو پریشانیوں نے تمہارے دماغ پر بڑا منفی اثر ڈالا ہے۔''

''میں تم سے حمایت کی درخواست کر بھی نہیں رہا۔'' عارف جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔ ''اور یہ تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے کہ میرے دماغ پر بڑے منفی اثرات ہوئے ہیں.....'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یار یوسف! تپش وہیں محسوس ہوتی ہے جہاں آگ جل رہی ہو۔ میں اپنے حالات کو بہتر طور پر سمجھتا ہوں..... تم صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مجھے یقین ہے، میری جگہ اگر تم ہوتے تو تمہارا فیصلہ بھی کچھ اسی نوعیت کا ہوتا!''

یوسف کو واضح طور پر نظر آنے لگا کہ عارف اپنی ضد سے باز نہیں آئے گا۔ اس کے انداز و اطوار سے جنونی کیفیت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھلکتی تھی۔ بہرحال، اس نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے اتمام حجت ضروری جانا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عارف! ابھی تم نے اپنے جن خوف ناک عزائم کا اظہار کیا ہے، وہ مشروط ہیں.....''

''مشروط ہیں..... کیا مطلب؟'' عارف نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

یوسف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اگر تم نے شاہدہ کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اسے جان سے مارو گے۔ فرض کرو.....!'' یوسف نے ذرا رک کر ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''فرض کرو، تم شاہدہ کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ تو پھر تم کیا کرو گے؟''

''اول تو اس بات کی بالکل امید نہیں کہ میں کامیاب نہ ہوں۔'' عارف نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور اگر ایسا ہوا تو بعد کی بعد میں سوچوں گا!''

یوسف خاموشی ... سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ عارف صحت اور جثے کے اعتبار سے ایسا نظر نہیں آتا تھا کہ وہ غیرت کے نام پر کوئی ''بڑا'' کارنامہ انجام دے سکے۔ اگر اس میں مردوں اور شوہروں والی روایتی خوبو ہوتی تو لوگ اسے شاہدہ کی بیوی مشہور کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ایک کم زور اور دبو قسم کا شوہر تھا لہٰذا یوسف نے اس کی خطرناک انتقامی باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔ یوسف خود بھی اسی قصبے میں رہتا تھا لیکن شاہدہ کے کردار سے متعلق اس نے اس سے پہلے کسی کے منہ سے ایسا کچھ نہیں سنا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاہدہ تیز، بدمزاج اور سرکش قسم کی بیوی تھی لیکن اس کے بے وفائی کا مرتکب ہونے کی اطلاع یوسف کے لیے حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھی۔

آئندہ چند روز تک ان کے درمیان شاہدہ کے حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ عارف نے اپنی گھریلو پریشانیوں کا تذکرہ موقوف کر دیا تھا۔ یوسف کو عارف کی اس پُراسرار خاموشی پر حیرت بھی ہوئی لیکن اس نے اسے کریدنا یا ٹٹولنا مناسب نہ سمجھا۔

اور اب یوسف حلوائی میرے سامنے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

جائے وقوعہ یعنی عارف کا گھر میرے ٹھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں نے ضروری تیاری کے بعد حوالدار نصیر شاہ کو اپنے ساتھ لیا اور جائے واردات کی جانب روانہ ہو گیا۔ اطلاع کنندہ یوسف حلوائی کو بھی میں نے اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔

راستے میں، میں نے اس سے سوال کیا۔ ''تم دونوں کے درمیان شاہدہ کے حوالے سے وہ خطرناک گفتگو کتنا عرصہ پہلے ہوئی تھی؟''

''یہی کوئی بارہ پندرہ دن پہلے۔'' اس نے سوچ کر جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''شاہدہ کا قتل تو یہی ظاہر کرتا ہے کہ عارف نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا؟''

''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''یوسف!'' میں نے گمبھیر انداز میں سوال کیا۔ ''تمہیں یہ کس طرح پتا چلا کہ عارف نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔ کیا تم اس کے پڑوس میں رہتے ہو؟''

''وہ میرے گھر سے کئی گلیاں دور رہتا ہے۔'' اس نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، آج تم صبح اس کے گھر گئے تھے۔ ہیں نا؟''

''جی ہاں'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے اس کے گھر جانا پڑا تھا۔''

''اور وہ ضروری کام کیا تھا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ لمحاتی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔ ''کچھ عرصہ پہلے عارف نے مجھ سے تین سو روپے ادھار لیے تھے۔ کل میں نے اس سے اپنی رقم واپس مانگی۔ مجھے اچانک ان روپوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ عارف نے کہا، اس وقت تو میرے پاس رقم نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، کل صبح میرے گھر آ جاؤ۔ میں تمہیں تین سو روپے دے دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تاکید کی کہ میں صبح ذرا جلدی اس کے پاس آؤں کیونکہ اسے کہیں جانا ہے.....'' وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا۔

''چنانچہ..... میں آج صبح اس کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے امید تھی کہ عارف اس وقت تک جاگ چکا ہوگا۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب تھوڑی دیر تک دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ بھی اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے تشویش ہوئی کہ عارف دروازہ کیوں نہیں کھول رہا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ گھر سے چلا تو نہیں گیا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیسری بار میں نے ذرا زور کی دستک دی اور اس کے ساتھ ہی گھر کے بیرونی دروازے پر زور ڑالا اور اسی لمحے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ دروازہ بند نہیں تھا۔ میرے ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے عارف کو پکارتے ہوئے بے ساختہ گھر کے اندر قدم رکھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس گھر میں کوئی بھی موجود نہ ہو۔ اس صورت حال نے میرے اندر تجسس جگایا کہ مجھے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیے، عارف کے گھر میں آج یہ کیسی ویرانی چھائی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے بلا اجازت یوں کسی کے گھر میں نہیں گھسنا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے اس وقت خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر ایک کمرے میں.....!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جھرجھری لی اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک کمرے میں، میں نے شاہدہ کو مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور.....!''

وہ ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ میں گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ یوسف حلوائی ان لمحات میں خوف زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں چند لمحات تک بغور اس کی کیفیت کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''شاہدہ کو مردہ حالت میں دیکھ کر تم نے سمجھا کہ عارف نے اسے قتل کر دیا ہے.....اور تم اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے پہنچ گئے۔ یہی بات ہے نا؟''

''جج.....جی ہاں.....یہی بات ہے!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں گھر میں عارف بھی کہیں دکھائی دیا؟''

''نہیں جناب!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''عارف مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔''

''تم نے وہاں کتنا وقت گزارا؟'' میں نے سوال کیا۔

''دو چار منٹ.....'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''شاہدہ کی لاش دیکھ کر میں فوراً گھر سے نکل آیا پھر تھانے کی جانب چل پڑا۔''

''ہوں!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''کیا عارف کے گھر سے نکلنے کے بعد، تم نے کسی اور کو شاہدہ کے قتل کے بارے میں بتایا تھا یا سیدھے اِدھر آگئے تھے؟''

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''جب

زندگی بدلنے والی ورزش کی مشینیں

KOBE
KOREAN

ELECTRIC TREADMILL
The King of All Exercise Machines

LCD-TV کے ساتھ بھی دستیاب

LG موٹر و انورٹر کی طاقت اور انتہائی مضبوط چاپانیز بیلٹ کے ساتھ

آرمی، پبلک جمنازیمز، پرائیویٹ کلبز، اور گھر بھر کے استعمال کیلئے

بعد از فروخت سروس اور پارٹس کی فراہمی کی ضمانت

EXERCISE BIKE

اپنے کمرے میں میلوں چلئے اور سائیکلنگ کا لطف اُٹھائیے۔

کسی بھی عمر میں اسمارٹ اور توانائی سے بھرپور رہنے کے لئے صرف 5 منٹ روزانہ کسی بھی وقت استعمال کیجئے۔

بے شمار ماڈلز آپ کے انتخاب کے لئے آپ کے بجٹ کے عین مطابق۔

یاد رکھیے! دائمی صحت برقرار رکھنے کے لئے چند منٹ کی گھریلو ورزش کا کوئی نعم البدل نہیں، ورزش کے کوئی مُضر اثرات نہیں

BILAL BROTHERS
Mustafa Arcade, SMCHS, Karachi. Tel: 4531961-62

Be Sure of our Prompt After Sales Service

LAHORE
NABI BUX & SONS
Tel: 7354004

FAISALABAD
ELECTROLUXE
Tel: 8541004-8543436

PESHAWAR
RASHID SONS
Tel: 5272823-5274931

QUETTA
S. K. BUSINESS MART
Tel: 2825564-2839082

marksman

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں گھبرایا ہوا عارف کے گھر سے باہر نکلا تو ظہور حسین اپنے دروازے میں کھڑا تھا۔ ظہور حسین، عارف کا پڑوسی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا، کیا بات ہے یوسف! تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو..... اور یہ صبح ہی صبح اِدھر؟ میں نے ظہور کو بتایا، میں ایک ضروری کام سے یہاں آیا تھا۔ عارف نے مجھے اسی وقت بلایا تھا لیکن پتا نہیں، وہ خود کہاں غائب ہوگیا ہے۔ اندر اس کی بیوی شاہدہ کی لاش پڑی ہے..... میں اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے جارہا ہوں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم عارف کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ وہاں لگ بھگ ایک درجن افراد جمع تھے۔ چھوٹی سی داڑھی والے ایک ادھیڑ عمر شخص نے عارف کے دروازے کو اس طرح کور کر رکھا تھا جیسے وہاں پہرا دے رہا ہو۔ یوسف نے مجھے بتایا کہ وہی ظہور حسین ہے، وہ غالباً وہاں موجود لوگوں کو عارف کے گھر کے اندر داخل ہونے سے روک رہا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑی تو ظہور نے اطمینان کی سانس لی اور قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''لو جی..... پولیس بھی آگئی!''

ہمیں دیکھ کر لوگ ایک طرف ہٹ گئے۔ ظہور نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور ایک سکون بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اچھا ہوا، آپ تشریف لے آئے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان لوگوں کو روک رکھا تھا۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور عارف کے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔ اپنے پیچھے میں نے صرف حوالدار نصیر شاہ، یوسف حلوائی اور ظہور کو آنے کی اجازت دی۔ دروازے کے باہر جو لوگ اکٹھا تھے ان میں سے ایک کی میں نے وہیں ڈیوٹی لگادی کہ وہ کسی کو اندر داخل نہ ہونے دے۔ رفیق نامی ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ مجھے یقین تھا، وہ باہر کی صورتِ حال کو بہ آسانی کنٹرول کرلے گا۔

وہ ماہِ اکتوبر کے ابتدائی ایام تھے۔ گلابی جاڑا اپنی پوری آب وتاب سے ماحول میں سرایت کرچکا تھا۔ دن خاصا معتدل گزرتا لیکن شام اور خصوصاً رات میں اچھی خاصی ٹھنڈک ہوجاتی تھی۔ لوگوں نے کمروں کے اندر بستر لگالیے تھے اور رات میں کھیس یا ہلکے کمبل اوڑھنے پڑتے تھے۔ ہم صحن سے گزر کر اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں یوسف حلوائی نے شاہدہ کی لاش دیکھی تھی۔

عارف کا گھر تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ دو کمرے پہلو بہ پہلو گھر کے پچھلے حصّے میں واقع تھے۔ ان کے آگے آٹھ فٹ چوڑا ایک برآمدہ تھا پھر چھوٹا سا صحن آجاتا تھا۔ گھر کا تیسرا کمرا وہ بیٹھک تھی جو بیرونی دروازے کے قریب، گھر کے سامنے والے حصّے میں ایک کونے میں بنی ہوئی تھی۔ باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ بیٹھک کی مخالف سمت میں ترتیب وار دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ شاہدہ کی لاش جس کمرے میں پائی گئی وہ عقبی دو کمروں میں سے ایک تھا۔

شاہدہ مردہ حالت میں بستر پر بڑی بے ترتیب پڑی تھی۔ اس کی گردن شہ رگ کے مقام سے کٹی ہوئی تھی بہنے والے بے تحاشا خون نے بستر کو بری طرح آلودہ کردیا تھا۔ بستر کی کیفیت سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ موت کو گلے لگانے سے پہلے شاہدہ کتنا تڑپی ہوگی۔ میں نے بستر کے مختلف خون آلود حصّوں کا بہ غور جائزہ لیا اور مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ شاہدہ کی موت واقع ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ اسے رات کے آخری پہر یا فجر کے وقت گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اسے نیند کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔ کیونکہ وہاں افراتفری کے آثار موجود نہیں تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، شاہدہ کو کسی تیز دھار چھری یا خنجر سے گردن کاٹ کر موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔

شاہدہ کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے چہرے کی دلکشی اور بدن کی شادابی کو مردہ حالت میں بھی بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ مجھے اس کی موت کا دلی افسوس ہوا اور اسی افسردہ دلی کے ساتھ میں موقع کی ضروری کارروائی میں مصروف ہوگیا۔

آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد میں آلۂ قتل برآمد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ گوشت کاٹنے والی بڑے سائز کی ایک چھری تھی جس کے پھل پر لگے ہوئے خون نے مجھے بتادیا کہ اسی کی مدد سے شاہدہ کی گردن کاٹی گئی تھی۔ مذکورہ چھری مجھے باورچی خانے میں، برتنوں کی دو چھتی پر، برتنوں کے پیچھے پڑی ملی تھی۔ یہ ایک اہم تفتیشی پیش رفت تھی۔

میں نے موقع کی ضروری کارروائی کو نمٹا کر مشیر نامہ تیار کیا اور شاہدہ کی لاش کو آلۂ قتل سمیت پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی سرکاری اسپتال بھجوادیا۔ ظہور حسین نے دبی زبان میں مجھ سے کہا بھی کہ میں لاش کو اسپتال روانہ کرنے سے پہلے عارف کی واپسی کا انتظار کرلوں لیکن اس کی یہ فرمائش مجھے غیر اہم اور فضول سی لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو، عارف کہاں گیا ہے؟''

''نہیں جی..... مجھے تو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم مجھے یہ بتا سکتے ہو کہ وہ کب تک واپس آئے گا؟''

''جناب! جب مجھے یہ ہی پتا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے تو میں اس کی واپسی کے بارے میں کیا بتا سکتا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانا بہت ضروری تھا اس لیے میں اس سلسلے میں کوئی تاخیر برداشت نہیں کر سکتا۔ عارف جب واپس آئے گا تو اس سے بھی نمٹ لیا جائے گا! ویسے مجھے امید نہیں کہ وہ واپس آئے۔ مجھے اس کی تلاش میں اپنے بندوں کو بھیجنا پڑے گا!''

میرے لہجے کی معنی خیزی کو محسوس کر کے اس نے چپ سادھ لی۔

میں نے وہاں موجود افراد کے بیانات لینے کا سلسلہ شروع کیا۔ یوسف حلوائی نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! سب سے پہلے آپ میرا بیان لے لیں۔ دوپہر ہونے والی ہے اور مجھے دکان بھی کھولنی ہے۔''

تھانے سے لے کر یہاں تک میں نے یوسف سے متعدد سوالات پوچھے تھے جن کے جوابات میں اس نے مجھے شاہدہ اور عارف کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کی تھیں۔ ایک طرح سے میں اسی کے بیان کی بنیاد پر تفتیش کو آگے بڑھا رہا تھا۔ میرے خیال میں اس سے فوری طور پر پوچھنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اگر آگے چل کر کوئی اہم بات سامنے آتی تو اسے تھانے بلا کر پوچھ گچھ کی جا سکتی تھی چنانچہ میں نے اسے جائے واردات پر مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔

''ٹھیک ہے، یوسف!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''مجھے احساس ہے تم صبح سے خوار ہو رہے ہو مجھے مزید جو کچھ پوچھنا ہوگا، میں دکان پر آ کر تم سے پوچھ لوں گا۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے موقع پر موجود افراد میں سے تین چار کے بیانات لیے جن میں ظہور حسین اور صداقت علی بھی شامل تھے۔ صداقت علی کے علاوہ بھی نے عام اور رسمی سی معلومات فراہم کیں مثلاً یہ کہ عارف اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا۔ شاہدہ کے سامنے اس کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ شاہدہ حاکمانہ مزاج کی مالک ایک دھانسو قسم کی عورت تھی۔ اس نے شروع دن ہی سے عارف کو اس طرح دبایا تھا کہ وہ اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بلاچون و چرا وہ اپنی بیوی کے اشاروں پر ناچتا رہتا تھا اسی لیے پورے قصبے میں مشہور تھا کہ عارف، شاہدہ کی بیوی ہے اور شاہدہ، عارف کا شوہر!

میں نے بڑے محتاط انداز میں شاہدہ کی بے وفائی کے بارے میں بھی سوالات کیے لیکن صداقت علی کے سوا کوئی مقتول کی زندگی کے اس زاویے سے آگاہ نہیں تھا۔ صداقت کی حیثیت بھی کسی چشم دید گواہ کی نہیں تھی تاہم اسے یہ پختہ شک تھا کہ شاہدہ کوئی بڑی گڑبڑ کر رہی ہے۔ ویسے بھی صداقت علی کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا بھی تھا لہٰذا میں اسے اسی کی بیٹھک میں لے کر بیٹھ گیا۔ مجھے امید تھی، صداقت سے کوئی ایسی بات ضرور معلوم ہو جائے گی جو اس کیس کی گتھی کو سلجھانے میں معاون ثابت ہو۔

صداقت علی کے گھر میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے عارف کے گھر کو بند کر کے اس کے داخلی دروازے پر سرکاری تالا لگا دیا تھا۔ آس پڑوس والوں کو میں نے سختی سے ہدایت کر دی کہ جس کو بھی عارف دکھائی دے وہ اسے سیدھا تھانے میں میرے پاس بھیج دے۔

صداقت علی نے میرے ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود بھی خاطر تواضع کے لیے اپنی گھر والی کلثوم کو احکام صادر کر دیے۔ جب ہم بیٹھک میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تو میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''صداقت علی! مجھے اس قصبے میں تعینات ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ میں نے تمہارے پڑوسی جوڑے کے بارے میں بڑی عجیب اور واہیات باتیں سنی ہیں۔ کیا عارف واقعی شاہدہ کے سامنے ایک زرخرید غلام بن جاتا تھا۔ لوگ اسے شاہدہ کی بیوی کیوں سمجھتے تھے۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز تو ضرور چھپا ہوگا؟''

صداقت علی نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ سمجھ دار اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیوں کے مانند ہوتے ہیں جو زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے میں قدم قدم پر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں مگر ان دونوں میں میاں بیوی والا اعتدال اور توازن نہیں تھا۔ ان کے رہن سہن اور باہمی برتاؤ کو دیکھ کر واقعی ایسا لگتا تھا جیسے عارف، شاہدہ کی گھر والی ہو۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زن مرید مرد بھی دیکھے ہیں لیکن ان دونوں کا معاملہ تو حد سے بڑھا ہوا تھا۔ انتہائی بے ہودہ اور شرم ناک!''

''میں یہی تو جاننا چاہتا ہوں صداقت علی!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''ایسی کیا بات تھی جو شاہدہ، عارف سے شوہروں والا سلوک کرتی تھی۔ عارف کی کس کمزوری نے اسے اپنی بیوی کی نظر میں چوہا بنا دیا تھا؟''

''میرے خیال میں جب کوئی شوہر اپنی بیوی کے سامنے چوہا بن جاتا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہوتی ہے!'' صداقت علی نے معنی خیز انداز میں کہا اور خاموش نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''ہوں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا..... تو یہ معاملہ تھا؟''

''دیکھیں ملک صاحب!'' وہ بے حد سنجیدہ ہوگیا۔ ''مجھے اپنی قبر میں جانا ہے اس لیے میں دعوے یا وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کسی بھی انسان کی زندگی کا بہت نازک اور حساس پہلو ہوتا ہے لیکن جب میاں بیوی کی عمروں میں آدھے سے زیادہ کا فرق ہو تو پھر لامحالہ اسی نازک پہلو کی طرف دھیان جاتا ہے!''

میں نے تھوڑی دیر پہلے شاہدہ کو مردہ حالت میں دیکھا تھا اور اس کی عمر کا اندازہ پچیس چھبیس کے قریب لگایا تھا اور آج سے چار سال پہلے یعنی شادی کے وقت وہ اکیس بائیس کی ہوگی۔ یہ تو اس تصویر کا ایک رخ تھا۔ دوسرا رخ یعنی عارف ابھی تک میری نگاہ میں نہیں آیا تھا۔ صداقت علی نے عمروں میں آدھے سے زیادہ فرق کی بات کی تو میں چونک کر اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''عارف کی کیا عمر ہوگی؟''

''کم از کم پچپن سال!'' اس نے فکر سے بتایا۔

''اوہ.....!'' میں بے ساختہ ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

صداقت علی نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! مجھے دیکھیں، اس وقت میری عمر پچاس سال ہو چکی ہے لیکن ابھی بھی ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہوں۔ انسان اگر اپنی صحت پر توجہ دے تو وہ جلدی بوڑھا نہیں ہوتا۔ عارف ہے تو پچپن سال کا لیکن اپنی ''شان دار'' صحت کی بنا پر وہ پینسٹھ ستر کا دکھائی دیتا ہے اور اگر شاہدہ سے اس کا موازنہ کیا جائے تو..... بڑی معذرت کے ساتھ کہوں گا تھانے دار صاحب، ایک ساتھ چلتے ہوئے دونوں باپ بیٹی نظر آتے تھے۔''

''صداقت علی! جیسا کہ تم نے بتایا ہے، شاہدہ کا تمہارے گھر میں اور تمہاری بیوی کلثوم کا اس کے گھر میں آنا جانا تھا۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو گے کہ عورتوں کی گفتگو کا نوے فیصد حصہ دوسری عورتوں کے شوہروں کی ذات سے متعلق باتوں پر مشتمل ہوتا ہے.....''

''ملک صاحب! یہ بات تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''یہ اللہ کی بندیاں ایسا ہی کرتی ہیں۔''

''اگر یہ اللہ کی بندیاں ایسا ہی کرتی ہیں تو...'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''پھر یقیناً کلثوم نے شاہدہ سے اس کے بوڑھے شوہر کے بارے میں بہت کچھ پوچھا ہوگا اور مجھے لگ رہا ہے، شاہدہ نے کلثوم کے پوچھنے سے کچھ بڑھ کر ہی بتایا ہوگا چونکہ ان دونوں کی شادی بے جوڑ تھی اور لوگ دونوں کے خلافِ معمول رویوں کی بنا پر ان کے حوالے سے مختلف عجیب اور واہیات باتیں بھی کرتے تھے لہٰذا میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شاہدہ نے عارف کی ذات سے متعلق بڑے دلچسپ اور سنسنی خیز انکشافات کیے ہوں گے اور..... یہ ممکن نہیں کہ کلثوم نے وہ ساری باتیں تمہیں نہ بتائی ہوں؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ملک صاحب! گاہے بہ گاہے کچھ اس قسم کی باتیں مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں جن سے پتا چلتا تھا، شاہدہ اپنے شوہر سے خوش نہیں!''

اسی لمحے میری خاطر مدارات کا سامان بیٹھک میں پہنچ گیا چنانچہ چند منٹ کے لیے ہم اصل موضوع سے ہٹ کر کھانے پینے کی باتیں کرنے لگے۔ صداقت علی پیشے کے اعتبار سے ایک متوسط زمیں دار تھا۔ اس کے گھر، رہن سہن اور کھانے کے برتنوں سے ظاہر ہوتا تھا، وہ ایک مطمئن اور آسودہ شخص ہے۔ بات چیت اور سوچ و فکر کے لحاظ سے بھی وہ ایک معقول آدمی ثابت ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے توقف کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر مقتول شاہدہ اور اس کے بیوی نما شوہر عارف کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''صداقت! تم بتا رہے ہو، عارف پچپن کے پیٹے میں ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے، شاہدہ سے اس کی شادی صرف چار سال پہلے ہوئی تھی۔ کیا تمہیں معلوم ہے، اس نے اتنی تاخیر سے شادی کیوں کی اور وہ بھی خود سے آدھی عمر کی ایک لڑکی سے؟''

''سب معلوم ہے ملک صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا۔ ''سال ہا سال سے ہم ایک دوسرے کے پڑوس میں رہ رہے ہیں جناب۔ آپ نے جو سوال کیا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ میں ترتیب وار اس کا جواب دیتا ہوں۔ پہلے میں اس کی شادی میں تاخیر کا سبب بتاتا ہوں۔ جب عارف کی شادی کی عمر تھی تو وہ اور اس کی ماں لڑکیوں کو مسترد کرتے رہے۔ کوئی لڑکی اگر عارف کو پسند آجاتی تو اس کی ماں سلمٰی لڑکی میں کوئی نہ کوئی عیب تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتی اور اگر سلمٰی کی نظر کسی لڑکی پر ٹک جاتی تو عارف کسی حیلے بہانے سے اسے ناپسند کردیتا۔ اس طرح عارف کی عمر آگے بڑھتی رہی۔ ان ماں بیٹے کا یہ وتیرہ دیکھ کر لوگ بھی محتاط ہوگئے اور کنواری لڑکیوں کے والدین نے ایک طرح سے انہیں بلیک لسٹ قرار دے دیا چنانچہ سلمٰی جہاں بھی عارف کے رشتے کی بات چلاتی، پہلے ہی قدم پر اسے منع کردیا جاتا۔ اس عمل سے گزر کر عارف جوان سے ادھیڑ عمر ہوگیا۔ پھر جیسے ہی وہ پچاس اکیاون کا ہوا، سمجھیں کہ اس کی لاٹری کھل گئی.....!'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ جو میں لاٹری والی بات بتا رہا ہوں نا، یہی آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب ہے۔ اُدھر ملتان میں عارف کی ایک خالہ کنیز رہتی تھی اور اس اللہ کی بندی کی بھی ایک ہی بیٹی تھی یعنی شاہدہ۔ جب کنیز کا وقتِ آخر قریب آگیا تو اس نے سلمٰی سے کہا، تمہارا بیٹا عارف ابھی تک کنوارا ہے اور میں پتا نہیں، کس پل اس دنیا سے رخصت ہوجاؤں۔ اگر میں مرگئی تو شاہدہ دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ کیوں نہ اس کی شادی عارف سے کردی جائے۔ اس طرح میں بھی آرام سے مرسکوں گی..... یوں شاہدہ کی عارف سے شادی ہوگئی!''

''ایک بات سمجھ نہیں آئی صداقت علی!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''جب کنیز اپنے بھانجے سے اتنی ہی محبت کرتی تھی تو بیٹی سے اس کی شادی کا خیال پہلے اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟''

''اس کی بھی دو وجوہات ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایک وجہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ یہ کہ جب عارف اپنی جوانی کے عروج پر تھا..... تو اس وقت شاہدہ بے چاری پیدا ہوئی ہوگی۔ جب شاہدہ شادی کے قابل ہوئی تو عارف کا بڑھاپا شروع ہوگیا۔ یہ تو ہے ایک وجہ..... دوسری وجہ یہ ہے کہ عارف کی شادی سے کچھ عرصہ پہلے تک دونوں بہنوں یعنی کنیز اور سلمٰی میں شدید ترین اختلافات رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔ سلمٰی یہاں یعنی ضلع جھنگ کے اس قصبے بخت پور میں اپنے بیٹے عارف کے ساتھ رہتی تھی اور کنیز اُدھر ضلع ملتان کے ایک نواحی گاؤں حسین آباد میں اپنی بیٹی شاہدہ کے ساتھ زندگی بسر کررہی تھی پھر جب کنیز شدید بیمار پڑی اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے اپنی موت کو یقینی دیکھتے ہوئے، اپنی بہن سے رنجش کو ختم کردیا۔ سلمٰی نے بھی کنیز کو معاف کردیا۔ اس طرح دونوں ناراض بہنوں کی رنجش ختم ہوئی جس کے نتیجے میں عارف کی شاہدہ سے شادی ہوگئی۔''

''بہت خوب!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو واقعی عارف کی لاٹری نکلی تھی۔''

''لاٹری تو تھی جناب!'' صداقت نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس لاٹری نے بعد میں عارف کا باجا بجا کے رکھ دیا۔ اسی باجے کی گونج میں وہ شاہدہ کی بیوی مشہور ہوگیا تھا۔''

میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ''اگر عارف دم خم والا شوہر ہوتا تو یہی لاٹری اس کی شان وشوکت کے گراف کو کوہِ ہمالیہ سے بھی اوپر لے جاتی!''

''یہ تو آپ بالکل درست فرمارہے ہیں ملک صاحب!'' صداقت علی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''شاہدہ ایسی ہی زوردار اور ٹھسے والی عورت تھی کہ جس کی بھی بیوی ہوتی، اس کا سر فخر سے بلند ہوجاتا۔''

میں نے کہا۔ ''صداقت علی! شاہدہ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوائی جاچکی ہے اور عارف کا ابھی تک کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں غائب ہے۔ یوسف حلوائی کے مطابق، اسے آج کہیں جانا تھا..... کہاں جانا تھا؟ یہ یوسف کو پتا ہے اور نہ ہی اور کوئی شخص یہ بات جانتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عارف نے یوسف سے غلط بیانی کی ہو اور وہ اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کے بعد کہیں فرار ہوگیا ہو؟''

''کون سا منصوبہ ملک صاحب؟'' صداقت نے متذبذب انداز میں پوچھا۔

اس کے استفسار کے جواب میں، میں نے اسے ان معلومات سے آگاہ کردیا جو یوسف حلوائی نے مجھے فراہم کی تھیں۔ صداقت نے پوری توجہ اور انہماک سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''ملک صاحب! یہ بات تو طے ہے اور آپ بھی جانتے ہیں کہ شاہدہ کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ اگر یوسف نے عارف کے بیان کے حوالے سے کوئی جھوٹ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عارف اپنی بیوی کو قتل کر کے خاموشی سے کہیں غائب ہو گیا ہے اور ہمیں..... اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔''

''وہ واپس آئے یا نہ آئے!'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''لیکن اگر وہ شاہدہ کو موت کے گھاٹ اتار کر فرار ہوا ہے تو میں اسے پاتال سے بھی کھینچ کر لے آؤں گا مگر اس سے پہلے ایک بات کا فیصلہ کرنا بہت ضروری ہے۔''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سی بات ملک صاحب؟''

''یہ بات کہ آیا شاہدہ بے وفائی کی مرتکب ہو رہی تھی یا نہیں!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم یوسف کی باتوں کو بنیاد بنا کر عارف کو شاہدہ کا قاتل گردانتے ہیں تو پھر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ شاہدہ چپکے چپکے اپنے شوہر کو دھوکا دے رہی تھی اور عارف نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا..... مگر کس کے ساتھ پکڑ لیا تھا، یہ ایک سنگین سوال ہے!'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا، اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس رنگین و سنگین سوال کے جواب تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تم میری مدد کرو گے صداقت علی کیونکہ..... تمہیں بھی شاہدہ کی ذات کے حوالے سے کچھ اسی قسم کا شک تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ملک صاحب!'' وہ بڑے رسان سے بولا۔

میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''پھر حقیقت کیا ہے، وہ بھی بتا دو؟''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ میری عادت دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ دوسروں کے معاملات میں مداخلت کرنا مجھے بالکل پسند نہیں اور ایسا ہی میں اپنے معاملات کے لیے دوسروں سے بھی چاہتا ہوں.....!''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا تو میں نے کہا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے عارف اور شاہدہ کے بارے میں بہت کچھ سنا لیکن میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ یوں سمجھیں کہ ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال باہر کیا مگر جو کچھ میرے دیکھنے میں آیا، میں اسے نظر انداز نہ کر سکا!'' یہاں تک بتانے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''ملک صاحب! بننا سنورنا عورت کا حق ہے اور شادی شدہ عورت ظاہر ہے، اپنے شوہر کے لیے بناؤ سنگھار کرتی لیکن میرے پڑوس میں یعنی عارف کے گھر میں مجھے اس کے برعکس دیکھنے کو ملتا رہا ہے۔ شاہدہ، عارف کو تو اپنا شوہر ہی نہیں سمجھتی تھی، اس کی دل بستگی کے لیے آرائش و زیبائش تو بہت دور کی بات ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی مرتبہ دیکھا کہ جب عارف گھر میں نہیں ہوتا تھا تو شاہدہ خود کو سنوارنے کے لیے خصوصی اہتمام کرتی تھی حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ شاہدہ کو قدرت نے ماشاء اللہ جو حسن و خوب صورتی عطا کر رکھی تھی اس کے ہوتے ہوئے کسی سجاوٹ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ نے تو اسے مردہ حالت میں دیکھا ہے، اگر زندہ حالت میں اس کی ایک جھلک دیکھ لیتے تو میری بات کو بہ خوبی سمجھ سکتے تھے۔''

''میں شاہدہ کی لاش کو ایک نظر دیکھ کر سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس کے لیے کسی وضاحت یا تفصیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے کہا۔

''میں نے اپنے پیشہ ورانہ کیریئر میں بہت سے زندہ لوگوں کو مردوں میں بدلتے ہوئے دیکھا ہے اور بڑی اچھی طرح جانتا ہوں کہ..... موت، زندگی پر حاوی ہونے کے بعد اس کی کون کون سی رونقیں چھین لیتی ہے بہرحال.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد صداقت علی کو اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''صداقت علی! بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ تم مجھے شاہدہ کی بے وفائی کے حوالے سے کچھ بتانے والے تھے؟''

''جناب! میں اسی طرف تو آ رہا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے محسوس کیا تھا کہ شاہدہ کا بننا سنورنا عارف کے لیے ہرگز نہیں تھا۔ عارف کا کام ایسا تھا کہ اسے دکان دوپہر کے وقت کھولنی پڑتی تھی۔ آپ جانتے ہیں، تکے کباب کی دکان داری دوپہر سے شروع ہو کر رات گئے تک چلتی ہے اور اس میں بھی شام کے بعد کا وقت بے حد مصروف ہوتا ہے اور عموماً انہی اوقات میں شاہدہ کو بے وفائی کا موقع ملتا تھا۔''

''صداقت علی! تم میرے سوال کے جواب میں کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لے رہے ہو۔ اس لیے اگر تم نے اپنی آنکھوں سے شاہدہ کی بے وفائی کا کوئی منظر دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ تاکہ میں اس کے قتل کے سلسلے میں اپنی تفتیش کو آگے بڑھا سکوں؟''

''جناب! میں نے اپنی آنکھوں سے تو کبھی کچھ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''لیکن عارف کی غیر موجودگی میں اس کا خصوصاً بناؤ سنگھار اور نامحرم لوگوں کا اس کے گھر میں آنا..... بہت کچھ سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ جناب! ایک اور بات..... کئی بار یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ جب عارف گھر میں نہیں ہوتا تھا تو گاہے بہ گاہے دو افراد کا وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ میں اس آمدورفت کو اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن کبھی میں نے عارف کے گھریلو معاملات میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی..... اگر شاہدہ کے قتل جیسا سنگین واقعہ نہ ہوا ہوتا اور ایک تھانہ انچارج کی حیثیت سے آپ مجھ سے تعاون کی بات نہ کرتے تو شاید میں اب بھی زبان بند ہی رکھتا!''

میں نے محسوس کیا کہ صداقت علی بنیادی طور پر ایک شریف النفس انسان تھا اس لیے دوسروں کے معاملات میں بولتے ہوئے وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ میں نے اس کی تشفی کے لیے واضح الفاظ میں کہا۔

''میں تمہارے جذبات اور احساسات کو سمجھ رہا ہوں صداقت علی۔ مجھے بتاؤ، وہ دو نامحرم افراد کون ہیں جو عارف کی غیر موجودگی میں اس کے گھر شاہدہ سے ملنے آیا کرتے تھے؟''

''ان میں سے ایک تو یہی مونا یوسف ہے جو ابھی ابھی آپ سے اجازت لے کر گیا ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''اور دوسرے شخص کا نام ہے..... داؤد!''

صداقت علی ایک کے بعد ایک چونکا دینے والا انکشاف کر رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم یوسف حلوائی کی بات کر رہے ہو نا؟''

''جی ہاں..... بالکل!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''یہ یوسف حلوائی، عارف کا سوتیلا بھائی بھی ہے..... اور وہ جو دوسرا آدمی داؤد ہے نا..... وہ کوئی اچھا انسان نہیں۔ آپ اسے آوارہ، اوباش شخص سمجھ لیں۔''

میں حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات سے صداقت علی کو تکنے لگا۔ یوسف حلوائی کے حوالے سے اس نے ایک نئی بات کر دی تھی۔ اب تک یوسف سے میری ڈھیروں باتیں ہوئی تھیں لیکن کسی بھی مرحلے پر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ عارف کا سوتیلا بھائی ہے۔ اس کی تمام تر گفتگو سے یہی تاثر ابھرتا تھا کہ ان دونوں میں اچھے اور خوش گوار دوستانہ تعلقات ہیں۔ رشتے داری کی طرف تو بھولے سے بھی دھیان نہیں گیا تھا۔

''کیا عارف اور یوسف واقعی سوتیلے بھائی ہیں؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ شاکی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میں آپ سے غلط بیانی کیوں کروں گا۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ یوسف حلوائی سے خود پوچھ لیں۔''

''وہ تو جب بھی نظر آئے گا، میں اس سے پوچھ ہی لوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ یوسف نے کیوں نہیں بتایا مجھے کہ وہ عارف کا سوتیلا بھائی ہے؟''

''ممکن ہے، وہ اس ناخوش گوار موضوع کو زیر بحث نہ لانا چاہ رہا ہو!''

''ناخوش گوار موضوع؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے صداقت علی کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا ''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ ماضی بعید میں عارف کے باپ قاسم علی نے عارف کی ماں کو طلاق دے دی تھی۔ اس وقت عارف کی عمر یہی کوئی دس بارہ سال رہی ہوگی۔ سلمٰی اور قاسم علی کے درمیان ایک بہت بڑے جھگڑے نے جنم لیا اور اس جھگڑے کے نتیجے میں قاسم علی، سلمٰی کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد قاسم علی نے فریدہ نامی ایک عورت سے شادی کر لی۔ یہ یوسف حلوائی اسی فریدہ کا بیٹا ہے۔ یوسف کی عمر چھ سات سال تھی تو قاسم علی نے زلیخا نامی ایک خوب صورت عورت سے تیسری شادی کر لی۔ اس بار اس نے فریدہ (دوسری بیوی) کو اپنی زندگی سے خارج نہیں کیا تھا۔ کچھ عرصے تک تو فریدہ اپنی سوتن زلیخا کو برداشت کرتی رہی اس کے بعد لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک نہ چل سکا اور بالآخر فریدہ اپنے بیٹے کو لے کر قاسم علی سے علیحدہ ہو گئی۔ قاسم علی نے فریدہ کو طلاق نہیں دی تھی اور نہ ہی فریدہ نے ایسا کوئی مطالبہ کیا تھا۔ ان تمام کرداروں میں سے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہے، بس عارف اور یوسف بچے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں داخل ہو چکے ہیں۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''خاصی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی ہے..... کیا زلیخا نامی اس عورت سے بھی قاسم علی کی کوئی اولاد پیدا ہوئی تھی؟''

''نہیں!'' صداقت علی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے دوسرے مشکوک بندے کے بارے میں اس سے پوچھا۔ ''اور یہ داؤد کون ہے؟''

''داؤد بھی اسی قصبے ہی میں رہتا ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے ملک صاحب! داؤد ایک آوارہ شخص ہے۔ کوئی خاص کام دھندا نہیں کرتا۔ آپ اسے ایک سڑک چھاپ غنڈا سمجھ لیں۔ اپنے سے کمزور لوگوں پر رعب ڈال کر غنڈا ٹیکس وصول کرتا ہے۔ مار، پیٹ اور چوری چکاری کے کاموں میں بھی ملوث رہتا ہے۔ ایک آدھ بار مختصر مدت کے لیے جیل بھی جا چکا ہے.....!''

میں گہری سوچ میں پڑ گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یوسف کے لیے تو اس حوالے سے تھوڑی بہت رعایت نکالی جا سکتی ہے کہ وہ عارف کا سوتیلا بھائی ہے۔ عارف کی موجودگی میں وہ اگر اس کے گھر میں آتا جاتا نظر آیا ہے تو یہ کوئی اتنی معیوب بات نہیں لیکن داؤد جیسے ایک مستند غنڈے کی وہاں آمد و رفت قابلِ غور ہے۔ میں موجودہ حالات میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عارف نے اپنی بیوی کے حوالے سے یوسف حلوائی کو جو کچھ بتایا تھا وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ شاہدہ کا قتل اور عارف کی روپوشی بھی اسی جانب اشارہ کر رہی ہے!''

''آپ کا کہنا برحق ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''شاہدہ کے طور طریقے بڑے خطرناک تھے، خاص طور پر عارف کی غیر موجودگی میں اس کا انداز ہی بدل جاتا تھا، اس پر داؤد کا گھر میں آنا واقعی ان حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کا تھوڑی دیر پہلے آپ نے ذکر کیا ہے لیکن میرے خیال میں یوسف حلوائی کو بھی کوئی رعایت نہیں ملنی چاہیے۔ بہرحال، وہ بھی تو شاہدہ کے لیے نامحرم ہی ہے نا، عارف کی غیر موجودگی میں، چوری چھپے شاہدہ سے ملنے کے لیے اس کا آنا جانا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!''

''میں نے یوسف کو نظر انداز کرنے کی بات نہیں کی صداقت علی!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اس سے تو میں بڑی سخت پوچھ گچھ کروں گا۔ تم فکر نہ کرو، انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

وہ گہری فکرمندی سے بولا۔ ''ملک صاحب! حالات و واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ عارف، شاہدہ کو قتل کر کے کہیں فرار ہو گیا ہے۔ آپ اسے کیسے تلاش کریں گے؟''

''میں سب سے پہلے تو یہ جاننا چاہوں گا کہ وہ بخت پور سے باہر اور کہاں کہاں جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے رشتے دار یا دوست یار کن کن علاقوں میں رہتے ہیں؟''

''میری معلومات کے مطابق، عارف کی صرف ایک ہی رشتے دار باقی بچی تھی یعنی شاہدہ! اب وہ بھی زندہ نہیں رہی۔ یہی احوال اس کے یار دوستوں کا بھی ہے۔ میں نے اسے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی ان کے گھر میں مہمانوں وغیرہ کی آمد و رفت ہوتی تھی لہٰذا اس سلسلے میں، میں تو آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا جناب!'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر معتدل لہجے میں بولا۔ ''اس سلسلے میں ہو سکتا ہے، یوسف حلوائی آپ کی کوئی مدد کر دے!''

''میں اسے ضرور چیک کروں گا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''لاش پوسٹ مارٹم کے بعد کل واپس آ جائے گی۔ شاہدہ کا وارث تو عارف ہی تھا لیکن وہ منظر سے غائب ہو گیا ہے۔ یوسف کے مطابق، اگر واقعی وہ کسی کام سے کہیں گیا ہے تو شام تک اسے واپس آ جانا چاہیے۔ اگر وہ واپس آ جاتا ہے تو اچھی بات ہے، میں شاہدہ کی لاش اس کے حوالے کر دوں گا بہ شرطیکہ وہ شاہدہ کے قتل میں ملوث نہ پایا گیا..... لیکن اگر اس کی واپسی نہیں ہوتی تو ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا!''

''دیکھیں جناب!'' وہ بڑے رسان سے بولا۔ ''اگر تو عارف، شاہدہ کو قتل کر کے فرار ہوا ہے تو اس کی واپسی کی امید نہ رکھیں..... بس سمجھیں، وہ گیا ہاتھ سے!''

''وہ ہاتھ سے تو نہیں جاتا صداقت علی!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے، اُدھر ملتان میں شاہدہ کے دیگر رشتے دار بھی ہیں؟ اگر آج شام تک عارف واپس نہیں آتا تو کل صبح کسی بندے کو ملتان بھیج کر شاہدہ کے رشتے داروں کو اس اندوہ ناک واقعے کی خبر تو دینی ہو گی نا!''

وہ شکست خوردہ انداز میں گردن کو دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''یہ سوال مجھے یوسف حلوائی ہی سے پوچھنا پڑے گا!'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

صداقت علی خاموش نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں مزید دو چار سوالات کے بعد اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔ واپسی کے سفر میں، میں اکیلا ہی تھانے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ میرے ساتھ جائے وقوعہ کی طرف آنے والوں میں سے حوالدار نصیر شاہ کو میں نے شاہدہ کی لاش کے ہمراہ سرکاری اسپتال بھجوا دیا تھا اور یوسف حلوائی مجھ سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا تھا۔ جب یوسف، عارف کے گھر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جارہا تھا تو میرا اندازہ یہی تھا کہ اس سے مزید کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں لیکن حالات میں اچانک ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی اور میرے خیال میں، اب یوسف سے پوچھنے کے لیے بہت کچھ جمع ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے داؤد کو تھانے بلا کر اس کا شاندار ''انٹرویو'' بھی کرنا تھا۔

میں اسی لائحۂ عمل کو ترتیب دیتے ہوئے تھانے پہنچ گیا۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ضلع جھنگ کے نواح میں واقع بخت پور نامی یہ قصبہ خاصا گنجان آباد تھا اور مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ میں قصبے کے معاملات اور تمام لوگوں سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکا تھا چنانچہ نئی نئی باتیں سامنے آ رہی تھیں۔ بہرحال، کوئی بھی بات ہمیشہ نئی نہیں رہتی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانی ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ان لوگوں کو میرے لیے اور مجھے ان کے لیے پرانا ہو جانا تھا۔ یہی حقیقت ہے اور دستورِ زمانہ بھی!

دوپہر کے بعد میں نے حیدر علی نامی کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور اس سے داؤد کے بارے میں مختلف سوالات کیے۔ حیدر علی اسی قصبے کا رہنے والا تھا اور میں نے اسے خاصا ہوشیار قسم کا بندہ پایا تھا۔ اس نے میرے سوالات کے جوابات میں ان باتوں کی تصدیق کر دی جو صداقت علی نے مجھے داؤد کے حوالے سے بتائی تھیں تاہم حیدر علی اس بات سے واقف نہیں تھا کہ داؤد کا عارف کے گھر میں آنا جانا تھا۔ میں نے خصوصی ہدایات کے ساتھ حیدر علی کو داؤد کی جانب روانہ کر دیا۔ اسے داؤد کو بڑے طریقے سلیقے سے گھیر کر اپنے ساتھ تھانے لانا تھا۔ ساتھ ہی یوسف حلوائی کو بھی یہ پیغام دینا تھا کہ مجھ سے تھانے آ کر ملے۔

وہ احکام کی تعمیل کا یقین دلا کر میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حوالدار نصیر شاہ اسپتال سے واپس آ گیا پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ نصیر شاہ ایک سمجھدار اور تجربہ کار حوالدار تھا۔ میں نے اسے ان باتوں سے آگاہ کیا جو صداقت علی نے مجھے بتائی تھیں۔ داؤد کے بارے میں نصیر شاہ کی رائے بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ اس کی بدمعاشیوں اور بدتمیزیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''شاہ جی! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی آپ داؤد کے کالے کرتوت سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور ابھی تک اس کے خلاف سخت قسم کی کارروائی کیوں نہیں کی گئی؟''

''اس کے خلاف قانونی کارروائی ہو چکی ہے جناب!'' حوالدار نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ جیل بھی کاٹ چکا ہے۔''

''میں اس کی جیل یاترا کے بارے میں سن چکا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس قسم کی چھوٹی موٹی سزاؤں سے داؤد جیسے لوگوں کا ''بھلا'' نہیں ہوتا۔ انہیں یا تو کہیں لمبا ہی فٹ کرنا پڑتا ہے یا پھر گاہے بہ گاہے، خاطر مدارات کے لیے تھانے بلاتے رہنا چاہیے۔''

''کہتے تو آپ بالکل ٹھیک ہیں جناب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن داؤد جیسے غنڈوں کے معاملے میں ایک مسئلہ ہمیشہ رہتا ہے۔''

''کیسا مسئلہ؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! یہ جو داؤد ہے نا..... یہ بہت سوچ سمجھ کر کارروائی کرتا ہے۔ اپنے برابر کے یا زیادہ طاقت ور لوگوں پر اس نے کبھی ہاتھ نہیں ڈالا ہمیشہ کمزور افراد کو نشانہ بناتا ہے..... کمزور آدمی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں ظلم و زیادتی برداشت کرنے کا بڑا حوصلہ ہوتا ہے لہٰذا وہ ظالم کی شکایت لے کر کسی صاحبِ اختیار آدمی کے پاس نہیں پہنچتا اور..... آپ جانتے ہیں ملک صاحب! جب تک کسی شخص کے خلاف ہمارے پاس کوئی رپورٹ نہ آئے، ہم کارروائی نہ کرنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔''

''یہ مجبوری اپنی جگہ.....'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن داؤد جیسے غنڈوں سے نمٹنے کے لیے پولیس کے پاس اور بھی کئی راستے، ہوتے ہیں۔ اگر ایک تھانہ انچارج داؤد جیسے لوگوں کے سامنے بے بس ہو جائے تو پھر ہو گئی تھانے داری.....!''

میں نے حوالدار نصیر شاہ کو یہ بتا دیا تھا کہ داؤد کو یہاں بلانے کے لیے کانسٹیبل حیدر علی روانہ ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو آگے بڑھی تو حوالدار نے کہا۔

''ملک صاحب! اگر یوسف حلوائی کا بیان درست نکلا تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی!''

میں نے اس کی بات سمجھنے کے باوجود بھی پوچھا۔ ''کس قسم کی مشکل شاہ جی؟''

''دیکھیں جناب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اگر عارف کی، یوسف سے کہی ہوئی یہ بات سچ نکلتی ہے کہ شاہدہ بے وفائی کی مرتکب ہورہی تھی تو اس امر کے قوی امکانات ہیں، عارف ہی نے شاہدہ کو قتل کیا ہوگا۔ اس صورت میں عارف کی واپسی مشکوک ہوجاتی ہے۔ ان حالات میں شاہدہ کی لاش کا کیا ہوگا، کس کے حوالے کریں گے لاش کو ہم، یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی؟''

میں نے نصیر شاہ کو صداقت علی سے ہونے والی بات چیت کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ اس میں شاہدہ کی بے وفائی کے حوالے سے داؤد اور یوسف حلوائی کا خصوصاً ذکر کیا اور آخر میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یوسف حلوائی، صداقت علی اور شاہ جی..... آپ سمیت، سب کا یہی خیال ہے کہ اگر عارف نے شاہدہ کو قتل کیا ہے تو وہ پلٹ کر بخت پور میں قدم نہیں رکھے گا۔ ٹھیک ہے، حالات وواقعات کی روشنی میں اس بات کے امکانات تو ہیں کہ عارف نے شاہدہ کی بے وفائی پر اسے قتل کردیا ہو لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے، حقیقت اس کے برعکس ہو۔ عارف کا شاہدہ کے قتل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ واقعی کسی کام سے کہیں گیا ہو۔ ہمیں اس واقعے کے اس زاویے کو یک سر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔''

''اللہ کرے! ایسا ہی ہو ملک صاحب!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! شاہدہ قتل ہوگئی اور اس کا شوہر متوقع قاتل عارف منظر سے غائب ہے۔ ان دونوں کے سوا اس گھر میں اور کوئی نہیں رہتا تھا اس لیے میں نے اس گھر پر سرکاری تالا لگوادیا ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ جب تک اس کیس کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا، عارف کے گھر کی نگرانی بہت ضروری ہے، خصوصاً رات کے وقت۔ اس قسم کے بند گھر چوروں اور ڈکیتوں کی دلچسپی کا خصوصی مرکز بن جاتے ہیں۔ اس گھر پر جو قیامت ٹوٹی ہے، سو ٹوٹی ہے..... کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسا ہی کوئی مہم جو چور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں صفایا ہی نہ کردے لہٰذا کسی چالاک قسم کے کانسٹیبل کی وہاں ڈیوٹی لازمی ہے۔''

''ہمارے تھانے میں ایک ایسا کانسٹیبل ہے جناب جو راتوں کو جاگنے کا بڑا ماہر ہے۔'' نصیر شاہ نے بتایا۔ ''عارف کے گھر پر اسی کی ڈیوٹی لگادیتے ہیں!''

''ٹھیک ہے، بلائیں اس کانسٹیبل کو'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد کانسٹیبل وسیم میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک صحت مند اور چاق چوبند شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے، تم راتوں کو جاگنے کے بہت ماہر ہو؟''

''بس جی، اپنی اپنی عادت کی بات ہوتی ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''کچھ لوگ رات کو جلدی سو جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کو دیر سے نیند آتی ہے۔ میں کبھی بھی آدھی رات سے پہلے نہیں سویا اور اگر کوئی دلچسپ مصروفیت ہو تو پوری رات جاگ کر بھی گزار سکتا ہوں۔''

''پھر اگلے روز تمہیں نیند آتی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''بس دن میں ایک دو گھنٹے آرام کے لیے مل جائیں تو گزارہ ہوجاتا ہے۔''

''بس تو ٹھیک ہے!'' میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اسے عارف کے گھر کی خفیہ نگرانی کے بارے میں بتایا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور آخر میں کہا۔ ''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں ابھی اُدھر روانہ ہوجاتا ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''انشاء اللہ! آپ کو میرے کام سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''وسیم!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس نگرانی کے دوران میں اگر تمہیں کوئی بھی غیر معمولی بات نظر آئے تو فوراً ایکشن میں آجانا اور اس واقعے کی اطلاع دینے میں کسی قسم کی تاخیر سے کام نہیں لینا۔'' میں لمحے بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر تمہیں کسی بھی وقت، کہیں بھی عارف کی شکل نظر آئے تو اسے پہلی فرصت میں پکڑ کر میرے پاس لے آنا۔''

''آپ فکر نہ کریں جناب!'' وہ یقین دہانی کروانے والے انداز میں بولا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں، مجھے وہاں کس نوعیت کی ڈیوٹی دینی ہوگی۔''

وسیم کے جانے کے بعد، میں دوبارہ حوالدار نصیر شاہ کی طرف متوجہ ہوگیا اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی! آپ ذرا یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اُدھر ملتان میں شاہدہ کا کوئی ولی وارث ہے یا نہیں۔ میں نے یہاں کے لوگوں سے اب تک جو بھی پوچھ تاچھ کی ہے اس کے مطابق تو عارف اور شاہدہ کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔''

''معلومات تو میری بھی یہی ہیں ملک صاحب!'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''لیکن پھر بھی میں ٹرائی کرکے دیکھتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی وقت کانسٹیبل حیدر علی واپس آ گیا۔ وہ ''خالی ہاتھ'' لوٹا تھا۔

''کیا بات ہے حیدر علی! تم جن لوگوں کو لینے گئے تھے وہ کہاں ہیں؟''

شاید میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا۔ جب میں نے حیدر علی کو داؤد کو لانے کے لیے روانہ کیا تھا تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا، اُدھر مین بازار میں یوسف حلوائی سے بھی کہتا جائے کہ وہ فوراً تھانے آ کر مجھ سے ملے۔ ''لوگوں'' سے میری مراد یہی داؤد اور یوسف حلوائی ہی تھے۔

حیدر علی نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ ''ملک صاحب! میں آپ کی ہدایت کے مطابق، پہلے مین بازار میں یوسف کے پاس ہی گیا تھا اور اسے آپ کا حکم سنا دیا تھا.....!''

''پھر اس نے کیا کہا؟'' میں نے حیدر علی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''وہ کہہ رہا تھا، بس میں ابھی پانچ منٹ میں تھانے پہنچتا ہوں۔''

''اس کے یہ پانچ منٹ کتنے لمبے ہیں!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب تو اس بات کو پونا گھنٹا ہونے کو آ رہا ہے اور وہ یہاں نہیں پہنچا؟''

''جناب! اگر آپ کا حکم ہو تو میں دوبارہ اس کی طرف جاتا ہوں اور اسے کان سے پکڑ کر لاتا ہوں۔'' حیدر علی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''ہاں، اس کے ساتھ تو یہی سلوک کرنا پڑے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا ''اور.....اس داؤد کی کیا رپورٹ ہے؟''

''داؤد اس وقت بخت پور میں موجود نہیں جناب!'' وہ حتمی انداز میں بولا۔

''بخت پور میں موجود نہیں تو کہاں چلا گیا؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

حیدر علی نے بتایا۔ ''میں نے اس کے بارے میں مختلف لوگوں سے پوچھا ہے، اس کے گھر والوں سے بھی بات کی ہے۔ پتا چلا ہے، وہ آج صبح چک عمر گیا ہے اور اس کی واپسی کل کسی وقت ہوگی۔''

چک عمر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور بخت پور کے مغرب میں تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس داؤد کم بخت کو بھی آج ہی چک عمر جانا تھا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی سوال ابھرا کہ کہیں داؤد کسی خاص پلاننگ کے تحت تو بخت پور سے غائب نہیں ہوا۔ اس کا غیاب، موجودہ صورتِ حال میں اس جانب اشارہ کرتا تھا کہ شاہدہ کے قتل سے اس کا کوئی نہ کوئی تعلق ہو سکتا ہے..... بلاواسطہ یا بالواسطہ۔ اس کے ''انٹرویو'' کے لیے مجھے کل تک انتظار کرنا تھا یا فوری طور پر چک عمر جا کر اس کی گردن پکڑنی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے یوسف حلوائی کو چیک کر لوں۔ اس کے بعد داؤد کی طرف رخ کروں گا۔

میں نے حیدر علی سے کہا۔ ''تم جاؤ..... اور یوسف حلوائی کو کان سے پکڑ کر لے آؤ!''

وہ ''اچھا جناب!'' کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد حوالدار نصیر شاہ نے کہا۔ ''ملک صاحب! شاہدہ کی لاش کو یوسف حلوائی کے سپرد بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ عارف کا سوتیلا بھائی ہے۔ اس حوالے سے وہ شاہدہ کا بھی رشتے دار ہی ہوا۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں یوسف حلوائی کو کاسٹک سوڈے سے دھونا چاہتا ہوں۔''

''آپ اس کی صفائی دھلائی ضرور کریں جناب! حیدر علی ابھی اسے کان سے پکڑ کر لانے والا ہے۔'' حوالدار نے کہا ''میں بھی اس کام میں مصروف ہو جاتا ہوں جو آپ نے مجھے سونپا ہے۔''

''بالکل..... بالکل۔'' میں نے جلدی سے کہا ''نیک کام میں تاخیر اچھی نہیں ہوتی!''

حوالدار نصیر شاہ کو میرے کمرے سے رخصت ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ حیدر علی، یوسف حلوائی کے ساتھ حاضر ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! یوسف مجھے راستے ہی میں مل گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ اِدھر ہی آ رہا تھا تو میں اسے کان سے پکڑے بغیر ہی سیدھا آپ کے پاس لے آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، حیدر علی! تم جاؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

میرے اشارے پر یوسف حلوائی چوبی بنچ پر بیٹھ گیا اور الجھن زدہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''یوسف! تم تو صرف پانچ منٹ میں میرے پاس آنے والے تھے اور اب ایک گھنٹے سے بھی زیادہ گزر گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ کیا تمہارے پانچ منٹ اتنے طویل ہوتے ہیں۔''

منت آمیز لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے اس نے بتایا۔ ''وہ بس جناب! نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ آپ مجھے معاف کردیں۔''

''دیر سے آنے کی معافی تو تمہیں مل جائے گی یوسف لیکن.....'' میں نے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو اس نے جلدی سے پوچھا۔

''دلل..... لیکن کیا تھا نے دار صاحب؟''

''لیکن یہ کہ تم نے جو غلط بیانی کی ہے..... بلکہ جس طرح حقیقت کو چھپایا ہے اس جرم کی معافی ملنی آسان نہیں!''

''جناب..... میں نے کس حقیقت کو چھپایا ہے؟'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ ''یوسف! کیا تم عارف کے سوتیلے بھائی ہو؟''

''نن..... ہاں.....'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''جی ہاں..... بالکل بالکل.....!''

اس کے تاثرات اور فوری ردعمل سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اس کی بوکھلاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یہ حقیقت تم نے مجھ سے کیوں چھپائی..... جانتے ہو، کسی اہم بات کو چھپانا بھی غلط بیانی ہی کے زمرے میں آتا ہے؟''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب.....!'' وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولا ''مجھے کیا پتا تھا، آپ کو یہ بات معلوم نہیں۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ یہاں کے تھانے دار ہیں۔ آپ سب کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہوں گے!''

''سب کی تفصیل تو میں بعد میں جمع کروں گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو مجھے صرف تمہارے بارے میں کچھ خطرناک نوعیت کی خبریں ملی ہیں، پہلے ان کی پوچھ پڑتال کرلوں، باقی کو بعد میں دیکھیں گے۔''

''جناب.....!'' اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات ابھر آئے، سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے استفسار کیا۔ ''مم..... میں نے کیا کیا ہے.....؟''

میں فوری طور پر اندازہ قائم نہ کرسکا کہ اس کا خوف اور گھبراہٹ مصنوعی تھے یا واقعی وہ یہ بات سن کر ڈر گیا تھا بہرحال وہ ڈرا سہما ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے نا..... عارف نے اپنی بیوی شاہدہ کے حوالے سے چند روز پہلے تم سے کیا کہا تھا؟''

''جی ہاں..... جی ہاں'' وہ بڑی سرعت سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ وہی شاہدہ کی بے وفائی والی بات کررہے ہیں نا؟''

''ہاں، میرا اشارہ اسی طرف ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے مطابق، عارف کا کہنا یہ تھا کہ اس نے جیسے ہی شاہدہ کی ''چوری'' پکڑلی، وہ اسے قتل کردے گا اور پھر..... جب شاہدہ قتل کردی گئی تو تم نے یہی خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید عارف نے شاہدہ کو رنگے ہاتھوں پکڑلیا ہے۔ تبھی وہ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد غائب ہوگیا ہے!'' میں نے لمحے بھر کو توقف کرکے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے صبح جب تم سے پوچھا کہ وہ شخص کون ہوسکتا ہے جس نے بے وفائی میں شاہدہ کا ساتھ دیا تو تم کوئی جواب دینے سے قاصر رہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''جج..... جی..... بالکل!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''واقعی، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں جناب! آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم بھی اٹھالوں گا۔''

''تمہیں چھوٹی یا بڑی قسم اٹھانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں یوسف!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میں نے ایسے دو افراد کا سراغ لگالیا ہے جو عارف کی غیر موجودگی میں چوری چھپے شاہدہ سے ملنے اس کے گھر جایا کرتے تھے۔''

''اچھا جی!'' اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''وہ دونوں کون ہیں جناب؟''

''ایک کا نام تو داؤد ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اور دوسرا.....!'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ''دوسرا کون ہے جناب؟''

''دوسرا بندہ اس وقت میرے سامنے بیٹھا ہے!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''مم..... میں.....؟'' وہ ہراساں نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں تم، یوسف!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، تم بھی عارف کی غیر موجودگی میں شاہدہ سے ملنے جایا کرتے تھے۔''

''یہ بالکل غلط ہے جناب!'' وہ قدرے احتجاجی انداز میں بولا۔ ''آپ کو میرے بارے میں ایسی اطلاع کس نے دی ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم اطلاع کنندہ کی کھوج میں نہ پڑو۔'' میں نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ، تم عارف کے غیاب میں شاہدہ سے ملنے جاتے تھے یا نہیں؟''

وہ قدرے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔ ''جناب! عارف کے بھیجنے پر تو ایک آدھ بار گیا ہوں لیکن ابھی ہم جس حوالے سے بات کر رہے ہیں اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عارف میرا سوتیلا بھائی ہونے کے علاوہ میرا گہرا دوست بھی ہے۔ میں اس کے گھر پر بری نظر کیسے ڈال سکتا ہوں۔ یقیناً کسی نے میرے بارے میں آپ سے غلط بیانی کی ہے۔ بتائیں جناب! وہ شخص کون ہے جس نے میرا نام لیا ہے؟''

میں نے یوسف کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، عارف نے ایک آدھ بار تمہیں اپنی غیر موجودگی میں گھر کیوں بھیجا تھا؟''

''وہ جناب، بات دراصل یہ ہے کہ.....'' وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔ ''دو چار مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ مجھے کسی کام سے اپنے گھر جانا پڑا۔ جب میں دکان عارف کے حوالے کر کے جانے لگا تو اس نے پوچھا، آج کون سا تازہ آئٹم بنانا ہے۔ میں اسے تازہ بننے والی مٹھائی کا نام بتا دیتا اور وہ کہتا، تم گھر تو جا ہی رہے ہو، ذرا میرے گھر تک بھی ہوتے آنا اور جو تازہ مٹھائی بنی ہے، ایک سیر شاہدہ کو دے آنا۔ تمہاری بھابی کو مٹھائی بہت پسند ہے۔ میں بلا جھجک اس کی فرمائش پوری کر دیتا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''بس، اتنی سی بات ہے جناب! میں دو چار مرتبہ مٹھائی دینے عارف کی غیر موجودگی میں مگر اس کے کہنے پر وہاں گیا ہوں۔ تھوڑی دیر گھر میں بیٹھا ہوں گا اور پھر واپس آ گیا..... داؤد تو ایک لچا لفنگا شخص ہے۔ اس سے کسی بھی برائی کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن جس کسی نے بھی مجھے اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوشش کی ہے وہ مجھ سے دشمنی کر رہا ہے۔ جناب! میں بیوی بچوں والا ہوں۔ ایسی نازیبا حرکت کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا..... میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس شخص کا نام بتا دیں جس نے آپ کو میرے خلاف بھڑکایا ہے؟''

بات ختم کرتے کرتے اس کا لہجہ خاصا جذباتی بلکہ جارحانہ ہو گیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یوسف! تمہاری نیت میں کوئی فتور نہیں تھا۔ تم عارف کی بیوی کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کسی غلط مقصد سے کبھی اس کے گھر نہیں گئے، تمہارے لیے بس یہی کافی ہونا چاہیے۔ تم اس فکر میں خود کو دبلا نہ کرو کہ مجھے تمہارے بارے میں کس نے بتایا!''

''پھر بھی ملک صاحب! پتا تو چلے، وہ میرا چھپا ہوا دشمن آخر ہے کون؟'' اس کے انداز میں اچھا خاصا اصرار پایا جاتا تھا۔

میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''وقت آنے پر میں اس شخص کا نام ظاہر کر دوں گا۔'' پھر شاکی نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''یوسف! تم سے ایک بڑی سنگین غلطی ہوئی ہے۔ اگر تم نے وہ غلطی نہیں کی ہوتی تو مجھے یقین ہے، شاہدہ یوں قتل نہیں کی جاتی۔ میں حالات کو بڑی خوب صورتی سے کنٹرول کر سکتا تھا!''

''میں نے کون سی غلطی کی ہے ملک صاحب؟'' وہ حیرانی سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب عارف نے تم سے شاہدہ کے قتل کے حوالے سے وہ خطرناک گفتگو کی تھی، تمہیں اسی وقت آ کر مجھے بتانا چاہیے تھا کہ اپنی بیوی کے حوالے سے عارف کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں؟''

''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے عارف کی بات کا یقین ہی نہیں آیا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں یہی سمجھا کہ وہ غصّے میں ایسا کہہ رہا ہے۔ اس کا شاہدہ پر کتنا کنٹرول تھا، یہ تو پورا قصبہ جانتا ہے۔ عارف سے ایسی کسی سنگین جرأت اور بہادری کی کسی کو توقع نہیں تھی لیکن شاہدہ کے قتل کے بعد تو یہی لگتا ہے کہ اس نے زندگی میں ایک بار ہمت کا مظاہرہ کر کے دکھا ہی دیا۔ بہرحال.....'' وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ ''اب مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے ملک صاحب..... کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے عارف کے عزائم کو اتنی غیر سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے تھا۔ اگر میں اسی وقت آپ کو اس کے خطرناک ارادے سے آگاہ کر دیتا تو آج یقیناً صورتِ حال مختلف ہوتی!''

یوسف حلوائی کی سنجیدگی اور جذباتیت سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس واردات میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ صداقت علی نے مقتول کے گھر میں اس کے آنے جانے کی بنا پر اسے بھی داؤد کے برابر لا کھڑا کیا تھا۔ میں نے گفتگو کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یوسف! کل اسپتال سے شاہدہ کی لاش آ جائے گی۔ اگر اس وقت تک عارف کا کچھ پتا نہیں چلا تو شاہدہ کی لاش کو کس کے حوالے کیا جائے؟ مجھے پتا چلا ہے، ان دونوں کا اس دنیا میں کوئی عزیز رشتے دار باقی نہیں..... سوائے تمہارے!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال، میں عارف کا سوتیلا بھائی ہی سہی مگر مجھ سے جو کچھ ہوسکا وہ میں ضرور کروں گا۔ شاہدہ میری بھابی تھی۔ میں اس کے کفن دفن کو اپنے ذمے لیتا ہوں۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں!''

میں نے مزید چند منٹ تک یوسف حلوائی سے بات کر کے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں تیار ہو کر حسبِ معمول اپنے کمرے میں پہنچا اور حوالدار نصیر شاہ کو اپنے پاس بلالیا۔ ان دنوں میری رہائش تھانے کی حدود ہی میں واقع سرکاری کوارٹر میں تھی جو تھانے کے پچھواڑے تھا۔ گزشتہ روز جب تک میں اپنی کرسی پر موجود رہا، عارف کی واپسی کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ صداقت علی سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنا پر پہلے تو میں نے ازخود چک عمر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ داؤد نامی اس غنڈے کو گردن سے پکڑ کر واپس لاؤں جس کی شاہدہ کے گھر میں مشکوک آمدورفت کا سلسلہ سننے میں آیا تھا لیکن عصر کے بعد تھانے میں اچانک ہنگامی صورتِ حال پیش آگئی جس کے سبب میں کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا۔

میں نے حوالدار کو اپنے پاس بلایا۔ ''میں نے آپ کو اپنے پاس اس لیے بلایا تھا۔ کیا داؤد چک عمر سے واپس آگیا؟''

''نہیں جناب! ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی!''

''اور عارف کی کوئی خیر خبر ہے؟''

''وہ بھی کسی کو نظر نہیں آیا!''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''اور وسیم کی کیا رپورٹ ہے؟''

''وہ نگرانی کے کام پر ڈٹا ہوا ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''ابھی تک وہاں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس کی رپورٹ کے لیے وسیم کو تھانے کا رخ کرنا پڑے۔''

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! آپ ایک کام کریں۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''آپ اسی وقت چک عمر روانہ ہو جائیں۔ چک عمر پینتیس، چالیس گھروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ معلوم کرنا ذرا مشکل نہیں ہوگا کہ داؤد وہاں کس سے ملنے گیا ہے۔ آپ اسے اپنے ساتھ تھانے لے آئیں۔ اُدھر جانے کا پروگرام تو میرا تھا لیکن اب تھانے میں موجود رہنا ضروری ہے۔ پتا نہیں، سرکاری اسپتال سے کس وقت شاہدہ کی لاش آجائے۔ اسے یہاں سے گئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہوگئے ہیں!''

''جو آپ کا حکم ملک صاحب!'' وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''میں ابھی روانہ ہو جاتا ہوں۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔ ''چک عمر آنے جانے کا راستہ تو ایک ہی ہے نا؟''

''جی ہاں، بالکل ایک ہی راستہ ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہوسکتا ہے، چک عمر پہنچنے سے پہلے ہی آپ کی اس سے ملاقات ہو جائے۔ داؤد کے گھر والوں کے مطابق، اسے آج واپس آنا ہے۔''

حوالدار نصیر شاہ مجھے سلام کر کے کمرے سے نکل گیا۔

ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ واپس آگیا۔ میں نے تعجب خیز نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''شاہ جی! اتنی جلدی آپ چک عمر سے ہو بھی آئے؟''

''جناب! تھانے سے نکلنے کے بعد مجھے ایک اہم بات یاد آگئی، اس لیے چک عمر کی طرف جانے سے پہلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔'' اس نے اضطراری لہجے میں بتایا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹٹولنے والے انداز میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس کا ہاتھ جیب سے باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے سگریٹ کا ایک پیکٹ نظر آیا۔ وہ مذکورہ پیکٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھیں جناب!''

میں نے پیکٹ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ وہ ہتھوڑا مارکا (فوکس اون) سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ میں نے پیکٹ کھول کر اندر جھانکا۔ اس میں تین سگریٹ بھی موجود تھے۔ وہ دس سگریٹ والا پیکٹ تھا، یعنی اس کے سات سگریٹ استعمال کیے جاچکے تھے۔ ہتھوڑا مارکا سگریٹ کے پیکٹ پر ایک محنت کش لوہار کو ہتھوڑے کی مدد سے لوہا کوٹتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ وزنی آہنی ہتھوڑے کی ضرب لگاتے وقت اس لوہار کے بازوؤں کی مچھلیاں بہت نمایاں ہوگئی تھیں۔ یہ اس زمانے کے مزدوروں اور محنت کشوں کا پسندیدہ سگریٹ برانڈ تھا جو معیاری ہونے کے علاوہ خاصا سستا بھی تھا۔

حوالدار نصیر شاہ نے فوکس اون کا پیکٹ کس مقصد سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے دیا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا لہٰذا میں نے تیکھے انداز میں اس سے دریافت کیا۔ ''شاہ جی! آپ کو تو معلوم ہے، میں سگریٹ نوشی نہیں کرتا، پھر یہ سب کیا ہے؟''

''جناب! میں بھی سگریٹ نہیں پیتا ہوں!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اسی لیے یہ اہم بات سامنے بھی آ گئی ورنہ میں تو سگریٹ کے اس پیکٹ کو جیب میں رکھ کر بھول ہی گیا تھا۔ وہ تو میری گھر والی نے جب کان کھینچے تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔''

بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ نصیر شاہ جوش جذبات میں سب کچھ ٹھیک طرح بتا نہیں پا رہا تھا جو اس کے ذہن میں تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شاہ جی! آپ اطمینان اور سکون سے بتائیں، سگریٹ کے اس پیکٹ کا کیا قصّہ ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، اس کے ساتھ کوئی نہایت ہی دلچسپ کہانی جڑی ہوئی ہے..... کوئی اہم واقعہ!''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے جناب کہ سگریٹ کا یہ پیکٹ مجھے کل جائے وقوعہ پر پڑا ملا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا کہ آپ کو دکھاؤں گا۔ آپ اس وقت لاش والے کمرے میں قانونی کارروائی میں مصروف تھے۔ سگریٹ کا یہ پیکٹ مجھے برابر والے کمرے سے ملا تھا۔ یہ پیکٹ میرے ذہن سے نکل گیا اور میرے ساتھ گھر پہنچ گیا۔ میں نے آج صبح یونیفارم دھونے کے لیے اپنی گھر والی کو دیا تو ظاہر ہے، پانی میں ڈالنے سے پہلے اس نے جیبوں کی تلاشی لی تاکہ کوئی اہم کاغذ کپڑوں کے ساتھ دھل کر صاف نہ ہو جائے۔ جب ایک جیب سے یہ پیکٹ برآمد ہوا تو وہ مجھ پر چڑھ دوڑی۔ جناب! میں تھانے میں حوالدار ضرور ہوں لیکن گھر میں میری بیوی کسی تھانیدار سے کم نہیں۔ میں اپنی گھر والی سے بہت ڈرتا ہوں جناب!''

''ہر شریف شوہر اور بچوں کا باپ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے شاہ جی!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خیر، آپ بتائیں کہ آگے کیا ہوا؟''

''جناب! میری گھر والی کو شک ہوا کہ میں نے سگریٹ پینا شروع کر دی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی پوزیشن صاف کی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اب آپ دیکھ لیں کہ سگریٹ کے اس پیکٹ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے، موجودہ کیس میں، ممکن ہے، اس کی مدد سے ہم قاتل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں!''

میں نے اس کمرے میں بھی استعمال شدہ سگریٹ کے چند ٹوٹے پڑے دیکھے تھے جہاں شاہدہ کی لاش پائی گئی تھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ وہ ٹکڑے، ہتھوڑا مار کا سگریٹ ہی کے تھے یا کسی اور برانڈ کے۔ بہرحال، یہ اس صورت میں ایک اہم اشارہ تھا اگر عارف سگریٹ نوشی نہ کرتا ہو..... یا کم از کم وہ ہتھوڑا مار کا سگریٹ نہ پیتا ہو۔ تو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اس گھر میں کوئی ایسا شخص آیا تھا جو ہتھوڑا مار کا سگریٹ پینے کا عادی تھا اور اس نے وہاں کچھ وقت بھی گزارا تھا!

''ٹھیک ہے شاہ جی!'' میں نے فوکس اون کے پیکٹ کو اپنی میز کی دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس پر ریسرچ کرتا ہوں۔ آپ فوراً چک عمر روانہ ہو جائیں۔''

وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں نے اپنے تئیں گھر والی کو یہ یقین دلانے کی کوشش تو کی ہے کہ میں سگریٹ نوشی نہیں کرتا لیکن اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ اس امر کی تصدیق آپ سے بھی کرے گی اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ اگر وہ میری غیر موجودگی میں اِدھر آئے تو آپ اس کی اچھی طرح تسلی کر دیں!''

''آپ بے فکر ہو جاؤ شاہ جی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کی گھریلو تھانیدار کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

میں مزید ایک گھنٹے تک تھانے میں موجود رہ کر روزمرہ کے اہم امور نمٹاتا رہا پھر ایک ضروری سوچ کے تحت تھانے سے نکل آیا۔ میری منزل عارف کا گھر تھی۔ کانسٹیبل وسیم کو نگرانی کرتے ہوئے میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ جب میں نے عارف کے دروازے پر لگے ہوئے سرکاری تالے میں چابی گھمائی تو وسیم میرے قریب آ گیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئے۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''وسیم! سب خیریت تو ہے نا؟''

''جی ملک صاحب! ابھی تک تو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ کسی شخص نے اِدھر آنے یا غیر قانونی طور پر گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی عارف کی واپسی ہوئی ہے۔''

''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''بس ایک دن کی ڈیوٹی اور ہے۔ میں کل صبح تمہیں واپس بلا لوں گا، مجھے امید ہے، جب تک اس کیس کی نیا کنارے لگ جائے گی۔''

میں نے کانسٹیبل سے باتیں کرنے کے دوران میں گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے پچھلے حصّے میں بنے ہوئے دونوں کمروں کا جائزہ بھی لے لیا۔ لاش والے کمرے میں میری تمام تر توجہ استعمال شدہ سگریٹ کے ٹکڑوں پر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے خاصی تقویت محسوس کی کہ وہ تمام تر ٹکڑے فوکس اون المعروف بہ ہتھوڑا مار کا سگریٹ ہی کے تھے۔ گزشتہ روز میں ساتھ والے کمرے کا تفصیلی معائنہ نہیں کر سکا تھا۔ اب میں نے اس کا بھی جائزہ لیا۔ مذکورہ کمرا اسٹور روم کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔

ایک جانب دیوار کے ساتھ لکڑی کے ایک بڑے تخت پر نیچے سے اوپر تک بستر رکھے تھے۔ وہ کم از کم نصف درجن افراد کے استعمال کے لیے لحاف اور گدے تھے، اتنی ہی تعداد میں تکیے اور چادریں بھی تھیں، میری سمجھ میں نہ آیا کہ دو افراد کی اس مختصر سی فیملی کو اتنے اوڑھنے اور بچھونے کی کیا ضرورت تھی۔ بہرحال، دوسری دیوار کے ساتھ تین ڈرم پہلو بہ پہلو رکھے ہوئے تھے۔ ساڑھے تین، چار فٹ اونچے نیلے رنگ کے وہ پلاسٹک کے ڈرم دراصل کسی ٹیکسٹائل کیمیکل کے لیے استعمال ہوتے تھے لیکن بعد ازاں لوگ انہیں دھو مانجھ کر گھریلو استعمال میں لے آتے تھے اور عموماً ان میں اناج اسٹور کیا جاتا تھا۔ میں نے ایسے ڈرم کئی گھروں میں رکھے دیکھے تھے۔

میں نے مذکورہ ڈرمز میں سے ایک کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے اندر مجھے گندم بھری ہوئی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا باقی دو ڈرمز میں آٹا اور چاول کا ذخیرہ ہوگا۔ میں ڈرم کو چھوڑ کر دیگر اشیا کی جانب متوجہ ہوگیا لیکن وہاں پر کوئی بھی ایسی چیز دکھائی نہ دی جو اس کیس میں کسی طور معاون ثابت ہوتی۔

میں نے دونوں کمروں کو دوبارہ لاک کیا اور گھر کے صحن میں آگیا۔ اس دوران میں وسیم مسلسل میرے ساتھ رہا تھا لیکن اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں اسے چند نئی ہدایات دینے کے بعد واپس آگیا۔

اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا اور وہ یہ کہ آیا عارف سگریٹ نوشی کا عادی تھا یا نہیں اور اگر وہ سگریٹ پیتا تھا تو کون سی برانڈ؟

اس سوال کا تسلی بخش جواب یا تو شاہدہ دے سکتی تھی اور یا پھر یوسف حلوائی۔ شاہدہ کسی سوال و جواب کے قابل نہیں رہی تھی لہٰذا میرے قدم بے اختیار مجھے یوسف حلوائی کی دکان لے گئے۔

یوسف نے ابھی ابھی دکان کھولی تھی اور شوکیس میں مٹھائی کے تھال سیٹ کر رہا تھا۔ اس وقت وہ تہ بند اور بنیان میں ملبوس تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ استقبالیہ انداز میں آگے بڑھا۔ ''آئیں جی..... آئیں جی..... سو بسم اللہ!''

اس کے ساتھ ہی اس نے جھاڑن نما ایک کپڑے سے اسٹول کو صاف کر کے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''تشریف رکھیں جناب!''

میں نے یوسف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی تکلف نہ کرو۔ میں یہاں تشریف رکھنے نہیں آیا۔ اِدھر سے گزر رہا تھا، سوچا تمہاری دکان ہی دیکھ لوں۔ کیا پتا کبھی مٹھائی لینے کے لیے آنا پڑ جائے!''

''جناب! کمال کرتے ہیں آپ بھی'' وہ چور نظروں سے دکان کے اندرونی حصّے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو زحمت کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ آپ اشارہ کر دیں مٹھائی تھانے میں آپ کی میز پر پہنچ جائے گی۔''

وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ''آج میں تازہ تازہ میسو پاک بنانے والا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو سیر، دو سیر بھجوا دیتا ہوں!''

میں جب اس کی دکان پر پہنچا تھا تو مجھے ویل کم کہنے سے پہلے بھی اس نے کن انکھیوں سے دکان کے اندر جھانکا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے یہی حرکت کی تو میں کھنک گیا تاہم معقول لہجے میں اس کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں سیر، دو سیر مٹھائی اٹھا کر تھانے لانے کی ضرورت نہیں یوسف۔ مجھے جب ضرورت ہوگی تو میں خود ہی تمہاری دکان سے منگوا لوں گا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے بے ساختہ اس سے پوچھ لیا۔ ''یہ تم بار بار چور نظروں سے دکان کے اندر کیا دیکھ رہے ہو؟''

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ جی بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے آنے سے پہلے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ کیا کروں، جب تک ایک آدھ سگریٹ نہ پھونک لوں دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ آپ کو دیکھ کر میں نے ادھ جلا سگریٹ اندر رکھ دیا تھا۔ اب بار بار اِدھر دھیان جاتا ہے کہ کسی شے میں آگ نہ لگ جائے!''

''تم فوراً وہ سگریٹ اٹھالاؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''باقی باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔''

اس نے پلک جھپکتے میں میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ وہ واپس آیا تو اس کی انگلیوں میں ادھ جلا سگریٹ دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''تم کون سا سگریٹ پیتے ہو؟''

اس نے سگریٹ کے ٹوٹے کو زمین پر پھینکا اور پھر جوتے کے نیچے مسلتے ہوئے سادگی سے بولا۔ ''کم خرچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بالانشین!''

''کیا یہ کوئی نیا سگریٹ آیا ہے؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''اونہیں جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں ''ہتھوڑا مارکا'' سگریٹ کی بات کر رہا ہوں۔''

ہتھوڑا مارکا کے الفاظ نے میری سوچ پر ایک ضرب سی لگائی۔ میں نے گمبھیر لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''یوسف! تم کتنے عرصے سے سگریٹ پی رہے ہو؟''

''اس شے سے دوستی کیے تو جناب آٹھ دس سال ہو گئے ہیں۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس دوران میں کئی ''مارکا'' ٹیسٹ کیے ہیں مثلاً بگلا مارکا، تارا مارکا، لالٹین مارکا، قینچی مارکا..... کون سا مارکا ہے جو میں نے ٹرائی نہ کیا ہو۔ آخر کار ہتھوڑا مارکا پر آ کر رک گیا ہوں۔ پچھلے دو سال سے میں یہی سگریٹ پی رہا ہوں..... اور میں نے غلط نہیں کہا جناب! یہ سگریٹ واقعی کم خرچ بالانشین ہے!''

یہ پچاس ساٹھ سال پہلے استعمال ہونے والے عوامی سگریٹ برانڈ ہیں اور آج کل ان میں سے کوئی کہیں نظر نہیں آتا اس لیے سگریٹ کے اس تذکرے کو کہانی کی ضرورت سمجھا جائے۔ میں سگریٹ بنانے والی کسی کمپنی کے لیے اشتہار بازی ہرگز نہیں کر رہا ہوں!

میں نے یوسف سے پوچھا۔ ''تم روزانہ کتنے سگریٹ پی لیتے ہو؟''

''بس جی، ایک ڈبی ختم کر لیتا ہوں۔''

''ایک ڈبی..... یعنی دس سگریٹ!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر اس کی دکان کے برابر واقع تکے کباب کی بند دکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ تمہارا سوتیلا بھگوڑا بھائی کتنے سگریٹ پھونک لیتا ہے؟''

وہ فوراً سے پیش تر سمجھ گیا کہ میرا اشارہ شاہدہ کے شوہر عارف کی جانب تھا۔ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے بتایا۔ ''یہ عارف تو سگریٹ نوشی کے سخت خلاف ہے۔ ہر وقت مجھے بھی نصیحتیں کرتا رہتا ہے کہ میں سگریٹ پینا چھوڑ دوں ورنہ مجھے ٹی بی ہو جائے گی لیکن میں اس کی باتیں سن کر ہنسا ہوں۔ وہ سگریٹ نوشی سے شدید نفرت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی اس کی صحت ''ماشاء اللہ'' ہے۔ وہ چہرے ہی سے صدیوں کا بیمار نظر آتا ہے اور میں..... دیکھ لیں جناب! آپ کے سامنے ہوں..... ہٹا کٹا اور صحت مند!''

اس زمانے میں دل کی بیماریوں کا ذکر بہت کم سننے میں آتا تھا اور کینسر کا نام تو شاید ہی کسی نے سنا ہو چنانچہ سگریٹ پینے والوں کو ٹی بی اور کھانسی ہی سے ڈرایا جاتا تھا تاہم آج کا چلن بالکل مختلف ہے۔ وہ سادہ، منافقت سے پاک زمانے گزر گئے۔ آج کل سب سے زیادہ رنگین اور غمگین اشتہار بازی سگریٹ کی ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آپ ان اشتہاروں کو ''توبہ شکن'' کہیں تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ وزارت صحت صرف یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتی ہے..... ''سگریٹ نوشی مضرِ صحت ہے۔ یہ کینسر اور دل کی بیماریوں کا باعث ہے!'' اللہ اللہ خیر سلا!

میں نے یوسف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا واقعی عارف سگریٹ نہیں پیتا؟''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ چوکنا نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اچھا..... مجھے تو لگا تھا، وہ سگریٹ نوشی کرتا ہے!''

''آپ کو کس بات سے ایسا لگا؟'' اس کا چوکنا شوشیش میں بدل گیا۔ ''یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ''بتائی تو کسی نے نہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا!''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ تیز آواز میں بولا۔ ''آپ نے کب اور کہاں عارف کو سگریٹ پیتے دیکھا ہے؟''

''میں نے اسے سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بلکہ کل اس کے گھر میں مجھے سگریٹ کے چند ٹوٹے پڑے نظر آئے تھے۔ اگر عارف واقعی سگریٹ سے نفرت کرتا ہے تو پھر مجھے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس کے گھر میں بیٹھ کر سگریٹ کس نے پیے تھے۔ مجھے یقین ہے، اس طرح میں شاہدہ کے قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔''

میں نے یوسف حلوائی کے چہرے کی رنگت کو بدلتے ہوئے فوراً محسوس کر لیا۔ تاثرات کی اس تبدیلی میں خوف اور تشویش کا عنصر نمایاں تھا اور..... اس بات نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ نقطہ غور و فکر کی دعوت دیتا تھا کہ عارف کے گھر میں پائے جانے والے سگریٹ کے ٹکڑوں نے یوسف حلوائی کو اتنا زیادہ بے چین کیوں کر دیا تھا۔ میری چھٹی حس نے اسی لمحے کسی بڑی گڑبڑ کی نشاندہی کر دی لیکن حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے میں نے اپنی سوچ اور محسوسات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور تجربہ کار کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے یک ٹک گھورتا چلا گیا۔

اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عارف کے گھر میں سگریٹ کے جو ٹکڑے پڑے دیکھے ہیں وہ کس برانڈ کے تھے؟''

یہ سوال کہیں اس کے بہت اندر سے آیا تھا جیسے سگریٹ کے برانڈ کے بارے میں جاننا اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہو۔ میں نے سگریٹ والے معاملے میں اس کی تشویش آمیز دل چسپی دیکھی تو عام سے لہجے میں کہا۔

''او جی، لعنت بھیجو سگریٹ کے برانڈ پر۔ یہ کوئی اتنی خاص بات نہیں ہے۔ یہ تو تمہاری سگریٹ نوشی سے عارف کا تذکرہ نکل آیا اور میں تم سے پوچھتا چلا گیا۔ اس کے گھر میں کوئی سے بھی سگریٹ پڑے ہوں، ہمیں اس سے کیا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے.....!'' میں نے رازدارانہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔'' کہ عارف تمہارے سامنے سگریٹ کی برائی کرتا ہو اور گھر میں چھپ چھپ کر سگریٹ پیتا ہو۔ انسان کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے یوسف!''

''ہاں..... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ وہ ظاہر یہی کررہا تھا جیسے میری وضاحت سے مطمئن ہوگیا ہو لیکن مجھے بہ خوبی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اندر سے بری طرح بے چین ہے، یوسف کی یہی بے چینی، بے قراری اور انتشار مجھے انتہا تک سوچنے پر مجبور کررہی تھی اور اس صورتِ حال میں عارف کے پڑوسی صداقت علی کے یہ الفاظ میری سماعت میں گونج رہے تھے..... تھانیدار صاحب! یوسف بھی شاہدہ کے لیے ایک نامحرم ہی ہے۔ عارف کی غیر موجودگی میں چوری چھپے شاہدہ سے اس کی ملاقاتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا!

میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ یوسف حلوائی کو چیک کرنے کے لیے میں نفسیاتی طریقۂ کار اختیار کروں گا۔ اگر وہ کسی بھی زاویے سے شاہدہ والے معاملے میں ملوث ہے تو میرے نفسیاتی جال سے بچ نہیں سکے گا۔ میں نے اسے مطمئن اور بے خبر رکھنے کے لیے سرسری انداز میں کہا۔''یوسف! عارف کی سگریٹ..... بلکہ خفیہ سگریٹ نوشی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کل صبح تمہارے ساتھ اس کے گھر جاؤں گا پھر تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا، وہ چھپ چھپ کر کون سے برانڈ کے سگریٹ پیا کرتا تھا!''

وہ تجویز دینے والے انداز میں بولا۔''میں اس وقت فارغ ہوں۔ اگر آپ کہیں تو ہم ابھی عارف کے گھر جا کر دیکھ لیتے ہیں!''

اس کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دل چسپی میرے شک کو یقین میں بدلنے کا باعث بن رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اس وقت تم فارغ ہوگے لیکن میں ہرگز نہیں ہوں..... آج ایک اہم معاملے میں سارا دن تھانے میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔''

وہ قدرے مطمئن ہوا کہ میں آج کا پورا دن تھانے میں گزارنے والا ہوں، پوچھنے لگا۔

''تھانے دار صاحب! شاہدہ کی لاش کب تک اسپتال سے واپس آئے گی۔ عارف کا تو ابھی تک کچھ پتا نہیں۔ اس کے کفن دفن کا بندوبست مجھے ہی کرنا ہوگا اس لیے پوچھ رہا ہوں!''

میں نے اسے بے خبر رکھنے کے لیے دانستہ جھوٹ بولا۔''میرے خیال میں شاہدہ کی لاش کل صبح ہی یہاں پہنچے گی۔ اس کے بعد تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا کہ تم اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست اس کے گھر پر کرتے ہو یا اپنے گھر پر!''

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔''لاش اسپتال سے آجائے تو پھر ہی کوئی بہتر فیصلہ کیا جاسکتا ہے!''

''لاش کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے تمہیں فوری طور پر اپنی دکان بند کرنے کا فیصلہ کرنا چاہیے یوسف!'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''عارف سوتیلا ہی سہی لیکن شاہدہ پھر بھی تمہاری بھابی تھی۔ کم از کم اس کے سوم تک تو تمہیں دکان نہیں کھولنی چاہیے!''

وہ قدرے شرمندہ ہوا پھر خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب! میں ان بنی ہوئی مٹھائیوں کو کسی ٹھکانے لگا کر دکان کو تالا لگاتا ہوں۔ مٹھائیوں کے یہ تھال اسی طرح اگر تین چار دن تک دکان میں بند رہے تو سب کا ستیاناس ہوجائے گا۔''

میں اس کی دکان سے نکل کر تھانے کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

شام سے تھوڑی دیر پہلے حوالدار نصیر شاہ لوٹ آیا اور آکر اس نے یہ خبر سنائی۔''ملک صاحب! داؤد وہاں چک عمر میں الیاس گھمن نامی ایک شخص سے ملنے گیا تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ دونوں گاؤں سے نکل چکے تھے۔''

''گاؤں سے نکل کر وہ کہاں گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر وہ بخت پور کی طرف آئے ہوتے تو یقیناً راستے میں ان سے ملاقات ہوجاتی!''

''جناب! مجھے پتا چلا ہے، وہ ''بدری وال'' کی طرف گئے ہیں۔'' نصیر شاہ نے بتایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''بدری وال، چک عمر اور داؤد کو فی الحال ذہن سے نکال دیں، آپ کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں بخت پور میں بڑا دلچسپ اور سنسنی خیز ڈراما ہونے والا ہے!''

''سنسنی خیز ڈراما؟'' وہ الجھن اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نصیر شاہ کو یوسف حلوائی کے رویے اور اپنے عزائم کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کیا۔ پوری بات توجہ سے سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! اس کام کے لیے رات کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی اسے پکڑ کر لے آتا ہوں۔ تھوڑی چھترول ہوگی تو خود ہی سب کچھ بک دے گا!''

''یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن رنگے ہاتھوں پکڑنے کا تو مزہ اور ہی ہے۔''

''کیا ضروری ہے کہ وہ رات ہی کو عارف کے گھر میں داخل ہو۔'' نصیر شاہ نے ایک اعتراض اٹھایا۔

''اگر وہ سگریٹ کے ٹکڑے اس کے لیے جان کا عذاب بن سکتے ہیں تو وہ دن میں کسی وقت بھی وہاں جا سکتا ہے۔''

''میرے پیشہ ورانہ تجربے کے مطابق، اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں!'' میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''میں نے بڑی اچھی طرح اسے یقین دلایا ہے کہ میں کل صبح سے پہلے عارف کے گھر کا رخ نہیں کروں گا لہٰذا وہ رات کی تاریکی میں ہی کوئی کارروائی کرے گا۔ ہم پہلے سے گھر کے اندر موجود ہوں گے لہٰذا وہ رنگے ہاتھوں گرفت میں آجائے گا۔ ''اگر وہ حماقت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے دن دہاڑے عارف کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو وسیم کی نظر سے نہیں بچ سکے گا۔ وسیم کی اطلاع پر، اس صورت میں بھی ہم اسے قابو کرلیں گے۔ پھر ایک بات اور بھی ہے..... جب تک شاہدہ کی لاش کے حوالے سے اسپتال کی جانب سے کوئی اطلاع نہیں آجاتی، مجھے تھانے ہی میں رہنا ہوگا!''

''ملک صاحب!'' وہ ندامت آمیز انداز میں اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''باتوں میں، میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ چک عمر سے واپسی پر میں اسپتال سے بھی ہوتے ہوئے آرہا ہوں۔ وہاں کی پکی اطلاع یہ ہے کہ کل صبح پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے ساتھ لاش یہاں آئے گی۔''

''اس کا مطلب ہے، آج کی رات ہم بے فکری سے یوسف حلوائی کو اپنے جال میں پھانس سکتے ہیں!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر اس کے ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کردیا۔ ''شاہ جی! آپ کسی طرح یوسف تک یہ خبر پہنچا دیں کہ لاش کل صبح آئے گی تاکہ وہ اطمینان سے رات ہی کو ہمارے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھے۔''

''ٹھیک ہے جناب! یہ میں کرلوں گا!'' وہ پُریقین لہجے میں بولا۔

دن کا باقی حصّہ میں نے یوسف حلوائی کے بارے میں سوچ بچار اور اسے گرفت میں لانے کی پلاننگ کرتے ہوئے گزارا اور رات کو ''پوری تیاری'' کے ساتھ عارف کے گھر پہنچ گیا۔ میرے ساتھ اس مشن میں نصیر شاہ بھی شامل تھا۔ وسیم کو میں نے وہاں سے ہٹا دیا تھا کیونکہ گھر کے اندر ہماری موجودگی کے بعد بیرونی نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔

منصوبے کے مطابق، میں اس کمرے میں چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے شاہدہ کی لاش اٹھائی گئی تھی۔ یوسف کی آمد کے زیادہ امکانات اسی کمرے میں تھے۔ حوالدار نصیر شاہ کو میں نے دوسرے کمرے یعنی اسٹور روم میں چھپا کر بٹھا دیا۔ ان دنوں موسم کچھ اس نوعیت کا تھا کہ سرِشام ہی فضا میں خنکی اتر آتی تھی لہٰذا کمروں کے اندر چھپ کر بیٹھنا ہمارے لیے چنداں دشوار ثابت نہیں ہوا۔

رات دس بجے کا وقت ہوگا جب میں نے گھر کے صحن میں کسی شخص کے کودنے کی مخصوص آواز سنی۔ گویا میرے اندازوں کو صد فیصد درست ثابت کرنے کے لیے یوسف حلوائی نے عارف کے گھر میں انٹری ڈال دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے کمرے کے دروازے کے ساتھ کھڑ پٹر کا احساس ہوا اور اگلے ہی لمحے دروازہ دھیرے سے کھلا۔ میں ایسی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ باہر سے آنے والا مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا جبکہ میں بہ آسانی اس کا جائزہ لے سکتا تھا اور..... میں نے کھلے ہوئے دروازے میں اندھیرے کے باوجود بھی مخصوص قد کاٹھ اور جسامت کی بنا پر یوسف حلوائی کو فوراً پہچان لیا۔

وہ محتاط قدموں سے کمرے کے اندر داخل ہوا، جیب سے ایک موم بتی نکال کر جلائی اور اس کی روشنی میں کمرے کے فرش پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں اوٹ میں چھپا بڑی خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ہتھوڑا مار کا سگریٹ کے ٹکڑے جمع کیے، انہیں احتیاط سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیب میں رکھا اور جلتی ہوئی موم بتی کو ہاتھ میں تھامے تھامے کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ کمرے سے نکلتے وقت اس نے دروازے کو کنڈی نہیں لگائی تھی ورنہ میرا کمرے سے باہر آنا مشکل ہو جاتا۔ اب اس کا رخ دوسرے کمرے کی طرف تھا۔ میں نے ٹارچ کو ہاتھ میں لیا اور باہر نکل آیا۔ جب میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا تو وہ اسٹور روم میں داخل ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے اس سمت لپک گیا۔

اسی لمحے اسٹور روم کے اندر سے ایسی آوازیں ابھریں جیسے دو افراد میں مڈبھیڑ ہو گئی ہو۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یوسف حلوائی کا حوالدار نصیر شاہ سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ میں فوراً کمرے کے دروازے پر پہنچا اور ٹارچ کو روشن کر کے اس کی روشنی کمرے کے اندر پھینکی۔

روشنی کے مخصوص دائرے میں مجھے وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا نظر آئے۔ حوالدار نے مجھے پکارتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''ملک صاحب! یہ کیس حل ہو گیا۔ میں نے عارف کی لاش دریافت کر لی ہے۔''

''عارف کی لاش؟'' میرے لہجے میں حد درجے حیرت سمٹ آئی۔ ''مگر وہ تو.....!''

''میں نے اس موٹے خبیث کو قابو کر لیا ہے۔'' نصیر شاہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''اس کو ہتھ کڑی لگائیں پھر میں آپ کو عارف کی لاش کے بارے میں بتاتا ہوں۔''

نصیر شاہ نے ''گمشدہ'' عارف کے حوالے سے اتنا بڑا انکشاف کیا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کسی تیز رفتار مشین کے مانند حرکت میں آ گئے۔ حوالدار نے یوسف کو قابو کرنے کا دعویٰ تو کیا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ پوری طرح اس کی گرفت میں نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر یوسف حلوائی کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میرے خوف ناک ٹھڈوں اور زناٹے دار طمانچوں نے ایک دو منٹ میں ہی اسے ''سیدھا'' کر دیا۔ حوالدار نے میرے اشارے پر اسے الٹی ہتھ کڑی لگا دی۔

میں نے کہا۔ ''شاہ جی! اس بدبخت کا ''انٹرویو'' تھانے لے جا کر ہی کریں گے۔ آپ عارف کی لاش کے بارے میں بتائیں؟''

''وہ بے چارہ..... میرا مطلب ہے، اس کی لاش اِدھر ڈرم کے اندر پڑی ہے۔'' حوالدار نے ایک دیوار کے ساتھ پہلو بہ پہلو رکھے تین ڈرموں کی جانب اشارہ کیا۔

یہ وہی پلاسٹک کے ڈرمز تھے جو میں نے بھی دیکھے تھے بلکہ ان میں سے ایک کا ڈھکنا اٹھا کر میں اس کے اندر جھانک بھی چکا تھا اور مجھے اس ڈرم میں گندم بھری ہوئی نظر آئی تھی۔

میں نے دوسرے ڈرموں کا جائزہ لیے بغیر ہی یہ فرض کر لیا تھا کہ ان میں چاول اور آٹے کا ذخیرہ ہو گا۔

میں بڑی سرعت سے مذکورہ ڈرموں کی طرف بڑھا تو عقب میں نصیر شاہ کی آواز ابھری۔ وہ اپنی کارروائی کی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

''ملک صاحب! اسٹور روم میں چھپ کر بیٹھنے کے دوران میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں ٹارچ جلا کر ایک مرتبہ پھر اس کمرے کا جائزہ لوں۔ یوسف کی آمد سے قبل میرے پاس جو بھی وقت تھا، میں اسے استعمال میں لانا چاہتا تھا۔ اسی جائزے کے دوران میں، جب میں اناج والے ڈرموں کے پاس پہنچا تو دل میں خواہش پیدا ہوئی، مجھے ان ڈرموں کے اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے۔ میں نے پہلے ڈرم کا ڈھکنا اٹھا کر اندر ٹارچ کی روشنی پھینکی ہی تھی کہ عارف کی لاش کو وہاں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ میں آپ کو اس بارے میں بتانے کے لیے کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ یوسف سے ٹکرا گیا..... پھر آپ آ گئے۔ اس کے بعد یہاں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ کے سامنے ہے!''

اِدھر نصیر شاہ کی وضاحت ختم ہوئی، اُدھر میں نے اس ڈرم کا ڈھکنا اٹھا لیا جس کی جانب اس نے اشارہ کیا تھا اور پھر..... میں عارف کی لاش کے دیدار سے محروم نہیں رہا۔ میں نے اس سے پہلے عارف کو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن میری تسلی کے لیے حوالدار کی گواہی کافی تھی کہ وہ عارف ہی کی لاش تھی۔

اس شور شرابے کے باعث آس پاس کے لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کوئی نصف درجن افراد وہاں جمع ہو گئے جن میں عارف کے دونوں پڑوسی صداقت علی اور ظہور حسین پیش پیش تھے۔ جب انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ نفرت انگیز نظروں سے ہتھکڑی لگے یوسف حلوائی کو گھورنے لگے۔

میں نے لالٹینوں اور ٹارچوں کی محدود روشنی میں موقع کی کارروائی مکمل کی اور اسی وقت ہنگامی بندوبست کر کے عارف کی لاش کو ڈرم سمیت پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد یوسف حلوائی کو تفتیش کے لیے اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔ وہ جس انداز میں جائے وقوعہ سے گرفتار ہوا تھا اور جس حالت میں عارف کی لاش دریافت ہوئی تھی اس کی روشنی میں یوسف کو کڑی تفتیش سے گزارنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے یوسف سے کہا۔ ''میں تمہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف دس منٹ دوں گا سوچنے کے لیے۔ اس کے بعد تمہارا بیان قلم بند کروں گا۔ یہ آخری موقع ہوگا سچ بولنے کا۔ اگر تم نے کسی چکر بازی میں پڑ کر یہ سنہری موقع گنوا دیا تو پھر تمہیں تفتیش کے کڑے مراحل سے گزرنا پڑے گا جہاں تمہاری زبان تو خاموش رہے گی البتہ، بدن کا ایک ایک عضو حلفیہ سچ بولنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

''جناب! آپ مجھے سوچنے کے لیے دس منٹ بھی نہ دیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے، بے خوف لہجے میں بولا۔ ''میں بغیر سوچے سمجھے اپنا بیان ریکارڈ کرانے کو تیار ہوں کیونکہ سچ بولنے کے لیے سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی!''

اس کے اعتماد اور ڈائیلاگ نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے گہری نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، شروع ہو جاؤ!''

اور وہ شروع ہو گیا۔ ''تھانے دار صاحب! میں نے شروع میں آپ سے تھوڑا جھوٹ بولا تھا، اس خوف سے کہ کہیں آپ مجھے اس کیس میں ملوث نہ کر دیں اور اب..... جب کہ ایسا ہو ہی چکا ہے تو میں ذرا سی بھی غلط بیانی نہیں کروں گا۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''وقوعہ کے روز صبح صبح جب میں عارف کے گھر تین سو روپے لینے کے لیے پہنچا تو دروازہ خود عارف ہی نے کھولا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ اسٹور روم میں لے گیا..... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا یوسف۔ اچھا ہوا، تم آ گئے۔ میں نے کہا، تم نے بلایا تھا تو مجھے آنا ہی تھا۔ وہ بولا، یوسف، تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں تین سو روپے دینے کے لیے بلایا ہے! میں نے کہا، ہاں میں تو رقم لینے کے لیے ہی آیا ہوں۔ وہ بولا، رقم کو فی الحال بھول جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ میں حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ غیر جذباتی لہجے میں بولا، یوسف، میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں بہت جلد اس شخص کا سراغ لگا لوں گا جو اس بے وفائی کے کھیل میں شاہدہ کا ساتھ دے رہا ہے؟ میں نے جواب دیا، ہاں تم نے ایسا کہا تھا۔ وہ خطرناک لہجے میں بولا، میں نے سراغ لگا لیا ہے۔ بدقسمتی سے وہ کوئی ایک شخص نہیں بلکہ دو افراد ہیں جو مختلف اوقات میں شاہدہ سے ملنے میرے گھر میں آتے رہتے ہیں۔ میں نے سادگی سے کہا، عارف! اگر اپنی مرغی اچھی ہو تو وہ پرائے گھر میں انڈا نہیں دیتی! اس نے نفرت آمیز نظروں سے مجھے گھورا اور بولا، مرغی کو تو میں نے ذبح کر ڈالا ہے۔ اب وہ کسی پرائے گھر تو کیا، اپنے گھر میں بھی انڈا دینے کے قابل نہیں رہی۔ اب ان دو مرغوں کے ذبح ہونے کی باری ہے جو بے وفائی کے کھیل میں اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، وہ دونوں افراد آخر ہیں کون؟ اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ایک شخص کا نام ہے داؤد۔ اس کی باری آخر میں آئے گی۔ شاہدہ کے بعد دوسرے شخص کو حلال ہونا ہے اور وہ اس وقت میرے سامنے کھڑا ہے..... یعنی، یوسف تم! میں نے گھبرا کر کہا، عارف تمہیں کوئی شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے ڈرم کے اوپر رکھی بڑی سی چھری اٹھالی اور بڑے وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس موقع پر اگر میں پھرتی کا مظاہرہ نہ کرتا تو شاید میں بیان دینے کے لیے آج زندہ نہ ہوتا!''

اس نے لمحاتی توقف کیا، ایک جھرجھری لی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے بڑی ہوشیاری سے اس کا وار خالی دیا اور اس کے ساتھ ہی اسے ایک زوردار دھکا بھی مارا۔ وہ مردنا تواں میرے دھکے کی تاب نہ لاتے ہوئے سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا اور اگلے ہی لمحے کسی مردہ چھپکلی کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ جب کئی منٹ گزر جانے کے بعد بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی تو میں نے قریب جا کر اس کا جائزہ لیا..... اور اس لمحے یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ وہ زندہ نہیں۔ اس کی سانس رک گئی تھی۔ جب کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے بے حس و حرکت عارف کو اٹھا کر ایک خالی ڈرم میں ٹھونس دیا اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دیا۔ شاید اس کا سر دیوار کے ساتھ اتنی شدت سے ٹکرایا تھا کہ پلک جھپکتے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عارف کو ڈرم میں ٹھونسنے کے دوران میں تمہاری جیب میں سے ہتھوڑا مار کا سگریٹ کی ڈبیا گر گئی ہو گی لیکن لاش والے کمرے میں استعمال شدہ سگریٹوں کے جو ٹوٹے پائے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے، تم نے کچھ وقت وہاں بھی گزارا تھا۔ تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے جائے وقوعہ سے سگریٹوں کے ٹوٹے چن کر اپنی جیب میں ڈالے تھے تاکہ تمہاری وہاں موجودگی کے آثار باقی نہ رہیں اور..... میں سمجھ رہا ہوں، صبح تمہاری دکان پر ہمارے درمیان سگریٹ نوشی پر جو معنی خیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گفتگو ہوئی تھی، یہ اسی کا نتیجہ ہے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی باتیں سن کر واقعی گھبرا گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ عارف کے بے حس و حرکت جسم کو ڈرم میں ٹھونسنے کے بعد میں ساتھ والے کمرے میں گیا تھا اور وہاں بستر پر مجھے شاہدہ کی گردن کٹی لاش نظر آئی۔ عارف نے غلط نہیں کہا تھا، اس نے اپنی بیوی کو واقعی کسی مرغی کے مانند ذبح کر ڈالا تھا۔ سارا بستر خون آلود ہو رہا تھا۔ میں شاہدہ کی لاش کے پاس ٹہلتے ہوئے اضطراری انداز میں سگریٹ پھونکتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے بعد میری سمجھ میں ایک کہانی آئی۔ وہی کہانی جو میں نے شروع میں آپ کو سنائی تھی۔'' وہ ذرا دیر کو رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور مزید بتانے لگا۔

''میں نے آلۂ قتل یعنی بڑے سائز کی اس چھری کو باورچی خانے کی دو چھتی پر اس طرح چھپا دیا کہ تلاش کے دوران میں آسانی سے مل جائے اور..... ایسا ہوا بھی۔ آپ نے بہ آسانی آلۂ قتل برآمد کر لیا۔ ابتدا میں سب کچھ میرے حق میں ہو رہا تھا۔ میں نے ہنگامی حالات میں عارف کی لاش کو اناج والے ڈرم میں ٹھونس دیا اور وہ فوری طور پر دریافت نہ ہو سکی۔ یہی سمجھا گیا کہ عارف اپنی بیوی کو قتل کر کے کہیں فرار ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے طور پر یہ سوچ رکھا تھا کہ شاہدہ کے کفن دفن کے بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو میں عارف کی لاش کو خاموشی سے ٹھکانے لگا دوں گا۔ یہ کام میرے لیے بہت ہی آسان ثابت ہوتا کیونکہ ان دونوں کا قریب ترین رشتے دار میں ہی تھا۔ ان کا گھر میرے قبضے میں آنا ایک سیدھی سی بات تھی لیکن.....!''

وہ لمحے بھر کو رکا، مایوسی سے گردن ہلائی اور شکستہ لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میری دکان پر آ کر جب سگریٹ نوشی کے بارے میں بات کی اور بتایا کہ جائے وقوعہ سے ہتھوڑا مارکا سگریٹ کے ٹکڑے ملے ہیں تو میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ آج ہی رات کو مجھے ہر کام نمٹا لینا چاہیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ گھات لگائے بیٹھے ہیں.....!''

وہ اپنا تفصیلی بیان دینے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''یوسف! تم نے جو بیان دیا ہے اس کی تصدیق پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی ہو سکے گی لیکن.....''

''جناب! عارف کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میں نے اپنی جان بچانے کے لیے اسے دھکا دیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ اتنی شدت سے دیوار کے ساتھ جا ٹکرائے گا کہ اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں جناب..... حفاظت خود اختیاری.....!''

''وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔'' میں نے ڈانٹ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ''عارف کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سب کچھ کھول کر بیان کر دے گی۔ اگر تم نے واقعی اپنی جان کو بچانے کے لیے اسے دھکا دیا تھا اور اس دھکے کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہوئی ہے تو یہ بات چھپی نہیں رہے گی اور اس صورت میں ظاہر ہے، تم بے قصور قرار پاؤ گے لیکن اس سے پہلے اس بات کا فیصلہ کیا جائے گا کہ عارف کا تم پر شک درست تھا یا غلط۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی جناب۔ میں دو چار مرتبہ یا تو عارف ہی کے بھیجنے پر اس کے گھر گیا ہوں یا پھر آخری چند دنوں میں [illegible] کا اتفاق ہوا ہے اور وہ بھی شاہدہ کو سمجھانے کے لیے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے۔ میں نے اسے عارف کے خطرناک عزائم سے بھی آگاہ کیا تھا لیکن افسوس کہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی.....!''

میں نے پوچھا۔ ''کیا شاہدہ نے داؤد کے حوالے سے اپنی غلطی کا اقرار کر لیا تھا؟''

''نہیں جناب، وہ تو سرے سے انکاری تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اسی لیے میری نصیحت کا بھی اس پر اثر نہیں ہوا لیکن جہاں تک عارف کے مجھ پر شک کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں، یہ سراسر اس کی غلط فہمی تھی..... میں ایسا بندہ نہیں ہوں جناب!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''داؤد کی باتیں میں داؤد ہی سے کروں گا اور جب تک دونوں میاں بیوی کی پوسٹ مارٹم رپورٹس نہیں آ جاتیں، تم سرکار کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤ گے۔''

''مہمان نوازی!'' وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں نے تو سن رکھا ہے کہ آپ مہمان نوازی کے نام پر.....''

''تمہارے ساتھ فی الحال ایسا کچھ نہیں ہوگا!'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''جب تک تم قصوروار ثابت نہیں ہو جاتے، تم بڑے آرام سے حوالات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں وقت گزار سکتے ہو۔''

وہ بے حد مطمئن اور پُرسکون نظر آنے لگا۔

میں نے عارف کی لاش کو اسپتال بھجواتے وقت خصوصی ہدایت کردی تھی کہ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ، شاہدہ کی رپورٹ کے ساتھ ہی بھیجی جائے۔ اس ہدایت کی روشنی میں انہوں نے عارف کا پوسٹ مارٹم ہنگامی بنیادوں پر کرنا تھا۔

آئندہ روز دوپہر کے بعد شاہدہ اور عارف کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں ابتدائی رپورٹس کے ساتھ آگئیں۔ میں نے نہایت ہی باریک بینی سے باری باری دونوں رپورٹس کا مطالعہ کیا۔

شاہدہ کی رپورٹ کے مطابق، اس کی موت آٹھ اکتوبر کی صبح چار اور پانچ بجے کے دوران واقع ہوئی تھی۔ اسے حالتِ نیند میں شہ رگ کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ عارف کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کی موت کا وقت سات اور آٹھ بجے کے درمیان بتاتی تھی اور موت کا سبب کنپٹی اور سر میں لگنے والی شدید چوٹیں تھیں۔ یہ مہلک چوٹیں اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹس کی روشنی میں یوسف حلوائی کا بیان درست نظر آتا تھا لہٰذا میں نے اسے چھوڑ دیا اور تنبیہی انداز میں کہا۔

''یوسف! عارف اور شاہدہ کے رشتے داروں میں تم ہی ایک باقی ہو اس لیے ان کے کفن دفن کا بندوبست بھی تمہیں ہی کرنا ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ ابھی اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔ جب تک داؤد میرے ہتھے نہیں چڑھ جاتا، تم بخت پور سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے..... اور اگر جانا بہت ہی ضروری ہو تو تم پیشگی مجھے مطلع کرو گے؟''

''ٹھیک ہے جناب..... میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔'' اس نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

اس جوڑے کی تدفین کے تین روز بعد میں نے داؤد کو پکڑ لیا۔ وہ بخت پور سے چک عمر گیا تھا پھر وہاں سے کسی الیاس گھمن نامی شخص کے ہمراہ بدری وال پہنچ گیا تھا۔ بدری وال سے مجھے پتا چلا کہ وہ اور الیاس گھمن، نذیر نامی ایک بندے کے ساتھ موضع نور چمن چلے گئے تھے۔ داؤد کو میں نے نور چمن سے گرفتار کیا۔

جب داؤد کو تفتیش کی چکی میں پیسا گیا تو اس نے شاہدہ کے ساتھ اپنے تعلقات کا اقرار کرلیا۔ میں نے جب اس سے کہا کہ اس کی حرکتوں کے باعث ایک گھر اجڑ گیا تو وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! جو لوگ اپنے گھر..... اور اس گھر میں بسنے والوں کی جائز ضروریات کا خیال نہیں رکھتے، ان کا انجام ایک دن ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس غیرت بند کو بہت دیر سے ہوش آیا.....''

میں نے داؤد کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور غصیلے لہجے میں کہا۔ ''عارف ایک اتفاقی حادثے میں چل بسا ورنہ شاہدہ کے بعد تمہارا نمبر تھا۔ وہ تمہیں کسی قیمت پر چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اور جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ وہ غیرت بند تھا یا غیرت مند، اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا لیکن فی الحال میں تمہارا منہ بند کرنے کا بندوبست کرتا ہوں بدبخت انسان!''

یہ بات سامنے آگئی تھی کہ داؤد کا براہِ راست ان دونوں میاں بیوی کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بہرحال، اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں تھا کہ عارف نے جو سنگین قدم اٹھایا تھا اس کا محرک یہی شیطان داؤد ہی بنا تھا۔ عارف کو اپنی بیوی کی بے وفائی کے حوالے سے داؤد اور یوسف حلوائی پر شک تھا۔ عارف کے پڑوسی صداقت علی نے بھی کچھ اسی قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا مگر میری پوچھ تاچھ کے نتیجے میں یوسف نے اپنی صفائی پیش کردی تھی البتہ، داؤد کے اقبالِ جرم نے مجھے اس کے خلاف قانونی کارروائی کا موقع فراہم کردیا۔

داؤد اس علاقے کا ایک سکہ بند غنڈا تھا اور مخلوقِ خدا اس کے شر سے بڑی پریشان تھی۔ تفتیش کے دوران اس نے اپنے بہت سے کارناموں کا اعتراف بھی کیا تھا۔ ویسے عارف اور شاہدہ والے معاملے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا وہ کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا اس کی ''اصلاح'' اور لوگوں کے سکون وآرام کے لیے میں نے اسے کچھ عرصے کے لیے جیل بھیج دیا۔

عارف ایک غیرت مند انسان تھا یا غیرت بند، اس کا فیصلہ کرنا زیادہ مشکل نہیں البتہ داؤد غنڈے کے یہ الفاظ بہت اہمیت کے حامل ہیں..... جو لوگ اپنے گھر اور گھر میں بسنے والوں کی جائز ضروریات کا خیال نہیں رکھتے، ان کا انجام ایک دن ایسا ہی ہوتا ہے۔

عارف، شاہدہ کی جائز ضروریات پوری کرنے میں ''ناکام'' تھا اور شاہدہ کی بے راہ روی میں اس محرومی نے سب سے خطرناک کردار ادا کیا تھا!

(تحریر: حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شادی ایک سزا

ملک صفدر حیات

دنیا کا ذہین سے ذہین مجرم بھی کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کرتا ہے۔ ضرورت ہوتی ہے اس غلطی کو گرفت میں لینے کی۔ اس کہانی میں بھی مجرم نے اپنا جرم دوسرے کے کھاتے میں ڈالنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا... بس جلد بازی میں غلطی کی اور ملک صاحب نے گردن ناپ لی۔

2 لاشوں نے اس منظر کی وحشت ناکی کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ ان میں ایک لاش انسان کی جب کہ دوسری ایک بے زبان جانور کی تھی۔ وہ بے زبان اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، اپنے مالک کا وفادار رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جان دے دی تھی۔ اس کی لاش اپنے مالک کے اوپر پڑی تھی۔

سننے اور دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ انسان کی بہ نسبت، جانور میں وفاداری کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ فرض نبھانے کے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا جیسا کہ اس گھوڑے نے کیا تھا۔ اس کی کٹی پھٹی لاش، اپنے مالک کی لاش کے اوپر پڑی اس امر کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اپنی جان قربان کرتے ہوئے وہ اپنے مالک کی ڈھال بنا ہوا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس واقعے کی اطلاع ملی، میں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

ان دنوں میں ضلع لائل پور، موجودہ فیصل آباد کے ایک دور دراز تھانے میں تعینات تھا۔ دہرے قتل کی یہ واردات موضع کوٹلا معراج میں ہوئی تھی جو میرے تھانے سے صرف آدھا میل دور تھا۔ قتل کی اطلاع مقتول کا چھوٹا بھائی ملک نوید لے کر آیا تھا اور میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ میں نے اپنے ہمراہ حوالدار خوش بخت کو بھی لے لیا تھا۔

جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے، تیز چمک دار دھوپ چاروں طرف پھیل چکی تھی اور فضا میں اچھی خاصی گرمی موجود تھی۔ وہ ماہِ جون کے وسطی دن تھے۔ دن کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم بھری دوپہر میں آ گئے ہوں۔

جائے واردات کھیتوں کے درمیان ایک مقام تھا جہاں یہ دونوں لاشیں پڑی ملی تھیں۔ ان دنوں گندم کی کٹائی کا سیزن چل رہا تھا۔ کچھ کھیتوں میں تیار پکی ہوئی فصل کھڑی تھی اور بعض کی فصل کو کاٹا جا چکا تھا۔ جس کھیت میں ملک نوید کے بڑے بھائی ملک وحید اور اس کے گھوڑے کی لاشیں پڑی تھیں وہاں سے فصل کاٹی جا چکی تھی۔ جائے وقوعہ پر پہنچتے ہی میں لاشوں کے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

ان دنوں چونکہ کھیتوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں لہٰذا خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جائے وقوعہ پر کوئی درجن بھر افراد موجود تھے۔ یہ سب لوگ کھیتوں میں کام کرنے والے تھے اور اس واقعے نے انہیں خاصا سراسیمہ کر دیا تھا۔ ہمیں اس طرف بڑھتے دیکھ کر جمگھٹا چھٹ گیا تھا چنانچہ مجھے قانونی کارروائی کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ملک وحید اور اس کے کتھئی گھوڑے کی لاشیں جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، ایک دوسرے کے اوپر پڑی ملی تھیں اور دونوں لاشوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ گھوڑے کی لاش کو ہٹا کر جب میں نے ان کا بہ غور جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ان کے بدن پر متعدد کٹ لگے ہوئے تھے جن میں سے بعض تو تین تین، چار چار انچ تک گہرے تھے۔ لگتا تھا، کسی تیز دھار آلے کی پے در پے ضربات نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ بعض وار اتنے کاری اور خطرناک تھے کہ جان لیوا ثابت ہوئے اور وہ دونوں موقع پر ہی زندگی کی بازی ہار گئے۔ مجھے اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ گھوڑے نے اپنی آخری سانسوں میں بھی ملک وحید کو کور دینے کی بھرپور کوشش کی تھی اور پھر بے جان ہو کر اس کے اوپر ہی گر گیا تھا، یہ الگ بات کہ ملک وحید اپنے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس سے پہلے ہی جاں بحق ہو چکا تھا۔

ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ حملہ آور دو یا دو سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ افراد تھے کیونکہ یہ کسی اکیلے آدمی کا کام نظر نہیں آتا تھا۔ گھوڑے اور ملک وحید کو اچانک گھیرے میں لے کر مارا گیا تھا۔ یہ ایک منظم واردات دکھائی دیتی تھی اور مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ تیز دھار کلہاڑیوں کے وار کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

لاشوں کے تفصیلی معائنے کے بعد میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا۔ اس سلسلے میں حوالدار خوش بخت نے میری بھرپور مدد کی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ملک وحید کی کٹی پھٹی لاش کو پوسٹ مارٹم کی غرض سے ضلعی اسپتال بھجوا دیا اور موقع پر موجود افراد سے اس واقعے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان افراد میں سے کوئی بھی اس واقعے پر ایسی روشنی ڈالنے کے قابل نہیں جس سے میں کوئی فائدہ اٹھا سکوں۔ وہ سب مقتول اور اس کے کٹھیئ گھوڑے سے تو بہ خوبی واقف تھے لیکن اس خونیں واردات کے حوالے سے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ میں نے براہِ راست مقتول کے چھوٹے بھائی ملک نوید سے پوچھ لیا۔

''نوید! تمہیں اس اندوہناک واقعے کے بارے میں کب اور کیسے پتا چلا؟''

ملک نوید کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک صحت مند اور خوب رو جوان تھا۔ اس نے گھنی، بڑی آن بان والی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کی شخصیت خاصی متاثر کن اور رعب دار تھی۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''جناب! میں تو اس وقت حویلی میں تھا جب مجھے پتا چلا کہ بڑے ملک صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''بڑے ملک'' سے اس کی مراد مقتول ملک وحید تھی۔ اس کا مطلب تھا، وہ خود ''چھوٹا ملک'' کہلاتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی کہ ملک وحید کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟''

''جیرا موچی نے...!'' اس نے بتایا۔

''جیرا موچی...!'' میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے دہرایا پھر کہا۔ ''کیا جیرا موچی یہاں موجود ہے؟''

''نہیں جناب!'' ملک نوید نے نفی میں گردن ہلائی۔

''جیرا اس وقت ان لوگوں میں موجود نہیں۔''

''وہ کہاں چلا گیا؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''مجھے تو جیرا موچی سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں؟''

''آپ میرے ساتھ حویلی چلیں جناب!'' ملک نوید نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں جیرا کو وہیں بلا لیتا ہوں۔ ساری باتیں ادھر بیٹھ کر ہی کریں گے۔ بھابی جی حویلی میں اکیلی ہیں۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''بھابی جی'' غالباً مقتول کی بیوہ تھی۔ اس عورت کو تو پریشان ہونا ہی چاہیے تھا۔ شوہر کو پیش آنے والا واقعہ اس سے چھپایا نہیں ہوگا۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ مجھے مقتول کی حویلی چلنا چاہیے تاکہ اس کی بیوہ سے بھی پوچھ تاچھ ہو جائے اور جیرا موچی کا انٹرویو بھی۔ جائے وقوعہ پر موجود، لوگوں پر وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں تھا لہٰذا میں ملک نوید کے ساتھ اس کی حویلی آ گیا۔

موضع کوٹلا معراج میں دو حویلیاں تھیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی۔ بڑی حویلی میں اس گاؤں کا چودھری رہتا تھا اور چھوٹی حویلی ملک وحید اور ملک نوید کے تصرف میں تھی۔ ان دونوں خاندانوں میں کوئی تعلق یا رشتے داری نہیں تھی۔ وہ گاؤں چودھری سراج کے باپ چودھری معراج کے نام سے منسوب تھا جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ چودھری سراج بھی اس وقت ستّر کے پیٹے میں تھا اور اس کی صحت دبلی زبان میں یہی اعلان کرتی تھی کہ اب تب میں اس کا بلاوا آنے والا ہے۔

ملک وحید اور ملک نوید کی حیثیت ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کی تھی۔ ان کے والد ملک حاکم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب یہ دونوں بھائی دو منزلہ حویلی میں رہتے تھے... بلکہ اس واقعے کے بعد تو ان دونوں میں سے ایک ہی باقی بچا تھا جو مجھے اپنے ساتھ حویلی لے آیا تھا۔ یہیں آ کر یہ پتا چلا کہ مقتول اپنی بیوی کے ساتھ حویلی کی بالائی منزل پر رہائش پذیر تھا جبکہ زیریں منزل ملک نوید کے استعمال میں تھی جو کہ ابھی غیر شادی شدہ تھا۔

ملک نوید نے مجھے حویلی کی زیریں منزل پر ایک سجی سجائی بیٹھک میں بٹھایا اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ''جناب! آپ تشریف رکھیں میں جیرا کو بلوانے کے لیے کسی کو بھیجتا ہوں۔''

میں نے تشریف رکھ دی۔ حوالدار خوش بخت کو میں نے لاش کے ساتھ ہی سرکاری اسپتال روانہ کر دیا تھا لہٰذا اس وقت میں وہاں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ملک نوید واپس آ گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تھانے دار صاحب! ایک بندے کو میں نے جیرا کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف دوڑا یا ہے۔ وہ اسے ڈھونڈ کر لے آئے گا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جناب! بڑے ملک صاحب کے ساتھ یہ کس قسم کا واقعہ پیش آیا ہے...!''

اس کی پریشانی اور غم عین فطری امر تھا۔ اس حویلی میں وہ دونوں بھائی رہائش پذیر تھے۔ بڑے بھائی کی المناک اور عبرت انگیز موت نے ملک نوید کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر کہا۔

''ملک نوید! جو کچھ پیش آیا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ کسی بدترین دشمنی کا شاخسانہ دکھائی دیتا ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ اس واردات میں ملک وحید کے کس دشمن کا ہاتھ ہوسکتا ہے... یہ کوئی اتفاقی حادثہ تو بہر حال نہیں ہے...!''

''جناب...!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''میرا تو دماغ ہی کام نہیں کررہا۔ بڑے ملک صاحب کی موت نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی ہے۔ میں کیا بتاؤں... کیا بتاؤں جی... کہ کس دشمن نے انہیں اس حال کو پہنچایا ہے... ان کا تو ایسا کوئی بھی دشمن نہیں جناب...!''

اس کے لہجے کی ناتوانی اور اعضا کی مضمحلی سے ہر لحہ یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بولتے بولتے یک دم بے ہوش ہوجائے گا۔ بڑے بھائی کی ناگہانی موت نے اسے بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی حالت بڑی افسوس ناک تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اسے پہلی فرصت میں آرام کا مشورہ دیتا۔ اس کی کیفیت خاصی غیر ہورہی تھی لیکن میں اسے اس طرح نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جب تک مجھے اس واردات کا کوئی سراغ نہیں مل جاتا، میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا لہٰذا میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''نوید! میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں لیکن ظاہر ہے، میں ایسا کچھ نہیں کرسکتا کہ تمہاری تکلیف کو خود پر لے لوں۔ ہاں البتہ...'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں البتہ... اگر تم مجھ سے بھرپور تعاون کرو تو یہ ہوسکتا ہے کہ میں جلد از جلد تمہارے بھائی کے قاتل یا قاتلوں کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دلوادوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا...؟''

''سمجھ تو رہا ہوں جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ میں آپ سے کیا... اور کس قسم کا تعاون کروں...!''

بات ختم کر کے اس نے گردن جھکالی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

انسان اور بندر

میں داروِن کی تھیوری کو مانتا ہوں۔ واقعی انسان پہلے بندر تھا اور اس سے پہلے کچھ اور تھا۔ اس تبدیلی کو ظہور میں آئے ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں اس لیے اب اس سلسلے میں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آج کل یہ تبدیلی یکلخت بند کیوں ہوگئی ہے۔ آج کل ہم بالکل تبدیل نہیں ہورہے ہیں۔ ہم سب ایک جگہ آکر رک کیوں گئے ہیں؟ کئی ہزار سال سے بندر، بندر ہی ہیں اور انسان، انسان ہی ہیں۔ نہ کوئی بندر انسان بنتا ہے اور نہ انسان آگے ترقی کرتا ہے۔ یہ کیوں ہے؟ یہاں یہ تھیوری کیوں ختم ہوجاتی ہے۔

حماقتیں از شفیق الرحمن

مطالعہ: طارق سلطان اعوان حیدر آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں میں سب سے زیادہ ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کل کلاں ہم کہیں اس کے مدمقابل نہ آن کھڑے ہوں۔''

''آپ لوگوں کے پاس کتنی زمین ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''اسّی ایکڑ!''

''اسّی ایکڑ اچھی خاصی اراضی ہوتی ہے ملک نوید!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''اور چودھری سراج کی زمینوں کا کیا حساب ہے؟''

''چودھری دوسو ایکڑ سے زیادہ زمین کا مالک ہے۔'' ملک نوید نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کی ہوس اور حرص کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے اور خواہش ایسی ہے کہ جیسے سب کچھ سمیٹنا چاہتا ہو... اس نے بڑے ملک صاحب کو پچھلے دنوں ایک پیش کش کی تھی...''

''کیسی پیش کش ملک نوید؟'' وہ جیسے ہی خاموش ہوا، میں نے سوال کر ڈالا۔

اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی چودھری کی جس حرص و ہوس کا ذکر کیا ہے نا جناب... اس پیش کش کا تعلق اسی سے ہے۔ چودھری نے بڑے ملک صاحب سے کہا تھا کہ وہ منہ مانگی رقم لے کر اپنی اسّی ایکڑ اراضی اس کے ہاتھ فروخت کر دیں لیکن ملک صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ آپ خود سوچیں تھانے دار صاحب! اگر زمیندار اپنی تمام تر زمین کسی کے ہاتھ فروخت کر دے گا تو پھر اس کے پاس بچے گا ہی کیا؟'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جب بڑے ملک صاحب نے چٹا انکار کر دیا تو چودھری سراج کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ظاہر ہے، پھر ان کے درمیان کوئی خوش گوار بات تو ہو نہیں سکتی تھی۔ ملک صاحب نے بعد میں گھر آ کر مجھے بتایا تھا کہ ان کے اور چودھری کے بیچ اچھی خاصی گرما گرمی ہو گئی تھی۔''

''ہوں...'' اس کی بات سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تمہارے خیال میں، اس واقعے میں چودھری سراج کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟''

''دیکھیں جناب! مجھے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''جب میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا تو وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ چودھری سراج بڑا کینہ پرور آدمی ہے اور اس نوعیت کے کاموں کے لیے اس نے غنڈے بھی پال رکھے ہیں لیکن جناب... آپ میری بات کا کوئی ایسا ویسا مطلب نہیں نکالیے گا۔ میں دراصل آپ کو بتا رہا تھا کہ...''

''میں سمجھ رہا ہوں نوید، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''چودھری سراج کو تو میں اپنے طور پر خود ہی چیک کر لوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ گزشتہ رات تمہارا بھائی ملک وحید حویلی کے اندر موجود تھا؟''

میں نے جائے وقوعہ پر ملک وحید اور گھوڑے کی لاشوں کا بغور جائزہ لیا تھا۔ ان کے کٹے پھٹے جسموں پر جمے ہوئے خون سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ وہ مہلک واقعہ رات کے درمیانی حصے میں پیش آیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ملک وحید گزشتہ رات کو اپنے گھر میں نہیں تھا یا یہ کہ اسے گھر سے بلایا گیا تھا۔ حقیقت کیا تھی، یہ ملک نوید کے جواب ہی سے کھل سکتی تھی۔ اس نے بڑے سادہ سے لہجے میں بتایا۔

''تھانے دار صاحب! بڑے ملک صاحب کل صبح کو اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر موضع قلعہ فرمان علی گئے تھے اور میری معلومات کے مطابق، رات کو ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی اور پھر صبح پتا چلا کہ...'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے چند لمحات کے بعد پوچھا۔ ''موضع قلعہ فرمان علی وہ کس کام سے گیا تھا اور یہ کہ... اس نے اپنی واپسی کے پروگرام کے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے ایک لمحہ سوچا اور بولا۔ ''ادھر قلعہ فرمان علی میں ان کا ایک دوست مہر سلیم رہتا ہے۔ وہ جب بھی ادھر جاتے ہیں تو اسی کے پاس جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے، وہ کل بھی مہر سلیم ہی سے ملنے گئے ہوں گے۔ ویسے ان کے پروگرام کا صحیح علم بھابی صاحبہ کو ہوگا... یہ دلخراش واقعہ تو بتاتا ہے کہ ان کی واپسی ہوئی تھی اور...!''

وہ ایک مرتبہ پھر بے حد جذباتی ہو گیا۔ اسی لمحے ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ وہ جیرا موچی کو بلا لایا ہے۔ غالباً یہ وہی شخص تھا جسے ملک نوید نے جیرا کی طرف دوڑایا تھا۔ نوید نے فوراً جیرا کو بیٹھک میں بلا لیا۔

جیرا ایک سوکھا سڑا سیاہ روبندہ تھا۔ چہرے کی پختگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی لیکن ''صحت اور جثے'' کی بدولت وہ تیس سے زیادہ کا نظر نہیں آتا تھا۔ چمڑے کے ساتھ مختلف نوعیت کی طبع آزمائی نے اسے بھی جیسے چمڑے ہی کا بنا کر رکھ دیا تھا۔ جیرا موچی کا تعلق موضع کوٹلا معراج ہی سے تھا۔

ملک نوید نے جیرا کو میری آمد کی غرض و غایت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارے میں، مناسب الفاظ میں بتایا اور حکم دیا کہ میں اس سے جو بھی سوال کروں وہ اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔ وہ بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلا کر میری جانب متوجہ ہوگیا۔

میں نے آئندہ پندرہ منٹ تک گھما پھرا کر اس سے لگ بھگ دو درجن سوالات کیے لیکن اس کے جوابات میں سے ایک بھی ایسی بات حاصل نہ کرسکا جو وحید مرڈر کیس کو حل کرنے میں کسی حوالے سے مددگار ثابت ہوسکتی۔ وہ ایک سیدھا سادا اسامی تھا۔ علی الصباح وہ رفعِ حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گیا تھا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ جائے وقوعہ کی صورتِ حال نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ وہ جب لاشوں کے قریب پہنچا تو یہ جان کر چونک اٹھا کہ گھوڑے کی لاش کے نیچے ملک وحید کی لاش دبی ہوئی تھی۔ وہ ملک وحید اور اس کے ننھے گھوڑے کو اچھی طرح پہچانتا تھا لہٰذا اس منظر نے اسے وحشت زدہ کردیا اور وہ دوڑا دوڑا ملک نوید کے پاس پہنچ گیا۔

اس اندوہناک واقعے کی خبر جب چھوٹی حویلی میں پہنچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ اس حویلی کی بالائی منزل پر مقتول کی بیوی کی رہائش تھی۔ ان کی شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے لیکن ابھی تک ان کی کوئی اولاد منظر پر نہیں آئی تھی لہٰذا وہ حویلی کی بالائی منزل پر بچوں کے بغیر ہی رہتے تھے۔ زیریں منزل پر چھوٹے ملک کا قبضہ تھا۔ وہ جیرا موچی کے ساتھ، آناً فاناً میں جائے واردات پر پہنچا اور اپنی آنکھوں سے اس وحشت ناک منظر کی تصدیق کرلی... بعدازاں ملک نوید نے واپس حویلی جاکر اپنی بھابی کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور میرے پاس تھانے آگیا۔

میں نے جیرا موچی کو فارغ کردیا۔ جب وہ ملک نوید کا اشارہ پاکر بیٹھک سے نکل گیا تو میں نے غم زدہ ملک سے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''نوید! میں تمہاری بھابی سے بھی دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا نام ہے ملک وحید کی بیوی... میرا مطلب ہے، بیوہ کا؟''

''ان کا نام تو نور جہاں ہے لیکن وہ ''نوری'' مشہور ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ اوپر والی منزل پر ہیں۔ میں انہیں نیچے بلاؤں یا آپ...؟''

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''اسے زحمت نہ دو۔ میں ہی اوپر جاکر اس سے مل لیتا ہوں، تم آؤ میرے ساتھ۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور میرے حکم کی تعمیل کردی۔ میں اس کی معیت میں حویلی کی اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ ملک نوید نے مجھے ایک ایسے کمرے میں بٹھایا جو کسی بیٹھک یعنی ڈرائنگ روم کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ میں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ چکا تو اس نے کہا۔

''میں بھابی صاحبہ کو لے کر آتا ہوں جناب!''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

اللہ کی شان نرالی اور کام انوکھے ہیں۔ اس کی مصلحت اور حکمت کو سمجھنا آسان نہیں اور جو لوگ اس کی قدرت کے مزاج سے آشنائی حاصل کرلیتے ہیں وہ انہیں اپنا دوست بنالیتا ہے پھر انہیں دنیا جہان اور آخرت کا کوئی غم نہیں رہتا۔

میں نے اس حویلی میں قدم رکھتے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ اوپر نیچے کی منزلوں کو ملا کر وہاں درجن بھر کمرے تو ہوں گے ہی اور مکینوں کی تعداد صرف تین تھی اور اللہ کی قدرت ہمیں کہیں ایسا بھی دکھاتی ہے کہ گھر کے افراد درجن سے زیادہ ہیں مگر انہیں رہائش اختیار کرنے کے لیے محض تین کمرے دستیاب ہیں۔ بہرحال... اس چھوٹی حویلی کے درجن بھر کمروں پر صرف تین افراد کی حکمرانی تھی اور اب یہ

BEFORE
AFTER
SHINE ON STRIPS
چہرے کلائیوں پنڈلیوں کے فاضل بال
اور چہرے کے کیل مہاسے داغ
دھبے ہمیشہ کیلئے دور کرنے کا بہترین
ٹریٹمینٹ ہے۔ قیمت فی پیکنگ
500 روپے
محصول ڈاک 50 روپے
گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر دی پی طلب فرمائیں یا E-mail کریں
fairy.perfumers@hotmail.com
فیری پرفیومرس پوسٹ بکس نمبر 2209
کراچی۔ 74600
fp

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی گھٹ کر دو ہی رہ گئے تھے۔ بالائی منزل کی مکین نوری اور زیریں منزل کا رہائشی ملک نوید۔ ملک وحید کی المناک موت نے اس حویلی کا سربراہ چھین لیا تھا۔

میں زندگی اور موت کے انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ ملک نوید اپنی بیوہ بھابی نوری کو لے کر بیٹھک میں آ گیا۔ وہ گردن جھکا کر اندر داخل ہوئی پھر دیور کے کہنے پر، وہ میرے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ملک نوید بھی ایک طرف بیٹھ گیا اور عاجزی سے بولا۔

''تھانیدار صاحب! میں نے بھابی صاحبہ کو آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ آپ نے ان سے جو بھی سوالات کرنا ہیں، ذرا جلدی کر لیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ بڑے ملک صاحب کی موت نے...''

''ہاں، میں جانتا ہوں!'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ تمہاری بھابی پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی ہے لیکن میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بھی بہت ضروری ہے بہرحال...'' میں سانس لینے کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ اسے جلدی فارغ کر دوں۔''

''بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ ممنونیت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ملک نوید! میری بات کا برا نہیں منانا... میں دراصل تمہاری بھابی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں اس لیے... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا...؟''

اس نے الجھن زدہ نظر سے باری باری مجھے اور اپنی بھابی نوری کو دیکھا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی... جی سمجھ رہا ہوں... آپ لوگ اطمینان سے بات کریں۔ میں آپ کے لیے لسی پانی کا بندوبست...!''

''کسی بندوبست کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ملک نوید۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ ''یہ ایسا موقع نہیں کہ تم میری خاطر مدارات کا تکلف کرو۔ بس، میں دس پندرہ منٹ میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ تم تھوڑی دیر کے لیے...!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''جی، ٹھیک ہے۔ آپ کر لیں بات... میں باہر جا رہا ہوں۔''

ملک نوید کے جانے کے بعد میں نوری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

نور جہاں عرف نوری ایک پُرکشش اور خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس اور تیس کے درمیان قائم کیا۔ بعد ازاں پتا چلا کہ وہ اس وقت اٹھائیس سال کی تھی۔ قد پانچ فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ بدن پُرکشش اور چست تھا۔ چہرہ گول، رنگت گندمی اور آنکھوں کا رنگ بادامی۔ اس کے سر کے بال شہد رنگ اور ریشمی تھے۔ میں نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''نوری! مجھے تمہارے خاوند کی ناگہانی موت کا بڑا دکھ ہے لیکن افسوس کہ میں ملک وحید کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا البتہ...'' میں ذرا سی دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''البتہ، اگر تم مجھ سے تعاون کا وعدہ کرو تو میں جلد از جلد اس کے قاتل یا قاتلوں کو گرفتار کر لوں گا۔''

اس نے گردن اٹھا کر بھیگی ہوئی بادامی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی لانبی پلکوں پر آنسوؤں کی چمک نمایاں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے گلابی لب وا ہوئے۔ وہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں تھانیدار صاحب...؟''

''میں تم سے جو بھی سوال کروں، اس کا بالکل سیدھا اور درست جواب دینا نوری۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تعاون سے میری یہی مراد ہے۔''

''جی پوچھیں، آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' وہ دھیرے سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے خیال میں ملک وحید کو کس نے قتل کیا ہوگا؟''

''جی... میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے بڑا مشکل سوال کر دیا ہے تھانیدار صاحب...!''

''تم اس حوالے سے کچھ اندازہ تو لگا سکتی ہو۔'' میں نے اپنے سوال کو ذرا مختلف انداز میں دہرایا۔ ''ملک وحید کا ایسا کون سا جانی دشمن ہو سکتا ہے؟''

اس نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''جناب! میں تو ملک صاحب کے کسی بھی دشمن سے واقف نہیں ہوں۔ میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے۔''

''چھوٹے ملک... یعنی تمہارے دیور ملک نوید نے مجھے بتایا ہے کہ پچھلے دنوں مقتول ملک وحید اور یہاں کے چودھری سراج میں خاصی گرما گرمی ہو گئی تھی۔'' میں نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''شاید زمین کی خرید و فروخت کا کوئی معاملہ تھا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''جی ہاں، یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''نوید نے آپ کو غلط نہیں بتایا۔ ملک صاحب نے اس سلسلے میں مجھ سے بھی ذکر کیا تھا۔ وہ دراصل بات یہ ہے جناب...'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکی پھر گمبھیر آواز میں بولی۔

''تھانیدار صاحب! ہمارے پاس صرف اسّی ایکڑ زمین ہے اور چودھری سراج ہم سے کئی گنا زیادہ زمین کا مالک ہے۔ میں نے سنا ہے، صرف کوٹلا معراج کے آس پاس ہی اس کا زرعی رقبہ دو سو ایکڑ سے زیادہ ہے لیکن اس کی کوشش یہ ہے کہ ہم اپنی زمین اس کے ہاتھ فروخت کر دیں اور... یہ بات ملک صاحب کو کسی بھی قیمت پر منظور نہیں تھی۔''

''ملک صاحب'' سے اس کی مراد مرحوم ملک وحید تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ چودھری سراج کی ذات کے حوالے سے ان دیور بھابی کی رائے ایک جیسی تھی تاہم تصدیق کی خاطر میں نے نوری سے مزید سوالات بھی کیے۔

''نوری! مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ چودھری سراج خاصا منتقم مزاج اور غصہ ور شخص ہے۔ اس نے خاص طور پر چند غنڈے بھی پال رکھے ہیں؟''

''جناب! آپ نے بڑے مناسب الفاظ میں چودھری سراج کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بہرحال، آپ نے جنہیں پالتو غنڈے کہا ہے وہ چودھری کی نظر میں اس کے وفادار نمک خوار اور محافظ ہیں۔''

میں نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔ ''ملک نوید نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ملک وحید کی موت میں چودھری سراج یا اس کے آدمیوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

میں نے محض نوری کے دل کا حال جاننے کے لیے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا تھا حالانکہ ملک نوید نے ایسا کوئی خدشہ ظاہر نہیں کیا تھا البتہ، اس نے واضح انداز میں انکار بھی نہیں کیا تھا۔ نوری نے بھی اپنے دیور سے ملتا جلتا جواب ہی دیا۔

''تھانیدار صاحب! میرے پاس ایسا کوئی ثبوت تو نہیں کہ میں چودھری سراج پر کھلم کھلا الزام لگا سکوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''لیکن ایک بات ہے کہ چودھری سراج سے ملاقات کے بعد ملک صاحب خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر جھنجلانے لگتے تھے۔ انہوں نے پچھلے پانچ سال میں مجھ پر کبھی اتنا غصہ نہیں کیا تھا جو چند روز میں دیکھنے کو ملا...'' بولتے بولتے نوری کی آواز بھرا گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتایا۔

''پچھلی دو راتوں میں، کل کی رات کو چھوڑ کر، میں نے انہیں نیند میں بڑبڑاتے ہوئے بھی سنا تھا... وہ... وہ بہت الجھے ہوئے اور بے چین تھے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''نوری! مجھے بتاؤ، ملک وحید نیند کی حالت میں کیا بڑبڑا رہا تھا؟''

''جناب... ان کی بڑبڑاہٹ اور جھنجلاہٹ چودھری سراج کے حوالے سے تھی۔'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''میں نے انہیں اس قسم کے جملے بولتے ہوئے سنا تھا... یہ چودھری سراج خود کو سمجھتا کیا ہے... کیا میں اس کی دھونس میں آ جاؤں گا؟... نہیں، کبھی نہیں... میں اپنی زمین کسی بھی قیمت پر اس کے ہاتھ فروخت نہیں کروں گا...''

''ہوں...!'' میں نے اس کی بات کے اختتام پر معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''تھانیدار صاحب! میں بغیر کسی ثبوت کے الزام تراشی کے حق میں نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ چودھری سراج کی وجہ سے ملک صاحب بہت پریشان تھے۔ باقی... آپ خود سمجھدار ہیں!''

اس نے بات کے اختتام پر گیند میری کورٹ میں پھینک کر خاموشی اختیار کر لی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ چودھری سراج پر شک کے حوالے سے ان بھابی دیور کی سوچ میں خاصی مطابقت نظر آتی تھی۔ ملک نوید نے بھی ڈھکے چھپے انداز میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے نوری کی تسلی کی خاطر خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔

''دیکھو نوری! میں تم سے ابتدا ہی میں وعدہ کر چکا ہوں کہ تمہارے خاوند کے قاتل یا قاتلوں کو بہت جلد کیفر کردار تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ میری تحقیق اور تفتیش کے نتیجے میں اگر چودھری سراج یا اس کا کوئی بندہ اس واردات میں ملوث نظر آیا تو انصاف اور قانون کے تقاضے پورے کیے جائیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور یہی بات میں نے ملک نوید کو بھی اچھی طرح سمجھا دی ہے۔''

''جی، بہت بہت شکریہ آپ کا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور گردن جھکا لی۔

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے نوری سے پوچھا۔ ''ملک نوید کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ گزشتہ رات ملک وحید حویلی میں موجود نہیں تھا۔ شاید وہ اپنے کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوست سے ملنے قلعہ فرمان علی گیا ہوا تھا؟''

''جی ہاں... ایسی ہی بات ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہاں قلعہ میں ان کا ایک دوست مہر سلیم رہتا ہے۔ وہ مہر صاحب ہی سے ملنے گئے تھے۔''

''کیا مہر سلیم بھی مقتول سے ملنے یہاں کوٹلا معراج آتا رہتا ہے؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' وہ بڑی رسان سے بولی۔ ''دو تین مہینے میں یہ لوگ آپس میں ایک آدھ ملاقات ضرور کرتے تھے۔ کبھی تو مہر صاحب ہماری حویلی میں آجاتے اور کبھی ملک صاحب ان سے ملنے قلعہ فرمان علی چلے جاتے تھے۔''

''نوری! ذرا سوچ کر بتاؤ، کیا کل بھی مقتول صرف مہر سلیم ہی سے ملنے گیا تھا یا اسے قلعہ فرمان علی کے علاوہ بھی کہیں جانا تھا؟''

''جی... مجھے تو صرف قلعہ ہی کے بارے میں بتایا تھا۔''

''کیا وہ گزشتہ روز کسی خاص کام سے قلعہ فرمان علی گیا تھا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور جواب دیا۔ ''وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ ملک صاحب کو مہر سلیم سے کوئی رقم لینی تھی۔ وہ اسی مقصد سے وہاں گئے تھے!''

رقم کے ذکر پر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''ملک وحید نے تمہیں یہ بھی بتایا ہوگا کہ اسے مہر سلیم سے کتنی رقم لینا تھی؟''

''جی... پانچ ہزار روپے!'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''پانچ ہزار روپے...!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔

معزز قارئین! آپ کو میری اس حیرت پر حیران ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ آج کے نہیں، بلکہ آج سے لگ بھگ پچپن ساٹھ سال پہلے کے پانچ ہزار روپے کا ذکر ہے جب تین سے چار روپے میں ایک من اعلیٰ درجے کی گندم مل جایا کرتی تھی اور سونے کا بھاؤ ساٹھ ستر روپے تولہ ہوا کرتا تھا۔ آپ اس رقم کو آج کل کے کم از کم دس لاکھ روپے تو سمجھ ہی لیں۔ نئی پود کی آسانی کے لیے بتاتا چلوں کہ میں نے گندم اور سونے کے وزن کا جو ذکر کیا ہے وہ علی الترتیب چالیس کلوگرام اور دس گرام ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آگئی ہوگی کہ میں نے پانچ ہزار روپے کی رقم پر چونک کر حیرت کا اظہار کیوں کیا تھا!

نوری نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی تو میں نے کہا۔ ''یہ تو اتنی بھاری رقم ہے کہ اس کے لیے کوئی بھی ملک وحید کی جان کا دشمن ہوسکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے معلوم ہو کہ اس کے پاس اتنی رقم موجود ہے...'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔

''نوری! یہ بات اور کس کس کو معلوم تھی؟''

''میرا خیال ہے، ملک صاحب نے یہ بات صرف مجھے ہی بتائی تھی۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔ ''یہ بات میرے، ملک صاحب اور مہر صاحب کے درمیان تھی۔ اگر مہر سلیم نے کسی اور کو بتا رکھا ہو تو میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی!''

اچانک میرے ذہن میں ملک نوید کے حوالے سے ایک جھماکا سا ہوا اور اس جھماکے کا سبب ماضی بعید کا ایک واقعہ تھا۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں نوری سے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس رقم کا ذکر کسی اور سے بھی کیا تھا؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ملک صاحب نے خاص طور پر مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس کے بارے میں کسی کو نہ بتاؤں۔''

''کیا ملک نوید اس راز سے واقف تھا؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''میں نے تو اسے بالکل نہیں بتایا۔ اگر ملک صاحب نے چھوٹے بھائی سے ذکر کر رکھا ہو تو مجھے اس کی خبر نہیں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر مجھ سے استفسار کیا۔

''کیا نوید نے اس سلسلے میں آپ کو کچھ بتایا ہے؟''

''نہیں... اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ ملک وحید کل صبح مہر سلیم سے ملنے قلعہ فرمان علی گیا تھا اور رات کو اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے، ملک صاحب نے رقم کے بارے میں نوید کو کچھ نہیں بتایا تھا۔'' نوری نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''تھانیدار صاحب! آپ نے ملک صاحب کی لاش کو اسپتال بھجوانے سے پہلے ان کے لباس کی تلاشی تو یقیناً لی ہوگی۔ کیا آپ کو وہ رقم ملی؟''

''مقتول ملک وحید کے لباس میں سے ایسی موٹی رقم برآمد نہیں ہوئی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''یہ تلاشی میں نے تمہارے دیور کی موجودگی میں لی تھی۔ مقتول کی مختلف جیبوں میں سے استعمال کی جو اشیا اور ڈھائی سو روپے ملے وہ میرے پاس محفوظ ہیں اور میں نے ان چیزوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باقاعدہ فہرست بنائی ہے۔ کیس کی تفتیش مکمل ہونے کے بعد میں تمام اشیا تمہارے حوالے کردوں گا...''

''اگر پانچ ہزار کی رقم ملک صاحب کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اسی رقم کی خاطر قتل کیا گیا ہے۔'' نوری نے قیاس انگیز لہجے میں کہا۔ ''کسی ظالم کو پتا چل گیا ہوگا کہ وہ ایک خطیر رقم لے کر آرہے ہیں۔ اس نے انہیں موت کے گھاٹ اتارا اور رقم لے کر فرار ہوگیا۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ گردن جھکا کر خاموش ہوگئی۔

''ایسا ممکن ہے...'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن میں ایک اور انداز سے بھی سوچ رہا ہوں۔''

''جی... وہ کیا؟'' اس نے سر اٹھا کر نم ناک آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ملک وحید کے پاس کوئی رقم ہی نہ ہو۔ مہر سلیم سے ملنے کے بعد ہی پتا چل سکتا ہے کہ اس نے مقتول کو رقم دی تھی یا نہیں۔ ایک بات اور...''

میں سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہارے خاوند کی لاش کا بغور جائزہ لیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق، اس کی موت رات دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ کوٹلا معراج سے قلعہ فرمان علی صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ کوئی بھی شخص گھوڑے پر سوار ہوکر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں قلعہ سے کوٹلا پہنچ سکتا ہے۔ اگر ہم ملک وحید کے قتل کا وقت دس بجے بھی فرض کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لگ بھگ نو بجے قلعہ سے نکلا ہوگا اور نو بجے کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ عشا کے بعد اندھیرے میں۔ اگر مقتول اپنے ساتھ اتنی بڑی رقم لے کر آرہا تھا تو اسے رات کے اندھیرے میں سفر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ شاید اس کے پاس رقم تھی ہی نہیں... ویسے اس بات کی تصدیق مہر سلیم سے ہوجائے گی۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اگر ملک صاحب کے پاس رقم نہیں تھی تو پھر کسی ظالم نے ان پر ظلم کیوں کیا... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا نیدار صاحب...!''

''تم پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے نوری۔'' اس کی حالت کے پیشِ نظر میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس لیے تم اس بارے میں سوچ کر اپنی پریشانی کو نہ بڑھاؤ۔ میں سب پتا چلالوں گا۔ تم صرف مجھے اتنا بتاؤ کہ کل گھر سے روانہ ہوتے وقت مقتول نے اپنی واپسی کے بارے میں تمہیں کیا بتایا تھا؟''

''انہوں نے کہا تھا...'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ''اگر مہر سلیم نے رقم دے دی تو وہ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے اور اگر وہاں دیر ہوگئی تو پھر وہ اگلی صبح یعنی آج ہی واپس آئیں گے...''

''عقل مندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول کے پاس رقم نہیں تھی ورنہ رقم سمیت وہ رات کے اندھیرے میں کبھی سفر نہ کرتا اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ رقم کے بغیر رات ہی کو کیوں واپس آگیا، اس کا جواب مہر سلیم کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا۔ میں یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا قلعہ فرمان علی جاؤں گا۔''

میرے اس ارادے پر نوری نے کچھ نہ کہا اور گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''نوری! ایک بہت ہی ذاتی سا سوال ہے!''

اس نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مضطرب استفسار کی جھلک بڑی نمایاں تھی تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ میں نے پوچھا۔ ''نوری! اپنے دیور ملک نوید کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''جی...!'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مم... میں کچھ... سمجھی نہیں...؟''

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، ملک نوید تمہاری نظر میں کیسا آدمی ہے؟''

جواب دینے کے بجائے نوری نے بے ساختہ بیٹھک کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں ملک نوید بند دروازے کے پیچھے کھڑا اس کی باتیں نہ سن رہا ہو۔ اس کی دیکھا دیکھی میری نگاہ بھی بلا ارادہ مذکورہ دروازے کی جانب اٹھ گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے واقعی ملک نوید دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا ہماری باتیں سننے کی کوشش کررہا ہے!

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور خاموشی سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اسی لمحے دروازے کے عقب میں قدموں کی مدھم آواز ابھری جیسے کوئی افراتفری میں مگر بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں سے ہٹا ہو۔ حویلی کی بالائی منزل پر اس وقت ہم تینوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اور نوری بیٹھک کے اندر موجود تھے۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ملک نوید دروازے کے پیچھے چھپ کر نہ صرف یہ کہ ہماری باتیں سننے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کررہا تھا بلکہ وہ دروازے کی کسی جھری میں سے ہمیں دیکھ بھی رہا تھا اور... اس نے مجھے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا جبھی وہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

میں نے دروازہ کھول کر راہ داری میں، ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھا۔ ملک نوید یا کوئی اور بندہ بشر مجھے دکھائی نہ دیا۔ میں دروازہ بند کرکے واپس نوری کے پاس آگیا اور اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

''نوری! ادھر کوئی بھی نہیں۔ تم بے دھڑک ہوکر میرے سوال کا جواب دو۔''

اس نے سوال کو دہرانے کی فرمائش نہیں کی اور چبھتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''تھانیدار صاحب! آپ کہیں نوید پر تو شک نہیں کررہے؟''

''شک کی ہمیں گھٹی دی جاتی ہے نوری۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پولیس ٹریننگ کے دوران میں ہر پولیس والے کو سکھایا جاتا ہے کہ کس طرح ہر شے کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھ کر تفتیش کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی مبرّا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ہمیں اپنے گھر والوں ماں باپ، بہن بھائی اور بچوں، بیوی پر بھی شک کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ ہم بعض انتہائی نازک اور سنگین حالات میں اپنی ذات کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تو...''

میں لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو... میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی ہمیشہ شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ تمہارے خاوند کا قتل بڑے پُراسرار انداز میں ہوا ہے۔ اس کے قاتل تک پہنچنے کے لیے مجھے ہر اس شخص پر شک کرنا ہے جو کسی نہ کسی زاویے سے اس سے تعلق رکھتا ہے۔ انہی افراد میں ملک نوید بھی شامل ہے اور تم بھی...!''

''مم... میں...؟'' وہ بوکھلا گئی پھر خوف زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''میں کیوں ملک صاحب کو... قتل... کروں گی...!''

''میں نے کہا ہے نا، تم اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔'' میں نے نوری کی کیفیت کے پیشِ نظر کہا۔ ''میں تمہیں یا ملک نوید کو تمہارے خاوند کا قاتل نہیں ٹھہرا رہا... یہ تو ''شک'' کی تفصیل تھی۔ ہم اپنی تفتیش کے دوران میں معمولی سے معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ اسی طرح ہم اصل مجرم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں...'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم یا ملک نوید اس معاملے میں ملوث نہیں تو تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو اپنا فرض پورا کررہا ہوں۔''

''اوہ...!'' اس نے ایک تسلی بھری سانس خارج کی اور مطمئن انداز میں بولی۔ ''تھانیدار صاحب! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...''

''تمہارے ہاتھ صاف ہیں تو پھر ڈر کیسا؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تم ملک نوید کے حوالے سے میرے سوال کا جواب بھی دے دو۔''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''میرے خیال میں... نوید اس قسم کی حرکت نہیں... کرسکتا جناب!''

''ٹھیک ہے نوری!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا جواب مجھ تک پہنچ گیا۔ دراصل یہ سوال ایک خاص واقعے کی وجہ سے بھی میرے ذہن میں آیا تھا۔ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے، چھوٹے بھائی نے، اپنے بڑے بھائی کو دولت کے حصول کی خاطر قتل کرکے ایک برساتی گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ بعدازاں، میں نے اصل قاتل کو گرفتار کرلیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ بڑا بھائی بھی اپنے کسی دوست سے بھاری رقم لے کر گھر آرہا تھا اور چھوٹے بھائی نے اپنے دوستوں کی مدد سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا البتہ، اس شخص کا زخمی گھوڑا کسی طرح گرتے پڑتے اپنے گھر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا جبکہ تمہارے خاوند کے ساتھ اس کے گھوڑے کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میں نے جس گھائل گھوڑے کا ذکر کیا ہے نا، اسی گھوڑے کی مدد سے میں نے قاتل کا سراغ لگایا تھا۔ ملتے جلتے حالات کے پیشِ نظر وہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہوگیا۔''

نوری نے ایک جھرجھری لی اور نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''یہ دنیا کیسے کیسے ظالم لوگوں سے بھری ہوئی ہے...!''

میں نے اوپر جس زخمی گھوڑے والے واقعے کا بیان کیا ہے اس کی کہانی کچھ عرصہ پہلے میں سسپنس ڈائجسٹ کے انہی صفحات میں پیش کرچکا ہوں۔ اچھی یادداشت رکھنے والے قارئین نے اس کہانی کو فراموش نہیں کیا ہوگا۔ واقعات وحالات کی مشابہت کے سبب میں ملک نوید کو شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور تھا اور نوری کی وضاحت کے باوجود بھی میرا شک رفع نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں ملک نوید اور اس کی حرکات وسکنات کی خفیہ نگرانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرواؤں گا کیونکہ میرے احساس کے مطابق، وہ شخص بند دروازے کے پیچھے چھپ کر میری اور نوری کی باتیں سنتے ہوئے بھی پایا گیا تھا۔ وہ میرے احساس کا دھوکا نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ملک نوید دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے نور جہاں عرف نوری سے پوچھا۔ ''نوری! کیا تمہارا میکا ادھر کوٹلا معراج ہی میں ہے؟''

''نہیں جناب...!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں چک چانن کی رہنے والی ہوں۔''

چک چانن، کوٹلا معراج سے کم و بیش دس میل دور مشرقی سمت میں واقع تھا۔ ''چانن'' کے معنی ہیں ''چاندنی''... میں نے نوری سے پوچھا۔

''یہاں حویلی میں تمہارے، ملک نوید اور چند ملازموں کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا۔ کیا اس اندوہناک واقعے کی اطلاع چک چانن والوں کو دے دی گئی ہے؟''

''جی تھانیدار صاحب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ملک نوید نے ایک بندے کو ادھر چک چانن بھیجا ہے۔ دوپہر کے بعد ان لوگوں کے آنے کی امید ہے۔''

''ٹھیک ہے...'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر تسلی بھرے انداز میں نوری سے کہا۔ ''تم اپنے حوصلے کو گرنے نہیں دو اور اس واقعے کے سلسلے میں کوئی بھی چھوٹی بڑی بات پتا چلے، فوراً مجھے بتانا۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد از جلد تمہارے خاوند کے قاتل یا قاتلوں کو گرفتار کر لوں۔''

وہ منت ریز لہجے میں مستفسر ہوئی۔ ''آپ نے ملک صاحب کی لاش کو اسپتال بھجوا دیا ہے۔ میں ان کے کفن دفن کا بندوبست کیسے...!''

''فکر نہ کرو نوری۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''وحید کی لاش انشاء اللہ! کل کسی وقت اسپتال سے واپس آ جائے گی۔ اس کے بعد میں تمہیں اطلاع بھجواؤں گا اور ضروری قانونی کارروائی کے بعد لاش تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔''

''کیا یہ پوسٹ مارٹم بہت ضروری تھا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔ ''کیا تمہیں ملک وحید کے پوسٹ مارٹم پر کوئی اعتراض ہے؟''

''نن... نہیں...'' اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ''میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ خوامخواہ لاش کی چیر پھاڑ سے مردے کی بے حرمتی ہوگی...!''

''ایک بات ذہن میں بٹھا لو نوری۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی صورت میں ہونے والی چیر پھاڑ خوامخواہ نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد ہی کیس کی بہت ساری گتھیوں کو سلجھاتا ہے لہٰذا ایسا سوچنا بالکل غلط ہے کہ پوسٹ مارٹم سے کسی مردے کی بے حرمتی ہوگی۔ لاش کا احترام اپنی جگہ لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے اور مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کی خاطر اس نوعیت کا اقدام اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔''

وہ میری وضاحت کے جواب میں کچھ نہیں بولی، اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔ میں بالائی منزل والی بیٹھک سے باہر نکل آیا۔

باہر قدم رکھتے ہی ملک نوید سے سامنا ہو گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر قدرے بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''مم... میں ادھر ہی... آ رہا تھا...''

''ہاں... وہ تو لگ رہا ہے ملک نوید!'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

یہ بات طے تھی کہ وہ دروازے کے آس پاس ہی موجود تھا۔ اس کی تشویش مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بہرحال، میں نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کی اس حرکت کے حوالے سے محتاط ہو چکا ہوں۔

میں اس کی معیت میں دوبارہ حویلی کی زیریں منزل پر آ گیا۔ جب میں نے رخصت کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! بھابی صاحبہ سے کیا بات ہوئی ہے؟''

''کوئی ایک بات ہوئی ہو تو بتاؤں۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''بھئی، ڈھیروں باتیں ہوئی ہیں اور سب سے خاص بات نوری نے تمہارے متعلق بتائی ہے!''

آخری جملہ میں نے دانستہ اس کے چہرے پر نگاہ جما کر چبھتے ہوئے انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ اس طرح اچھلا جیسے اس کے پہلو میں کوئی بچھو نکل آیا ہو لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا اور قدرے مضبوط لہجے میں مستفسر ہوا۔

''کیا کہا ہے... بھابی صاحبہ نے؟''

''نوری کا خیال ہے...!'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ تمہارا، ملک وحید کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں۔''

''اوہ...!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر اطمینان کی جھلک دیکھ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ''تم تو خواہ مخواہ ہی ڈر گئے تھے حالانکہ تمہاری بھابی کو تو تمہارا بڑا خیال ہے...!''

''وہ جناب...!'' اس نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''صورتِ حال ایسی ہے نا کہ ذرا ذرا سی بات پر چونکنا پڑتا ہے... پھر آپ کا انداز بھی تو ڈرانے والا تھا...!''

''پولیس والوں کا انداز تو ایسا ہی ہوتا ہے ملک نوید!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے، آج سے پہلے تمہارا ابھی اس محکمے سے واسطہ نہیں پڑا؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے جناب!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔''

میں نے اس کے اطمینان کے لیے کہہ دیا۔ ''جبھی تم اس قدر بوکھلائے ہوئے ہو۔ بہرحال، پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اس قسم کے حالات سے نمٹنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہوں۔ اپنے بھائی کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں چلتا ہوں ملک نوید۔ مجھے چودھری سراج کو چیک کرنا ہے اور ادھر قلعہ فرمان علی میں مہر سلیم سے ملاقات کے لیے بھی جانا ہے۔ جو بھی صورتِ حال ہوگی میں تمہیں اس سے آگاہ کروں گا اور تم بھی...!'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے علم میں بھی کوئی بات آئے تو تم فوراً مجھے بتانا تاکہ تمہارے بھائی کے قاتل یا قاتلوں کو جلد از جلد قانون کی گرفت میں لایا جا سکے۔''

ملک نوید نے مجھ سے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا اور میں اس کی حویلی سے نکل کر تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں اپنے کمرے میں موجود تھا۔

سب سے پہلے میں نے کانسٹیبل اشتیاق کو اپنے پاس بلالیا۔ اشتیاق ایک قابلِ بھروسا پولیس اہلکار تھا۔ میں نے اسے ملک نوید کی نگرانی پر مامور کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ سادہ لباس میں رہتے ہوئے بڑی خوش اسلوبی سے یہ کام سرانجام دے سکتا تھا۔ وہ قابلِ اعتماد ہونے کے ساتھ ہی ذہین، چاق چوبند اور ہوشیار قسم کا بندہ تھا۔ میں نے ضروری ہدایات اور نصیحت کے بعد اسے ملک نوید کی جانب روانہ کر دیا۔ ظاہر ہے، وہ حویلی کے اندر داخل ہو کر کوئی سرگرمی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اسے باہر رہتے ہوئے ملک نوید اور اس کے معاملات پر نگاہ رکھنا تھی۔ مجھے امید تھی، وہ یہ کام کر گزرے گا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے قلعہ فرمان علی کی طرف جانے کا پروگرام ترتیب دیا۔ چودھری سراج اسی گاؤں میں رہتا تھا لہٰذا اس سے ملاقات کسی بھی وقت کی جا سکتی تھی۔ مہر سلیم سے ملنا پہلی فرصت میں ضروری تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے مجھے بڑی اہم معلومات حاصل ہوں گی۔

کوٹلا معراج کے جس تھانے کا میں انچارج تھا وہاں عملے کی شدید کمی تھی۔ میرے علاوہ حوالدار خوش بخت اور چند سپاہی تھے۔ بس انہی لوگوں سے کام چلایا جا رہا تھا اور مستقبل قریب میں نفری بڑھنے کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے کانسٹیبل یعقوب کو اپنے ساتھ لیا اور قلعہ فرمان علی کی جانب روانہ ہوگیا۔

ملک وحید کے قتل کے سلسلے میں اب تک میں نے جو تفتیش اور تحقیق کی تھی اس نے میرے ذہن کو ایک خاص انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ انداز یہ تھا کہ قتل کی یہ واردات محض لوٹ مار کا واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے کوئی خاص الخاص دشمنی کارفرما تھی۔ قاتل، ملک وحید سے شدید نفرت کرتا تھا۔ اگر یہ محض راہ زنی کی واردات ہوتی تو لٹیروں کو رقم لوٹنے کے بعد نو دو گیارہ ہو جانا چاہیے تھا یا اگر پہچان لیے جانے کا امکان نظر آتا تو وہ زیادہ سے زیادہ ملک وحید کو ختم کر دیتے، اس کے گھتی گھوڑے کو ایسی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوئی منطق یا تک نظر نہیں آتی تھی۔ ایک بے زبان جانور کو اس کے مالک کے ساتھ بہیمانہ انداز میں قتل کرنا یہی ظاہر کرتا تھا کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دل و دماغ میں بے پناہ غصہ اور نفرت پالے بیٹھا تھا اور مجھے... اسی شخص کو تلاش کرنا تھا!

موقع کی کارروائی کے دوران میں مقتول کی جامہ تلاشی کے نتیجے میں یا جائے وقوعہ کے جائزے سے پانچ ہزار کی رقم نہیں مل سکی تھی چنانچہ رقم کے حوالے سے فی الحال یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر مقتول گزشتہ رات مہر سلیم سے وہ رقم لے کر آیا تھا تو پھر اس واردات کا ذمے دار وہ رقم لے اڑا تھا۔ اس بات کی تصدیق صرف مہر سلیم ہی کر سکتا تھا کہ مقتول ایک ٹنگڑی رقم کے ساتھ قلعہ فرمان علی سے روانہ ہوا تھا یا رقم کے بغیر...!

اسی سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ غور تھی۔ ملک وحید کی کٹی پھٹی لاش جس کھیت میں پڑی ملی تھی وہ کوٹلا معراج کی حدود میں تھا بلکہ گاؤں کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ راہ زن اور ڈاکو عموماً ویران علاقوں میں واردات کرنا پسند کرتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوران کی مذموم سرگرمیوں کے مراکز بھی ایسی ہی جگہیں ہوتی ہیں۔ اس صورت میں یہ واردات قلعہ فرمان علی اور کوٹلا معراج کے درمیان کہیں وقوع پذیر ہونا چاہیے تھی جبکہ کوٹلا معراج کے قریب لاش ملنے کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ڈاکوؤں کا عمومی کارنامہ نہیں بلکہ یہ کوئی اور ہی پراسرار قصہ ہے۔ پتا نہیں کیوں، میرا ذہن راہ زنی والی تھیوری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

قلعہ فرمان علی میرے تھانے سے لگ بھگ تین میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔ ہم دونوں گھوڑوں کی پشت پر سوار ہوکر تقریباً پونے گھنٹے کے سفر کے بعد دو بجے دوپہر مہر سلیم کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔

مہر سلیم، قلعہ فرمان علی کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھا لہٰذا اس تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ وہاں کا ایک معروف اور سب سے زیادہ طاقتور زمیندار تھا۔ اس کی حیثیت گاؤں کے چودھری ایسی تھی۔ ہماری آمد کی اطلاع پاکر اس نے فوراً ہمیں اپنے دولت خانے کی سجی سجائی بیٹھک میں بلالیا۔ ہم ایک ملازم صورت شخص کی راہ نمائی میں مذکورہ مقام پر جابیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مہر سلیم بہ نفس نفیس بیٹھک میں موجود تھا۔

مہر سلیم کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک قدآور شخص تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ صحت مند سے ایک درجہ اوپر تن وتوش کا مالک تھا۔ سر کے بال چھوٹے اور مونچھیں بھاری بھرکم رکھی ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ باوقار اور پُراثر شخصیت کا حامل تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے خاصے دوستانہ انداز میں کہا۔

''ملک صاحب! اگر آپ دس منٹ بعد یہاں پہنچتے تو شاید پھر ہماری ملاقات نہ ہوتی۔ میں بس گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔''

''کہاں جانے کا ارادہ تھا مہر صاحب؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے آپ ہی کے علاقے یعنی کوٹلا معراج جانا تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے بالکل انجان بنتے ہوئے کہا۔

''خیریت تو ہے نا مہر صاحب! آپ کوٹلا معراج کس سلسلے میں جانا چاہتے تھے؟''

اس نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو آپ ملک وحید کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟''

''آپ بالکل غلطی نہیں کررہے مہر صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بھی اندازہ ہورہا ہے کہ کوٹلا معراج میں پیش آنے والے واقعے کی آپ کو خبر ہوگئی ہے۔''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''کوئی دو گھنٹے پہلے کوٹلا معراج سے ایک بندہ یہاں پہنچا ہے۔ اسی سے پتا چلا ہے کہ وہاں یہ اندوہناک واقعہ پیش آگیا ہے۔''

میں نے اسے مختصر الفاظ میں اپنی کارروائی کے بارے میں بتایا اور کیس کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مہر صاحب! میں نے اب تک جو پوچھ گچھ کی ہے اس کی روشنی میں آپ کی ذات بڑی اہم دکھائی دے رہی ہے۔ میں اسی لیے چند سوالات کرنے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ بتائیں، یہیں بیٹھ کر بات کی جائے یا واپسی کے راستے میں...؟''

''ہم اس وقت گھر میں بیٹھے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرے خیال میں مناسب ہوگا کہ یہیں بیٹھ کر بات کرلیں۔ ویسے بھی آپ ملک وحید کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوا چکے ہیں...''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر مختصر سی تمہید کے بعد اس سے پوچھا۔ ''مقتول وحید کل کتنے بجے آپ کے پاس سے رخصت ہوا تھا؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔''

''اور وہ جس کام سے یہاں آیا تھا وہ تو ہوگیا تھا نا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کام...؟'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے کہا۔ ''مقتول کی بیوی نوری نے مجھے بتادیا ہے کہ مقتول ملک وحید آپ سے ایک بھاری رقم لینے آیا تھا... اس نے رقم کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔''

''جی ہاں'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''وحید کو میں نے پانچ ہزار روپے دے دیے تھے۔''

''مہر صاحب! آپ ماشاءاللہ! سیانے آدمی ہیں اور وحید بھی سمجھ دار شخص تھا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر بھی آپ نے اسے اتنی بھاری رقم کے ساتھ رات کے اندھیرے میں سفر کرنے دیا...؟''

''میں اس بات کے حق میں نہیں تھا۔'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن وحید نے بات ہی ایسی کی کہ میں اسے روک نہ سکا۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ایسی کون سی بات کر دی تھی؟''

اس سے پہلے کہ مہر سلیم میرے سوال کا جواب دیتا، وہ ملازم بیٹھک میں داخل ہوا جس کی معیت میں ہم دونوں اس گھر کے اندر پہنچے تھے۔ مذکورہ ملازم نے اپنے ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جو کسی کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ ٹرے ہماری خاطر مدارات کے لیے تھی اور اس کے لیے یقیناً مہر سلیم نے ہمارے پاس آنے سے پہلے اپنے ملازم کو حکم دے دیا تھا۔

مذکورہ ملازم نے وہ ٹرے ہمارے سامنے ایک میز پر سجادی پھر مہر سلیم کے اشارے پر وہ بیٹھک سے نکل گیا۔ میزبان نے ٹرے کے اوپر سے کپڑا ہٹا دیا تو پتا چلا کہ ہماری تواضع کے لیے آم اور لچی سی پیش کی گئی تھی۔ میں نے مہر سلیم کے ہاتھوں کو مصروف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی مہر صاحب! ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دوپہر کا کھانا کھا کر تھانے سے نکلے تھے۔''

''یہ کھانا نہیں ہے ملک صاحب، بس تھوڑا شغل میلہ ہے۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کچھ کھائے پیے بغیر ہی آپ رخصت ہو جائیں۔''

اس کے بے حد اصرار پر ہم اپنے ہاتھوں کو ''حرکت'' میں لے آئے۔

میں نے یاددہانی کرانے والے انداز میں کہا۔

''مہر صاحب! آپ مقتول وحید کے حوالے سے مجھے کوئی اہم بات بتانے والے تھے!''

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میری تو کوشش یہی تھی جناب کہ شام سے پہلے پہلے ملک وحید کو کوٹلا معراج روانہ کر دوں لیکن رقم کا بندوبست کرنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے وحید سے کہا کہ وہ رات کو میرے پاس ہی رک جائے اور اگلی صبح یعنی آج گھر چلا جائے لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اور کہا کہ نوری نے آج ہی واپس آنے کو کہا ہے۔ وحید اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے... بلکہ تھا... جس سے انسان کو محبت ہو اس کی بات بھی ماننا پڑتی ہے۔ میں نے اکثر معاملات میں دیکھا تھا کہ وحید، نوری کی طرف داری کرتا تھا لہٰذا جب اس نے نوری کے حوالے سے رات ہی کو واپس جانے کی ضد کی تو میں رکنے کے لیے اصرار نہ کر سکا اور احتیاط کی تلقین کرتے ہوئے اسے روانہ کر دیا۔''

مہر سلیم کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ واضح الفاظ میں بتا رہا تھا کہ نوری کی فرمائش پر وحید رات کے اندھیرے میں واپسی کا سفر کرنے کا خواہاں تھا جب کہ نوری نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس نے تو مجھے بتایا تھا کہ وحید جاتے وقت اس سے کہہ کر گیا تھا کہ یا تو وہ اندھیرا چھانے سے پہلے گھر آ جائے گا اور یا پھر اگلی صبح ہی واپس آئے گا۔ ان حقائق کو حالات و واقعات کے تناظر میں اگر دیکھا جاتا تو مقتول وحید اور اس کی بیوہ نوری میں سے کسی ایک نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ مطلب یہ کہ یا تو مقتول نے مہر سلیم سے، نوری کی فرمائش کے حوالے سے جھوٹ بولا تھا اور یا پھر نوری نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ وحید تو اب سوال و جواب کے دائرے میں سے نکل کر بہت دور جا چکا تھا البتہ، میں واپس کوٹلا معراج پہنچ کر اس سلسلے میں نوری سے ضرور استفسار کر سکتا تھا۔

''ملک صاحب! ہاتھ بھی چلاتے جائیں۔ آپ پتا نہیں، کن خیالوں میں گم ہو گئے ہیں۔'' مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر مہر سلیم نے بہ آواز بلند کہا۔

میں نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''مہر صاحب! ملک وحید آپ کا بڑا گہرا دوست تھا۔ وہ گزشتہ رات ہی کو اگر واپسی کے لیے بہ ضد تھا تو کم از کم حفاظت کے خیال سے آپ اس کے ساتھ اپنے کسی بندے ہی کو بھیج دیتے!''

''میں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن ملک وحید نے میری تجویز بلکہ میری پیشکش سے اتفاق نہیں کیا۔ کاش! وہ میری بات مان لیتا تو شاید یہ افسوس ناک واقعہ پیش نہ آتا!''

بات ختم کر کے وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ ظاہر ہے، ایک دوست کو دوست کی المناک موت پر اسی طرح دکھی اور رنجیدہ ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''مہر صاحب! میری، آپ سے پہلے نوری اور ملک نوید سے بھی خاصی تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ نوری نے مقتول کی واپسی کے حوالے سے جو کچھ کہا وہ آپ کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کا کہنا ہے کہ وحید نے اس سے کہا تھا، یا تو وہ دن کی روشنی میں واپس آ جائے گا اور یا پھر رات کو قلعہ فرمان علی ہی میں ٹھہر جائے گا۔''

''ممکن ہے...!'' وہ اپنی سوچ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نوری اپنی ضد اور فرمائش والی بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پ سے چھپانا چاہتی ہو اس لیے اس نے ملک وحید ہی کے
والے سے سب کچھ کہا ہے۔''

''ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں اس
تائید کرتے ہوئے کہا۔

میں نے مہر سلیم کی تسلی کی خاطر یہ جملہ کہہ تو دیا تھا لیکن
ی بات نہیں تھی کہ میں بھی مطمئن ہوگیا ہوں۔ میں نے
اسب موقع دیکھتے ہی اس سلسلے میں نوری سے ضرور استفسار
رنا تھا۔ فی الحال تو مہر سلیم کا انٹرویو ہو رہا تھا لہٰذا میں نے
ں سے پوچھا۔

''مہر صاحب! یہ راز یہاں قلعہ فرمان علی میں اور کس
س کو معلوم تھا کہ مقتول اپنے ساتھ پانچ ہزار روپے کی رقم
لے کر کوٹلا معراج جا رہا ہے؟''

''میں آپ کے سوال کا مقصد سمجھ رہا ہوں ملک
احب...!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''سمجھ رہے ہیں تو پھر وضاحت بھی کردیں؟'' میں نے کہا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''قلعہ
مان علی میں یہ بات صرف مجھے معلوم تھی کہ ملک وحید مجھ
ے کوئی بھاری رقم لے کر گیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے
مر والوں یا گاؤں کے کسی اور بندے کو مطلق خبر نہیں لہٰذا...''

لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لہٰذا اس امر کے امکانات کو یک سر نظر انداز کرنا ہوگا
ہ یہاں سے کوئی بندہ ملک وحید کے تعاقب میں گیا ہو اور
ں نے رقم کے حصول کی خاطر اسے قتل کردیا ہو۔ ویسے
ں...'' وہ ایک مرتبہ پھر تھما اور لمحے بھر کے توقف کے بعد
بارہ گویا ہوا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوئی ہوتی تو متعاقب
س کوٹلا معراج کی حدود شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے
ہو بے پر عمل کر ڈالتا جبکہ میری معلومات کے مطابق اور
پ نے بھی بتایا ہے کہ ملک وحید کی لاش جس کھیت سے ملی
ہ، وہ گاؤں کے بہت قریب ہے۔ میرے خیال میں تو ملک
ید کو محض رقم کے حصول کے لیے قتل نہیں کیا گیا۔ یہ الگ
ت کہ وہ بگڑی رقم بونس کے طور پر قاتل کے ہاتھ لگ گئی
ل۔''

''میں آپ کے خیال سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں
صاحب!''

''جی...!'' وہ الجھن زدہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا
تک کا تجزیہ بھی یہی بتاتا ہے کہ ملک وحید کا قتل کسی راہزن
برے کا کارنامہ نہیں کیونکہ اس مزاج کے ڈاکو اور لٹیرے
جانوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ ملک مقتول کے کشتنی گھوڑے
کو جس بے دردی سے گھائل کر کے موت سے ہم کنار کیا گیا
ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ حملہ آور ملک وحید اور اس کی
ہر شے سے شدید نفرت کرتا تھا...''

''ایسا شخص کون ہوسکتا ہے؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے
نکلا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس
سلسلے میں آپ میری رہنمائی کریں گے مہر صاحب!''

''میں...!'' وہ انگلی سے اپنے سینے کی جانب اشارہ
کرتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں جناب! بتائیں، میں
کس طرح آپ کی رہنمائی کرسکتا ہوں؟''

میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے بتایا۔
''مہر صاحب! میری اب تک کی تحقیق کے مطابق آپ مقتول
کے سب سے زیادہ قریبی ساتھی ثابت ہو رہے ہیں۔ آپ
دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ اپنے دل کی ہر بات،
اپنی زندگی کا ہر مسئلہ آپ کو ضرور بتاتا تھا لہٰذا یہ بات آپ سے
زیادہ بہتر اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ مقتول کے مخالفین میں ایسا
شخص کون ہوسکتا ہے جو اس خونیں واردات کا ذمے دار ٹھہرایا
جانا چاہیے۔ مجھے اس سلسلے میں آپ کے تعاون، مدد اور
رہنمائی کی اشد ضرورت ہے تاکہ میں جلد از جلد مقتول وحید
کے قاتل یا قاتلوں کو جیل کی دیواروں کے پیچھے پہنچا سکوں۔
آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی...!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑے
محتاط لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ نے اس سلسلے میں... اور
خاص طور پر اس زاویے سے نوری یا نوید سے بات کی ہے؟''

''ہاں کی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
جواب دیا۔ ''انہوں نے کوئی واضح اشارہ تو نہیں دیا لیکن وہ
اس بات پر متفق نظر آرہے ہیں کہ چودھری سراج کے سوا
مقتول کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ زمین کی خرید و فروخت کے
حوالے سے شاید ان دونوں کے بیچ کوئی تنازع چل رہا تھا۔''

''میں اس تنازع کی حقیقت سے واقف ہوں ملک
صاحب!'' مہر سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مقتول اکثر
وبیشتر مجھے اس بارے میں بتا تا رہتا تھا۔ چودھری سراج اور
اس کے درمیان ہونے والی تازہ ترین بدمزگی کا قصہ بھی کل
وحید نے مجھے سنایا تھا۔''

''تو آپ کے خیال میں، ملک وحید کو پیش آنے والے
اندوہناک واقعے کے حوالے سے چودھری سراج کو شاملِ
تفتیش کیا جاسکتا ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بالکل... آپ کو ایسا ضرور کرنا چاہیے ملک صاحب!'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''چودھری سراج ایک کینہ پرور اور منتقم مزاج شخص ہے۔ اس سے کسی بھی اوچھی حرکت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ وہ کافی عرصے سے ملک وحید کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ اپنی اسّی ایکڑ اراضی اس کے ہاتھ فروخت کردے۔ زمین کی خرید و فروخت بھلا کوئی زبردستی کا سودا ہے۔ کل مجھے وحید نے بتایا تھا کہ چودھری سراج نے بڑے کھلے الفاظ میں اس سے کہا تھا کہ اگر اس نے چودھری کی پیشکش کو قبول نہ کیا تو خطرناک نتائج کا ذمے دار وہ خود ہوگا!''

''ہوں...!'' مہر سلیم کی وضاحت کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں مہر سلیم سے مزید چند باتیں ہوئیں پھر میں اور کانسٹیبل یعقوب اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر واپس تھانے آگئے۔ مہر سلیم نے شروع میں ہمارے ساتھ ہی کوٹلا معراج آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن پھر اس نے اپنا پروگرام تبدیل کردیا۔ اس نے مجھ سے یہ کہا تھا۔

''ملک صاحب! آپ جائیں، میں بعد میں ادھر چکر لگالوں گا۔ ویسے آپ کی زبانی بہت ساری معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ ملک وحید کی لاش کل ہی اسپتال سے واپس آئے گی۔ ہوسکتا ہے، میں بھی کل ہی وہاں جاؤں۔''

''آپ جب بھی آئیں۔'' میں نے وقتِ رخصت اس سے کہا۔ ''مجھ سے ملاقات کے لیے تھانے کا ایک چکر ضرور لگائیں۔''

اس نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

اگلی صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا اور اپنے کوارٹر سے نکل آیا۔ میری منزل تھانے والا کمرا نہیں، بلکہ چودھری سراج کی حویلی تھی اور اس وقت میں سادہ لباس میں تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ تھانے داری کا وقت شروع ہونے سے پہلے ہی میں کوٹلا معراج کے چودھری سے ملاقات کرلوں تاکہ کیس کا سب سے اہم مشتبہ پہلو میری نگاہ میں پوری طرح اجاگر ہوجائے۔

جب چودھری سراج کو میری آمد کی اطلاع دی گئی تو اس نے فوراً مجھے اپنے پاس بلالیا۔ چودھری کا ایک خاص ملازم مجھے اس کے کمرے میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت محسوس نہ ہوئی کہ چودھری میرے وہاں پہنچنے سے قبل ناشتے سے انصاف کررہا تھا۔ ناشتے کے برتن وغیرہ ابھی تک کمرے میں موجود تھے۔

چودھری سراج کی عمر ستر سے متجاوز تھی اور اس کی صحت بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ دوستانہ انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! آپ کی آمد سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ میں ابھی ناشتے سے فارغ ہوا ہوں۔ آپ کی خاطر تواضع کا میں بندوبست کرتا ہوں۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں چودھری صاحب!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بڑا تگڑا ناشتا کرکے نکلا ہوں۔ بس تھوڑی دیر آپ کے پاس بیٹھوں گا پھر تھانے چلا جاؤں گا اس لیے آپ کسی قسم کا تکلف نہ کریں۔''

''ناشتا آپ نے کرلیا ہے، چلو کوئی بات نہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن چائے یا لسی تو پی جاسکتی ہے۔ میں تو کل ہی آپ کی آمد کی توقع کررہا تھا۔ اگر میری صحت اجازت دیتی تو میں خود آپ سے ملنے تھانے چلا آتا۔''

میں نے چائے کے حق میں ووٹ دینے کے بعد کہا۔

''آپ میرے پاس آئیں یا میں آپ کے پاس، ایک ہی بات ہے چودھری صاحب۔ میں کل قلعہ فرمان علی چلا گیا تھا۔ واپسی میں دیر ہوگئی اس لیے رات گئے آپ کو زحمت دینا مناسب نہ سمجھا۔''

اس نے پُرسوچ انداز میں گردن کو دو تین ہلکے پھلکے جھٹکے دیے پھر گمبھیر آواز میں گویا ہوا۔ ''ملک وحید کا پُراسرار قتل بہت ہی افسوس ناک واقعہ ہے ملک صاحب... کیا آپ نے قاتل کے سلسلے میں کوئی مفید تحقیق کی ہے؟''

''قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ انتہائی شقی القلب اور سفاک شخص ہے چودھری صاحب!'' میں نے چودھری سراج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ملک وحید سے تو اس کی جو بھی دشمنی رہی ہوگی مگر اس نے وحید کے کتھئی گھوڑے کو جس تشدد اور بربریت کا نشانہ بنانے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا ہے اس سے اس کی سفاکی اور درندگی کو سمجھا جاسکتا ہے۔''

''آپ بالکل صحیح فرمارہے ہیں ملک صاحب!'' چودھری سراج نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی بیماری کے باعث وقوعہ پر تو نہیں جاسکا البتہ میرے آدمیوں نے مجھے وہاں کی تفصیلات سے آگاہ کردیا ہے۔ سچ مانیں تو کل ہی سے میرا دل بجھا ہوا ہے۔ مجھے ملک وحید کی المناک موت کا بڑا دکھ ہوا ہے۔''

اگر چودھری سراج ان لمحات میں اداکاری کررہا تھا تو اس اداکاری کو انتہائی لاجواب کہنا پڑے گا کیونکہ اس کے جسم و جاں سے ملک وحید کے لیے ہمدردی، افسوس اور گہرا رنج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! میں نے جائے وقوعہ کا بڑی اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔ مقتول کی بیوی، چھوٹے بھائی ملک نوید سمیت اور بھی بہت سارے لوگوں کے بیانات قلم بند کیے ہیں حتیٰ کہ جب مجھے پتا چلا کہ مقتول قلعہ فرمان علی اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا تو میں نے وہاں جا کر مہر سلیم سے بھی ملاقات کی ہے مگر قاتل کے سراغ کے حوالے سے ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہیں لگا۔ اب آپ کے پاس آیا ہوں تا کہ اس سلسلے میں آپ کی مدد لی جائے۔''

مہر سلیم کے ذکر پر چودھری سراج نے برا سا منہ بنایا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ مہر سلیم کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس نے معنی خیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''مہر سلیم، وحید کے قتل کے سلسلے میں کیا کہتا ہے؟''

''وہ بھی قاتل کی نشاندہی یا اس کے حوالے سے کوئی قیاس آرائی کرنے سے قاصر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس نے ایک اہم بات یہ بتائی ہے کہ ملک وحید کو اس روز اس نے پانچ ہزار روپے بھی دیے تھے لیکن مقتول کی جامہ تلاشی کے دوران میں مجھے کوئی رقم نہیں ملی۔''

''ہوں...!'' چودھری نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، میرا اندازہ درست تھا!''

''کیسا اندازہ چودھری صاحب؟'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

میرے اس سوال کے جواب میں چودھری نے جو کچھ بتایا اس کی روشنی میں مجھے بہت کچھ سمجھنے کی آسانی ہوگئی۔ خاص طور پر مقتول اور چودھری سراج کے مابین جاری کشمکش بڑی واضح ہوگئی۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! شاید یہ بات آپ کے علم میں نہ ہو کہ میرے اور مقتول وحید کے درمیان دو چار بار خاصی تلخ کلامی ہو چکی ہے، بلکہ چند روز پہلے تو اچھی خاصی جھڑپ بھی ہوگئی تھی!''

''جی ہاں، یہ واقعات میرے علم میں آ چکے ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس تنازع کا سبب مقتول کی اسّی ایکڑ اراضی رہی ہے؟''

آخری جملہ میں نے قدرے چبھتے ہوئے انداز میں ادا کیا تھا۔ وہ میرے زاویے کو نظر انداز نہ کر سکا اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

''سبب اگرچہ مقتول کی اراضی ہی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں اور آپ کی بات سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ اس فتنے کے پیچھے سراسر مہر سلیم کا ذہن کام کر رہا تھا!''

''میں کچھ سمجھا نہیں چودھری صاحب!'' میں نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''میں نے کس امر کی تصدیق کی ہے؟''

''یہی... کہ مقتول، مہر سلیم سے پانچ ہزار روپے لے کر آیا تھا!''

''لیکن...'' میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ ''ان پانچ ہزار روپے کا آپ لوگوں کے زمینی تنازع سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق ہے ملک صاحب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''ٹھہریں، میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں گہری دلچسپی اور توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''مقتول کی اراضی لگ بھگ اسّی ایکڑ ہے لیکن اس زمین کے بیس ایکڑ ایسے ہیں جو ایک طرف سے میری زمین کے ساتھ اور دوسری جانب سے مہر سلیم کی اراضی سے لگے ہوئے ہیں جبکہ میرے مہر سلیم کے ساتھ کبھی بھی دوستانہ تعلقات تو کیا محض اچھے تعلقات بھی نہیں رہے۔ ان حالات کی روشنی میں آپ مقتول کے مذکورہ بیس ایکڑ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں...!''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس لے کر تنفس کو درست کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کچھ عرصہ پہلے مجھے اپنے خفیہ ذرائع سے پتا چلا کہ مقتول وحید اپنی زمین کا وہ حصہ یعنی وہ بیس ایکڑ اراضی مہر سلیم کے ہاتھ فروخت کرنے والا ہے۔ اگر وہ ایسا کر بیٹھتا تو زمین کے ساتھ زمین لگ جانے سے میرے اور مہر سلیم کے درمیان ایک خطرناک جنگ کا آغاز ہو جاتا لہٰذا اسی روز سے میں نے مقتول کو زمین فروخت کرنے کی پیشکش کر دی۔ نہ صرف فتنہ پرور بیس ایکڑ بلکہ میں ملک وحید کی ساری زمین پورے اسّی ایکڑ خریدنے کو تیار تھا اور وہ بھی اس کے منہ مانگے داموں پر لیکن میری ہزار کوشش کے باوجود بھی یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی اور اس نے زمین مہر سلیم کے ہاتھ فروخت کر دی... مجھے یقین ہے، ایسا ہی ہوا ہے... اور وہ پانچ ہزار روپے اسی سلسلے کی کڑی ہیں...''

چودھری کی بات سے جہاں مختلف امور کی وضاحت ہوئی وہیں یہ سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی کہ اس نے پانچ ہزار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی رقم کو بڑی آسانی سے زمین کی فروخت کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔ اگر مقتول اور مہر سلیم کے درمیان واقعی زمین کی خرید و فروخت کا کوئی معاملہ ہوا تھا تو مہر سلیم مجھے اس بارے میں ضرور بتاتا یا نوری اور نوید کے منہ سے، اس حوالے سے کوئی بات نکل کر سامنے آتی۔ ان تینوں نے فرداً فرداً یہ تو کہا تھا کہ چودھری سراج زبردستی مقتول سے زمین خریدنا چاہتا ہے اور ان کا ایک مشترکہ خیال یہ بھی تھا کہ ملک وحید کے قتل میں چودھری سراج کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی جیسا کہ چودھری بتا رہا تھا۔ میں نے پوری توجہ سے اس کی وضاحت سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''چودھری صاحب! میری معلومات کے مطابق، مہر سلیم اور مقتول کے درمیان ایسی کوئی سودے بازی نہیں ہوئی اور نہ ہی پانچ ہزار روپے والی رقم کا اس سے کوئی تعلق ہے۔ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوا ہوتا تو مہر سلیم مجھے ضرور بتاتا۔''

''میں اسے آپ کی خوش فہمی کہوں گا ملک صاحب اور وہ بھی بڑی معذرت کے ساتھ۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ مہر سلیم کو نہیں جانتے... بڑا ہی کمینہ اور گہرا آدمی ہے۔ وہ آپ کو کبھی بھی اس بارے میں کچھ نہ بتاتا اور ملک وحید کے قتل کے بعد تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے تو شک ہے کہ...!''

وہ بولتے بولتے پُراسرار انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''چودھری صاحب! آپ کو کس بات کا شک ہے؟''

جواب دینے سے پہلے ایک لمحہ اس نے سوچا پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میرا تو دل یہ کہتا ہے کہ ہو نہ ہو، وحید کے قتل میں مہر سلیم کا ہاتھ ہے... وہ اوپر سے وحید کا دوست بنا ہوا تھا اور اسے میرے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے، موقع دیکھتے ہی اس شاطر شخص نے وحید کو لڑھکا دیا ہو۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ مہر سلیم نے واقعی وحید کو پانچ ہزار روپے دیے تھے؟''

''فی الحال، کوئی ٹھوس ثبوت تو نہیں ہے۔ میں مہر سلیم کی زبان پر یقین کرنے پر مجبور ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ یہ بات صرف مہر سلیم، مقتول اور اس کی بیوہ کے درمیان تھی۔ ویسے چودھری صاحب...'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ مہر سلیم نے ہی ملک وحید کو لڑھکایا ہوگا۔ وحید کی جان لینے سے بھلا اس کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟''

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا تھانیدار صاحب!'' وہ بڑے معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے، آگے چل کر یہ بات کھلے کہ ملک وحید نے قتل ہونے سے قبل اپنی ساری اراضی مہر سلیم کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔ وہ اس سلسلے میں دستاویزی ثبوت بھی منظرِ عام پر لا سکتا ہے۔ میں نے کہا ہے نا... آپ مہر سلیم کو نہیں جانتے۔ وہ بڑا چیتا چال باز قسم کا شخص ہے!''

''آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں چودھری صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آنے والا وقت ہی حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا سکتا ہے۔ ویسے مہر سلیم کے خیالات بھی آپ سے مختلف نہیں ہیں...!''

''کیا مطلب، ملک صاحب؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

''مطلب یہ چودھری صاحب کہ...'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''مہر سلیم کا خیال یہ ہے کہ ملک وحید کی موت میں آپ کا ہاتھ ہو سکتا ہے!''

''اگر ایسا ہوتا تو وحید کی لاش موضع کوٹلا معراج کی حدود میں نہ پڑی ملتی۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اتنے بے وقوفی کے کھیل نہیں کھیلتا جناب عالی... اور پھر ملک وحید سے میری ایسی کوئی دشمنی بھی نہیں تھی کہ نوبت قتل و غارت گری تک جا پہنچتی، سمجھے نا... میں اس کی زمین جس مقصد کی خاطر خریدنا چاہتا تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے اور حقیقت بھی وہی ہے۔ میری دعا ہے...'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ جلد از جلد ملک وحید کے قاتل تک پہنچ جائیں۔ اس سلسلے میں آپ مجھ سے جو بھی تعاون چاہیں گے، میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''بہت بہت شکریہ چودھری صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔ اس پیشکش کے لیے میں ایک مرتبہ پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اس ملاقات کے بعد، میں چودھری کی حویلی سے باہر نکل آیا۔

اب تک کی تحقیق اور تفتیش میں مہر نے چودھری پر اور چودھری نے مہر پر ملبا گرانے کی کوشش کی تھی۔ ویسے چودھری سراج کا یہ پوائنٹ خاصا جاندار تھا کہ اگر ملک وحید کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ ہوتا تو مقتول کی لاش اس کے گاؤں کی حدود سے باہر پڑی ملتی۔ دوسری جانب مہر سلیم کو شکوک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دشمنیات کے حوالے سے چودھری سراج پر اس لیے سبقت حاصل تھی کہ ملک نوید اور نوری بھی اس کے ہم خیال تھے۔ بہرحال، میری تفتیش کا دائرہ محدود نہیں تھا۔ مہر اور چودھری کے علاوہ ملک بھی میری نگاہ میں تھا یعنی... ملک نوید!

میں تھانے پہنچا پھر اپنے کوارٹر میں جا کر یونیفارم پہنا اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ وہ سیٹ جس پر بیٹھ کر میں تھانیداری کرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حوالدار خوش بخت میرے کمرے میں آ گیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا اور پریشان نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا اور تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا بات ہے خوش بخت! تم اتنے الجھے ہوئے اور حواس باختہ کیوں دکھائی دیتے ہو۔ کیا کتھئی گھوڑے کی زخم زخم لاش رات کو خواب میں آ کر تمہیں ڈراتی رہی ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے جناب!'' وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیسی بات ہے؟''

''میں دراصل آپ سے ایک بات کے لیے معذرت کرنے آیا ہوں۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''پتا نہیں، یہ بات میرے دماغ سے کیسے نکل گئی تھی۔ میں نے...''

''اللہ کے بندے، بجھارتیں ہی ڈالتے رہو گے یا وہ بات بھی بتاؤ گے؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''خوش بخت! آخر اس تمہید کی ضرورت کیا ہے...؟''

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ برآمد کیا پھر اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھیں جناب!''

میں نے دیکھا۔ وہ ایک طلائی زنجیر تھی جس میں دل کی شکل کا ایک تعویذ بھی موجود تھا۔ آپ اسے سونے کا لاکٹ سمجھ لیں۔ لاکٹ کے دل والے حصے میں انگریزی کا ''این'' بنا ہوا تھا۔ میں نے این والے مذکورہ لاکٹ کو ہاتھوں میں گھما پھرا کر دیکھا اور سوالیہ نظروں سے حوالدار کی جانب دیکھا۔

اس نے بتایا۔ ''ملک صاحب! یہ لاکٹ کل مجھے جائے وقوعہ سے ملا تھا، جب آپ مشیر نامہ تیار کر رہے تھے اور میں گھوم پھر کر اس مقام کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اس لاکٹ کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا لیکن آپ کو بتانا بھول گیا۔ موقع واردات کے منظر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا پھر آپ نے مجھے مقتول کی لاش کے ساتھ اسپتال بھیج دیا۔ اس افراتفری میں یہ لاکٹ بالکل میرے ذہن ہی سے نکل گیا اور جیب میں پڑا پڑا یہ میرے گھر پہنچ گیا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آج صبح جب میں وردی پہن رہا تھا تو جیب میں ہاتھ گیا اور یہ لاکٹ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں سیدھا تھانے پہنچا تاکہ آپ کو اس بارے میں بتا سکوں لیکن آپ یہاں موجود نہیں تھے۔ اب آئے ہیں تو آپ سے مل رہا ہوں۔''

''یہ لاکٹ کس کا ہو سکتا ہے۔'' حوالدار کی وضاحت ختم ہونے پر میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''این... یعنی نون سے کس کا نام آتا ہے...؟''

''نوید...'' حوالدار نے بے ساختہ کہا۔ ''ملک نوید...''

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے ابتدائی صفحات میں جس واقعے کا ذکر کیا ہے اس میں بھی ایک طلائی زنجیر نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا جب میں نے زخمی گھوڑے کی رہنمائی میں مقتول کی لاش ایک برساتی گڑھے میں سے برآمد کی تھی۔ طلائی زنجیر نے مجھے قاتل تک پہنچا دیا تھا جو کوئی اور نہیں بلکہ مقتول کا چھوٹا بھائی ہی تھا۔

ملک نوید بھی مقتول ملک وحید کا چھوٹا بھائی تھا۔ حوالدار نے جب ''این'' کی مناسبت سے اس کا نام لیا تو ماضی کا وہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔ اگر یہ لاکٹ ملک نوید ہی کا تھا تو پھر صورتِ حال بڑی سنسنی خیز ہو جاتی تھی۔ جائے وقوعہ سے اس لاکٹ کا ملنا ملک نوید کی ذات کو مشکوک بناتا تھا اور... اس کا شمار تو میں پہلے ہی مشکوک افراد میں کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد، میں کانسٹیبل یعقوب کے ہمراہ ملک نوید کی حویلی پہنچ گیا۔ اس نے سوگوارانہ انداز میں میرا استقبال کیا اور پوچھا۔ ''ملک صاحب کی لاش کب تک اسپتال سے واپس آئے گی۔ ہمیں ان کا کفن دفن کا بندوبست بھی کرنا ہے۔''

میں نے یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نوید! تمہارے بھائی کی لاش آج کسی بھی وقت تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔ تمہیں اس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اس کی تدفین کے انتظامات میں لگے رہو۔''

''ہوں...'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔ ''جناب! ملک صاحب کے قاتل کا کوئی سراغ ملا؟''

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ایک سراغ ملا تو ہے۔''

''کک... کیا؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے اپنی جیب میں سے وہ لاکٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔ ''ہمیں جائے وقوعہ سے یہ لاکٹ ملا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ کیا تم اس کی شناخت کر سکتے ہو؟''

''جناب! میں اس لاکٹ کو تو آنکھیں بند کر کے بھی شناخت کر سکتا ہوں۔'' وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''یہ جائے وقوعہ پر کیسے پہنچ گیا؟''

''یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''ویسے تمہارے جذباتی ردِعمل سے میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ یہ لاکٹ تمہارا ہی ہے۔ ''این''... نوید...؟''

''آپ کا اندازہ تو سو فیصد درست ہے تھانیدار صاحب!'' وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ یہ جائے وقوعہ پر کیسے پہنچ گیا...؟''

''یہ تمہاری ملکیت ہے تو اس کے بارے میں پتا بھی تمہیں ہی ہونا چاہیے۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم اسے اپنے گلے میں پہنے رہتے تھے؟''

''جی ہاں...'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن پچھلے چند دنوں سے یہ میرے پاس نہیں ہے۔ پتا نہیں، یہ کہاں گم ہوگیا تھا۔ میں اس کے کھوجانے پر خاصا پریشان رہا تھا۔''

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے گھورا اور کہا۔ ''یہ لاکٹ ہمیشہ تمہارے گلے میں موجود رہتا تھا اور اس کی ٹوٹی ہوئی زنجیر بتاتی ہے کہ کسی افراتفری کے نتیجے میں یہ تمہارے گلے سے نکل کر کہیں گر گیا تھا۔ مجھے یہ لاکٹ جائے وقوعہ سے ملا ہے جس کا مطلب یہ نکلتا ہے، میں نے ابھی جس ''افراتفری'' کا حوالہ دیا ہے وہ جائے وقوعہ پر ہوئی تھی... ہے نا؟''

میری مسلسل گھورتی ہوئی آنکھوں کی وہ ''تاب'' نہ لاسکا، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''جناب! میں پہلے ہی ملک صاحب کی ناگہانی موت پر پریشان ہوں... الٹا آپ خواہ مخواہ مجھ ہی پر شک کررہے ہیں...''

''میں تو خواہ مخواہ کچھ نہیں کرتا ہوں ملک نوید۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''یہ لاکٹ تمہارا ہے اور اس مقام پر پڑا ملا ہے جہاں تمہارے بھائی کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ میں اسی لیے تم سے پوچھ تاچھ کررہا ہوں... سمجھے نا!''

''اور جناب...!'' وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں نے آپ کو بتادیا ہے کہ یہ لاکٹ چند روز پہلے گم ہوگیا تھا۔ یہ جائے وقوعہ پر کیسے پہنچا، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''میں تو تمہاری بات کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوں ملک نوید لیکن لگتا ہے، میری بات تمہارے پلے نہیں پڑ رہی۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، تمہارے بھائی کے قتل کی تفتیش ابھی جاری ہے۔ مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا بھی انتظار ہے۔ تمہیں میں یہی مشورہ دوں گا کہ جب تک میں اس کیس کی تفتیش مکمل نہیں کرلیتا، تم گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالو گے!''

''گاؤں کیا... جناب! آپ کہیں تو میں حویلی سے باہر قدم نہیں نکالوں گا۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن خدا کے لیے آپ مجھ پر ایسا گھناؤنا شک نہ کریں۔''

''ملک نوید!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس کا کام شک کے بغیر چل نہیں سکتا۔ اگر ہم یہ کام نہ کریں تو سب لوگ ہمیں شریف شہری ہی نظر آئیں بلکہ چوروں اور بدمعاشوں نے تو کچھ زیادہ ہی شرافت اوڑھ رکھی ہے اور اسی لبادے کی آڑ میں وہ لوگ سنگین نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں ہمیں مجرموں کا کھوج لگانے کے لیے شک تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال... اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ بھی کررہا ہوں اسے معمول کی کارروائی ہی سمجھو۔''

آخری جملہ میں نے دانستہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا تھا اور مجھے اس جملے کے واضح اثرات بھی مرتب ہوتے دکھائی دیے۔ اسے مزید ہدایات دینے کے بعد میں حویلی سے نکل آیا۔

میں نے ایک کانسٹیبل اشتیاق کو ملک نوید کی نگرانی پر متعین کررکھا تھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے حویلی میں داخل ہوتے وقت اور وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے بھی چاروں جانب نظر دوڑا کر اشتیاق کو دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اشتیاق کی اس حرکت پر مجھے شدید غصہ آیا تھا اور میں نے سوچا تھا، وہ جیسے ہی ملے گا، میں اس کے کان ضرور کھینچوں گا۔

ہم تھانے پہنچے تو اشتیاق وہاں موجود تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔ میں اس کی ''حرکت'' پر خاصا برہم تھا لیکن جب اس نے اپنے غیاب کی سنسنی خیز تفصیلات بیان کیں تو میری ساری خفگی اور برہمی ڈھل گئی۔

اشتیاق کے مطابق، وہ میری ہدایات پر ملک نوید اور اس کی حویلی کی نگرانی کررہا تھا۔ آج علی الصباح اس نے ایک بندے کو مشکوک حالت میں، حویلی کے پچھواڑے منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک محفوظ آڑ میں کھڑے ہوکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا جائزہ لینے لگا۔ حویلی کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا اور وہ شخص اسی دروازے کے قریب ٹہل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مذکورہ دروازہ کھلا اور وہاں مقتول کی بیوہ نوری کی شکل دکھائی دی۔ اشتیاق کو حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ تو ملک نوید کے نمودار ہونے کی توقع کر رہا تھا کیونکہ میں نے اسے نوید کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔

اشتیاق آڑ میں رہتے ہوئے اس مشکوک بندے اور نوری کو دیکھتا رہا۔ ان دونوں کی ملاقات لمحاتی ثابت ہوئی۔ نوری نے چمڑے کا ایک بیگ اس بندے کو تھمایا اور حویلی کے اندر غائب ہوگئی۔ دروازہ بند ہوا اور وہ بندہ چمڑے کا بیگ لے کر ایک جانب بڑھ گیا۔

یہ ایسا منظر تھا کہ اشتیاق کے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ پہلے اس کے دماغ میں آیا کہ وہ فوراً اس واقعے کی مجھے اطلاع دے لیکن پھر اس کی سوچ بدل گئی۔ اس کے اندر سے آواز اٹھی کہ اگر وہ تھانے چلا گیا تو یہ بندہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تھانیدار صاحب کو بعد میں بھی رپورٹ کی جاسکتی ہے، پہلے اس پُراسرار بندے کا تعاقب کر کے یہ پتا چلانا چاہیے کہ وہ ہے کون، کہاں سے آیا ہے اور بیگ لے کر کہاں جارہا ہے!''

قصہ مختصر، اشتیاق بڑے محتاط انداز میں مذکورہ بندے کا تعاقب کرتے ہوئے قلعہ فرمان علی پہنچ گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ بندہ سیدھا وہاں کے چودھری کی حویلی کے اندر داخل ہوگیا تھا۔ اشتیاق تھوڑی دیر حویلی کے باہر رک کر اس بندے کا انتظار کرتا رہا۔ جب مذکورہ بندہ حویلی سے باہر نہیں نکلا تو اشتیاق واپس آگیا اور... اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا یہ روداد سنا رہا تھا۔

''چمڑے کے بیگ'' کا ذکر سن کر چودھری سراج کے الفاظ میری سماعت میں گونجنے لگے۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ آگے آگے دیکھیں، ہوتا ہے کیا... عین ممکن ہے، چند دنوں کے بعد یہ پتا چلے کہ ملک وحید اپنی موت سے قبل اسّی ایکڑ اراضی مہر سلیم کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔

کسی بندے کا پُراسرار انداز میں چمڑے کا بیگ لے کر کوٹلا معراج سے قلعہ فرمان علی پہنچنا یہ ثابت کرتا تھا کہ اس بیگ کے اندر کوئی نہایت ہی اہم شے تھی جو نوری نے انتہائی رازداری کے ساتھ مہر سلیم کے لیے بھجوائی تھی اور یہ اہم شے... کوئی قیمتی دستاویز بھی ہوسکتی تھی!

میں نے فوری طور پر اشتیاق کے ساتھ ایک اور کانسٹیبل کی ڈیوٹی بھی لگادی۔ منیر اور اشتیاق کو سادہ لباس میں رہتے ہوئے حویلی کی نگرانی کرنا تھی اور میں نے ان دونوں کو اس بات کا مکمل اختیار بھی دے دیا کہ اگر نوری یا نوید میں سے کوئی حویلی سے نکل کر کہیں دور جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے گرفتار کر کے فوراً تھانے پہنچایا جائے۔ اس بندوبست کے بعد، میں فوری طور پر قلعہ فرمان علی روانہ ہوگیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنے ساتھ کانسٹیبل یعقوب کے علاوہ حوالدار خوش بخت کو بھی لے لیا تھا۔ وہاں کسی بھی قسم کے حالات پیش آسکتے تھے۔ ممکن تھا کہ مجھے مہر سلیم کی حویلی کی تلاشی بھی لینا پڑ جاتی۔

پہلی مرتبہ جب میں قلعہ فرمان علی آیا تھا تو مہر سلیم کا رویہ بڑا ہی دوستانہ اور مخلصانہ تھا لیکن اب جو میرے تیور اور عزائم دیکھے تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ویسا ہی مہر سلیم نظر آرہا تھا جیسا نقشہ چودھری سراج نے اس کا کھینچا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں دوبارہ وہاں کس مقصد سے آیا ہوں تو اس کا انداز ہی بدل گیا۔ بڑی برہمی سے بولا۔

''ملک صاحب! میں وحید کا سچا دوست تھا اور آپ مجھ ہی پر اس کے قتل کا شک کر رہے ہیں۔ لگتا ہے، چودھری سراج نے آپ کو میرے خلاف بھڑکا دیا ہے!''

''میں کوئی ننھا بچہ نہیں ہوں جو کوئی یونہی مجھے بھڑکا دے گا'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں پکے ثبوت کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ شرافت سے بتادو کہ تمہارا بندہ آج صبح نوری سے جو چمڑے کا بیگ لے کر آیا ہے اس کے اندر کیا تھا ورنہ مجھے بھی زبردستی کرنا پڑے گی۔ جب میں تمہاری حویلی کی تلاشی لوں گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ مجھے سختی پر مجبور نہ کرو مہر سلیم!''

میرے خطرناک تیور دیکھ کر وہ قدرے نرم پڑ گیا۔ ''اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں تو بے شک حویلی کی تلاشی لے لیں۔ آپ کو یہاں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

''حویلی کی تلاشی تو میں بعد میں لوں گا مہر سلیم!'' میں نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم مجھے اس کمرے میں لے چلو جہاں تم زمین و جائداد کے کاغذات کو محفوظ رکھتے ہو!''

''آپ کو... اس کمرے... اور ان دستاویزات سے کیا کام ہے...؟'' وہ بے حد ہراساں انداز میں بولا۔

اس کی بوکھلاہٹ نے مجھے بتادیا کہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ پوری دال ہی کالی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں ان دستاویزات کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں کہ مہر سلیم کی زمین اور جائداد کہاں سے کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسے تم مردم شماری کی طرح جائداد شماری سمجھ لو...'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر چبھتے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔

''اور... اس طرح یہ سمجھنے میں بھی آسانی رہے گی کہ مقتول ملک وحید نے اپنی اسّی ایکڑ اراضی کب اور کتنی رقم کے عوض تمہارے ہاتھ فروخت کی تھی...؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں...!'' وہ بے حد پریشان نظر آنے لگا۔ ''مم... مم... میں نے تو وحید کی زمین خریدی ہی نہیں...''

''تو پھر تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''تم بے دھڑک مجھے اپنے کاغذات دکھادو۔ ساری بات واضح ہوجائے گی۔''

زمین و جائداد کی دستاویزات دیکھنے کی۔ ''خواہش'' ظاہر کرکے میں نے گویا اس کے نرخرے پر انگوٹھا رکھ دیا تھا۔ وہ اس نادیدہ ناخن کی چبھن اور انگوٹھے کے دباؤ سے بہت تڑپا اور پھڑکا لیکن میں نے اپنی ''گرفت'' میں کوئی کمی نہ آنے دی اور دھمکی آمیز انداز میں اسے ہر وہ راہ دکھادی جس پر قدم رکھ کر وہ خطرناک نتائج حاصل کرسکتا تھا۔ بالآخر اس نے میرے عزم کے سامنے ہتھیار پھینک دیے۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کے بعد اس کے کاغذات میں سے مقتول کی اسّی ایکڑ اراضی کے کاغذات الگ کرلیے۔ یہ ایک ایسا ثبوت تھا کہ مجھے مہر سلیم کو گرفتار کرکے تھانے لانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

تھانے پہنچتے ہی... اس کھیل کے دوسرے کردار یعنی مقتول کی بیوی نوری کو بھی میں نے اس کی حویلی سے گرفتار کرلیا۔ دونوں کو الگ الگ کمرے میں رکھ کر میں نے ان کے بیانات قلم بند کیے جن کی روشنی میں ملک وحید کے پُراسرار قتل کا معما حل ہوگیا۔ یہ قتل مہر سلیم نے کروایا تھا اور اس کام میں نوری کی تائید شامل تھی۔ وہ دونوں ''اندر'' سے ملے ہوئے تھے اور وحید کو راستے سے ہٹانے کے بعد وہ ''باہر'' سے بھی ملنا چاہتے ہیں!

نوری نے اپنے اقراری بیان میں بتایا کہ جب مہر سلیم کا ان کی حویلی میں آنا جانا شروع ہوا تو وہ اسے پسند کرنے لگی تھی پھر یہ پسندیدگی اتنی بڑھی کہ وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال سمجھنے لگی۔ دوسری جانب مہر سلیم کی کیفیت بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ وہ نوری سے عشق لڑانے کے دوران میں یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ بہ الفاظِ دیگر وہ اپنے دوست کی پیٹھ میں چھرا گھونپ رہا ہے۔

نوری اور مہر سلیم کو اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ وحید کی زندگی میں وہ ایک نہیں ہوسکیں گے لہٰذا جب انہوں نے متفقہ طور پر وحید کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تو نوری نے گلے ہاتھوں اپنی راہ کے آخری کانٹے کو بھی چننے کا بندوبست کردیا۔ اس نے کوشش کرکے ملک نوید کی طلائی زنجیر چرالی جس میں دل کی شکل کا تعویذ تھا جس پر ''این'' بنا ہوا تھا۔ اس نے وہ لاکٹ مہر سلیم کو دے دیا تاکہ وحید کے قتل کے بعد جائے وقوعہ پر وہ لاکٹ پڑا ملے اور پولیس کی تفتیش کا رخ ملک نوید کی طرف مڑ جائے۔

اور ایسا کسی حد تک ہوا بھی لیکن نوری اور مہر سلیم کی جلد بازی نے کھیل کا پاسا پلٹ کر رکھ دیا۔ اگر چمڑے کے بیگ والا واقعہ اتنی جلدی پیش نہ آیا ہوتا تو ملک نوید کی جان آسانی سے چھوٹنے والی نہیں تھی۔ اسے آپ نوید کی خوش قسمتی اور ان دونوں کی سنگین حماقت سمجھ لیں کہ چمڑے والے بیگ کے سلسلے میں انہوں نے چند روز بھی صبر نہیں کیا۔ نوری نے اسی بیگ میں اسّی ایکڑ اراضی کے کاغذات کو ٹلا معراج سے قلعہ فرمان علی بھیجے تھے۔

یہ سچ ہے کہ دنیا کا ذہین سے ذہین مجرم بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہمیں چاروں طرف مجرم ہی مجرم دندناتے نظر آئیں۔ بس بات اتنی سی ہے کہ مجرم کی اس غلطی کو پکڑنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسا کہ میں نے نوری اور مہر سلیم کی جلد بازی کو فوراً نوٹس کرلیا تھا ورنہ اپنی اپنی جگہ ان دونوں نے تو ایسی پرفارمنس دی تھی کہ وہی مقتول کے سب سے زیادہ ہمدرد اور خیر خواہ نظر آتے تھے اور لاکٹ کی دستیابی کے باعث نوید کی ذات شکوک و شبہات کے بھنور میں آپھنسی تھی لیکن اس کی خوش قسمتی کہ عین وقت پر بازی پلٹ گئی۔

خوشی کے حصول پر کوئی پابندی ہے اور نہ ہی عشق و محبت کرنے کی ممانعت لیکن اہمیت اس بات کی ہے کہ ہمارا عمل کس نوعیت کا ہے۔ نوری اور مہر سلیم نے ایک ہونے کے لیے جو راہ اپنائی وہ سنگین ہی نہیں بلکہ قابلِ مذمت بھی ہے۔ وہ دونوں شادی شدہ تھے۔ اپنے اپنے رفیقِ حیات سے بے وفائی کا ارتکاب کرکے انہوں نے جس خطرناک کھیل کا آغاز کیا تھا اس کا انجام بھی اتنا ہی خطرناک اور افسوس ناک ہوا تھا۔

وہ شادی جس کے لیے انہوں نے بڑے حسین سپنے بُنے تھے... وقت سے پہلے ہی، پلک جھپکتے میں ''شادی بربادی'' ہوکر رہ گئی تھی!

(تحریر: حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک صفدر حیات

تین بٹا ایک

زندگی کبھی دو جمع دو چار ..... جیسے سیدھے اصولوں کے تحت بسر نہیں کی جا سکتی یہ تو ضرب اور تقسیم جیسے پر پیچ رستوں سے گزرنے کی عادی ہوتی ہے۔ اس کا ہر زاویہ جیو میٹریکل انداز میں آگہی کے کئی دروا کر دیتا ہے ..... مگر اک انسان ہے کہ دولت کی ہوس میں قدرت کا نظام اور حساب کتاب کا دن بھلائے بیٹھا ہے ..... جس رستے پر اس کے قدم اٹھ گئے تھے اس کا انجام اگر بھیانک نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک اور لہو رنگ واقعہ

پچھلے دنوں جنوبی پنجاب کے ایک علاقے میں ایک ہولناک اجتماعی قتل کی واردات پیش آئی جب ایک ہی خاندان کے تمام افراد کو سوتے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پریس اور میڈیا نے اس واقعے کی بھرپور کوریج کی اور ''جتنے منہ اتنی باتیں'' کے مصداق تحقیقی جگادریوں نے اس واردات کے بارے میں بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق قیاس ارائیاں کیں۔ بعد ازاں، اس واقعے کے پس منظر کے حوالے سے جو شواہد اور حقائق سامنے آئے وہ آپ سب کے علم میں ہیں۔ دنیا کے کسی بھی مسئلے اور تنازع کی جڑ کھودیں، وہاں زن، زر اور زمین میں سے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ بیٹھے نظر آتے ہیں!

ہمارے زمانے میں پریس اور میڈیا اتنا طاقتور نہیں تھا بلکہ میڈیا کا تو دور دور تک نام و نشان سننے اور دیکھنے میں نہیں آتا تھا اور پریس میں بھی وہی خبریں اپنی جگہ بنا پاتی تھیں جن کے پیچھے کوئی بڑا ایشو موجود ہوتا تھا۔ آج والی آسانی اور سہولت ہمیں میسر نہیں تھی۔

آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ کہانی شروع کرنے کے بجائے میں نے کوئی اور ہی قصہ چھیڑ دیا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل، اس تمہید کا مقصد ''زن، زر اور زمین'' کی ہلاکت خیزیوں کو اجاگر کرنا تھا اور کوئی بھی کہانی یا داستان ان کے ذکر سے خالی نہیں.....!

اب میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں تھانے میں بیٹھا روزمرّہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا، موضع شمشیر پور میں دہرے قتل کی ایک واردات ہوگئی ہے۔ شمشیر پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اگرچہ وہ تھانے سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ ان دنوں تھانوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی جتنی کہ آج کل ہے اور تھانوں کے اندر موجود نفری کا بھی آج کل کی نفری سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اگر مقابلہ ناگزیر بھی ٹھہرے تو یہی کہنا مناسب ہوگا کہ یہ مقابلہ ہاتھی اور چوہے کے مابین ہے۔

میں نے اطلاع کنندہ کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔ اس شخص کا نام بشیر لوہار تھا اور وہ موضع شمشیر پور ہی کا رہنے والا تھا۔ وہ عام سی شکل صورت اور متناسب بدن کا مالک تھا۔ اس نے چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ عمر یہی کوئی پینتالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔

میں نے بشیر لوہار سے سوال کیا۔ ''ہاں بھئی، کون کون قتل ہوا ہے؟''

''وہ دونوں سگے بھائی تھے تھانیدار صاحب!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''بڑے کا نام فیاض اور چھوٹے کا ریاض تھا۔ دونوں گبرو تھے جی۔''

''تمہارا ان دونوں سے کیا رشتہ ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کے انداز سے مجھے اتنا اندازہ تو ہوگیا تھا کہ وہ مقتولین کا باپ نہیں ہوسکتا تھا۔ ہاں، البتہ چاچا، ماما، تایا وغیرہ میں سے کوئی ہوسکتا تھا۔ بشیر لوہار کے جواب نے میرے آخر الذکر اندازے کی بھی نفی کر دی۔ اس نے دل گرفتہ انداز میں بتایا۔

''میری ان سے کوئی رشتے داری نہیں تھی جناب..... بس یہ سمجھ لیں کہ ہم سب ایک ہی گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں ان کا پڑوسی ہوں جی۔''

''پڑوسی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم اکیلے ہی یہ اطلاع دینے آئے ہو یا مقتولین کا کوئی قریبی عزیز بھی تمہارے ساتھ ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں اکیلا نہیں ہوں جی، دو بندے باہر برآمدے میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن ہم میں سے کوئی بھی فیاض اور ریاض کا رشتے دار نہیں۔ وہ دراصل بات یہ ہے جناب کہ.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ان کے گھر میں ایسا کوئی بھی نہیں جو اس واقعے کی رپورٹ کرنے آپ کے پاس آتا۔ وہ دونوں تو قتل کر دیے گئے۔ باقی گھر میں ان کی ماں زاہدہ ہے یا پھر چھوٹا بھائی فرمان علی جس کی عمر تین سال کے قریب ہے۔''

''اوہ.....!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''کیا ان کا باپ موجود نہیں؟''

''نہیں جی۔'' بشیر لوہار نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''فتح محمد کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی تم لوگوں کے ساتھ شمشیر پور چلتا ہوں۔ تم بھی باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو..... اور ہاں، یہ تو بتاؤ کہ تم تینوں شمشیر پور سے یہاں کیسے پہنچے ہو؟''

شمشیر پور اور میرے تھانے کے بیچ لگ بھگ چار میل کی مسافت حائل تھی اور ظاہر ہے، وہ پیدل چل کر تو نہیں آئے ہوں گے۔ بشیر لوہار نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''جی، ہم تانگے میں بیٹھ کر آئے ہیں۔ باہر اصغر اور صدیق موجود ہیں جن میں صدیق ایک کوچوان ہے اور ہم اسی کے تانگے پر سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''کیا اس تانگے میں مزید دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں بہت آسانی سے گنجائش نکل آئے گی۔''

میں نے بشیر لوہار کو باہر برآمدے میں بیٹھنے کو کہا اور کانسٹیبل مراد علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مراد میرے تھانے کا ایک ہوشیار اور چاق چوبند اہلکار تھا اسی لیے میں نے اسے اپنے ساتھ شمشیر پور لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ میرے کمرے میں آیا تو میں اسے روانگی سے متعلق مختلف ہدایات دینے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم سب صدیق کوچوان کے تانگے میں بیٹھے موضع شمشیر پور کی جانب رواں دواں تھے۔ اس سفر کے دوران میں میری اصغر، صدیق اور بشیر سے اس واردات کے حوالے سے بات چیت بھی جاری رہی تھی اور میں کافی مفید باتیں جاننے میں کامیاب رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم اپنے مطلوبہ گاؤں پہنچ گئے۔

☆☆☆

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، شمشیر پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں بہ مشکل اسی، نوّے گھر آباد ہوں گے۔ میرا تھانہ ''حافظ آباد، پنڈی بھٹیاں'' روڈ پر واقع تھا اور وہاں سے ایک کچا راستہ شمشیر پور کی طرف آتا تھا۔ یہ کچا راستہ شمشیر پور کے اندر سے گزر کر جنوب میں ''چک میراں'' نامی ایک گاؤں تک چلا جاتا تھا۔ اس راستے کی خوبصورتی یہ تھی کہ اس کی دونوں جانب سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا دکھائی دیتا تھا اور راستے کے ایک پہلو میں کسی چھوٹی نہر کے سائز کا ایک کھالا بھی بہتا تھا جسے مقامی دیہاتی زبان میں ''سُوا'' کہا جاتا تھا۔ یہ سُوا اپنے دائیں بائیں کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا یا پھر موسم گرما کی تپتی، سلگتی دوپہروں میں گاؤں کے نوجوان اور جوان اس میں نہاتے تھے۔ آج کل گلابی جاڑے کے دن تھے لہٰذا اس سُوے کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا!

ہم گاؤں میں داخل ہوئے اور سیدھے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں دُہرے قتل کی یہ واردات ہوئی تھی۔ وہ دراصل مویشیوں والا ایک باڑا تھا جو مقتولین کے گھر کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے تانگے سے نیچے اترے پھر میں بشیر لوہار کی راہ نمائی میں مذکورہ باڑے کے اندر داخل ہو گیا۔

جب ہم تانگے کو چھوڑ رہے تھے تو میں نے باڑے کے دروازے پر درجن بھر افراد کا جمگھٹا دیکھا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ دائیں بائیں چھٹ گئے تھے لہٰذا ہمیں ان سے کچھ بھی نہیں کہنا پڑا تھا۔ پولیس کی وردی کی اپنی ہی ایک زبان ہوتی ہے!

باڑے کے صحن میں پہلو بہ پہلو دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان دونوں چارپائیوں پر دو لاشیں ڈھکی نظر آ رہی تھیں۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ انہیں بعد میں چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ میرے حکم پر کانسٹیبل مراد علی نے لاشوں کے اوپر سے چادریں ہٹا کر انہیں قابلِ مشاہدہ و قابلِ معائنہ بنا دیا۔

بشیر لوہار نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ فیاض اور ریاض نامی وہ دونوں بھائی گبرو تھے۔ فیاض کی عمر میرے اندازے کے مطابق، بائیس سال رہی ہوگی جبکہ ریاض لگ بھگ انیس کا نظر آتا تھا۔ بعد ازاں، میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ فیاض، ریاض سے تین سال بڑا تھا۔ دونوں الگ الگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چارپائیوں پر زندگی سے خالی پڑے تھے، اس طرح کہ ان کے وجود کے بالائی حصوں کا خانہ خراب کر دیا گیا تھا۔

دونوں کی لاشیں خون میں لت پت تھیں۔ جسم کے اوپری حصوں خصوصاً سر، چہرہ، گردن، سینہ اور دیگر اعضا کو کلہاڑی کے متعدد وار کر کے زخموں سے چور کر دیا گیا تھا۔ سب سے زیادہ خطرناک کٹ کھوپڑی اور گردن پر نظر آ رہے تھے جو یقیناً ان کی موت کا سبب بھی تھے۔ ان لاتعداد گھاؤ سے خارج ہونے والے خون نے ان کے لباسوں کے علاوہ چارپائیوں پر بچھے ہلکے پھلکے بستروں کو بھی پوری طرح رنگین بنا دیا تھا۔ موسم کی خنکی نے خارج شدہ خون کے جمنے میں اچھی خاصی مدد کی تھی۔

وہ ماہِ اکتوبر کے ابتدائی ایام تھے۔ دن میں موسم خاصا خوشگوار رہتا تھا لیکن جیسے ہی دن ڈھلنے لگتا، فضا میں ہلکی ٹھنڈک شامل ہو جاتی تھی اور رات میں لازماً کچھ نہ کچھ اوڑھ کر سونا پڑتا تھا، خاص طور پر کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنے والوں کو تو چادر یا کھیس وغیرہ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ دونوں مقتول بھائی بغیر کچھ اوڑھے سوئے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ان کے اوپر سے جو چادریں ہٹوائی تھیں وہ ان کا اوڑھنا نہیں تھیں۔ میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ لاشوں کی دریافت کے بعد ڈھانپنے کے لیے ان پر وہ چادریں ڈالی گئی تھیں۔ یا تو قاتل ان کے اوڑھنے کے کپڑے ساتھ لے گیا تھا اور یا پھر انہوں نے کوئی کپڑا اوڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ ہر دو صورت میں، صورتِ حال بڑی پراسرار، حیرت انگیز، گمبھیر اور خاصی الجھی ہوئی تھی۔

اس سے بھی زیادہ تشویش ناک اور قابلِ غور بات یہ تھی کہ دونوں بھائیوں کی جانب سے کسی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ جب کسی شخص پر کلہاڑی کے وار کیے جاتے ہیں تو چاہے وہ سویا ہوا ہی کیوں نہ ہو، کچھ نہ کچھ مزاحمت ضرور کرتا ہے پھر یہ دو افراد کے قتل کا معاملہ تھا، اس میں تو مزاحمت کی کوشش واضح طور پر دکھائی دینا چاہیے تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دونوں رضا کارانہ طور پر قتل ہوئے تھے..... وہ دونوں بڑی شرافت سے آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ قاتل آیا، تیز دھار کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا اور واپس چلا گیا۔ انہوں نے اس یلغار کے خلاف اف تک نہ کی حتیٰ کہ ان کی لاشوں نے بھی بڑے صبر اور برداشت کا مظاہرہ کیا۔ درجنوں مہلک وار

قارئین متوجہ ہوں

قرآنِ حکیم کی مُقدس آیات و احادیثِ نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مُطابق بے خرمتی سے محفوظ رکھیں۔

کھا کر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں..... جب کہ فطری ردِعمل اس بات کا متقاضی تھا کہ ہر وار پر ان کے بدن تڑپتے اور پھڑکتے اور.....!

اس گہرے قتل کی واردات میں ''سوچنے اور سمجھنے'' کے لیے بہت کچھ تھا اور ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہ صورتِ حال مجھے کسی بھی طور پر ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے بلکہ امکان اس بات کا تھا کہ پوری دال ہی کالی ہے!

ایسا ہونا ممکن نہیں تھا کہ وہ کچھ اوڑھے بغیر کھلے آسمان کے نیچے سوئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاتل ان کے ''اوڑھنے'' اپنے ساتھ لے گیا تھا اور دوسری بات یہ بھی طے تھی کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک سوچی سمجھی انتقامی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور عین ممکن تھا کہ جب ان پر کلہاڑیاں برسائی جا رہی تھیں تو ان لمحات میں وہ لوگ گہری اور بے خبری کی نیند میں ہوں..... انہیں کسی خاص ''طریقے'' سے بے خبری کی ''نیند'' میں پہنچایا گیا ہو تاکہ قاتل کو اپنے ''کام'' میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو!

میں نے تفصیلی معائنے کے بعد دونوں لاشوں کو دوبارہ چادروں سے ڈھک دیا اور انہیں سرکاری اسپتال پہنچانے کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ فیاض اور ریاض کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم بہت ضروری تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے خدشات کی تسکین کر سکتی تھی۔ مجھے امید تھی، یہ تسکین، تصدیق کی حامل ہو گی!

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مذکورہ باڑے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ باڑے کا رقبہ لگ بھگ آٹھ مرلے رہا ہو گا۔ کراچی میں رہنے والے اسے دو سو گز کا پلاٹ تصور کر لیں۔ باڑے کے عقبی حصے میں دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں ایک نسبتاً چھوٹا اور دوسرا بڑا تھا۔ چھوٹے کمرے کے اندر مویشیوں کا کھاجا وغیرہ بھرا ہوا تھا اور کچھ کھیتی باڑی کا سامان بھی رکھا نظر آ رہا تھا۔ بڑے کمرے میں کوئی قابلِ ذکر شے موجود نہیں تھی۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت وہاں مویشیوں کو ''پارک'' کیا جاتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں کمروں کے ٹیکنیکل معائنے کے بعد میں کشادہ صحن میں نکل آیا۔ جس کی ایک دیوار کے ساتھ چار مویشی موجود تھے۔ ان میں دو بیل اور دو بھینسیں تھیں۔ ایک بھینس کالی اور دوسری بھوری تھی۔ یہ چاروں بے زبان جانور اپنی کنڈلیوں پر بندھے خاصے افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ صحن کے دوسرے کونے میں دو بکریاں اور ایک بکرا بھی بندھا ہوا نظر آیا۔

اس باڑے میں داخلے کے دو دروازے تھے جن میں سے ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا تھا۔ مقتولین کا گھر گلی کے آخری کنارے پر واقع تھا یعنی یہ ایک کارنر کا مکان تھا جسے دو گلیوں کا ساتھ میسّر تھا۔ باڑا، گھر کے پچھواڑے واقع تھا جس کا ایک دروازہ عقبی گلی میں اور دوسرا پہلو والی گلی میں کھلتا تھا۔ ہم اسی، پہلو والے دروازے سے باڑے میں داخل ہوئے تھے جو نسبتاً بڑا تھا۔ صحن میں دو تین گھنے سایہ دار درخت بھی استادہ تھے۔

میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد وہاں موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ کانسٹیبل مراد علی کو میں نے لاشوں کے ساتھ سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا اور اب جو بھی کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔

میں نے دو تین افراد کو ٹٹول کر دیکھا لیکن ان کی زبانوں سے کام کی کوئی بات نکل نہ سکی۔ اس کے بعد میں بشیر لوہار کی طرف متوجہ ہوگیا۔ یہ شخص مقتولین کا پڑوسی تھا اور اس واقعے کی اطلاع لے کر میرے پاس پہنچا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''بشیر! تمہارے خیال میں اس واردات کا ذمے دار کون ہوسکتا ہے؟''

''جناب! میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''تم ان کے پڑوسی ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اتنا بے خبر تو نہیں ہونا چاہیے؟''

''آپ غلط نہیں کہہ رہے تھانیدار صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''میں ان کا پڑوسی ہوں اور ان کے حالات کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں لیکن قتل کی اس واردات کے حوالے سے مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ آپ یقین کریں، میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں نے فی الحال تمہاری بات کا یقین کرلیا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ بتاؤ، اس واردات کا سب سے پہلا شاہد کون تھا؟''

اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میری بات کا آخری حصہ شاید اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔ میں نے فوراً وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ ان دونوں بھائیوں کی لاشوں کو سب سے پہلے کس نے دیکھا تھا؟''

''منظور موچی نے!'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''منظور بازو والی گلی سے گزر رہا تھا کہ باڑے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے اس کی نظر اندر صحن میں چلی گئی جہاں بچھی چارپائیوں پر یہ دونوں بھائی خون میں لت پت پڑے تھے.....'' اس نے تھوڑا توقف کرکے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میری دکان گھر کے اندر ہی، سامنے والے حصے میں ہے اور سارا گاؤں جانتا ہے کہ میں صبح سویرے اپنی دکان پر بیٹھ کر کام شروع کردیتا ہوں۔ میرا اور مقتولین کا گھر ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور میری دکان کے دروازے اور ان کے گھر کے دروازے میں چند فٹ کا ہی فاصلہ ہے۔ ان کے گھر میں داخل ہونے والا ہر شخص میری نظر میں رہتا ہے۔ منظور موچی نے باڑے والا خونیں منظر دیکھ کر مقتولین کے گھر کی طرف دوڑ لگائی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا، میری اس پر نگاہ پڑ گئی۔ میں نے اسے بڑی پریشانی کے عالم میں دیکھا۔ یہ سب مجھے بڑا عجیب لگا اور میں نے بے ساختہ اسے آواز دی۔

''او منظورے! خیریت تو ہے.....؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر تیزی سے میری دکان میں داخل ہوکر بولا۔ ''خیریت نہیں ہے بشیرے.....!''

اس کی خوف زدگی کو دیکھتے ہوئے میں نے کام سے ہاتھ کھینچ لیا اور پوچھا۔ ''پر ہوا کیا ہے۔ کچھ منہ سے تو بول؟''

''پیچھے باڑے میں دو لاشیں..... پڑی ہیں!'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مم..... میرا خیال ہے، فیاض اور ریاض کو کسی نے قتل کردیا ہے.....!''

''اوہ.....!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تم اسی واقعے کی اطلاع دینے ادھر آئے ہو؟''

''ہاں.....'' اس نے میکانکی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''میں ان کی ماں کو بتانا چاہتا تھا کہ تم نے آواز دے دی.....''

میں دکان سے فوراً باہر آگیا۔ جس دوران میں منظورا، مقتولین کے دروازے پر دستک دے رہا تھا، میں نے باڑے میں جاکر اس کی فراہم کردہ اطلاع کی تصدیق اپنی آنکھوں سے کرلی۔ فیاض اور ریاض کی خون آلود لاشیں بے حس و حرکت چارپائیوں پر پڑی تھیں۔

اس نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا، ایک گہری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''تھانیدار صاحب! اس دہرے قتل کا لرزہ خیز منظر دیکھ کر میں واپس آیا تو منظور دروازے پر کھڑا زاہدہ کو اس واقعے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے بعد تو گویا ایک کہرام مچ گیا۔ زاہدہ اپنا دوپٹا سنبھالتے ہوئے ہم دونوں کے ساتھ باڑے میں پہنچی اور اپنی آنکھوں سے فیاض اور ریاض کی کٹی پھٹی خون آلود لاشیں دیکھیں۔ اس منظر نے اسے بے قابو کر دیا اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی.....''

وہ اتنا بتانے کے بعد پھر رکا، گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جناب! پھر تو اس واقعے کی خبر پورے شمشیر پور میں پھیل گئی۔ فوری طور پر فیصلہ کیا گیا کہ سب سے پہلے تھانے میں اطلاع دینا چاہیے چنانچہ میں نے صدیق کو چوان کو تیار کیا اور ہم اصغر کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ گئے۔ یہ ہے کل کہانی جناب!''

''کافی سنسنی خیز کہانی ہے.....!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر وہاں پر موجود افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بشیر لوہار سے پوچھا۔ ''کیا منظور موچی ان لوگوں میں شامل ہے؟''

''نہیں جناب.....'' اس نے میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس وقت کہیں نظر نہیں آ رہا۔''

''وہ ہوگا تو گاؤں کے اندر ہی نا؟''

''جی ہاں..... اسے کہاں جانا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں مقتولین کی والدہ کے پاس جا رہا ہوں۔ تم منظور موچی کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر میرے پاس لے آؤ۔''

''بہت بہتر جناب!'' اس نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے گھر میں کوئی فالتو تالا پڑا ہوا ہے؟''

''جی..... تالا مل جائے گا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''جاؤ، بھاگ کر جلدی سے وہ تالا لے آؤ..... چابی بھی ساتھ لانا۔''

''ابھی گیا..... اور ابھی آیا سرکار۔'' یہ کہتے ہی وہ رخصت ہو گیا۔

اس باڑے میں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، دو دروازے تھے۔ ایک وہ بڑا دروازہ جس میں سے ہم اندر داخل ہوئے تھے اور دوسرا چھوٹا دروازہ جو باڑے کی عقبی دیوار میں تھا۔ یہ چھوٹا دروازہ اندرونی جانب سے بند تھا اور اس پر تالا بھی لگا ہوا تھا۔ بشیر لوہار سے میں نے جو تالا منگوایا تھا اسے میں بڑے دروازے پر لگانا چاہتا تھا تاکہ جائے وقوعہ کو محفوظ کیا جا سکے۔ یہ کچھ اس نوعیت کی واردات تھی کہ عین ممکن تھا، قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے باقاعدہ کھرا اٹھانا پڑتا اور..... اس کام کا نقطۂ آغاز یہ باڑا ہی تھا!

تھوڑی ہی دیر کے بعد بشیر لوہار تالا اور چابی لے کر آ گیا۔

میں نے باڑے کا بڑا دروازہ باہر سے بند کیا، اس کی کنڈی چڑھا کر تالا لگایا اور خود زاہدہ پروین سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں نے وقتی طور پر، باڑے کو لوگوں کی آمد و شد سے محفوظ رکھنے کے لیے بشیر کا تالا لگا دیا تھا لیکن بعد ازاں پہلی فرصت میں مجھے وہاں سرکاری تالا ڈالنا تھا۔ یہ ساری کارروائی زاہدہ سے ملاقات کے بعد ہی ممکن تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، اس ملاقات کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ اس ملاقات سے کچھ ایسے اشارے مل جائیں کہ کسی کھوجی کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو!

دونوں لاشوں کی حالت چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ یہ واردات ایک سنگین انتقامی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ ان دونوں بھائیوں کے لیے اپنے دل و دماغ میں نفرت کا بڑا ذخیرہ رکھتا تھا۔ اس تناظر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ زاہدہ، اپنے بیٹوں کے کسی ایسے دشمن سے واقف نہ ہو جو اس حد تک چلا گیا تھا۔

☆☆☆

زاہدہ پروین کو دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ پینتالیس پچاس کے پیٹے میں ہوگی لیکن وہ کسی بھی طور تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنی حیرت کو فی الحال ظاہر نہیں ہونے دیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''زاہدہ! مجھے اس ہولناک واقعے کا گہرا دکھ ہے اور میں تمہارے رنج میں برابر کا شریک ہوں۔ تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد تمہارے بیٹوں کے قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا.....!''

اس وقت ہم دونوں زاہدہ کے گھر کے اندر ایک کمرے میں بیٹھے تھے اور اس کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس واقعے کی خبر عام ہونے کے بعد زاہدہ کا گھر گاؤں کی عورتوں سے بھر گیا تھا۔ وہ سب اس سے ہمدردی اور تعزیت کے لیے آئی تھیں۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو اس وقت بھی وہاں چار پانچ عورتیں موجود تھیں اسی لیے پوچھ گچھ کی خاطر میں زاہدہ کو الگ کمرے میں لے کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھ گیا تھا۔ زاہدہ کا تین سالہ بچہ فرمان علی بھی انہی عورتوں نے سنبھال رکھا تھا۔

وہ میرے اظہار ہمدردی کے جواب میں بولی۔ ''میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ فیاض اور ریاض کا قاتل جتنی جلدی ممکن ہو سکے، جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے۔''

''میں یہ کر سکتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہوگی۔''

''بتائیں..... میں آپ سے کیا تعاون کروں؟'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے ایک انجانی سی سرد مہری محسوس ہوئی۔ اس کے دو بیٹوں کو بڑے بہیمانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس اندوہناک موقع پر ایک ماں کا جو فطری ردِعمل ہونا چاہیے تھا وہ مجھے زاہدہ کے انداز و تاثرات میں کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رو رہی تھی، پریشانی اور دکھ کا اظہار کر رہی تھی، رنجیدہ اور دکھی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں موت کا دیا ہوا داغ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ آنکھیں کرب اور اذیت کے مفہوم سے خالی تھیں۔

''تمہارے تعاون کے بغیر میرے لیے ایک قدم بھی اٹھانا ممکن نہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ گی کہ ان دونوں بھائیوں کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''اگر مجھے قاتل کا پتا ہوتا تو میں جا کر اسے گردن سے نہ پکڑ لیتی۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں تھانیدار صاحب!''

''میں نے کوئی عجیب بات نہیں کی ہے زاہدہ۔'' میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم اس وقت دکھی اور پریشان ہو اس لیے تمہیں ایسا محسوس ہوا ہے ورنہ میں تو.....''

میں ایک لمحے کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں بھائیوں کی کس کس سے دشمنی تھی؟''

میرا سوال سن کر زاہدہ کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے کوئی واضح جواب دینا چاہ رہی ہو لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا اور بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ دونوں تو بہت ہی نیک اور شریف تھے۔ کوئی ان سے دشمنی کیوں کرے گا مگر.....!''

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''زاہدہ بی بی! انہیں جس بے دردی سے فنا کے گھاٹ اتارا گیا ہے، یہ کام کسی دوست کا نہیں ہو سکتا۔ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ قاتل ان دونوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ وہ کتنے ہی نیک اور شریف کیوں نہ ہوں، کوئی نہ کوئی ان کا دشمن ضرور ہوگا۔ انسان کے جہاں دس دوست ہوتے ہیں وہاں انہی دوستوں کے اندر یا باہر ایک آدھ دشمن بھی موجود ہوتا ہے۔ اور یہ جو تم.....!'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جو بولتے بولتے اچانک رک گئی ہو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اس واردات کے حوالے سے کوئی ایسی بات ضرور جانتی ہو جو مجھے فیاض اور ریاض کے قاتل تک پہنچا سکتی ہے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتی ہو کہ ان کے قاتل کو عبرتناک سزا ہو؟''

''میں نے بتایا ہے نا، میری شدت سے یہ خواہش ہے کہ ان کا قاتل جلد از جلد پھانسی لگ جائے۔'' وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ''آپ میری کسی بات کا غلط مطلب نہ نکالیں۔ کیا ہوا جو میں ان کی سگی ماں نہیں ہوں.....!''

زاہدہ پروین کے آخری جملے نے میرے ذہن میں ابھرنے والے بہت سے سوالات کا منہ بند کر دیا۔ میں نے ہمدردی بھرے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''زاہدہ! تمہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ تم ایک خوبصورت اور جوان عورت ہو۔ میرے اندازے کے مطابق، تم زیادہ سے زیادہ تیس سال کی ہوگی۔ ایک تیس سالہ عورت کے بیٹے انیس اور بائیس سال کے تو نہیں ہو سکتے نا!''

آخری جملہ میں نے اس کی زبان رواں کرنے کے لیے ادا کیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''میں اس وقت اٹھائیس سال کی ہوں۔ میں فیاض اور ریاض کی سوتیلی ماں ہوں۔ فتح محمد نے پانچ سال پہلے مجھ سے شادی کی تھی لیکن افسوس کے پچھلے سال وہ میرا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم دونوں کی نشانی فرمان علی ہے.....''

اتنا بتا کر اس نے افسردہ انداز میں گردن جھکا لی۔ مجھے اگر اس کی آنکھوں میں اپنے لختِ جگر کی ابدی جدائی کا غم نظر نہیں آیا تھا تو اس کا یہی سبب تھا کہ فیاض اور ریاض نے اس کی کوکھ سے جنم نہیں لیا تھا جبھی زاہدہ کی سوگواری میں وہ تڑپ نظر نہیں آتی تھی۔

زاہدہ اٹھائیس سال کی ایک بھرپور اور جوان عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ بھرے بھرے بدن کی مالک ایک پرکشش عورت تھی۔ فتح محمد نے اگر بڑھاپے میں اس سے شادی کی تھی اور ایک بچے کا باپ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن گیا تھا تو اس کا سبب، زاہدہ کے حسن اور جوبن کی شکل میں نظر آتا تھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ زاہدہ کو بوڑھے فتح محمد میں کیا دکھائی دیا تھا!

میں نے زاہدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''فیاض اور ریاض تمہارے سگے بیٹے تھے یا سوتیلے، اس سے قطعی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا ہوں کہ ان کی المناک موت نے تمہیں توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں تمہارے دکھ اور تکلیف کو سمجھ سکتا ہوں زاہدہ!''

''آپ کا بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ گردن اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں چونکہ تمہارے دکھ درد کو سمجھ رہا ہوں اسی لیے چاہتا ہوں کہ فیاض اور ریاض کے قاتل کو قرار واقعی سزا ملے۔ مجھے امید ہے، اگر تم مجھ سے مناسب تعاون کرو تو یہ کام آسانی سے ہوسکتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے ان کے دشمن کے حوالے سے جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے تو.....!''

''وہ کوئی خاص بات نہیں تھی.....!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''بات خاص تھی یا عام، تم اس فکر میں نہ پڑو۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بعض اوقات ایک معمولی اور غیر اہم بات بھی نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ۔ میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں۔''

چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''تھانیدار جی! دراصل، میرا دھیان صفدر کی طرف جارہا تھا.....''

''صفدر.....!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ صفدر کون ہے؟''

''صفدر اسی گاؤں میں رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''فضول اور آوارہ گرد انسان ہے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

''ٹھیک ہے، یہ صفدر بہت ہی بے کار شخص ہوگا۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن فیاض اور ریاض کے قتل کے سلسلے میں تمہارا دھیان صفدر کی طرف کیوں چلا گیا۔ اس کا مقتولین سے کیا تعلق ہے؟''

مجھے واضح طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ زاہدہ کی زبان سے کوئی ایسا انکشاف ہونے والا ہے جو مجھے دونوں بھائیوں کے قاتل تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔ میں پوری توجہ سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''وہ جی..... پچھلے دنوں صفدر کا ان دونوں بھائیوں سے اچھا خاصا جھگڑا ہوگیا تھا۔''

''جھگڑا.....!'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟''

''میرا خیال ہے، میں آپ کو کھل کر بتاتی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''ہاں ہاں، میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا۔ ''جب تک تم کھل کر نہیں بولو گی، بات بن نہیں سکے گی اور میں بھی خوامخواہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہوں گا۔''

''تھانیدار جی!'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگی۔ ''دراصل، صفدر اپنی بوڑھی ماں اور جوان بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔ وہ کوئی باقاعدہ کام دھندا نہیں کرتا۔ تھوڑی بہت بدمعاشی اور غنڈا گردی یا کہیں چھوٹا موٹا کام مل گیا تو کرلیا۔ اس کی بوڑھی ماں کریاں پی پی کو پوری طرح دکھائی بھی نہیں دیتا۔ وہ کسی کی مدد کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی۔ صفدر کی بہن نازو ہی بوڑھی ماں کا خیال رکھتی ہے اور.....''

''یہ تو صفدر کے خانگی حالات ہیں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ مقتولین کا کس بات پر صفدر سے جھگڑا ہوا تھا؟''

''میں اسی طرف آرہی ہوں تھانیدار جی!'' وہ بڑی رسان سے بولی۔ ''دراصل، صفدر کے خانگی حالات کا جائزہ لیے بغیر آپ جھگڑے کی وجہ کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکیں گے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے ابھی صفدر کی چھوٹی بہن نازو کا ذکر کیا ہے نا..... وہی سارے جھگڑے کی بنیاد ہے۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ سال ہوگی لیکن اللہ نے شکل صورت اچھی دی ہے، بلکہ بہت اچھی دی ہے اور اسی شکل صورت نے ریاض کا دماغ خراب کردیا تھا۔ وہ نازو پر مرمٹا تھا۔ اس کے بعد جو ہوتا ہے، وہ آپ بھی جانتے ہیں.....''

وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوگئی۔ اس بار میں نے اسے روکنے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے کہانی میں نازو کے کردار کو شامل کرکے میرے جذبۂ تجسس کو ہوا دے دی تھی لیکن میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا، اس کی زبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کوئی نہایت ہی سنسنی خیز انکشاف ہونے والا ہے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''ریاض اور نازو نے چھپ چھپ کر ملنا شروع کردیا۔ کبھی کھیتوں میں، کبھی رات کی تاریکی میں، ٹیوب ویل کے پیچھے اور کبھی ذخیرے کے اندر (ذخیرے سے اس کی مراد گھنے درختوں کا وہ جھنڈ تھا جو شمشیر پور کے سرسبز کھیتوں سے جڑا ہوا تھا) آپ سمجھ دار ہیں، یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ چوری چھپے کی ان ملاقاتوں کا نتیجہ کیا نکل سکتا ہے۔''

اس نے توقف کر کے میری آنکھوں میں دیکھا اور مزید بتانے لگی۔ ''نازو اور ریاض کے درمیان جو کچھ چل رہا تھا وہ زیادہ عرصے تک چھپا نہ رہ سکا۔ ان کے تعلقات کی خبریں اڑ کر صفدر تک بھی پہنچیں اور اس غنڈے کا دماغ خراب ہوگیا۔ ایک روز اس نے ریاض کو گھیر لیا اور بغیر کوئی سوال کیے اسے مارنا شروع کردیا اور کسی کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن ریاض اچھی طرح جانتا تھا کہ صفدر اس سے کس بات پر جھگڑا کررہا ہے۔ اس سے پہلے کہ بات بہت زیادہ بڑھ جاتی، لوگوں نے بیچ میں پڑ کر انہیں جھگڑنے سے روک دیا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمی اور اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''اس جھگڑے کی خبر گھر تک بھی پہنچی تھی۔ مجھے اور فیاض کو اس معاملے کی سن گن تو تھی لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ نوبت مار پیٹ تک جا پہنچے گی۔ جب ہمیں ان کے تعلقات کا پتا چلا تو ہم نے ریاض کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ آئندہ وہ نازو سے نہیں ملے گا۔ ہم مطمئن ہوگئے لیکن.....'' اس نے پراسرار انداز میں رک کر مجھے دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ریاض نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا اور چوری چھپے نازو سے ملنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چند روز بعد، ریاض اور فیاض کھیتوں کی طرف جارہے تھے کہ صفدر اچانک ان کے سامنے آگیا۔ اس وقت صفدر کے ساتھ لالکھو بھی تھا۔ لالکھو کوئی اچھا آدمی نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے، وہ مختلف قسم کے جرائم میں ملوث رہتا ہے اور صفدر سے اس کی بڑی گاڑھی دوستی بھی ہے۔ لالکھو نے اس روز ریاض سے کہا۔

''اسے آخری وارننگ سمجھ لو۔ میں اپنے الفاظ دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ جو لوگ میری بات کو نہیں سمجھ پاتے انہیں میں پھر اپنے مخصوص طریقے سے سمجھا دیتا ہوں اور..... ایسا سمجھاتا ہوں کہ زندگی بھر اور زندگی کے بعد بھی وہ میرا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے ہیں..... صفدر کی چھوٹی بہن نازو سے دور رہو.....!''

''لیکن ریاض کا تو اب اس لڑکی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔'' فیاض نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ''ہم نے اسے سمجھا دیا ہے۔ شاید تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''غلط فہمی!'' لاکھو ایک جھٹکے سے ریاض کی جانب مڑا اور زہریلے لہجے میں بولا۔

''اوئے بھونڈے عاشق کی اولاد! کیا تم پچھلی جمعرات کو نازو سے نہیں ملے تھے۔ ادھر کھڑی فصل میں..... بتاؤ اپنے بھائی کو کہ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی!''

کوئی جواب دینے کے بجائے ریاض نے گردن جھکالی جو اس بات کا اقرار تھا کہ لاکھو کے کہے کے مطابق، وہ پچھلی جمعرات کو نازو سے ملنے کھیتوں کی طرف گیا تھا۔ اس موقعے پر فیاض نے اپنے بھائی کی حمایت لیتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''تم میرے بھائی کے پیچھے ہی ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہو۔ ذرا اپنے دوست صفدر کی بہن کو بھی تو سمجھاؤ..... وہ کیوں ریاض سے ملنے کے لیے آتی ہے؟''

''میرا خیال ہے.....!'' لاکھو نے فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''ریاض کے ساتھ ساتھ، ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑنے کی بھی ضرورت ہے۔ تمہاری حمایت ہی نے اس لڑکے کا دماغ خراب کیا ہے.....!''

لاکھو کے لہجے میں پوشیدہ سنگین دھمکی کو اس وقت فیاض سمجھ نہ سکا اور معاملہ رفع دفع کر کے وہ ریاض کو اپنے ساتھ گھر لے آیا اور پھر..... چند روز بعد ہی یہ واقعہ پیش آگیا۔''

زاہدہ پروین نے دکھی انداز میں بات ختم کی اور امید افزا نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''زاہدہ! تم نے جو کہانی سنائی ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں کی موت میں صفدر یا لاکھو کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ میں ان دونوں بندوں کو اچھی طرح ''چیک'' کروں گا۔ صفدر تو شمشیر پور ہی کا رہنے والا ہے۔ کیا لاکھو بھی.....!''

''نہیں جی.....!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''لاکھو کا تعلق چیاں والی سے ہے جو ہمارے گاؤں سے دو میل دور مغرب میں واقع ہے۔ وہ صفدر سے ملنے یہاں آتا رہتا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو زاہدہ!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔ ''اس واردات میں صفدر اور لاکھو ملوث ہیں یا کوئی اور شخص، میں قاتل کی تلاش میں مغرب مشرق وشمال جنوب ہر سمت میں جاؤں گا.....'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''بس، تم میرے ایک دو سوالات کے جواب مزید دے دو پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا تاکہ جلد از جلد قاتل کی تلاش کا کام شروع کر سکوں۔''

''جی پوچھیں..... میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی اور متوقع نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں زاہدہ سے کوئی سوال کرتا، کمرے کے باہر کسی بچے کے رونے کی آواز ابھری۔ زاہدہ نے تڑپ کر دروازے کی سمت دیکھا جو بھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہ دروازے سے پلٹ کر میری طرف آئی پھر اضطراری لہجے میں اس نے کہا۔

''میرا فرمان رو رہا ہے۔ اس کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں دس پندرہ منٹ میں اسے کچھ کھلا پلا کر واپس آجاتی ہوں؟''

کسی ماں کو، اس کے روتے بلکتے بچے کے پاس جانے سے نہیں روکا جا سکتا اور خاص طور پر ان لمحات میں جب بچہ کچھ کھانے کی طلب محسوس کر کے بھوک سے رو رہا ہو، لہٰذا میں نے زاہدہ کو کمرے سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔

ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ زاہدہ نے نازو کے حوالے سے صفدر اور لاکھو کے غم و غصے اور دھمکیلے انداز کی جو تفصیل بیان کی تھی اس کی روشنی میں تو ذہن کی آنکھ انہی دو غنڈا عناصر کو دیکھنے پر مجبور تھی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ ہوتی کہ صفدر یا لاکھو نے..... یا ان دونوں نے مل کر ریاض اور فیاض کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہو!

میں نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور انہیں دیکھ کر یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ دورانِ قتل انہوں نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اپنی جان ہر انسان کو پیاری ہوتی ہے۔ ریاض اور فیاض کا ردِعمل سمجھ سے بالاتر تھا جو اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتا تھا کہ جب ان پر کلہاڑیاں برسائی جا رہی تھیں تو وہ دونوں ہوش وحواس سے بے گانہ تھے اور یہ ''بے گانگی'' عارضی بھی ہو سکتی تھی اور مستقل بھی!

تھوڑی دیر کے بعد زاہدہ اپنے بیٹے فرمان علی کو کھلا پلا کر واپس میرے پاس آگئی۔ باہر سے اب فرمان کے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ماں کی گود کی مخصوص حرارت میں شکم سیر ہونے کے بعد پرسکون ہو گیا ہے۔ میں نے زاہدہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''زاہدہ! دن چاہے کیسا بھی کیوں نہ ہو لیکن رات میں آج کل اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور کچھ اوڑھے بغیر سونا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ ایسے موسم میں وہ دونوں بھائی باڑے میں جا کر کیوں سوئے تھے اور وہ بھی کھلے آسمان میں..... اس طرح کہ انہوں نے کچھ اوڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی؟''

اس نے تحمل سے میری بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''پہلی بات تو یہ کہ وہ بغیر کچھ اوڑھے باڑے میں نہیں سوتے تھے۔ ان کی چارپائیوں پر سرہانوں کے علاوہ کھیس بھی رکھے ہوتے تھے اور جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکی، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار جی! آج کل شمشیر پور میں ڈھور ڈنگر کی چوری کے بڑے واقعات پیش آرہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، ادھر باڑے میں ہمارے اچھے خاصے مویشی بندھے ہوئے ہیں۔ پچھلے چند روز سے ریاض اور فیاض اپنے مال ڈنگر کی حفاظت کے لیے ادھر ہی سو رہے تھے۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے زاہدہ!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''لیکن جائے وقوعہ سے کھیس تو نہیں ملے۔ یہ حیرت والی بات نہیں کہ قاتل جاتے ہوئے ان کے کھیس بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے؟''

''بات تو واقعی بہت عجیب ہے جناب!'' وہ ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے، ان کی چارپائیوں پر کھیس رکھے تھے۔ میں ہی شام کے وقت ان کی چارپائیاں اور بستر وغیرہ بچھاتی ہوں اور پچھلی رات بھی میں نے ان کی چارپائیوں پر تکیے اور کھیس رکھے تھے۔ دونوں کھیس کیسے غائب ہو گئے، یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آرہی جی۔''

اس کے بعد وہ گمشدہ کھیسوں کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگی۔ زاہدہ کے مطابق، ان میں سے ایک کھیس چٹا سفید تھا جس کے دونوں سروں پر سرخ بارڈر بنا ہوا تھا جبکہ دوسرا کھیس کریم کلر کا تھا اور اس کا بارڈر ہرے رنگ کا تھا۔ زاہدہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے مجھے بتایا کہ جب صبح، اطلاع ملنے پر وہ باڑے کی طرف گئی تو واقعی بستروں پر گھیس موجود نہیں تھے لہٰذا اس نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کو ڈھانپنے کے لیے گھر سے دو چادریں لادی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ! رات کو سونے سے پہلے وہ دونوں باڑے کے بڑے دروازے کو اندر سے بند تو کرلیا کرتے تھے نا؟''

''ظاہر ہے جی، ورنہ پھر پہرے داری کا کیا فائدہ!'' وہ عام سے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''آج صبح باڑے کا بڑا دروازہ کھلا پایا گیا تھا جبھی منظور موچی نے گلی میں سے گزرتے ہوئے باڑے کے اندر وہ خونچکاں منظر دیکھ لیا۔ منظور سے یہ بات بشیر لوہار تک پہنچی اور پھر انہوں نے اس واقعے کے بارے میں تمہیں بتایا۔ اس کا مطلب ہے.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ قاتل خالصتاً ان دونوں بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی نیت سے وہاں پہنچا تھا۔ اگر وہ کوئی ڈنگر چور ہوتا تو باڑے سے مویشی غائب ہوجاتے اور وہ دونوں بھائی محفوظ رہتے۔ باڑے کی دیوار زیادہ اونچی نہیں۔ قاتل دیوار پھلانگ کر اندر آیا ہوگا اور ان کا کام تمام کرکے واپس چلا گیا۔ واپسی میں اس نے باڑے کا بڑا دروازہ استعمال کیا اور جاتے ہوئے وہ دروازے کو کھلا چھوڑ گیا.....!''

''ہاں جی، محسوس تو ایسا ہی ہورہا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی!''

''وہ کیا جی؟'' وہ جلدی سے مستفسر ہوئی۔

میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ! جب کسی انسان کو موت کے گھاٹ اتارا جارہا ہوتا ہے تو وہ آسانی سے جان دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی زندگی، اپنی جان بچانے کے لیے ہر قسم کی مزاحمت اور کوشش کرتا ہے، خاص طور پر جب حملہ آور کہلاڑی سے وار کررہا ہو لیکن ان دونوں بھائیوں کی لاشیں جتنے ''صبر وسکون'' سے پڑی ملی ہیں اس سے تو ظاہر ہوتا ہے انہوں نے قاتل کی منشا کے سامنے اف تک نہیں کی۔ اس صورتِ حال میں میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچنے پر مجبور ہے.....!''

میں لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا تو زاہدہ نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''تھانیدار جی! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''میرے اندازے کے مطابق.....!'' میں نے بدستور پرخیال انداز میں کہا۔ ''جس وقت قاتل ان دونوں بھائیوں پر کلہاڑی کے وار کررہا تھا تو وہ بے چارے کسی مزاحمت کے قابل ہی نہیں تھے۔''

''جی..... کیا مطلب ہے آپ کا؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سیدھا اور سادہ مطلب یہ ہے کہ ان لمحات میں ریاض اور فیاض کسی شے کے زیرِ اثر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے، وہ آخری درجے پر انٹا غفیل ہوچکے تھے۔''

''یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے جی؟'' اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ تو مجھے تم ہی بتاؤ گی؟''

میرا سوال سن کر وہ گھبرا گئی پھر بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''مم..... مجھے کیا پتا جی.....''

میں چند لمحات تک گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے استفسار نے اسے اچھا خاصا بے چین کردیا تھا۔ اس بے چینی میں پریشانی بھی شامل تھی۔ دراصل، لوگ پولیس کا سامنا کرتے ہوئے اکثر گھبرا جاتے ہیں اور کسی قتل کیس میں جب ان سے پوچھ گچھ کی جارہی ہو تو ان کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ میں نے بھی زاہدہ پروین کی موجودہ کیفیت کو اسی خانے میں فٹ کیا اور ذرا گھما پھرا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''زاہدہ!'' میں نے متحمل لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ، رات کو وہ کتنے بجے تک باڑے میں سونے کے لیے چلے جایا کرتے تھے؟''

''یہی..... کوئی نو بجے جی۔'' اس نے متذبذب لہجے میں جواب دیا۔

''اور صبح ان کی واپسی کتنے بجے ہوتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل تڑکے جناب۔'' اس نے بتایا۔ ''وہی واپس آکر مجھے جگایا کرتے تھے۔ آج اسی لیے میں دیر تک سوتی رہی کہ وہ اپنے وقت پر واپس نہیں آئے..... پھر دوسرے لوگوں نے دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے جگایا اور یہ خبر بھی دی کہ.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور دل گرفتہ انداز میں چپ ہوگئی۔

میں اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا لیکن میں نے خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ جب اس کی حالت قدرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنبھل گئی تو میں نے سوال کیا۔

''زاہدہ! کیا پچھلی رات بھی وہ نو بجے ہی سونے کے لیے باڑے میں گئے تھے؟''

''جی، جی ہاں۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ دونوں شام سے تھوڑی دیر پہلے کھیتوں سے واپس آجایا کرتے تھے۔ سب سے پہلے وہ بھینسوں کا دودھ نکالتے پھر تمام مویشیوں کو چارا وغیرہ کھلاتے اور اس کے بعد گھر کے اندر آجایا کرتے تھے۔ رات کے کھانے کے بعد، ہم سب میں تھوڑی بات چیت ہوتی اور لگ بھگ نو بجے وہ باڑے کی طرف چلے جاتے تھے۔''

''آپ لوگوں کی زمین کتنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دس کلے جناب۔''

''اس دس ایکڑ زمین پر وہ دونوں خود ہی کاشت کاری کرتے تھے یا انہوں نے اپنی مدد کے لیے کوئی ملازم وغیرہ بھی رکھا ہوا تھا؟''

''نہیں جی۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''کھیتی باڑی کا سارا کام وہ خود ہی کیا کرتے تھے۔''

''تم نے رات کو کھانے میں کیا پکایا تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دونوں بھائیوں کو ''کڑی چاول'' بہت پسند تھے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔ ''میں نے رات کو چاٹی والی لسی کی کڑی اور باسمتی کے چاول بنائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کھیر بھی تھی۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھایا اور پھر سونے کے لیے چلے گئے تھے.....!''

''کیا رات والے کھانے کا کچھ حصہ بچا ہوا ہے؟'' میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''کیوں جی!'' وہ متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ اس کا کیا کریں گے؟''

''کرنا کیا ہے زاہدہ.....!'' میں نے بدستور عام سے لہجے میں کہا۔ ''دراصل، کڑی چاول اور کھیر مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ سوچا تھا، تمہارے ہاتھ کا ذائقہ بھی چکھ لوں گا۔ ویسے بھی دن کے کھانے کا وقت ہے!''

موقع محل اور صورتِ حال کے پیشِ نظر میرے یہ خواہش اور پسندیدگی بھرے الفاظ انتہائی نامناسب تھے۔ ابھی ابھی اس گھر سے دو لاشیں اٹھا کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوائی گئی تھیں اور میں مقتولین کی ماں سے دوپہر کے کھانے کی بات کر رہا تھا۔ دراصل، یہ سب کچھ میں ایک خاص مقصد کی خاطر کر رہا تھا۔ عقل مند قارئین کا ذہن یقیناً میرے اس مقصد تک پہنچ گیا ہوگا۔

چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''اب تو جناب، کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ میں نے رات ہی کو ہنڈیا اور پتیلے دھو کر رکھ دیے تھے۔ ان دونوں کو کھانا اتنا پسند آیا تھا کہ وہ ایک پلیٹ ختم کرتے تو دوسری مانگتے.....!''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ دراصل، میں اس کھانے کا لیبارٹری ٹیسٹ کروانا چاہتا تھا جسے کھا کر وہ دونوں ایسی غفلت کی نیند سوئے تھے کہ انہیں اپنے ''اناللہ'' ہونے کی بھی مطلق خبر نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے زاہدہ سے پوچھا۔ ''کیا تم اس گاؤں میں اکیلی ہی رہتی ہو۔ تمہارے عزیز رشتے دار مجھے نظر نہیں آئے۔ باہر اور دوسرے کمروں میں جو عورتیں موجود ہیں وہ تمہاری رشتے دار تو نہیں لگتیں!''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ گاؤں کیا، اس سے باہر بھی دور دور تک میرا کوئی رشتے دار موجود نہیں.....بس، میرا ایک تایا کا بیٹا ہے جو ادھر جلال نگر میں رہتا ہے۔ میں نے اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے ایک بندے کو جلال نگر بھیجا تو ہے۔ اب دیکھیں، سلطان کب تک یہاں پہنچتا ہے!''

''سلطان تمہارے تایا زاد کا نام ہے؟'' میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے مزید پندرہ منٹ اس کے پاس گزار کر اسے مختلف ہدایات دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس عظیم سانحے پر اسے تسلی تشفی بھی دی۔ وہ اس ہمدردانہ رویے پر بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ بہت جلد ریاض اور فیاض کے قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا اور اس دوران میں اگر اسے کوئی اہم بات پتا چلے تو وہ فوراً مجھے بتائے۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایت کو ذہن میں رکھے گی۔

☆☆☆

میں زاہدہ کے گھر سے نکلا تو بشیر لوہار سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنی دکان کے سامنے کھڑا ایک ضعیف شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری جانب بڑھا اور اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! یہ اپنا منظورا ہے جی.....منظور مسیح!''

''اوہ.....!'' میں بے ساختہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منظور موچی کی عمر ساٹھ سے متجاوز دکھائی دیتی تھی۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے تمام تر بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک پستہ قامت اور اکہرے بدن کا مالک تھا۔ منظور نے سر پر ہلکی پھلکی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے سب سے پہلے ریاض اور فیاض کی کٹی پھٹی لاشوں کو باڑے کے اندر چارپائیوں پر پڑے دیکھا تھا۔ میں منظور موچی کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں، چاچا منظورے! مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ آج صبح تم نے باڑے کے اندر کیا دیکھا تھا؟''

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتانا شروع کیا کہ وہ صبح اس گلی سے گزرا تو باڑے کے کھلے ہوئے دروازے میں سے اس نے ایک خونچکاں منظر دیکھا۔ وہ روزانہ صبح ادھر سے گزر کر کھیتوں کی جانب جایا کرتا تھا لیکن پہلے جب بھی وہ باڑے کے قریب سے گزرا تو اس نے سب کچھ نارمل پایا۔ دروازہ تو کھلا ہوا ہی کرتا تھا مگر وہ دونوں بھائی سوئے ہوئے دکھائی نہیں دیتے تھے اور سوئے ہوئے بھی ایسے کہ..... خدا کی پناہ!

وہ یہاں تک بتانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں خوف زدگی کے آثار واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک جھرجھری بھی لی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''چاچا! کیا تمہیں پتا تھا کہ ریاض اور فیاض آج کل باڑے کے اندر سو رہے ہیں؟''

''جی سرکار! یہ بات تو پورے پنڈ کو پتا ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج کل اس علاقے میں ڈنگروں کی چوری کی بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔ جس کسی نے بھی مال مویشی پال رکھے ہیں، وہ ان کی حفاظت کے لیے پریشان ہے..... آپ اس علاقے کے تھانیدار ہیں۔ آپ کو تو سب پتا ہی ہے جناب۔''

یہ سچ ہے کہ مویشیوں کی چوری کے اِکّا دُکّا واقعات پیش آئے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے ''مویشی چوری'' کا سیزن ہی سمجھ لیا جائے۔ بہرحال، گاؤں دیہات میں کسی بھی ناخوشگوار واقعے کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ میں نے منظور موچی کی بات کے جواب میں کہا۔

''ہاں چاچا، سارے حالات میرے علم میں ہیں۔ میں جانتا ہوں، حالات اتنے خراب نہیں ہیں جتنا خوف و ہراس لوگوں میں پایا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں، موضع شمشیر پور میں تو ابھی تک ایک مرغی بھی چوری نہیں ہوئی۔ خیر.....!'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''چاچا! تم نے باڑے کے اندر دونوں بھائیوں کی خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں دیکھیں اور زاہدہ کو اس واقعے کے بارے میں بتانے کے لیے ادھر آئے اور بشیر سے تمہاری ملاقات ہو گئی۔ تم دونوں نے زاہدہ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، جائے وقوعہ پر تمہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی۔ مثلاً کوئی بھی ایسی شے جسے دیکھ کر تم چونک اٹھے ہو؟''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!'' وہ آنکھیں سکیڑ کر بولا۔ ''اس سے زیادہ غیر معمولی اور اہم بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ دو جوان بھائیوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا؟''

''میں تو کہتا ہوں، اس گھر کو کسی کی نظر کھا گئی ہے۔'' بشیر لوہار نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ابھی ایک سال پہلے ہی ان کا باپ فتح محمد خون تھوکتا ہوا مرا ہے اور اب یہ دونوں خون میں لت پت۔ پتا نہیں، خون کا یہ بہاؤ آگے چل کر کیا کیا تماشے دکھائے گا!''

خون تھوک کر واقع ہونے والی موت کو عموماً ٹی بی کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔ آج کل تو اس مرض کا بڑا آسان علاج دریافت ہو چکا ہے لیکن اُس زمانے میں اس موذی مرض کو بڑا ہی خطرناک اور ناقابلِ علاج مرض سمجھا جاتا تھا۔ ''ٹی بی'' درحقیقت موت ہی کا دوسرا نام تھا جو یک دم نہیں بلکہ دھیرے دھیرے آتی تھی۔

میں یہ تو جانتا تھا کہ کوئی سال بھر پہلے فتح محمد کا انتقال ہو گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی موت کا سبب کیا رہا تھا۔ میں نے بشیر لوہار کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا فتح محمد کو ٹی بی کا مرض لاحق تھا؟''

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں تھی جناب!''

''تم نے بتایا ہے نا، وہ خون تھوکتا ہوا مرا ہے۔'' میں نے استفسار کیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''وہ جناب..... بات دراصل یہ ہے کہ.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''فتح محمد کو کوئی ٹی بی، شی بی نہیں تھی۔ ساٹھ سال کی عمر میں بھی وہ اچھا خاصا صحت مند تھا۔ ٹی بی کا مریض تو آپ جانتے ہیں، صحت کے کون کون سے مسائل کا شکار رہتا ہے۔ خون تھوکنے کا مرحلہ تو بہت بعد میں آتا ہے، پہلے اس کی صحت کا کباڑا ہوتا ہے۔ چہرے پر مردنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھائی رہتی ہے، جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے.....''
وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''فتح محمد کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو ''ساٹھا پاٹھا'' کی مثال تھا جناب! یہی دیکھیں نا، پانچ چھ سال پہلے اس نے زاہدہ سے شادی کی اور پھر اگلے ہی سال ایک بیٹے کا باپ بھی بن گیا۔ ٹی بی کے مریض میں اتنی ہمت اور جرات کہاں ہوتی ہے۔ یہ مرض تو سب سے پہلے مریض کے اعتماد پر حملہ آور ہوتا ہے، اسے اپنی ذات پر بھی بھروسا نہیں رہتا۔ کجا یہ کہ.....!''
''یہ سب تو ٹھیک ہے بشیرے!'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''مجھے یقین آ گیا کہ تم نے ٹی بی پر بڑی ریسرچ کر رکھی ہے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ فتح محمد کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟''
''ٹی بی پر ریسرچ کرنے والی بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی ہے جناب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''دراصل، میرے خاندان میں دو تین اموات اس مرض کی وجہ سے ہو چکی ہیں جن میں ایک تو میرے والد صاحب تھے۔ مجھے اس مرض کے مریض کو بہت قریب سے دیکھنے، پرکھنے اور برتنے کا موقع ملا ہے اور جہاں تک فتح محمد کی موت کا تعلق ہے.....!''
وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''رات کو اچھا خاصا سویا تھا۔ آدھی رات کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بس..... کھانستا چلا گیا۔ دونوں بیٹے اور زاہدہ پریشان ہو گئے۔ ریاض میرے پاس آیا اور باپ کی کیفیت کے بارے میں بتایا۔ یہ لوگ میرے پڑوسی ہیں۔ میں فوراً ان کے ساتھ ہو لیا۔ فتح محمد کے پاس پہنچا تو اسے عجیب حالت میں پایا۔ وہ پیٹ کی تکلیف سے دُہرا ہوا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ درد زہ لیبر پین میں مبتلا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے کچھ سوچ پاتا، اس نے خون کی الٹی کر دی..... پھر ایک اور الٹی..... خون اس کے منہ سے ایسے جاری تھا جیسے اس کے پیٹ کا کوئی پھوڑا پھٹ گیا ہو یا جیسے کسی نے اسے اندر سے ذبح کر دیا ہو.....'' وہ دل شکستہ انداز میں متوقف ہوا پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔
''پھر اس نے دم دے دیا..... وہ خون تھوکتا تھوکتا مر گیا.....!''
''مجھے تو یہ کوئی کالے علم کا چکر لگتا ہے بشیرے!'' منظور موچی نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی میں نے یہی کہا تھا۔ اس دنیا میں بعض لوگ بڑے ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے انسانوں سے دشمنی نکالنے کے لیے کالے، پیلے ہر قسم کے علم کا سہارا لیتے ہیں اور پھر کالا جادو تو ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا نا!''
''میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گا منظورے۔'' بشیر لوہار نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ فتح محمد کا کوئی دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ایک بھلا مانس اور شریف آدمی تھا۔''
وہ دونوں فتح محمد کی موت پر، اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور میں ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس وقت میرے ذہن میں فتح محمد نہیں بلکہ اس کے دو جوان بیٹوں کی المناک موت کے مناظر چل رہے تھے اور ان کے قاتل کے سلسلے میں ابھی تک کوئی اشارہ نہیں مل سکا تھا۔ زاہدہ نے نازو اور صفدر کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا وہ بہت اہم تھا لہٰذا میں نے اس معاملے کی تصدیق کے لیے بشیر لوہار سے پوچھ لیا۔
''میں نے سنا ہے، ریاض کا کسی نازو نامی لڑکی سے کوئی چکر بھی چل رہا تھا؟''
میرے استفسار کا انداز بڑا پُراسرار اور رازدارانہ تھا۔ بشیرے اور منظورے نے بہ یک وقت چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان کے چہروں اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی سنسنی خیزی پائی جاتی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں بشیر لوہار نے بتایا۔
''جناب! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ شمشیر پور میں ''ہیر رانجھا'' کی یہ کہانی واقعی چل رہی تھی۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ریاض اور نازو دنیا والوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔''
''ہوں.....!'' میں نے ایک گمبھیر سانس خارج کی اور کہا۔ ''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ نازو کا بھائی صفدر کوئی اچھا آدمی نہیں۔ اسے بدمعاشی اور غنڈہ گردی کا بڑا شوق ہے..... بلکہ گاؤں سے باہر بھی ایسے ہی غنڈا عناصر سے اس کے بڑے گہرے اور دوستانہ تعلقات ہیں مثلاً لاکھو بدمعاش..... جو موضع چیاں والی میں رہتا ہے؟''
''جی ہاں، حقیقت تو یہی ہے۔'' انہوں نے بہ یک زبان ہو کر کہا۔
''ماشاءاللہ! آپ دونوں بڑے سمجھدار اور تجربہ کار انسان ہو۔'' میں نے باری باری بشیرے اور منظورے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ لوگوں کی ساری زندگی شمشیر پور میں گزری ہے۔ یہاں کی آب وہوا اور ایک ایک انسان کے مزاج سے گہری واقفیت ہے آپ کو۔ آپ کو کیا لگتا ہے.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا۔

''ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ صفدر نے اپنی بہن نازو کا سارا غصہ ادھر ہی اتار دیا ہو۔'' میں نے انگلی سے باڑے کی سمت اشارہ کیا اور کہا۔ ''کچھ دن پہلے صفدر اور ان دونوں بھائیوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی اور ہاتھا پائی بھی ہوچکی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ صفدر نے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی تھیں..... اس دُہرے قتل کی واردات میں صفدر کا بھی تو ہاتھ ہوسکتا ہے؟''

''ہاں، ایسا ہوتو سکتا ہے مگر.....!'' بشیر لوہار کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''مگر کیا بشیرے؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میرے علم کے مطابق، صفدر تو کل صبح سے کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ گاؤں میں موجود نہیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ گاؤں میں ہے یا گاؤں سے باہر۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''وہ کہاں گیا ہوا ہے؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب!'' وہ بے بسی سے بولا۔

منظور موچی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''پتر تھانیدارا! آپ ایسا کرو کہ صفدر کے گھر جا کر پتا کرو۔ اس کی بوڑھی والدہ اور بہن گھر پر ہی ہیں۔ صفدر کے بارے میں وہی کوئی صحیح بات بتا سکتی ہیں۔''

''ہاں جی.....'' بشیر لوہار نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''منظورا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ صفدر کے گھر سے کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی ہے۔''

میں نے مزید دو چار سوالات کر کے انہیں فارغ کر دیا اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے، میں نے ان سے صفدر کے گھر کی لوکیشن بھی معلوم کر لی۔ جب میں جانے لگا تو بشیر لوہار نے مجھ سے پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! باڑے پر آپ نے جو تالا لگایا ہے اس کی چابی آپ کے پاس ہے اور آپ جانتے ہیں، وہاں نصف درجن سے زیادہ جانور بندھے ہوئے ہیں۔ اس واردات کے ہنگامے کی وجہ سے پتا نہیں، انہیں صبح بھی کچھ کھانے کو دیا گیا ہے یا نہیں اور آگے شام بھی آنے والی ہے.....!''

اس نے ایک اہم نکتے کی طرف میری توجہ دلائی تھی۔ میں نے اس خیال سے باڑے کو لاک کر دیا تھا کہ اگر کسی کھوجی کی مدد سے قاتل کا سراغ لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو آسانی رہے لیکن زاہدہ کی زبانی صفدر اور ناز و والا جو معاملہ مجھ تک پہنچا تھا اس کی روشنی میں کھوجی سے زیادہ صفدر اور لاکھو پر ''توجہ'' دینے کی ضرورت تھی۔ محض کھوجی کے کام کے لیے نصف درجن جانوروں کو بھوکا پیاسا نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا فیصلہ بدلنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

میں نے اپنی جیب میں سے، باڑے پر لگے ہوئے تالے کی چابی نکالی اور اسے بشیر لوہار کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ وہاں پر موجود جانوروں کو صبح شام چارا اور پانی دینا تمہاری ذمے داری ہے اور ہاں.....'' میں نے لمحے بھر کے لیے توقف کیا پھر تسلی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''چوری چکاری کا خیال دل سے نکال دو۔ تمہیں رات کو باڑے کی نگرانی یا خفیہ حفاظت کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس، سونے سے پہلے تالا وغیرہ چیک کر لیا کرنا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اگر زاہدہ نے اس بات پر کوئی اعتراض کیا تو میں کیا کہوں گا؟''

''تم کہہ دینا کہ یہ ڈیوٹی میں نے تمہارے سپرد کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے مجھے نہیں امید کہ زاہدہ کو تمہارے اس عمل پر کوئی اعتراض ہو۔ وہ اس وقت ایک مصیبت میں گھری ہوئی ہے۔ اسے آپ لوگوں کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔ اس کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار تو ہے نہیں۔ گاؤں کے لوگ ہی اس کے رشتے دار ہیں اور پھر..... تم تو اس کے پڑوسی بھی ہو۔ تمہارا اس سے زیادہ حق بنتا ہے۔ مجھے یقین ہے، تمہارے اس تعاون پر وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گی۔ اور بالفرض محال.....'' میں نے بات نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اس نے تمہیں منع کیا یا تمہاری پرخلوص کوشش پر کوئی اعتراض کیا تو تم اس سے کوئی ضد بحث نہ کرنا، خاموشی کے ساتھ باڑے کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دینا۔''

''ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے میرے ذہن سے ایک بوجھ اتار دیا ہے۔''

''بوجھ ذہن پر ہو یا دل پر، یہ بڑی خرابی پیدا کرتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہارا ذہن اس معاملے میں ہلکا پھلکا ہوگیا ہے تو میں چلتا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منظور موچی نے پیشکش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''تھانیدار جی! میں اسی طرف جارہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو صفدر کے گھر تک پہنچا دیتا ہوں۔''

میں خاموشی سے منظور کے ساتھ ہولیا۔

☆☆☆

شام کے سائے پھیلنا شروع ہوگئے تھے۔ میں اس وقت کانسٹیبل ارشد کے ساتھ ایک تانگے میں بیٹھ کر موضع چیاں والی جارہا تھا۔ ہم چند منٹ بعد اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے۔ میرے تھانے سے چیاں والی اور شمشیر پور کا فاصلہ لگ بھگ ایک جیسا تھا، بس سمت کا فرق تھا۔ شمشیر پور تھانے سے جنوب میں اور چیاں والی جنوب مغرب میں واقع تھا۔ جبکہ یہ دونوں گاؤں آپس میں صرف دو میل کی دوری پر تھے۔ چیاں والی جانے کا مقصد تھا، صفدر اور لاکھو سے ملاقات کرنا!

دوپہر کے وقت میں صفدر کے گھر گیا تھا اور اس کی ماں سے ملاقات ہوگئی تھی۔ بوڑھی کریماں بی بی ہی نے مجھے بتایا کہ صفدر اپنے دوست سے ملنے چیاں والی گیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا، کیا اس کے دوست کا نام لاکھو ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ وہ نازو اور ریاض والے ''معاملے'' کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ دُہرے قتل والی واردات کی خبر اس تک پہنچ گئی تھی اور اسے اس واقعے کا بڑا دکھ تھا۔

میں نے نازو سے بھی علیحدگی میں بات کی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے اور ریاض کے تعلق سے انکار کرتی رہی۔ جب میں نے سخت رویہ اختیار کیا اور کہا کہ میرے پاس اس معاملے کے عینی شاہد بھی ہیں۔ اگر اس نے غلط بیانی کی تو میں تفتیش کے لیے اسے تھانے بھی بلا سکتا ہوں، پھر گواہوں کے ساتھ اسے عدالت کے حوالے کردوں گا۔ اس طرح اس کی جو رسوائی ہوگی اس کے بارے میں اچھی طرح سوچ لے!

وہ میری اس دھمکی سے خوفزدہ ہوگئی اور بڑی شرافت سے اس نے اقرار کرلیا کہ وہ ریاض کو پسند کرتی تھی اور یہ کہ وہ چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ میں نے جب اس امکان کی جانب اس کی توجہ دلائی کہ ان دونوں بھائیوں کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے میں صفدر کا ہاتھ ہوسکتا ہے تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا۔

''نہیں تھانیدار جی! میرا بھائی چھوٹی موٹی غنڈا گردی تو کرتا ہے لیکن وہ کسی کے خون میں ہاتھ نہیں رنگ سکتا..... صفدر قاتل نہیں ہے جی۔''

''پچھلے دنوں اس کا دونوں بھائیوں سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا تھا۔'' میں نے اس کی افسردہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور صفدر نے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔ اس بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''مجھے اس کے بارے میں ریاض نے بتایا تھا جی۔''

وہ غمزدہ انداز میں بولی۔ ''اور میں نے اس سے کہا تھا، وہ زیادہ پریشان نہ ہو..... وہ جی، دراصل صفدر غصے کا بڑا تیز ہے، بہت جلدی جوش میں آجاتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہم نے یہی طے کیا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے ملنا چھوڑ دیں۔ آٹھ دس دن سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی اور آج صبح سنا کہ.....'' بولتے بولتے نازو کی آواز رندھ گئی اور وہ خاموش ہوگئی۔

اس کے انداز اور تاثرات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ واقعی مقتول ریاض کو چاہتی تھی کیونکہ جذبات اور احساسات کبھی ''غلط بیانی'' سے کام نہیں لیتے۔ میں چند لمحات تک اس مغموم حسینہ کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جو لوگ بڑے جوشیلے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے غصے پر قابو نہیں ہوتا، ان سے کسی بات کی بھی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے صفدر کی ذات شک سے بالا تر نہیں ہوسکتی۔''

''آپ چاہے کچھ بھی کہیں جی پر میرا دل نہیں مانتا کہ صفدر نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہوگا۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ''وہ غنڈا بدمعاش تو ہوسکتا ہے مگر قاتل نہیں۔ وہ ساری غصے والی باتیں اس نے ریاض کو ڈرانے کے لیے کی تھیں تاکہ وہ مجھ سے ملنا چھوڑ دے..... وہ تو دنیا ہی چھوڑ کر چلا گیا.....!'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔

نازو کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ زاہدہ نے اس کے حسن کی بے جا تعریف کی تھی اور نہ ہی ریاض عقل کا اندھا تھا۔ نازو بنی بنائی موم کی گڑیا تھی۔ ہر دیکھنے والا اسے پانے کی تمنا کرسکتا تھا۔ وہ کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی۔

اس کی کیفیت قدرے بحال ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''تمہاری ماں نے بتایا ہے کہ صفدر کل سے چیاں والی گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟''

''وہ اپنی مرضی کا مالک ہے جی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''نہ تو کہیں جاتے ہوئے کسی سے پوچھتا ہے اور نہ ہی واپسی کے بارے میں کچھ بتا کر جاتا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ اس سے پہلے بھی تو چیاں والی جاتا رہتا ہے نا؟''

''جی، وہ اکثر وہاں جاتا رہتا ہے۔'' نازو نے جواب دیا۔

''عموماً اس کی واپسی کتنے دن کے بعد ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی ایک دن، کبھی دو دن اور کبھی تین چار دن.....!''

اس کا جواب ایسا ہی تھا جیسے بغیر سر پیر کے کوئی کہانی۔ میں نے پھر اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے گھر سے نکل آیا تھا۔

''اگر وہ آج کسی وقت واپس لوٹ آئے تو اس سے کہنا، نور اتھانے آکر مجھ سے ملاقات کرے۔ ٹھیک ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلا نے پر اکتفا کیا تھا۔

میں شمشیر پور سے تھانے آیا۔ حوالدار حنیف باجوہ کو سختی سے ہدایت کی کہ اگر میری غیر موجودگی میں صفدر تھانے آئے تو وہ اسے ''بٹھا'' لے۔ میں رات کو کسی بھی وقت چیاں والی سے لوٹ آؤں گا۔

حنیف باجوہ نے کہا تھا۔ ''ملک صاحب! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں صفدر کو تھانے میں ایسا ''بٹھاؤں'' گا کہ آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔''

اور..... میں واقعی بے فکر ہو کر کانسٹیبل ارشد علی کے ہمراہ چیاں والی کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

ہم مغرب کی اذان سے چند منٹ پہلے چیاں والی پہنچ گئے۔ چیاں والی، شمشیر پور کی بہ نسبت ایک چھوٹا گاؤں تھا حالانکہ شمشیر پور کا شمار بھی بڑے گاؤں میں نہیں ہوتا تھا۔ اس گاؤں میں اسی نوے گھر آباد تھے جب کہ چیاں والی کا حال یہ تھا کہ وہاں بہ مشکل پچاس مکان ہوں گے۔

یہ چیاں والی آنے کا میرا پہلا اتفاق تھا لہٰذا پوچھتے پاچھتے ہم لاکھو کے گھر تک پہنچ ہی گئے۔ وہ اپنے گھر پر اکیلا ہی رہتا تھا اور اس کا یہ گھر ڈیرا کہلاتا تھا۔ لاکھو کا مذکورہ ڈیرا گاؤں کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اس سے آگے سرسبز کھیتوں کا وسیع و عریض سلسلہ تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔

ہمارا تانگا لاکھو کے ڈیرے کے سامنے جا رکا۔ میں اور ارشد علی تانگے سے اترے اور ڈیرے کے گیٹ پر پہنچ گئے۔

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی گیٹ پر دستک دیتا، گیٹ کھلا اور وہاں ایک چہرہ نمودار ہوا۔ وہ کوئی ملازم صورت شخص تھا۔ ہم پر نظر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا لیکن ابھی اتنی تاریکی بھی نہیں چھائی تھی کہ وہ ہمیں پولیس یونیفارم میں نہ دیکھ سکتا۔

پولیس کی وردی کا ایک اپنا رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ ہمیں دروازے کے سامنے پایا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''اوئے پولیس، اتنی جلدی..... ایک دن پہلے ہی.....''

اتنا کہتے ہی اس نے جلدی سے گیٹ بند کرنا چاہا لیکن اس وقت تک میں ایکشن میں آچکا تھا۔ میں نے ایک عقابی جھپٹا مارا اور اس شخص کے اوپر جا گرا۔ وہ شاید مجھ سے ایسی تیزی اور مستعدی کی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے بوکھلا کر گیٹ بند کرنا بھول گیا اور اندر کی جانب دوڑ لگانے کی کوشش کی۔

میں بھلا اس کی کوشش کو کیسے کامیاب ہونے دیتا۔ میں نے اسے من مانی کرنے کے لیے تو جھپٹا نہیں مارا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ڈیرے کے اندرونی حصے میں آگئے۔ اس دوران میں کانسٹیبل ارشد علی نے موقع محل کی مناسبت سے پھرتی دکھائی اور ڈیرے کے گیٹ کو اندر سے بند کر دیا۔

وہ ڈیرا دو کمروں اور ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ ہم اس وقت صحن کے ابتدائی حصے میں تھے جو نسبتاً گیٹ سے زیادہ قریب تھا۔ میری اور اس شخص کی نبرد آزمائی سے کچھ ایسی آوازیں پیدا ہوئی تھیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً یہ آوازیں ڈیرے کے اندرونی کمروں تک بھی پہنچی تھیں، تبھی ادھر سے ایک بھاری بھرکم سی استفسار یہ آواز ابھری ''بخشو! کون ہے باہر؟''

''بخشو'' یقیناً اسی شخص کا نام تھا جسے میں نے اپنی بغل میں دبوچ رکھا تھا۔ اس کے لیے تو آسانی سے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا، وہ کسی کے سوال کا کیا جواب دیتا۔ میں نے بڑی سرعت سے بخشو کو ارشد کے حوالے کیا اور کمروں کی سمت بڑھ گیا۔ میری تمام تر توجہ اس کمرے کی جانب تھی جدھر سے بھاری بھرکم آواز میں بخشو کو پکارا گیا تھا۔ مجھے ارشد کے مضبوط و توانا بازوؤں سے قطعی امید تھی کہ وہ بخشو کی قوت گویائی کو مسلسل بریک لگائے رہیں گے۔

میں نے اندرونی کمرے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اپنا سروس ریوالور نکال کر ہاتھ میں کر لیا تھا۔ جب باہر سے بخشو نے کوئی جواب نہیں دیا تو پکارنے والا صورتِ حال جاننے کے لیے کمرے سے نکل آیا۔ میں اس وقت کمرے کے دروازے کے قریب ہی ایک دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ وہ شخص مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا جب کہ میری نگاہ اسی پر لگی ہوئی تھی۔

وہ بھاری تن و توش کا مالک ایک، حد سے زیادہ صحت مند شخص تھا۔ دراز قامتی نے اس کے ڈیل ڈول کی ہیبت ناکی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق، اس ڈیرے پر دو افراد کو ہونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہیے تھا۔ نمبر ایک لاکھو، نمبر دو صفدر..... میں نے ان دونوں میں سے کبھی کسی کو دیکھا نہیں تھا۔ ڈیرے کے گیٹ پر جس بندے سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی وہ یقینی طور پر بخشو تھا کیونکہ اسے اسی نام سے پکارا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ گینڈ ایا تو صفدر تھا اور یا پھر وہ لاکھو تھا!

مذکورہ جناتی شخص نے کمرے سے باہر آ کر گیٹ کی سمت نگاہ دوڑائی جہاں ارشد نے بخشو کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ شخص دو قدم مزید آگے بڑھا اور الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''بخشو! تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے۔ گیٹ کے پاس کیا معاملہ ہو گیا ہے..... تم تو تانگے کا انتظام کرنے گئے تھے اور.....''

اسی لمحے کمرے کے اندر سے ایک اور مردانہ سوالیہ آواز ابھری۔ ''لاکھو! کیا مسئلہ ہے یار۔ تم بار بار بخشو کو کیوں آواز دے رہے ہو۔ کیا کوئی پھڈا ہو گیا ہے؟''

اس استفسار نے میرے ذہن کی الجھن کو سلجھن میں بدل دیا۔ اگر وہ گینڈ الاکھو تھا تو کمرے کے اندر موجود شخص یقیناً صفدر رہا ہوگا یعنی میرے دونوں مطلوبہ شخص میرے آس پاس ہی تھے۔ اس احساس نے میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑا دی۔

اس سے پہلے کہ گینڈ ابدن لاکھو، صفدر کے سوال کے جواب میں کچھ کہتا، میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اندھیرے میں سے نکل کر اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا پھر غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لاکھو! کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔''

''تت..... تم کون ہو؟'' وہ ہکلایا۔

میں چونکہ اس کی پشت پر موجود تھا اس لیے وہ مجھے دیکھ نہیں پا رہا تھا اور اس نادیدگی کو تاریکی کا تعاون بھی حاصل تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لاکھو! میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ اتنا تعارف کافی ہے یا.....؟''

میں نے دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''اوہ..... تھانیدار صاحب.....!'' اتنا کہتے ہی وہ بڑے رضا کارانہ اور پرسکون انداز میں ''ہینڈز اپ'' ہو گیا۔

لاکھو کی جانب سے شرافت کے اس مظاہرے نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ دراصل، ان لمحات میں، میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ جب گیٹ پر مجھے بخشو کی صورت دکھائی دی تھی تو اسے میں نے یہ کہتے ہوئے سنا تھا..... ''اوئے، پولیس۔ اتنی جلدی..... ایک دن پہلے ہی!'' اس کے بعد جب لاکھو کمرے میں سے باہر نکل کر بخشو کو پکار رہا تھا تو اس کے منہ سے یہ نکلا تھا۔ ''بخشو! تم تو تانگے کا انتظام کرنے گئے تھے اور.....!''

ان دو افراد کے دو جملوں کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ اس ڈیرے پر بیٹھ کر کسی واردات کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور یہ واردات آج رات کسی وقت وہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس صورت میں ضروری تھا کہ پولیس کا پتا چلتے ہی لاکھو وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتا جبکہ اس کے برعکس وہ بڑے صبر و سکون کا مظاہرہ کر رہا تھا..... اور یہی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی!

میں نے تحکمانہ انداز میں لاکھو سے پوچھا۔ ''کیا صفدر کمرے کے اندر موجود ہے؟''

''جی ہاں، وہ اندر ہی ہے۔'' اس نے بڑی فرماں برداری سے جواب دیا۔

''اور کون کون ہے اندر؟'' میں نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''کوئی نہیں جناب..... ہم تینوں کے سوا اس ڈیرے پر کوئی چوتھا شخص موجود نہیں۔''

میں نے اس کی تسلی اور اپنی آسانی کے لیے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لاکھو! اگر اس وقت تم کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہو تو تمہیں ڈرنے یا پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں ایک خاص حوالے سے معمول کی پوچھ گچھ کرنے آیا ہوں۔ تم کمرے کے اندر چلو۔''

پھر میں نے صحن کی طرف منہ اٹھا کر ارشد علی کو مخاطب کیا اور بہ آواز بلند کہا۔ ''ارشد! حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ تم بخشو کو گرفت میں لے لو۔ اس کا انٹرویو ہم بعد میں کریں گے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے لاکھو کو ٹہوکا دیا جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اب اسے میرے حکم کے مطابق صفدر کے پاس کمرے کے اندر چلنا چاہیے۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

میں اس کے عقب میں رہتے ہوئے کمرے کے اندر آ گیا۔ اندر لالٹین روشن تھی اور اس کی روشنی میں مجھے صفدر بھی نظر آ گیا۔ صفدر، لاکھو کی بہ نسبت خاصا ''اسمارٹ'' تھا۔ اس نے اپنے ساتھی لاکھو کو گن پوائنٹ پر دیکھا تو گھبرا گیا۔ ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن دروازے میں موجود ہونے کی وجہ سے میں نے چونکہ فرار کی راہ مسدود کر رکھی تھی لہٰذا اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے لاکھو کو ایک ''مناسب'' سا دھکا دیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم ادھر جا کر صفدر کے ساتھ بیٹھو!''

اس کے لیے میرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

مذکورہ کمرے میں پہلو بہ پہلو دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک آہنی کرسی بھی رکھی نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک چارپائی پر جڑ کر بیٹھ گئے اور میں نے آہنی کرسی سنبھال لی پھر اس سے پہلے کہ میں پوچھ گچھ کا آغاز کرتا، لاکھو نے متذبذب لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

''ملک صاحب! آپ یہاں..... اور اچانک! خیریت تو ہے نا؟''

''پولیس اور خیریت کی آپس میں بڑی پرانی دشمنی ہے لاکھو!'' میں نے اس کی آنکھوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''جہاں خیریت ہوتی ہے، وہاں پولیس دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔''

''تو..... کیا چیاں والی میں کوئی سنگین واردات ہوگئی ہے؟'' اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ہاں..... واردات تو ہوئی ہے لیکن چیاں والی میں نہیں بلکہ اُدھر شمشیر پور میں۔'' میں نے صفدر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا..... کیا ہوگیا ہے وہاں.....؟'' صفدر اضطراری انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''یہ بھی تم مجھی سے پوچھو گے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں تو اس بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے!''

اس دوران میں، میں صفدر اور لاکھو، خصوصاً صفدر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ لالٹین کی روشنی اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھی مگر میرے مقصد میں کسی قسم کی کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ان دونوں کے چہروں کی کیفیت مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔

میرے کٹیلے استفسار پر صفدر نے متذبذب انداز میں لاکھو کی جانب دیکھا۔ تاثر ایسا ہی تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جواباً لاکھو نے چہرے کے تاثرات سے اپنی بے خبری اور لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ صفدر دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب!'' اس کے لہجے میں ہلکا سا احتجاج بھی شامل تھا۔ ''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کس واقعے کی بات کر رہے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا، وہاں شمشیر پور میں کیا ہوگیا ہے۔ میں تو کل صبح سے یہاں لاکھو کے پاس آیا ہوا ہوں۔ میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ لاکھو سے پوچھ سکتے ہیں۔''

''ملک صاحب!'' میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی لاکھو نے کہا۔ ''صفدر غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ یہ واقعی کل میرے پاس آیا تھا۔''

''نہ تو صفدر غلط بیانی کر رہا ہے اور نہ ہی کریماں بی بی اور ناز و نے مجھ سے کوئی جھوٹ بولا ہے۔'' میں نے تحمل بھرے انداز میں کہا۔ ''صفدر واقعی کل صبح شمشیر پور سے چیاں والی آیا تھا اور اس وقت بھی یہاں موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''.....وہ پچھلی رات کو تھوڑی دیر کے لیے شمشیر پور نہ گیا ہو..... اکیلا یا تمہارے ساتھ لاکھو..... آخر شمشیر پور یہاں سے دور ہی کتنا ہے؟''

''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں ملک صاحب!'' لاکھو نے قدرے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ پچھلی پوری رات یہ میرے ساتھ اسی ڈیرے پر تھا۔ اگر کسی نے اس کے نام پر اُدھر شمشیر پور میں کوئی واردات کر دی ہے تو اس میں صفدر بے چارے کا کیا قصور ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ شمشیر پور میں ہوا کیا ہے؟''

''وہاں پچھلی رات دہرے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات ہوگئی ہے!'' میں نے دھماکا کرنے والے انداز میں کہا۔ ''دو گبرو بھائیوں کا بہیمانہ قتل!''

''قتل کی واردات.....؟'' انہوں نے بہ یک وقت بہ یک زبان ہو کر کہا۔

میں نے انہیں گھورتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

صفدر نے ہیجانی انداز میں دریافت کیا۔ ''آپ قتل ہونے والے کن دو بھائیوں کا ذکر کر رہے ہیں تھانیدار صاحب؟''

''ریاض اور فیاض کی بات کر رہا ہوں!'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''اوہ.....!'' اس کے ہونٹوں سے ایک مایوس اور متاسفانہ آواز نکلی۔ ''انہیں کس نے قتل کر دیا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ان کے قاتل کی تلاش ہی میں تو میں شمشیر پور سے چیاں والی پہنچا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو..... آپ کا مطلب ہے، ان دونوں بھائیوں کا قاتل یہاں چیاں والی میں چھپا ہوا ہے؟'' لاکھو نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آثار اور اشارے تو ایسے ہی ملے ہیں.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے میں قاتل کے تعاقب میں یہاں پہنچا ہوں۔''

''لیکن قاتل ہے کون؟'' لاکھو کے استفسار میں احتجاج شامل تھا۔

میں نے بدستور مضبوط لہجے میں کہا۔ ''یہ تو تم دونوں ہی بتاؤ گے!''

''ہم دونوں کیوں؟'' لاکھو کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔

میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ ریاض اور فیاض کا قاتل تم دونوں کے اندر چھپا ہوا ہے۔ یا تو تم قاتل ہو!'' میں نے انگلی سے صفدر کی جانب اشارہ کیا پھر لاکھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یا تم نے ان دونوں بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔'' میں نے سنسنی خیز انداز میں توقف کیا پھر کہا۔

''یا پھر تم دونوں نے مل کر یہ کارنامہ انجام دیا ہے!''

''آپ..... آپ کس بنا پر یہ بات کر رہے ہیں.....؟''

''میرے پاس اس بات کو کہنے کے لیے بڑی مضبوط بنیاد ہے!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا پھر بڑے واشگاف الفاظ میں اپنے دعوے کی وضاحت کر دی۔

وہ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری بات سن رہے تھے۔ میں انہیں ریاض اور صفدر کی بہن نازو والے معاملے سے آگاہ کر رہا تھا پھر اس جھگڑے کا ذکر بھی آیا جو صفدر نے دونوں مقتولین سے، ان کی موت سے چند روز قبل کیا تھا۔ میں نے اس ذیل میں صفدر کی خطرناک دھمکیوں کا بھی ذکر کیا اور آخر میں کہا۔

''آپ لوگوں کو اس ''بنیاد'' میں کوئی کمی یا کمزوری نظر آ رہی ہے؟''

وہ دونوں الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''صفدر! تمہاری دھمکی کے چند روز بعد وہ دونوں بھائی بڑے وحشیانہ انداز میں قتل کر دیے گئے۔ اب اگر میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا تمہارے دوست لاکھو کے ڈیرے پر آ گیا ہوں تو اس میں، میں کہاں غلطی پر ہوں؟''

وہ اچانک ہی پھٹ پڑا۔ ''تھانیدار صاحب! آپ صفدر حیات ہیں اور میں صفدر حسین..... ہم دونوں کے نام میں ایک ہی ترتیب سے ص اور ح آتا ہے۔ آپ اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر ایک بات بتائیں.....؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیا پوچھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

''ہاں پوچھو.....!''

اس نے پوچھا۔ ''اگر کوئی لفنگا آپ کی بہن کو ورغلا رہا ہو، اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھا رہا ہو تو آپ کیا کریں گے؟''

''ورغلا رہا ہو یا اس سے محبت کر رہا ہو؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''کچھ بھی سمجھ لیں.....!''

''کچھ بھی سمجھنے سے بات نہیں بنتی صفدر حسین۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ طے کرنا ضروری ہے کہ اس شخص کا میری بہن کے ساتھ کس نوعیت کا تعلق ہے۔ کسی سے محبت کرنے یا اس کو ورغلانے میں بڑا فرق ہوتا ہے اور.....'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے کسی شخص کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''لفنگا'' کہا ہے۔ میں یہ دیکھنا بھی ضروری سمجھوں گا کہ وہ لفنگا ہے یا کوئی شریف النفس اور معقول انسان ہے میرے خیال میں ریاض کو لفنگا کہنا درست بات نہیں ہوگی!''

اس نے نگاہ چرانے والے انداز میں کہا۔ ''چلیں، آپ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے بتائیں کہ آپ اس صورت میں کیا کریں گے؟''

''دیکھو صفدر حسین!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''اگر کوئی معقول شخص میری بہن سے محبت کر رہا ہو اور میں یہ بھی دیکھوں کہ میری بہن بھی اس سے محبت کرتی ہے تو میں ان کی مدد کروں گا۔ ان سے کہوں گا کہ وہ چھپ چھپ کر کھیتوں میں نہ ملا کریں۔ میں ان کے مستقل ملاپ کی کوئی سبیل نکالوں گا مگر تمہاری طرح.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سلگتے ہوئے انداز میں کہا۔

''تمہاری طرح میں اس لڑکے کو بیچ راہ روک کر اس کی پٹائی کروں گا، نہ ہی اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دوں گا اور نہ ہی.....''

میں نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا پھر کہا۔ ''اور نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہی اسے اس کے بھائی سمیت، رات کو سوتے میں کلہاڑی کے وار کر کے.....!''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا.....'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلا کر بولا۔ ''بلکہ ہم نے تو اس کے لیے کچھ اور ہی.....!''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا، انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو یا پھر یہ کہ اسے احساس ہو گیا ہو کہ اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے، کوئی ایسی بات جو اسے کسی بڑی مصیبت میں پھنسا سکتی ہو!

اس موقع پر صفدر کے یارِ غار لاکھو نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس نے بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''صفدر! کیا خیال ہے..... تھانیدار صاحب کو حقیقت بتا دیں؟''

صفدر نے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر لاکھو سے کہا۔ ''ہاں، تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ اگر اب بھی ہم نے اپنی زبانیں بند رکھیں تو یہ مجھے ان دونوں بھائیوں کا قاتل سمجھتے رہیں گے۔''

''تو بتاؤ..... تم شروع کر رہے ہو یا میں سناؤں انہیں تمہاری کہانی؟'' لاکھو نے صفدر حسین سے پوچھا۔

''یار! تم ہی بتا دو۔'' وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا۔ ہم یہاں کچھ اور ہی منصوبہ بنا رہے تھے اور انہوں نے آ کر سارا کام خراب کر دیا ہے۔''

میں نے لاکھو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لاکھو! تم لوگوں کو جو کچھ بھی کہنا ہے، سادہ اور آسان الفاظ میں کہہ ڈالو۔ میں یہاں تمہارے قصے اور کہانیاں نہیں سننے آیا ہوں۔ ادھر تھانے میں مجھے اور بھی بہت سارے کام ہیں۔''

''جی.....!'' لاکھو نے ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی پھر اس سے پہلے کہ وہ بیان شروع کرتا، باہر ارشد علی کی آواز بلند ہوئی۔

وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ''ملک صاحب! یہ بندہ تو پوری طرح میرے قابو میں ہے لیکن کبھی کبھی تنگ کرنے لگتا ہے۔ یہاں اچھا خاصا اندھیرا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اسے کمرے کے اندر لے آتا ہوں ورنہ اس کی کسی چالاکی کے جواب میں اگر میں نے اپنے ہاتھوں کو بے سمت حرکت دے دی تو اس کی گردن کا کڑاکا نکل جائے گا۔''

''ارشد! بخشو کا منکا نہیں توڑنا۔ ابھی اس کا بیان بھی لینا ہے۔'' میں نے جواباً بہ آواز بلند کہا۔ ''اندر سب خیریت ہے، لے آؤ اسے بھی۔''

پھر میں دوبارہ لاکھو گینڈے کی طرف متوجہ ہو گیا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہاں بھئی! تم کیا بتانے والے تھے..... شروع ہو جاؤ۔ شاباش!''

اور وہ شروع ہو گیا۔ ''میں آپ سے یہ کہہ رہا تھا، تھانیدار صاحب..... کہ صفدر نے مجھے اپنی بہن اور ریاض کے چکر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے سمجھانے بجھانے کا جب کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے مجھ سے کہا کہ اس گدھے کے بچے کو تھوڑا سبق سکھانا چاہیے۔ اسی سلسلے میں یہ کل میرے پاس آیا تھا۔ ہم دونوں مل کر ریاض کا دماغ درست کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ایک دن کی سوچ بچار کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ریاض کو مستقل طور پر لنگڑا بنا دیں۔ وہ ایک ٹانگ پر دباؤ ڈال کر جب اوپر نیچے جھٹکے کھاتے ہوئے چلتا دکھائی دے گا تو بڑا مزہ آئے گا۔ پھر کبھی اسے اتنی ہمت نہیں ہو گی کہ وہ نازو سے ملے یا اس کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہم یہاں ڈیرے پر بیٹھے یہی منصوبہ بنا رہے تھے اور جب ایک فیصلے پر پہنچ گئے تو ہم نے بخشو کو تانگے وغیرہ کا بندوبست کرنے بھیج دیا تبھی..... میں نے کمرے سے باہر نکل کر بخشو سے یہ پوچھا تھا..... تم تانگے کا انتظار کرنے گئے تھے.....!''

''اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔'' میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ''جب ڈیرے کے گیٹ پر بخشو نے ہمیں دیکھا تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ کیوں نکلا تھا..... اوئے پولیس، اتنی جلدی..... ایک دن پہلے ہی.....''

میں نے لمحاتی توقف..... کے بعد صفدر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں صفدر حسین! اب مجھے بتاؤ کہ تم کس فیصلے پر پہنچے تھے۔ آج رات تم لوگ کس طرح ریاض کو لنگڑا بنانے والے تھے؟ اور تمہارے جواب دینے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا تا چلوں کہ ریاض زور زبردستی سے، نازو سے ملاقات نہیں کرتا تھا لہٰذا آنکھ اٹھا کر دیکھنے یا نہ دیکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ دونوں اپنی مرضی اور پسند سے ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں۔ بہرحال، تم بتاؤ کہ اس ڈیرے پر پکنے والی کھچڑی کا ذائقہ کیسا ہے؟''

''کھچڑی'' اور ''ذائقہ'' کے الفاظ پر اس نے الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں نے اس کی آسانی کے لیے جلدی سے وضاحت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم لوگ جس مشن پر جانے والے تھے اس کی تفصیل کیا ہے۔ ریاض کے ساتھ، تمہارا کیا کرنے کا ارادہ تھا۔ تم کس طریقے سے اسے لنگڑا بناتے؟''

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بتانے لگا۔ ''جناب! جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے کہ ہم نے ریاض کی ایک ٹانگ توڑنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ ریاض اور فیاض آج کل رات کو باڑے میں سو رہے ہیں.....''

''سو رہے ہیں نہیں..... بلکہ سویا کرتے تھے۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''پچھلی رات وہ ابدی نیند سو چکے ہیں۔ اب انہیں بار بار سونے جاگنے کی حاجت نہیں رہے گی۔''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''منصوبے کے مطابق، ہم دونوں تانگے میں بیٹھ کر آدھی رات کو شمشیر پور پہنچتے اور بڑی خاموشی سے دیوار پھلانگ کر ڈیرے کے اندر داخل ہو جاتے۔ اس کے بعد ہم ان سوتے ہوئے بھائیوں میں سے ایک ایک کو سنبھال لیتے۔ ہمیں صرف ریاض کو ایک ٹانگ کے استعمال سے محروم کرنا تھا۔ ٹخنے کے مقام پر ایسی ضرب لگائی جاتی کہ ہڈی چکنا چور ہو کر رہ جاتی پھر ہم وہاں سے واپس آ جاتے۔ اللہ اللہ..... خیر سلا!''

''اللہ اللہ، خیر سلا..... اتنا بھی سہل نہیں ہوتا صفدر حسین!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کارروائی کے دوران میں اس بات کے بڑے قوی امکانات موجود تھے کہ وہ دونوں بھائی یا ان میں سے کوئی ایک تم لوگوں کو پہچان لیتا۔ تم پہچان لیے جانے کا خطرہ مول لینے کے لیے کیسے تیار ہو گئے؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے جناب.....'' لاکھو نے میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو چہروں پر ڈھاٹے لگا کر وہاں جانا تھا۔ ان میں سے کوئی ہمیں شناخت نہیں کر سکتا تھا، پھر یہ کہ ہم انہیں جان پہچان اور شناخت کی مہلت ہی نہ دیتے۔ یہ تو بہ مشکل تین چار منٹ کی کارروائی تھی جیسے ہی ہم ریاض کے گئے (ٹخنے) کا جنازہ نکالتے، فیاض ہمیں بھول کر اس کی فکر میں لگ جاتا اور ہم اس موقع کا فائدہ اٹھا کر جائے واردات سے غائب ہو جاتے.....'' وہ اتنا بتا کر تھما پھر عام سے لہجے میں بولا۔

''میں نے ساری حقیقت آپ کو بتا دی ہے۔ یقین کریں یا نہ کریں، آپ کی مرضی ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم دونوں کی کہانی سن لی لیکن تم لوگ یہ مت سمجھنا کہ میں اس اسٹوری پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ تمہارے بیان کو چیک کرنا بہت ضروری ہے اور جب تک یہ چیک نہیں ہو جاتا، تم میرے مہمان رہو گے!''

''مہمان..... کیا مطلب جناب؟'' صفدر نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''مطلب یہ کہ.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ جب تک ان دونوں بھائیوں کا قاتل میری گرفت میں نہیں آ جاتا، تم تینوں تھانے کی حوالات میں رہو گے۔''

''یہ تو بڑی زیادتی والی بات ہو گی تھانیدار صاحب.....!'' لاکھو نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔

میں نے آئندہ چند منٹ میں انہیں ''زیادتی'' اور ''قانونی کارروائی'' کے فرق سے آگاہ کیا پھر اپنے ساتھ تانگے میں بٹھا کر تھانے لے آیا۔ یہ وہ تانگا نہیں تھا جس میں بیٹھ کر ان دونوں دوستوں نے مقتول ریاض کا گٹا توڑنے جانا تھا۔ مذکورہ تانگے کو لانے کی تو نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ بخشو، ڈیرے کے گیٹ سے نکلتے ہی ہمارے ہتھے چڑھ گیا تھا گویا، سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی صورتِ حال ہو گئی تھی۔

ان تینوں نے راستے میں بڑی شرافت کا ثبوت دیا اور ہم بخیر و عافیت موضع چیاں والی سے واپس تھانے آ گئے۔

☆☆☆

اگلی صبح میں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ بشیر لوہار کافی دیر سے میرے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا لیا۔

بشیر لوہار وہ شخص تھا جس نے گزشتہ روز اس دُہرے قتل کی واردات کی اطلاع مجھے دی تھی۔ وہ مقتولین کا پڑوسی تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک معقول اور بھلے مانس انسان تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے حاضر ہو گیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ''بشیرے! خیریت تو ہے..... یہ صبح ہی صبح تم مجھ سے ملنے آ گئے؟''

''میں تو رات ہی کو آنے والا تھا جناب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''جی.....!'' اس نے مختصر سا جواب دینے کے بعد گردن جھکالی۔

''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔

وہ ندامت آمیز آواز میں بولا۔ ''جناب! میں اپنی ذمے داری پوری نہیں کر سکا۔''

''کون سی ذمے داری؟'' میرے لہجے میں الجھن شامل ہوگئی۔

''وہ..... آپ نے میری ڈیوٹی لگائی تھی نا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر ڈیرے پر بندھے ہوئے مال مویشیوں کی دیکھ بھال مجھے کرنا تھی۔ میں اسی ذمے داری کی بات کر رہا ہوں.....''

''کیا مویشی چوری ہونے کا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہے؟'' میں نے حالیہ صورت حال کی روشنی میں ممکنہ خدشے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ آپ نے مجھے جو ذمے داری سونپی تھی، زاہدہ نے وہ پوری نہیں کرنے دی۔ اس نے رات ہی کو مجھ سے باڑے کی چابی لے لی تھی..... بلکہ میرا تالا اتار کر وہاں اپنا تالا لگا دیا ہے۔ میں رات ہی کو آپ کے پاس آنے والا تھا پھر سوچا کہ صبح جاؤں گا اور اب میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں.....''

''اوہ..... بس اتنی سی بات کے لیے تم پریشان ہو۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ نے اگر باڑے کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ تم کیوں فکر مند ہو رہے ہو؟'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کل میں نے تم پر واضح کر دیا تھا کہ اگر زاہدہ کو تمہارے اس پر خلوص عمل پر کوئی اعتراض ہو تو تم کسی بحث مباحثے میں نہ پڑنا بلکہ باڑے کی چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دینا.....''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! اگر زاہدہ نے باڑے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا ہوتا تو شاید میں پریشان نہ ہوتا.....!''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو بشیرے!'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''زاہدہ نے باڑے کا نظام کس کو سونپا ہے؟''

''اس بندے کا نام سلطان ہے جناب!'' بشیر لوہار نے جواب دیا۔ ''پتا چلا ہے، وہ زاہدہ کا کوئی دور پار کا رشتے دار ہے۔ میں نے شمشیر پور میں اسے پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا، وہ اچانک کہاں سے ٹپک پڑا ہے!''

سلطان کا نام سنتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ زاہدہ نے اپنے کسی تایا زاد کا ذکر کیا تھا۔ اس کے مطابق، سلطان نامی وہ شخص اس کا واحد رشتے دار تھا جو شمشیر پور سے پانچ میل مشرق میں واقع موضع جلال نگر میں رہتا تھا۔ زاہدہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے اپنے اس اکلوتے رشتے دار کو بلانے کے لیے ایک بندہ ادھر جلال نگر روانہ کر دیا ہے۔ مجھے صدفی صد یقین تھا کہ سلطان گزشتہ رات شمشیر پور پہنچ گیا تھا اور بشیر لوہار اسی بندے کا ذکر کر رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بشیرے! یہ سلطان جو ہے نا، یہ زاہدہ کے تایا کا بیٹا ہے جو موضع جلال نگر کا رہنے والا ہے۔ وہ ریاض اور فیاض کے قتل کا سن کر ادھر آیا ہے۔ زاہدہ نے کل مجھے سلطان کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ تم سلطان کی وجہ سے خود کو پریشان نہ کرو.....!''

''جناب.....!'' وہ بات کرتے کرتے اچانک خاموش ہوگیا۔ میں نے فطری لہجے میں پوچھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو بشیرے؟''

''تھانیدار جی!'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''یہ بندہ سلطان مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔ اس کی طرف سے میرا دل مطمئن نہیں ہے۔''

''وہ کیا اچھا نہیں ہے؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں دریافت کیا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہیں سلطان میں کون سی برائی نظر آئی ہے؟''

''بس جی..... میں آپ کو سمجھا نہیں سکتا.....'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''عجیب سا بندہ ہے جی۔ کھا کھا کر سانڈ کی طرح پلا ہوا ہے، رنگ توے کی طرح سیاہ، آنکھیں سرخ اور انداز و اطوار سے مکاری جھلکتی ہے..... آپ ادھر آ کر خود دیکھ لیں جی۔ وہ آپ کو بھی پسند نہیں آئے گا۔''

''ٹھیک ہے.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں بہت جلد شمشیر پور آؤں گا اور دیکھوں گا، وہ سلطان کس قماش کا آدمی ہے!''

''میں جاؤں جی.....!'' اس نے اجازت طلب کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''اگر تمہیں اور کچھ نہیں کہنا تو مطمئن ہو کر جاؤ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے، میں دوپہر کے بعد ادھر چکر لگاؤں۔''

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو دروازے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب سے پلٹ آیا اور پوچھنے لگا۔ ''میں نے سنا ہے جی..... آپ نے دو بندوں کو کل رات پکڑا ہے جن میں ایک ہمارے گاؤں کا صفدر اور دوسرا اس کا یار لاکھو ہے۔ کیا انہوں نے ریاض اور فیاض کے قتل کا اقرار کرلیا ہے؟''

بشیر لوہار میری آمد سے قبل ہی تھانے پہنچ گیا تھا لہٰذا یہ عین ممکن تھا کہ عملے کے کسی آدمی سے اس کی بات ہوئی ہو اور اسے صفدر و لاکھو کی گرفتاری کا پتا چل گیا ہو۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''دو نہیں، میں نے تین افراد کو گرفتار کیا ہے۔ تیسرا آدمی لاکھو کا ساتھی بخشو ہے۔ اسی دہرے قتل کے سلسلے میں ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ وہ تینوں زیرِ تفتیش ہیں۔ انشاء اللہ! بہت جلد کوئی مثبت نتیجہ دیکھنے کو ملے گا اور ہاں.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب تم باہر جا کر ان بندوں کا چرچا نہ کرنا۔ گاؤں میں کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے کریماں بی بی کے بیٹے صفدر کو حوالات میں ڈالا ہوا ہے۔ زبان کو کنٹرول میں رکھنا بشیرے۔ سمجھ رہے ہو نا..... میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''جی سمجھ گیا.....!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایت کا خیال رکھوں گا جی۔''

میں نے اسے شاباشی دے کر رخصت کر دیا۔

میں نے بشیرے سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ میں واقعی دوپہر کے بعد شمشیر پور جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا، تھانے میں ایک ایمرجنسی آ گئی۔ وہ دنگا فساد کا معاملہ تھا۔ نہری پانی کے استعمال کے سلسلے میں دو زمینداروں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ یہ جھگڑا زبانی بحث و تکرار سے شروع ہو کر سر پھٹول پر جا کر رکا تھا۔ اللہ کا شکر ہے، اس جھگڑے میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا البتہ، فریقین میں دونوں جانب کئی بندے زخمی ہو گئے تھے۔ میں اس معاملے کو سیدھا کرنے میں اس قدر مصروف ہوا کہ سر کھجانا بھی یاد نہ رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام ہو گئی۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں شمشیر پور کا رخ کرتا لہٰذا اس پروگرام کو کل صبح تک موخر کر دیا۔

شمشیر پور کا نام آپ کو عجیب سا لگ رہا ہوگا۔ عموماً گاؤں دیہات، قصبات اور شہروں وغیرہ کے نام کسی مشہور شخصیت کے نام پر رکھے جاتے ہیں پھر اس گاؤں کا نام شمشیر یعنی تلوار کے نام پر کیوں رکھا گیا.....؟ یہ ایک دلچسپ اور اہم سوال ہے۔

دراصل، اس میں عجیب و غریب اور اچنبھے والی کوئی بات نہیں۔ کسی زمانے میں اس گاؤں میں ایک شہ زور زمان خان رہا کرتا تھا۔ فن پہلوانی کے علاوہ اسے تلوار بازی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب یہ خطہ متحدہ ہند ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ زمان خان کا مقابلہ ایک ہندو تلوار باز سے ہونا طے پایا۔ پلٹو رام وقت اور خطے کا مانا ہوا تلوار باز تھا۔ عمومی رائے یہ تھی کہ زمان خان، پلٹو رام کے سامنے دو منٹ بھی ٹک نہیں پائے گا مگر جب مقابلے کا آغاز ہوا تو زمان خان نے عمومی رائے کی تاریخ بدل کر لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ دو منٹ کیا، وہ پورے پندرہ منٹ پلٹو رام کے سامنے ڈٹا رہا تھا اور اس مقابلے کے اختتام پر پلٹو رام کو اپنے تلوار والے بازو سے محروم ہونا پڑا تھا۔ وہ زمان خان کے ایک برق رفتار وار کو سمجھ نہ پایا اور پلک جھپکنے میں اس کا بازو کندھے سے جدا ہو کر زمین پر جا پڑا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ پلٹو رام کی تلوار اسی کٹے ہوئے بازو والے ہاتھ میں دبی رہی تھی۔

اس منظر کی وحشت ناکی نے پلٹو رام کے عزم اور حوصلے کو ریت کی دیوار کے مانند زمیں بوس کر دیا اور وہ مقابلے کے میدان میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد زمان خان کا نام شمشیر خان رکھ دیا گیا اور یہ گاؤں شمشیر پور کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس گاؤں کا پرانا نام اب کسی کو یاد نہیں تھا اور نوجوان نسل میں سے بہت سوں کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ شمشیر خان کون تھا اور ماضی کے کس سنہری کارنامے نے زمان خان کو شمشیر خان بنا دیا تھا۔

ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہم ماضی کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ یہ یادداشت کی کمزوری نہیں، بلکہ ہماری تن آسانی ہے اور اس سہل پسندی میں ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ آج اگر ہم ''حال'' ہیں تو گردشِ دوراں کل ہمیں ''ماضی'' بنا دے گی پھر اس وقت کا ''حال'' ہمیں بھی بھلا بسرا ماضی جان کر اتنی ہی آسانی سے فراموش کر دے گا.....!

☆☆☆

آئندہ روز میں شمشیر پور جانے کے لیے تھانے سے نکلنے ہی والا تھا کہ مقتولین کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشیں آ گئیں۔ لاشوں کے ساتھ ہی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ بھی تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں کی لاشوں کو ایک مناسب جگہ پر رکھوایا اور اپنے کمرے میں آ کر رپورٹ کا جائزہ لینے لگا۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق، ریاض اور فیاض کی موت وقوعہ کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان کسی وقت واقع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھی جبکہ ان کی موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ اس نکتے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا اور میں رپورٹ کو پڑھتا چلا گیا۔ آگے لکھا تھا۔

دونوں مقتولین کے معدوں سے حاصل ہونے والے نمونوں نے ثابت کر دیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے انہوں نے جو کھانا کھایا تھا اس میں کوئی سریع الاثر زہر ملا ہوا تھا جو ان کے زہر نے معدے میں پہنچتے ہی اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ اس زہر کی خصوصیت رپورٹ کے مطابق یہ بتائی گئی تھی کہ وہ سب سے پہلے اعصاب اور دماغ کو اپنے زیر اثر لا کر متاثرہ شخص کو غنودگی میں پہنچا دیتا ہے پھر بہت جلد یہ غنودگی گہری نیند میں بدل جاتی ہے اور اسی نیند میں سفر کرتے ہوئے متاثرہ ذہن ابدی نیند کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ ریاض اور فیاض کی زندگی کا چراغ بھی اسی انداز میں گل ہوا تھا۔

رپورٹ میں مزید یہ بھی درج تھا کہ جب ان دونوں بھائیوں کے جسموں کے بالائی حصوں پر تیز دھار کلہاڑی کے وار کیے گئے تو وہ زندگی سے محروم دو لاشوں کی صورت چارپائیوں پر پڑے تھے لہٰذا کلہاڑی بردار کو اپنے کام میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ بڑے اطمینان سے ان کے جسموں کو زخموں سے چور چور کر کے خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دو تین مرتبہ بڑی توجہ سے پڑھا پھر ایک طرف رکھ دیا۔ ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ ان دونوں بھائیوں کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ قاتل کا مقصد بھی بڑی حد تک واضح ہو رہا تھا۔ اس نے پہلے زہر کھلا کر انہیں موت کی نیند سلایا پھر ان پر کلہاڑیاں برسا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ یہ شدید نوعیت کی انتقامی کارروائی کا نتیجہ ہے۔ کسی دشمن نے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انہیں بڑے بھیانک انداز میں فنا کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس صورت حال میں شک کے تمام تر تیر صفدر کی جانب چلتے نظر آتے تھے لیکن میرا ذہن اس کے بالکل برعکس سوچ رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے صفدر اور لاکھو کو بڑی حد تک بے قصور ثابت کر دیا تھا۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ صفدر اس بات پر اختیار نہیں رکھتا تھا کہ کسی بھی طریقے سے ان بھائیوں کے معدوں تک زہر پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔ یقیناً یہ کام کسی اور ہی شخص کا کیا ہوا تھا!

صفدر اور لاکھو کی طرف سے دھیان ہٹا تو میری سوچ میں زاہدہ پروین کا چہرہ ابھر آیا پھر اس کی ایک ایک احترازی حرکت مجھے یاد آنے لگی۔ اس کی جز بز اور ہچکچاہٹ، پس وپیش اور اکتاہٹ کے معنی اور مفہوم واضح ہونے لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، جب میں نے زاہدہ کو بتایا کہ ریاض اور فیاض کو ان کی بے خبری میں موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ وہ غفلت کی ایسی نیند میں ڈوبے ہوئے تھے کہ حملہ آور کے خلاف ایک ذرا سی مزاحمت بھی نہ کر سکے!

وہ میری بات سن کر گھبرا گئی تھی اور اسی گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکلا تھا..... ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس کا چونکنا اور گھبراہٹ بڑی معنی خیز تھی جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو!

زاہدہ کے مطابق، دونوں بھائیوں نے لگ بھگ رات نو بجے کھانا کھایا اور سونے کے لیے باڑے میں چلے گئے تھے یعنی رات کے کھانے اور سونے کے درمیان انہوں نے اور کوئی شے نہیں کھائی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ رات کا کھانا ہی زہر آلود تھا!

جب میں زاہدہ سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا تو مقتولین کی عدم مزاحمت اور کھانے کی گڑبڑ کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا اور اسی خیال کے تحت میں نے اس سے کھانے کی فرمائش کی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ رات والے کھانے کا کچھ حصہ بچا ہوا ہو تو مجھے دیدے۔ وہ میری اس فرمائش پر بدک گئی تھی اور بڑے تشویش ناک انداز میں اس نے مجھ سے پوچھا تھا..... ''کیوں جی، آپ اس کھانے کا کیا کریں گے؟''

میں زاہدہ کے گھر سے نکلا تو بشیرے اور منظورے سے ملاقات ہو گئی تھی اور ان کی زبانی ایک اور خطرناک حقیقت ابھر کر سامنے آئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ سال بھر پہلے، ایک رات ریاض اور فیاض کا باپ فتح محمد خون کی الٹیاں کرتے ہوئے موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔

اس وقت میں نے فتح محمد کی موت کے حوالے سے بشیرے اور منظورے کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ ان لمحات میں میرا ذہن ریاض اور فیاض کے قتل کا معما حل کرنے میں مصروف تھا لیکن اب ..... دونوں بھائیوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در وا کر دیا تھا۔ فتح محمد اگر خون تھوکتا ہوا مرا تھا تو یہ کسی کالے، پیلے یا نیلے عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا..... مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ فتح محمد بھی زہر خورانی کے باعث ہی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پولیس کی تفتیشی گاڑی شک کے پیٹرول سے بھاگتی ہے اور ان لمحات میں میرا شک زاہدہ پروین کی طرف جارہا تھا۔ زاہدہ ایک جوان، خوب رو اور پرکشش عورت تھی۔ اس کا خود سے، ایک دوگنا عمر کے شخص کے ساتھ شادی کرنا حلق سے اترنے والی بات نہیں تھی۔ فتح محمد کم و بیش ساٹھ سال کا تھا جب اس نے زاہدہ سے شادی کی تھی۔ اس قسم کی تفاوتی شادیاں عموماً بڑے بھیانک نتائج لے کر آتی ہیں۔ عین ممکن تھا کہ فتح محمد بھی کسی خطرناک سازش کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلا گیا ہو..... اور یہ دونوں بھائی تو پھر بھی زاہدہ کی سوتیلی اولاد تھے.....!

پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ریاض اور فیاض کی پوسٹ مارٹم شدہ لاشوں کو تدفین کے لیے شمشیر پور پہنچادوں گا لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے میرے ارادے کو بدل دیا۔

میں نے کانسٹیبل مراد علی کو اپنے پاس بلایا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

''مراد علی! تم فوراً شمشیر پور چلے جاؤ۔ جاکر زاہدہ کو بتاؤ کہ اسپتال سے اس کے بیٹوں کی لاشیں آگئی ہیں۔ وہ تھانے آکر انہیں وصول کرلے تاکہ تجہیز و تکفین کی تیاری میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔''

''لیکن ملک صاحب.....!'' کانسٹیبل نے متعجب انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آپ کا پروگرام تو کچھ اور تھا.....؟''

وہ اس پروگرام کی بات کررہا تھا جس کے مطابق، مجھے لاشوں کے ساتھ بہ ذاتِ خود شمشیر پور جانا تھا۔ اس سلسلے میں میری اس سے تفصیلی بات ہوچکی تھی لیکن میں نے ابھی تک اسے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے ''نشیب و فراز'' سے آگاہ نہیں کیا تھا لہٰذا اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔ پہلے پروگرام کچھ اور تھا، اب کچھ اور ہے۔ تم سے جو کہا جارہا ہے، بس تم اتنا ہی کرو۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے جناب.....!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جو آپ کا حکم'' پھر وہ شمشیر پور روانہ ہوگیا۔

کانسٹیبل میرا بھروسے کا آدمی تھا۔ میں نے کسی خاص مقصد کے تحت اسے پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ناآشنا..... رکھا تھا۔ اگر میں اس راز میں اسے بھی شریک کرلیتا تو مجھے پوری امید تھی کہ وہ راز کا امین رہے گا لیکن میں نے فی الحال اس کے لیے بھی سسپنس کی فضا قائم رہنے دی تھی تاکہ جب اچانک اسے اس زاویے کی خبر ہو تو اس کے تن بدن میں سنسنی کی لہر سی دوڑ جائے۔ اس کے لیے یہ ایک سرپرائز ہوتا۔ یقیناً وہ اس سے بے حد محظوظ ہوتا!

میری توقع کے عین مطابق، دو گھنٹے کے اندر مراد علی واپس لوٹ آیا اور وہ اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ تانگے میں زاہدہ پروین بھی موجود تھی جو یقیناً اپنے ''بیٹوں'' کی لاشیں وصول کرنے آئی تھی۔

میں نے فوراً زاہدہ کو اپنے کمرے میں بلالیا اور مراد علی سے کہا کہ وہ دروازے کے باہر موجود رہے۔ جب تک میں زاہدہ کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہوں، وہ کسی کو بھی کمرے کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔

زاہدہ میرے سامنے بیٹھ گئی اور ادھر ادھر نگاہ دوڑانے کے بعد بولی۔ ''کہاں ہیں ان دونوں کی لاشیں؟''

اس کے استفسار میں گہری تشویش پائی جاتی تھی جیسے جواں بیٹوں کی المناک موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہو۔ میں اس دوران میں بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے اس کے تاثرات کا ایکسرے کررہا تھا اور مجھے اس نتیجے تک پہنچنے میں قطعی کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ اس کی تشویش بڑی کھوکھلی اور مصنوعی نوعیت کی تھی۔

''لاشیں میرے کمرے میں نہیں رکھی ہوئیں!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ تھانے ہی میں ہیں اور خاصی محفوظ جگہ پر ہیں۔ تم ان کی طرف سے پریشان نہ ہو۔ بس، تھوڑی سی قانونی کارروائی ہوگی پھر ریاض اور فیاض کی لاشیں تمہارے حوالے کردی جائیں گی۔''

''کیسی قانونی کارروائی.....؟'' وہ چونکتا نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''گھبرانے والی کوئی بات نہیں زاہدہ۔ تم سکون سے ادھر ہی بیٹھو۔ میں تم سے چند ضروری سوالات کروں گا اور مطمئن ہونے کے بعد تمہیں جانے کی اجازت دے دوں گا۔''

''لل..... لیکن.....'' وہ ہکلائی۔ ''اب آپ..... کون سے سوال..... کرنا چاہتے ہیں.....؟''

''میں نے کہا ہے نا.....'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ڈرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو.....؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بے ساختہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''مم..... میں..... نے..... کچھ نہیں کیا.....!''

''تبھی تو کہہ رہا ہوں، تمہیں پریشان نہیں ہونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہیے۔'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔''بس، پانچ دس منٹ میں، میں تمہیں فارغ کردوں گا.....!''

''جج..... جی.....'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔''آپ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے؟''

میں نے پوچھا۔''زاہدہ! تم نے وقوعہ کی رات دونوں بھائیوں کی فرمائش پر ان کی پسندیدہ ڈشیں کڑی، چاول اور کھیر بنائی تھیں انہوں نے ڈٹ کر کھایا اور لگ بھگ نو بجے رات وہ سونے کے لیے باڑے میں چلے گئے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جج..... جی.....!'' وہ دوپٹے کے پلو سے پیشانی کا پسینا پونچھتے ہوئے بولی۔

وہ اکتوبر کا مہینا تھا اور فضا میں خنکی پائی جانے لگی تھی۔ اس موسم میں پیشانی کے عرق آلود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر زاہدہ کا ماتھا نم ہوا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ..... میرا چلایا ہوا تیر نشانے پر جا کر بیٹھا تھا۔ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ذرا سوچ کر بتاؤ زاہدہ..... کیا انہوں نے باڑے میں جا کر بھی کچھ کھایا تھا؟''

''نہیں جی..... وہ وہاں جاتے ہی سو گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔''انہوں نے گھر میں اتنا زیادہ کھانا کھالیا تھا کہ مزید کچھ کھانے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی وہ باڑے میں جانے کے بعد کچھ کھاتے پیتے نہیں تھے.....''

''ہاں، یہ تو تم نے مجھے اس دن بھی بتایا تھا۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔''کہ اس رات انہوں نے ایسا ڈٹ کر کھانا کھایا تھا کہ ہانڈی پتیلے سب خالی ہوگئے تھے حتیٰ کہ جب میں نے تم سے کھانے کی فرمائش کی تو تمہیں معذرت کرنا پڑی تھی..... ہیں نا زاہدہ؟''

''جی..... یہ سب تو ہے۔'' اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔''لیکن آپ دوبارہ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔''کیا اس رات تم نے بھی کڑی چاول اور کھیر کھائی تھی؟''

''جی ہاں..... میں نے بھی خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔''

''پھر تم ابھی تک زندہ کیسے ہو؟''

''جی.....!'' میرا سوال کسی ہتھوڑے کے مانند اس کے سر پر لگا تھا۔

میں نے تلخی سے کہا۔''ہاں زاہدہ! اس کھانے کو کھا کر کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا جیسا کہ وہ دونوں بھائی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے اور.....''

''لیکن ریاض اور فیاض کو تو کلہاڑی کے وار کر کے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی چالاکی سے بولی۔

''یہ تمہارا خیال ہے زاہدہ.....!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔''ورنہ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے۔''

''کیا..... کیا ہے..... حقیقت.....؟'' وہ دوبارہ اپنی پیشانی کا پسینا صاف کرتے ہوئے مستفسر ہوئی تاہم اس مرتبہ اس کے لہجے میں جارحیت کے بجائے نقاہت کا عنصر شامل تھا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔''حقیقت یہ ہے زاہدہ کہ..... وقوعہ کی رات دونوں بھائیوں کے شکم میں جو کھانا اترا، وہ زہریلا تھا جسے کھاتے ہی وہ پہلے نیم بے ہوش ہوئے پھر یہ نیم بے ہوشی گہری نیند میں بدل گئی..... ایسی نیند جس سے کوئی بیدار نہیں ہوسکتا لیکن.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''..... لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ وہی کھانا تم نے بھی کھایا تھا اور ابھی تک زندہ سلامت نظر آرہی ہو؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ خود کو کسی منجدھار میں گھرا ہوا محسوس کررہی ہے۔ آخری سنبھالا لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بکھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ..... کس بنا پر..... یہ بات کہہ رہے ہیں.....؟''

میں نے میز کی دراز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں.....!''

''پھر.....؟'' اس نے سہمی ہوئی تحیر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کے سامنے ڈالتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔''اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ دونوں بھائیوں نے زہریلا کھانا کھایا اور سو گئے پھر کچھ ہی دیر کے بعد ان کی موت واقع ہوگئی۔ موت کا وقت رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان بتایا گیا ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ جب آدھی رات کے بعد ان پر کلہاڑیاں برسائی گئیں تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکے تھے اسی لیے اس دہرے قتل کے جواب میں ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت دیکھنے کو نہیں ملی۔'' میں نے لمحے بھر کا توقف کرکے سانس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہموار کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''زاہدہ! یہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے جو ایک قابل سرجن کی نگرانی میں تیار کی گئی ہے۔ تم اس میں درج حقائق کو نہ تو جھٹلا سکتی ہو اور نہ ہی چیلنج کر سکتی ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتی ہو تو سچ سچ بتا دو، تم نے اس رات کھانے میں کیا ملایا تھا؟''

''مم..... میں نے کسی چیز میں زہر..... نہیں ملایا.....''

وہ نیم احتجاجی لہجے میں بولی تاہم اس کی آواز میں کوئی دم خم نہیں تھا۔ ''میں..... ان کو کیوں مارنا چاہوں گی۔ میں تو انہیں اپنی سگی اولاد سے زیادہ سمجھتی تھی اور.....''

''تم ریاض اور فیاض کو سگی اولاد سے زیادہ سمجھتی تھیں.....!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور فتح محمد کو اپنا سگا شوہر..... ہیں نا؟''

اس نے چونک کر ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے میں کوئی تھانیدار نہیں بلکہ عفریت ہوں۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر دہشت اور دہشت نے ڈیرا جما لیا تھا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

''یہ فتح محمد..... کا ذکر..... کہاں سے..... نکل آیا.....؟''

''فتح محمد کا ذکر اس لیے نکل آیا کہ مجھے یقین ہے، اسے بھی زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے چٹانی لہجے میں کہا۔

اس کی ہمت جواب دے گئی، مریل سے لہجے میں بولی۔ ''یہ..... آپ کیا..... کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب.....؟''

''میں جو بھی کہہ رہا ہوں وہ تم بڑی اچھی طرح سمجھ رہی ہو زاہدہ۔'' میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تم عورت ذات ہو، تفتیش کے کٹھن مراحل کو جھیل نہیں سکو گی۔ سیدھی طرح اپنے جرم کا اقرار کر لو ورنہ.....!''

میں نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ خوف زدہ انداز میں اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''ور..... نہ.....؟''

میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مجھے مجبوراً فتح محمد کی بچی کھچی لاش کو قبر میں سے نکلوا کر اس کا بھی پوسٹ مارٹم کروانا پڑے گا..... پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا!''

''پپ..... پانی.....!'' اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں میں سے آتی محسوس ہوئی۔

میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''میں نے ابھی پانی اور دودھ کا ذکر کیا ہے۔ فکر نہ کرو، تمہیں پانی بھی ملے گا اور دودھ بھی لیکن ابھی بہت سارے سوالات باقی ہیں.....'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کالا کلوٹا سانڈ نما تمہارا تایا زاد سلطان تو ادھر گاؤں ہی میں ہے نا۔ میں ابھی چار سپاہیوں کو بھیج کر اسے تھانے بلواتا ہوں۔ میرا خیال ہے، اگر میں اسے تفتیش کی چکی میں ڈالوں تو اس کی زبان سے بڑے مفید انکشافات ہوں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے زاہدہ پروین؟''

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں رہی تھی۔ میں نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ خوف اور دہشت کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے دو کانسٹیبلوں کو شمشیر پور کی جانب دوڑا دیا تاکہ وہ سلطان نامی اس بندے کو پکڑ کر فوراً میرے پاس لے آئیں لیکن افسوس کہ وہ فوری طور پر دستیاب نہ ہو سکا۔ وہ پورے گاؤں میں کہیں نہیں ملا تھا۔ بعد ازاں جب میں زاہدہ کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ سلطان ایک دن کے لیے جلال نگر گیا ہے اور کل صبح واپس آئے گا۔

سلطان، زاہدہ کا شریکِ جرم تھا لہٰذا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت تین کانسٹیبلوں کی ایک ٹیم جلال نگر روانہ کی۔ وہ رات ہونے سے پہلے کامیاب لوٹے۔ سلطان کو وہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔

جب سلطان نے یہ دیکھا کہ زاہدہ نے پولیس کی تحویل میں اقبالِ جرم کر لیا ہے تو اس نے سارا الزام زاہدہ پر ڈال دیا۔ اس کے مطابق، وہ زاہدہ کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ زاہدہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اس کا ''کام'' کر دے تو وہ سلطان سے شادی کر لے گی۔ اس نے سلطان کو باور کرا دیا تھا کہ ریاض اور فیاض اس شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ یہ رکاوٹ ہٹا دے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک ہونے سے نہیں روک سکتی۔ سلطان کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا اور اس کی شکل صورت کی وجہ سے ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ زاہدہ کی صورت میں اسے بیٹھے بٹھائے ایک حسین و جمیل عورت مل رہی تھی اور ایسی عورت کہ جو زمین و جائداد کی مالک بھی تھی۔

وہ لالچ میں آ گیا۔ زاہدہ کی پیش کش میں اس کے لیے بڑی کشش تھی لہٰذا وہ آگ اور خون کے اس کھیل میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھیں بند کر کے کود گیا۔ اسی نے زاہدہ کو ایک سریع الاثر زہر لا کر دیا اور جائے وقوعہ کو کسی انتقامی کارروائی کا رنگ دینے کے لیے اسی نے مردہ بھائیوں کی لاشوں کو کلہاڑی کے وار کر کے بری طرح بگاڑ دیا پھر ایک ایسی لرزہ خیز کہانی نے جنم لیا جس میں شامل خونیں واقعات و حالات اور اعمال کا کچھ ایسا ہی نتیجہ نکلا کرتا ہے۔

سلطان نے، ریاض اور فیاض والے معاملے میں زاہدہ کا شریکِ جرم ہونے کا اقرار تو کر لیا تھا لیکن فتح محمد کی موت سے اس نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''وہ کارنامہ'' زاہدہ نے اپنے بل بوتے پر انجام دیا تھا۔ ریاض اور فیاض سے ''نمٹنا'' اس کے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا بڑی مکاری سے اس نے سلطان کو استعمال کر لیا تھا۔

میں نے ایک موقع پر زاہدہ سے سوال کیا۔ ''اگر یہ معاملہ دب دبا جاتا تو کیا تم واقعی سلطان سے شادی کر لیتیں؟''

''کیا میں آپ کو اتنی ہی بے وقوف نظر آتی ہوں؟'' اس کا جواب بڑا معنی خیز تھا۔

''نہیں.....'' میں نے نفی میں گردن ہلائی اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اگرچہ تم اتنی احمق نہیں ہو لیکن ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے فتح محمد سے کیوں شادی کی تھی۔ تم دونوں کی عمروں میں زمین آسمان کا فرق تھا؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہماری عمروں میں تقریباً آدھے آدھے کا فرق تھا لیکن وہ ایک صاحبِ جائداد زمیندار تھا اور مجھے امید تھی کہ.....!''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر معنی خیز انداز میں چپ ہو گئی تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''تمہارا یہی خیال تھا نا کہ فتح محمد سال، ڈیڑھ سال میں اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا لیکن وہ ساٹھا پاٹھا ثابت ہوا۔ نہ صرف یہ کہ وہ تم سے شادی کے بعد دوبارہ جوان ہونے لگا تھا بلکہ شادی کے دوسرے سال ہی تمہارے بطن سے اس کی اولاد بھی پیدا ہو گئی۔ اس صورتِ حال نے تمہیں خاصا مایوس کر دیا۔ جب تم نے اپنا منصوبہ ڈوبتا ہوا دیکھا تو.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''.....تو تم نے سوچا کہ جو کام قدرتی انداز میں نہیں ہو رہا اسے تم اپنے ہاتھوں سے انجام دو گی اور پھر.....ایک رات فتح محمد خون اگلتا ہوا موت کے منہ میں چلا گیا.....!''

زاہدہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے گردن جھکا لی۔

یہ اس کے بھیانک جرم کا خاموش اقرار تھا۔

بعد ازاں، اس نے اپنے تفصیلی بیان میں بتایا کہ یہ ٹھیک ہے اس نے زمین و جائداد کے لالچ میں خود سے دوگنا عمر کے فتح محمد سے شادی کی تھی لیکن وہ ریاض اور فیاض سے کسی نوعیت کی دشمنی نہیں رکھتی تھی۔ یہ سارا فساد اس کے سگے بیٹے فرمان علی کی پیدائش کے بعد اٹھا تھا۔ جیسے جیسے فرمان علی بڑا ہو رہا تھا، دونوں بھائیوں کے تیور بدلتے جا رہے تھے۔ وہ فرمان علی کو اپنے لیے ایک خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کا خیال تھا، فتح محمد کے صرف وہ ہی وارث ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے فتح محمد کے کان بھی بھرنا شروع کر دیے تھے۔ فضا کا رنگ بدلتے دیکھا تو زاہدہ نے اس گھر میں اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بہت خطرہ محسوس کیا چنانچہ ایک رات اس نے فتح محمد کا کام تمام کر دیا۔

چند ماہ امن و امان سے گزر گئے پھر ریاض اور فیاض کے رویے میں نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ زاہدہ نے محسوس کیا کہ وہ دونوں اسے اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ یہ وہ کیسے ہونے دیتی۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں ان کے خلاف کوئی چال چلتے، اس نے سلطان کی مدد سے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

زاہدہ کے اقبالی بیان میں کس حد تک حقیقت تھی اس کو چیک کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے بیان کی تصدیق یا تردید صرف وہ دونوں بھائی ہی کر سکتے تھے جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے تھے۔ البتہ، اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش کرنا ممکن نہیں تھا کہ زاہدہ ایک لالچی، سازشی اور مجرم ذہن عورت تھی۔

زمین و جائداد کا لالچ اور دولت کی ہوس بہت ہی گھناؤنی اور خطرناک ہوتی ہے۔ یہ اپنے، بے گانے کا فرق مٹا کر انسان کو تباہی و بربادی کے عمیق غار میں پھینک دیتی ہے۔ یہی حرص اور ہوس زاہدہ کو بھی لے ڈوبی۔ جس مقصد کے حصول کے لیے اس ایک نے تین انسانی جانوں کو ختم کر ڈالا وہ پورا نہ ہو سکا۔

وہ اپنے گلے میں ''تین بنا ایک'' کا طوق سجا کر جیل چلی گئی۔ اسے تو اپنے کیے کی سزا ملی سو ملی لیکن اس کے کرتوتوں کا سب سے زیادہ خمیازہ ننھے فرمان علی کو بھگتنا پڑا تھا۔ وہ معصوم دو سال کی عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہوا اور تین سال کی عمر میں ممتا کی گود اس سے چھن گئی۔

پتا نہیں، اس جھمیلے میں اس بے چارے کا کیا قصور تھا!

(تحریر حُسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیدھی چال

ملک صفدر حیات

ایک پیچیدہ اور ٹیڑھے کیس کی روداد۔ ملک صاحب نے ایک سیدھی چال چلی اور نتائج حاصل کر لیے ...لیکن مسئلہ پیدا ہونے سے حل ہونے تک کیسے کیسے مرحلے آئے یہ آپ کو کہانی پڑھ کر معلوم ہوگا!

فروری کے ابتدائی ایّام تھے۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ موسم بڑا خوش گوار اور فرحت بخش ہو رہا تھا۔ ایسی ہی ایک صبح میں ناشتے سے فارغ ہو کر تھانے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں اپنے کوارٹر کے اکلوتے کمرے سے باہر نکلا اور دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

اس وقت عموماً کوئی نہیں آیا کرتا تھا۔ تھانے میں اگر میری ضرورت پیش آجاتی تو وہ لوگ دروازہ کھٹ کھٹانے کے بجائے میرا انتظار کرتے تھے کیونکہ چند منٹ بعد مجھے تھانے کے اندر پہنچنا ہی ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہوگئی تھی یا پھر...!

اسی لمحے ایک مرتبہ پھر دستک کی آواز ابھری۔ یہ اور اس سے پہلے والی دستک میں ایک خاص نوعیت کی احتیاط اور نزاکت پائی جاتی تھی جیسے دروازہ بجانے والا ہاتھ کسی مرد کا نہیں بلکہ کسی نازک اندام حسینہ کا ہو!

''کوئی حسینہ صبح ہی صبح میرا دروازہ کھٹ کھٹانے کیوں چلی آئی...!'' میں زیرِلب بڑبڑاتے ہوئے، صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہاں تیسری دستک کی آواز ابھرتی، میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔

کھلے ہوئے دروازے نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی اور تصدیق بھی ڈبل ... وہاں ایک نہیں، بلکہ دو حسینائیں کھڑی تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''کیا بات ہے...تم دونوں کون ہو اور یہاں کیا لینے آئی ہو؟''

انہوں نے بہ یک وقت دائیں بائیں دیکھا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ انہیں وہاں کسی نے دیکھا تو نہیں پھر ان میں سے ایک نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''تھانے دار جی! ہم آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنے آئے ہیں۔ ہمیں اندر آنے دیں۔''

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے سرتاپا ان کا جائزہ لیا پھر لمحاتی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے...آجاؤ!''

وہ دونوں میرے کوارٹر میں داخل ہوگئیں۔ میں نے بیرونی دروازہ بھیڑ دیا اور انہیں اپنے پیچھے چلاتے ہوئے کمرے میں لے آیا۔ میں خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور انہیں چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔

انہوں نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

وہ دونوں تقریباً ہم عمر نظر آتی تھیں لیکن قد و قامت اور جسامت میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ان میں سے ایک دراز قامت اور گندمی رنگت کی تھی جب کہ دوسری پستہ قامد اور گوری چٹی تھی۔ یہ لڑکی حسن و جمال میں بھی دوسری، دراز قد لڑکی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ، آپ لوگ مجھ سے کون سی ضروری بات کرنے آئی ہو...اور اُدھر تھانے میں آنے کے بجائے میرے کوارٹر کا رخ کیوں کیا لیکن ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے اپنا تعارف بھی کرا دو۔''

''تھانے دار جی!'' دراز قامت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام جمیلہ ہے اور یہ نبیلہ ہے۔'' اس نے اپنی ساتھی لڑکی کی جانب اشارہ کیا اور مزید بتایا۔ ''ہم دونوں اسی قصبے کی رہنے والی ہیں...اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہم تھانے کے بجائے اِدھر کیوں آئی ہیں تو...!'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''دراصل بات یہ ہے کہ ہم چھپ چھپا کر یہاں آئی ہیں۔ ہم نہیں چاہتیں کہ کسی کو ہمارے یہاں آنے کا پتا چلے۔ اگر ہم تھانے میں آتیں تو آپ کے عملے کو خبر ہو جاتی۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اچھا...!'' میں نے گھور کر جمیلہ کی طرف دیکھا۔ ''تم لوگ چھپ چھپا کر مجھ سے ملنے آئی ہو اس کا مطلب ہے، کوئی بہت ہی سنگین مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟''

اب تک صرف جمیلہ ہی نے مجھ سے بات کی تھی۔ گوری چٹی نبیلہ اس کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق، ان کی عمریں بیس اور پچیس کے درمیان تھیں۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ نبیلہ تیئس سال کی اور جمیلہ پچیس سال کی تھی۔ اس مرتبہ بھی جمیلہ ہی نے میرے سوال کا جواب دیا بلکہ یہ جواب سوال نما تھا۔

''تھانے دار جی! مسئلہ واقعی سنگین ہے اور آپ وعدہ کریں کہ اس سلسلے میں ہماری... میرا مطلب ہے، نبیلہ کی مدد ضرور کریں گے!''

''مسئلہ سنے بغیر میں تم لوگوں سے کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بھی بتاؤ کہ تم دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ تم بہنیں تو نہیں ہوسکتی ہو!''

''ہم دونوں بڑی گہری سہیلیاں ہیں۔'' جمیلہ نے بتایا۔ ''اسی دوستی کی وجہ سے نبیلہ کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا جو میں اسے لے کر آپ کے پاس آگئی ہوں۔ صرف ایک آپ ہی ہیں جو ہماری مدد کرسکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے، آپ بہت ہی ایماندار اور اصول پرست تھانے دار ہیں۔ غلط بات کوئی امیر، وزیر یا چوہدری بھی کررہا ہو، آپ اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے اور نہ ہی اس سے دب کر، ناانصافی کرتے ہیں۔ آپ اپنے فرائض میں کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔''

''تم نے میرے بارے میں جو کچھ بھی سنا ہے وہ غلط نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہید خاصی طویل ہوگئی ہے۔ اب تم نبیلہ کے مسئلے کی طرف... بلکہ نبیلہ! تم خود اپنا مسئلہ مجھے بتاؤ؟''

نبیلہ نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ایک لمحے کے توقف سے مستفسر ہوئی۔ ''تھانے دار جی! کیا بیٹیاں بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں...؟''

''نہیں...!'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سوال کے الفاظ میں دکھ ہی دکھ بھرا ہوا تھا۔ ''یہ بات تم سے کس نے کہہ دی۔ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت اور اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہوتی ہیں۔ انہیں نہ تو بوجھ سمجھنا چاہیے اور نہ ہی بھیڑ بکریاں...''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن مجھے تو ایسا ہی سمجھا جارہا ہے۔''

اس کی گلوگیری کو دیکھتے ہوئے میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''نبیلہ! لگتا ہے، تمہارے گھر میں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے، خصوصاً تمہارے رشتے یا شادی کے حوالے سے؟''

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟''

''تمہاری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور رندھی ہوئی آواز نے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیٹی! مجھے تھانے داری کرتے ہوئے کئی سال ہوگئے ہیں۔ جس طرح تم اپنے ہاتھوں اور ان کی انگلیوں کو پہچانتی ہو، بالکل ویسے ہی میں اپنے پاس آنے والے لوگوں اور ان کے مسائل سے واقف ہوجاتا ہوں۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نبیلہ بیٹی! تمہاری ذہنی کیفیت اور جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے والدین زبردستی تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے کرنا چاہتے ہیں جو تمہیں ذرا بھی پسند نہیں اور یہ کہ... تم کسی اور کو پسند کرتی ہو... ہیں نا؟''

نبیلہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے استفسار کے جواب میں کچھ کہتی، جمیلہ جلدی سے بول اٹھی۔ اس کے لہجے میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی۔

''تھانیدار جی! کیا یہ کہانی ہم سے پہلے ہی آپ کے پاس پہنچ چکی ہے؟''

''نہیں!'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''پہلے تم دونوں یہاں پہنچی ہو، پھر یہ کہانی... میں نے بتایا ہے نا، میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نبیلہ کے بارے میں ایک اندازہ قائم کیا ہے اور مجھے قوی امید ہے، یہ اندازہ غلط نہیں ہوسکتا!''

''آپ یا تو غیب داں ہیں... یا پھر کوئی نجومی!'' جمیلہ نے حیرت آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے گناہ گار نہ کرو بیٹی!'' میں نے تنبیہی انداز میں انگلی ہلاتے ہوئے جمیلہ سے کہا۔ ''غیب داں صرف خدا کی ذات ہے اور علم نجوم سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب میرے پیشہ ورانہ تجربے کا نچوڑ ہے۔ اگر میں نے کچھ بھی غلط کہا ہے تو تم اس کی تردید کرسکتی ہو!''

''آپ نے بالکل ٹھیک بتایا ہے تھانیدار جی۔'' نبیلہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''تم لوگوں کی آمد سے قبل میں تھانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ تم نے جو کچھ بھی کہنا ہے، مختصر اور مؤثر الفاظ میں کہہ ڈالو۔ ورنہ اُدھر سے اگر کوئی مجھے بلانے یہاں آ گیا تو تمہاری، میرے پاس موجودگی کا راز کھل جائے گا اور... تم لوگ ایسا نہیں چاہو گی!''

نبیلہ نے سہمی ہوئی نظروں سے جمیلہ کی طرف دیکھا اور اضطراری لہجے میں بولی۔ ''جمیلہ! تم ہی جلدی جلدی تھانیدار جی کو سب کچھ بتا دو۔ میں ٹھیک طرح بات نہیں کر سکوں گی۔''

نبیلہ کا اشارہ پا کر جمیلہ شروع ہو گئی۔

آئندہ دس منٹ کی گفت و شنید میں نبیلہ کے جو تازہ ترین حالات مجھ تک پہنچے، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ بھی نبیلہ کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، نبیلہ نہایت ہی حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے لیے بعض اوقات ان کا حسن ہی سب سے بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔ بے چاری نبیلہ کے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کی صورتِ حال تھی۔ وہ گاؤں ہی کے ایک نوجوان انور علی کو پسند کرتی تھی اور ظاہر ہے، اس سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی ماں عائشہ بی بی کو اس کے جذبات، احساسات اور پسند کی ذرا پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے زبردستی اس کی شادی چوہدری مشتاق سے کرنا چاہتی تھی۔ نبیلہ کے مطابق، چوہدری مشتاق ایک عیاش شخص تھا اور عمر میں اس کے باپ سے بھی دس سال بڑا تھا۔ ''شادی'' کا لفظ تو وہ اس کی ماں کو تسلی دینے کے لیے استعمال کر رہا تھا ورنہ اس کی نظروں میں نبیلہ کی حیثیت کسی خوبصورت کھلونے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ چند روز تک اس دلکش کھلونے سے اپنا دل بہلاتا پھر اسے کہیں بھی پھینک دیتا۔ وہ ایک شادی شدہ اور پوتوں، پوتیوں، نواسوں، نواسیوں والا شخص تھا۔ اس عمر اور حالات میں وہ نبیلہ سے باقاعدہ شادی کر کے حویلی میں اپنے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ نبیلہ اور جمیلہ کو یقین تھا کہ اگر چوہدری مشتاق نے عائشہ بی بی سے ایسی کوئی بات کی تھی تو یہ دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور... عائشہ بڑی خوب صورتی سے یہ دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ چوہدری مشتاق واقعی اس کی بیٹی کو چوہدرائن بنائے گا۔ اس طرح وہ خود چوہدری کی ساس بن جائے گی، پھر پورے گاؤں میں اس کی ٹور نکل آئے گی۔ نبیلہ یہ چاہتی تھی کہ میں اس کی ماں کو سمجھاؤں تاکہ وہ چوہدری مشتاق کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔ اسی مقصد سے وہ دونوں میرے پاس آئی تھیں۔ ان کی نظر میں ایک میں ہی تھا جو اس مسئلے کو حل کر سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کچھ بھی کروں... عائشہ بی بی کو سمجھاؤں یا چوہدری سے بات کروں، نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ نبیلہ، چوہدری مشتاق کے ہتھے چڑھنے سے بچ جائے!

میں نے پوری توجہ سے یہ قصہ سنا اور جمیلہ کے خاموش ہونے پر نبیلہ سے پوچھا۔ ''نبیلہ بیٹی! کیا تمہارا باپ حیات ہے؟''

''جی ہاں'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میرے ابو کا نام حیات ہی ہے۔''

''میں نے تمہارے باپ کا نام نہیں پوچھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تمہارا باپ زندہ ہے؟''

''جی، میرے ابو زندہ ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تمہارے باپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ تمہاری ماں، تمہارے ساتھ کیا کرنے والی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو کو سب پتا ہے جی۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تو کیا تمہارا باپ بھی اس سازش میں اپنی بیوی کا حامی ہے؟''

''نن... نہیں جی۔'' اس نے بڑی سرعت سے نفی میں گردن ہلائی۔

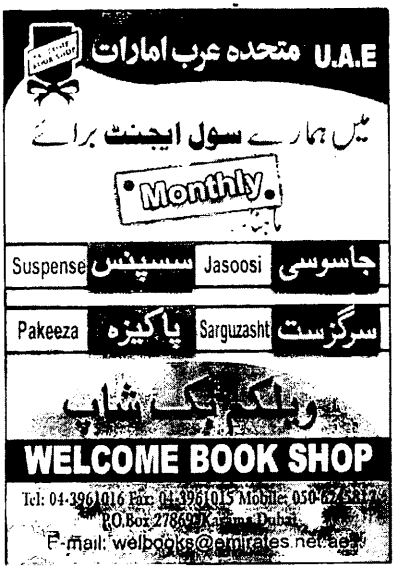

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر...؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ جی..." وہ متذبذب انداز میں بولی۔ "گھر میں صرف امی کی چلتی ہے۔"

جمیلہ نے اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تھانیدار جی! بات دراصل یہ ہے کہ نبیلہ کی امی بڑی جلال والی اور من مانی کرنے والی عورت ہے۔ حیات چاچا کی تو اس کے سامنے ذرا نہیں چلتی۔ گھر میں، ایک طرف کسی کونے میں خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ عورتوں کا تو یہ خیال ہے کہ...!"

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی تو میں نے دریافت کیا۔ "ہاں بتاؤ، بعض عورتوں کا حیات کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ جی... وہ کہتی ہیں، عائشہ نے اپنے خاوند کو الو کا گوشت کھلایا ہوا ہے۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اسی لیے چاچا حیات الو بنا ایک طرف پڑا رہتا ہے اور بیوی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتا۔"

الو کے گوشت اور خون کے حوالے سے متعدد داستانیں سالہا سال سے چلی آرہی ہیں۔ ہوسکتا ہے، ان میں کچھ سچائی بھی ہو لیکن اس سلسلے میں چونکہ میرا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لیے کوئی حتمی رائے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ سنا ہے، الو کا خون اور گوشت مختلف قسم کے سفلی عملیات میں استعمال ہوتا ہے!

"ہوں...!" میں نے جمیلہ کی وضاحت کے جواب میں ایک گہری سانس خارج کی اور نبیلہ سے پوچھا۔ "تمہارے اور بھائی بہن بھی ہوں گے؟"

"صرف ایک چھوٹا بھائی ہے جی۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ "اس کا نام یعقوب ہے جس کی عمر پندرہ سال کے قریب ہوگی۔"

"پندرہ سال کوئی کم عمر نہیں ہوتی نبیلہ!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس عمر میں لڑکا بھرپور جوان ہوجاتا ہے اور بھائی تو ہمیشہ سے بہنوں کے حامی رہے ہیں۔ کیا یعقوب کو تمہارا کوئی خیال نہیں... اسے تمہارے حالات کی خبر تو ہے نا؟"

"جسے خود اپنی خبر نہ ہو وہ دوسروں کی کیا خبر رکھے گا۔" اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اپنی خبر نہ ہو... کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی آواز ایسی بھرائی تھی کہ میرے سوال کے جواب میں کچھ بتا نہ سکی۔ اس نازک مرحلے پر اس کی دوست جمیلہ مدد کو لپکی اور اس نے مجھے بتایا۔

"تھانیدار جی! یعقوب مستانہ ہے... اللہ لوگ ہے... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں بیٹی۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ نبیلہ کے نامساعد بلکہ افسوس ناک حالات سن کر میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھر آئے تھے اور میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے اس مصیبت سے ضرور نکالوں گا لہٰذا میں نے اسی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"نبیلہ بیٹی! تم بے فکر ہوکر گھر جاؤ اور آئندہ کے لیے چھپ چھپا کر تھانے یا میرے کوارٹر میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارا مسئلہ بڑی توجہ سے سن اور سمجھ لیا ہے۔ میں اپنے طور پر تھوڑی تفتیش کروں گا۔ اگر تمہارے بیان کردہ حالات میں صداقت نظر آئی تو یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ عائشہ بی بی تمہاری مرضی کے خلاف زبردستی کہیں بھی تمہاری شادی نہیں کرسکے گی۔ اس سلسلے میں تم بالکل مطمئن ہوجاؤ۔"

"بہت بہت شکریہ تھانیدار جی۔" وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔ "اور آپ پورا بھروسا رکھیں کہ میں نے ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر روئے سخن جمیلہ کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"جمیلہ! تمہارے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے؟"

"نہیں جی...!" اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلادی۔

"چاچا، چاچی تو بہت اچھے ہیں جی۔" نبیلہ نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "میرا مطلب ہے، جمیلہ کی امی اور ابو...!"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا تھا بیٹی۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

جمیلہ بولی۔ "نبیلہ واقعی سچ کہہ رہی ہے تھانیدار جی! میرے امی ابو بہت ہی سمجھ دار ہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے ہمیشہ اچھا سوچا ہے۔ مجھے یقین ہے، ہماری شادیاں بڑے امن وامان سے ہوجائیں گی۔"

"تم لوگ کتنے بھائی بہن ہو؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

"ہم تین بہنیں ہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔ "ہمارا کوئی بھائی نہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بیٹی یا بیٹا دینا قدرت کے ہاتھ میں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان معاملات میں انسان کا بس نہیں چلتا۔ ویسے بھی بیٹی اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ تم بہنوں کو بھائی کی کمی تو ضرور محسوس ہوتی ہوگی لیکن اس دنیا میں سب کو، سب کچھ نہیں ملتا۔ قدرت کی طرف سے جو عطا ہو، اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور... جو بھی محرومی ہو، اس پر صبر کرنا چاہیے۔ اس حکمت کو اگر عملی زندگی میں داخل کرلیا جائے تو جیون بڑا پُرسکون ہوجاتا ہے۔''

انہوں نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے تسلی تشفی دے کر انہیں اپنے کوارٹر سے رخصت کردیا۔ ان کے جانے کے بعد، میں نے جلدی جلدی یونیفارم پہنی اور اپنی ڈیوٹی پر ''حاضر'' ہوگیا۔ تھانے کے حالات معمول کے مطابق تھے۔

اس روز میں خلافِ معمول تھوڑی تاخیر سے تھانے پہنچا تھا لیکن تھانے کے عملے نے میری اس ''دیری'' کو محسوس نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آج کل راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا!

☆☆☆

بزرگوں کو کہتے سنا ہے اور میرے تجربے میں بھی آیا ہے کہ اپنی خوشی، سکون، آسائی، آرام اور چین کا زیادہ تذکرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ان معاملات کو جتنا محدود رکھا جائے، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اگر چرچا حد سے تجاوز کرجائے تو پھر خوشیوں کو فوراً ہی نظر بھی لگ جایا کرتی ہے اور ایسا ہی معاملہ اس روز میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ان دنوں تھانے میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ میں تھانے آیا تو اے ایس آئی وحید راٹھور میرے کمرے میں آگیا۔ وحید ایک تجربہ کار اور سمجھ دار پولیس اہلکار تھا۔ مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اور اس مختصر سی مدت میں، میں نے وحید کے جوہر دیکھ لیے تھے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس پر مکمل بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ میں نے آزمائش کے لیے ایک دو شن میں اسے اپنے ساتھ بھی رکھا تھا اور اس کی کارکردگی کو تسلی بخش پایا تھا۔ فارغ اوقات میں وہ میرے کمرے میں آجاتا اور ہمارے درمیان دنیا کے ہر موضوع پر آزادانہ گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ وحید راٹھور کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہوجایا کرتی ہے۔

اس روز بھی میں اور وحید اپنی فرصت اور فراغت پر بات کررہے تھے کہ یہ چرچا قدرت کو پسند نہیں آیا اور دوپہر سے پہلے ہی ہمارے لیے مصروفیت کی بھرمار ہوگئی۔ تین چار ایسے معاملات آن پڑے تھے کہ انہیں نمٹانے میں شام ہوگئی۔ ذرا سانس لینا نصیب ہوا تو مجھے یاد آیا کہ نبیلہ والے مسئلے پر مجھے وحید راٹھور سے بات کرنا تھی۔ وحید اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ مقامی ہونے کے ناتے اسے یہ آسانی حاصل تھی کہ وہ وہاں کے لوگوں کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا اور ان کے حوالے سے بہ نسبت زیادہ سہولت کے ساتھ معلومات اکٹھا کرسکتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

''وحید...!'' وہ آکر میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں تمہیں سب کچھ معلوم ہوگا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

وحید راٹھور کی عمر پینتیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ وہ پکے رنگ کا ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس نے خاصی بھاری مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے۔ وہ کم گو تھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا لیکن مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی کم گوئی غائب ہوجاتی تھی، البتہ لہجے کا ٹھہراؤ برقرار رہتا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''ملک

BEFORE
AFTER
بطور خاص خواتین کیلئے
اب آپ کو بار بار تھریڈنگ یا ویکسنگ کی ضرورت نہیں
SHINE ON STRIPS
جو ایک خاص پٹیاں ہیں۔ ان فاضل بالوں کو جو آپ کے چہرے کلائیوں پنڈلیوں پر موجود ہوں یہ ٹریٹمنٹ بالوں کو اگنے نہیں دیتا اور چہرے کے کیل مہاسے داغ دھبوں کو دور کرتا ہے
چہرے کیلئے قیمت 450 روپے،
محصول خرچ 50 روپے،
دیگر حصوں کیلئے قیمت 1350 روپے،
گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر رقم پی او سے طلب فرمائیں یا E-mail کریں۔
fairy.perfumers@hotmail.com
فیری پرفیومرس پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی۔ 74600
fp

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب! اس گاؤں کے ایک ایک بندے کو جاننے کا دعویٰ تو میں نہیں کرسکتا لیکن یہ ہے کہ تقریباً سبھی سے دعا سلام ہے مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا کوئی مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے؟''

اس نے اپنی بات کو سوالیہ جملے پر چھوڑا تو میں نے کہا۔ ''فی الحال تو کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن روک تھام نہ کی گئی تو آگے چل کر مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے۔'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل، میں گاؤں کے چند لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں چوہدری مشتاق، حیات احمد اور اس کی بیوی عائشہ بی بی، ان دونوں کی بیٹی نبیلہ اور بشیر ترکھان کے بیٹے انور علی کے نام شامل ہیں...''

وحید راٹھور نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ملک صاحب! ان تمام افراد سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ آپ کو ان کے بارے میں کس قسم کی معلومات درکار ہیں!''

''میں سمجھاتا ہوں'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ حیات احمد کی بیوی عائشہ اپنے خاوند کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ وہ بے چارہ کسی الو کے مافق گھر کے کونے کھدرے میں پڑا رہتا ہے۔ گھر کے کسی معاملے میں، اس کو شامل نہیں کیا جاتا اور... عائشہ بالا ہی بالا نبیلہ کی شادی چوہدری مشتاق سے کرنے والی ہے جب کہ نبیلہ، چوہدری سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ بشیر ترکھان کے بیٹے انور علی کو پسند کرتی ہے... یہ ہے ساری کہانی۔'' میں لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس کہانی کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کیا جاسکے!''

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں بشیر ترکھان کے اکلوتے بیٹے انور علی کو تو جانتا ہوں لیکن مجھے یہ پتا نہیں کہ کوئی نبیلہ اس کو پسند کرتی ہے، البتہ... جہاں تک حیات احمد کی گھر والی عائشہ کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ خاصا گڑبڑ ہے...!''

''معاملہ خاصا گڑبڑ ہے... کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ رازدارانہ انداز میں بتانے لگا ''ملک صاحب! میری معلومات کے مطابق، عائشہ اچھے کردار کی عورت نہیں۔''

''میں نے سنا ہے، اس نے اپنے خاوند کو الو کا گوشت کھلا رکھا ہے۔'' میں نے بدستور چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں تمہارا اشارہ اس جانب تو نہیں وحید؟''

''نہیں...!'' اس نے بڑی شدت نفی میں گردن ہلائی۔ ''جناب! الو کے گوشت والی کہانی تو میرے علم میں نہیں... میرا اشارہ چوہدری صاحب کی طرف ہے۔''

''چوہدری صاحب... تمہارے کہنے کا مطلب ہے، چوہدری مشتاق؟'' میری حیرت میں اضافہ ہوگیا۔

''جی ... میں چوہدری مشتاق ہی کی بات کررہا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''لیکن...'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''چوہدری مشتاق اور عائشہ کا آپس میں کیا تعلق؟''

''ملک صاحب! میں نے مرکر اپنی قبر میں جانا ہے۔'' وحید راٹھور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے چونکہ اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا، اس لیے دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر...'' وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''مگر گاؤں میں عائشہ کے حوالے سے کوئی اچھا تاثر نہیں پایا جاتا۔ لوگ، ظاہر ہے کہ چوہدری سے ڈرتے ہیں اور اس کی ناراضی کو برداشت نہیں کرسکتے اس لیے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموش رہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے خیال میں عائشہ کوئی باکردار عورت نہیں۔ اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ چوہدری مشتاق سے اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔''

''تو کیا... چوہدری مشتاق اس ٹائپ کا بندہ ہے؟'' میں نے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔

اے ایس آئی نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ہوں...!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''میں نے سنا ہے، چوہدری مشتاق ساٹھ کے پیٹے میں ہے اور... عائشہ بھی پینتالیس کے اریب قریب ہے۔ اس عمر میں، جبکہ اولاد بھی جوان ہوچکی ہو تو انسان میں خاصا ٹھہراؤ آجاتا ہے لیکن...؟''

میں نے پُرسوچ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وحید راٹھور نے جلدی سے کہا۔ ''ملک صاحب! آپ نے مردوں کے حوالے سے وہ محاورہ تو سنا ہوگا۔ ساٹھا پاٹھا... تو اپنے چوہدری مشتاق کا شمار بھی ایسے ہی مردوں میں ہوتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوا اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ عائشہ پینتالیس سال کی ہے لیکن شاید آپ نے اسے دیکھا نہیں...!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں، میں نے اسے دیکھا نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیوں... کیا کوئی خاص بات؟''

''وہ بہت خوبصورت عورت ہے۔'' وحید نے پُرمعنی لہجے میں بتایا۔ ''دیکھنے میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔ وہ کیا کہتے ہیں...'' وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''عائشہ نے سدا بہار جوانی پائی ہے...!''

''ایک ساتھا پاٹھا اور دوسری سدا بہار...!'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''لیکن وحید... ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی!''

''کون سی بات ملک صاحب؟'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''اگر عائشہ ''اس'' درجے پر چوہدری سے منسلک رہی ہے تو وہ اپنی بیٹی کی شادی چوہدری سے کیسے کرسکتی ہے۔ کیا اس میں اتنی سی عقل بھی نہیں؟''

''یہی بات مجھے بھی ہضم نہیں ہورہی ملک صاحب!'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کہا ہے تو میں اس معاملے پر غور کررہا ہوں ورنہ مجھے یقین تو بالکل نہیں آیا۔ یہ ٹھیک ہے، عائشہ ایک حسین وجمیل عورت ہے اور اس کی بیٹی نبیلہ بھی اسی پر گئی ہے لیکن چوہدری مشتاق اس مزاج کا آدمی نہیں کہ وہ کسی مرحلے پر ان سے شادی کے لیے تیار ہوجائے۔ یہ تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند والی بات ہوگی۔ چوہدری اپنی عیاشی کے لیے تو... خیر، چھوڑیں ملک صاحب! مجھے مرکر خدا کو جواب دینا ہے۔ میں کسی کی عیب جوئی کرکے خوامخواہ گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔''

''میں بھی یہ نہیں چاہوں گا کہ تم گناہ گار ہو۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ تو پتا چلنا چاہیے کہ اس، شادی والی کہانی کی حقیقت کیا ہے؟''

''اس کے لیے تھوڑی تحقیق کرنا پڑے گی ملک صاحب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، تم آج ہی سے اس منصوبے پر کام شروع کردو۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اور جیسے ہی کوئی مثبت یا منفی نتیجہ سامنے آئے، تم فوراً مجھے آگاہ کرو۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر ملک صاحب!'' وحید راٹھور نے فرمانبرداری سے کہا۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کس کیس پر کام کررہے ہیں...؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وحید! تم میرے بھروسے کے آدمی ہو۔ اس بات کو خود تک ہی محدود رکھنا...'' میں نے ذرا توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''وہ دراصل آج صبح عائشہ کی بیٹی نبیلہ اپنی ایک سہیلی جمیلہ کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے مجھے ان تشویش ناک حالات سے آگاہ کیا ہے اور ساتھ ہی روتے ہوئے مجھ سے یہ التجا بھی کی کہ میں کسی بھی طرح اس شادی کو روکنے کی کوشش کروں۔ وہ چوہدری مشتاق سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اس کی خواہش تو یہی ہے کہ بشیر ترکھان کے لڑکے سے اس کی شادی ہو مجھے تو یہ بچی نبیلہ بہت ہی دکھی اور ستم رسیدہ لگتی ہے!''

''جو حالات آپ نے بتائے ہیں ان کی روشنی میں تو نبیلہ واقعی ہمدردی اور مدد کی مستحق ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جس حد تک ممکن ہو اور ہمارے اختیار میں ہو، ہمیں اس کی مدد کرنا بھی چاہیے۔'' وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر مجھ سے سوال کردیا۔

''ملک صاحب! نبیلہ آج صبح کس وقت تھانے آئی تھی؟''

''وہ تھانے نہیں، بلکہ میرے کوارٹر پر آئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں تھانے آنے کی تیاری کررہا تھا اسی لیے آج میں قدرے دیر سے اپنے کمرے میں پہنچا ہوں۔''

''اوہ...!'' اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! آپ مجھے صرف دو دن دے دیں۔ میں تیسرے دن اس معاملے کی مکمل رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کردوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اس موضوع پر ہم دو دن بعد یعنی، تیسرے روز بات کریں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اے ایس آئی وحید راٹھور نے مجھ سے دو دن کی مہلت لی تھی لیکن اسے یہ تحقیق مکمل کرنے کا بھرپور موقع نہ مل سکا کیونکہ دوسرے دن کی صبح کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ یہ معاملہ کسی اور ہی سانچے میں ڈھلتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

فروری کی آٹھ تاریخ کو میں تھانے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آگیا۔ مجھے اپنے کمرے کے باہر شور سا سنائی دیا جیسے چند افراد آپس میں جھگڑا کررہے ہوں۔ میں نے کانسٹیبل گل فراز کو آواز دے کر اپنے پاس بلایا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صورتِ حال جاننے کی کوشش کی۔

''گل فراز! یہ باہر کیا چھلی بازار بنا ہوا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ملک صاحب! چوہدری کے بندے ایک جوان کو مارتے ہوئے تھانے لائے ہیں۔ وہ اس کے خلاف کوئی اغوا شغوا کی رپورٹ درج کروانا چاہتے ہیں۔''

''کون ہے وہ بدبخت؟'' میں نے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''وہ کم ذات، بدبخت یہ ہے تھانیدار صاحب...!'' کانسٹیبل کے بجائے کسی اور نے میرے سوال کا جواب دیا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر گل فراز کے عقب میں دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں بولنے والے کا چہرہ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ ایک ہٹا کٹا، دراز قامت شخص تھا جس نے ایک جوان کو کالر سے دبوچ رکھا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بدبخت شخص یہی تھا جس کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے، دو تین مزید افراد بھی نظر آئے جن میں ایک خوبصورت عورت بھی شامل تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک پستہ قامت بندے نے معتوب شخص کو بازو سے تھام لیا اور قدرے درشت لہجے میں بولا۔

''تھانیدار جی! اس کمینے کو حوالات میں بند کر دیں۔''

مجھے اس بندے کا انداز بہت برا لگا۔ میں نے معتوب شخص کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی سے پوچھ لیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میرا نام خوشیا ہے اور ہم چوہدری صاحب کے خاص بندے ہیں۔''

اس نے اپنے دراز قامت ساتھی کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ دارا ہے... دارا مرکی والا۔''

مذکورہ دراز قامت شخص کے ایک کان میں بالی ڈلی ہوئی تھی۔ گاؤں دیہات میں کان کے اس زیور کو مرکی کہا جاتا ہے۔ مرکی والا ہٹا کٹا شخص وہی تھا جس نے اس جوان کو کالر سے دبوچ رکھا تھا۔ خوشیا نے اسی حوالے سے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا تھا۔

میں نے گھور کر پستہ قامت خوشیا کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔ ''تم نے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف تو کرا دیا۔ تم دونوں کے انداز ہی سے پتا چلتا ہے کہ تمہارے پیچھے کسی طاقتور بندے کا ہاتھ ہے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ اس تھانے کا انچارج کون ہے؟''

خوشیا میرے سوال پر بری طرح چونکا پھر اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''جناب تھانیدار تو آپ ہی ہیں۔''

''میں تھانیدار ہوں تو تھانیداری بھی مجھے ہی کرنے دو۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہ بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ کس کو حوالات میں بند کرنا ہے اور کس کو ڈرائنگ روم کی سیر کرانا ہے... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جناب! آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔'' دارا مرکی والا نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم تو ایک خطرناک مجرم کو پکڑ کر آپ کے پاس لائے ہیں اور آپ الٹا ہمیں ہی جھڑک رہے ہیں۔''

''میں الٹا جھڑک رہا ہوں یا سیدھا، اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''دارا! تم پہلی فرصت میں اس کا کالر چھوڑ دو...!''

دارا نے ایک لمحے کے لیے مجھے متذبذب نظر سے دیکھا پھر اس مسکین صورت شخص کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس نے سکھ کی ایک گہری سانس لی اور تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ شکل صورت سے ایک بھلے مانس آدمی دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی... نام کیا ہے تمہارا؟''

''جی... میں انور علی ہوں۔'' وہ ڈرے سہمے لہجے میں بولا۔

''انور علی...!'' مجھے یہ نام شناسا سا محسوس ہوا لیکن فوری طور پر کچھ یاد نہ آ سکا۔ میں نے انور علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے ایسا کون سا خطرناک جرم کیا ہے جو یہ لوگ یوں دھکیل گھسیٹ کر یہاں لائے ہیں؟''

''اس کا جرم میں بتاتی ہوں تھانیدار جی!'' ان کے ساتھ آنے والی خوبصورت عورت نے عصبی لہجے میں کہا۔ ''اس مردود نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔''

''بی بی... تم کون ہو؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میرا نام عائشہ بی بی ہے جناب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''اور میری اکلوتی بیٹی کا نام ہے نبیلہ...!''

''اوہ...!'' ایک منظر میری یادداشت میں گھوم کر رہ گیا۔ ''کیا... کیا تم حیات احمد کی بیوی ہو؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''جی... آپ بالکل ٹھیک پہچانے ہیں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر انور علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اس شیطان نے میری بیٹی نبیلہ کو ورغلا کر پتا نہیں، کہاں غائب کر دیا ہے۔ آپ اس کے خلاف پرچہ کاٹیں جی، اور... اس کی اتنی پٹائی کریں کہ ہاتھ اور پاؤں جوڑ کر نبیلہ کا پتا بتائے۔ اب یہ آپ کے حوالے ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تھانیدار جی! ان دونوں سانڈوں نے پہلے ہی مجھے بہت مارا ہے۔'' انور علی نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''میں چوہدری مشتاق کے ڈر سے مار کھاتا رہا ورنہ... اگر یہ چوہدری کے بندے نہ ہوتے تو...'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

''آپ مجھ سے جس کی بھی قسم لے لیں جناب... میں سچ کہتا ہوں، میں نے نبیلہ کو اغوا نہیں کیا... اور نہ ہی اسے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے جی...'' عائشہ چیخ کر بولی۔ ''ایسی گھٹیا حرکت اس کمینے کے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔''

یہ ساری کہانی اب کھل کر میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے کل صبح ہی نبیلہ کو دیکھا تھا اور اے ایس آئی وحید راٹھور کی زبانی عائشہ کے حسن و جمال کی جو داستان سنی تھی وہ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہو رہی تھی۔ اس کہانی کی ابتدا ہی میں انور علی، نبیلہ، عائشہ، حیات احمد اور چوہدری مشتاق کے حوالے سے میں کافی تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے، آپ بھی اس سچویشن کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

نبیلہ اور انور علی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور آگے چل کر شادی کی خواہش رکھتے تھے مگر عائشہ اپنی بیٹی نبیلہ کی شادی چوہدری مشتاق سے کرنے کی خواہاں تھی۔ نبیلہ، چوہدری کو سخت ناپسند کرتی تھی... بلکہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی اور اس بے جوڑ، غیر منطقی شادی کو رکوانے کے لیے ہی وہ چھپ چھپا کر مجھ سے ملنے، اپنی سہیلی جمیلہ کے ہمراہ میرے کوارٹر پر آئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انور علی مجھے ایسا شخص محسوس نہیں ہوتا تھا جو نبیلہ کے اغوا میں ملوث رہا ہو۔ دوسری جانب چوہدری کے دو مسٹنڈوں کا، انور علی کو زدوکوب کرتے ہوئے تھانے تک لانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ چوہدری، انور کو کسی لمبے چکر میں، طویل عرصے کے لیے فٹ کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ایسا ممکن بھی دکھائی دیتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ نبیلہ کب اور کتنے بجے سے لاپتا ہے۔ اس کے بعد یہ تحقیق قدرے سہل ہو جاتی کہ اس کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو گزشتہ روز صحیح سلامت اسے اپنے کوارٹر سے رخصت کیا تھا۔

میں نے عائشہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''بی بی! تم انور کو کمینہ، کم ذات اور پتا نہیں، کیا کیا کہہ رہی ہو اور تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ، تم کس بنا پر اسے موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو؟''

''یہ... یہ منحوس ہاتھ دھو کر میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔'' وہ انور کی طرف، نفرت انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسے ورغلاتا رہتا تھا۔ پیار محبت کی پٹیاں پڑھا کر اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا اس نے۔ نبیلہ کی گمشدگی میں کسی اور کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا تھانیدار جی۔ میں تو کہتی ہوں، آپ اسے فوراً پھانسی پر لٹکا دیں۔''

عائشہ کا منہ کھلتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک لڑاکا اور زبان دراز عورت تھی۔ اپنی آواز کی بلندی اور الفاظ کی چڑھائی کے بل پر وہ مدِمقابل کو چت کرنے کے چکر میں رہتی تھی۔ ایسی تیز طرار اور جھگڑالو عورتوں سے نمٹنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مجھے حیات احمد کی بے بسی اور بے کسی کا ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا۔ جمیلہ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، عائشہ نے حیات کو الو کا گوشت کھلا رکھا تھا جبھی وہ الو بنا گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا تھا لیکن عائشہ کے ''جلال اور کمال'' کو دیکھتے ہوئے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ایسی عورتوں کو الو کے گوشت یا افریقی گورمیلے کی چربی کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زبان کی دھار ہی سے کام نکال لیتی ہیں۔ اس مزاج کی عورتوں کے شوہر یا تو انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور یا پھر خود کو تپ دق میں مبتلا کر کے ساری عمر خون تھوکتے رہتے ہیں۔

میں نے عائشہ کے ''مطالبے'' کے جواب میں، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بی بی! اگر میں انور کو پکڑ کر فوراً پھانسی پر لٹکا دوں گا تو پھر تمہاری بیٹی کا سراغ کیسے ملے گا۔ یہ تو پھانسی پر لٹکنے کے بعد کچھ بھی سننے یا بتانے کے قابل نہیں رہے گا اس لیے تم جلد بازی سے کام نہ لو اور... اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو۔''

اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا، ندامت آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ جی... میرا مطلب یہ تھا کہ یہ مردود کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔''

''تم نے چوہدری مشتاق کے بندوں کے زور پر اسے تھانے پہنچوا دیا ہے۔ اس وقت یہ میرے قبضے میں ہے۔ تم اس کے اِدھر اُدھر ہونے کی ذرا فکر نہ کرو۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر دارا مرکی والا اور خوشیا کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''تم دونوں باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ اگر کسی مرحلے پر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں اندر بلا لوں گا۔''

انہوں نے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔ان کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتے، میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔ گمشدہ لڑکی کی ماں سے میں بات کر رہا ہوں نا اور... تمہارا پیش کردہ ملزم بھی میرے قبضے میں ہے...؟'' پھر میں نے کانسٹیبل گل فراز کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ان دونوں کو بتاؤ کہ تھانے کا برآمدہ کس طرف ہے اور اس برآمدے میں لکڑی کی بینچ کدھر بچھی ہے...!''

گل فراز میرا اشارہ پاکر ان کی جانب بڑھا تو وہ ناگوار نظروں سے کانسٹیبل کو گھورتے ہوئے خود ہی برآمدے کی سمت قدم بڑھانے لگے۔ کانسٹیبل نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے کہا۔

''گل فراز! تم انور کو حوالدار کے پاس لے جاؤ اور خود بھی وہیں بیٹھو۔ اس سے میں بعد میں بات کروں گا۔''

''او کے سر...!'' گل فراز نے فرمانبرداری سے کہا اور انور کو ہاتھ سے پکڑ کر میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں اپنے سامنے بیٹھی تیز طرار عائشہ کی طرف متوجہ ہوگیا اور کہا۔ ''بی بی! تم کوئی فکر نہ کرو۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تمہاری بیٹی کے اغوا میں انور کا ہاتھ ہے تو میں اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا جسے دیکھ کر کسی کو پھر ایسے سنگین جرم کی جرأت نہیں ہوگی لیکن...''

''لیکن کیا جی...؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے کہا۔ ''لیکن یہ کہ... اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی کو فوراً بازیاب کروں تو تمہیں مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔''

میں عائشہ کی زبان کھلوانے اور اسے اپنے اعتماد میں لینے کے لیے غیر محسوس انداز میں گھس رہا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''جی... میں تو ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ آپ حکم تو کریں۔''

اس نے ''آپ حکم تو کریں'' کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا کہ اگر میں مضبوط سوچ کا مالک نہ ہوتا تو کسی زبردست غلط یا خوش فہمی کا شکار ہوسکتا تھا۔ ان لمحات میں عائشہ کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات کوئی اور ہی زبان بول رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کے لیے ذرا بھی پریشان نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اس سے کہا۔

''حکم صرف اتنا ہے کہ میں تم سے جو بھی سوال کروں اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دینا...!''

''جی... پوچھیں آپ۔'' وہ منتظر نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ انور اور نبیلہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور آپس میں شادی کی خواہش رکھتے ہیں؟''

''تھانیدار جی! یہ جو انور ہے نا... یہ بڑا ہی مکار اور عیار بندہ ہے۔ میں جانتی ہوں، نبیلہ کا اس میں کوئی قصور نہیں یہی شیطان میری بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ خود کو اس کا عاشق کہتا ہے۔ بھلا آپ بتائیں... یہ پیار محبت کی باتیں تو اچھی اچھی لڑکیوں کا دماغ خراب کر دیتی ہیں۔ میری نبیلہ تو بڑی سیدھی سادی ہے۔ وہ اس چالاک کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئی ہے۔ لگتا ہے، جیسے اس بدبخت نے نبیلہ پر کوئی جادو کر دیا ہو۔ وہ تو اب میرے سامنے بھی زبان چلانے لگی ہے... میرا مطلب ہے، زبان چلانے لگی تھی۔'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ ''پتا نہیں... میری بچی کس حال میں ہوگی۔ اس مردود نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے، کہاں لے جا کر چھپا دیا ہے میری نبیلہ کو...!''

عائشہ نے میرے سوال کے جواب میں جو جذباتی تقریر کی اس میں کام کی بات کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یعنی تمہارا مطلب ہے، انور کے ورغلانے میں آ کر ہی سہی، نبیلہ بھی اس سے شادی کی خواہاں تھی لیکن تمہیں اس رشتے پر سخت اعتراض تھا؟''

میں غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے عائشہ کو اپنے مقصد کی طرف لا رہا تھا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''جی... انور مجھے ایک آنکھ پسند نہیں۔ میں کبھی بھی نبیلہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔ میری بیٹی تو شہزادی ہے۔ اس لنگور کا اس سے کیا مقابلہ...؟''

انور علی واجبی سی شکل صورت کا مالک تھا لیکن اسے لنگور کہنا سراسر زیادتی والی بات تھی، البتہ نبیلہ کے لیے ''شہزادی'' کا لفظ نہایت ہی موزوں اور مناسب تھا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ میں عائشہ کو جس ٹریک پر لانا چاہتا تھا وہ خاموشی سے ادھر ہی آ رہی تھی۔

ہوسکتا ہے، آپ کے ذہن میں یہ خیال آ رہا ہو کہ ایک لڑکی اغوا ہوگئی اور میں کوئی عملی اقدام کرنے کے بجائے اطمینان سے بیٹھا باتوں میں مصروف ہوں لیکن یہ بتاتا چلوں کہ میں اطمینان سے نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کر کے کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی سمت الل ٹپ دوڑ پڑنا بھی دانش مندی نہیں ہوتی۔ ایسی کارروائی کے نتیجے میں عموماً ناکامیابی اور شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، اسی لیے میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ وہ اشارے اور نکتے جمع کررہا تھا جن کی مدد سے میں چند خطوط واضح کرسکتا اور ان خطوط پر چلتے ہوئے نبیلہ کو بازیاب کروالیتا... پھر مجھے یہ بھی تسلی تھی کہ اس کیس کا ملزم انور علی میری کسٹڈی میں ہے۔

عائشہ کے بعد میں اس کو اپنے پاس بلاتا اور ایک کڑا انٹرویو کرتا مجھے یقین تھا، عائشہ اور انور سے حاصل ہونے والی معلومات کے نتیجے میں، میں نبیلہ کا سراغ لگانے کی پوزیشن میں آجاتا۔

میں نے عائشہ کے طنزیہ الفاظ کے جواب میں مصلحت بردار لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہاری بیٹی کو تو نہیں دیکھا لیکن انور کے بارے میں تمہاری رائے سے مجھے مکمل اتفاق ہے۔ وہ بس ایویں سا ہی ہے۔''

مجھے اپنا ہم خیال پاکر اس کی آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی، جلدی سے بولی۔ ''آپ بڑے سمجھدار تھانیدار ہیں... مجھے یقین ہے، آپ میری بچی کو بہت جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''انشاء اللہ!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''تم جتنے خلوص سے تعاون کررہی ہو اس کے بعد میں بھی بڑا پُرامید ہوں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تو تم نے عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے کہ نبیلہ کو انور سے نہیں بیاہنا لیکن تمہارے ذہن میں، اپنی بیٹی کے حوالے سے کوئی نام... کوئی رشتہ تو ہوگا؟''

''وہ... وہ جی...'' وہ گڑبڑا گئی ''میں نے ابھی اس بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔''

میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ابھی سوچا نہیں... یا مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو؟''

''جی... ایسی تو کوئی بات نہیں!'' اس کی گڑبڑاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں محسوس کررہا ہوں، تمہارے دل اور دماغ میں چوہدری مشتاق کے لیے بڑی گنجائش ہے؟''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بات بناتے ہوئے بولی۔ ''تھانیدار جی! ہمارے چوہدری صاحب ہیں ہی اتنے اچھے کے گاؤں کے سب لوگوں کے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔''

''میں سب گاؤں والوں کی بات نہیں کررہا ہوں عائشہ!'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا ''میرا اشارہ تمہارے دل اور دماغ کی طرف ہے؟''

میں نے اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ گاؤں والے چوہدری کی عزت کس وجہ سے کرتے ہیں۔ کسی طاقتور شخص کے خوف اور ڈر کے سبب اس کا احترام کیا جائے تو وہ اچھا نہیں ہوجاتا۔ بہرحال، عائشہ نے میرے معنی خیز سوال کے جواب میں بتایا۔

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی چوہدری مشتاق کی عزت کرتی ہوں۔''

''اور تمہاری بیٹی نبیلہ چوہدری سے شدید نفرت کرتی ہے؟''

''جج... جی ہاں... جی نہیں...'' وہ لڑکھڑاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں...!''

بات ختم کرکے وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ایسی بات نہیں تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ چوہدری کو تمہاری طرح بہت پسند کرتی ہے... ہوں؟''

''جج... جی ہاں...!'' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔

میں نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے پوچھا ''اگر نبیلہ کو چوہدری مشتاق برا نہیں لگتا، وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تو پھر وہ اس سے شادی کرنے سے کیوں انکاری ہے؟''

''جی...!'' اس نے وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا آپ کو سب پتا ہے؟''

''میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں۔'' میں نے نبیلہ اور جمیلہ سے ہونے والی ملاقات کا ذکر گول کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تھوڑی دیر پہلے تمہی نے کہا تھا کہ میں ایک سمجھدار تھانیدار ہوں۔ ایک سمجھ بوجھ والا تھانیدار اپنے علاقے کے تمام لوگوں کے حالات وواقعات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے لہٰذا تمہیں اس حوالے سے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں کہ میں تمہارے گھریلو معاملات سے کیسے آگاہ ہوگیا ہوں۔ میری پکی معلومات کے مطابق، تم نبیلہ کو چوہدری سے بیاہ کر اس کی ساس بننے کا خواب دیکھ رہی ہو مگر نبیلہ چوہدری مشتاق سے ازحد نفرت کرتی ہے۔ اس کا دل انور علی میں اٹکا ہوا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' میں نے سانس درست کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ کسی بھی قسم کی غلط بیانی یا حقائق کی پردہ پوشی تمہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی بڑی مصیبت میں گرفتار کرسکتی ہے!''

میرے دھمکی بھرے انداز نے اسے راہِ راست پر رکھتے ہوئے، دروغ گوئی کی طرف نہیں جانے دیا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''تھانیدار جی... آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ واقعی، یہ میری خواہش ہے کہ نبیلہ کی شادی چوہدری صاحب سے ہوجائے لیکن...'' وہ تھوڑا متوقف ہوئی، افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکی اور بوجھل آواز میں بولی۔

''لیکن اب تو نبیلہ ہی کہیں غائب ہوگئی ہے... اس الّو کے پٹھے انور نے پہلے اس کے دماغ میں چوہدری صاحب کے خلاف نفرت بھری پھر اسے کہیں غائب کردیا!''

''نبیلہ اگر غائب ہوئی ہے تو بہت جلد مل بھی جائے گی۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس کی تلاش کے لیے میں تم سے زیادہ تشویش میں مبتلا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، میں اسے بہت جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔ فی الحال... ہم چوہدری مشتاق کی طرف آتے ہیں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''عائشہ بی بی! ٹھیک ہے، تمہاری یہ خواہش تھی کہ نبیلہ کی شادی چوہدری مشتاق سے ہوجائے۔ کیا چوہدری بھی اس رشتے کے لیے تیار تھا؟''

''جی... چوہدری صاحب بھی راضی تھے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''چوہدری مشتاق کی عمر کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ میں نے سنا ہے، اس کی اولادوں کی اولادیں بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہیں...؟''

''جی ...'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''چوہدری صاحب پکی عمر کے ہیں۔''

''پکی عمر...؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''چوہدری مشتاق کچھ زیادہ ہی پکی عمر کا نہیں عائشہ... مجھے پتا چلا ہے، وہ نبیلہ کے باپ سے بھی دس بارہ سال بڑا ہے۔ تمہاری مت تو نہیں ماری گئی عائشہ بی بی؟''

''وہ جی... عمر کم یا زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''چوہدری صاحب اس عمر میں بھی بڑے زندہ دل اور صحت مند ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو بی بی...!'' نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے ایک سلگتا ہوا جملہ نکل ہی گیا ''یہ بات تم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا؟''

وہ جھینپ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اے ایس آئی وحید را ٹھور نے مجھے مبہم انداز میں عائشہ اور چوہدری کے پرائیویٹ تعلقات کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، عائشہ کا حالیہ رویّہ اس کی تصدیق کررہا تھا۔ میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''عائشہ بی بی! نبیلہ تمہاری بیٹی ہے۔ تم انور علی کو لنگور کہہ کر مسترد کرچکی ہو اور چوہدری مشتاق تمہاری نظر میں گبرو ہے۔ تم نبیلہ کی شادی جہاں بھی کرو، یہ میرا مسئلہ نہیں۔ میں کسی کے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔'' میں لمحے بھر کے لیے تھما پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بتاؤ، نبیلہ کب سے غائب ہے؟''

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''کل دوپہر سے جی۔''

''کل دوپہر سے'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا ''وہ کل سے غائب ہے اور تم آج اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئی ہو؟''

''میں رپورٹ درج کرانے نہیں آئی جی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بلکہ میں نے ملزم انور کو پکڑ کر آپ کے حوالے کیا ہے۔ آپ کا آدھا کام تو ہوگیا۔ اب انور کی زبان سے نبیلہ کا پتا اگلوانا آپ کی ذمے داری ہے۔''

میں نے قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے یہ بتانے کی کوشش نہ کرو کہ میری کیا ذمے داری ہے۔ میں اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کل دوپہر سے اب تک تم کیا کرتی رہی ہو؟''

میرے بدلے ہوئے انداز نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ قدرے نرم لہجے میں بولی۔ ''تھانیدار جی... آپ تو خوا مخواہ خفا ہورہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے جی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہوگی اس لیے فکر مند نہیں تھی لیکن جب شام ہوگئی اور وہ گھر واپس نہیں آئی تو مجھے اس کی طرف سے تشویش ہوئی میں نے اس کی سہیلیوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ صبح وہ جمیلہ کے ساتھ تھی۔ دوپہر کو گھر آئی تھی اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد پھر گھر سے نکل گئی تھی۔ میری پوچھ پڑتال کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ نبیلہ کو آخری مرتبہ کل دوپہر کے بعد تقریباً دو بجے کھیتوں میں انور کے ساتھ چھپ چھپ کر باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آئی۔ میں نے اس کے لیے...''

''ایک منٹ!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔ ''کل دو پہر دو بجے، نبیلہ اور انور کو کھیتوں میں چھپ کر باتیں کرتے ہوئے کس نے دیکھا تھا؟''

''چھیمو نے...'' عائشہ نے جواب دیا۔ ''نیاز تیلی کی بیٹی چھیمو کھیتوں کے پاس سے گزر رہی تھی کہ ایک جگہ، کھیت کی کھڑی فصل میں اسے حرکت دکھائی دی۔ وہ چونکی اور اپنی توجہ اس ''حرکت'' کی طرف لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے وہاں نبیلہ اور انور کی جھلک دکھائی دی۔ وہ راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ چھیمو نے انہیں مخاطب کرنا یا ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ چھیمو نے یہ خاص بات کل رات ہی کو مجھے بتائی اور میں پریشان ہوگئی۔ میں سیدھی انور کے گھر پہنچی لیکن وہ کم بخت گھر میں نہیں ملا۔ اس کے باپ نے بتایا کہ وہ ساتھ والے پنڈ گیا ہے اور صبح واپس آئے گا۔ بشیر ترکھان نے بہت کریدا کریدا کر مجھ سے پوچھا کہ میں اس کے بیٹے انور کو کیوں ڈھونڈ رہی ہوں مگر میں نے اسے نبیلہ کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور واپس آگئی۔''

وہ سانس درست کرنے کے لیے رکی تو میں نے پوچھا ''واپس کہاں آگئی؟''

''میں آپ کو بتا رہی تھی کہ بشیر ترکھان کے گھر سے واپس آگئی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہاں سے میں اپنے گھر نہیں آئی بلکہ سیدھی چوہدری صاحب کے پاس ان کی حویلی چلی گئی۔ انہیں اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا کیونکہ بہت جلد نبیلہ کی ان سے شادی ہونے والی تھی۔''

''پھر چوہدری مشتاق نے تم سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور کہنے لگے...'' عائشہ نے بتایا۔ ''اس وقت انور تو گاؤں میں موجود نہیں اور اس کے باپ سے کوئی بات کرنے کا فائدہ نہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انور کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ وہ کل جب یہاں پہنچے گا تو میں اسے حویلی میں بلا کر خود اس کی خبر لوں گا۔ تم پریشان نہ ہو عائشہ... میں تمہاری بیٹی کو جلدی تلاش کروالوں گا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا متوقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار جی! میں چوہدری صاحب کے حکم پر خاموشی سے گھر آگئی اور پوری رات نبیلہ کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دی۔''

''مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا بیٹا یعقوب سودائی سا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بے چارے کا گھر کے کسی معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں لیکن حیات احمد نے اس موقع پر کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا، میرا مطلب ہے کہ بیٹی کی گمشدگی نے اس پر کیا اثرات مرتب کیے تھے؟''

اس نے برا سا منہ بنایا اور کڑوے لہجے میں بولی۔ ''حیات کا کچھ نہ پوچھیں تھانیدار جی۔ وہ نہ تین میں ہے اور نہ ہی تیرہ میں۔ اگر وہ سمجھدار اور معقول بندہ ہوتا تو مجھے یہ دن ہی نہ دیکھنے پڑتے۔ اسے سارا دن گھر میں پڑ کر چارپائی توڑنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ حیات نہیں... بلکہ میرے لیے ایک عورت ہے...!''

میں نے الّو کے گوشت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی کہ کہیں بحث کا ایک نیا در نہ کھل جائے۔ میں نے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''آج صبح کیا واقعات پیش آئے ہیں۔ انور علی تم لوگوں کو کہاں سے ملا ہے؟''

''چوہدری صاحب نے رات مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اب پتا چلا ہے کہ انہوں نے دارا اور خوشیا کی رات ہی کو ڈیوٹی لگا دی تھی کہ انور جیسے ہی گاؤں میں داخل ہو، اسے پکڑ کر تھانے لے جائیں۔ بس جی، پہلے انہوں نے اس لفنگے کو قابو کیا پھر ایک بندہ میری طرف دوڑا کر مجھے بھی بلا لیا اور ہم سب مل کر تھانے آگئے۔ یہ ہے ساری کہانی جی!''

''رات کو چوہدری نے تم سے کہا کہ وہ انور کو اپنی حویلی میں بلا کر اس سے پوچھ گچھ کرے گا لیکن بعد میں اپنے بندوں کو حکم دیا کہ وہ انور کو پکڑ کر سیدھے تھانے لے جائیں۔ چوہدری کی یہ ادا میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''پتا نہیں جی... انہوں نے ایسا کیوں کیا!'' وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ''یہ بات تو آپ انہی سے پوچھیں جی۔''

''چوہدری سے ملاقات ہوگی تو میں یہ سوال اس سے ضرور کروں گا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال، تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بشیر ترکھان کو اس بات کا پتا ہے کہ اس کے بیٹے کو تھانے پہنچا دیا گیا ہے؟''

''نہیں جی...'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے، گاؤں میں ابھی کسی کو بھی اس واقعے کی خبر نہیں۔ یہ ساری کارروائی چوہدری صاحب کے بندوں نے چھپ چھپا کے کی ہے۔''

''ہوں...'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اب اس سلسلے میں جو کچھ بھی میں کروں گا وہ سب چھپ چھپا کے ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگا!''

''جی ... کیا مطلب؟'' اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عائشہ! میں نے تمہاری شکایات توجہ سے سن لیں۔ تمہیں اپنی بیٹی کی گمشدگی کے سلسلے میں جس بندے پر شک ہے وہ اس وقت میری تحویل میں ہے۔ تم آرام سے گھر جاؤ۔ میں انور علی کی زبان کھلوانے کے لیے نیا عمل شروع کرتا ہوں۔ انشاءاللہ! بہت جلد نبیلہ کو بازیاب کرلیا جائے گا اور...'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''... اور چوہدری کے ان دو ڈشکروں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ جو باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ ان کی تھانے میں کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی کام۔ میں اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا، چاہے وہ کوئی چوہدری ہو یا چوہدری کا گماشتہ!''

میری بات عائشہ بی بی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد خاموشی سے رخصت ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے انور علی کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ مسکین سی صورت کے ساتھ میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ بے حد سہما ہوا اور ڈرا ڈرا سا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں پتا ہے، چوہدری کے بندوں نے تمہیں کس چکر میں پکڑ کر تھانے پہنچایا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا ''یہ لوگ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ میں نے نبیلہ کو اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔''

''تو کیا واقعی تم نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں جناب!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں نے یہ جرم نہیں کیا۔ مجھے تو لگتا ہے، چوہدری نے خود ہی نبیلہ کو کہیں غائب کرایا ہے اور مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اب تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ چوہدری تم سے کیوں دشمنی کر رہا ہے۔ کیا تم نے اس کی بھینس چوری کرلی ہے؟''

''وہ جناب... بات دراصل یہ ہے کہ...!'' وہ بولتے بولتے متذبذب انداز میں خاموش ہوگیا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انور! تمہیں جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو۔ تھانے میں صرف مجرموں کو کڑی آزمائشوں سے گزارا جاتا ہے۔ بے گناہ لوگوں کے ساتھ میں بڑی عزت سے پیش آتا ہوں۔''

اس کے چہرے پر اطمینان کا رنگ جھلکنے لگا، تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''تھانیدار صاحب! ہمارے گاؤں کا چوہدری بڑا ہی عیاش اور ظالم شخص ہے۔ اس نے نبیلہ پر بھی بری نظر رکھی ہوئی ہے۔ عائشہ پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔ اس نے عائشہ کو یہ راگ دیا ہے کہ وہ نبیلہ سے شادی کرے گا لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے اور عائشہ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ نبیلہ کو عیاشی کا کھلونا سمجھ کر چند روز اس سے کھیل تو سکتا ہے لیکن اس سے شادی کبھی نہیں کرے گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے'' میں نے کہا ''لیکن ابھی تک تم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ چوہدری تم سے کیوں دشمنی کر رہا ہے؟''

''وہ جی دراصل ... وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتا ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''یا یوں سمجھ لیں کہ مجھے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے کیونکہ نبیلہ اس سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ مجھے چاہتی ہے اور میں اسے چاہتا ہوں۔ چوہدری نے نبیلہ کو غائب کرا کے مجھے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا ہے جب کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو یہاں آکر پتا چلا ہے کہ نبیلہ کل دوپہر سے غائب ہے۔ اس کے لیے جتنا پریشان میں ہوں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جناب...!''

اس کی پریشانی میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا تھا۔ ان لمحات میں وہ واقعی بے حد الجھا ہوا اور فکرمند دکھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحات تک یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے، تم نبیلہ سے سچی محبت کرتے ہو؟''

وہ اٹل انداز میں بولا۔ ''جی ہاں... بالکل!''

''پھر تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ محبت کرنے والے جھوٹ نہیں بولتے؟''

''جی پتا ہے'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''اور میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

''یعنی نبیلہ کے اغوا... یا گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں؟''

''نہیں... بالکل نہیں'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''کل شام میں نبیلہ کی ماں عائشہ تمہارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھر گئی تھی۔ اس نے تمہارے باپ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ تم ساتھ والے گاؤں گئے ہوئے ہو اور آج صبح واپس آؤ گے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''جی ہاں، میں کل سہ پہر میں، اپنی خالہ سے ملنے گیا تھا جو ساتھ والے گاؤں میں رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پروگرام کے مطابق، مجھے آج صبح واپس آنا تھا اور میں آیا بھی لیکن گاؤں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی چوہدری کے بندوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور یہاں تھانے لے آئے۔ انہی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ نبیلہ کل دوپہر سے غائب ہے۔ یہ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں کہ میں نے اسے اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔''

''ان کے شک کا سبب یہ ہے کہ آخری بار کل دوپہر کے بعد نبیلہ کو تمہارے ساتھ دیکھا گیا ہے'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں کھیتوں میں چھپ کر راز و نیاز کر رہے تھے... ہیں نا؟''

وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جی ہاں، ہم آپس میں اسی طرح چھپ کر ملتے ہیں۔ کل وہ بہت پریشان تھی۔ چوہدری کے حوالے سے، شادی کے لیے اس پر ماں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس نے مجھے آپ کے بارے میں بھی بتایا تھا۔''

انور کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''میرے بارے میں کیا بتایا تھا اس نے؟''

''جناب! وہ کل صبح جمیلہ کے ساتھ آپ سے ملنے آئی تھی۔'' انور نے کہا۔ ''اس نے اپنے تمام حالات آپ کے سامنے رکھے تھے اور آپ سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں تو یہ سن کر کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے نبیلہ کو تسلی دی اور خالہ کے گھر چلا گیا لیکن جب واپس آیا ہوں تو یہاں کے حالات ہی بدلے ہوئے ہیں۔ آپ نے تو الٹا مجھے ہی تھانے میں بند کر دیا ہے جی!''

صورتِ حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا، انور جھوٹ کا سہارا نہیں لے رہا۔ اس کی پٹتا سے ثابت ہوتا تھا، نبیلہ کی گمشدگی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ ان سنسنی خیز حالات میں دھیان چوہدری مشتاق کی طرف جاتا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ چوہدری ہی نے نبیلہ کو غائب کروایا ہوگا۔ میں نے انور کی الجھن کے جواب میں کہا۔

''انور! تمہیں تھانے پہنچانے میں میرا نہیں بلکہ چوہدری کے بندوں اور عائشہ کا ہاتھ ہے اور... میرا خیال ہے، یہ تمہارے حق میں بہتر ہی ہے۔''

''جی... کیا مطلب؟'' وہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں تم اگر تھانے میں ایک دو روز رہو تو تمہارے لیے اچھا ہے۔ یہاں تم زیادہ محفوظ ہو۔ اگر باہر آزادانہ گھومتے رہے تو چوہدری کسی بھی ذریعے سے تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور جہاں تک میرے وعدے کا تعلق ہے...'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے نبیلہ سے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ میں نے اپنی تحقیق سے یہ پتا چلا لیا ہے کہ نبیلہ حق پر ہے، اس کی ماں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اس کی شادی چوہدری سے کر کے بڑا ظلم کرنا چاہتی ہے اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''میری عمر بھی اللہ آپ کو دے دے'' وہ دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بہت عظیم ہیں۔ آپ ہمارے لیے کسی فرشتے سے کم نہیں ہیں۔''

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انور علی! اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کے لیے عمر کا ایک کوٹا مقرر کر رکھا ہے اور کسی کی عمر کسی کو نہیں لگا کرتی لہٰذا اس قسم کی دعائیں نہیں کرنا چاہیے اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں بلکہ تمہاری ہی طرح گوشت و پوست کا انسان ہوں۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں یا آگے چل کر جو کروں گا وہ میرے فرائض کا تقاضا ہے، اس میں تم پر کوئی احسان نہیں'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تم ایک دو دن ادھر تھانے ہی میں سرکاری مہمان بن کر گزارو۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہارے یہاں رہنے سے چوہدری مطمئن رہے گا کہ میں تم پر سختی کر کے نبیلہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ میں اس دوران میں، نہایت ہی خفیہ طور پر نبیلہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا اور میرا خصوصی ٹارگٹ چوہدری مشتاق ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ''اور مجھے یقین ہے بلکہ میری دعا ہے کہ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھے آپ کی تحویل میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن میرے ماں باپ کو جو پریشانی ہوگی اس کا کیا حل ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اس کا بھی حل ہے میرے پاس'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''تمہیں اس سلسلے میں ذرا بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بشیر ترکھان اور نذیراں کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ وہ تمہاری گرفتاری کی خبر سن کر تھانے آئیں گے تو میں ان سے بات کرلوں گا۔''

''میری ماں نذیراں کو بہت کم نظر آتا ہے۔ آپ اسے ایک اندھی عورت ہی سمجھیں جناب'' وہ دکھی لہجے میں بولا ''وہ کہیں آتی جاتی نہیں، گھر ہی میں رہتی ہے۔ یہاں تو مجھ سے ملنے میرا باپ ہی آئے گا۔''

''میں نے کہا نا، تم اپنے ذہن کو مت الجھاؤ'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا ''میں سب سنبھال لوں گا!''

''ٹھیک ہے جی...!'' وہ ایک گہری، اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر انور علی کو دوبارہ حوالدار بہادر علی کے پاس بھجوا دیا۔ اسی وقت اے ایس آئی وحید راٹھور میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وحید اسی گاؤں کا رہنے والا تھا لہٰذا رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا اور صبح وقت پر ڈیوٹی سنبھال لیتا تھا مگر آج وہ تقریباً دو گھنٹے لیٹ تھا۔

وہ سلام کر کے میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے کہا ''وحید! تھانے کے قریب رہائش ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان کا جب دل چاہے، اٹھ کر چلا آئے...؟''

''نہیں ملک صاحب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ''ایسی بات نہیں۔ آپ جانتے ہیں، میں نے ہمیشہ وقت کا خیال رکھا ہے... وہ دراصل، رات سے میری گھر والی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج رات کو وہ چھوٹے بچے کو نہیں دیکھ سکی لہٰذا مجھے بار بار اٹھ کر اسے دیکھنا پڑا بلکہ یوں سمجھیں کہ یہ رات میں نے جاگ کر گزاری ہے... اسی لیے صبح کے وقت ایسی آنکھ لگی کہ پھر دن چڑھے ہی اٹھ سکا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر دھیرے سے بولا۔

''اب تو آپ میری تاخیر کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے!''

''بالکل سمجھ گیا ہوں'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''اب تمہاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟''

وحید راٹھور کے تین بچے تھے۔ بڑی بیٹی آٹھ سال کی، اس سے چھوٹے بیٹے کی عمر تین سال تھی اور تیسرا، سب سے چھوٹا بیٹا صرف چھ ماہ کا تھا۔ یہ بچہ جب سے پیدا ہوا تھا، وحید کی بیوی صغریٰ کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ دو چار دن میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا اور اس ''ہونے'' کو نمٹنے یا بھگتنے کے لیے وحید کو زیادہ وقت گھر پر دینا پڑتا تھا۔ اس گاؤں میں وحید کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے گھریلو حالات اور مسائل کے بارے میں اکثر مجھ سے تبادلۂ خیال کرتا رہتا تھا۔

''اب تو وہ خاصی سنبھل گئی ہے۔'' میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا ''لیکن دن میں ایک دو دفعہ مجھے گھر کا چکر لگانا پڑے گا...'' وہ قدرے متوقف ہوا پھر افسوس ناک لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میں اپنی اس گھریلو پریشانی کے سبب اس مسئلے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا ہوں جس پر ہم نے رات کو تفصیلی بات کی تھی۔ میں گھر پہنچ کر ایسا مصروف ہوا کہ کچھ خبر نہیں، اس وقت سے لے کر اب تک گاؤں میں کیا ہوتا رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اٹھا ہوں اور تھوڑا کھا پی کر تھانے آ گیا ہوں...''

''تمہارے لہجے میں اسی لیے افسوس کا عنصر شامل ہے کہ تمہیں کچھ پتا نہیں، آج کا سورج طلوع ہونے سے لے کر اب تک اس گاؤں خصوصاً تھانے میں کیا انقلابی واقعات پیش آ چکے ہیں'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''تم جس کام پر توجہ نہ دے پانے کی وجہ سے افسردہ ہو، سمجھو وہ کام پچھلے دو تین گھنٹوں میں آدھے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ بس، چند ایک آخری مناظر باقی ہیں''

''کک... کیا مطلب...!'' حیرت کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ملک صاحب... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں وحید راٹھور!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے اسے حالات کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی رائے اور اندازوں کا بھی ذکر کیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مجھے سنتا رہا اور جب میں خاموش ہوا تو وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! مجھے پکا یقین ہے، نبیلہ کی گمشدگی میں چوہدری مشتاق کے سوا اور کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا ہے... یعنی نبیلہ بھی اسے حاصل ہو جائے اور اس کی راہ کا کانٹا انور علی بھی بڑی صفائی سے ٹھکانے لگ جائے۔''

''گویا تم انور علی سے اتفاق کرتے ہو'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا ''اس نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ہاں... بڑی حد تک۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میرے ذہن میں نبیلہ کی گمشدگی کا ایک اور بھی پہلو ہے جس کے بارے میں انور نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

''ہوں...'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا ''اور وہ مختلف پہلو کون سا ہے؟''

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا ''آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ انور کے خیال میں چوہدری مشتاق نے اپنے بندوں کی مدد سے نبیلہ کو اس طرح غائب کروایا ہے کہ اس کی گمشدگی کا شک سیدھا اس پر جائے۔ پولیس انور کو نبیلہ کے اغوا کے الزام میں پکڑ کر کسی مصیبت میں ڈال دے اور چوہدری کی عید ہو جائے۔ بعد ازاں نبیلہ کو اس طرح برآمد کیا یا کرایا جائے کہ ہر صورت میں انور ہی قصوروار دکھائی دے لیکن میں نے جس پہلو کا ذکر کیا ہے نا جناب...'' وہ ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا پھر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں، اس کھیل میں نبیلہ کی ماں عائشہ بھی چوہدری مشتاق کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ وہ جانتی ہے کہ نبیلہ کو کہاں غائب کیا گیا ہے۔ اس کا رونا دھونا اور بیٹی کے لیے پریشان ہونا محض اداکاری بھی ہو سکتی ہے۔ ملک صاحب! پتا نہیں، مجھے کیوں یقین سا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ڈراما ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت رچایا گیا ہے۔''

''اگرچہ تمہاری باتوں پر تصدیق مہر تو نہیں لگائی جا سکتی لیکن ان میں خاصا وزن پایا جاتا ہے۔'' میں نے کہا ''نبیلہ کی بازیابی کے لیے عائشہ اور چوہدری مشتاق کو باری باری ایک ہی کسوٹی پر گھسنا پڑے گا اور... یہ کام ابھی سے شروع سمجھو۔''

''لگتا ہے، آپ نے اپنے ذہن میں کوئی لائحہ عمل تیار کر لیا ہے'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے بعد میں تھانے سے نکلا اور چوہدری مشتاق کی حویلی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ چوہدری کی حویلی اسی گاؤں میں موجود تھی اور تھانے سے مشکل دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں اگر چاہتا تو سائیکل، گھوڑے یا تانگے کے ذریعے چوہدری سے ملنے جا سکتا تھا لیکن اس وقت میرے ذہن میں سوچوں کا ایک ہجوم سا لگا ہوا تھا اور میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ لہٰذا میں نے دانستہ پیدل جانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

یہ بات دیکھنے، سننے اور پرکھنے میں آئی ہے کہ چہل قدمی کے دوران میں انسان کا ذہن زیادہ فعال ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ اس کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا ہو تو اس ''عمل'' کے ذریعے وہ بہ نسبت آسانی سے مسئلے کے حل تک پہنچ جاتا ہے۔ نیوٹن، ایڈیسن اور آئن اسٹائن نے بہت ساری سائنسی گتھیاں ٹہل ٹہل کر اور چہل چہل کر ہی سلجھائی تھیں!

میں چوہدری مشتاق کی حویلی تک بعد میں پہنچا، مجھ سے پہلے میری آمد کی خبر وہاں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ حویلی کے گیٹ پر، ایک ہٹے کٹے ڈشکرے نے میرا بڑا پُرجوش استقبال کیا اور فدویانہ انداز میں بولا۔

''آئیں جی... تھانیدار صاحب... چوہدری صاحب اس وقت حویلی کے اندر موجود ہیں۔ میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیکھے لہجے میں کہا ''لگتا ہے، تمہارے چوہدری صاحب میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں؟''

''او جناب! آپ تو اس علاقے کے بادشاہ ہیں۔'' وہ مسکا لگانے والے انداز میں بولا ''چوہدری صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے رہتے ہیں۔''

اس شخص کی باتوں سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا کہ چوہدری نے تھانے اور گاؤں کے معاملات پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ بہرحال، میں نے چوہدری کے بندے کے ساتھ زیادہ بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی معیت میں ایک بیچ سجائے کمرے میں پہنچ گیا جو یقیناً چوہدری کی بیٹھک تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد چوہدری مشتاق بھی وہاں آ گیا۔

یہ چوہدری سے روبہ رو میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ جثے سے اندازہ ہوتا تھا، جوانی میں وہ کسرت کا عادی رہا ہوگا۔ ڈنڈ پیلنے کی ابھی تک قائم تھی۔ وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ذہن میں پنجابی فلموں کے ایک معروف ولن کا تصور اجاگر ہوتا تھا۔ عمر کے اس حصے میں بھی اس کی صحت قابلِ تحسین تھی۔ گویا عائشہ نے اس کی مستعدی اور کارکردگی کے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا!

چوہدری بڑے تپاک سے، مجھ سے ملا۔ اس کے انداز میں بڑا جوش اور دوستانہ پن پایا جاتا تھا۔ اپنے ابتدائی تاثر سے وہ خاصا زندہ دل اور خوش مزاج ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوہدری نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا ''ملک صاحب! نبیلہ کی گمشدگی ایک حوالے سے اچھی ثابت ہورہی ہے کہ اس بہانے آپ سے ملاقات تو ہوگئی ورنہ...'' وہ لمحے بھر کے لیے تھما پھر معنی خیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ورنہ آپ کو اس تھانے میں تعینات ہوئے اب کافی دن ہوگئے ہیں لیکن نہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوسکا اور نہ ہی محکمہ جاتی مصروفیات نے آپ کو اس زحمت کی فرصت دی۔ بہرحال، بہانہ کوئی بھی ہو... خوشی اس بات کی ہے کہ ہماری ملاقات ہوگئی۔''

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ نبیلہ کے ذکر پر چوہدری کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک ابھر آئی تھی۔ اس چمک کو حیوانی یا ہوس کی چمک کہا جاسکتا ہے۔ اس کے تاثرات سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ وہ نبیلہ اور اس کے معاملے میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چوہدری صاحب! آپ کی بات سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ابھی تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی تو اس میں ہم دونوں برابر کے قصوروار ہیں... خیر، کسی بھی سبب سہی ہم آج ایک دوسرے سے مل تو لیے۔''

اس نے کہا۔ ''اور سنائیں... آج کل تھانے داری کیسی چل رہی ہے؟''

اصولی طور پر اسے سب سے پہلے نبیلہ کے بارے میں استفسار کرنا چاہیے تھا۔ اس کی عملداری میں سے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی غائب ہوگئی تھی اور جس کے اغوا کا ملزم تھانے میں بند تھا۔ فطری طور پر اس کے اندر یہ تجسس نظر آنا چاہیے تھا کہ ملزم انور نے کیا اگلا، وہ نبیلہ کی گمشدگی کے حوالے سے کیا کہانی سنا رہا ہے اور میں نے مغویہ کی بازیابی کے لیے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے مگر چوہدری نے ان امور سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اپنے انداز اور تاثرات سے بڑا پُرسکون اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چوہدری صاحب! اب آپ مجھ سے یہ سوال تو نہ کریں کہ تھانیداری کیسی چل رہی ہے۔ بھلا کون سا معاملہ آپ کی نظر سے اوجھل ہے۔ آپ کا تو ایک ادنیٰ سا ملازم بھی یہ جانتا ہے کہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں اور وہ مجھے اطلاع دیتا ہے کہ... چوہدری صاحب اس وقت حویلی کے اندر موجود ہیں۔ میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں...!''

میرا اشارہ اس بندے کی جانب تھا جو مجھے حویلی کے گیٹ پر ملا تھا اور جس کی راہنمائی میں، میں اس بیٹھک تک پہنچا تھا۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا ''کیا کریں جی... نظر تو رکھنی پڑتی ہے نا۔ تھانیداری اور چوہدراہٹ قائم رکھنے کے لیے اپنے مخبروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ تو اس بات کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں؟''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب!'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔

اسی وقت ایک ملازم بڑی سی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا۔ یقیناً چوہدری نے ادھر آنے سے پہلے میری خاطرداری کے لیے احکام جاری کیے ہوں گے۔ ملازم نے میرے سامنے رکھی میز پر سامان خورونوش چن دیا۔ میں نے کہا۔

''اس تکلف کی کیا ضرورت تھی چوہدری صاحب۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کھانا کھایا ہے۔''

''وہ تو آپ نے اپنے تھانے میں کھایا ہوگا نا!'' چوہدری نے ملازم کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں اور کچھ کھائے پیے بغیر ہی چلے جائیں۔ تھوڑا بہت تو آپ کو لینا ہی پڑے گا ملک صاحب!''

ملازم، چوہدری کا اشارہ بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ گردن جھکا کر بیٹھک سے نکل گیا۔ میں چوہدری کے فرمائشی الفاظ ''تھوڑا بہت'' کے مطابق، نعمت خداوندی سے انصاف کرنے لگا۔ میرے ساتھ ہی چوہدری کا ہاتھ بھی حرکت میں آگیا۔

چوہدری نے پوچھا ''ملک صاحب! بندے نے زبان کھولی کہ نہیں؟''

بڑی دیر کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آیا تھا۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کہا ''ابھی تک تو میں نے پیار کی زبان استعمال کی ہے اور میں محسوس کررہا ہوں، یہ زبان اس کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ رات کو اسے حوالدار کے سپرد کروں گا۔ امید ہے، صبح تک وہ تیر کے مانند سیدھا ہوجائے گا اور بڑی خوشی سے حقیقت اگل دے گا۔ ویسے...'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر چوہدری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو وہ آپ پر ہی الزام لگا رہا ہے...!''

''کیا کہتا ہے، میرے بارے میں وہ بدبخت؟'' چوہدری کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی۔

میں نے کہا ''اس کا دعویٰ ہے کہ نبیلہ کو آپ ہی نے کہیں غائب کروایا ہے اور اس پر الزام لگا کر اسے جیل بھجوانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتے ہیں۔''

اس گفتگو کے دوران میں، میں بڑی توجہ سے چوہدری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ انور کے لگائے گئے الزامات کا سن کر چوہدری کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی نفرت ابھری، پھنکار سے مشابہ لہجے میں اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

''ملک صاحب! اس گندے کیڑے نے یہ نہیں بتایا کہ میں ایسا کیوں کروں گا۔ میری اس سے کیا دشمنی ہے؟''

''بتایا ہے جناب!'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''اس کا کہنا ہے کہ وہ نبیلہ سے سچی محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن آپ کو یہ پسند نہیں ہے۔''

''کمال ہے...'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور الٹا مجھی سے پوچھنے لگا ''ملک صاحب! آپ ہی بتائیں، مجھے انور اور نبیلہ کی شادی پر بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟''

چوہدری کے اس استفسار سے واضح ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی حوالے سے نبیلہ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ یہ ایک اہم اور حیران کن بات تھی۔ چوہدری ان لمحات میں اگر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا تو پھر انور اور وحید راٹھور کے خدشات برمبنی حقیقت نظر آتے تھے یعنی وہ نبیلہ سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنی مطلب براری کے لیے محض عائشہ کو سبز باغ دکھا رہا تھا۔ بہرحال، میں نے چوہدری کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''انور کا دعویٰ ہے کہ آپ نبیلہ سے شادی کی خواہش رکھتے ہیں لہٰذا اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہیں اسی لیے آپ نے نبیلہ کو غائب کرا کے اسے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا ہے۔''

''کتنا بے وقوف ہے یہ بھی'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا ''ملک صاحب! آپ ماشاءاللہ! سیانے آدمی ہیں۔ میرا اور انور کا کیا مقابلہ... اگر مجھے نبیلہ سے شادی کرنا ہوتی تو کیا میں اس سے اجازت لیتا۔ وہ کون لگتا ہے نبیلہ کا...؟''

چوہدری کی آواز میں غصے کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا ''ملک صاحب! فرض کریں، میں اگر واقعی نبیلہ سے شادی کا خواہش مند ہوتا تو پھر اسے غائب کرنے کی کیا ضرورت تھی... اور دوسری بات یہ کہ اول تو وہ الو کا پٹھا کسی بھی درجے پر میرا ہم سر نہیں اور اگر ایسا ہوتا بھی تو میں نبیلہ کو غائب کرانے کے بجائے اس کا مکو ٹھاپ دیتا۔ اپنی راہ کے کانٹے صاف کرنا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کا دماغ کیوں خراب ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے، جب رات کو آپ اسے تفتیش کی سختی سے گزاریں گے تو اس کا بخار فوراً اتر جائے گا اور وہ آپ کو نبیلہ کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔''

چوہدری نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے جتا دیا تھا کہ وہ نبیلہ سے شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی خیال اے ایس آئی وحید راٹھور کا بھی تھا۔ انور نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا تھا کہ چوہدری عائشہ سے مسلسل جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اسے شادی کا لارا دے کر نبیلہ کو اپنی عیاشی کے لیے مخصوص رکھنا چاہتا ہے مگر عائشہ کو پورا یقین تھا کہ چوہدری اس کی بیٹی سے ضرور شادی کرے گا۔

میں اگر چاہتا تو یہاں عائشہ کو کوٹ کرسکتا تھا۔ چوہدری نے انور کو تو جھٹلا دیا تھا ممکن ہے، وہ عائشہ کی خواہش کو بھی ایک دیوانگی سے تعبیر کرتا لہٰذا میں نے چوہدری کو مزید گھسنے کے لیے اس پتے کو بچا لیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چوہدری صاحب! اگر سچ پوچھیں تو مجھے انور کی بات کا بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ اب اس عمر میں جب آپ نانا اور دادا بن چکے ہیں، کیا شادی کریں گے اور وہ بھی ایک معمولی سی لڑکی کے ساتھ لیکن آپ کو تو پتا ہے نا...'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ جانتے ہیں چوہدری صاحب! جب ہمارے پاس کوئی شکایت پہنچتی ہے تو اس پر کارروائی لازمی ہوجاتی ہے۔ بس، میں تو معمول کی پوچھ گچھ کے لیے اِدھر آگیا تھا حالانکہ اس نامراد نے آپ پر بھی اور حوالے سے بھی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے اور...!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا ''مزید کیا بکواس کی ہے اس کتے نے؟''

میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایک کاری ضرب لگائی ''وہ بڑے وثوق سے کہہ رہا ہے کہ آپ کے اور عائشہ کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں... اسی لیے عائشہ آپ کے دباؤ میں ہے اور وہ نبیلہ کی شادی آپ سے کرنے کو تیار ہے۔ وہ اپنے شوہر کی ذرا عزت نہیں کرتی۔ اسے الو کا گوشت کھلا کر گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھا ہے۔ اس کے گھر کا سارا خرچہ آپ کی حویلی سے جاتا ہے اسی لیے آپ کے دو ڈشکروں نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردیا ہے۔ آپ اس کے خلاف ایک گہری سازش کر رہے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ملک صاحب!'' وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے قہرناک انداز میں بولا۔ ''میں قانون کا بہت احترام کرتا ہوں۔ وہ اس وقت آپ کی تحویل میں ہے اس لیے میں آپ کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔ اگر وہ تھانے سے باہر ہوتا تو یقین کریں، اس بکواس پر میں اس کی گردن مروڑ کے رکھ دیتا...''

میں نے دل میں کہا، چوہدری صاحب! مجھے آپ کی طرف سے کسی ایسے ہی ردِعمل کی توقع تھی جبھی تو انور کی حفاظت کے پیشِ نظر میں نے اسے تھانے میں بند کر رکھا ہے!

میں نے انور کی ذات سے منسوب کر کے جو بھی کہانی چوہدری کو سنائی تھی اس کی اثر پذیری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان جانے میں کسی نے اس کی اَن دیکھی دم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ وہ بری طرح بلبلا رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! دیکھا آپ نے، اس کم ذات نے بے چاری عائشہ پر کتنا گھناؤنا الزام لگایا ہے۔ اس سے اس کی گندی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے۔ ذرا سوچیں، اس کمینے کی بکواس کے مطابق، اگر مجھ میں اور عائشہ میں ایسا کوئی تعلق رہا ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے پر کیسے تیار ہو جاتی۔ وہ کم بخت آپ کو گمراہ کر رہا ہے ملک صاحب... جب کہ عائشہ کا معاملہ صرف اتنا ہے...'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''عائشہ ایک طویل عرصے تک میری حویلی میں نوکرانی کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ اس کا گھر والا حیات احمد ایک نمبر کا ہڈحرام اور نکھٹو ہے۔ ظاہر ہے، عائشہ پورا دن میری حویلی میں جان مارتی رہی ہے تو اس کے گھر کا خرچہ بھی میرے ہی توسط سے چلتا رہا ہے... بس، فرق اتنا سا ہے کہ میں نے اس سلسلے کو ابھی تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ عائشہ اب باقاعدہ حویلی میں کام کرنے نہیں آتی لیکن میں ایک اچھی روایت کو ابھی تک نبھا رہا ہوں۔ ویسے بھی دریا میں سے اگر ایک قطرہ نکل جائے تو اس سے دریا کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے اور پھر... اگر میں عائشہ کے گھر کا خرچہ چلا بھی رہا ہوں تو اس ذلیل انسان کو کیا تکلیف ہے۔ ملک صاحب...!'' اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں مجھے مخاطب کیا پھر گمبھیر انداز میں بولا۔

''انور اس وقت آپ کی کسٹڈی میں ہے۔ میرے آدمیوں نے پکڑ کر اسے آپ کے حوالے کیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے، نبیلہ کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اگر آپ نبیلہ کو بازیاب کروانے کے بعد اس خارش زدہ کتے کو جیل بھجواتے ہیں تو اچھی بات ہے ورنہ...!''

''ورنہ کیا چوہدری صاحب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''میں اس ناپاک جانور اور اس کے گھر والوں کو اپنے گاؤں میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر انور لمبے عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں جاتا تو بشیر ترکھان کو یہ گاؤں چھوڑ کر اپنا ٹھکانا کہیں اور کرنا ہوگا۔ میں اس گاؤں کا چوہدری ہونے کی حیثیت سے انہیں گاؤں بدر کر سکتا ہوں۔''

''آپ کو ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی چوہدری صاحب!'' میں نے اسے لگام میں رکھنے کے لیے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''انور کی طرف سے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں اسے ایسا فٹ کروں گا کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی اس نوعیت کی بکواس کی جرأت نہیں کر سکیں گی۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ کوئی بھی مجرم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتا!''

''مجھے آپ سے یہی امید ہے ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میں قانون کو ہاتھ میں لینے کا حامی نہیں ہوں اسی لیے میرے بندوں نے اس بدبخت کو پکڑ کر آپ کے حوالے کیا ہے۔ ورنہ میں اسے حویلی بلا کر اس کے سارے کس بل نکال سکتا تھا۔ مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے کہ آپ اس کا انجام بڑا عبرتناک کریں گے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں چوہدری صاحب!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں انصاف کے تقاضے ضرور پورے کروں گا۔''

وہ مطمئن ہو گیا۔

میں نے اس سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور حویلی سے نکل آیا۔

واپسی کی مڑگشت میں بھی میرا ذہن پوری طرح بیدار اور فعال رہا اور تھانے پہنچنے سے پہلے ایک ایسا آئیڈیا میرے دماغ میں آ ہی گیا جس پر عمل کر کے میں اس کیس کا ڈراپ سین چلا سکتا تھا اور وہ آئیڈیا تھا... عائشہ پر خصوصی کام!

☆☆☆

میں نے تھانے میں قدم رکھا تو اے ایس آئی کو ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں اس وقت تھانے کے احاطے میں کھڑے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تو وحید راٹھور نے بہ آوازِ بلند کہا۔

''لیں، انچارج صاحب بھی آ گئے!''

یہ جملہ یقیناً اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو سنانے کے لیے ادا کیا تھا۔ وہ امید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس دوران میں، میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ اے ایس آئی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ وہ گویا اس شخص کا تعارف کرا رہا تھا۔

''ملک صاحب! یہ بشیر ترکھان ہے۔ اپنے بیٹے انور سے ملنے تھانے آیا تھا۔ میں نے حوالاتی سے اس کی ملاقات کرا دی ہے اور اب یہ واپس جا رہا ہے۔''

میں نے چوہدری کی حویلی کا رخ کرنے سے پہلے وحید راٹھور کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں کہ اسے میری غیر موجودگی میں تھانے کا نظام کس طرح سنبھالنا ہے۔ انہی ہدایات میں بشیر ترکھان کے حوالے سے بھی چند اہم باتیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وحید نے بشیر ترکھان کو اطمینان بخش طریقے سے ڈیل کیا ہوگا۔

وحید نے میرا تعارف کرایا تو بشیر ترکھان مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا ''تھانیدار جی! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میرا بیٹا اغوا جیسے جرم میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ یہ تو کل دوپہر کو اپنی ماسی سے ملنے دوسرے پنڈ گیا ہوا تھا۔ اگر اس دوران میں عائشہ کی بیٹی غائب ہوئی ہے تو اس میں میرے انور کا کوئی ہاتھ نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے، انور کو پھنسانے کے لیے کوئی گہری سازش کی جا رہی ہے۔''

''بشیر!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''پہلی بات تو یہ کہ تمہیں چھوٹی یا بڑی، کوئی بھی قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا ہوں بلکہ میں اپنے طور پر تحقیق اور تفتیش کرتا ہوں۔ اگر تمہارا بیٹا بے قصور ہے تو یقین کرو، اس کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ بس، ایک رات کی بات ہے۔ کل تک میری تفتیش مکمل ہو جائے گی۔ اگر انور نے نبیلہ کو اغوا کر کے کہیں نہیں چھپایا تو سمجھو کہ کل کی رات یہ اپنے گھر میں سوئے گا اور اگر... یہ اس معاملے میں ملوث ہے تو پھر اسے کوئی بھی قرار واقعی سزا سے نہیں بچا سکے گا'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہارے بیٹے کو معمول کی پوچھ گچھ کے لیے روکا ہوا ہے۔ تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ اللہ بھلا کرے گا۔''

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

میں وحید راٹھور کے ساتھ اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ وحید نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اِدھر چوہدری کی حویلی میں کیا رہا؟''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے وہاں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''اب آپ کا کیا ارادہ ہے ملک صاحب؟''

''ارادہ تو میرا نیک ہی ہے۔'' میں نے کہا ''تم فوراً جاؤ اور نبیلہ کی ماں عائشہ کو اپنے ساتھ تھانے لے آؤ... اور ہاں، یہ کوشش کرنا کہ وہ اکیلی ہی آئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی بالکل سمجھ رہا ہوں'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا ''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کوئی خاص قسم کا ٹرائل کرنے والے ہیں۔''

''وحید! جو کچھ بھی ہوگا، تمہاری نظر کے سامنے ہی ہوگا۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا ''تم وقت ضائع نہ کرو اور فوراً عائشہ کے گھر کی جانب روانہ ہو جاؤ۔''

''او کے سر...!'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ عائشہ کو اپنے ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ پتا نہیں، اس نے نبیلہ کی ماں کو کیا راگ دیا تھا کہ وہ خاصی مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ میں نے عائشہ کو اپنے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھنے کو کہا۔ وحید راٹھور بھی ایک کرسی کھینچ کر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

عائشہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا ''ملک صاحب! اس نامراد نے کیا بتایا ہے میری بیٹی کے بارے میں؟''

اس کا اشارہ انور علی کی طرف تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''عائشہ! میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے تھانے بلایا ہے کہ انور نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔''

''جی...!'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔

اس کے ایک لفظی جملے میں دنیا جہان کی حیرت بھری ہوئی تھی۔ یہ اس کا ایک بے ساختہ عمل تھا جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں... کیا میری بات کا تمہیں یقین نہیں آیا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نن...نہیں جی...ایسی بات نہیں...'' وہ گڑبڑا کر رہ گئی ''آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہوگا...کیا بتاتا ہے وہ نبیلہ کے بارے میں...میری بچی کس حال میں ہے اور...کہاں ہے...آپ نے اس سے پوچھا تو ہوگا...؟''

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''عائشہ بی بی! تم میری بات کو بالکل غلط سمجھی ہو۔ میں نبیلہ کے بارے میں نہیں کہہ رہا تھا!''

''پھر...!'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی ''پھر اس شیطان نے کس جرم کا اقرار کیا ہے؟''

''جرم محبت...!'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''عائشہ بی بی! انور نے اس حقیقت کا اعتراف کرلیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی سے سچی محبت کرتا ہے اور اسی جرم محبت کی پاداش میں چوہدری اسے فٹ کرانا چاہتا ہے کیونکہ وہ خود بھی نبیلہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔''

''یہ بکواس تو کسی کام کی نہ ہوئی تھانیدار جی۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی ''میں تو یہ سمجھی تھی کہ اس نے نبیلہ کو اغوا کرنے کا جرم قبول لیا ہے...!''

''عائشہ! تم سیانی بیانی ہو...'' میں نے آگے کو جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا ''نبیلہ کو اغوا کرنے کا اقرار وہ کیسے کرسکتا ہے جبکہ اس نے یہ جرم کیا ہی نہیں!''

''آپ بھی اسی بدبخت کی طرف داری کررہے ہیں تھانیدار جی!'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی؟''

''ناراض نہ ہو عائشہ بی بی!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انور نے نبیلہ کو اغوا کیا ہے یا نہیں، سزا تو اسے ہر صورت ملے گی۔ میں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر ہی دم لوں گا!''

اس نے خوشی بھری حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''پتا نہیں، آپ کس قسم کی الجھی ہوئی باتیں کررہے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا!''

''تم اپنے ذہن اور سمجھ کو نہ تھکاؤ۔ میری بات میں کوئی الجھن نہیں ہے عائشہ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میری چوہدری صاحب سے بات ہوگئی ہے۔ میں ابھی ابھی ان کی حویلی ہی سے آرہا ہوں۔ سمجھو کہ نبیلہ کے حوالے سے اب میں بھی تم لوگوں کے راز میں شریک ہوں۔ چوہدری مشتاق نے اعتماد میں لے کر مجھے سب کچھ بتادیا ہے بلکہ میں تو نبیلہ سے...!''

میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اضطراری لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا ''آپ نبیلہ سے کہاں مل کر آرہے ہیں...؟''

اس کے ایک اضطراری جملے نے ہاتھ پکڑ کر مجھے میرے مقصد تک پہنچادیا۔ میں نے ایک گہری سکون بخش سانس خارج کی۔ میں نے اپنے نامکمل جملے میں قطعاً ایسا کوئی تاثر نہیں دیا تھا کہ میں نبیلہ سے مل کر آرہا ہوں لیکن میری اس سیدھی اور سادہ سی چال نے اس کی زبان کو حقیقت حال کے اظہار پر مجبور کردیا تھا۔ یہ خدشہ یا اندازہ سچ ثابت ہورہا تھا کہ نبیلہ کو چوہدری مشتاق اور عائشہ نے ملی بھگت سے کہیں غائب کیا تھا۔ میں نے اس کے اضطرابی استفسار کے جواب میں بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا نا...! عائشہ تم سیانی بیانی ہو...اور یہ بھی بتایا ہے کہ نبیلہ والے معاملے پر میری چوہدری مشتاق سے تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ نبیلہ کو ڈیرے پر چھپایا گیا ہے۔ میں ابھی چوہدری کے ڈیرے ہی پر نبیلہ سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ بھلی چنگی اور خوش باش ہے۔ چوہدری صاحب نے بتایا ہے کہ جب میں انور کو جیل بھجوادوں گا تو نبیلہ کو منظر عام پر لایا جائے گا۔ اب تو تمہیں یقین آگیا نا، میں تم دونوں کے راز میں شریک ہوچکا ہوں؟''

''یقین تو آگیا ہے جی، پر میرے دل میں ایک بات چبھ رہی ہے۔'' وہ اے ایس آئی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بالکل کسی کانٹے کی طرح جی...!''

''یہ اے ایس آئی وحید راٹھور ہے، میرے مکمل بھروسے کا آدمی'' میں نے عائشہ کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا ''تم بے دھڑک بتاؤ، کون سی بات تمہارے دل میں کھٹک رہی ہے؟''

وحید راٹھور ہماری گفتگو کے دوران میں بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ اس سچویشن کو انجوائے کررہا تھا۔ عائشہ متذبذب انداز میں بولی۔

''تھانیدار جی! آپ ابھی نبیلہ سے مل کر آرہے ہیں تو ظاہر ہے جھوٹ نہیں بول رہے ہوں گے مگر چوہدری صاحب نے مجھ سے کیوں غلط بیانی کی؟''

''کیسی غلط بیانی عائشہ؟'' میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا ''چوہدری صاحب نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ نبیلہ کو بے ہوش کرنے کے بعد دارامر کی والا کے ساتھ بھرت پور بھیج دیں گے۔ دارا اسے وہاں اپنے بندوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس چھوڑ کر واپس یہاں آجائے گا۔ بھرت پور والے بندے بھی دراصل چوہدری صاحب ہی کے نمک خوار ہیں۔ پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ انور کے جیل جانے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو نبیلہ کو یہاں لے آئیں گے لیکن آپ بتا رہے ہیں کہ...!''

''میں نے کہا ہے نا، تم اپنے جی کو نہ الجھاؤ'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''نبیلہ بھرت پور میں ہے یا یہاں والے چوہدری کے ڈیرے پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت جلد وہ تمہارے سامنے ہوگی اور اس وقت تک تم ایک سرکاری مہمان کی حیثیت سے میرے پاس رہو گی!''

میرا آخری جملہ سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا، وہ بے حد مضطرب انداز میں بولی۔ ''جی... کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب بڑا واضح ہے عائشہ!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا ''جب تک میں بھرت پور سے تمہاری بیٹی کو بازیاب کر کے یہاں نہیں لے آتا، تمہیں میرے تھانے کی حوالات میں رہنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم آزاد گھومو... اور چوہدری مشتاق سے جا کر اس بات کی تصدیق کرو کہ اس نے مجھے نبیلہ والے راز میں شریک کیا ہے یا نہیں!''

''تو کیا... تو کیا...؟'' اس کی آنکھوں میں دہشت سی بھر گئی۔

میں نے کڑک کر کہا ''تو کچھ نہیں... تو کچھ نہیں...!''

''ابھی آپ نے بتایا ہے کہ ڈیرے پر نبیلہ سے مل کر آرہے ہیں...'' اس کی حالت دیدنی تھی ''پھر... اسے لینے کے لیے بھرت پور کیوں جا...؟''

وہ بولتے بولتے یک دم خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے موت کے سائے لہراتے دکھائی دیے۔ اسے یقین ہوگیا کہ میں نے ایک سیدھی چال چل کر اسے بڑا الٹا پھنسا دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہائے وائے شروع کرتی، میں نے حوالدار بہادر علی کو بلا کر اسے حوالات میں بند کرا دیا پھر وحید راٹھور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہو، کیسا رہا... میرا آئیڈیا پسند آیا؟''

''سپر سپر'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا ''آپ نے تو کمال کر دیا۔''

''اب تھوڑا بہت کمال اور جلال تمہیں بھی دکھانا ہے وحید!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے جوشیلے لہجے میں بولا ''حکم ملک صاحب!''

میں نے کہا ''بھرت پور یہاں سے صرف دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ میں نبیلہ کو بازیاب کرنے اُدھر جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی میں کامیاب لوٹ آؤں گا۔ اس دوران میں تمہیں جواں مردی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ چوہدری کو عائشہ کی حراست کا علم ہو جائے۔ وہ خود یا اپنے کسی ڈشکرے کو تھانے بھیج سکتا ہے تاکہ صورتِ حال سے آگاہی حاصل کر سکے۔ تم نے کسی بھی شخص کو عائشہ تک نہیں پہنچنے دینا ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''عائشہ کی حمایت میں یہاں آنے والا کوئی بھی شخص اگر زیادہ اکڑفوں دکھانے کی کوشش کرے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے پکڑ کر حوالات میں بند کر دینا، چاہے وہ چوہدری مشتاق ہی کیوں نہ ہو۔ میری طرف سے تمہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اختیارات دیے ہیں تو سمجھیں، میں شیر بن گیا ہوں۔ اب چوہدری ہو یا اس کا کوئی پالتو جانور... اگر کسی نے میرے منہ لگنے کی جرات کی تو میں اسے چیر پھاڑ کر کھا جاؤں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا ''برائی اور باطل کے خلاف ایک پولیس اہلکار کو ایسا ہی پُرعزم اور فرض شناس ہونا چاہیے۔ میں تھانے کے عملے کو خصوصی ہدایات دے کر جاؤں گا۔ اس کارِ خیر میں وہ تم سے مکمل تعاون کریں گے۔''

''بہت بہت شکریہ ملک صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا پھر پوچھا ''کیا آپ بھرت پور اکیلے ہی جائیں گے؟''

''میں اپنے ساتھ کانسٹیبل گل فراز کو لے کر جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا ''بھرت پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں چوہدری مشتاق کے نمک خواروں کو تلاش کرنا اور ان کے قبضے سے نبیلہ کو نکالنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ سمجھو، میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ یہ اتنا بڑا مشن نہیں کہ میں اپنے ساتھ پوری بٹالین لے کر چلوں۔''

وحید نے زیرِلب مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

اس روز میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی کامیاب واپس لوٹ آیا۔ انسان کا عزم مضبوط اور حوصلہ جوان ہو تو وہ پہاڑ کاٹ کر بھی اپنے لیے راستہ بنا سکتا ہے۔ میں نے نہ صرف نبیلہ کو بازیاب کرا لیا تھا بلکہ بھرت پور سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوہدری مشتاق کے تین بندوں کو بھی گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ جب میں نے تھانے میں قدم رکھا تو ایک سنسنی خیز صورتِ حال میری منتظر تھی۔

چوہدری مشتاق اپنے حواریوں کے ہمراہ بہ نفسِ غلیظ تھانے میں موجود تھا اور عائشہ کی رہائی کے لیے وحید راٹھور سے گرما گرمی کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ برہمی سے بولا۔

''صفدر حیات! تم نے مجھ سے بڑا خطرناک دھوکا کیا ہے۔ یاد رکھو، اس حرکت کا بڑا بھیانک نتیجہ برآمد ہوگا!''

''حرکت میں برکت ہے چوہدری مشتاق اور خاصی صحت مند ''برکت'' ہے'' میں نے نبیلہ اور اس کے، بھرت پور سے گرفتار ہونے والے بندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اور جہاں تک دھوکا دینے کا تعلق ہے تو یف گیم (دھوکا دہی کے کھیل) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، تم نے کتنی رتی سچ اور کتنے ٹن جھوٹ بولا ہے مجھ سے اور... تم جو بھیانک نتیجے کا ذکر کر رہے ہو نا...'' میں نے ڈرامائی توقف کیا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ نتیجہ تو واقعی بڑا بھیانک نکلنے والا ہے لیکن میرے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے...!''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بڑی بدتمیزی سے مستفسر ہوا۔

میں نے وحید راٹھور کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا ''راٹھور صاحب! چوہدری مشتاق کو آسان زبان میں میری بات کا مطلب سمجھا دو۔ میں سمجھانے بیٹھ گیا تو اس کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

اے ایس آئی خطرناک انداز میں چوہدری کی جانب بڑھا تو وہ چلّا اٹھا ''یہ... یہ کیا بے ہودگی ہے...؟''

''یہ بے ہودگی نہیں، گرفتاری ہے چوہدری صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''میں تمہیں نبیلہ کو اغوا کرانے اور جس بے جا میں رکھوانے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ اب تمہاری باقی کی، ابتدائی زندگی میرے تھانے کی حوالات میں اور آخری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔''

''تم... تم... ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ بھڑک کر بولا اور اس کے ساتھ ہی باہر کی جانب دوڑ لگانے کی کوشش کی۔

مجھے اس سے ایسی کسی بھی حرکت کی توقع تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگوں میں اڑنگا لگایا۔ وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ، منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ اس ٹکراؤ نے اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ برآمد کی اور وہ بلبلاہٹ بھرے انداز میں مجھے غلیظ گالیوں اور خطرناک دھمکیوں میں تولنے لگا۔

میں نے اس کی یاوہ گوئی اور لن ترانیوں کی ذرا پروا نہیں کی اور اس کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں بھر دیا۔ حوالات اس ''شکم سیری'' پر بڑی خوش نظر آتی تھی۔ ''پیٹ'' بھرنے کے لیے کھانا تو اسے ملتا ہی رہتا تھا لیکن چوہدری مشتاق کے وجود نے گویا اس کے لیے ''شاہی ضیافت'' کا اہتمام کر دیا تھا۔

چوہدری مشتاق کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے میرے پاس نبیلہ کی شکل میں ایک مضبوط گواہ موجود تھی۔ وہ چوہدری سے جتنی شدید نفرت کرتی تھی اتنا ہی ٹوٹ کر وہ انور کو چاہتی تھی۔ اس محبت کی قوت نے اس کے اندر ایسا حوصلہ پیدا کیا کہ وہ حالات کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔ چوہدری نے مختلف ذرائع سے اسے خطرناک دھمکیاں دیں لیکن اس کے پایہ استقامت میں کوئی لرزش نہ آئی۔

نبیلہ کے استقلال اور تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال کو دیکھ کر عائشہ بھی چوہدری کے خلاف ہوگئی اور اس نے اس بکھیڑے کا سارا الزام چوہدری مشتاق پر ہی ڈال دیا۔ اس نے اپنے حلفیہ بیان میں بتایا کہ وہ چوہدری کے دباؤ کے سبب مجبور ہوگئی تھی۔

عائشہ وعدہ معاف گواہ بنی تو میرا کام اور بھی آسان ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی نبیلہ اور انور کا ''کام'' بھی سہل ہوگیا۔ ان کی سچی محبت رنگ لے آئی۔ اِدھر میں نے چوہدری مشتاق کو عدالت سے سزا دلوا کر جیل بھجوایا، اُدھر نبیلہ اور انور کی شادی ہوگئی۔

ایسا نہیں ہے کہ چوہدری مشتاق نے اپنی طاقت اور تعلقات کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اس نے سزا سے بچنے کے لیے سر تا پا زور مارا تھا لیکن اس کے مدِمقابل کوئی عام تھانیدار نہیں، بلکہ ملک صفدر حیات تھا... میں نے اس کی ہر چال اسی پر لوٹا کر نبیلہ سے کیا ہوا وعدہ نبھا دیا۔

بعض اوقات چہل قدمی کرتے ہوئے ایسے ہی ان مول آئیڈیاز ذہن میں آجاتے ہیں جیسا کہ میرے ذہن میں وارد ہوا تھا۔ میں نے عائشہ کی زبان کھلوانے کے لیے ایک سیدھی چال چلی جو نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

نہ صرف نتیجہ خیز ثابت ہوئی بلکہ اس نے بہت سوں کی زندگی میں بہار، نکھار اور سدھار پیدا کر دیا تھا۔

(تحریر حسام بٹ)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیساکھی

ملک صفدر حیات

عورت اگر جلاپے اور انتقام کا شکار ہوجائے تو چنگاری بن کر دھیرے دھیرے سلگتی رہتی ہے اور تیز طوفانی ہواؤں میں بھڑک کر شعلہ بن جاتی ہے... وہ بھی کچھ یوں بھڑکی کہ کئی گھر جل کر خاک ہوگئے۔ ایک وفا شعار بیوی کی سفاکی کئی جفاکاروں کو سبق سکھانے کا سبب بن گئی۔

ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک اور لرزہ خیز قصے کا انکشاف

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ موسم کی شدت کاروبارِ زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ گھر سے باہر قدم نہ نکالیں۔ ''جو ہوتا ہے، ہو جائے.....'' کا سوچ کر انسان کسی گوشۂ عافیت میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے لیکن میرے پیشے کے تقاضے ایسی من مانی اور تن آسانی کی اجازت نہیں دیتے۔ فرض کی راہ میں ہر رکاوٹ اور مشکل کو توڑ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ موسم کی خرابی اور حالات کی سنگینی میرے پیشے پر کسی بھی طور اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ بہ ہر صورت فرض کی ادائیگی لازم ٹھہرتی ہے۔

وہ موسم سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، جنوری کا پہلا یا دوسرا ہفتہ تھا۔ ان دنوں سردی اپنے عروج پر ہوتی ہے اور اس سال تو موسم سرما بڑی آن بان سے وارد ہوا تھا۔ اکتوبر کے آغاز ہی سے فضا میں ٹھنڈک رچ بس گئی تھی۔ آثار و اطوار سے یہی لگتا تھا کہ اس بار موسم سرما مارچ تک کھنچا چلا جائے گا۔ اس حوالے سے جنوری کا وسط بہت ہی کمپرس اور شدید ہو گیا تھا۔ رگوں میں خون منجمد کر دینے والی سردی نے کاروبارِ حیات کے ساتھ ہی حواس اور احساسات کو بھی معطل کر کے رکھ دیا تھا۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، میرا پیشہ ان حالات میں بھی کسی نرمی اور سستی کی اجازت نہیں دیتا لہٰذا میں اس برفیلی صبح بھی حسبِ معمول تیار ہوا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے حوالدار نبی جان میرے کمرے میں آ گیا۔

اس کے چہرے پر گمبھیرتا دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی استفسار کرتا، وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! اچھا ہوا، آپ آ گئے ورنہ..... میں تو آپ کے کوارٹر کی طرف آ رہا تھا۔''

''کیوں بھئی؟'' میں پوری طرح حوالدار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے جناب!'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا ''آخر ہوا کیا ہے؟''

''ایک عورت قتل ہو گئی ہے جناب۔'' نبی جان نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''کون عورت.....؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''یہ قتل کہاں..... کس جگہ ہوا ہے؟''

''عورت کا نام عابدہ بتایا جاتا ہے۔'' حوالدار وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی لاش ادھر بیری والے کھوہ (کنوئیں) کے پاس پڑی ہے۔''

''بیری والا کھوہ!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ کھوہ جو ریلوے لائن کے اس پار کھیتوں میں ہے؟''

''جی ہاں..... میں اسی کھوہ کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ تصدیقی انداز میں بولا۔

میں ان دنوں قصبہ رائے پور کے تھانے میں تعینات تھا اور یہاں میری تعیناتی کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے لہٰذا میں یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں اس علاقے اور وہاں بسنے والے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ قصبہ دراصل ایک سڑک اور ریلوے لائن کے بیچ واقع تھا۔ ہمارا تھانہ سڑک کے کنارے، بس اسٹاپ کے ساتھ تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری طرف سرسبز و شاداب کھیتوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ ریلوے لائن سے ایک کچی پگ ڈنڈی کھیتوں کی سمت جاتی تھی۔ مذکورہ بیری والا کھوہ اسی پگ ڈنڈی کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔

میں نے حوالدار نبی جان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ عورت کے قتل کی اطلاع کون لے کر آیا ہے؟''

''آیا تھا.....!'' حوالدار نے ٹھوس انداز میں جواب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ ''اس بندے کا نام مرتضیٰ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس گیا ہے۔ مرتضیٰ اسی قصبے کا رہنے والا ہے۔ اس کا گھر مقتولہ عورت کے گھر کے نزدیک ہی ہے۔ مرتضیٰ کے گھر میں کوئی مسئلہ ہے اس لیے فوراً واپس چلا گیا۔''

''ہوں.....!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مرتضیٰ نے مقتولہ عورت کے بارے میں اور کیا کیا بتایا ہے؟''

''اس عورت کا نام عابدہ ہے۔'' نبی بخش نے جواب دیا۔ ''عمر تیس کے قریب اور وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اس کی ایک چار سالہ بچی بھی ہے۔ مقتولہ کا خاوند ملک سے باہر گیا ہوا ہے.....''

میں نے پوری توجہ سے نبی جان کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ''کیا اے ایس آئی سکندر علی آچکا ہے؟''

''نہیں جناب!'' حوالدار نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ آج ذرا دیر سے آئے گا۔ اس کا بچہ کل سے بیمار ہے۔ وہ رات جاتے ہوئے مجھے بتا کر گیا تھا۔''

اے ایس آئی سکندر علی کی رہائش اسی قصبے میں تھی چنانچہ اگر تھانے میں کسی قسم کی ایمرجنسی نہ ہوتی تو وہ رات کو اپنے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ شخص ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ سکندر علی کا بیٹا سا جد بیمار ہے۔

میں نے حوالدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''نبی جان! دس پندرہ منٹ میں نکلنے کی تیاری کرلو۔ تم میرے ساتھ وقوعہ پر جاؤ گے۔''

''او کے ملک صاحب!'' اس نے فرمانبرداری سے کہا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

نبی جان اپنے قدیمت اور جسمانی ساخت سے پولیس والا نظر نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی شخص اسے یونیفارم کے بغیر دیکھتا تو اسے یقین نہ آتا کہ وہ پولیس والا ہے بلکہ..... حوالدار ہے لیکن نبی جان اپنے ''کام'' کا ''ماہر'' اور بڑا مستعد پولیس اہلکار تھا۔

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہوئے تھے اور اس عرصے کے دوران میں یہ پہلی سنگین واردات میرے ہاتھ لگی تھی ورنہ اب تک تو چھوٹے موٹے جھگڑے اور چوری چکاری کے کیس ہی نمٹانے کا موقع ملا تھا۔ قتل کی اس واردات کا سن کر میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور مجھے امید تھی کہ اس معاملے میں ہاتھ پاؤں کھولنے کا خوب موقع ملے گا۔ اس وقت میرا ذہن برق رفتاری سے مصروف عمل تھا۔

جیسے ہی نبی جان نے تیاری کی اطلاع دی، ہم دونوں تھانے سے نکل کر جائے وقوعہ کی سمت روانہ ہوگئے۔

نیم پختہ پکڑ قصبے کے شمال میں اور ریلوے لائن جنوب میں واقع تھی جب کہ بیری والا کھوہ ریلوے لائن کے جنوب میں کھیتوں کے درمیان پگ ڈنڈی کے کنارے پر تھا۔ ہمیں جائے واردات پر پہنچنے میں بہ مشکل دس منٹ لگے ہوں گے۔

☆☆☆

اس کنوئیں کو ''بیری والا کھوہ'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ ایک قدیم اور کنگ سائز بیری کے نیچے واقع تھا۔ بیری کے درخت کی بہت سی شاخیں مذکورہ کنوئیں کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ جب میں حوالدار نبی جان کی ہمراہی میں موقع واردات پر پہنچا تو وہاں درجن بھر افراد کو موجود پایا۔ ان کا تعلق اسی گاؤں سے تھا، پولیس کو باوردی وہاں دیکھا تو وہ ادھر ادھر ہوگئے۔

میں فوراً عورت کی لاش کے قریب چلا گیا اور بہ غور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ کنوئیں کی منڈیر کے ساتھ ہی کچھ زمین پر آڑھی ٹیڑھی پڑی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے یقین ہوگیا کہ زندگی اس سے روٹھ کر بہت دور جا چکی ہے!

میں نے مقتولہ کی عمر کا اندازہ اٹھائیس اور تیس کے درمیان قائم کیا۔ وہ بلاشبہ ایک حسین وجمیل عورت تھی لیکن ان لمحات میں اس کی خوبصورتی اور رعنائی ماند پڑ چکی تھی۔ اس کے بدن پر سرخ رنگ کا فلانیل کا لباس تھا جس پر چھوٹے چھوٹے سیاہ پھول بنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں بند جوتی تھی جس کا رنگ سیاہ تھا۔ اس کی لاش کے قریب ہی گہرے نیلے رنگ کی ایک گرم شال بھی پڑی نظر آرہی تھی۔ یہ شال، موت کے منہ میں جانے سے قبل یقیناً اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ مقتولہ کی ایک کلائی میں پیلے رنگ کی بلوری چوڑیاں نظر آرہی تھیں اور دو تین ٹوٹی ہوئی چوڑیاں لاش کے قریب ہی زمین پر بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے لباس اور زمین پر گھسٹنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں، موت سے لڑتے ہوئے اس نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ اس کا فلانیل کا لباس جگہ جگہ سے گرد آلود ہو رہا تھا۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ فلانیل ایک گرم اونی کپڑا ہوتا ہے جسے گاؤں دیہات میں اور بعض اوقات شہروں میں بھی ''فلالین'' کہا جاتا ہے۔ فلالین، درحقیقت فلانیل کا بگاڑ ہے جو کہ غلط العوام ہے۔

میں عابدہ کی لاش کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور بڑی باریک بینی سے اس کی گردن کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی گردن کی حالت کسی نارمل گردن سے بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی اور پہلی ہی نگاہ میں مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اسی گردن کو دبا کر عابدہ نامی اس عورت کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں نے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ لگالیا کہ مقتولہ کی گردن دبانے کے لیے کسی مضبوط رسی وغیرہ کا استعمال کیا گیا تھا۔ گردن کے محیط پر رسی کے مخصوص دباؤ کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے تھے۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر حوالدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''نبی جان! تم جائے وقوعہ کے گردوپیش کا اچھی طرح جائزہ لو۔''

''جو حکم ملک صاحب.....!'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کام میں جت گیا۔

میں وہاں موجود لوگوں کی طرف متوجہ ہوگیا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم میں سے اس بدنصیب کا رشتے دار کون ہے؟''

ہمارے آنے سے پہلے وہ لوگ عورت کی لاش کے قریب جمع تھے مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ کنوئیں سے دور ہٹ گئے تھے۔ میری پکار پر، پچاس پچپن سال کا ایک شخص آگے بڑھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرا نام وزیر علی ہے۔ میں عابدہ کا سسر ہوں جی.....!''

وزیر علی متناسب قد اور بھاری جسم کا مالک تھا۔ رنگ سانولا اور توند نکلی ہوئی، سر کے بال کافی حد تک اڑ چکے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں وزیر علی سے کوئی سوال کرتا، ایک صحت مند شخص تیزی سے آگے آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

''جناب، تھانیدار صاحب! میرا نام راشد ہے۔ یہ عابدہ میری چھوٹی بہن ہے..... میرا مطلب ہے، یہ میری بہن تھی۔''

میں نے چونک کر باری باری وزیر علی اور راشد کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میرے سوال کے جواب پر پورے اترتے تھے یعنی وہ مقتولہ کے قریبی رشتے دار تھے۔ راشد ایک مضبوط کاٹھی کا مالک شخص تھا، رنگ گورا اور عمر چالیس کے اریب قریب تھی۔

یہ بات مجھے معلوم ہوچکی تھی کہ مقتولہ عابدہ اسی قصبے کی رہنے والی تھی اور اس کا خاوند روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر میں نے مقتولہ کے بڑے بھائی سے پوچھ لیا۔

''راشد! کیا تم بھی ادھر رائے پور ہی میں رہتے ہو؟''

''جی ہاں.....'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہم پچھلی تین پیڑھیوں سے اسی گاؤں کے وسنیک ہیں جناب۔ وزیر علی کا گھر جنوبی سمت ریلوے لائن کے قریب ہے اور میں شمالی جانب رہتا ہوں۔ آپ تھانے سے آئیں تو پہلے میرا گھر پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تم دونوں سے بعد میں باری باری بات کروں گا۔'' میں نے نسبتاً تیز لہجے میں کہا۔ ''پہلے موقع کی ضروری کارروائی مکمل ہوجائے۔''

وہ دونوں خاموش ہوکر پیچھے ہٹ گئے لیکن میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ان کے مابین کوئی خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر آتے تھے اور کوشش کرکے ذرا دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ میں ان کی باہمی رنجش کو نوٹ کیے بنا رہ نہیں سکا تھا!

میں نے لوگوں کو موقع واردات سے اس لیے بھی دور ہٹا دیا تھا کہ عین ممکن تھا، مجھے قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کھرا وغیرہ اٹھانے کی ضرورت پیش آجاتی۔ میں نے موقع پر موجود دیگر افراد سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن وہ اس واقعے یا قاتل کے حوالے سے کوئی اہم بات بتا نہ سکے۔ مجھے امید تھی کہ راشد اور وزیر علی سے ہونے والی بات چیت ضرور نتیجہ خیز ثابت ہوتی۔ ان دونوں کے دلوں اور ذہنوں میں پائے جانے والے تفاوت کو میں نے بڑی وضاحت سے نوٹ کیا تھا جبھی میں نے ان سے الگ الگ بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا مابین تفاوت ضرور کوئی گل کھلا دیتا۔

میں اس پوچھ تاچھ میں مصروف ہی تھا کہ حوالدار تیز قدموں سے چلتے ہوئے میری طرف آگیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو نمایاں کررکھا تھا اور مجھے اس کے ہاتھوں میں ایک رسی دبی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ میرے قریب آکر ہیجان خیز لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! یہ دیکھیں..... کیا ملا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے مذکورہ رسی میری طرف بڑھا دی۔

وہ ایک بٹی ہوئی ایسی رسی تھی جو عام طور پر چارپائی کی ادوائن وغیرہ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ہلکے بھورے رنگ کی اس رسی کی لمبائی، میرے اندازے کے مطابق نویا دس گرہ رہی ہوگی..... تقریباً بیس بائیس انچ۔ میں مقتولہ کی گردن کا تفصیلی جائزہ لے چکا تھا لہٰذا اس رسی کو دیکھتے ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور پہلا خیال یہی ابھرا کہ عابدہ کا گلا اسی رسی کی مدد سے دبایا گیا ہوگا!

یہ میرا ایک فوری تاثر تھا حالانکہ نبی جان نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی تاہم میرے اس تاثر کے قیام میں حوالدار کے جوش وجذبے کا اغلب ہاتھ تھا مجھے یقین تھا، وہ بھی میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے مذکورہ رسی اس کے ہاتھ سے لے لی پھر اسے اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر نبی جان سے پوچھا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملی ہے؟''

''جناب! یہ کھوہ کی پرلی طرف سے ملی ہے۔'' یہ بتاتے ہوئے اس نے ریلوے لائن کی جانب اشارہ کیا۔ ''ادھر کھیتوں میں یہ لگ بھگ بیس فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔''

جو کچی پگ ڈنڈی ریلوے لائن سے کھیتوں کی سمت آتی تھی، اس کا زاویہ جنوب مغرب میں بنتا تھا اور بیری والا کھوہ مذکورہ پگ ڈنڈی سے مغرب میں تیس فٹ کے فاصلے پر واقع تھا جب کہ رسی کے حوالے سے حوالدار نے جس سمت اشارہ کیا تھا وہ کھیتوں اور ریلوے لائن کا درمیانی حصہ تھا، یعنی کھوہ سے بیس فٹ دور، ریلوے لائن کی جانب۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج نہیں تھا یا یوں سمجھیں کہ رواج عام نہیں ہوا تھا اور اگر کوئی پولیس آفیسر کسی طرح بھی کوشش کر کے یہ کام سرانجام دے بھی ڈالتا تو عدالت اس کی کارکردگی کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی جیسا کہ آج کل دی جاتی ہے۔ اس ثبوت کو سرسری انداز میں لیا جاتا تھا لہٰذا فنگر پرنٹس کے بکھیڑوں میں پڑنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے حوالدار کے ذہن کا احوال جاننے کے لیے رسی اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''نبی جان! کیا تمہارے خیال میں یہ رسی آلۂ قتل کی حیثیت کی حامل ہوسکتی ہے؟''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے.....'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں تو اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ آپ نے مقتولہ کی گردن کی حالت دیکھی ہے نا؟''

''بڑی اچھی طرح دیکھی ہے نبی جان.....!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں، سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گیا۔

میں نے آئندہ چند منٹ میں، حوالدار کی مدد سے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا پھر بیری والے کھوہ کے آس پاس کا وہ حصہ حصار زدہ بنا دیا جہاں سے قاتل کے سراغ کے سلسلے میں کھرا وغیرہ ملنے کے روشن امکانات تھے۔ اس مقصد کے لیے میں نے کھونٹے اور رسی منگوا کر مطلوبہ حصے کے گرد ایک ''باڑ'' سی کھینچ دی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مقتولہ کی لاش کو سرکاری اسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا اور اس کے ورثا کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وزیر علی اور راشد ہی دو ایسی پارٹیاں تھیں جن سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں کوئی ایسی بات سامنے آسکتی تھی جو قتل کے اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے، میں نے ان دونوں افراد کے درمیان اچھا خاصا تناؤ محسوس کیا تھا۔ یہی تناؤ اس مرحلے پر بھی ایک مسابقت کی صورت ابھر کر سامنے آگیا۔ راشد نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! پہلے آپ مجھ سے سوال وجواب کریں۔ عابدہ میری چھوٹی بہن تھی۔ میں آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا ہوں کہ اس بے چاری کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔''

''وہ میرے بیٹے کی گھر والی تھی۔'' وزیر علی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میری بہو اور میری اکلوتی پوتی کی ماں تھی۔ آپ اس کے بارے میں پہلے مجھ سے پوچھ کچھ کریں جی.....''

''آپ لوگ آپس میں جھگڑا نہ کریں ورنہ اصل معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تم دونوں کو بولنے کا پورا موقع دوں گا لیکن ایک اصول کے تحت!''

''کیسا اصول جی؟'' وزیر علی نے الجھن زدہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے تحمل لہجے میں کہا۔ ''موسم کی سختی اس بات کی اجازت اور رعایت نہیں دیتی کہ یہاں کھلی فضا میں کچہری لگا کر مزید قیام کیا جائے۔ ہمیں کسی گھر کے اندر بیٹھ کر صبر وسکون سے بات کرنا چاہیے لہٰذا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''لہٰذا..... جس کا گھر جائے وقوعہ سے قریب ہے، پہلے میں اس کا بیان لوں گا۔ اس کے بعد دوسرے کی باری آئے گی۔''

میرا فیصلہ سن کر وزیر علی مطمئن دکھائی دینے لگا کیونکہ قرعۂ سوال اس کے نام نکل آیا تھا۔ وہ ریلوے لائن کی دوسری طرف رہتا تھا جبکہ راشد کا گھر قصبے کے دوسرے سرے پر،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے تھانے کے نزدیک تھا۔ وہ اس فیصلے پر برا سا منہ بنا کر رہ گیا تاہم اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''راشد! مجھے پوری طرح اس بات کا احساس ہے کہ یہ سانحہ تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہے۔ میں تمہارے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ تم اطمینان سے اپنے گھر جاؤ۔ میں وزیر علی سے فارغ ہو کر سیدھا تمہارے پاس آتا ہوں۔'' میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا تم لوگوں سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد عابدہ کے قاتل کو گرفتار کر کے عدالت کے حوالے کر دوں گا اور اپنی سی کوشش کر کے اسے ایسی عبرتناک سزا دلواؤں گا کہ تم لوگوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ میں جان ہارنے والی عابدہ کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن اس کے قاتل کو تلاش کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا میرا فرض ہے۔''

میرے ان مبنی بر حقیقت عزائم نے دونوں پارٹیوں کو مطمئن کر دیا۔ میں وزیر علی اور راشد کو دو پارٹیاں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان کے درمیان خفگی اور ناراضی کی ایک لکیر سی کھنچی دیکھی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، اس لکیر کی مضبوطی اور اہمیت کیا ہے۔ یہ تو ان کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ہی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ صورتِ حال کیا ہے! اپنے اس مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں مقتولہ عابدہ کے سسر وزیر علی کے ہمراہ اس کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

حوالدار نبی جان کو میں نے مقتولہ کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال روانہ کر دیا تھا لہٰذا اس وقت میں اکیلا ہی تھا۔ نبی جان اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا تھانے آ جاتا۔ وزیر علی کا گھر ریلوے پٹری پر کھڑے ہو کر دیکھا جا سکتا تھا۔ ریلوے لائن اور اس کے گھر کے درمیان کم و بیش پچاس، ساٹھ گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔ اگر آپ کو ٹرین میں بیٹھ کر سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے ریلوے لائن کے آس پاس اس نوعیت کے گاؤں دیہات آباد ضرور دیکھے ہوں گے۔ وہ ایک لوکل ٹرین کا ریلوے ٹریک تھا جو دن میں صرف ایک مرتبہ وہاں سے گزرتی تھی۔ زیادہ تر مال گاڑیوں نے ہی اس پٹری کو اپنی گزرگاہ بنا رکھا تھا۔

وزیر علی کا گھر ایک روایتی کچا مکان تھا۔ ریلوے لائن کی طرف پائے جانے والے اکثر مکانات کے آگے چھوٹے موٹے باغیچے اور سبزیوں وغیرہ کی کیاریاں بنی دکھائی دیتی ہیں۔ گاؤں دیہات کے لوگ بہت سی اشیائے ضرورت میں خود کفیل ہوتے ہیں اور گنتی کی چیزیں انہیں خریدنا پڑتی ہیں۔ ان کاموں کے لیے ان میں ذوق و شوق بھی ہوتا ہے اور ان کے پاس وافر وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ شہر کی زندگی اتنی مصروف ہوتی ہے کہ بعض اوقات شیو بنانے اور کپڑے استری کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا، سبزی ترکاری گھر میں یا گھر کے باہر اگانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اعتدال، انسانی زندگی کی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں توازن ہونا چاہیے۔ ہم چند چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے اتنی تیز رفتاری سے بھاگتے ہیں کہ بہت سی اشیا سے محروم رہ جاتے ہیں جن میں صحت اور سکون سرفہرست ہے۔ اس محرومی میں صحت کا قصور ہے، نہ سکون کا اور نہ ہی کسی اور کا..... انسان دراصل اپنی ہی خواہشات اور فیصلوں کا اسیر ہے!

یہ مجھے راستے ہی میں پتا چل چکا تھا کہ وزیر علی ایک دکاندار ہے۔ قصبے کے مین بازار میں اس کی پرچون کی دکان تھی۔ گھر میں بسنے والے افراد کی تعداد بھی محدود تھی۔ یعنی خود وزیر علی، اس کی بیوی ملکہ، بہو عابدہ (جو اب اس دنیا کو چھوڑ کر اس دنیا کی باسی ہو چکی تھی) عابدہ کی چار سالہ بیٹی فاخرہ اور بس..... وزیر علی کا اکلوتا بیٹا مشتاق روزگار کے سلسلے میں پاکستان سے باہر گیا ہوا تھا۔ وزیر علی نے بتایا کہ وہ عراق میں ہے اور کسی میکینکل فرم میں کام کرتا ہے۔

وزیر علی نے مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھایا۔ اس کی بیوی ملکہ بھی وہیں آ گئی۔ فاخرہ اپنے ہم عمر بچوں کے ہمراہ باہر کھیل رہی تھی۔ وہ اس سانحے کی حقیقت اور سنگینی سے ظاہر ہے، اس طرح آگاہ نہیں تھی جیسے کوئی عاقل بالغ انسان ہو سکتا ہے۔

ملکہ کی عمر پچاس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ گول چہرے والی ایک گوری چٹی اور فربہ عورت تھی۔ بعد ازاں، تفصیلی گفتگو کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ پہلے بیٹے مشتاق کی پیدائش کے وقت کوئی زچگانا پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی اور یوں آئندہ کے لیے ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھی۔ مشتاق ان کی اکلوتی اولاد تھا اور وہ پچھلے تین سال سے عراق میں تھا۔

ملکہ اور وزیر علی، عابدہ کی المناک موت پر بڑے غمزدہ نظر آتے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس سانحے کے حوالے سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ان سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد ان کی بہو کے قاتل کو..... نہ صرف ڈھونڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکالوں گا بلکہ اسے کیفر کردار تک بھی پہنچاؤں گا۔

ملکہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آرہا کہ عابدہ کو کس نے قتل کیا ہے!''

''سمجھ میں آجائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے اس بات کا پتا چلانا ہوگا کہ آپ لوگوں کی بہو بیری والے کھوہ تک پہنچی کیسے؟ وہ اپنی مرضی سے گئی یا اسے زبردستی وہاں لے جایا گیا؟ وہ وہاں کس سے ملنے گئی تھی..... وغیرہ وغیرہ!'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اور..... اسی طرح کے دیگر سوالات کے جواب آپ مجھے دیں گے کیونکہ مقتولہ آپ کے پاس، آپ کے گھر میں رہتی تھی ..... یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کو کچھ پتا ہی نہ ہو!''

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں تھانیدار صاحب!'' وزیر علی نے گھگیائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے دماغ میں کچھ نہیں آرہا، یہ سب کیا اور کیسے ہوگیا.....!''

''ایک بات تو طے ہے کہ آپ کی بہو کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کی گردن کی حالت تم نے بھی دیکھی ہے وزیر علی۔ مقتولہ کی لاش جس آڑے ٹیڑھے انداز میں کچی زمین پر بے ترتیب پڑی تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے، زندگی کو الوداع کہتے ہوئے اس نے موت سے لڑنے کی بھرپور کوشش کی تھی، یہ الگ بات ہے کہ اس کی پیش نہ چلی اور قاتل اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر ایک لمحے کی خاموشی اختیار کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ لوگ مجھ سے تعاون نہیں کرو گے تو اس کیس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آئے گا۔ میں نے راشد کے تیور دیکھے ہیں۔ وہ آپ لوگوں سے خاصا خفا نظر آتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اس کا کوئی بیان آپ کو کسی بڑی مصیبت میں مبتلا کردے لہٰذا.....'' میں نے سنسنی خیز انداز میں توقف کیا پھر کہا۔

''.....لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ حقیقت سے آپ لوگ جس حد تک واقف ہیں، مجھے بھی آگاہ کردیں..... بہ صورت دیگر مجھے راشد کی بات بڑی توجہ سے سننا پڑے گی اور اس کی بات پر کان بھی دھرنا پڑیں گے!''

میرے انداز میں ایک خاص قسم کی دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بھول کر پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے واضح ہوتا تھا کہ وہ خود کو کسی بڑی مصیبت میں گھرا ہوا محسوس کررہے ہیں۔ فوری طور پر میں فیصلہ نہ کرسکا کہ وہ کوئی اہم بات مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہے تھے یا پھر انہیں واقعی کسی بات کا علم نہیں تھا.....! انہیں متذبذب، فکرمند اور الجھا ہوا دیکھا تو میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں مقتولہ کے کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں!''

میری تقلید میں وزیر علی بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں جی۔''

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وزیر علی کا گھر لگ بھگ پانچ مرلے قطعۂ زمین پر بنا ہوا تھا۔ کراچی کے رہائشی اسے ایک سو تیس گز کے پلاٹ پر تعمیر شدہ مکان سمجھ لیں۔ مکان کے ابتدائی حصے میں ایک چھوٹی سی بیٹھک بنی ہوئی تھی جہاں سے میں ابھی اٹھا تھا۔ بیٹھک کے پہلو میں ڈیوڑھی یعنی گھر کا داخلی راستہ تھا۔ بیٹھک میں آمد وشد کے لیے دو دروازے تھے۔ ایک ڈیوڑھی کی جانب اور دوسرا گھر کے صحن کی طرف۔ گھر کا صحن اور برآمدہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ نسبتاً نیچی چھت والا باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ صحن والی دیوار کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے جبکہ برآمدے کے اختتام پر دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں ایک مربع شکل کا اور دوسرا مستطیل صورت کا تھا۔ چوکور کمرے میں وزیر علی اور اس کی بیوی ملکہ کی رہائش تھی جب کہ لمبوترے کمرے میں مقتولہ عابدہ اپنی چار سالہ بیٹی فاخرہ کے ساتھ رہتی تھی۔ وزیر علی مجھے عابدہ کے کمرے میں لے آیا۔

وہ کمرا اپنے اندرونی ماحول اور اشیا کے حوالے سے بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ گاؤں دیہات کے گھروں کے کمرے ہوا کرتے ہیں۔ کمرے کے وسط میں دو چارپائیاں پہلو بہ پہلو بچھی ہوئی تھیں اور دیگر ساز وسامان بھی اپنی اپنی جگہ پر رکھا نظر آرہا تھا۔ کمرے میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ دروازے والی دیوار میں ایک بڑی سی کھڑکی بھی موجود تھی۔ یہ کھڑکی اور دروازہ باہر صحن میں کھلتے تھے۔

مقتولہ کے کمرے کی سامنے والی دیوار پر ایک فریم شدہ تصویر بھی آویزاں تھی جس میں ایک مرد اور ایک عورت جڑ کر بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ عورت کو تو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ مقتولہ عابدہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی جبکہ تصویر میں نظر آنے والا مرد یقیناً مقتولہ کا شوہر مشتاق تھا۔ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کی خاطر فریم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وزیر علی! کیا یہ تمہارا بیٹا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشتاق ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا ہے تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ فوٹو ان کی شادی کے فوراً بعد کی ہے۔ اس وقت تک فاخرہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ فاخرہ، ان کی شادی کے دو سال بعد اس دنیا میں آئی تھی۔ اب ماشاءاللہ! وہ پورے چار سال کی ہوگئی ہے۔''

''اور مشتاق کو عراق گئے لگ بھگ تین سال ہوگئے ہیں؟'' میں نے پھولے ہوئے گالوں والے مشتاق کی تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، مشتاق ایک پستہ قامت اور فربہ شخص ہونا چاہیے تھا۔

وزیرعلی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جی ہاں..... فاخرہ ایک سال کی تھی جب مشتاق کو ملک سے باہر جانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس پر زور دیا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگائے۔ اگر وہ چند سال ملک سے باہر لگا آئے گا تو اس کی زندگی بن جائے گی۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ عراق چلا گیا۔''

''کیا ان تین سالوں میں، تمہارا بیٹا ملنے کے لیے پاکستان آیا ہے؟'' میں نے وزیرعلی سے سوال کیا۔

یہ اس دور کا واقعہ ہے جب بیرون ملک جا کر روزی کمانے کے رجحان کا ابھی آغاز ہوا تھا، خاص طور پر گاؤں دیہات میں رہنے والوں کے لیے یہ بالکل ایک نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ عام طور پر لوگ لیبر میں جاتے تھے، بہت کم ہی ایسے ہوتے تھے جنہیں کسی ٹیکنیکل شعبے میں قسمت آزمائی کا موقع ملتا تھا اور مشتاق انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔ وہ عراق کی کسی میکینکل فرم میں مشین مین کی حیثیت سے ملازم تھا۔

وزیرعلی نے جواب دیا۔ ''نہیں جناب..... وہ ان تین سالوں میں ہم سے ملنے کے لیے ایک مرتبہ بھی یہاں نہیں آیا البتہ، دو تین ماہ میں اس کی خیر خیریت کا خط آجاتا ہے اور جواب میں ہم بھی اسے خط لکھ دیتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ پانچ سال کا عزم لے کر عراق گیا تھا اور پروگرام یہی تھا کہ ان پانچ سالوں میں وہ خوب محنت کرے گا۔ وہ اتنا جمع کرلے گا کہ یہاں واپس آنے کے بعد اسے کسی قسم کی محتاجی نہیں رہے گی۔ وہ بڑی آسانی سے کوئی بھی کاروبار شروع کرلے گا لیکن.....'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

''لیکن اس واقعے کے بعد تو مشتاق کو پاکستان آنا ہی پڑے گا۔ میں آج یا کل کسی وقت بڑے ڈاک خانے جا کر مشتاق کو تار (ٹیلی گرام) بھیجتا ہوں تاکہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں آجائے۔''

وزیرعلی کے ادا کیے ہوئے ایک ایک الفاظ سے پریشانی ٹپکتی تھی۔ قتل کی اس واردات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر دوستانہ لہجے میں کہا۔

''وزیرعلی! تمہارا بیٹا جس عراقی مکینیکل فرم میں کام کرتا ہے اس کا نام پتا تو ہوگا تمہارے پاس؟''

''جی بالکل ہے.....'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے مشتاق کے سارے خط سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ شروع کے خطوط میں اس نے اپنی کمپنی کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ کمپنی کا نام، ایڈریس، فون نمبر وغیرہ..... سب ہے میرے پاس محفوظ۔''

''شاباش.....!'' میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے اس کی فرم کا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دو۔ میں ہیڈ کوارٹر سے یا ایس پی صاحب کے دفتر سے تمہارے بیٹے کو فون کرکے یہاں کے حالات سے آگاہ کردوں گا، ٹیلی گرام وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

اس نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وزیرعلی! میں ایک مرتبہ پھر نرمی سے پوچھ رہا ہوں کہ اگر تم اپنی بہو کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں ذرا سا بھی جانتے ہو تو خاموش نہیں رہو۔ مجھے تفتیش کی گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کے لیے کوئی اشارہ چاہیے.....!''

وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''تھانیدار صاحب! عابدہ کا تو کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا، وہ گھر سے کیسے نکلی اور بیری والے کھوہ پر کیا لینے گئی تھی جو کسی نے اس کی گردن دبا کر زندگی سے محروم کردیا.....''

''وزیرعلی! جس انداز میں تمہاری بہو کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، وہ کسی دوست کا کارنامہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں پتا ہو یا نہ ہو، لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ میں پہلی فرصت میں اس دشمن تک پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ یہ پتا چلایا جاسکے کہ اس قتل کی اصل وجہ کیا ہے۔ مجھے تو یہ لگتا ہے وزیرعلی.....''

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کو..... کیا لگتا ہے..... تھانیدار جی.....؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مجھے یہ لگتا ہے کہ تمہاری بہو اپنی مرضی سے بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اکیلی یا کسی کے ہمراہ..... اس حقیقت کا بہت جلد پتا چلا لیا جائے گا۔ میں نے جائے وقوعہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ کھوجی کی مدد سے جب کھرا اٹھایا جائے گا تو صاف پتا چل جائے گا، پچھلی رات وہاں کس کس شخص کے فٹ پرنٹ (قدموں کے نشانات) پہنچے تھے پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ میں یہ جاننے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ تمہاری بہو کب، کیسے اور کیوں بیری والے کھوہ پر گئی تھی!''

میری ان سنگین باتوں نے اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سوہنا رب خیر کرے جی.....!''

''سوہنا رب تو ہمیشہ خیر ہی کرتا ہے وزیر علی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ انسان بڑا ظالم اور فتنہ پرور ہے۔ اسے کسی کروٹ چین نہیں آتا۔ نت نئے ہنگامے کھڑے کرتا رہتا ہے!''

میرے ان معنی خیز جملوں کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولا۔ پتا نہیں کیوں، مجھے اندر سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وزیر علی کو اس واردات کے حوالے سے کوئی ایسی بات پتا ہے جو اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اب یہی کہا جا سکتا تھا کہ یا تو اسے بھی اس نکتے کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اور یا پھر وہ دانستہ مجھ سے چھپا رہا تھا، یعنی ایک لحاظ سے وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا، بہ الفاظِ دیگر..... وہ جھوٹ بول رہا تھا!

اگر وہ دیدہ و دانستہ اس حرکت کا مرتکب ہو رہا تھا تو یہ اس کی سنگین غلطی تھی کیونکہ جب کوئی انسان جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پیشِ نظر دو یا ان دو میں سے ایک مقصد ضرور ہوتا ہے۔ نمبر ایک، وہ کسی خطرناک جرم کا ارادہ کر چکا ہوتا ہے۔ نمبر دو، وہ اپنے کسی بھیانک جرم کی پردہ پوشی کر رہا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ مجرم کے خانے میں فٹ ہوتا ہے..... اگر وزیر علی بھی اسی خانے کا باسی تھا تو میں مستقبل قریب میں اس کا حشر نشر کرنے والا تھا.....!

میں نے اسے کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے، عام سے لہجے میں کہا۔ ''تمہارا اور تمہاری بیوی کا نام کچھ عجیب سا نہیں ہے؟''

''عجیب سا کیوں جی.....!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''بیوی ملکہ اور شوہر وزیر..... تمہیں یہ کیسا لگتا ہے کہ وزیر کی بیوی ملکہ.....ہوں؟''

''جناب! دراصل ملکہ تو بادشاہ کی بیوی ہوتی ہے اور وزیر بادشاہ کا نائب.....'' وہ اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ سارا چکر ناموں کی وجہ سے ہے۔ میں کسی بادشاہ کا وزیر نہیں لیکن میرا نام وزیر علی ہے۔ ملکہ کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ میری بیوی ہے.....''

''اچھا، ٹھیک ہے۔'' میں نے اس سلسلے میں نام کے وزیر کو زیادہ الجھانا مناسب نہ سمجھا اور معتدل لہجے میں کہا۔ ''اگر تم کہتے ہو کہ یہ محض ناموں کا چکر ہے تو میں تمہاری ہی بات کو درست مان لیتا ہوں۔''

میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ وزیر علی کے لیے جواب دینا لازم ٹھہرتا۔ وہ خاموش اور الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوالات کے حلقے کو تنگ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''وزیر علی! آج کل تم لوگ رات کا کھانا کتنے بجے کھا لیتے ہو؟''

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''آج کل موسم سرما اپنے عروج پر ہے اس لیے سارے کام جلدی جلدی کرنا پڑتے ہیں۔ شام (مغرب) کی نماز کے بعد ہم کھانے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔''

''مغرب کی نماز کے بعد.....'' میں نے مقتولہ کی خواب گاہ سے واپس بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''یعنی زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہی کوئی چھ، سوا چھ بجے.....''

''اس کا مطلب ہے.....'' میں نے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''سات بجے تک تو تم لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے ہو گے؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگ رات کے کھانے کے بعد کیا کرتے ہو..... میرا مطلب ہے کہ فوراً سو جاتے ہو یا.....؟''

ہم ملکہ کو بیٹھک میں چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ بھی ہمارے بعد وہاں سے نکل گئی تھی۔ وہ ہمارے پیچھے کمرے میں تو نہیں آئی، ہو سکتا ہے باورچی خانے میں گھس کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ بہرحال، جب ہم بیٹھک میں واپس آئے تو وہ وہاں موجود نہیں تھی تاہم قبل اس کے کہ وزیر علی میرے سوال کا جواب دیتا، ملکہ کی آواز سنائی دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تھانیدارجی.....میں آپ کو بتاتی ہوں.....''

میں نے پلٹ کر عقب میں دیکھا، ملکہ ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ ہماری ہی طرف آرہی تھی۔ بچی کی عمر کم وبیش چار سال رہی ہوگی۔ وہ ایک گوری چٹی اور گول مٹول بچی تھی جس کے گھونگریالے بال بڑے خوبصورت نظر آتے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ مقتولہ کی اکلوتی بیٹی فاخرہ ہے۔

مجھے بچی کی جانب یک ٹک دیکھتے پاکر ملکہ نے تصدیقی لہجے میں کہا۔''یہ میری پوتری (پوتی) فاخرہ ہے۔کافی دیر سے باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ آج بڑی غضب کی سردی ہے اس لیے اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی ہوں۔'' وہ کہے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''بچے بڑے معصوم اور ننھے منے ہوتے ہیں لیکن پتا نہیں، یہ کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں کہ انہیں ذرا بھی سردی نہیں لگتی۔ ہم بڑے سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں مگر ان بچوں کو ذرا بھی پروا نہیں۔ ان میں بے پناہ قوتِ برداشت ہوتی ہے۔''

''قوتِ برداشت نہیں ملکہ، بلکہ بے پروائی اور لاابالی پن کہو۔'' میں نے دلکش نقوش والی فاخرہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''یہ لوگ اپنے کھیل کود میں اس حد تک مگن ہوتے ہیں کہ انہیں موسم کی سختیوں کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ تو یہاں تک بے نیاز ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی ماں کی موت کا بھی ادراک نہیں ہو پاتا.....''

میرے آخری جملے نے ان دونوں میاں بیوی کو بے حد ملول وافسردہ کردیا تاہم ننھی فاخرہ ٹکر ٹکر ہم سب کی صورتیں دیکھنے لگی۔ میں نے صورتِ حال کی غمزدگی کو کم کرنے کی غرض سے اضافہ کیا۔

''اسی لیے بزرگ کہتے ہیں کہ بچوں میں منافقت، مصلحت اور ریاکاری نہیں ہوتی۔ وہ تن اور من کے سچے ہوتے ہیں۔ان کی ذات میں خدا جھلکتا ہے.....!''

ملکہ نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، میں نے کہا۔''ملکہ! تم مجھے کچھ بتانے والی تھیں؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے فاخرہ کے ننھے منے ٹھنڈے ٹھار ہاتھوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر کر گرم کیا، اس سے کہا کہ وہ باہر جائے، پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''وہ جی.....آپ نے وزیرعلی سے جو پوچھا تھا، میں اسی بات کا جواب دینے والی تھی.....کہ ہم رات کے کھانے کے بعد کیا کرتے ہیں.....''

''ٹھیک ہے.....بتاؤ۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ بولی۔''وزیرعلی تو ادھر برآمدے میں چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔ ہم تینوں باورچی خانے میں چولہے کے پاس بیٹھ کر کھاتی ہیں۔ کھانے کے بعد تھوڑی باتیں بھی ہوتی ہیں۔اس دوران میں عابدہ برتن دھوتی تھی اور میں فاخرہ کے ساتھ قصے کہانیاں کرتی، پھر ہم سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔''

''سونے سے پہلے میں نے گھر کا بیرونی دروازہ کبھی بند کرنا نہیں بھولا۔'' وزیرعلی نے مزید بتایا۔''دروازے کو اندر سے کنڈی لگانے کے بعد ہی مجھے اطمینان ہوتا ہے۔''

''کیا صبح تمہی دروازے کی کنڈی کھولا بھی کرتے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔''یہ کام میرے ہی ذمے ہے۔ جب مشتاق گھر میں تھا تو میں کبھی اس سے کہہ کر بھی یہ کام کروالیا کرتا تھا۔ پچھلے تین سال سے تو مجھے ہی کنڈی چڑھانا اور اتارنا پڑ رہی ہے۔''

''کیا کل رات کو بھی سونے سے پہلے تم نے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی تھی؟''

''جی.....مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔''میں نے رات کو دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی تھی اور اپنے کمرے میں آگیا تھا، پھر ہم سو گئے تھے۔''

''پچھلی رات، لگ بھگ کتنے بجے تم نے کنڈی چڑھائی تھی؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت آٹھ بجے ہوں گے۔''

''جب تم بیرونی دروازے کو کنڈی لگانے گئے تو اس وقت تمہاری بہو سو چکی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سو چکی تھی یا جاگ رہی تھی، اس بات کا تو مجھے کچھ پتا نہیں جناب!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔''ہاں، یہ جانتا ہوں کہ عابدہ اور فاخرہ اس وقت اپنے کمرے کے اندر جا چکی تھیں۔''

''تم نے گھر کے بیرونی دروازے کو کنڈی چڑھائی اور اپنے کمرے میں آگئے۔'' میں نے خودکلامی کے سے انداز میں کہا پھر تیز لہجے میں پوچھا۔''کیا تم اپنے کمرے میں آنے کے بعد فوراً ہی سو گئے تھے یا تمہیں دیر سے نیند آئی تھی؟''

''جناب! میں دن بھر دکان میں اس قدر تھک جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں کہ رات دیر تک جاگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''جب مشتاق یہاں تھا تو دکان داری میں میری مدد کیا کرتا تھا۔ اب تو مجھ اکیلے ہی کو سارا کام سنبھالنا پڑتا ہے جناب.....!''

''تم نے گزشتہ رات کم و بیش آٹھ بجے گھر کے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور اپنے کمرے میں آ کر سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ''اور پھر تم فوراً ہی سو گئے..... یعنی ساڑھے آٹھ یا زیادہ سے زیادہ نو بجے تک تم گہری نیند میں جا چکے تھے.....؟''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''پچھلی رات میرے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ میں نے ملکہ سے کہا کہ وہ میرا سر دبا دے۔ یہ ہلکے ہلکے میرا سر دبانے لگی۔ مجھے ایسا سکون ملا کہ پتا ہی نہ چلا، کب میں سو گیا۔''

''ٹھیک ہے.....!'' میں وزیر علی کو چھوڑ کر اس کی بیوی ملکہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پچھلی رات، جب وزیر علی سو گیا تو اس کے بعد تم کیا کرتی رہی تھیں؟''

''میں نے کیا کرنا تھا جی۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''جب وزیر علی کے خراٹوں کی آواز ابھرنے لگی تو میں بھی اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی تھی۔''

''کیا تمہیں لیٹتے ہی نیند آ گئی تھی؟''

''نہیں جی!'' اس نے نفی میں گردن جھٹکی اور بتایا۔ ''میں تھوڑی دیر تک جاگتی رہی تھی۔''

''تھوڑی دیر تک.....!'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''دس منٹ، بیس منٹ، تیس منٹ.....؟''

''میرا خیال ہے، میں کوئی آدھے گھنٹے تک جاگتی رہی تھی۔'' ملکہ نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس آدھے گھنٹے میں، تم نے گھر کے اندر کسی قسم کی آواز ابھرتے سنی تھی..... خاص طور پر صحن یا بیرونی دروازے کی جانب سے؟''

''نہیں جی، میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھ رہی ہوں، آپ یہ سوال کس حوالے سے کر رہے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں نا کہ اگر عابدہ خود ہی گھر سے نکلی تھی تو میں نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی ہوگی..... ہیں نا؟''

''تمہارا اندازہ بڑی حد تک درست ہے ملکہ۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن اس سلسلے میں مجھے کوئی ابہام یا غلط فہمی نہیں کہ عابدہ خود اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اگر اس کے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی کی گئی ہوتی تو اس کے آثار گھر کے مختلف حصوں میں ضرور دکھائی دیتے اور وہ ہنگامہ مچتا کہ آپ دونوں لمبی تان کر پڑے سوتے نہ رہتے!''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!'' وزیر علی گمبھیر انداز میں بولا۔ ''گھر کے اندر یا باہر کسی قسم کی ابتری یا افراتفری نظر نہیں آئی جس کا مطلب ہے.....''

''جس کا مطلب ہے.....'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''کہ تمہاری بہو عابدہ اپنی مرضی سے گھر سے نکلی تھی!''

وہ دونوں متعجب نظروں سے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے پوچھا۔ ''اس گھر میں صبح سب سے پہلے کون اٹھتا ہے؟''

''میں۔'' وزیر علی نے جواب دیا۔ ''عام طور پر میں ہی پہلے اٹھتا ہوں۔ میں ملکہ کو جگاتا ہوں اور ملکہ جا کر عابدہ کو اٹھاتی ہے..... میرا مطلب ہے، اٹھاتی تھی۔ اب تو وہ کبھی نہ اٹھنے کے لیے سو چکی ہے۔''

بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی۔ میں اس کے صدمے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن میں اس دکھ کو کم کرنے کے لیے فوری طور پر ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''وزیر علی! کیا آج صبح بھی تم ہی سب سے پہلے اٹھے تھے؟''

''نہیں جی، آج ملکہ کی آنکھ مجھ سے پہلے کھل گئی تھی اور اس کی بھی ایک وجہ ہے۔'' وہ میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ رات میرے سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے جب مجھے نیند آئی تو میں بے خبر سویا اور اپنے وقت پر صبح اٹھ نہ سکا۔ ملکہ نے میرا سر دبا کر مجھے ایسی پُرسکون نیند میں پہنچا دیا تھا کہ میں معمول کے مطابق جاگ نہ سکا۔''

''ملکہ نے تمہیں جگایا اور پھر وہ عابدہ کو اٹھانے چلی گئی۔'' میں نے واقعات کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا پھر ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''کیا عابدہ تمہیں اپنے کمرے میں مل گئی تھی؟''

''نہیں جناب، وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔'' اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے جواب دیا۔ ''فاخرہ گہری نیند سو رہی تھی۔ عابدہ کو کمرے میں نہ پا کر مجھے حیرت تو ہوئی لیکن پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں کمرے کی طرف آنے کے بجائے دروازے کی طرف بڑھ گئی.....''

ملکہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی تو وزیر علی نے کہا۔ ''میں رات کو دروازے کی کنڈی چڑھا کر سویا تھا لیکن جب صبح دستک کی آواز سن کر ملکہ دروازے پر پہنچی تو اس کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ جب ملکہ نے دروازہ کھولا تو سامنے مجید کھار کھڑا تھا۔''

''مجید کھار.....!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ مجید کھار کون ہے اور وہ صبح ہی صبح تمہارے دروازے پر کیا لینے آ گیا تھا؟''

وزیر علی نے جواب دیا۔ ''مجید کھار بھی اسی قصبے میں رہتا ہے اور وہ ہمیں عابدہ کی لاش کے بارے میں بتانے آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، عابدہ کی لاش کو سب سے پہلے مجید کھار نے دیکھا تھا؟'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں۔'' وزیر علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ادھر بیری والے کھوہ کے قریب ہی پگ ڈنڈی کے دوسرے کنارے پر ایک چھپڑ (گندے پانی کا تالاب، جوہڑ وغیرہ) ہے۔ اس چھپڑ میں دن بھر مال مویشی نہاتے ہیں یا پھر عورتیں اپنے کچے گھروں کی لیپائی پوتائی (لیپا پوتی) کے لیے مٹی نکالتی ہیں۔ مجید کھار بھی مٹی کی تلاش میں ادھر چکر لگاتا ہے۔ آج تڑکے جب.....'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آج صبح جب مجید کھار اپنے گدھے اور کتے کے ہمراہ چھپڑ کی طرف گیا تو کتے نے بیری والے کھوہ کے قریب پہنچتے ہی بھونکنا شروع کر دیا پھر جلد ہی کتے کے بھونکنے کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ وہ بے زبان جانور عابدہ کی لاش دیکھ کر بھونک رہا تھا.....!''

وزیر علی یہاں تک بتانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ مجید کھار کا نام پہلی مرتبہ سامنے آیا تھا۔ اس سے پہلے مرتضیٰ کا نام سننے میں آیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے پہنچا تھا اور میری آمد سے پہلے ہی تھانے سے نکل گیا تھا۔ ان دونوں افراد کی حیثیت اس کیس میں اطلاع کنندگان ایسی تھی..... اور مزے کی بات یہ تھی کہ میری ان دونوں اہم افراد سے ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ جائے وقوعہ پر وہ موجود نہیں تھے ورنہ یہ بات مجھ سے چھپی نہ رہتی اور میں ان سے بھی کڑی پوچھ گچھ کرتا۔

میں نے وزیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجید کھار نے آ کر تمہیں بتایا کہ ادھر بیری والے کھوہ کے پاس تمہاری بہو کی لاش پڑی ہے۔ پھر اس گھر میں افراتفری مچ گئی۔ ایک بندے جس کا نام مرتضیٰ ہے، کو تھانے کی طرف دوڑایا گیا تاکہ اس واقعے کی رپورٹ درج ہو سکے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ.....'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر وزیر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہ.....ابھی تک مجید کھار یا مرتضیٰ سے میرا سامنا نہیں ہو سکا حالانکہ ان دو اہم افراد کو تو جائے وقوعہ پر حاضر رہنا چاہیے تھا۔ کیا تم مجھے ان دونوں کے گھروں کا پتا بتا سکتے ہو؟''

''جی ضرور، ضرور.....'' یہ کہتے ہوئے وزیر علی نے میرے مطلوبہ دونوں افراد کے گھروں کی لوکیشن سمجھا دی۔

میں نے کہا۔ ''وزیر علی! مجھے امید ہے، تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہو گی۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ تمہاری بہو اپنی مرضی سے گھر سے نکلی تھی۔ اب وہ کس مقصد سے بیری والے کھوہ تک پہنچی اور وہاں اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، اس کا میں بہت جلد پتا چلا لوں گا۔ ویسے ایک بات تو تم بھی تسلیم کرو گے کہ کوئی بہت ہی ضروری کام ہو گا جو عابدہ اپنی چار سالہ بچی کو سوتا چھوڑ کر ٹھنڈی ٹھار رات کی خوفناک تاریکی میں بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی.....!''

وہ دونوں متذبذب اور الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں اور آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے واضح طور پر لہراتے دیکھے جا سکتے تھے۔ اس واقعے سے زیادہ میری باتوں نے انہیں سراسیمہ کر دیا تھا۔

اسی لمحے ننھی فاخرہ بیٹھک میں داخل ہوئی اور اپنی دادی کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی حرکات و سکنات سے نہیں لگتا تھا کہ اسے اپنی ماں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر ہو گی۔ وہ بڑی مطمئن اور پُرسکون دکھائی دیتی تھی۔

میں نے ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، یہ بچی تمہارے ساتھ ہلی ہوئی ہے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تھانیدار صاحب!'' وہ بڑے دلار سے فاخرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''یہ صرف رات کو سونے کے لیے اپنی ماں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس جاتی ہے۔ پچھلے سال اس کا دودھ بھی چھڑا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد تو یہ ہر وقت میرے پاس ہی رہتی ہے یا پھر باہر بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔ ماں کی اسے زیادہ پروا نہیں ہوتی۔''

میں ملکہ کے آخری جملے سے قطعاً اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ بچہ چاہے ایک دن کا ہو یا سو سال کا ہو جائے، ہر حال میں اسے اپنی ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی سے آخری سانس تک وہ قدم قدم پر ماں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک صرف انہی لوگوں کو ہے جو ماں ایسی ٹھنڈک سے محروم ہیں!

ملکہ نے ننھی فاخرہ کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ ایک دادی کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ فاخرہ کے لیے عابدہ کے وجود کو غیر ضروری سمجھتی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وزیر علی سمجھ گیا کہ میں نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ بھی جلدی سے میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ایک منٹ جناب.....!''

میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو مشتاق کی کمپنی کا پتا اور فون نمبر چاہیے تھا نا..... آپ ایک منٹ رکیں، میں اس کے خط لے کر آتا ہوں.....''

میں رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر علی اپنے بیٹے کے خطوط کا پلندا اٹھا لایا۔ میں نے مشتاق کی کنٹینکل فرم کا پتا اور فون نمبر وغیرہ اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ ان کے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے ننھی فاخرہ کو پیار کیا اور بھاری دل کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔

وزیر علی میرے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''عابدہ کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟''

''میرا خیال ہے، کل شام میں یا پھر پرسوں دن میں کسی وقت۔'' میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ویسے تم اپنے ذہن میں پرسوں کا دن ہی رکھو۔''

''اور آپ مشتاق کو کب فون کریں گے؟''

''یہ کام تو میں آج ہی کر دوں گا۔''

''اچھا ہے، مشتاق پرسوں تک یہاں پہنچ جائے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تاکہ اس کی موجودگی میں لاش کے کفن دفن کا بندوبست کیا جا سکے۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا.....'' میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وزیر علی نے بڑے بھرپور انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور میں وہاں سے رخصت ہو ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی سکندر علی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

☆☆☆

مقتولہ کے بھائی راشد کا گھر قصبہ رائے پور کے سامنے والے حصے میں واقع تھا۔ یہ جگہ میرے تھانے سے بہت قریب تھی۔ راشد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے اے ایس آئی سے استفسار کیا۔

''سکندر علی! تمہارے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟''

''حکیم جی نے نمونیا بتایا ہے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''حکیم نے علاج شروع کیا یا نہیں؟''

''علاج پچھلے دو دن سے جاری ہے ملک صاحب!'' سکندر علی نے بتایا۔ ''کوئی واضح فرق تو محسوس نہیں ہوتا لیکن حکیم جی بہت پُرامید ہیں۔ انہوں نے کہا ہے، آنے والے ایک دو دن میں بچہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن مکمل صحت یابی میں آٹھ دس دن مزید لگیں گے۔''

''اللہ تمہارے بیٹے کو جلد از جلد صحت یاب کرے!'' میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

''آمین.....!'' اس نے صدق دل سے کہا۔

سکندر علی اسی قصبے کا رہائشی تھا لہٰذا میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتا تھا۔ عابدہ کے قتل کے معمے کو حل کرنے کے لیے سکندر علی میری بھرپور مدد کر سکتا تھا۔ صبح وہ تھانے میں موجود نہیں تھا ورنہ میں تو اسے ہی جائے وقوعہ پر اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے ہمراہ، راشد کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''سکندر علی! تمہیں پتا تو چل چکا ہوگا، اس علاقے میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔ وزیر علی کریانہ فروش کی بہو کو کسی نے گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ادھر بیری والے کھوہ کے پاس مقتولہ کی لاش پڑی ملی ہے؟''

''ملک صاحب! یہ سارے حالات میرے علم میں آ چکے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ نے مقتولہ عابدہ کی لاش کو حوالدار کے ہاتھ پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا ہے۔ میں صرف جائے وقوعہ پر نہیں گیا، باقی ہر بات میرے علم میں ہے جناب۔''

''جائے وقوعہ کے گرد رسی کا حصار کھینچ کر میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے محفوظ بنا دیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تک میں نے اس کیس کے سلسلے میں جو پیچھ پرتیت کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی سیدھی سادی قتل کی واردات نہیں بلکہ اس خونیں واقعے کے پیچھے کوئی نہایت ہی اہم راز چھپا ہوا ہے اور یہ راز.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔

''یہ راز.....صرف تمہاری مدد ہی سے حل کیا جاسکتا ہے!''

''میں ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں ملک صاحب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں کہ کرنا کیا ہے؟''

''ہم اس موضوع پر تفصیلی بات شام میں کریں گے۔'' میں نے کہا۔

وہ الجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور تب تک ملک صاحب؟''

''تب تک ہم چند بنیادی کام نمٹائیں گے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں مقتولہ کے بھائی راشد کی طرف جارہا ہوں۔ اس سے مختصر ملاقات کرکے میں تھانے جاؤں گا اور پھر مجھے ایس پی صاحب کے آفس جانا ہے۔ چند محکمہ جاتی کاموں کے علاوہ مجھے وہاں سے عراق ایک فون بھی کرنا ہے تاکہ مقتولہ کے شوہر مشتاق کو اس..... سانحے کی اطلاع دی جاسکے۔ میری واپسی شام تک ہی ہو سکے گی اور اس دوران میں تم.....'' میں نے تھوڑا توقف کرکے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تب تک تم بھی دو چار ضروری کام کرڈالو جن میں سے ایک کام تو دو بندوں کا تفصیلی انٹرویو کرنا ہے۔ مرتضیٰ اور مجید کھار.....'' پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اے ایس آئی کو ان دونوں اطلاع کنندگان کے بارے میں بتا دیا۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں ان دونوں بندوں کو اچھی طرح کریدلوں گا۔'' وہ پراعتماد لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ''مجھے اور کیا کرنا ہے؟''

''بابا جلال دین کو ڈھونڈ کر فوراً کام پر لگا دو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے جائے وقوعہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس طرح جلال دین کا کام آسان ہو جائے گا۔ اس سے کہہ دینا کہ وزیر علی کے گھر سے لے کر بیری والے کھوہ تک کے راستے کو اچھی طرح کھنگالنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی غیر موجودگی میں، میں صورت حال کو اچھی طرح ہینڈل کرلوں گا اور جب آپ واپس آئیں گے تو میں آپ کو انشاء اللہ! نتائج دوں گا۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی سکندر علی!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگیا۔

جلال دین عرف بابا جلالا ایک عمر رسیدہ کھوجی تھا۔ دراز قامت، سانولی رنگت، ہاتھ پاؤں اور کاٹھی کا مضبوط، وہ بڑی مزے دار باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنے کام کا ایسا ماہر کہ کوئی دوسرا دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اپنی سرخ آنکھوں سے اس طرح مٹی کو گھورتا تھا جیسے وہ زمین نہ ہو بلکہ کوئی دقیق اور خستہ حال وکہنہ سال کتاب ہو جس میں مجرم کا نام بھول بھلیوں کے سے انداز میں درج ہو اور وہ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہو..... میں نے اے ایس آئی سکندر علی سے، اسی بابے جلالے کی خدمات حاصل کرنے کو کہا تھا!

راشد بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا جیسے ہی میں اس کے گھر پہنچا اس نے مجھے ایک الگ کمرے میں بٹھایا اور گہری سنجیدگی سے موجودہ صورت حال پر گفتگو کرنے لگا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کر دیا۔

''ملک صاحب! کچھ پتا چلا، میری بہن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور اس کا قاتل کون ہے؟''

''ابھی تک قاتل کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وزیر علی اور اس کی بیوی ملکہ سے جو باتیں ہوئی ہیں ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ وہ اس واقعے اور عابدہ کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں نے کھوجی کو کھرے کے کام پر لگا دیا ہے۔ انشاء اللہ! شام تک کوئی نتیجہ سامنے آجائے گا۔''

''کھوجی تو اپنی جگہ کام کرتا ہی رہے گا ملک صاحب!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن آپ وزیر علی پر توجہ دیں۔ یہ اتنا سیدھا نہیں جتنا اوپر سے نظر آتا ہے!''

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جائے وقوعہ پر بھی میں نے راشد کے تیوروں کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ وزیر علی سے خاصا نالاں اور خفا نظر آتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ ضرور کوئی ایسا پیچ موجود تھا جس کو کھولنا ضروری تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''راشد! تم کہنا کیا چاہتے ہو.....؟''

راشد کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ غلہ منڈی میں ایک آڑھتی حاجی مراد کا منشی تھا لیکن اس واقعے کی وجہ سے وہ آج دکان پر نہیں گیا تھا۔ راشد کے باپ ارشد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ساٹھ سالہ بوڑھی والدہ اللہ رکھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ راشد کی بیوی کا نام بلقیس تھا۔ ان کی اولادوں میں دو بیٹے حفیظ اور عارف اور ایک بیٹی آمنہ تھی۔ آمنہ کی عمر آٹھ سال رہی ہوگی۔ دونوں بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ حفیظ سات اور عارف پانچ سال کا تھا۔ راشد اور بلقیس کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے۔

میرے سوال کے جواب میں راشد نے بتایا۔ ''جناب! اگر میرا بس چلے تو اس شخص کو میں اتنے جوتے ماروں کہ اس کے سر پر ایک بال نہ رہے۔ بے غیرتی اور کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مگر اس نے تو تمام حدیں ہی توڑ ڈالی ہیں.....''

میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ راشد محض وزیر علی کو ناپسند کرتا ہے لیکن راشد کے حالیہ غصیلے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔ یہ اس کیس کا ایک نیا، انوکھا اور سنسنی خیز زاویہ تھا۔ مجھے امید ہو چلی کہ اگر میں نے راشد کو اچھی طرح ہینڈل کر لیا تو کوئی نہ کوئی ایسا سرا ضرور میرے ہاتھ آ جائے گا جسے تھام کر میں قاتل تک پہنچ سکوں گا۔ میں نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''راشد! تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وزیر علی سے تمہیں کیا شکایات ہیں؟''

''شکایات.....!'' وہ اس اکلوتے لفظ کو چباتے ہوئے بولا۔ ''جناب! بات شکوے اور شکایت کی نہیں ہے۔ انسان میں انسانیت ہونا چاہیے۔ اس بندے کا میری بہن کے ساتھ جو سلوک ہے وہ بہت ہی غیر انسانی اور غیر اخلاقی ہے۔ میں.....میں.....''

غصے کی شدت میں وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا، وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھول بند کر رہا تھا۔ میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔

''راشد! میں جاننا چاہتا ہوں کہ وزیر علی میں کون کون سی غیر اخلاقی اور غیر انسانی عادت ہے، خاص طور پر تم اپنی بہن عابدہ کے حوالے سے بتاؤ؟''

''وہ کمینہ..... میری بہن کے کردار پر شک کرتا تھا.....!'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

''کردار پر شک.....!'' میں نے سوالیہ نظروں سے راشد کو دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا.....وہ عورت جو اس کی بہو تھی اور اسی کے گھر میں رہتی تھی وہ اسی کی ذات کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن.....وہ ایسا لگتا تو نہیں!''

''تھانیدار صاحب! میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ بظاہر جتنا سیدھا اور شریف نظر آتا ہے، ایسا ہے نہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اور اس مردود کی یہ خبیث خصلت بھی عابدہ کی شادی کے بعد ہی سامنے آئی تھی۔ ہم نے تو مشتاق کو دیکھ کر اس رشتے کے لیے ہامی بھر دی تھی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے، اس کا پیٹھ پیچھا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ مشتاق ہیرا آدمی ہے۔ وہ جب تک یہاں رہا، میری بہن کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی لیکن اس کے عراق جاتے ہی ایک سے بڑھ کر ایک مسئلہ کھڑا ہونے لگا۔ میں نے تو سوچ لیا تھا جناب کہ اگر بات زیادہ بڑھی تو میں عابدہ کو اپنے گھر واپس لے آؤں گا۔ دو ماں بیٹی مجھ پر بوجھ نہیں بن سکتیں۔ جب مشتاق عراق سے واپس آتا تو میں اسے اپنے پاس بٹھا کر بات کرتا۔ پھر جو بھی فیصلہ ہوتا مگر..... میں سوچتا ہی رہا اور میری بہن جان سے چلی گئی۔''

''عابدہ کی المناک موت ایک افسوس ناک واقعہ ہے جس کا جتنا بھی سوگ منایا جائے، کم ہے۔'' میں نے راشد کے زخموں پر الفاظ کا مرہم رکھتے ہوئے کہا۔ ''میری یہ کوشش ہے کہ میں جلد از جلد تمہاری بہن کے قاتل تک پہنچ جاؤں۔ اس سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے راشد۔ تمہاری مدد کے بغیر میں ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

صورت حال نے جیسی نازک اور حساس پٹڑی پکڑ لی تھی اس کا تقاضا تھا کہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ راشد کے دل اور دماغ کو ٹٹولوں تا کہ یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ میری بات کے جواب میں اس نے کہا۔

''جی حکم کریں، آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟''

میں نے اپنے لہجے کو پراسرار بناتے ہوئے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''راشد! اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری آواز کمرے کے باہر سنی نہیں جا سکتی لہٰذا تم بے فکری سے اپنے دل کی بات کہہ دو..... کیا تم وزیر علی کو عابدہ کا قاتل سمجھتے ہو؟''

اس نے بڑی سرعت سے پلکیں جھپکائیں اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میرا یہ مطلب تو نہیں تھا جناب!''

''گویا.....!'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وزیر علی، عابدہ کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قاتل نہیں؟''

''جناب..... !'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''دراصل میں..... وزیر علی کے قاتل ہونے یا نہ ہونے کی بات نہیں..... کر رہا تھا..... میں تو اس کی کم ظرفی اور گھٹیا پن کے بارے میں آپ کو بتا رہا تھا۔''

''اچھا..... تو تم صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ وزیر علی کو تمہاری بہن کے کردار پر شک تھا؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں..... مجھے اس پر اسی بات کا غصہ ہے۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''کیا اس حوالے سے اس نے کسی شخص کا نام بھی لیا تھا۔'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، مقتولہ کے کردار کے حوالے سے؟''

''جی نہیں، ایسا کوئی نام سامنے نہیں آیا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ اس مردود نے اس سلسلے میں مجھ سے بات نہیں کی بلکہ ایک غیر کے سامنے بکواس کی اور اڑتی اڑتی یہ خبر میرے کانوں تک پہنچ گئی.....''

اب اس قتل کیس کہانی میں اہم موڑ آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اہم سرا میرے ہاتھ لگنے ہی والا ہے جس کی تلاش میں، میں پچھلے کئی گھنٹے سے سر کھپا رہا تھا..... اور جس کے سہارے میں اپنے ہاتھوں کو قاتل کی گردن تک پہنچا سکتا تھا۔ میں نے راشد کو گھسنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس غیر شخص کا نام کیا ہے جس سے وزیر علی نے اپنی بہو یعنی تمہاری بہن کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کی تھیں؟''

راشد نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ''اس بندے کا نام اکرام اللہ ہے۔ اکرام اللہ تمباکو کا کاروبار کرتا ہے اور اس کی دکان وزیر علی کی دکان سے جڑی ہوئی ہے اور اتفاق دیکھیں کہ.....'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا، ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''اسی اکرام اللہ کا گھر میرے گھر کے برابر میں واقع ہے۔ وہ دکان داری میں وزیر علی کا پڑوسی ہے اور رہائش گاہ ہی میں میرا پڑوسی۔ بات جب مردوں کی زبان سے نکل کر عورتوں تک پہنچتی ہے تو اس کو سنبھال کر رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس معاملے میں بھی ہوا۔ اکرام اللہ نے اپنی بیوی سائرہ سے ذکر کیا پھر یہ معاملہ میری بیوی تک پہنچا اور مجھے بھی خبر ہو گئی۔ یہ ہے ساری کہانی جناب!''

''کہانی خاصی خطرناک اور الجھی ہوئی ہے راشد۔'' میں نے مدبرانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''جب یہ قصہ تمہارے علم میں آیا تو تم نے وزیر علی سے پوچھ تاچھ نہیں کی۔ کم از کم تمہیں اس معاملے کی تصدیق تو کرنا چاہیے تھی۔''

''جناب! میں پچھلے تین سالوں میں وزیر علی کے مزاج اور فطرت کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتا تھا، اگر میں نے اس سلسلے میں اس سے باز پرس کی تو وہ ایک طوفان کھڑا کر دے گا لہٰذا میں نے اس کے منہ لگنے کی کوشش نہیں کی ویسے بھی.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے بلقیس سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ ہم مشتاق کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ وہ ایک سمجھدار اور معقول انسان ہے، ہماری بات کو سمجھ جائے گا۔ اس کا وزیر علی پر بھی زور چلتا ہے۔ وہ اس معاملے کو اچھی طرح سنبھال سکتا تھا۔ وزیر علی سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا.....''

''ہوں.....!'' میں نے پرسوچ انداز میں ہنکاری بھری اور پوچھا۔ ''کیا ان معاملات کا تمہاری والدہ اللہ رکھی کو بھی علم ہے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اماں کی عمر اور صحت اس قابل نہیں کہ میں اس معاملے میں اسے پریشان کرتا۔ ویسے بھی وہ بہت اونچا سنتی ہے۔ اسے اس سلسلے میں کچھ پتا نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے راشد! تم نے تو وزیر علی کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا لیکن میں اس معاملے میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اگر عابدہ کے کردار کے حوالے سے اس کے ذہن میں کچھ خدشات تھے تو اس کا ذکر مجھ سے کرنا چاہیے تھا۔ وزیر علی کے علاوہ میں اکرام اللہ سے بھی ایک بھرپور ملاقات کروں گا تاکہ پتا چلے کہ وزیر علی نے اس سے ایسی کوئی بات کی بھی تھی یا نہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''جناب! میں پولیس کے کام میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ جو مناسب سمجھتے ہیں وہ ضرور کریں۔ میں تو چاہتا ہوں، آپ میرے تین کام کر دیں۔''

''کون سے تین کام؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نمبر ایک، میں چاہتا ہوں کہ میری بہن کے قاتل کو ایسی سزا ملے جو دیکھنے اور سننے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والوں کے لیے عبرت ناک ہو۔ نمبر دو، میری خواہش ہے کہ اسپتال سے عابدہ کی لاش سیدھی میرے گھر پہنچے اور میں اپنی مرضی سے اس کے کفن دفن کا بندوبست کروں۔ نمبر تین، میں چاہوں گا کہ عابدہ کی موت کے بعد فاخرہ میرے پاس رہے میں اس ننھی سی بچی کو وزیر علی کے گھر میں چھوڑنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں.....!''

میں نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے ایک دیومالائی کہانی سن رکھی تھی جس میں تین خواہشات کا ذکر ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی کہانیاں آپ نے بھی سن رکھی ہوں گی۔ کہانی کسی بھی نوعیت کی ہو، اس کا انجام ایک ہی جیسا ہوا کرتا تھا یعنی تین خواہشیں بھی پوری ہو جاتیں اور کچھ حاصل بھی نہ ہوتا۔ خواہش مند شخص مزید سے مزید الجھتا چلا جاتا۔ شاید ایسی ہی صورت حال کے لیے شاعر نے کہا تھا..... ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے.....!''

جب راشد نے اپنی تین خواہشات کا ذکر کیا تو میرا ذہن لامحالہ اس طلسماتی کہانی کی طرف چلا گیا تھا لیکن یہاں صورت حال نسبتاً مختلف تھی لہٰذا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

''راشد! میری بات دھیان سے سنو۔ تمہاری پہلی خواہش تو میں ہر قیمت پر پوری کروں گا۔ عابدہ کا قاتل نہ صرف یہ کہ بہت جلد گرفتار ہوگا بلکہ وہ عبرتناک سزا پا کر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی چلا جائے گا لیکن جہاں تک باقی دو خواہشوں کا تعلق ہے تو.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ فی الحال میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ انہیں پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔''

''کیوں..... کیوں جناب؟'' وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''راشد! تمہاری خواہش نمبر دو اس لیے پوری نہیں ہو سکتی کہ عابدہ اپنی سسرال میں رہ رہی تھی جب اس کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ وہ اس کا، اس کے شوہر کا گھر ہے لہٰذا اسپتال سے اس کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش پہلے تھانے میں اور پھر تھانے سے وزیر علی کے گھر پہنچے گی اور جہاں تک تمہاری خواہش نمبر تین کا تعلق ہے تو وہ مشتاق کی مرضی اور اجازت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، مشتاق فاخرہ کا باپ ہے۔ اپنی اولاد کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے۔ میرا خیال ہے، تم میری بات سمجھ گئے ہو گے؟''

''لل..... لیکن مشتاق تو عراق میں ہے.....'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

''عراق میں ہے تو کیا ہوا۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''وہ ہمیشہ وہاں تو نہیں رہے گا۔ میں اسے آج فون کر کے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ دو تین دن بعد وہ تمہیں یہیں قصبہ رائے پور میں نظر آئے گا۔''

میری اس مدلل وضاحت کے بعد اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بے بسی سے خلا میں گھورنے لگا۔ میں اس کے گھر سے نکل آیا۔

راشد سے ملاقات کے بعد ایک نیا قابل تفتیش کردار سامنے آیا تھا۔ اکرام اللہ نامی اس تمباکو فروش سے کڑی پوچھ گچھ کی جاتی تو سنسنی خیز انکشافات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں ذہن میں اس کیس کے تانے بانے بنتے ہوئے تھانے پہنچا اور پھر ایس پی آفس چلا گیا۔ چند روز قبل ایس پی صاحب نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا لہٰذا وہاں جانا ضروری تھا۔ اس بہانے میں مشتاق کو فون کر کے تازہ ترین حالات سے آگاہ بھی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

واپسی میں مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ جب میں تھانے پہنچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اے ایس آئی سکندر علی بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں بتایا پھر اس سے پوچھا۔

''سکندر علی! تمہارے کام کا کیا رہا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ملک صاحب! میں نے آپ کے حکم کے مطابق، مرتضیٰ اور مجید کمہار کو تھانے بلا کر ان سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن وہ دونوں کسی ایسی بات سے واقف نہیں ہیں جو اس قتل کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔'' وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجید کمہار کی تو صرف اتنی کہانی ہے کہ وہ حسب معمول چھپڑ سے مٹی نکالنے کے لیے اس طرف گیا اور اس نے بیری والے کھوہ کے پاس عابدہ کی لاش پڑی دیکھی۔ وہ سیدھا وزیر علی کے گھر پہنچا اور اسے اس واقعے کی اطلاع دی۔ مرتضیٰ تھانے میں اطلاع دینے کے بعد اس لیے جلدی گھر چلا گیا تھا کہ اس کے سسرالی رشتے داروں نے کوئی تنازع ڈالا ہوا تھا۔ وہ بیوی کے معاملات نمٹانے میں پھنسا ہوا تھا اس لیے زیادہ دیر تھانے میں رک کر آپ کی آمد کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''کھوجی جلال دین نے کیا رپورٹ دی ہے؟''

''جلال دین، اندھیرا پھیلنے سے پہلے تک کام کرتا رہا ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے رپورٹ دے کر گیا ہے۔'' سکندر علی نے بتایا۔ ''باقی کا کام وہ صبح کرے گا۔ ویسے اس نے جو کام کیا ہے وہ خاصا تسلی بخش اور نتیجہ خیز ہے۔''

''ہاں بتاؤ..... اب تک کی کوشش میں بابے جلالے نے کیا تیر مارا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''وزیر علی کے گھر سے بیری والے کھوہ تک مقتولہ عابدہ کا کھرا صاف مل گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی اور اس کے ساتھ کسی اور شخص کا کھرا دستیاب نہیں ہو سکا یعنی کسی ایسے شخص کا کھرا جو اس کی ہمراہی میں بیری والے کھوہ تک پہنچا ہو۔ اس کا مطلب ہے، گزشتہ رات وہ گھر سے نکلی اور اکیلی ہی بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی.....''

''اس بات کا اندازہ تو میں کھرا اٹھوانے سے پہلے ہی لگا چکا تھا۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ ''اگر سچی بات کہوں تو مجھے یقین ہو چلا ہے، وہ کسی مرد سے ملنے بیری والے کھوہ تک گئی تھی۔ کس سے ملنے؟ کیوں ملنے؟ اور اسے قتل کیوں کیا گیا؟ اسے کس نے قتل کیا؟..... ان سوالات کے جوابات چاہئیں مجھے.....!'' میں نے لمحاتی توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جلال دین جائے وقوعہ کے بارے میں کیا رپورٹ دیتا ہے؟''

''جائے وقوعہ پر چار پانچ افراد کے فٹ پرنٹس ملے ہیں جن میں صرف ایک مرد اور باقی سب عورتوں بہ شمول عابدہ..... کے قدموں کے نشانات ہیں۔ کھوہ پر عموماً عورتیں ہی پانی بھرنے جاتی ہیں لہٰذا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن جلال دین نے الجھن زدہ انداز میں کہا تھا کہ ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی لہٰذا پوری طرح تصدیق کرنے کے بعد وہ اس کے بارے میں بتائے گا۔''

''وہ بات یقیناً اس مرد کے حوالے سے ہوگی جس کے قدموں کے نشانات بیری والے کھوہ پر پائے گئے ہیں۔'' میں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ انہی نشانات کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے!''

''ایسی بات نہیں ہے جناب۔'' اے ایس آئی سنجیدگی سے بولا۔ ''اس مرد کے قدموں کے نشانات کو تو جلال دین نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔ اسے یقین ہے، وہ کھرا تین چار روز پرانا ہے لہٰذا گزشتہ رات والی وارداتِ سے اس مرد کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔''

''اوہ.....!'' میں نے متاسفانہ انداز میں سر کو مخصوص جنبش دی اور کہا۔ ''تو کیا جلال دین کا یہ خیال ہے کہ پچھلی رات وہاں کوئی مرد گیا ہی نہیں..... کیا عابدہ کو کسی عورت نے قتل کیا ہے؟''

''میں نے عرض کیا ہے ناجناب.....'' سکندر علی نے آہستگی سے کہا۔ ''جلال دین نے کوئی واضح بات نہیں کی۔ جو سوالات آپ کے ذہن میں ابھر رہے ہیں، یہ میں نے بھی اس سے پوچھے تھے لیکن اس نے یہی کہا ہے کہ وہ صبح ایک مرتبہ پھر جائے وقوعہ کا جائزہ لے گا، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کن بات کرے گا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ کسی نکتے پر بری طرح الجھا ہوا تھا۔''

''ٹھیک ہے سکندر علی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں صبح تک انتظار کرلوں گا۔ دیکھتے ہیں، جلال دین کون سا سنسنی خیز انکشاف کرتا ہے بلکہ..... میں کل اس کے ساتھ رہوں گا پھر ساری صورتِ حال مجھ پر واضح ہو جائے گی۔''

''ہاں سر، یہ زیادہ مناسب ہوگا۔'' سکندر علی نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنے والے تھے بلکہ مجھے کوئی اہم ذمے داری سونپنے والے تھے؟''

''ہاں سکندر علی! میں نے راشد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے تم سے ایسا کہا تھا کہ شام میں ہم کسی اہم معاملے پر ڈسکس کریں گے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت میرے ذہن میں صرف اتنا تھا کہ مقتولہ کا کسی مرد سے کوئی چکر ہو سکتا ہے۔ وہ اسی شخص سے ملنے بیری والے کھوہ پر گئی، پھر ان کے درمیان کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس شخص نے گردن دبا کر عابدہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم چونکہ اسی قصبے کے رہنے والے ہو لہٰذا میرا خیال تھا، تم ایسے مرد کا سراغ لگانے کے لیے میری بھرپور مدد کر سکو گے لیکن.....''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو سکندر علی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''لیکن کیا ملک صاحب؟''

''لیکن یہ کہ.....'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب صورتِ حال خاصی تبدیل ہو چکی ہے بلکہ..... خاصی آسان ہو چکی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب۔'' وہ الجھن زدہ نظروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''سکندر علی! مجھے پہلے صرف شک تھا، میرا اندازہ تھا کہ مقتولہ کسی مرد سے ملاقات کرنے بیری والے کھوہ پر پہنچی تھی لیکن راشد سے ملاقات کے بعد میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی ہے۔ افسوس کہ وزیر علی نے مجھ سے ایک اہم بات چھپائی ہے۔ میں کل اچھی طرح اس کی خبر لوں گا۔''

''راشد نے ایسا کون سا انکشاف کیا ہے ملک صاحب؟'' وہ متجسس نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں سکندر علی کو اس معاملے سے آگاہ کیا جس کے ڈانڈے وزیر علی، اکرام اللہ، سائرہ، بلقیس اور راشد تک پھیلے ہوئے تھے۔ وزیر علی کو اپنی بہو کے کردار کے حوالے سے جو خدشات تھے وہ اس نے اکرام اللہ کے گوش گزار کیے تھے۔ بات اکرام اللہ سے اس کی بیوی سائرہ تک پہنچی، سائرہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بلقیس کی سماعت کو سیراب کیا اور عابدہ کا متنازعہ کردار راشد تک پہنچ گیا جبھی وہ وزیر علی سے شدید نفرت کرتا تھا اور اس دن کا منتظر تھا جب مشتاق، عراق سے واپس آئے تاکہ وہ اس سے فیصلہ کن بات کر سکے۔

''لیکن ملک صاحب.....!'' سکندر علی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو اچھا ہوا کہ ایک ایسا پہلو سامنے آگیا جو اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوگا مگر وہ شخص ہے کون جس کے حوالے سے وزیر علی کو اپنی بہو کا کردار میلا نظر آتا تھا۔ جب تک اس بندے کا پتا نہ چلے، تفتیش کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں سکندر علی۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس شخص کی نشاندہی بہت ضروری ہے جس سے ملاقات کرنے، رات کی تاریکی میں عابدہ بیری والے کھوہ پر گئی تھی۔ اس کے وہاں پہنچنے کا مقصد اتنا اہم تھا کہ وہ اپنی چار سالہ معصوم بچی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گئی تھی.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جہاں تک مذکورہ، مطلوبہ آدمی تک رسائی کا تعلق ہے تو یہ کام ہم دونوں مل کر کریں گے سکندر علی۔ میں کل پہلی فرصت میں اکرام اللہ کی دکان پر جا کر اسے ٹٹولتا ہوں۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجائے گا۔ یہ پتا چل جائے گا کہ راشد کے بیان کے مطابق، وزیر علی نے اپنی بہو کے کردار سے متعلق اکرام اللہ سے کوئی الٹی سیدھی باتیں کی تھیں یا نہیں۔ اگر کی تھیں تو وہ باتیں کیا تھیں۔ اس کہانی میں مرد کا کردار کس شخص نے کیا تھا اور اگر..... اکرام اللہ اس حوالے سے تردید کردیتا ہے تو پھر وزیر علی کی ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس صورت میں، راشد کی گوشمالی ضروری ہوجاتی ہے اور تم.....'' میں نے ایک مرتبہ پھر توقف کر کے سانس کو ہموار کیا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اور تم اپنی بیوی کو سائرہ کے پیچھے لگا دو۔ تم اسی علاقے میں رہتے ہو۔ تمہاری بیوی سائرہ کو اچھی طرح جانتی ہوگی۔ وہ اسے ٹٹول کر یہ معلوم کرسکتی ہے کہ کیا اس کے شوہر نے مقتولہ کے کردار کے حوالے سے اسے کوئی قصہ سنایا تھا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا سکندر علی؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں عالیہ کو صبح ہی اس مہم پر لگا دیتا ہوں جناب۔ میری بیوی ٹوہ اور کھوج کے معاملات میں مجھ سے بھی زیادہ پولیس والی ہے۔ مجھے امید ہے، وہ بڑی آسانی سے یہ کام کرلے گی۔ میں کل شام تک آپ کو کوئی بڑی خوش خبری سناؤں گا۔''

''بہت خوب!'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''عابدہ کی موت کے بعد یہ تحقیق زیادہ سہل ثابت ہوگی۔ اس کی ذات کے حوالے سے اکرام اللہ زبان کھولنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرے گا اور نہ ہی سائرہ کسی مصلحت سے کام لے گی۔ سب کی یہی خواہش ہوگی کہ عابدہ کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو کر اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہم عابدہ کے قاتل سے زیادہ فاصلے پر نہیں کھڑے!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' سکندر علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر مقتولہ سے منسوب شخص کا سراغ مل جائے تو قاتل تک رسائی کا مرحلہ آسان ہوجائے گا۔ مجھے تو ننانوے فیصد یہی امید ہے کہ وہی شخص عابدہ کا قاتل ہے۔''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا!'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''بہرحال، دیکھتے ہیں، کل سورج ہمیں کیا دکھاتا ہے۔''

''بہ شرطیکہ سورج ہمیں نظر آجائے.....!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

سکندر علی کا اشارہ موسم کی ستم ظریفی کی جانب تھا۔ ان دنوں اس کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی کہ بعض اوقات گیارہ بجے تک سورج کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی تھی۔ دھند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی دبیز چادر پوری فضا کو اپنی بکل میں چھپائے بیٹھی نظر آتی تھی لیکن یہاں سورج سے میری مراد کل دن کا آغاز تھا نہ کہ سورج چمکتا ہوا دکھائی دینا۔

سکندر علی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! کل کے دن کے لیے آپ کو مجھے ایک الاؤنس دینا ہوگا!''

''کیسا الاؤنس سکندر علی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔ ''میں کل ڈیوٹی پر نہیں آؤں گا۔ آپ مجھے ایک دن کی چھٹی دیں گے۔''

''چھٹی کس لیے سکندر علی!'' میری حیرت میں اضافہ ہوگیا۔ ''تم چھٹی لے کر کل کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''جناب! یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ میرا بیٹا ساجد بیمار ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''کل سائرہ کو ''رام'' کرنے کے لیے عالیہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارے گی لہٰذا ساجد کے پاس مجھے رکنا پڑے گا۔ ہمارے گھر میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔''

''ٹھیک ہے، کل تمہاری چھٹی پکی!'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اور یہ چھٹی غیر حاضری کے کھاتے میں نہیں جائے گی کیونکہ تمہاری جگہ کل عالیہ ڈیوٹی کرے گی..... یعنی وہ کارِ سرکار کے سلسلے میں اکرام اللہ کی بیوی پر کچھ ''کام'' کرے گی!''

''تھینک یو ملک صاحب!'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولا۔

میں زیرِلب مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

میں اگلی صبح کی مصروفیات کے بارے میں سوچتے ہوئے سویا تھا لیکن خلافِ معمول آدھی رات کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ وہ جنوری کے ابتدائی ایام تھے یعنی لمبی راتوں کا موسم۔ چھ بجے تک چہار سو گھپ اندھیرا پھیل جاتا تھا اور آئندہ صبح دور دور تک روشنی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ آدھی رات کے بعد آنکھ کھلنے کا مطلب یہ تھا کہ میں لگ بھگ ایک نیند لے چکا تھا اور آنکھ کا یوں کھل جانا خلافِ معمول تھا۔

میں رات کو سونے سے پہلے اپنے دماغ کو کچھ اس قسم کی ہدایات دیا کرتا تھا..... میں نہایت ہی پرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا..... اور اذانِ فجر کے وقت میری آنکھ خود بہ خود ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن اگر میری نیند کے دوران میں میرے ماحول کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا یا پیش آنے کے آثار پیدا ہوئے تو میں وقتِ مقررہ سے پہلے ہی بیدار ہو جاؤں گا..... تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماحول میں کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی!

اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی تمام تر توجہ ماحول پر مرکوز کر دی۔ اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ باہر ایک مخصوص آواز ابھر رہی تھی اور یہ آواز بارش کی تھی!

میں نے بستر چھوڑ دیا اور تصدیق کی خاطر کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا پھر اگلے ہی لمحے مجھے پتا چل گیا کہ میری آنکھ بے سبب نہیں کھلی تھی۔ بارش واقعی ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس کا زور زیادہ نہیں تھا مگر جلال بابا کی محنت پر کائل ''پانی پھرنے'' کے لیے یہ بھی بہت کافی تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہ چمکا کہ کھوج اور کھرے کا تو اب اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ بارش کچے پکے تمام راستوں سے لوگوں کے قدموں کے نشانات کو صاف کر دیتی اور صبح جلال دین کو اپنا ہنر دکھانے کا موقع نہ ملتا۔

جلال دین کے تصور کے ساتھ ہی اے ایس آئی کی کہی ہوئی باتیں بھی ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ اس نے جلال دین کی الجھن کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کل صبح کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے والا تھا۔ میرے دل میں اس وقت شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کاش! بابا جلال دین میرے سامنے موجود ہو اور میں اس سے پوچھوں، اس کے ذہن میں کھرے کے حوالے سے کیا الجھن ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ کسی ایسے نتیجے پر پہنچ چکا تھا جو معمول کے کھرے سے بہت ہٹ کر، بہت مختلف اور جدا تھا۔

بابے جلالے سے کل ہی ملاقات ہو سکتی تھی لہٰذا میں دوبارہ جا کر بستر پر لیٹ گیا اور عابدہ کے قتل اور قاتل کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ کیس جتنے الجھے ہوئے اور پیچیدہ انداز میں شروع ہوا تھا اتنی ہی جلدی حل ہوتا نظر آرہا تھا۔ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وزیر علی نے واقعی عابدہ کے کردار کے حوالے سے اکرام اللہ سے کوئی نازیبا باتیں کی ہیں تو پھر منسوب شخص کا نام سامنے آنا لازم تھا اور یہ نام منظرِ عام پر آتے ہی قاتل تک رسائی آسان ہو جاتی۔ یہ بات طے تھی کہ عابدہ، فاخرہ کو سوتے چھوڑ کر اگر آدھی رات کو سخت ترین سردی میں بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی تو اس میں اس کی کوئی بہت بڑی مجبوری رہی ہوگی، چاہے وہ مجبوری کسی بیرونی دباؤ کا نتیجہ ہو یا وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو!

خلافِ معمول اگر رات کے کسی پہر آنکھ کھل جائے تو دوبارہ نیند کی وادی میں اترنا آسان ثابت نہیں ہوتا اور میرے ذہن میں تو ایک سنسنی خیز قتل کا قصہ بھی چل رہا تھا لہٰذا دوبارہ آنکھ لگنے میں کافی وقت صرف ہوگیا۔ اسی سبب صبح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیداری میں بھی تھوڑی تاخیر ہوگئی۔ میں حسبِ معمول روزمرہ کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد تیار ہوا اور ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا۔ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے ہوئے مجھے عموماً ایک سہولت یہ میسر رہی ہے کہ میری رہائش تھانے ہی کے احاطے میں بنے ہوئے سرکاری کوارٹر میں رہی جو کہ تھانے کی اصل عمارت کے عقب میں بنا ہوتا ہے۔ اس رہائشی سہولت سے یہ آسانی رہی کہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے میں مجھے کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

بارش رات کے آخری پہر کسی وقت رک گئی تھی۔ یہ موسم سرما کی ابتدائی بارش تھی۔ اگرچہ اس کا زور اور دورانیہ نہایت ہی مختصر رہا تھا مگر تھوڑی سی دیر ہی میں اس نے ٹھنڈک کی شدت میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھوج کھرے کے شعبے کو بھی بری طرح معطل کرکے رکھ دیا تھا البتہ، اس کا ایک فائدہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ دھند میں نمایاں کمی واقع ہوگئی تھی جس کے سبب کئی دن کے بعد سورج کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔

اس روز اے ایس آئی سکندر علی چھٹی پر تھا۔ میں جلال دین کے انتظار میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا حوالدار نبی جان کو اپنے پاس بلا کر ضروری ہدایات دیں۔

''نبی جان!'' میں نے اس کی آمد پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں یا کچھ دیر کے بعد کھوجی جلال دین یہاں آئے گا۔ تم نے اسے کہیں جانے نہیں دینا۔ جب تک میں واپس نہ آجاؤں، اسے تھانے ہی میں بٹھائے رکھنا۔ مجھے اس سے کوئی ضروری کام ہے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' اس نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلادی اور پوچھا۔ ''کیا آپ تھانے سے باہر کہیں جارہے ہیں؟''

''ہاں، میں ذرا قصبے کے مین بازار کی طرف جارہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہاں کچھ کام ہے، جلدی واپس آجاؤں گا۔''

''کیا آپ اکیلے ہی جائیں گے یا میں بھی ساتھ چلوں؟''

''اگر تمہیں میں ساتھ لے کر جانا چاہتا تو پھر جلال دین کے حوالے سے خصوصی ہدایات نہ دیتا نبی جان!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آج سکندر علی تھانے نہیں آئے گا لہٰذا تمہارا تھانے میں موجود رہنا ضروری ہے۔ کوئی ایک آدھ سینئر اہلکار تو یہاں موجود رہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں کانسٹیبل افتخار کو اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں اور ہماری واپسی جلد ہوجائے گی۔''

اس کے بعد حوالدار نے کوئی سوال نہیں کیا اور میں ضروری تیاری کے بعد افتخار کے ہمراہ تمبا کو فروش اکرام اللہ کی دکان کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس بات کے امکانات صفر کے برابر تھے کہ آج وزیر علی کی دکان کھلی نظر آئے۔ اس کے گھر میں جتنی بڑی قیامت برپا ہوئی تھی اس کے بعد تو اس کی دکان کو ہفتہ، دس دن کے لیے بند رہنا ہی تھا۔

اور اس ہنگامی موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اکرام اللہ کا بھرپور انٹرویو کرسکتا تھا، وزیر علی کی مداخلت کا دور دور تک امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

☆☆☆

میں تھانے پہنچا تو بڑا پرجوش تھا۔ اکرام اللہ سے ہونے والی ''ملاقات'' بڑی سودمند ثابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے تعاون کرنے میں کسی ہچکچاہٹ یا لیت ولعل سے کام نہیں لیا تھا۔ وزیر علی نے اپنی بہو کے کردار پر جس انداز میں انگلی اٹھائی تھی اس کی تفصیل اکرام اللہ نے مجھے بتادی۔ میں اس کے پاس سے سنسنی خیز اور انکشاف انگیز معلومات حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔ قاتل اب میری پہنچ سے زیادہ دور نہیں رہا تھا!

جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اے ایس آئی سکندر علی کو اپنا منتظر پایا۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ پروگرام کے مطابق، آج وہ آن ڈیوٹی چھٹی پر تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ساجد کا خیال آگیا۔ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ساجد کے بارے میں پوچھ لیا۔

''سکندر علی! تمہارے بیٹے کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی، اللہ کا شکر ہے۔'' وہ مطمئن انداز میں بولا۔ ''اب تو اس کا بخار تقریباً ختم ہی ہوگیا ہے۔ سینے میں بھی وہ پہلے والی کھڑکھڑاہٹ اور گھٹن باقی نہیں رہی۔ حکیم جی کی دوا اپنا کام دکھارہی ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ حکیم جی کی دی ہوئی دوا اپنا کام دکھارہی ہے۔'' میں نے اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''لیکن تم نے کیا کام دکھایا ہے۔ آج تو تم چھٹی پر تھے پھر یہاں آمد کا کیا مطلب ہے؟''

''مطلب بڑا مفید اور نیک ہے ملک صاحب!'' وہ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جس مقصد کے لیے چھٹی لی تھی وہ حاصل ہوگیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں خاصی ہلچل اور سنسنی خیزی دکھائی دی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ کوئی بڑا میدان مار کر واپس آیا ہے۔ میں نے یہاں ''بڑا میدان'' محاورے کی ضرورت کے تحت استعمال کیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی سے استفسار کیا۔ ''سکندر علی! تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''جناب! آپ نے جو کام عالیہ کے حوالے سے میرے ذمے لگایا تھا.....'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کے آغاز کی نوبت ہی نہیں آئی۔ عالیہ کو پہلے سے اس معاملے کی خبر ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا، میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ پولیس والی ہے۔ وہ عابدہ کے ایک خطرناک چکر سے آگاہ تھی۔ میں نے اس سلسلے میں اسے اعتماد میں لے کر جیسے ہی بات شروع کی، اس نے دوٹوک اور حتمی انداز میں کہہ دیا..... ہاں، یہ معاملہ تو کافی عرصے سے چل رہا ہے۔ میں عابدہ اور قادر بخش کے چکر سے واقف ہوں.....!''

''قادر بخش.....!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کیا تمہاری بیوی نے قادر بخش ہی کا نام لیا تھا؟''

''جی ملک صاحب! میں غلط کیوں کہوں گا۔'' وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''بس.....تو سمجھو پھر ہو گیا کام۔''

''کیا آپ کے پاس بھی قادر بخش کے حوالے سے کوئی اہم اطلاع ہے۔'' سکندر علی نے پرجوش انداز میں پوچھا۔ ''آپ کی بات سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔''

''ہاں، سکندر علی! ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی اکرام اللہ کا ''انٹرویو'' کر کے آرہا ہوں۔ اس نے بھی قادر بخش ہی کا نام لیا ہے۔ وزیر علی نے اس سے بات کرتے ہوئے اپنی بہو کے ساتھ قادر بخش کا نام ہی جوڑا تھا۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے ظاہر ہوتا ہے، مقتولہ کے بڑے بھائی راشد کے موقف میں خاصا دم خم ہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں اس قادر بخش کو شاملِ تفتیش کر لینا چاہیے!''

''قادر بخش کا گھر وزیر علی کے گھر سے زیادہ دور نہیں۔'' اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''ان دونوں کے گھروں کے بیچ میں صرف تین گھر اور واقع ہیں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں ابھی قادر بخش کو پکڑ کر یہاں لے آتا ہوں۔ ٹرائل روم میں لے جا کر اس پر تھوڑی ''محنت'' کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے سکندر علی!'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ تم جاؤ اور قادر بخش کو گرفتار کر کے تھانے لے آؤ۔ دیکھتے ہیں، وہ کون سی رام کہانی سناتا ہے۔'' میں تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اے ایس آئی سے پوچھا۔

''یہ قادر بخش کرتا کیا ہے؟''

''قادر بخش بکروال ہے۔'' سکندر علی نے جواب دیا۔ ''وہ دراصل بکریوں اور بھیڑوں وغیرہ کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ اس سلسلے میں، وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا سفر کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی یہاں ہوتا ہے تو کبھی وہاں لیکن یہ ہے کہ وہ زیادہ دنوں کے لیے رائے پور سے دور نہیں رہتا۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے، ایک آدھ دن میں واپس آجاتا ہے۔''

''لگتا ہے، تم نے اس بکروال قادر بخش پر بڑی تحقیق کر رکھی ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا وہ شادی شدہ ہے؟''

آخری سوال اچانک ہی میرے ذہن میں آگیا تھا۔ سکندر علی نے جواب میں بتایا۔

''جی ملک صاحب! قادر بخش شادی شدہ ہے۔ اس کی شادی کو لگ بھگ آٹھ سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اس کے گھر اولاد نہیں ہوئی۔''

''دیکھنے میں کیسا نظر آتا ہے۔'' میں نے سوال کیا۔ ''اس کی شخصیت کیسی ہے؟''

''شخصیت بڑی متاثر کن اور جاندار ہے۔'' سکندر علی نے بتایا۔ ''قادر بخش کی عمر پینتیس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک جوان اور پُرکشش مرد ہے۔''

''ہوں.....!'' میں چند لمحات کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اے ایس آئی سے کہا۔ ''سکندر علی! تم جاؤ اور فوراً قادر بخش کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔''

اے ایس آئی تھانے سے روانہ ہوا تو میں دوسرے انتظامات میں لگ گیا۔ اس کیس کی بساط پر دو نہایت ہی اہم مہرے اور بھی موجود تھے۔ نمبر ایک، وزیر علی۔ نمبر دو، کھوجی بابا جلال دین۔ قادر بخش کا کردار نمایاں ہونے کے بعد مجھے وزیر علی پر سخت غصہ آرہا تھا۔ میں نے کرید کرید کر اور شرافت کی زبان میں اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مجھے مقتولہ کے حوالے سے کوئی ایسا اشارہ دے جو اس کے قاتل تک پہنچنے میں میری مدد کر سکے لیکن اس نے زبان پر جیسے تالا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈال لیا تھا۔ اس نے مقتولہ کے کردار کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اپنے دل کا احوال اکرام اللہ سے تو کہہ ڈالا تھا لیکن مجھ سے دانستہ چھپایا تھا۔ اگر یہ بات وزیر علی کے علم میں تھی تو ظاہر ہے ملکہ بھی اس معاملے سے بے خبر نہیں رہی ہوگی۔ ان دونوں میاں بیوی نے مجھ سے مسلسل جھوٹ بولا تھا لہٰذا اس حرکت کے لیے ان سے باز پرس ضروری ہوگئی تھی۔

دوسری طرف جلال دین غائب تھا۔ سکندر علی کے مطابق، آج اسے تھانے آکر کسی اہم راز کا انکشاف کرنا تھا لیکن دوپہر ہو چلی تھی اور دور دور تک جلال دین کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں اسے ایسا غیر ذمے دار نہیں سمجھتا تھا۔ پتا نہیں، اس کے ساتھ ایسا کیا ہوگیا تھا!

میں نے کانسٹیبل افتخار کو اپنے پاس بلایا اور ضروری ہدایات دینے کے بعد کہا۔ ''تم پہلے جلال دین کے گھر جاؤ اور اگر وہ گھر میں مل جائے تو اس سے کہو کہ میں نے اسے فوراً تھانے بلایا ہے۔ اس کے بعد.....'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تم وزیر علی کے پاس جانا اور اسے اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آجانا۔''

افتخار نے حکم کی تعمیل کی یقین دہانی کرائی اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد حوالدار نبی جان میرے کمرے میں آگیا اور ہم اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ نبی جان کو ہر بات کی آگاہی تھی اور وہ کل صبح ہی سے اس کیس میں شامل تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ نے سکندر علی کو قادر بخش کی طرف بھیجا ہے اور افتخار کو وزیر علی کی جانب..... اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ ان دونوں افراد کے گھر قریب قریب واقع ہیں۔ یہ کام کوئی ایک بندہ بھی کرسکتا تھا؟''

''ہاں، یہ کام واقعی ایک بندہ کرسکتا تھا لیکن جیسا کہ تم نے کہا، اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''سکندر علی اور افتخار دو مختلف اوقات میں وہاں پہنچیں گے۔ افتخار کو میں نے ہدایت کی ہے کہ وہ پہلے کھوجی کی طرف جائے۔ بعد ازاں وزیر علی کے گھر کا رخ کرلے۔ اس طرح ان دونوں پولیس اہلکاروں کی وہاں آمد میں لگ بھگ آدھے گھنٹے کا فرق آجائے گا۔ جب افتخار، وزیر علی کے گھر پہنچے گا تو سکندر علی، قادر بخش کو لے کر تھانے آچکا ہوگا۔'' میں ایک لمحے کے لیے رکا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔

''میں ان دونوں بندوں کو الگ الگ طریقے سے ''چیک'' کرنا چاہتا ہوں تاکہ بہتر اور کارآمد نتائج حاصل کیے جاسکیں!''

نبی جان اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

اے ایس آئی سکندر علی خالی ہاتھ واپس آیا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھا تو میں نے پوچھا۔ ''کیا رہا سکندر علی؟''

''قادر بخش گھر میں موجود نہیں ہے جناب!'' اس نے جواب دیا۔

''گھر میں موجود نہیں تو پھر کہاں ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میری اس کی بیوی سے بات ہوئی ہے۔'' سکندر نے بتایا۔ ''فریدہ کا کہنا ہے کہ قادر بخش چک جیونا گیا ہوا ہے۔''

چک جیونا، قصبہ رائے پور کے جنوب میں پانچ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ''وہ چک جیونا کب اور کس کام سے گیا ہے؟''

''کام تو اس کا میں آپ کو بتا چکا ہوں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہ بکریوں اور بھیڑوں کی خرید و فروخت کے سلسلے ہی میں وہاں گیا ہے اور فریدہ نے مجھے بتایا ہے کہ جس رات عابدہ کا قتل ہوا اس سے پہلے والی دوپہر کو وہ گھر سے نکلا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، قادر بخش کی روانگی کے بارہ، تیرہ گھنٹے بعد عابدہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو بڑی گڑبڑ ہوگئی۔ اگر قادر بخش کی بیوی کا بیان درست ہے تو یہ بندہ شک کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔''

''جناب! فریدہ نے تو بڑے وثوق سے اس کی روانگی کے بارے میں بتایا ہے۔'' سکندر علی کی آواز میں بھی الجھن جھلکتی تھی۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں ملک صاحب! اگر قادر بخش نے، عابدہ کی موت کے وقت، اپنی موجودگی کو جائے وقوعہ سے پانچ میل دور ثابت کردیا تو واقعی قاتل کی حیثیت میں اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں رہے گا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر وہ دوپہر میں رائے پور سے روانہ ہوا تھا تو یقیناً سورج غروب ہونے سے پہلے وہ چک جیونا پہنچ گیا ہوگا اور وہ رات جب عابدہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، قادر بخش نے چک جیونا میں گزاری ہوگی۔ اس شب بستی کے ثبوت کے لیے اس کے پاس چند گواہ بھی ہوں گے لہٰذا اسے عابدہ کا قاتل ٹھہرانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ثابت ہوگا۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بعد میں جو کچھ بھی ہوگا، اس کے بارے میں بعد ہی میں سوچیں گے سکندر علی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو وہ ہمارے ہاتھ ہی میں نہیں..... تم یہ بتاؤ کہ اس کی بیوی فریدہ نے واپسی کے بارے میں کیا کہا ہے..... قادر بخش اپنے کاروباری دورے سے واپس کب آئے گا؟''

''فریدہ نے آج رات یا کل صبح اس کی واپسی کا امکان ظاہر کیا ہے۔'' سکندر علی نے جواب دیا۔ ''میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ قادر بخش جیسے ہی رائے پور میں قدم رکھے، وہ فوراً اسے تھانے بھیج دے۔''

''فریدہ نے کسی قسم کی تشویش ظاہر نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ پولیس کو اس کے خاوند قادر بخش کی تلاش کس سلسلے میں ہے؟''

''نہیں جناب!'' سکندر علی نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں نے اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''اس نے پوچھا بھی نہیں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''پوچھا تھا اور..... بڑی تشویش سے پوچھا تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے فریدہ سے ایک خوبصورت بہانہ کیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیسا بہانہ سکندر علی؟''

''میں نے یہ کہہ کر اس کی تسلی کر دی ہے کہ.....'' سکندر علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ قادر بخش چوری کے جانوروں کا کاروبار کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے اسے تھانے بلایا جا رہا ہے۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظروں سے اے ایس آئی کو دیکھا اور کہا۔ ''تم نے واقعی بڑی خوبصورتی سے معاملے کو کور کیا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جب تک قادر بخش ہمارے ہتھے نہ چڑھ جائے، ہمارے مشن کو..... کم از کم اس کی بیوی کی حد تک اوپن نہیں ہونا چاہیے۔''

''دوسری طرف کی کیا خبر ہے ملک صاحب!'' سکندر علی نے مجھ سے پوچھا۔ ''میرا اشارہ وزیر علی کی جانب ہے؟''

''میں نے اسے بلانے کے لیے بندے کو دوڑایا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ بابے جلالے کو بھی سچ کرتا آئے گا۔''

''بابا جلال دین کے ذکر پر یاد آیا ملک صاحب.....!''

وہ پرسوچ لہجے میں بولا۔ ''اسے تو آج جائے وقوعہ کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنا تھا۔''

''سکندر علی! رات کی بارش کے بعد اب حالات تو ایسے نہیں رہے کہ کھرے کے کام کو مزید جاری رکھا جا سکے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے اس بات کی تشویش بہرحال ہے کہ جلال دین رپورٹ کرنے تھانے کیوں نہیں آیا!''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل افتخار نے میرے کمرے میں انٹری دی۔ میں نے کچھ دیر پہلے افتخار کو جلال دین اور وزیر علی کی طرف روانہ کیا تھا۔ افتخار مجھے سلام کرنے کے بعد اٹین شن کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی، کیا رپورٹ ہے ادھر کی؟''

''وزیر علی کو میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں جناب!'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔''

''اور بابا جلالا.....؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کھوجی جلال دین کی حالت بہت خراب ہے جناب۔'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''کیوں..... کیا ہوا ہے اس کو؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

افتخار نے بتایا۔ ''وہ گزشتہ رات سے بخار میں پڑا ہے۔ ابھی بھی اس کا پورا بدن آگ جیسا ہو رہا ہے۔ میں خود اسے چیک کر کے آ رہا ہوں۔ حکیم جی سے دوا لی ہے۔ حکیم نے کہا ہے کہ جلال دین کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ رات تک بخار ہلکا ہو جائے گا۔''

''اب میری سمجھ میں آ گیا کہ بابا جلال دین غائب کیوں ہے؟'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے افتخار! تم وزیر علی کو اندر بھیج دو۔''

وہ ''یس سر'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وزیر علی میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے معتدل لہجے میں اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اسے کس مقصد کے لیے بلایا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اس کے چہرے کے تاثرات سے چھپی نہ رہتی۔ اس نے بیٹھتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

''تھانیدار صاحب! عابدہ کی لاش آج اسپتال سے آ جائے گی نا؟''

''آج کا امکان تو ذرا کم ہی ہے۔'' میں نے اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''البتہ، کل کے بارے میں یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے اور ہاں.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کل ایس پی آفس سے تمہارے بیٹے مشتاق کو فون کردیا تھا۔ مشتاق سے میری بات تو نہیں ہوسکی۔ فون اس کے سپروائزر نے اٹھایا تھا۔ مشتاق اس وقت فیکٹری میں موجود نہیں تھا۔ تاہم سپروائزر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مشتاق کو نہ صرف یہ کہ اس اندوہناک واقعے سے آگاہ کردے گا بلکہ اسے پہلی فرصت میں پاکستان بھی بھیج دے گا۔''

''بہت بہت شکریہ تھانیدار صاحب!'' وہ نرمی سے بولا پھر پوچھا۔ ''عابدہ کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلا کہ نہیں؟''

''یہی پتا چلانے کے لیے تو تمہیں یہاں بلایا ہے وزیر علی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے نا؟''

''جناب..... میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ.....''

''پہلے کی بات چھوڑ دو وزیر علی۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب حالات بہت مختلف شکل اختیار کرچکے ہیں۔ میں قاتل کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔ تمہیں صرف تصدیق یا تردید کرنا ہے!''

میں دراصل وزیر علی کو بے خبر رکھ کر اس پر ایک نفسیاتی حربہ آزمانا چاہتا تھا تاکہ اس کے دل اور دماغ کا احوال واضح ہوسکے۔ میری بات سنتے ہی وہ چونکا اور اضطراری لہجے میں بولا۔

''آپ کے خیال میں عابدہ کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''قادر بخش نے!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے.....!'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا پھر وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہو۔ جو کچھ اس کی زبان سے ادا ہوا تھا وہ سب شاید اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یعنی تمہاری نظر میں بھی قادر بخش ہی عابدہ کا قاتل ہے؟''

''وہ جی.....'' وہ صورت حال کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ..... ایسا ہوسکتا ہے..... قادر بخش نے عابدہ کو..... ٹھکانے لگادیا ہو.....''

''لیکن کیوں.....؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ وزیر علی اس معاملے میں اندر سے بڑا کمزور ہے۔ ''قادر بخش، عابدہ کا خون کیوں کرسکتا ہے۔ تمہاری بہو سے اس بکروال کی کیا دشمنی تھی؟ کیا عابدہ نے اس کی کوئی بھیڑ بکری چرالی تھی یا کسی بکری کا دودھ نکال لیا تھا؟ تمہارا دھیان قادر بخش کی طرف ہی کیوں گیا.....؟ اور اگر تمہیں اس بندے پر ذرا سا بھی شک تھا تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے کتنا کریدکریدکر تم سے پوچھا تھا.....؟''

''آپ نے.....'' وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک ہی سانس میں اتنے..... سارے سوالات کردیے ہیں..... کہ میرا دماغ ہل کر..... رہ گیا ہے۔ مم..... مم.....'' وہ لکنت زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگیا اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''وزیر علی! یہ ضروری نہیں ہے کہ تم میرے سوالات کے جوابات ایک ہی سانس میں دو لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لینا کہ اب جھوٹ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں اکرام اللہ سے تفصیلی بات کرچکا ہوں جس سے تم نے عابدہ اور قادر بخش کے حوالے سے چند شرم ناک باتیں کی تھیں۔ وہ باتیں اکرام اللہ کی بیوی سائرہ کے ذریعے راشد کی بیوی بلقیس تک اور راشد تک بھی پہنچ چکی ہیں۔ راشد تمہیں اپنی بہن عابدہ کا قاتل سمجھتا ہے لیکن میں جانتا ہوں.....'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کرکے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''وزیر علی! میں جانتا ہوں کہ تم قاتل نہیں ہو لیکن اگر تم نے کسی بھی معاملے میں اب ذرا سی بھی غلط بیانی سے کام لیا تو میں کوئی ٹکڑا کیس بنا کر تمہیں جیل بھجوادوں گا!''

وہ کرسی پر جیسے ڈھے سا گیا۔ میری دھمکی نے اسے چاروں خانے چت کردیا تھا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ آنکھوں میں خوف کے سایے لہرانے لگے، پھنسی پھنسی آواز میں اس نے مجھ سے کہا۔

''تھانیدار صاحب! کسی بھی معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں..... میں نے بڑے واضح انداز میں یہ محسوس کیا تھا کہ عابدہ اور قادر بخش کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ اس معاملے کی تصدیق کے لیے میں نے سب سے پہلے عابدہ سے پوچھا تو وہ صاف مکر گئی۔ اس سلسلے میں، میں قادر بخش سے کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات نہیں کرسکتا تھا۔ آپ میری نازک پوزیشن کا اندازہ لگا سکتے ہیں..... جب مجھ سے زیادہ برداشت نہیں ہوا تو میں نے اکرام اللہ کو دل کا حال سنا ڈالا۔ وہ بڑا ہی بھلا مانس اور مخلص دوست ہے لیکن شاید..... مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے اسے بھی نہیں بتانا چاہیے تھا.....!''

''تمہاری غلطی یہ نہیں کہ تم نے اکرام اللہ کو اپنے درد سے آشنا کردیا تھا۔ یہ تو تمہارا ایک فطری ردعمل تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''غلطی تم سے یہاں پر ہوئی کہ تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا..... !''

''میں بہت شرمندہ ہوں جناب!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھ سے بھول ہوگئی۔ آئندہ میں ایسی کوتاہی نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کردیں..... وہ دراصل، میں اپنی عزت کی خاطر زبان بند رکھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔''

میں اس کی مجبوری کو سمجھ سکتا تھا۔ اس مجبوری میں شرافت اور سادگی کا بھی غالب ہاتھ تھا۔ جب معاملہ گھر کی عزت کا ہو تو انسان مختلف مرحلوں پر خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ میرے ہم خیال ہیں اور آپ کی تفتیش کے مطابق، قادر بخش ہی نے عابدہ کا خون کیا ہے تو پھر آپ اسے گرفتار کرکے جیل کیوں نہیں بھجوا دیتے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وزیر علی! مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری بہو کو قادر بخش نے قتل کیا ہے!''

''جی.....'' وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ.....''

''وہ بات میں نے تمہاری زبان کھلوانے کے لیے کہی تھی وزیر علی!'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اور واقعی، تم سچ اگلنے پر مجبور ہوگئے۔''

''لیکن آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہیں کہ قادر بخش قتل کی اس واردات میں ملوث نہیں؟'' وہ حیرت اور الجھن سے بھرپور لہجے میں بولا۔

میں نے نہایت ہی مستحکم لہجے میں کہا۔ ''وزیر علی! ویسے تو قادر بخش کے ہاتھ لگنے کے بعد ہی حقیقت حال پر سے پردہ اٹھے گا لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ جب عابدہ کا قتل ہوا، قادر بخش جائے وقوعہ سے پانچ میل دور چک جیونا میں موجود تھا۔ جب وہ رائے پور میں تھا ہی نہیں تو پھر عابدہ کو قتل کیسے کرسکتا ہے!''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ عابدہ کے قتل کے وقت قادر بخش رائے پور میں نہیں تھا؟'' وہ متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''میں نے بتایا ہے نا، مجھے کہیں سے اس بات کا پتا چلا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تصدیق تو اس وقت ہوسکے گی جب قادر بخش واپس رائے پور آئے گا۔ اس کی بیوی فریدہ نے بتایا ہے کہ وہ آج شام کو یا کل کسی وقت چک جیونا سے واپس آجائے گا۔''

''وہ یہاں سے گیا کب تھا؟'' وزیر علی نے تشکیک آمیز لہجے میں پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''وہ عابدہ کی موت سے نو، دس گھنٹے پہلے اپنی بھیڑ بکریوں کے ہمراہ رائے پور سے روانہ ہوگیا تھا۔ فریدہ نے اس کی روانگی کے وقت کی تصدیق کی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے وزیر علی سے پوچھا۔ ''قادر بخش اور فریدہ تم سے صرف تین گھر کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ تم ان کے معمولات سے اتنے بے خبر کیوں ہو جبکہ..... تم قادر بخش اور عابدہ کے درمیان چلنے والے چکر سے بھی اچھی طرح واقف ہو؟''

''دراصل، اس بے خبری کی وجہ یہ واقفیت ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب سے مجھے قادر بخش کے کرتوتوں کا پتا چلا تھا، مجھے اس سے شدید نفرت ہوگئی تھی۔ میں نے اس پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔''

''جب کہ عابدہ کے تعلق کے باعث تمہیں سب سے زیادہ دھیان اسی پر دینا چاہیے تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے گھر کی عزت کا معاملہ تھا۔ مشتاق تمہارے ہی بھروسے پر اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر پردیس کی صعوبتیں اٹھا رہا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب۔'' وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔

''میں غلط تھا، عابدہ کے معاملے میں مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی۔ اگر میں شروع ہی میں کوئی بہادرانہ قدم اٹھا لیتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا.....!''

''وقت گزر جانے کے بعد پچھتانے یا نادم ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا وزیر علی!'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''اب دعا کرو کہ میں جلد از جلد عابدہ کے قاتل تک پہنچ جاؤں تاکہ اسے عبرتناک سزا دلوائی جاسکے۔''

''عابدہ کے قاتل کو اگر پھانسی لگ جاتی ہے تو اس سے مشتاق اور فاخرہ کے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکے گی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مشتاق کی بیوی اور فاخرہ کی ماں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو اب کوئی بھی واپس نہیں لا سکتا۔''

اس کی دل شکستگی اور افسردگی کو میں بڑی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں اس بگاڑ کو سدھار سکتا تھا اور نہ ہی اس خلا کو پُر کر سکتا تھا جو عابدہ کی موت سے ان لوگوں کی زندگیوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ قدرت کی مصلحتوں کے سامنے گردن جھکانا ہی پڑتی ہے!

☆☆☆

حکیم جی کا کہنا تھا کہ جلال دین کا بخار رات تک ہلکا ہو جائے گا لیکن مجھے ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس کا بدن تنور کے مانند دہک رہا تھا۔ میں اے ایس آئی کے ساتھ اسے دیکھنے اس کے گھر پہنچ گیا تھا اور اس وقت جلال دین کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی یا یوں کہیں کہ حکیم جی کی دوا نے اتنا اثر ضرور دکھایا تھا کہ بابا جلالا اب ہوش و حواس میں تھا اور بات کرنے کے قابل بھی تھا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی بے حد معذرت کی اور اٹھ کر بیٹھنے لگا لیکن میں نے اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے جلال دین۔ تم اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ تھانے آسکتے اور جہاں تک کھرا نکالنے کا تعلق ہے تو..... گزشتہ رات ہونے والی بارش نے اس کہانی کو ہی ختم کر دیا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''جو کہانی اختتام پذیر ہو گئی اس کے آخر کے چند تحیر آمیز واقعات میرے علم میں نہیں آسکے..... وہ واقعات میں تمہاری زبانی سنوں گا.....''

وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی معنی خیزی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جلال دین! گزشتہ روز تم نے جو کھرا اٹھایا اس کے نتائج کے بعض حصوں نے تمہیں الجھن میں ڈال دیا تھا۔ تم کسی خاص حوالے سے متذبذب تھے اور کسی حتمی رائے تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ مجھے بتاؤ، ایسی کیا بات تھی؟''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ ''ملک صاحب! میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور میرے پیشہ ورانہ تجربہ اور مہارت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیری والے کھوہ کے پاس مقتولہ عابدہ کسی جاندار عورت سے نبرد آزما ہوئی تھی.....''

''کسی عورت سے.....؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ کمزور سی آواز میں بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں ملک صاحب..... اور اسی کشمکش نے مجھے الجھا کر رکھا ہوا ہے۔ جائے واردات پر جہاں مقتولہ کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اور دیگر اشیا پڑی ملی ہیں، وہاں دو افراد کا کھرا بڑا واضح نظر آیا ہے۔ پاؤں کے ان نشانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ دونوں افراد ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں اور میری ماہرانہ آنکھیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ وہ دونوں افراد سو فیصد عورتیں تھیں۔ عورتوں کے پاؤں کے مخصوص دباؤ کے باعث ان کا کھرا مردوں کی بہ نسبت بہت مختلف ہوتا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان میں سے ایک کھرا تو مقتولہ عابدہ کا تھا اور دوسرا کسی صحت مند اور توانا عورت کا.....'' وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا، دو چار گہری گہری سانسیں لیں اور سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے وزیر علی کے گھر سے لے کر جائے وقوعہ تک کے راستے کو اچھی طرح کھنگالا تھا۔ اس راہ میں مجھے مقتولہ کے قدموں کے نشانات ملے تھے لیکن میں نے جس طاقت ور عورت کا ابھی ذکر کیا ہے اس کا کھرا وہاں کہیں نظر نہیں آیا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ کسی اور راستے سے بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی.....''

''جلال دین.....!'' اس کے بیان میں ایک مرتبہ پھر توقف آیا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تم کس بنا پر کر رہے ہو کہ دوسری عورت بڑی جاندار، طاقت ور اور صحت مند و توانا تھی؟''

''اس کے پاؤں کے غیر معمولی سائز اور مخصوص دباؤ کے باعث۔'' جلال دین نے ایک بوجھل سانس چھوڑتے ہوئے بتایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ عورت ہاتھ پاؤں کی مضبوط ہوگی۔ یہ کھرے کی بعض تکنیکی نزاکتیں ہیں جو میں وضاحت سے نہیں سمجھا سکتا ملک صاحب!''

''فی الحال، ایسی کسی وضاحت کی ضرورت ہے اور نہ ہی تمہاری صحت اجازت دیتی ہے جلال دین۔'' میں نے موقع محل کی نزاکت کے پیش نظر کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ اس صحت مند عورت کے کھرے نے اور کیا کیا راز اگلے ہیں؟''

اس دوران میں اے ایس آئی سکندر علی دم سادھے بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جلال دین کے انکشافات نے اسے کسی گہری سوچ میں غرق کر دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھوجی بابا نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''میں نے تھوڑی کوشش اور محنت کے بعد اس عورت کا کھرا بھی پکڑ لیا تھا۔ وہ کھیتوں کے اندر سے ہوتے ہوئے جائے وقوعہ تک پہنچی تھی اور پھر اسی راستے سے واپس بھی گئی تھی.....''

''لیکن وہ کہاں سے چل کر جائے وقوعہ تک پہنچی تھی؟'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا اور واپس وہ کہاں گئی؟''

''وہ جہاں سے آئی تھی، واپس وہیں پہنچی تھی۔'' وہ پروثوق لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے کھرے کا تعاقب کرتے ہوئے ایک ایسے گھر تک پہنچا تھا جو مقتولہ کے گھر سے صرف تین مکان کے فاصلے پر واقع ہے.....''

''تم قادر بخش کے گھر کی بات کر رہے ہو جلال دین؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اسی لمحے سکندر علی کی جوشیلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''ملک صاحب! میں نے قادر بخش کی بیوی فریدہ کو بڑی باریک بینی سے دیکھا ہے۔ وہ بابے جلالے کے بتائے ہوئے قد بت پر سولہ آنے پوری اترتی ہے۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، صحت منداور توانا جسم.....''

''میں بھی کل اسی نتیجے پر پہنچا تھا ملک صاحب!'' جلال دین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اور اسی بات نے مجھے الجھا دیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں کوئی حتمی رپورٹ پیش کرنے سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر کھرے کا جائزہ لے لوں لیکن بارش نے سب کچھ ختم کر دیا.....''

جلال دین نے متوقع قاتل عورت کی آمد و شد کا جو روٹ بتایا تھا وہ کھیتوں کا وہی حصہ تھا جہاں سے حوالدار نبی جان کو وہ رسی ملی تھی جس کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ عابدہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے اسی رسی سے اس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا تھا۔

''جلال دین! گزشتہ رات والی بارش کی شرارت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ ویسے تم نے اتنی کارگزاری دکھا دی ہے کہ میں بہ آسانی قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے لمحے بھر کو رک کر ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''جلال دین! تم مکمل آرام کرو۔ ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ میرا کام ہو گیا ہے۔'' وہ تشکر آمیز فخریہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

جلال دین اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتا تھا جن کے چار بچے بھی تھے۔ میں نے اس کے بیٹے کو خصوصی ہدایت کی کہ وہ اپنے باپ کا بہت زیادہ خیال رکھے، پھر میں سکندر علی کے ساتھ اس کے گھر سے نکل آیا۔

☆☆☆

پولیس کو کسی مجرم کے بارے میں کوئی حتمی اشارہ مل جائے تو پھر وہ پلک جھپکتے میں منزل پر پہنچ کر اپنا مقصد حاصل کر لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی اس کیس میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جلال دین کی ''راہ نمائی'' کو مشعل راہ جان کر میں نے پہلی فرصت میں قادر بخش کی بیوی فریدہ کو تھانے بلوا کر اس کا ٹرائل شروع کر دیا۔

فریدہ کوئی عادی مجرم نہیں تھی اور نہ ہی اس کا پھولن دیوی ایسا دل گردہ تھا، لہٰذا اس نے ایک آدھ تفتیشی فارمولے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس نے یہ قتل اپنے گھر اور گھر والے کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ جبھی اس نے واردات کے لیے ایک ایسی رات کا انتخاب کیا جب قادر بخش گھر پر موجود نہ ہوتا کہ اس قتل کے حوالے سے اس پر کسی کا شک نہ جائے۔

اقبالِ جرم کرتے ہوئے فریدہ نے مجھے بتایا کہ وہ قادر بخش اور عابدہ کے چکر سے واقف ہو گئی تھی لیکن اس سلسلے میں جب اس نے اپنے شوہر سے بات کی تو وہ صاف مکر گیا لیکن وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ قادر بخش اور عابدہ چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس نے کوشش کر کے یہ پتا بھی لگا لیا کہ وہ اندھیری رات کا فائدہ اٹھا کر بیری والے کھوہ پر ملاقات کرتے ہیں۔ جب اسے شوہر ہاتھ سے نکلتا ہوا اور گھر برباد ہوتا دکھائی دیا تو اس نے ایک انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ شادی کو آٹھ سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کی پوزیشن خاصی کمزور اور نازک تھی۔ قادر بخش کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا لہٰذا اس نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صاف کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور وقوعہ کی رات اپنے ارادے کو پورا بھی کر دکھایا۔

میں نے اس کا مکمل بیان لینے کے بعد پوچھا۔ ''فریدہ! تم نے جو کچھ کہا جو کچھ کیا، وہ تو سمجھ میں آ رہا ہے لیکن چند باتیں ہنوز میرے ذہن کو الجھا رہی ہیں۔''

وہ منہ سے ایک لفظ ادا کیے بغیر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک ایسی رات کا انتخاب کیا جب تمہارا خاوند گھر سے اور جائے واردات سے پانچ میل دور چک جیونا میں موجود تھا تاکہ قادر بخش کی ذات شک کے دائرے میں نہ آسکے لیکن یہ بتاؤ، جب قادر بخش رائے پور میں موجود ہی نہیں تھا تو عابدہ اس سے ملاقات کے لیے بیری والی کھوہ پر کیوں گئی؟''

''اسے ایسا کرنے کے لیے میں نے مجبور کیا تھا۔'' فریدہ سپاٹ آواز میں بولی۔

''تم نے مجبور کیا تھا!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر کیسے.....؟''

''میں ان کی ملاقات کے طریقہ کار سے واقف ہوگئی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ''انہوں نے آپس میں مشورہ کرکے چند اشارے طے کرلیے تھے۔ جب انہیں ملنا ہوتا تھا تو قادر بخش، عابدہ کی بچی فاخرہ کے ہاتھ پر پین کی مدد سے ایک مخصوص نشان بنادیا کرتا تھا جو کسی ستارے سے مشابہ ہوتا۔ عابدہ، فاخرہ کا ہاتھ دیکھ کر سمجھ جاتی کہ آج رات جب پورا قصبہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہوتا اسے قادر بخش سے ملنے کے لیے بیری والے کھوہ پر جانا ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتی تھی۔ میں نے بھی اسی طریقے کو اپنا کر عابدہ کو بیری والے کھوہ تک بلالیا تھا جہاں ایک درخت کی اوٹ میں، میں پہلے سے چھپی کھڑی تھی۔ پھر رسّی نے میرا کام آسان کردیا۔ وہ میری ''گرفت'' میں بہت تڑپی پھڑکی لیکن میں نے رسّی کے پھندے میں ذرا سی کمزوری نہیں آنے دی اور جب تک وہ اس دنیا سے اُس دنیا میں نہیں پہنچ گئی، میں نے رسّی کو کس کر تھامے رکھا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی، ایک آسودہ سانس خارج کی اور بڑی سفّاکی سے بولی۔

''میں نے عابدہ کی لاش کو بیری والے کھوہ کے پاس چھوڑا، رسی کو کھیتوں کی طرف اچھال دیا اور اطمینان سے چلتے ہوئے گھر آگئی۔ مجھے پکا یقین تھا کہ میری یہ ''حرکت'' کسی کی نظر میں نہیں آئے گی لیکن اس مردود کھوجی نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔''

بات کے اختتام پر فریدہ کے چہرے اور آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اس نے کسی نہایت ہی تلخ شے کو بے خیالی میں دانتوں تلے دبالیا ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا عابدہ کو یہ بات پتا نہیں تھی کہ قادر بخش دوپہر ہی کو گاؤں سے نکل گیا تھا؟''

''میرا خیال ہے، وہ قادر بخش کی روانگی سے واقف نہیں تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اترا سے پتا ہوتا کہ قادر بخش چک جیونا گیا ہوا ہے تو وہ کبھی بیری والے کھوہ کا رخ نہ کرتی۔''

''لیکن تمہاری یہ چال بہت ہی خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر عابدہ کو قادر بخش نے اپنے پروگرام سے آگاہ رکھا ہوتا تو پلک جھپکتے میں تمہاری چوری پکڑی جاسکتی تھی، یعنی تمہاری یہ اندھی چال بری طرح ناکام ہوجاتی۔''

''میں جانتی ہوں تھانیدار صاحب..... اور یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا۔'' وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن کہیں نہ کہیں تو کسی کمزوری کو بھی ساتھ رکھ کر چلنا پڑتا ہے..... یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری کمزوری عابدہ کی نظر سے نہیں گزری۔''

''اور یہ تمہاری بدقسمتی تھی کہ تمہارا کھرا کھوجی کی نظر سے چیک کر رہ گیا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہی تمہاری گرفتاری اور تباہی کا سبب بنا.....؟''

جلال دین کے ذکر پر فریدہ نے ایک مرتبہ پھر برا سا منہ بنایا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے حوالات میں بند کردیا۔

اگلے روز سرکاری اسپتال سے عابدہ کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تھانے پہنچ گئی۔ اسی روز دوپہر کے وقت قادر بخش بھی چک جیونا سے واپس آگیا۔ یہ کیسا سماں ہوگا اس کے بارے میں، میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ آپ اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے مطابق خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔ میں تو ان لمحات میں صرف اور صرف مشتاق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ مشتاق..... جو اپنی بیوی بچوں کی خوشحالی اور ان کے تاب ناک مستقبل کی خاطر رات دن پردیس کی سختیاں برداشت کرتا رہا اور اس کی بیوی یہاں برائی کی راہ پر گامزن تھی۔ اس کا شوہر تین سال سے اس کے پاس نہیں تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ اپنے بے لگام جذبات کی تسکین کے لیے ایک کمزور بیساکھی کا سہارا لے..... یہ احسان فراموشی اور کم ظرفی کی بڑی افسوس ناک مثال تھی۔

جو لوگ زندگی کی شاہراہ پر، اپنی ٹانگیں سلامت ہونے کے باوجود بھی کسی بیساکھی کے سہارے دوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک دن انہیں عابدہ کی طرح منہ کے بل زمین پر گرنا پڑتا ہے!

(تحریر حُسام بٹ)